اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

ھُدًی لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ الصّٰفّٰتِ)

(جلد: ۹)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ
کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًی لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ الصّٰفّٰتِ)

(جلد: ۹)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے‘ پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پرادارہ هُدًی لِلنَّاسِ نے اس کتاب کا نام ''دروس القرآن'' کی بجائے ''تفسیر روح القرآن'' تجویز کیا ہے۔اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئینِ کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کرلیں، اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب	:	تفسیر روح القرآن
مؤلف	:	ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ناشر	:	ادارہ هُدًی لِلنَّاسِ
کمپوزنگ	:	زاہد حسین
پرنٹرز	:	محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور
تاریخ اشاعت دوئم	:	جنوری 2012ء
تعداد	:	1000
قیمت	:	700 روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ 343- مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ فون 042-35426800

۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انارکلی لاہور۔

۳۔ مکتبہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔

۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔

۵۔ ۳۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔ فون: 042-37248676-37320961

ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 042-35417074

۶۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

موبائل: 0300-8485030۔ فون: 042-37225030

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

(سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ، سُوْرَةُ الرُّوْمِ، سُوْرَةُ لُقْمٰنَ، سُوْرَةُ السَّجْدَةِ)

(سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ، سُوْرَةُ سَبَاٍ، سُوْرَةُ فَاطِرٍ، سُوْرَةُ يٰسٓ، سُوْرَةُ الصّٰٓفّٰتِ)

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ

تعارف 1
نام 1
زمانۂ نزول 1
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 1
سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ 4
آیات کا پس منظر 6
راہِ حق میں آزمائشیں ضرور پیش آتی ہیں 7
سابقہ آیت کے مضمون کی تاکید و تائید 8
مخالفین کو تنبیہ 9
مسلمانوں کو تسلی 9
ایک غلط فہمی کا ازالہ 10
اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت 11
اللہ تعالیٰ اور والدین کے حقوق میں کلمة الفصل 12
اہلِ ایمان کو تسلی کی وضاحت 14
ایمان کے دعویداروں کو تنبیہ 15
استقامت اہلِ ایمان کی قوت اور نفاق ہلاکت ہے 16
وڈیروں اور بزرگوں کی جھوٹی منطق 16
جھوٹی تسلی دینے والوں کو تنبیہ 17
سابقہ رکوع کا خلاصہ 19

Marfat.com

سابقہ حقائق پر حضرت نوحؑ کی سرگزشت سے استشہاد 20
حضرت نوح علیہ السلام کی عمر 20
حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کی کامیابی 22
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت 22
دعوت کی تفصیل دلائل کے ساتھ 24
طویل کشمکش کے بعد قوم کو تنبیہ 24
آیت ۲۳ تک جملہ معترضہ ہے 25
قیامت کا انکار کرنے والوں کو مشاہدے اور غور کی دعوت 26
ضابطۂ خداوندی 26
اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مقابلہ نہیں ہوسکتا 27
امید اور محرومی میں قولِ فیصل 29
سرگزشت کا بقیہ حصہ، بگڑی ہوئی قوم کا جواب 29
ایمان لانے والوں کیلئے اس سرگزشت میں نشانیاں 30
تمہاری دوستی کی بنیاد صرف دنیا تک ہے 31
حضرت لوط علیہ السلام کا قبولیتِ ایمان اور جرأتِ حق 32
ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ کا انعام 33
حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت 34
فاحشہ کی وضاحت اور تباہ ہونے والی قوم کا جواب 34
حضرت لوطؑ کی فریاد بارگاہِ ایزدی میں 36
فرشتے حضرت ابراہیمؑ کیلئے بشارت اور قومِ لوط کیلئے عذاب لے کر آئے 39
حضرت لوطؑ سے متعلق حضرت ابراہیمؑ کی تشویش اور اس کا جواب 39
حضرت لوط علیہ السلام کی آزردگی اور فرشتوں کی تسلی 40
قومِ لوط پر عذابِ الٰہی فرشتوں کے توسط سے 41
قومِ لوط کی بستی عقل والوں کیلئے نشانی ہے 41
مزید چند تاریخی حوالے اختصار کے ساتھ 42
حضرت شعیب علیہ السلام کی تکذیب پر اہلِ مدین پر عذاب 43

Marfat.com

عاد و ثمود کا حوالہ 43
تاریخ کے چند نمایاں متکبرین 44
خلاصۂ کلام 45
شرک اور اہلِ شرک کی تمثیل 46
اللہ تعالیٰ ہر چیز کی حقیقت سے آگاہ ہے 46
مثال کے فہم کیلئے علم شرط ہے 47
آسمان و زمین کی گواہی 48
مخالفین کی پرواہ نہ کریں اور تلاوت اور نماز کا اہتمام رکھیں 50
نماز کی تاثیر دو گونہ ہے 51
یہود کے ذکر کی وجہ اور ان سے متعلق ہدایات 52
قرآن کی دعوت کا انداز 54
آنحضرت ﷺ کی رسالت نہایت سادہ اور محکم دلیل 55
آیت کے دو مفہوم 56
اعتراض اور اس کا جواب 57
اعتراض کا دوسرا جواب 58
آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مخالفین کو تنبیہ 60
کافروں کی طرف سے استعجال بالعذاب کا مطالبہ اور اللہ تعالیٰ کا قانونِ عذاب 61
قریش کی بے بصیرتی پر تعجب کا اظہار 61
مظلوم مسلمانوں سے خطاب اور ہجرت کی ہدایات 62
ہجرت میں پیش آنے والے مصائب کا صلہ 63
اللہ تعالیٰ کی زمین کی طرح اس کا خوانِ کرم بھی وسیع ہے 64
گزشتہ ہدایات پر دلائل 65
رزق کے خزانے اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں 66
مشرکین کے فکری تضاد کی ایک مثال 66
کفار کی گمراہی کا اصل سبب 68
دنیا کے سرمستوں کی ایک مثال 69

Marfat.com

کشتی کے غافلوں اور قریش میں وحدتِ فکر و عمل 70
عقلِ عام سے ایک سوال 71
جہاد اور مجاہدہ کا مفہوم اور اہلِ ایمان کو بشارت 72

سُوْرَةُ الرُّوْم

تعارف 73
نام 73
مقامِ نزول 73
شانِ نزول 73
زمانۂ نزول 73
تاریخی پس منظر 73
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 77
سُوْرَةُ الرُّوْم 79
گزشتہ سورۃ سے ربط 81
بِضْعِ سِنِيْنَ کا مفہوم 81
ایک حقیقت کا انکشاف 82
بِنَصْرِ اللّٰهِ کا مفہوم 83
انسان کی کوتاہیِ فکر 84
آیت کا ایک اور پہلو سے مفہوم 84
انسان کو تفکر کی دعوت 85
تاریخ سے استدلال 88
قانونِ مجازات کے دن کا ذکر دلائل کے ساتھ 91
روزِ آخرت مجرموں کی حالت 91
مشرکین کی مایوسی کا سبب 92
ایک اہم حقیقت کا انکشاف 92
آخرت میں انسانوں میں تقسیم 94

Marfat.com

توحید اور قانونِ مجازات کا تقاضا 94
منکرینِ قیامت کی غلط فہمی کا ازالہ 96
انسان کا وجود قدرتِ الٰہی کا مشاہدہ 98
انسان کے وجود سے خارج کی چند نشانیاں 99
اہلِ علم کو تخلیقِ ارض وسما، زبانوں اور رنگوں کی نشانیوں کی طرف ہدایت 101
آیت کے ترجمے کی وضاحت 102
نینداور حصولِ رزق کی جدوجہد سے استدلال 102
اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر امید وبیم سے استدلال 104
ایک اور نشانی کا ذکر 105
سابقہ آیت پر دلیل 106
سابقہ دلیل کی مزید تسہیل 106
توحید پر نفسیاتی دلیل 110
ہوائے نفس کی پیروی کرنے والوں کا انجام 111
دینِ فطرت کی پیروی کا حکم 113
دینِ فطرت کے تقاضے 114
توحید کے اثبات اور شرک کا رد انسانی رویئے سے 116
مشرکین سے ایک سوال 117
انسان کی متلون مزاجی سے استدلال 118
تدبر کی دعوت 119
اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا صحیح طریقہ 120
انسانی سوچ کی اصلاح اور ربا کا مفہوم 121
شرک کی مذمت میں ایک جامع دلیل 122
بحروبر میں فساد انسانی اعمال کا نتیجہ ہے 125
تاریخ سے استدلال 127
آنحضرت ﷺ کی طرف التفات 128
قیامت میں کفر کا نتیجہ 129

Marfat.com

قیامت کے آنے کا مقصد 129
اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی 130
آنحضرت ﷺ کو تسلی 130
گزشتہ آیت کی وضاحت تاریخ کے آئینہ میں 131
اپنی قدرتِ قاہرہ کی وضاحت ایک مثال سے 132
بارش سے بعث بعد الموت پر استدلال 133
ایک استدراک 134
آنحضرت ﷺ کو تسلی 135
سماعِ موتیٰ پر استشہاد 137
توحید، قدرتِ قاہرہ اور قیامت پر دلیل 138
قیامت میں مجرمین کی کیفیت 139
صاحب ایمان وعلم کی ہوشمندی 140
قیامت یوم الجزاء ہے کسی عمل کا موقع نہیں 141
ہدایت کی ہر بات قرآن نے بیان کردی ہے، منکرین نشانی دیکھ کر بھی ہدایت قبول نہیں کرتے 141
ہٹ دھرمی دلوں پر مہر کا باعث بنتی ہے 142
دعوت کے راستے کی فیصلہ کن ہدایت 142

☆☆☆☆

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ

تعارف 144
نام 144
زمانۂ نزول 144
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 144
سُوْرَةُ لُقْمٰنَ 146
هُدًى کی وضاحت اور تسہیل 148
رہنمائی کی متعدد صورتیں 148

Marfat.com

رحمت کا مفہوم 150
محسنین کی تین صفات 151
اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم 151
اقامتِ صلوٰۃ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری 152
نماز کی پابندی نہ کرنا نفاق کی علامت ہے 153
نماز کا اہتمام بحالی امن کا پیش خیمہ ہے 155
زکوٰۃ دوسرا ستون ہے 157
زکوٰۃ سے مراد انفاق فی سبیل اللہ ہے 157
آخرت کا مفہوم 158
ایمان اور ایقان میں فرق 159
ہدایت کا تکمیلی مفہوم 160
لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا مفہوم 160
شانِ نزول 161
قریش کا اصل مرض 162
ایمان وعمل کا صلہ 163
عزیز و حکیم کی شواہد سے وضاحت 164
شرک کے ابطال میں نہایت واضح دلیل 165
حکمتِ لقمان سے استدلال 167
لقمان کی شخصیت 168
حکمت کا اولین ثمر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے 168
دفع دخلِ مقدر 169
لقمان کی پہلی نصیحت 169
نصائح کے ضمن میں جملہ معترضہ 171
دوسری نصیحت آخرت سے متعلق 172
تین نصیحتیں 173
تصعیر خد کا مفہوم اور اس سے ممانعت 174

Marfat.com

تکبر کی چال کی ممانعت 174
چال میں میانہ روی اور آواز میں فروتنی اور احساسِ ذمہ داری 175
توحید اور شکر پر دلائلِ آفاق سے استدلال 178
تسخیر کا مفہوم 178
مشرکین کا بے دلیل مجادلہ 179
بے دلیل مجادلہ کی مثال 179
لمحۂ فکریہ 180
قیامت میں تفویض و احسان کام آئیں گے 181
آنحضرت ﷺ کو تسلی 181
ایک تاثر کی اصلاح 182
مسلمات سے اتمامِ حجت 183
سابقہ حقیقت کی مزید وضاحت 183
بے شمار نشانیاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہیں 184
چند مزید نشانیوں کی طرف اشارہ 186
کائنات میں نظم و ترتیب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہے 187
گزشتہ مضمون پر ایک تمثیل 189
سابقہ آیت کے اجمال کی تفصیل 190
آخری تنبیہ 191
اسلوب میں تبدیلی 191
ایک نکتہ 191
تنبیہ پرزور 192
ایک سوال کا جواب 193
چار چیزوں سے استشہاد 193
امورِ غیب یہی پانچ ہی نہیں اور بھی ہیں 194

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ

تعارف 195
نام 195
زمانۂ نزول 195
موضوع 195
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 195
سُوْرَةُ السَّجْدَةِ 197
چند اہم باتوں کی طرف اشارہ 198
اظہار تعجب 200
قرآن حق ہے 200
قرآن کریم کے اتارنے کا مقصد 200
توحید پر اعتراض کا جواب 202
کائنات کے انتظام پر اللہ تعالیٰ کی گرفت 203
اللہ تعالیٰ کے انتظام اور تدبیر کی جامعیت 204
اللہ تعالیٰ کا حُسنِ تخلیق 205
حُسنِ تخلیق کی مثال 206
آخرت پر اعتراض کا جواب 208
آیت میں تین باتوں کی وضاحت 209
آنحضرت ﷺ کو تسلی 212
کفار کی درخواست کا جواب 213
قرآن پر ایمان لانے والوں کی صفات 214
مومن اور فاسق کا مفہوم اور ان میں عدم مساوات 216
صاحب ایمان و عمل کی جزاء 217
نافرمانوں کی سزا 217
عذاب ادنیٰ اور عذاب اکبر کا مفہوم 218

Marfat.com

باغی کی سزا کا سبب 219
ایک اعتراض کا جواب 221
مِنْ لِقَآئِهٖ میں ضمیر کے مرجع کی وضاحت 222
کتاب ہدایت کیلئے ہے 222
کتاب سے ہدایت لینے کا ثمرہ 223
پچھلی قوموں کی طرف اجمالی اشارہ 224
مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ 225

☆☆☆☆

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ

تعارف 227
نام 227
مقامِ نزول 227
تاریخی پس منظر 227
غزوۂ بنو قریظہ 231
حضرت زینبؓ سے نکاح 232
سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ 234
خطاب کا پس منظر اور اس کا مفہوم 236
گزشتہ مضمون کا تسلسل مثبت انداز میں 237
آیت میں توکل کا مفہوم 238
فکر وارادہ کے تضاد پر تنبیہ 238
تضادِ فکر وارادہ کی ایک مثال 239
تضادِ فکر کی ایک اور مثال 240
باپ کا علم نہ ہو تو پھر؟ 241
آنحضرت ﷺ کا اسلامی معاشرے میں مقام ومرتبہ 242
آنحضرت ﷺ کی بیویاں امت کی مائیں ہیں 243

Marfat.com

مسلمانوں کے ایک گروہ کے رویہ پر تنقید 243
مسلمانوں کے باہمی حقوق کی بنیاد رحمی رشتوں پر ہے 244
انبیائے کرام میں منصبی وحدت 245
میثاق لینے کی اہمیت وحکمت 246
تمہیدی کلمات کے بعد اللہ تعالیٰ کے احسانات کی یاد دہانی 249
مشرقی ومغربی دونوں سمتوں سے حملہ اور اس کی شدت 251
منافقین کی ریشہ دوانیاں 253
منافقینِ اعراب کا رویہ 253
منافقین کا عذرِ لنگ 254
منافقین کی بدعہدی 255
ادائے فرض سے پہلے فرار کبھی مفید نہیں ہوتا 256
اللہ تعالیٰ کا اختیارِ کامل 256
منافقین کا ایک اور سازشی گروہ 257
ایک غلط فہمی کا ازالہ 259
عزیمت کیلئے نمونہ اور اس راستے پر چلنے والوں کی صفات 262
مخلص مومنوں کا رویہ 263
مردانِ خاص کا طرزِ عمل 264
مسلمانوں کے ایمان واستقامت کا انعام 265
بنو قریظہ کی عہد شکنی اور اس کا انجام 266
مسلمانوں کو شاندار مستقبل کی بشارت 267
آیات کا پس منظر 269
ایک غلط فہمی کا ازالہ 270
خطاب میں وسعت اور تبدیلی کا سبب 271
ایک وضاحت 272
جزاء وسزا مقام ومرتبہ کے مطابق 272
پردے کے ابتدائی احکام اور ایک غلط فہمی کا ازالہ 273

Marfat.com

خضوع بالقول کا مفہوم 274
قَرْنَ، تبرج اور جاہلیت اولیٰ کی وضاحت 275
اہلِ بیت کے خطاب اور مصداق کی وضاحت 276
ازواجِ مطہرات کا مقصدِ زندگی 278
معاشرے کے اجزائے ترکیبی اور مرد وعورت میں عند اللہ مساوات 281
آیت کا پس منظر 284
آیت کے حکم میں عموم 286
حضرت زینبؓ سے نکاح پر اعتراضوں کا جواب 286
انعم الله عليه و انعمت عليه کا مفہوم 287
آنحضرت ﷺ کے حضرت زیدؓ کو طلاق سے روکنے کے اسباب 288
آنحضرت ﷺ کو تسلی 291
حضرات انبیاء کیلئے اللہ تعالیٰ کی سنت 291
مخالفین کے اعتراضات کا جواب اور آنحضرت ﷺ کے منصبی تقاضے 292
آپؐ کا خاتم النبیین ہونا آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے منافی نہیں 293
نبوت کے مفہوم کی تحریف ظلی اور بروزی نبوت کی ایجاد 294
مسلمانوں کو الزامات کے مقابلے میں ثابت قدمی کی تاکید 300
صلوٰۃ کا مفہوم 301
ذِکرِ الٰہی سے رحمت نازل ہوگی 301
آخرت میں اہلِ ایمان کیلئے اللہ تعالیٰ کا سلام وپیغام 302
آنحضرت ﷺ کے منصبی فرائض 303
اہلِ ایمان کو بشارت 305
آنحضرت ﷺ کو تسلی 305
ایک ضمنی سوال کا جواب 306
چند قانونی احکام کا خلاصہ 306
منافقین کے آنحضرت پر اعتراضات کا جواب اور آپؐ کے بعض امتیازات 310
خانگی زندگی کے سکون کیلئے بعض حقوق میں آپؐ کو رعایت 314

Marfat.com

نکاح کے معاملے میں آنحضرت ﷺ پر بعض پابندیاں 316
اسلامی معاشرت کے چند آداب 319
پردے کے بارے میں چند احکام 321
ان رشتوں کا ذکر جو ان احکام سے مستثنیٰ ہیں 323
آیت کا شانِ ورود 324
صلوٰۃ کا مفہوم 325
صلوٰۃ وسلام کا طریقہ 325
صلوٰۃ وسلام سے چند احتیاطی ہدایات 326
اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانے کا مفہوم 327
خواتین کیلئے گھروں سے باہر جانے کے احکام 330
جلباب کی تحقیق 330
تین عناصر 331
منافقین کو تنبیہ 332
سنت اللہ 333
وقت کے معلوم نہ ہونے سے قیامت کے حقیقت ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا 333
آنحضرت ﷺ کو تسلی 334
کافروں کو تنبیہ 335
کفار کا اظہارِ حسرت 335
مسلمانوں کی تین قسمیں 337
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہنچائی جانے والی بعض اذیتوں کا تذکرہ 338
قومِ موسیٰ کے طرزِ عمل سے بچنے کیلئے دو ہدایات 340
انسان کا اصل شرف 341
حاملِ امانت ہونے کا لازمی نتیجہ 343

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَۃُ سَبَا

تعارف 345
نام 345
زمانۂ نزول 345
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 345
سُوْرَۃُ سَبَا 347
حمد کا مفہوم 349
حکیم وخبیر سے مراد کیا ہے؟ 350
صفتِ خبیر کی وضاحت 350
ایک غلط فہمی کا ازالہ 351
قیامت صفاتِ خداوندی کا لازمی تقاضا ہے 352
قیامت کی ضرورت 352
اہلِ ایمان کو دو چیزوں کی بشارت 353
بدترین مخالفین کا انجام 353
آنحضرت ﷺ کو تسلی 354
آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں کفار کا غیر شریفانہ رویہ 354
مخالفین کی مخالفت کا اصل سبب 355
اشرافِ قریش کے سامنے حضرت داؤد علیہ السلام کی مثال 359
جبال وطیور کی ہم نوائی کا مفہوم 359
حضرت داؤد علیہ السلام کی جامعیت 360
قوت کا اخلاقی تقاضا 361
حضرت سلیمان علیہ السلام پر انعامات میں سے پہلا انعام 361
دوسرا انعام 362
تیسرا انعام 362
جنات کی خدمات 363

Marfat.com

تماثیل کے مفہوم کی وضاحت	364
اعتراضات کا جواب	365
جِفَانٍ وَقُدُوْرٍ کا مفہوم	367
نعمتوں پر شکر لازم ہے	368
حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت سے غلط عقائد کی تردید	368
کفرانِ نعمت کا انجام تاریخِ سبا کے حوالے سے	370
ناشکری کا انجام	371
اہلِ سبا پر انعامات الٰہی کی مزید تفصیل	372
اہلِ سبا کا اپنے آپ پر ظلم اور اس کا انجام	373
ناشکری شیطان کی امیدوں کو پورا کرنا ہے	374
ایک شبہ کا ازالہ	374
شرک پر کاری ضرب	377
غلط تصورِ شفاعت کی نفی	378
قول و عمل کے تضاد سے استدلال	378
احساسِ فکرمندی کی انگیخت	380
سابقہ سوال نئے اسلوب میں	381
چند حقائق کی طرف توجہ	381
مخالفین کی ضد اور استہزاء	383
قیامت کی آمد تمہاری خواہشات کے تابع نہیں	384
مخالفین کا عناد اور قیامت کے روز ان کا حال	386
گزشتہ بات کی وضاحت	387
پیروکاروں کا اپنے لیڈروں کو جواب	388
آنحضرت ﷺ کو تسلی	389
غلط فہمی کا ازالہ	390
ایک غلط تصور کی تردید	392
رزق و فضل کا صحیح مصرف	394

Marfat.com

قیامت کے دن فرشتوں کی گواہی 394
فرشتوں کا جواب 395
فرشتوں کی گواہی کے بعد پروردگار کا حکم 396
مخالفین کی ہٹ دھرمی 396
امیوں کی ناشکری اور اللہ تعالیٰ کا احسان 398
ایک نصیحت بھی اور تنبیہ بھی 399
نبی کریم ﷺ کی بے لوثی 401
ایک غلط فہمی کا ازالہ اور ایک تنبیہ 401
باطل کی بے ثباتی 402
وحیِ الٰہی کی تکذیب کا انجام 403
قیامت کے روز متکبرین کی بے بسی 404
امیدوں کا اختتام 405

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ فَاطِرِ

تعارف 406
نام 406
زمانۂ نزول 406
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 406
سُوْرَۃُ فَاطِرِ 409
اعمال کی اصلاح کا انحصار عقائد کی اصلاح پر ہے 410
عقیدۂ توحید اور حمد میں ربط 411
عقیدۂ توحید پر دلیل اور شرک کا رد 412
توحید پر ایک اور دلیل 413
الوہیت پر دلیل 414
آنحضرت ﷺ کو تسلی 415

Marfat.com

ایک تنبیہ اور دھمکی 416
شیطان کا انسان سے تعلق 417
ایک غلط تصور کی تردید 417
آنحضرت ﷺ کو تسلی 420
قیامت کے وقوع پر ایک واقعاتی دلیل 422
ایمان کے راستہ کی رکاوٹ 423
اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ایمان اور عمل ہے 423
شرک کے ایک اور عامل کی تردید 425
ایک واہمہ کی تردید 426
شرک اور شرکاء کی تردید اضداد میں سازگاری کے پہلو سے 427
فرضی معبودوں کی بے کسی دنیا اور آخرت دونوں میں 428
اللہ تعالیٰ غنی اور حمید ہے 430
ہر شخص خود اپنا مسئول ہے 432
آپ ﷺ کی دعوت خشیتِ الٰہی کے حامل اور نماز پر عامل قبول کریں گے 433
اضداد سے استدلال اور آنحضرت ﷺ کو تسلی 434
ہدایت قبول نہ کرنے والے خود اپنی ضلالت کے ذمہ دار ہیں 435
آپ ﷺ کی اصل حیثیت اور اس کی حد 436
مکذبین کی تکذیب پر تاریخ سے استدلال 437
گزشتہ مضمون کا تسلسل پیرایۂ بیان کے اختلاف کے ساتھ 440
بعض الفاظ کی تشریح 440
انواع واقسام سے استدلال ایک دوسرے پہلو سے 441
علماء کی تین صفات 443
دو صفاتِ الٰہیہ 444
اب حق کی نمائندہ یہ آخری کتاب ہے 445
کتاب اللہ کے منتخب وارث 446
منتخب حاملین کے تین طبقات 447

Marfat.com

ان منتخب لوگوں کا انجام 449
اہلِ جنت کا کلمۂ تشکر 449
کفار کا انجام 450
اللہ تعالیٰ کے عدل میں مساوات 451
جہنم میں کفار کی درخواست 451
ایک تنبیہ 454
اللہ تعالیٰ کا عدل بے لاگ ہے 455
مشرکین کا معقولیت کیخلاف رویہ 456
گزشتہ مضمون کا تسلسل 456
قریش کا اپنی روایت سے انحراف اور اس کا سبب 457
قریش برے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں 459
معذب قوموں کے آثار سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت 459
ایک شبے کا ازالہ 460

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ یٰسٓ

تعارف 461
نام 461
زمانۂ نزول 461
سورۃ کے مطالب کا تجزیہ 461
سورۃ یٰسٓ 463
آنحضرت ﷺ کی نبوت پر قرآنِ حکیم سے استدلال 464
قرآنِ کریم کی عظمت واہمیت 465
نزولِ قرآن کا مقصد اور بنی اسماعیل کو تنبیہ 466
آنحضرت ﷺ کو تسلی 467
مخالفین کے ایمان نہ لانے کا سبب 467
گزشتہ مضمون کی مزید وضاحت 468

Marfat.com

انذار کے مؤثر ہونے کی شرائط	469
آخرت کی یاددہانی	470
قریش کی عبرت کیلئے اہل قریہ کی مثال اور قریہ کا تعین	473
تین رسولوں سے مراد؟	475
اہلِ قریہ کا اعتراض	476
اعتراض کا جواب اور تنبیہ	478
تَطَيَّرْ کا مفہوم اور اس الزام کا سبب	478
طٰٓئِرُ کا مفہوم	479
ایک مخلص کی حمیتِ حق اور قوم کو دعوت	480
قوم کی ملامت کا جواب	481
شرکاء پر تنقید	482
اتمامِ حجت	482
راہِ حق کے شہید کو بشارت کا مفہوم	483
مردِ مومن کا کمالِ اخلاق	484
مکذبینِ رسول کیلئے سنتِ الٰہی	484
مکذبینِ رسول پر افسوس	485
آخری آیت کی نحوی توجیہ	486
توحید پر ربوبیت سے دلیل	488
ضمیر کا مرجع؟	489
سُبْحٰنَ کا مفہوم	490
توحید پر صفتِ تخلیق سے استدلال	490
رات اور دن کی نشانی سے استدلال	491
سورج کی نشانی سے استدلال	492
چاند کی نشانی سے دلیل	492
صفتِ تخلیق اور صفتِ ابقاء سے استدلال	494
انسان کے بگاڑ کی مثال	495
بگاڑ کی انتہا	496

Marfat.com

اخلاقی کجروی اور بے حسی 496
اَلْوَعْدُ سے مراد 497
نفخۂ ثانیہ کے بعد کی کیفیت 499
ایک غلط فہمی کا ازالہ 500
پروردگار کی طرف سے اظہارِ حقیقت 501
اہلِ جنت پر نوازشات 501
مجرموں کا حشر 502
اسلوب کی تبدیلی کا سبب 504
حیرت انگیز بات اور تنبیہ و تہدید 505
گزشتہ دھمکی پر انسانی زندگی کے احوال سے دلیل 507
آنحضرت ﷺ پر شاعر ہونے کے الزام کی تردید 508
فیصلہ کن تین کسوٹیاں 509
ایک ضروری بات 511
شانِ نزول 512
چار خصوصیات کے حامل شعراء کا استثناء 512
قرآن کے نزول کا مقصد 514
کفار کی سرکشی کے مقابلے میں رحمت کے اسلوب میں دلائلِ ربوبیت 516
مخالفین کے دلوں کی سنگینی 517
آنحضرت ﷺ کو تسلی 517
مخالفین کو اوقات یاد دلائی گئی ہے 518
مخالفین کے اعتراض کا جواب 519
ضد سے ضد کا ظہور 520
مسلمات سے دلیل 520
مخالفین کی ایک غلط فہمی کا ازالہ 521
مشرکین کی اصل کمزوری کی نشاندہی 522

☆☆☆☆

Marfat.com

سُوْرَةُ الصَّافَّاتِ

تعارف	523
نام	523
زمانۂ نزول	523
مضامین	523
سُوْرَةُ الصَّافَّاتِ	525
قسم دلیل ہوتی ہے یہاں فرشتوں کے تین گروہوں کی قسم کھائی گئی ہے	526
مقسم علیہ یعنی دعویٰ کی وضاحت	528
قدرتِ خداوندی کی وسعت اور حفاظت	529
جنات کی بے بسی اور اہلِ عرب کے مشرکانہ خیالات کی تردید	529
احوالِ قیامت سے پہلے امکانِ قیامت کی دلیل	531
متکلم اور مخاطب کی سوچ اور ذوق میں تضاد	532
بدذوقی کے نتائج	533
مزید وضاحت	533
قیامت کے منکرین کی بدحواسی سے دلیل	534
مجرمین کی میدانِ حشر میں حاضری کا ایک منظر	538
منکرین کی تذلیل	539
میدانِ حشر کا ایک اور منظر لیڈروں اور پیروں کی تو تکار	540
اللہ تعالیٰ کا فیصلہ	541
گزشتہ آیت کی مزید وضاحت	542
قریش کے طعن کا جواب	543
مجرمینِ قریش کا انجام	543
اہلِ جنت کا تذکرہ	544
اہلِ جنت کی مجلسی زندگی	545
اہلِ جنت کی پرائیویٹ زندگی	546

Marfat.com

اہلِ جنت کے مابین ایک مکالمہ 547
جنت کا حصول سب سے بڑی کامیابی ہے 548
زقوم کی وضاحت 549
زقوم کافروں کیلئے فتنہ 549
ایک بلیغ تشبیہ 550
تکلیف دہ غذا 550
جلا ڈالنے والا مشروب 551
اصل ٹھکانہ جہنم 551
گمراہی کا اصل سبب آباء پرستی ہے 552
حضرت نوحؑ کی مایوسی کے بعد دعا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت 555
آنحضرت ﷺ کو تسلی 555
حضرت نوحؑ کے ذکرِ خیر اور آپ کے پیغام کو بعد والوں میں باقی رکھا 556
حضرت نوحؑ کیلئے دنیا ہی میں اظہارِ تحسین 557
تمام محسنین کی یہی جزاء ہے 557
ایک حقیقت کا انکشاف 558
حضرت نوحؑ کے قافلۂ حق کے ایک سالار حضرت ابراہیمؑ ہیں 558
حضرت ابراہیمؑ کا اصل سرمایہ قلب سلیم ہے 559
حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید 559
مخالفین کے اعتقادات سے استدلال 560
آیت کا پس منظر اور اس کا مفہوم 561
بت خانے میں حضرت ابراہیمؑ کی ظرافت اور حمیت 562
بت کدے کے ذمہ داروں کا تجسس 562
حضرت ابراہیمؑ کی تعریض 563
حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کی سازش اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت 563
حضرت ابراہیمؑ کی محض اللہ تعالیٰ کے سہارے ہجرت 564
بیٹے کی دعا اور قبولیت 564

Marfat.com

آیت کی تشریح کے ضمن میں ایک ترتیب سے چند باتوں کی وضاحت	565
تسلیم واطاعت کا اصل مرحلہ	566
نحوی تشریح اور امتحان میں حضرت ابراہیمؑ کی فیروزمندی	567
حضرت ابراہیمؑ کی عظیم قربانی کا صلہ دائمی قربانی	567
ذبح عظیم قرار دینے کی وجہ	568
آپؑ کی جاں نثاری کی قبولیت	568
حضرت اسحاقؑ قربانی کا انعام ہیں	569
حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے پر چند سامنے کی باتیں	570
حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں سے دو رسولوں کی سرگزشت کے بعض اہم گوشوں کا تذکرہ	573
اَلْکِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ کا مفہوم	574
صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی ہدایت کا مفہوم	575
یہ ترجیع کی آیات ہیں ان کا مفہوم گزر چکا ہے	575
حضرت الیاسؑ کی ذاتی اور منصبی زندگی کی بعض تفصیلات	576
حضرت الیاس علیہ السلام کی دعوت	577
ان آیات کی تشریح ہو چکی ہے	578
حضرت لوطؑ کی دعوت قوم کا جواب اور ان کا انجام اور قریش کو تنبیہ	579
حضرت یونسؑ کی سرگزشت کے اہم واقعات	582
تسبیح (آیت کریمہ) رحمتِ خداوندی کی ضمانت ہے	484
اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور	584
قوم کی طرف مراجعت اور قوم کی خوش نصیبی	585
خاتمہ سورۃ کی آیات اور سابقہ مضمون کا اعادہ اور اختتام	586
ملائکہ سے متعلق بعض قبائل کا عقیدہ	586
غلط بات کا ثبوت مزید غلط بات سے	586
اظہار تعجب	587
اپنے موقف پر کوئی واضح دلیل کتاب سے پیش کرو	587
جنوں کا بھی اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑ رکھا ہے	588

Marfat.com

جنات کی پرستش کرنے والوں کو تنبیہ 589
حضرت جبرائیل علیہ السلام کی زبان سے فرشتوں کے مقام کی وضاحت 590
قریش کی بڑ، اور اس پر تنبیہ 591
سنت اللہ کا ذکر 591
آنحضرت ﷺ کو تسلی 592
گزشتہ امتوں کے حوالے سے قریش کو انجامِ بد سے بچنے کی ہدایت 592
خلاصۂ سورۃ 594

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ

(۲۹)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام اَلْعَنْكَبُوْتِ ہے۔ یہ نام اس سورۃ کی آیت نمبر ۴۱ سے ماخوذ ہے۔ مراد اس سے صرف یہ ہے کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں لفظ عَنْكَبُوْتِ آیا ہے۔ اس سورۃ کی آیات کی تعداد ۶۹ ہے۔ اس میں ۹۸۰ کلمات اور ۴۱۶۵ حروف ہیں۔

زمانۂ نزول:۔ حضرت حسن، عکرمہ، عطاء اور جابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ساری سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ آیت نمبر ۵۶ تا ۶۰ سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورۃ ہجرتِ حبشہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی، لیکن بعض لوگوں نے ان آیات میں ہجرت کے ذکر کو دیکھ کر یہ گمان کیا ہے کہ یہ شاید آخری ہجرت ہے جو نبی کریم ﷺ اور باقی مسلمانوں نے مدینہ کی طرف کی تھی۔ انہوں نے اس گمان کے تحت اس سورۃ کو مکہ معظمہ میں نازل ہونے والی آخری سورتوں میں شامل کیا ہے جبکہ مضامین کی اندرونی شہادت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہجرت سے مراد ہجرتِ مدینہ نہیں بلکہ ہجرتِ حبشہ ہے۔

اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں منافقین پر تنقید دیکھ کر گمان کیا گیا ہے کہ ابتدائی دس آیات مکی نہیں بلکہ مدنی ہیں، کیونکہ نفاق کا ظہور مدینہ میں ہوا تھا، مکہ میں نہیں۔ لیکن وہ یہ اندازہ نہ کر سکے کہ یہ وہ منافقین نہیں جن کا ذکر مدنی سورتوں میں کیا گیا۔ اور نہ یہ وہ نفاق ہے جس کا ظہور ہم مدینہ میں دیکھتے ہیں۔ مدینہ میں نفاق کا سبب عقائدِ جاہلیت میں عصبیت، گروہی تعصب اور مال و دولت کی محبت تھی۔ لیکن مکہ معظمہ میں یہ اسباب موجود نہیں تھے کہ مدینہ کے منافقین جیسے منافق پیدا ہوتے۔ بلکہ اس سورۃ میں جن لوگوں کے نفاق کا ذکر ہے یہ وہ لوگ ہیں جو کفار کے ظلم وستم اور جسمانی اذیتوں کے خوف سے منافقانہ روش اختیار کر رہے تھے۔ جسمانی اذیتوں کے مقابلے میں ان کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی اور بعض جگہ برادری یا ماں باپ کے دباؤ کا سامنا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لیے بعض مسلمانوں میں وہ کمزوری پیدا ہوئی جس پر ان آیات میں تنقید کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیات بجائے خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہیں اور مکی ہیں۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سورۃ کی ابتدائی آیات سے ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی ہے جس وقت مسلمانوں پر مکہ معظمہ میں مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ ہر طرح کی قرابت اور ہر طرح کے تعلق کو پامال کر دیا گیا تھا۔ اندھا مذہبی جوش ہدایت کے نور کو بجھانے کے لیے دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صادق الایمان مسلمان بری طرح ادھیڑے کھدیڑے جا رہے تھے اور کمزور مسلمانوں کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں یہ سورۃ صادق الایمان لوگوں کے لیے عزم و ہمت اور استقامت کا پیغام لے کر آئی۔ اور ضعیف

Marfat.com

الایمان لوگوں کو یاد دلایا گیا کہ تم نے ایمان کو شاید چند خیالات کی تبدیلی کے مترادف سمجھا ہے۔ اب جبکہ اس کی قیمت ادا کرنے کا وقت آیا ہے تو تمہارے حوصلے جواب دے رہے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو ہمیشہ آزماتا رہا ہے تاکہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز قائم ہو سکے اور مومن اور منافق کھل کر سامنے آ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی کفارِ مکہ کو تہدید کی گئی ہے کہ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آج انہیں ظلم و ستم کی جو ڈھیل ملی ہوئی ہے اس سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ خدا کی گرفت سے باہر ہیں اور مخلص مسلمانوں کو نوید سنائی گئی ہے کہ تم آج ایمان کی راہ میں جو دکھ جھیل رہے ہو اس سے کہیں بڑھ کر تم اس کا صلہ پانے والے ہو۔

ایمان لانے والے نوجوان عام لوگوں کی اذیت رسانی کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے گھروں میں ایک عجیب طرح کے امتحان سے گزر رہے تھے۔ ان کے والدین بار بار ان پر زور ڈال رہے تھے کہ ہر مذہب کی طرح تمہارا یہ نوزائیدہ مذہب والدین کے احترام اور اطاعت کا حکم دیتا ہے۔ ہم اپنے اس حق کے تحت جو ہمیں مذہب نے دے رکھا ہے تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم محمد ﷺ کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ تم اپنے مذہب کے مطابق ماں باپ کی نافرمانی کے جرم میں پکڑے جاؤ گے۔ مسلمان نوجوانوں کو اس مخمصے سے نکالنے کے لیے والدین اور بزرگوں کی اطاعت کی حدود کی وضاحت کی گئی ہے کہ والدین یقیناً احترام اور اطاعت کا حق رکھتے ہیں لیکن یہ حق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مطالبہ کریں تو پھر ان کا حکم ماننے کی ہرگز اجازت نہیں، کیونکہ کسی بھی مخلوق کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں جائز نہیں۔

بعض نومسلموں سے ان کے قبیلے کے بزرگ یا غلاموں سے ان کے آقا یہ مطالبہ کرتے تھے کہ ہم تمہارے ہر طرح کے عذاب و ثواب کی ذمہ داری لیتے ہیں، تم ہماری بات مانو اور محمد ﷺ کا ساتھ چھوڑ دو۔ اور اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت کا اندیشہ ہوا تو ہم خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پیش کر دیں گے کہ ہم نے ان کی ذمہ داری لے رکھی ہے، آپ ان کی جگہ ہمیں پکڑ لیں۔ اس واہمے کا ازالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی دوسرے کے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوگا، وہاں ہر شخص کو اپنے اعمال کی خود جواب دہی کرنا ہوگی۔

مختصر یہ کہ ان آیات میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

(۱) جو شخص بھی راہِ حق کا مسافر بنتا ہے اس کے ایمان کو امتحان کے متعدد مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ اور یہی کسوٹی ہے جس پر دعویٰ ایمان کی صداقت کو جانچا جاتا ہے۔ یہ اس راہ کی لازمی سنت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد حق کا معیار صرف اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ٹھہرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں نہ رشتوں کی کوئی اہمیت ہے اور نہ قرابتوں کی۔ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کی کی جاتی ہے باقی تمام رشتے اس کے تابع ہیں۔

(۳) دشمنانِ دین کو آگاہی کہ تم اہلِ حق کو جس طرح فتنوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہو یاد رکھو تم اللہ تعالیٰ کی گرفت سے باہر نہیں ہو۔ کسی وقت بھی اس وبال میں پکڑے جا سکتے ہو۔

محولہ بالا تینوں باتوں کی تائید کے لیے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، مدین، عاد، ثمود، قارون، فرعون اور ہامان کے واقعات اجمالی طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ اور ان واقعات کے شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ آج جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے یہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ اور جو کچھ دشمنانِ حق کر رہے ہیں ان میں بھی کوئی بات نئی نہیں ہے۔ لیکن ان تمام واقعات میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اہلِ حق ایک مدت تک ستائے جاتے ہیں لیکن اجر و ثواب اور فوز و فلاح ہمیشہ ان کا مقدر بنتی ہے۔ اور اہلِ باطل ہمیشہ اپنے کرتوتوں کی پاداش میں پکڑے جاتے اور سامانِ عبرت بن جاتے ہیں۔

Marfat.com

اس کے بعد مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر ظلم وستم تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے تو ایمان چھوڑنے کی بجائے گھر بار اور وطن چھوڑ کر ہجرت کر جانا۔ اللہ تعالیٰ کی زمین بہت وسیع ہے۔ کہیں نہ کہیں ایسی جگہ ضرور مل جائے گی جہاں تم اللہ تعالیٰ کی بندگی کر سکو۔ اور زندگی کے وسائل بھی اللہ تعالیٰ ضرور مہیا فرمائے گا۔

مسلمانوں کو حوصلہ دینے کے لیے ان لوگوں کے زور واثر کی اصل حقیقت کو جو دوسرے سہاروں کے بل پر اللہ تعالیٰ کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے ایک تمثیل کے ذریعے سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کی تمام سعی وتدبیر کی مثال مکڑی کے جالے کی ہے جس سے زیادہ کمزور اور بے بنیاد تعمیر کوئی بھی نہیں ہو سکتی۔ بظاہر یہ لوگ بڑے قوی معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت ان کی اس سے مختلف نہیں۔ مزید فرمایا گیا ہے کہ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ غائت اور حکمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو بنایا ہے۔ اور وہ غائت وحکمت ایک دن لازماً ظہور میں آئے گی۔ آنحضرت ﷺ کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ تمام مخالفتوں سے بے پرواہ ہو کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی کتاب سنائیں اور نماز کا اہتمام کریں۔ اسی نماز کے اندر اہلِ ایمان کے لیے تمام شرور وآفات سے امان ہے اور یہی طاقت کا اصل خزانہ ہے۔

ان تمام ہدایات کے ساتھ ساتھ اہلِ کتاب کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو وہ آنحضرت ﷺ کی رسالت پر کرتے تھے۔ اور توحید اور معاد پر مشرکین کے مسلمات سے ان پر حجت قائم کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان کو ملامت بھی کی گئی ہے کہ اس سرزمین میں تمہیں امن ورفاہیت تو اللہ تعالیٰ کے حرم کی بدولت حاصل ہوئی، لیکن تم اس کی نعمت کی ناشکری کر رہے ہو۔ اور عین خدا کے حرم میں بیٹھ کر اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے گن گا رہے ہو۔ پھر آخر میں ناشکری کا جو انجام سامنے آنے والا ہے اس کو بیان فرمایا گیا ہے اور اہلِ حق کو اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت کی بشارت دی گئی ہے۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ٧	سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ (٢٩)	اٰيَاتُهَا ٦٩

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ
لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿٢﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ
اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٣﴾ اَمْ حَسِبَ
الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿٤﴾
مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٥﴾ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ
الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٧﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ
حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ
فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٨﴾
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴿٩﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ

Marfat.com

فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ
لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ
خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ
لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۫ وَ
لَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع

رکوع: ا۔ (ال م ...... یہ حروف مقطعات میں سے ہے اور اس کی بحث اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ ۱) کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔ ۲) حالانکہ ہم ان لوگوں کی بھی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں، سو اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۳) اور کیا وہ لوگ جو بری حرکتیں کر رہے ہیں وہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے، بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۴) جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہے وہ اطمینان رکھے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت ضرور آ کے رہے گا، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۵) اور جو شخص بھی جدوجہد کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے جدوجہد کرے گا، بے شک اللہ دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے۔ ۶) جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو ہم ان کی برائیاں ان پر سے جھاڑ دیں گے اور ان کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دینگے۔ ۷) اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کر اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر، میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے پھر میں تم کو بتادوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ ۸) اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو ضرور صالحین

Marfat.com

میں داخل کریں گے۔ ۹) اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، لیکن جب انہیں اللہ کی راہ میں ستایا گیا تو انہوں نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔ اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آ گئی تو کہیں گے ہم تو تمہارے ساتھ تھے، کیا لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر نہیں ہے۔ ۱۰) اور اللہ ایمان والوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۱۱) اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے راستے کی پیروی کرو اور ہم تمہاری خطاؤں کو اپنے اوپر لے لیں گے حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں، بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ ۱۲) وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی اور یقیناً قیامت کے روز ان سے پوچھا جائے گا ان کی بابت جو وہ افترا کرتے رہے ہیں۔ ۱۳)

الٓمّٓ ۝۱

(ا ل م ...... یہ حروف مقطعات میں سے ہے اور اس کی بحث اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ ۱)

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝۲

(کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔ ۲)

آیات کا پس منظر

یہ آیات اس زمانے میں نازل ہوئی ہیں جب مکہ کی سرزمین مسلمانوں کے لیے آزمائشوں کی بھٹی بنی ہوئی تھی۔ جو شخص اسلام قبول کرتا، اہل مکہ کا غیظ و غضب بری طرح اس پر حملہ آور ہوتا۔ اگر اس کا تعلق کسی غریب گھرانے سے ہوتا یا وہ غلام ہوتا تو مکے کی ریت تپ اٹھتی، چٹانیں گرم ہو جاتیں، مکے کے اشرار ایسے لوگوں کو گرم ریت پر گھسیٹتے، دہکتی چٹانوں پر لٹاتے اور سینے پر سل رکھ دیتے اور کہتے کہ جب تک تم اسلام چھوڑنے کا اعلان نہیں کرو گے یا اللہ اور رسول کے بارے میں کوئی نازیبا بات منہ سے نہیں نکالو گے اس وقت تک تمہاری جان نہیں چھوٹے گی۔ اگر کوئی شخص ہنرمند اور پیشہ ور ہوتا تو اس کی روزی کے دروازے بند کر دیے جاتے۔ اور اگر کوئی تاجر ہوتا تو اس کا بائیکاٹ کر دیا جاتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ لوگ بھوکوں مرنے پر مجبور ہو جاتے۔ اور اگر ایمان لانے والوں میں کوئی شخص کسی بااثر خاندان کا آدمی ہوتا تو اس کے اپنے خاندان کے لوگ اس کے لیے زندگی دشوار کر دیتے۔ نبی کریم ﷺ جو مکہ کے سابق سردار کے پوتے اور مکہ کی سب سے ہردلعزیز شخصیت تھے ان شرپسندوں کی اذیتوں سے محفوظ نہیں تھے۔ ان حالات نے عجیب صورتحال پیدا کر دی تھی کہ جو لوگ دلوں میں آنحضرت ﷺ کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے وہ ان مصائب کو دیکھ کر آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے۔ اور وہ صادق الایمان لوگ جو زندگی کی ہر ضرورت اور نعمت پر

Marfat.com

ایمان کو ترجیح دے رہے تھے انہیں مصائب کے ایسے شکنجوں میں کسا جا رہا تھا کہ ان کی قوتِ برداشت شکست و ریخت کا شکار ہونے لگی تھی۔ حضرت خباب بن ارتؓ نہایت راسخ الایمان صحابہ میں سے تھے۔ کافروں نے ان کی اذیت کو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ دہکتے انگاروں پر انہیں لٹایا جاتا، ان کی چربی پگھل کر انگاروں کو سرد کرتی تو تب ان کی خلاصی ہوتی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں مشرکین کی سختیوں سے ہم بری طرح تنگ آئے ہوئے تھے، ایک روز میں نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ کعبہ کی دیوار کے سائے میں تشریف رکھتے ہیں، میں نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ ہمارے لیے دعا نہیں فرماتے۔ یہ سن کر آپؐ کا چہرہ جوش اور جذبے سے سرخ ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا تم سے پہلے جو اہلِ ایمان گزر چکے ہیں ان پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر بٹھایا جاتا اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے، کسی کے جوڑوں پر لوہے کے کنگھے گھسے جاتے تاکہ وہ ایمان سے باز آ جائے۔ خدا کی قسم یہ کام پورا ہو کے رہے گا یہاں تک کہ ایک شخص صنعاء سے حضر موت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہ ہو گا جس کا وہ خوف کرے۔

ان آیات میں انہیں احساسات اور انفعالات کا جواب دیا گیا ہے۔ اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ دنیا میں ایمان ایک ایسی وابستگی کا نام ہے جس سے زیادہ مؤثر، وسیع اور گہرے اثرات رکھنے والی اور کوئی وابستگی نہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی تمام صفات کے ساتھ ہمہ قسم کی دلبستگی کا اقرار، آنحضرت ﷺ پر اعتماد، آپؐ کی اطاعت اور آپؐ سے محبت کا دعویٰ اور قیامت کے دن از سرِ نو جی اٹھنے، اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہونے اور اپنے ہر عمل کے بارے میں جواب دہی کرنے اور جزاء و سزا کے ابدی قانون پر یقین جیسے عوامل شامل ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ عہد بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول پر جو کچھ دین کے حوالے سے نازل ہوا ہے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مکمل طور پر نافذ بھی کرنا ہے۔ ایسی جامع و مانع قسم کی وابستگی کا اقرار و اعلان کیسے ممکن ہے کہ بغیر آزمائش اور بغیر امتحان کے قبول کر لیا جائے۔ یہ تو ایک ایسی محبت کا دعویٰ ہے جو ہمیشہ آزمائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی خود سپردگی اور خود فروشی ہے جسے قدم قدم پر اپنی سچائی کا امتحان دینا پڑتا ہے۔ ٹھیک کہا کسی نے:

محبت کے مقدر میں ہے کہاں آرام اے ہمدم
کہیں شعلہ، کہیں بجلی، کہیں سیماب ہوتی ہے

راہِ حق میں آزمائشیں ضرور پیش آتی ہیں

یہی وہ بات ہے جو پروردگار اہلِ ایمان کو پیشِ نظر آیت میں سمجھا رہا ہے کہ ہم نے اہلِ ایمان کے ساتھ دنیا و آخرت میں کامیابیوں کے جو وعدے کر رکھے ہیں ان کا ایفاء مجرد دعویٰ ایمان پر تو نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک کوئی شخص آزمائشوں کی بھٹی سے گزر کر اپنا استحقاق ثابت نہیں کرتا اس وقت تک اسے اللہ تعالیٰ کے وعدے نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی جنت اس قدر سستی نہیں۔ اور نہ دنیا میں اہلِ ایمان پر ہونے والی عنایات اس قدر ارزاں ہیں کہ صرف دعویٰ ایمان اس کے لیے کافی ہو جائے۔ اس کے لیے تو امتحان شرط ہے۔ ایسا امتحان جس میں جان و مال کی قربانی بھی ہے اور مصائب و مشکلات کی برداشت بھی۔ جس میں خوف کے مراحل بھی ہیں اور ہوسنا کی کی کھائیاں بھی۔ جب تک آزمائشوں کے ان مراحل سے کوئی شخص کامیابی کے ساتھ نہیں گزر جاتا اس وقت تک ایمان کے صادق یا کاذب ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳

(حالانکہ ہم ان لوگوں کی بھی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں، سو اللہ ان لوگوں کو ممیز کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۳)

سابقہ آیت کے مضمون کی تاکید و تائید

اس آیتِ کریمہ میں سابقہ آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے نہایت مؤکد انداز میں اس کی تائید و تاکید فرمائی گئی ہے یعنی یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہے جو صرف آپ لوگوں کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ تاریخ مذہب اٹھا کے دیکھ لیجیے آپ کو نظر آئے گا کہ تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب بھی کچھ لوگ ایمان و اسلام کا دعویٰ لے کر اٹھے ہیں ہمیشہ ان کو آزمائشوں میں ڈال کر آزمایا گیا ہے۔ چنانچہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون رہا ہے کہ وہ آزمائشوں میں ڈال کر سچے اور کھرے ثابت ہونے والے لوگوں کو جھوٹے اور کمزور لوگوں سے ممیز کر دیں۔ اور دیکھنے والے خود جان لیں کہ ان میں راست باز کون ہے اور جھوٹا مدعی کون ہے۔ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علمِ محیط کا مالک ہے اسے آزمائشوں میں ڈال کر جاننے کی کیا ضرورت ہے وہ تو خود جانتا ہے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے۔ لیکن ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو کوتاہیِ فکر کا شکار ہو، ورنہ یہ بات سب پر آشکارا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ جزاء و سزا کا معاملہ مجرد اپنے علم کی بنیاد پر نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے عمل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک کو امتحان میں ڈال کر پرکھتا ہے اور اسی امتحان سے ہر ایک کے مدارج معین کرتا ہے۔ ویسے بھی جب تک کسی شخص سے عمل کی صورت میں اس کے اندر کی صلاحیتوں کا اظہار نہیں ہوتا اس وقت تک عدل و انصاف کے نقطۂ نگاہ سے نہ اسے کسی انعام کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے اور نہ کسی سزا کا سزاوار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آزمائشوں کا یہ سلسلہ جس طرح کسی بھی دعویٰ کی صداقت کی دلیل ہے اسی طرح شخصیت کی تعمیر کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ جیسے جیسے آدمی آزمائش سے گزرتا ہے اس کے اندر صلابتِ فکر کے ساتھ ساتھ عمل کی پختگی بھی وجود میں آتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے امتحان اور نازک سے نازک مرحلے میں کسی کمزوری کا شکار نہیں ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت پیشِ نظر رہے کہ کسی نظریے کی صداقت کے لیے جب اس نظریے کا داعی اور مدعی تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کرتا ہے تو دیکھنے والی نگاہیں اور محسوس کرنے والے دل اس نظریے کی صداقت پر یقین لائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے اندر سے یہ آواز آتی ہے کہ اگر اس نظریے میں کوئی کمزوری ہوتی تو اس کے لیے مصائب برداشت کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اور اس کے لیے جان دینے کا عزم تو افسانے سے زیادہ کوئی حقیقت نہ رکھتا۔ لیکن جب ہم اسے عملی صورت میں ڈھلتا دیکھتے ہیں تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ یہ صداقت کی ایک ایسی دلیل ہے جس سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۴

(اور کیا وہ لوگ جو بری حرکتیں کر رہے ہیں وہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے، بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۴)

Marfat.com

مخالفین کو تنبیہ

آیت کے الفاظ میں اگرچہ عموم پایا جاتا ہے لیکن سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ روئے سخن قریش کے ان ظالم سرداروں کی طرف ہے جو اسلام کی مخالفت میں اور مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچانے میں پیش پیش تھے۔ مسلمانوں کو ان ظالم سرداروں کی طرف سے پہنچائی جانے والی اذیتوں پر صبر وثبات کی تلقین کرنے کے بعد ان ظالموں کو بھی تنبیہ کی جا رہی ہے کہ ان لوگوں نے شاید یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ اسی طرح مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑتے رہیں گے اور کوئی ہاتھ انہیں پکڑنے والا نہیں ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کو لاوارث سمجھتے ہیں۔ اس لیے نہ تو انہیں مسلمانوں کی طرف سے کسی سخت ردِعمل کا اندیشہ ہے اور نہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کبھی کوئی غیبی ہاتھ ان کی گرفت بھی کر سکتا ہے۔ اس لیے وہ روز بروز اذیت رسانی میں دلیر ہوتے جا رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی آزمائش کے لیے انہیں جو ڈھیل دے رکھی ہے وہ ہمیشہ کے لیے نہیں۔ جیسے ہر فصل کے بار آور ہونے، ہر پھل کے پکنے اور ہر وجود کے بالغ ہونے کا ایک وقت ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دین کی فصل بھی اپنے وقت پر بار آور ہو کے رہے گی۔ آج کے کمزور کل کو طاقتور ہو جائیں گے۔ مزید اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ کفارِ قریش کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ہم سے سبقت لے جائیں گے کیونکہ ہم نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اسے تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کر دے اور قریش ہمارے رسول اور اس کی تبلیغی کاوشوں کو ناکام کر دینے پر تلے ہوئے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نوزائیدہ دین اور اس کی بنیاد پر اٹھنے والی ایک قوت بہت جلد ناکامی سے ہمکنار ہوگی اور ہم اس کا راستہ روکنے میں کامیاب ہو جائیں گے، یہ ان کی خام خیالی ہے اور ان کا بہت برا فیصلہ ہے جو وہ حالات کے تناظر میں کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا دین غالب آ کر رہے گا اور جب اللہ تعالیٰ ان پر ہاتھ ڈالے گا تو کوئی انہیں بچا نہ سکے گا۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۵﴾

(جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہے وہ اطمینان رکھے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت ضرور آ کے رہے گا، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۵)

مسلمانوں کو تسلی

اس آیت میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ مکے میں اسلام کے نفوذ کی رفتار اگرچہ بہت سست ہے اور دوسری طرف دشمنانِ اسلام کی اذیت رسانیاں ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔ جو شخص بھی منطقی انداز میں اس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ نکالے گا اس کی پریشانی میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ لیکن جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور فیصلوں پر یقین رکھتا اور اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت کو جانتا ہے اس کے لیے پریشانی کا کوئی موقع نہیں۔ اسے معلوم ہے کہ ہر ابتداء کی ایک انتہاء اور ہر عمل کے نتیجہ خیز ہونے کا ایک وقت مقرر ہے۔ چولہے پر چڑھی ہوئی ہنڈیا کو جب مطلوب حرارت پہنچ جاتی ہے تو وہ ضرور ابلتی ہے اور پانی کو جمنے کے لیے جب مطلوب برودت مل جاتی ہے تو وہ ضرور جم جاتا ہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں مسلمانوں کے اخلاص کو کبھی بے نتیجہ نہیں چھوڑا جاتا۔ ان کی تبلیغی کاوشیں، ان کی سرفروشیاں اور ان کا اخلاص اس وقت ضرور کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اسی حوالے سے اس آیت میں پروردگار تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے جو وقت طے کر رکھا ہے

Marfat.com

وہ آنے ہی والا ہے۔ کیونکہ جو کچھ آپ کے ساتھ گزر رہی ہے اور آپ جس کے لیے شب و روز اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے ہیں اور جس طرح دین کی سربلندی کے لیے آپ قربانیاں دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب باتوں کو سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔

آیت کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ مسلمان اسلام کی تبلیغ و دعوت اور اس کی سربلندی کے سلسلے میں جو قربانیاں دے رہے ہیں ان کے پیشِ نظر آخرت کی کامیابی ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ یہاں کی ایک ایک تکلیف قیامت کے دن اجر و ثواب کا نخلستان بن جائے گی۔ کسی کو کانٹا بھی چبھا ہے تو اسے پھولوں میں تولا جائے گا۔ ان مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو مدت ٹھہرا رکھی ہے وہ لازماً پوری ہو کے رہے گی۔ ایک دن مسلمان اپنے رب سے ملیں گے اور ایک ایک محنت اور قربانی کا صلہ پائیں گے اور اس وقت آرزو کریں گے کاش ہمیں اس راستے میں اس سے بھی بڑھ کر ستایا گیا ہوتا تو ہم اس سے بھی بڑھ کر اجر و ثواب کی دولت سے بہرہ ور ہوتے۔

بعض اہلِ علم نے اس کا ایک اور مطلب لیا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص حیاتِ اخروی کا قائل ہی نہ ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ کوئی ذات ایسی نہیں جس کے سامنے ہمیں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہو اور کوئی وقت ایسا نہیں جب ہم سے ہمارے کارنامۂ زندگی کا محاسبہ کیا جائے، اس کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ لیکن جو لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ ایک وقت ہمیں اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے انہیں اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ موت کا وقت کچھ بہت دور ہے۔ ان کو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بس قریب ہی آلگا ہے اور عمل کی مہلت ختم ہوا ہی چاہتی ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَلَمِينَ ۝٦

(اور جو شخص بھی جدوجہد کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے جدوجہد کرے گا، بے شک اللہ دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے۔ ۶)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیتِ کریمہ میں ایک بہت بڑی غلط فہمی پر توجہ دلائی جارہی ہے۔ راسخ الایمان صحابہ کرامؓ کے بارے میں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن وہ لوگ جو نئے نئے دائرۂ ایمان میں آتے یا اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوتے، لیکن کفار کی بے پناہ مخالفت کو دیکھ کر یہ سمجھ کر پیچھے ہٹ جاتے کہ یہ بہت کٹھن راستہ ہے جس پر ہم نہیں چل سکتے۔ ایسے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی نشر و اشاعت، تبلیغ و دعوت، لوگوں میں اس کے نفوذ اور غلبے کے لیے جو جدوجہد کی جاتی ہے وہ محض ایک نظریاتی آویزش میں حصہ لینے کے مترادف نہیں۔ اور نہ ایسا ہے کہ دینیات یا الٰہیات کی ایک بحث ہے جسے بہر صورت غالب کرنے کی ایک کوشش ہے بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے لیے تگ و دو کرنے والا ایک شخص جدوجہد میں کبھی ہراساں نہیں ہوتا، کبھی اسے کافی نہیں سمجھتا اور کبھی اپنے لیے اسے بوجھ خیال نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی شخص اسے روکنا بھی چاہے تو وہ اسے اپنے ساتھ دشمنی سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی ضروریات کی فراہمی کا نام ہے جس میں اگر کھانے پینے کی ضروریات پوری ہوجاتی ہیں تو مکان کے لیے تگ و دو شروع ہوجاتی ہے، مکان بن جاتا ہے تو بچوں کا مستقبل سنوارنے کی خلش دل میں اتر جاتی ہے۔ اور پھر خوب سے خوب تر کے حصول میں زندگی کا ہر لمحہ نچڑ کر رہ جاتا ہے تاآنکہ بڑھاپا آدمی کو مفلوج کردیتا ہے اور یا موت کام تمام کردیتی ہے۔ بالکل اسی طرح دین بھی انسانی زندگی کی سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے

Marfat.com

بغیر کوئی شخص نہ معرفتِ حق سے بہرہ ور ہوتا ہے اور نہ کائنات کے بارے میں اسے اپنی الجھنوں کا جواب ملتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے فکر مند ہوتا ہے تو دین ہی اسے بنیادی تصورات فراہم کرتا ہے، طریقۂ کار تجویز کرتا ہے اور اہداف کا تعین کرتا ہے۔ وہ معاشرے کا کارآمد حصہ بننے کے لیے شادی کرنا چاہتا ہے تو دین ہی اسے رہنمائی دیتا ہے۔ اولاد ہوتی ہے اور وہ ان کی تربیت کے لیے سرگرداں ہے تو دین اس کی اس سرگرانی کا علاج تجویز کرتا ہے۔ وہ اپنے گھر کو آسودگی کا مرکز بنانا چاہتا ہے تو دین ہی اس کے گھر میں ماں باپ کی شفقت اور اولاد کی اطاعت کے پھولوں کی تخم ریزی کرتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس زندگی اپنے انفرادی اور اجتماعی اداروں میں جہاں تہاں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے وہیں ہمیں دین کا نور اس کے دل میں جگمگاتا اور اس کا راستہ روشن کرتا نظر آتا ہے۔ ایسی بنیادی ضرورت جس کے بغیر زندگی گھٹنوں چلنے پر بھی قادر نہیں۔ اگر اس جدوجہد میں کوئی تکلیف ہوتی یا کوئی محنت کرنی پڑتی ہے یا مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو اس کی شکایت کرنے کی بجائے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ تو اس راہ کی وہ سنتیں ہیں جس کے بغیر اس راستے میں کوئی شخص کامیابی سے چلنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ دین بظاہر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور اس کا جلیل القدر رسول ہر طرح کا دکھ اٹھا کر لوگوں تک اسے پہنچاتا ہے لیکن کاش اس بات کو ذہن نشین کر لیا جائے کہ یہ تو میری اپنی ضرورت اور میرا اپنا بنیادی فریضہ ہے جسے دوسری ضرورتوں کی طرح مجھے بہر صورت انجام دینا ہے۔ اس کے لیے کی جانے والی محنت اور اس راستے میں اٹھائے جانے والے مصائب اللہ تعالیٰ پر احسان نہیں، بلکہ دوسری ضرورتوں کی طرح اس راستے کی ایک لازمی سنت اور ایک لازمی تقاضا ہے جسے بہر صورت انجام دینا ہے۔ اور اگر اس کے انجام دینے کی فکر نہیں کی جائے گی تو نقصان اپنا ہوگا، اللہ تعالیٰ تو دنیا جہان والوں سے غنی ہے اس کی ولایت اور حکومت میں کسی قسم کے فرق آجانے کا اندیشہ نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ ٧

(جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو ہم ان کی برائیاں ان پر سے جھاڑ دیں گے اور ان کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دینگے۔ ۷)

اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت

ایمان و عمل کی راہ میں اٹھائی جانے والی تکلیفیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے کی جانے والی جدوجہد اگرچہ انسان کی اپنی ضرورت ہے اسی سے اسے آسودہ زندگی میسر آسکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا کہنا، پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ جو بھی ایمان لائیں گے یعنی ان تمام بنیادی صداقتوں کو سچے دل سے تسلیم کریں گے جنہیں تسلیم کرنے کی دعوت اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کی کتاب نے دی ہے اور عملِ صالحہ کریں گے یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ہدایت کے مطابق زندگی میں ہر کام کو سرانجام دیں گے۔ ان کے دل و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے دل کی دھڑکنیں، ان کے خیالات اور ارادے سب اللہ تعالیٰ کی شریعت کے پابند ہوں گے۔ ان کی زبان ہر برائی سے محفوظ اور ہر نیکی کی پرچارک ہوگی۔ ان کی توانائیاں حق و انصاف اور راستی کے قیام میں صرف ہوں گی۔ اور ان کے تمام اعضاء و جوارح اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی میں اور اس کے احکام و قوانین کی پابندی میں کام کریں گے۔ ایسے صاحبِ ایمان اور صاحبِ عمل لوگوں کی جزاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان سے پہلے کیے ہوئے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کو معاف کر دیں

Marfat.com

گے اور جھاڑ دیں گے۔ اور ان کی نیکیوں کا بدلہ اس طرح عطا فرمائیں گے جیسے بہترین اعمال کا بدلہ دیا جاتا ہے۔ جو شخص ایک نیکی کرے گا اسے دس گنا ثواب دیا جائے گا اور جیسے جیسے اخلاص میں ترقی ہوتی جائے گی ویسے ویسے اجر و ثواب بھی بڑھتا چلا جائے گا۔ یہ وہ رحمت کا معاملہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ محض اپنے فضل و کرم سے فرمائیں گے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞ ۸

(اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ہے اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی کو میرا شریک ٹھہرا جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر، میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے پھر میں تم کو بتا دوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ ۸)

اللہ تعالیٰ اور والدین کے حقوق میں کلمۃ الفصل

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کی جن آزمائشوں کا ذکر ہوا ہے اور جس میں ثبات و استقلال کی مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے ان آزمائشوں میں ایک بڑا حصہ اس آزمائش کا بھی تھا جو اسلام لانے والے نوجوانوں کو اپنے کافر باپوں اور سرپرستوں کے ہاتھوں پیش آرہی تھی۔ اسلام نے دیگر مذاہب کی طرح بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے کی ترغیب دی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے بعد ان کے حق کا ذکر فرمایا ہے۔ ماں باپ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اسی حق کے حوالے سے اپنی اولاد کو اسلام لانے سے روکتے تھے۔ اور چونکہ اسلام نے ان کی اطاعت کا حکم دیا تھا اس لیے ایمان لانے والے نوجوانوں کو بڑی الجھن پیش آرہی تھی کہ ایک طرف اسلام کی حقانیت ہمیں اپنی طرف بلا رہی ہے اور دوسری طرف والدین کا حقِ اطاعت راستے میں حائل ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس الجھن کو دور کرنے کے لیے پروردگار نے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس بات کی وضاحت فرمائی۔ یوں تو یہ آیت نہ جانے کس کس نوجوان مسلمان کی الجھنوں کا جواب ثابت ہوئی ہوگی لیکن مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ اٹھارہ انیس سال کے تھے جب انہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی ماں حمنہ بنتِ سفیان بن امیہ ابوسفیان کی بھتیجی تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ بیٹا مسلمان ہوگیا ہے تو اس نے کہا کہ جب تک تو محمد (ﷺ) کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور نہ سائے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ تو میری بات کو نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کرے گا۔ حضرت سعدؓ اس پر سخت پریشان ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں ماں باپ کے حوالے سے مسلمانوں کو جو اصولی ہدایات دی گئیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلی یہ بات ارشاد فرمائی کہ ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تلقین اللہ تعالیٰ نے ہر مذہب میں کی ہے۔ اور اپنے حق کے بعد تمام حقوق میں ماں باپ کے حقِ اطاعت کو سب سے مقدم کیا ہے، لیکن یہ حق غیر مشروط اور علی الاطلاق نہیں۔ والدین غیر مسلم بھی ہوں جب بھی ان کا احترام اور ان کی ضروریات کی بہم رسانی اسلام کی

Marfat.com

تعلیمات میں شامل ہے۔لیکن اگر وہ کوئی ایسا حکم دیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہو اور اس سے پروردگار کی معصیت لازم آتی ہو تو پھر ان کی اطلاعت کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔اسلام کا قانون یہ ہے کہ **لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق** ''خالق کے حکم کے خلاف کسی مخلوق کی اطاعت بھی جائز نہیں۔''

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ اگر ماں باپ اپنی اطاعت کے لیے اولاد پر زور ڈالیں اور ہر ممکن اصرار سے کام لیں تو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف نہ صرف والدین کا حکم ماننا جائز نہیں بلکہ ان کے اصرار کو رد کر دینا بھی واجب ہے۔کیونکہ انہیں جو بھی حق ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حق کے تابع ہے۔ان کی اطاعت دنیوی معاملات تک ہے وہ دین کے کسی معاملے میں دخل دینے کے مجاز نہیں۔اور اس معاملے میں ان کا اصرار اور ان کا زور دینا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے حقِ اطاعت کو محض ایک نصیحت قرار نہیں دیا بلکہ اسے مامور ٹھہرایا ہے۔ توصیة یہاں ہدایت دینے کے مفہوم میں ہے۔اس میں ایک تاکید اور قطعیت پائی جاتی ہے۔اس قدر اہمیت کے ساتھ والدین کے حقِ اطاعت کو بیان کرنے کے بعد اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ مشروط کر دیا۔بلکہ یہ تک فرمایا کہ اگر وہ کسی بات پر مجبور بھی کریں اور دباؤ بھی ڈالیں تو جب بھی ان کا حکم اللہ تعالیٰ کے تابع رہے گا۔ان کی کسی بات کو اس لیے تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ یہ ان کا حکم ہے۔ اطاعت کے لیے علم شرط ہے۔جب تک اس بات کا علم نہ ہو جائے کہ والدین جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے عِلمِ وحی کی تائید بھی حاصل ہے، اس وقت تک ان کے حکم کی کوئی قیمت نہیں۔کسی بیٹے یا بیٹی کے لیے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ وہ صرف اس بنا پر ماں باپ کے مذہب کی پیروی کریں کہ یہ اس کے ماں باپ کا مذہب ہے۔اگر اولاد کو یہ علم حاصل ہو جائے کہ والدین کا مذہب غلط ہے تو اسے اس مذہب کو چھوڑ کر صحیح مذہب اختیار کرنا چاہیے اور ان کے دباؤ ڈالنے پر بھی اس طریقے کی پیروی نہ کرنا چاہیے جس کی گمراہی اس پر کھل چکی ہے۔ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ کا یہی مفہوم ہے۔بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ شرک کی نفی کی دلیل ہے۔کیونکہ جہاں تک ایک خدا کا تعلق ہے وہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے جس کو ایک مشرک بھی بہرحال مانتا ہے۔رہے دوسرے اس کے شریک تو ان کی دلیل پیش کرنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو ان کو شریکِ خدا ٹھہراتے ہیں۔اور جب تک ان کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو کسی عاقل کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ ان کو خدائی میں شریک کر کے ان کی غلامی کا قلادہ بھی اپنی گردن میں ڈال لے۔

اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اس میں تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی۔اولاد کو تسلی دی جا رہی ہے کہ کوئی ہزار انکار کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سب کو اپنے اپنے وقت پر مرنا ہے اور پھر ایک متعین دن جسے قیامت کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے۔آج جو ماں باپ اپنی اولاد کو اللہ تعالیٰ کا دین اختیار کرنے پر سزائیں دیتے اور ان کا جینا مشکل کر دیتے ہیں انہیں بہرصورت اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عمل کا جواب دینا ہوگا۔کیونکہ وہاں تو سب کو اپنے اپنے عمل کی جواب دہی کرنی ہے۔وہاں نہ سخن سازی سے کام چلے گا نہ اپنے کرتوت چھپائے جا سکیں گے۔اللہ تعالیٰ سب کے اعمال نامے ان کے سامنے کھول کر رکھ دے گا۔تو جن والدین نے اپنی اولاد کو دینِ حق کی قبولیت کے جرم میں ستایا ہو گا وہ پکڑے جائیں گے اور اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔اور اولاد نے اپنے والدین کے ہاتھوں جو دکھ سہے ہوں گے وہ بہتر سے بہتر اجر و ثواب کی صورت میں اولاد کے لیے زادِ آخرت بنیں گے۔اور وہ انہیں دیکھ کر تمنا کریں گے کاش ہم اس سے بھی زیادہ ستائے گئے ہوتے۔

Marfat.com

اور والدین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ آج تم حالات کو موافق پا کر اپنے نوجوان بچوں کو زبردستی دینِ حق کو قبول کرنے سے روکتے ہو لیکن قیامت کے دن جب تمہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے لیے پیش ہونا پڑے گا تو اپنے ان مظالم کا کیا جواب دو گے کہ تم نہ صرف خود دینِ حق کی قبولیت سے محروم رہے اور ہر ممکن طریقے سے اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو آگے بڑھنے سے روکا بلکہ ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی بھی گمراہی اور محرومی کا سبب بننے کی کوشش کرتے رہے اور اگر اولاد نے تمہارے اصرار اور دباؤ کو قبول نہیں کیا تو تم ان کے لیے مصیبت بنے رہے۔ بتاؤ آج تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴿۹﴾

(اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔ ۹)

اہلِ ایمان کو تسلی کی وضاحت

گزشتہ آیت کے آخر میں والدین کو تنبیہ کے ساتھ ساتھ ایمان لانے والی اولاد کو تسلی دی گئی تھی کہ تمہیں اطمینان رکھنا چاہیے۔ آج تمہارا ہر عمل اور تمہارا ایمان تمہارے لیے مشکلات کا باعث بن رہا ہے لیکن تمہیں بہرصورت اپنے اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے وہاں تمہاری یہی مشکلات تمہاری کامرانیوں اور جنت کی نعمتوں کا سبب بنیں گی۔ پیشِ نظر آیت میں تسلی کے اسی پہلو کو کھول دیا گیا ہے اور صریح الفاظ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ حالات کی انتہائی ناموافقت کے باوجود ایمان لائے اور پھر عمل کے چراغ روشن کیے۔ ہم انہیں ضرور صالحین میں شامل کریں گے۔ صالحین سے یہاں اللہ تعالیٰ کے وہ خالص اور مخلص بندوں کا گروہ مراد ہے جنہوں نے دنیا کی ہر صعوبت اٹھا کر اور ہر آزمائش کا سامنا کر کے ثابت کیا کہ ان کا سب کچھ ان کے خدا کے لیے ہے زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کی اور کفر نے اگر اس راستے میں مصیبتوں اور تکلیفوں کے پہاڑ کھڑے کیے تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے ان سے ٹکرا گئے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے جیسی بھی قربانی کی ضرورت پڑی انہوں نے آگے بڑھ کر خوشی سے پیش کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے زمرۂ صالحین میں شامل کرے گا اور اس زمرے میں جہاں اللہ تعالیٰ کے عام مخلص بندے شامل ہیں وہیں ان میں انبیائے کرام بھی موجود ہیں کیونکہ ان کی علامت بقدرِ مراتب اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی رضا کے حصول کے لیے سب کچھ لٹا دینا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾

(اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، لیکن جب انہیں اللہ کی راہ میں ستایا گیا تو انہوں نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔ اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آ گئی تو کہیں گے ہم تو تمہارے ساتھ تھے، کیا لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر نہیں ہے۔ ۱۰)

Marfat.com

ایمان کے دعویداروں کو تنبیہ

حق و باطل کی کشمکش میں جس طرح سرفروشوں کے مدارج ہیں اسی طرح تکلیفوں اور مصیبتوں پر ثابت قدم نہ رہنے والوں اور کمزوری دکھانے والوں کے بھی مراتب ہیں۔ نہ راہِ حق میں قربانیاں دینے والے یکساں ہوتے ہیں اور نہ اس راستے میں کمزوریاں دکھانے والے ایک سطح کے لوگ ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ راہِ حق میں بقدرِ ہمت ثابت قدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ اسی طرح جو بھی اس راستے میں کمزوری دکھاتا اور کم ہمتی کا ثبوت دیتا ہے وہ اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہتا ہے۔ لیکن آیتِ کریمہ میں خاص طور پر ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو دعوتِ حق سے متاثر ہو کر ایمان لانے کا دعویٰ تو کر بیٹھے، لیکن جیسے ہی انہوں نے اس راستے کی مشکلات کو دیکھا اور قدم قدم پر آزمائشیں سر اٹھاتی ہوئی نظر آئیں تو وہ حوصلہ ہار بیٹھے۔ وہ بجائے اس کے کہ لوگوں کی طرف سے پہنچائی جانے والی تکلیفوں کو ایک آزمائش سمجھتے اور اخلاص اور توانائی سے اس میں سے گزرنے کی کوشش کرتے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کی امید رکھتے، انہوں نے اسے بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرح سمجھا۔ انہوں نے گمان کیا کہ آج ہم جن اذیتوں سے گزر رہے ہیں آخرت میں جہنم کی سزائیں اس سے کیا مختلف ہوں گی۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ قیامت کے دن جہنم کے عذاب سے بچنے کے لیے آج کے عذاب میں مبتلا ہونے کی بجائے آخرت ہی کے عذاب کو اختیار کر لیا جائے اس سے کم از کم یہ تو ہوگا کہ اس نقد عذاب سے ہماری جان چھوٹ جائے گی اور دنیا کی زندگی آسانی سے گزر جائے گی۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ راہِ حق میں پہنچنے والی مصیبتیں اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں، آزمائش ہے۔ اس کی مدت محدود اور چند روزہ ہے اور اس کی شدت بھی انسانی برداشت سے بہت بڑھ کر کبھی نہیں ہوتی۔ اور اگر ایسا ہونے لگے تو ظالموں کو اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے تباہ کر دیا کرتا ہے۔ لیکن آخرت کا عذاب کبھی نہ ختم ہونے والی سزا ہے۔

وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّکَ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّا کُنَّا مَعَکُمْ یعنی آج تو ان کم ظرفوں کا حال یہ ہے کہ وہ آزمائشوں سے ڈر کر دشمنانِ دین کے گروہ میں جا شامل ہوئے ہیں لیکن کل جب خدا کی مدد و نصرت کے آثار ظاہر ہوں گے اور قافلۂ حق کامرانیوں کے سفر پر نکلے گا تو یہ لوگ فتح کے ثمرات میں حصہ بٹانے کے لیے آ موجود ہوں گے۔ اور مسلمانوں کو یقین دلائیں گے کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے ہم نے درپردہ تمہارے لیے دعائیں مانگیں۔ ہم نے بھی اپنی ہمت کے مطابق حق کی سربلندی کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی ان ثمرات سے حصہ ملنا چاہیے۔ اس کے جواب میں آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اس طرح کی باتیں اس ذات کے سامنے تو چل سکتی ہیں جو دلوں کے بھیدوں سے بے خبر ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ جو سینوں کے اسرار سے واقف ہے اور ظاہر و باطن اس کے سامنے آشکارا ہے اسے تو یہ فریب نہیں دیا جا سکتا۔ وہ تو ہر بات کو بھی جانتا ہے اور اس کے پس منظر سے بھی آگاہ ہے۔

وَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ﴿۱۱﴾

(اور اللہ ایمان والوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۱۱)

Marfat.com

استقامت اہلِ ایمان کی قوت اور نفاق ہلاکت ہے

حق و باطل کی آویزش میں حق کا اصل سرمایہ مخلصین کا وہ گروہ ہوتا ہے جو ایمان و عمل کی ہر آزمائش میں پورا اترتا ہے۔ اس لیے حق کے راستے پر چلنے والوں کے لیے سب سے زیادہ فکرمندی اس بات کی ہوتی ہے کہ ہماری صفوں میں کوئی کمزور عنصر شامل نہ ہونے پائے تاکہ اس قافلے کی منزل کھوٹی نہ ہونے پائے۔ اسلام چونکہ قافلۂ حق کا وہ عنوان ہے جسے قیامت تک کے لیے روشنی دینا ہے۔ اس لیے پروردگار نے اسلام کو قبول کرنے والوں کو مسلسل ایسی آزمائشوں سے گزارا تاکہ وہ کندن بن کر نکلیں اور جو کٹھن ذمہ داری ان پر ڈالی جانے والی ہے اس میں سرِ مو فرق نہ آنے پائے۔ اس لیے پروردگار نے قدم قدم پر اس کا اہتمام فرمایا تاکہ مخلص مومنوں میں کہیں بھی نفاق کی پرچھائیں نہ پڑنے پائیں۔ پروردگار کبھی کسی کو نام لے کر منافق قرار نہیں دیتا، لیکن راہِ حق میں پیش آنے والی مشکلات مومن اور منافق کو پوری طرح نمایاں کردیتی ہیں۔ اسلام چونکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ سے انتساب کا سب سے بڑا ذریعہ بھی۔ بنابریں یہ بات ازبس ضروری تھی کہ اس فرق و امتیاز میں کبھی فرق نہ آنے دیا جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی صفات کا لازمی تقاضا بنایا اور ہمیشہ اس پر عمل کیا گیا تاکہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنا مشکل نہ ہو۔ سورۃ آلِ عمران میں اس بات کو پوری طرح کھول کر بیان فرمایا گیا مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَآ اَنْتُمْ عَلَیْہِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ”اللہ مومنوں کو ہرگز اس حالت میں رہنے دینے والا نہیں ہے جس میں تم اس وقت ہو کہ صادق الایمان اور منافق سب ملے جلے ہیں، وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ نمایاں کرکے رہے گا۔“

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰکُمْ ؕ وَمَا ھُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰھُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَھُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِھِمْ ز وَلَیُسْئَلُنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَمَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾

(اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے راستے کی پیروی کرو اور ہم تمہاری خطاؤں کو اپنے اوپر لے لیں گے حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں، بےشک وہ جھوٹے ہیں۔ ۱۲) وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی اور یقیناً قیامت کے روز ان سے پوچھا جائے گا ان کی بابت جو وہ افترا کرتے رہے ہیں۔ ۱۳)

وڈیروں اور بزرگوں کی جھوٹی منطق

اس آیتِ کریمہ کے الفاظ اپنے اندر معنوی عموم رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پر عام کافروں کا ذکر ہو رہا ہے لیکن سیاقِ کلام دلالت کر رہا ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن کی اولاد یا جن کے زیردست افراد مسلمان ہوچکے تھے۔ اور وہ معاشرتی یا قبائلی روایت کے مطابق ان پر اخلاقی دباؤ ڈالتے ہوئے کہتے تھے کہ ہم تمہارے بزرگ ہیں ہم نے دنیا کا نشیب و فراز تم سے زیادہ دیکھا ہے ہم کسی کے دعوے کی سچائی اور کسی کی بات کی گہرائی کو تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اور ہم اچھائی اور برائی کے تصورات کو بھی تم سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ

Marfat.com

حق پہنچتا ہے کہ تمہیں سمجھائیں کہ تم نے محمد (ﷺ) کی دعوت کو قبول کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے یہ صحیح نہیں۔ تم ہمارے فہم وفراست پر اعتماد کرو اور ہمارے طریقے پر چلتے رہو۔ جب تک ہم اس دعوت کے بارے میں یکسو نہیں ہوتے تمہیں اسے قبول کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر تم یہ سمجھو کہ یہ دین کا معاملہ ہے اس میں کسی طرح کا تساہل یا غلط فہمی بہت نقصان کا باعث ہوسکتی ہے اور قیامت کے دن اگر ہمیں واقعی اس کا جواب دینا پڑا تو ہم کیا جواب دیں گے تو پھر ہم تم سے کہتے ہیں کہ اولاً تو قیامت آنے والی نہیں، یہ محض ایک افسانہ ہے۔ لیکن اگر واقعی یہ حقیقت ثابت ہوگئی تو ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ تمہارے گناہوں کا بوجھ ہم اپنے سر لے لیں گے اور ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے اقرار کریں گے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہمارے کہنے سے کیا۔ اس کے جواب میں اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے ہیں کہ وہ ان کے بوجھ اٹھالیں گے وہ بہت غلط بات کہہ رہے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذاتی ذمہ داری رکھتا ہے اور اسی حوالے سے اس سے بازپرس ہوگی، کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ”کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“ اگر بالفرض اس بات کی اجازت بھی ہوتی کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اٹھالے تو یہ لوگ کفر اور شرک کا انجام ایک دھکتی ہوئی جہنم کی صورت میں جب سامنے دیکھیں گے اس وقت کس میں یہ ہمت ہوگی کہ وہ کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے کا نام بھی لے۔ وہاں تو خونی رشتے ایک دوسرے کو بھول جائیں گے، ماں اپنے بچوں تک کو نہیں پہچانے گی۔ ایسے حال میں اس طرح کے دلاسے کہاں یاد رہیں گے اور یاد بھی ہوں تو کون ان کی پاسداری کرے گا۔ اس لیے یہ سردارانِ قوم اپنے زیردستوں سے اس طرح کی جو باتیں کرتے ہیں وہ درحقیقت جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان باتوں کا کوئی امکان نہیں۔

جھوٹی تسلی دینے والوں کو تنبیہ

البتہ ایک بات ضرور ہے اور قیامت کے دن جس پر عمل بھی ہوگا وہ یہ ہے کہ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اس معنی میں تو نہیں اٹھا سکے گا جس سے دوسرا اپنی ذمہ داری سے بچ جائے۔ البتہ وہ لوگ جنھوں نے دوسروں کو گمراہ کیا اور خود بھی گمراہ ہوئے وہ اپنی گمراہی کے بوجھ کے ساتھ ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ یعنی ایک تو سزا انہیں خود اپنے گمراہ ہونے کی ہوگی اور دوسرا عذاب انہیں ان لوگوں کے حوالے سے بھی دیا جائے گا جن کی گمراہی کا یہ سبب بنے۔ مثلاً ایک آدمی نے کہیں نقب لگائی اور ساتھ ہی ایک دوسرے آدمی کو بہکا کر اپنی اس چوری میں شریک کرلیا۔ اب قیامت کے دن جب اسے چوری کی سزا ملے گی تو ساتھ ہی اس بات کی بھی سزا ملے گی کہ تم نے دوسرے کو گمراہ کرکے بھی چوری کا جرم کرایا۔ یعنی وہ خود اپنے جرم میں بھی پکڑا جائے گا اور دوسرے کو جرم پر آمادہ کرنے کی سزا بھی اسے ملے گی۔ اس لحاظ سے یہ لوگ ڈہری سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔

آیت کے آخر میں ایک ایسی بات ارشاد فرمائی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو گمراہ لوگ دوسروں کی گمراہی کا بھی سبب بنتے رہے ہیں ان کی بدنصیبی اور شقاوت کسی ایک سزا پر رکنے والی نہیں بلکہ انہیں اس بات کا بھی جواب دینا ہوگا کہ تم نے اپنے دلوں میں جو اس طرح کی باتیں پال رکھی تھیں کہ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھایا جاسکتا ہے اور دوسروں کو اس طرح سے مطمئن کرکے ان کی گمراہی کی عمر کو دراز کیا جاسکتا ہے، یہ جھوٹی باتیں تم نے کہاں سے سیکھی تھیں؟ اسی طرح تم نے اپنی گمراہی کی چند بنیادیں بنا رکھی تھیں اور انہیں حوالوں سے تم دوسروں کو بھی گمراہ کررہے تھے۔ مثلاً تم توحید کے مقابلے میں مذہب شرک کو برحق سمجھتے تھے۔ اسی طرح قیامت کو تم

Marfat.com

نے محض ایک مفروضہ تصور کر رکھا تھا۔ اسی طرح یہ بات کہ جو شخص کسی کے کہنے پر کوئی جرم کرتا ہے اس پر اپنے جرم کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی اور دوسرا کہنے والا شخص اس کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سی بدعتیں جو تم نے ایجاد کر رکھی تھیں اور انہیں منسوب تم اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے تھے ان میں سے ایک ایک بات کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ یہ ایک بوجھ کی بات کرتے ہیں نہ جانے گمراہیوں کے کتنے بوجھ یہ اپنے سر پر اٹھائے جواب دہی کے لیے کھڑے کیے جائیں گے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا

اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ
الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَ
جَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ
وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ
كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾
اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى
اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ
ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾
يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾

Marfat.com

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ۫ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۲۲﴾

رکوع: ۲۔ (اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کوان کی قوم کی طرف رسول بنا کے بھیجا اور وہ ان کے اندر پچاس برس کم ایک ہزار سال رہے، پس انہیں طوفان نے آ پکڑا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔ ۱۴) پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور اسے دنیا والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا دیا۔ ۱۵) اور ہم نے ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۱۶) بلاشبہ تم اللہ کو چھوڑ کر بتوں کی بندگی کر رہے ہو اور جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ بے شک تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتے ہو وہ تمہیں رزق دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے تو اللہ ہی سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۷) اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلی بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ۱۸) کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح خلق کی ابتداء کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے، بے شک یہ اللہ تعالیٰ پر بہت آسان ہے۔ ۱۹) اے پیغمبر! کہہ دیجیے کہ تم زمین میں چلو پھر و پھر دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی ہے پھر اللہ بارِ دگر زندگی بخشے گا، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۰) وہ جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جس پر چاہے رحم فرماتا ہے، اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے۔ ۲۱) نہ تم زمین میں عاجز کرنے والے ہو اور نہ آسمان میں، اور تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست اور کوئی مددگار نہیں۔ ۲۲)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

(اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کوان کی قوم کی طرف رسول بنا کے بھیجا اور وہ ان کے اندر پچاس برس کم ایک ہزار سال رہے، پس انہیں طوفان نے آ پکڑا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔ ۱۴)

سابقہ رکوع کا خلاصہ

گزشتہ رکوع میں تین باتیں واضح فرمائی گئیں۔ ایک یہ کہ حق و باطل کی کشمکش میں راہِ حق کا مسافر بننا ایک بہت بڑی ذمہ داری کو قبول کرنا ہے۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس راہ پر چلتے ہیں انہیں بہت سے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان آزمائشوں سے گزرے بغیر وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں صادق اور مخلص ہونے کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

دوسری یہ بات کہ دین کے معاملے میں ہر شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے خود مسئول اور ذمہ دار ہے۔ اسے اپنے ایمان و عمل کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔ کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں ہے۔ بہکانے والے کتنے بھی ہوں بھٹکنے کی سزا خود اسے ملے گی، کسی دوسرے پر اپنے جرم کو ڈالا نہیں جا سکتا۔

تیسری یہ بات کہ جو لوگ راہِ حق پر چلنے والے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر یا بہکا کر راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ایک خاص حد تک ڈھیل دیتا ہے۔ اگر وہ اس ڈھیل سے فائدہ اٹھانے کی بجائے طغیان اور تمرد میں بڑھتے چلے جاتے ہیں تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے قانون کی گرفت میں آ کر رہتے ہیں۔ اور جب اس کی گرفت آ جاتی ہے تو پھر بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

پیشِ نظر رکوع میں انہیں حقائق کو چند انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین اور مکذبین کے احوال سے نمایاں کیا گیا ہے تاکہ ان حقائق کے سمجھنے میں کسی طرح کا ابہام باقی نہ رہے۔

سابقہ حقائق پر حضرت نوحؑ کی سرگزشت سے استشہاد

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی سے استشہاد کیا گیا ہے۔ ان کی دعوتی زندگی کی تفصیلات مختلف سورتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں صرف ایک بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے بھیجا اور آپؑ نے ان میں اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے ساڑھے نوسو سال گزارے۔ یعنی اتنا طویل عرصہ اپنی قوم کی تمام تر گمراہیوں اور اذیت رسانیوں کے باوجود مسلسل کام کیا۔ اس سلسلے میں آپؑ کو کیسی کچھ صعوبتوں سے واسطہ پڑا ہوگا اور آپؑ نے کیسے کیسے اندوہناک حالات کا سامنا کیا ہوگا لیکن آپ نے اتنے طویل عرصے تک کبھی حالات کی شکایت کی نہ کبھی قوم کے بارے میں کوئی حرفِ شکایت زبان پر لائے۔ بجز آخری دنوں کے جب آپ نے پیغمبرانہ ذکاوت سے محسوس کیا کہ اب اس قوم پر اتمامِ حجت ہو چکا اور ان میں سے جس کسی میں قبولیتِ ایمان کی کوئی رمق باقی تھی وہ اسلام قبول کر چکا اور باقی کسی میں اس کی صلاحیت نہیں۔ اور پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے عذاب بھیجنے کی استدعا کی۔ اس میں مسلمانوں پر یہ بات واضح کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ و دعوت کوئی چند روز کا کام نہیں اور پھر یہ کوئی ایسا سفر نہیں جس میں کوئی شخص ٹھنڈی سڑک سے چلتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ یہ تو صعوبتوں سے اٹا ہوا راستہ ہے۔ یہاں تو قدم قدم پر آزمائشیں ہیں اور یہ اتنا طویل راستہ ہے کہ ساڑھے نوسو سال بھی اس میں صرف کیے جا سکتے ہیں۔ تمہیں ابھی چند سال اس سفر میں گزرے ہیں اور تم ابھی سے شکایت کرنے لگے ہو اور اللہ تعالیٰ کے رسول سے دعا کی درخواستیں کرنے لگے ہو۔

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر

آیت کے پہلے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو آپ کی قوم میں رسول بنا کر بھیجا تھا اور آپ نے رسول ہونے کی حیثیت سے ساڑھے نوسو سال اپنی قوم میں قیام فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں ساڑھے نوسو سال کی مدت آپ کی رسالت کی مدت کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ آپ کی عمر کی طوالت کے طور پر نہیں۔ تورات کا بیان اس لحاظ سے قرآنِ کریم سے مختلف ہے۔ تورات میں ہے ''اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین سو برس اور جیتا رہا اور نوح کی کل عمر ساڑھے نوسو برس کی ہوئی تب اس نے وفات

Marfat.com

پائی۔" (پیدائش باب ۹۔۲۸۔۲۹) بائبل کے بیان کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام چھ سو برس کے تھے جب طوفان آیا اور اس کے بعد ساڑھے تین سو برس اور زندہ رہے۔ اس لحاظ سے بائبل آپ کی مجموعی عمر ساڑھے نو سو سال قرار دیتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم ساڑھے نو سو سال کو ان کی نبوت کی عمر قرار دیتا ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ آپ نے نبوت سے پہلے بھی کچھ عمر گزاری ہوگی اور پھر طوفانِ نوح کے بعد بھی آپ کچھ عرصہ تک زندہ رہے ہوں گے۔ اس لحاظ سے آپ کی عمر ایک ہزار سال سے متجاوز ہونی چاہیے۔

بعض لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی طویل عمر کو دیکھتے ہوئے شک وشبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں حالانکہ اس میں دو باتیں بالکل واضح ہیں ایک تو یہ بات کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں عمروں کا اوسط آج کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے والد کی عمر سات سو تہتر برس بیان کی جاتی ہے اور ان کے دادا کی عمر نو سو انہتر برس ذکر کی گئی ہے۔ اسی طرح ان کے دوسرے اجداد میں سے کسی کی عمر نو سو باسٹھ برس مذکور ہے اور کسی کی آٹھ سو پچانوے برس۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی یہ عمر اس زمانے کی اوسط عمر کے بالکل مطابق ہے۔ اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں زمین پر آبادی بہت کم تھی۔ اور تمدن و معیشت کے وہ مفاسد ابھی ظہور میں نہیں آئے تھے جو اب زندگی کے ہر شعبے پر چھا گئے ہیں۔ کھلی فضا، خالص غذا، حوادث اور تصادم سے محفوظ زندگی، فطری حالت اور سادگی کی وجہ سے جسم میں غیر معمولی قوتِ مدافعت جیسے اسباب کی وجہ سے زندگی کے دراز ہونے سے کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی طوالتِ عمر ایک استثنائی اور غیر معمولی واقعہ ہو۔ کیونکہ ہم ہر دور میں یہ دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے مفروضات کو توڑنے کے لیے کائنات کے ہر گوشے میں اور مخلوقات کی ہر صنف میں خلافِ معمول حالات وواقعات کی ایک فہرست ملتی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی قادرِ مطلق ذات ہے جو کائنات کے نظام کو چلا رہی ہے اور وہ کبھی کبھی کسی غیر معمولی بات کے اظہار سے اپنی ذات کے ہونے اور اپنے متصرفِ حقیقی ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ہمیں طویل عمروں کے لوگ ملتے ہیں جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظام ایک لگے بندھے قانون کے تحت نہیں چل رہا بلکہ کوئی چلانے والا اسے چلا رہا ہے۔ جب وہ چاہتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی بھی پیدا کر دیتا ہے۔

فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ "پس ان کو طوفان نے آ پکڑا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔" حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی اکثریت نے جب آپ کی صدیوں کی محنت کے باوجود آپ کی تکذیب کر دی اور پھر اس تکذیب میں بڑھتے ہی چلے گئے تو آخر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان پر پانی کا طوفان آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی قوم کو بہت طویل مہلت ملی، لیکن جب انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے تکذیب وانکار ہی کو اپنا شیوہ بنائے رکھا تو آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا عذاب آ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح صاحب ایمان لوگ ایمان لانے کے بعد آزمائے جاتے ہیں اسی طرح مخالفین کو بھی ایک خاص حد تک مہلت دی جاتی ہے جب وہ اپنے ظلم وانکار سے باز نہیں آتے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت آتی ہے اور وہ تباہ وبرباد کر دیے جاتے ہیں۔ اور یہ تباہی اور بربادی اس وقت ان کا مقدر بنتی ہے جب اللہ تعالیٰ کے نبی کی طرف سے تبلیغ ودعوت کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور سمجھانے بجھانے کے جتنے طریقے ممکن ہو سکتے ہیں، سب آزما لیے جاتے۔ اور اس طرح سے ان پر اتمامِ حجت ہو جاتا ہے۔ اب وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع نہ دیا گیا۔ یہی بات یہاں بھی فرمائی گئی ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اس وقت آیا جب وہ پوری طرح اپنے آپ کو ظالم ثابت کر چکے تھے۔

Marfat.com

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝١٥

(پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور اسے دنیا والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنادیا۔ ۱۵)

حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کی کامیابی

سورۃ ہود میں وضاحت گزر چکی ہے کہ کس طرح حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ بنانے کا حکم دیا گیا اور کس طرح سیلاب کا آغاز ہوا، سفینہ میں کن کن جانوروں اور انسانوں کو سوار کرنے کا حکم دیا گیا اور پھر کس طرح کشتی پانی پر تیرتی ہوئی ایک پہاڑ پر جا ٹھہری اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور جو آپ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے ان کو نجات دی۔

آخر میں فرمایا کہ ہم نے اسے جہاں والوں کے لیے سامانِ عبرت بنادیا۔ سوال یہ ہے کہ سامانِ عبرت کس کو بنایا گیا اور ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ بعض اہلِ علم نے اس پورے واقعہ کو ضمیر کا مرجع ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ اسی میں بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے سامانِ عبرت ہے۔ لیکن بعض اہلِ علم کے نزدیک ضمیر کا مرجع وہ کشتی ہے۔ وہ سورۃ القمر کی آیات ۱۳ تا ۱۵ سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کے سامانِ عبرت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اولاً تو ایک کشتی کا زمین سے اٹھ کر کسی بلند پہاڑ پر جا ٹکنا بجائے خود ایک نشانی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طوفان کس بلا کا تھا۔ اور دوسری یہ بات کہ پھر وہ کشتی پہاڑ کی چوٹی پر صدیوں موجود رہی ہے اور ممکن ہے آج بھی موجود ہو۔ ابنِ جریر نے قتادہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ عہدِ صحابہ میں جب مسلمان الجزیرہ کے علاقہ میں گئے ہیں تو انہوں نے کوہِ جودی پر اور ایک روایت کی رو سے باقردیٰ نامی بستی کے قریب اس کشتی کو دیکھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی مختلف وقتوں میں یہ اطلاعات اخبارات میں چھپتی رہی ہیں کہ کشتیِ نوح کو تلاش کرنے کے لیے مہمات بھیجی جارہی ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستان اراراط پر سے گزرے ہیں تو ایک چوٹی پر انہوں نے ایک ایسی چیز دیکھی ہے جو ایک کشتی سے مشابہ ہے۔ چونکہ وہ برف سے اٹی ہوئی ہے اس لیے پوری طرح اس کی شکل ہوائی جہاز سے دکھائی نہیں دیتی اور شاید پہاڑ پر برف کے بڑے بڑے تودوں کی وجہ سے آج تک کوئی جانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ واللہ اعلم۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝١٦

(اور ہم نے ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ ۱۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت

لفظ اِبْرٰهِيْمَ سے پہلے ارسلنا محذوف ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی ہدایت کے لیے اپنا رسول بنا کر بھیجا تھا اسی طرح ہم نے ابراہیم کو بھی ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ انہوں نے اپنی قوم کو اسی بنیادی حقیقت کی دعوت دی جس کی دعوت حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی کوئی رسول آیا ہے اس نے وہی دعوت پیش کی ہے جو ہر رسول کی دعوت رہی ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے کہ ان کا زمانہ ایک

10952

Marfat.com

دوسرے سے بہت دور، ان کی قومیں ایک دوسرے سے بہت مختلف، ان کے جغرافیائی حالات بعض دفعہ ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور ان کے قبائل اور قومی مزاج بھی ایک دوسرے سے متفاوت۔ بایں ہمہ ان کی دعوت میں تضاد تو دور کی بات ہے کوئی جوہری اختلاف بھی نہیں۔ سورۃ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے کی دعوت دی تھی۔ اور یہی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت میں دوسروں کو شریک کرنا سب سے بڑا جرم ہے اس لیے اس جرم پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے۔ تم اس جرم کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار نہ ہونا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اسی کی بندگی کرو تا کہ تم اس کے غضب سے بچ سکو۔ اور آخر میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ اگر کوئی خیر خواہی کر سکتا ہوں اور کوئی بہتر سے بہتر نصیحت کر سکتا ہوں تو وہ یہی ہے اگر تم اسے سمجھ سکو۔ یہ کہنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے جو تعلق ہے وہ بنیادی طور پر اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان بندہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا معبود ہے۔ اسی کو عربی زبان میں عبد کہا گیا ہے، یہی انسان کا بنیادی تعارف ہے اور یہی اس کے مدارج کی معراج ہے۔ انسان جب اپنی سطح سے گرتا ہے تو یا وہ عبد ہونے سے انکار کرتا ہے اور یا دوسروں کی بندگی کے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی کو کفر اور شرک کہا گیا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ عبدیت اور بندگی ایک وسیع اصطلاح ہے جب تک اسے ذہن نشین نہ کر لیا جائے اس وقت تک اس لفظ کی معنوی ہمہ گیری کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ عبد کا معنی ہے غلام۔ اور عبدیت غلامی کو کہتے ہیں۔ غلامی کی پہچان چار چیزیں ہیں۔ (۱) غلام وہ ہوتا ہے جسے حق ملکیت حاصل نہ ہو، اس کے پاس جو کچھ ہو وہ امانت ہو اس کی ملکیت اس کے آقا کو حاصل ہو۔ (۲) اس کے زیرِ تصرف اور زیرِ استعمال چیزوں میں اسے آزادانہ تصرف کا حق نہ ہو۔ وہ ہر بات میں اپنے مالک کے حکم یا اجازت کا محتاج ہو۔ (۳) وہ اپنی زندگی کے اہداف اور نصب العین کے تعین کا مجاز نہ ہو۔ (۴) اس کا آقا اسے جس حال میں بھی رکھے اسے شکایت کا کوئی موقع نہ ہو۔ انہیں چاروں معنوں میں ہر شخص اپنے اللہ کا غلام ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے چاہے وہ جسم و جان ہو، صلاحیتیں ہوں، مال و دولت ہو یا عہدہ و منصب، سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور اس کے پاس امانت ہیں۔ یہ اپنے ہر تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت کا پابند ہے۔ آزادیِ مطلق اسے حاصل نہیں۔ اسے زندگی کس طرح گزارنی ہے، زندگی کے اہداف کیا ہونے چاہئیں اور اس کا نصب العین کیا ہو، اس کے تعین کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور ہر مومن اللہ تعالیٰ کے اس حق کی پیروی میں زندگی گزارنے کا پابند ہے۔ اسے اپنے اللہ سے دعا کرنے اور مانگنے کی اجازت تو ہے اور اپنی آرزوؤں کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی بھی، لیکن اپنے اللہ سے شکایت کرنے کا حق نہیں۔ یہی چاروں باتیں زندگی کا حصار، زندگی کا میدان اور زندگی کا اعزاز ہیں۔ ان کے بارے میں نصیحت کرنا اور توجہ دلانا، اس سے بہتر کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

(بلاشبہ تم اللہ کو چھوڑ کر بتوں کی بندگی کر رہے ہو اور جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ بے شک تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتے ہو وہ تمہیں رزق دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے تو اللہ ہی سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۷)

Marfat.com

دعوت کی تفصیل دلائل کے ساتھ

مشرکین کی ذہنی پستی کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ تم خود اپنی حالت پر غور کرو تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم جنہیں اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھ کر پوجا کر رہے ہو ان کی حیثیت بتوں کے سوا اور کیا ہے۔ تم نے کسی شخصیت کا مجسمہ بنا رکھا ہے یا کسی تھان اور استھان کے تقدس کے وہم میں مبتلا ہو گئے ہو۔ یا تم نے اپنے تصور میں کوئی دیوتا یا اوتار قرار دے رکھا ہے۔ یہ سب کچھ بت پرستی کے سوا اور کیا ہے۔ ذرا سوچو بت بھی کبھی معبود ہوتے ہیں۔ اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ تم نے ان بتوں کے بارے میں عجیب و غریب تصورات بنا رکھے ہیں اور ان کی طرف اللہ تعالیٰ کے بیشتر اختیارات کا انتساب کر رکھا ہے۔ کسی کو شفا دینے والا، کسی کو اولاد بخشنے والا، کسی کو روزگار دلوانے والا اور کسی کو خدا کا مقرب سمجھ کر اور بھی بڑے بڑے اختیارات کا حامل بنا رکھا ہے، یہ سب جھوٹی باتیں ہیں جو تم نے اپنے وہم و گمان سے گھڑ رکھی ہیں۔ بعض کے بارے میں تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے رزق رساں ہیں حالانکہ وہ کسی قسم کا رزق پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ اگر تمہیں رزق ہی کے لیے بندگی کرنی ہے تو تب بھی تمہیں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنا چاہیے کیونکہ اس کے سوا کوئی رزق دینے پر قادر نہیں۔ یہ سب تمہاری ذہنی پستی کی علامتیں ہیں کہ حقیقی آستانہ چھوڑ کر نہ جانے کہاں کہاں جبہ سائی کرتے پھر رہے ہو۔ تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو، اسی کے شکر گزار رہو۔ کیونکہ عبادت اور شکر گزاری کا وہی مستحق ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم ہزار انکار کرو مرنے کے بعد ایک دن ضرور اٹھائے جاؤ گے اور تمہاری پیشی اسی ایک پروردگار کے سامنے ہونے والی ہے۔ اس دن یہ اصنام و اوثان تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۱۸

(اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلی بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ۱۸)

طویل کشمکش کے بعد قوم کو تنبیہ

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور اس آیت کے نزول میں ایک طویل فاصلہ ہے۔ کیونکہ پیغمبر اپنی قوم کی تبلیغ و دعوت کے نتائج سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ وہ دکھ اٹھاتا ہے لیکن قوم کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا حق ادا کرنے سے نہیں رکتا۔ آپ نے یہ بات یقیناً اس وقت کہی ہوگی جب کئی سالوں کی جانگسل کوششوں کے باوجود قوم نے آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور دھمکیاں دینے پر اتر آئی۔ اور ہوسکتا ہے بعض لوگوں نے اسی عدمِ قبولیت کو آپ کی نبوت کے باطل ہونے پر دلیل بنایا ہو۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ اگر تم میری دعوت کو جھٹلاتے ہو اور مجھ پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہو اور میری بات کو قبول کر کے نہیں دیتے ہو تو اس میں نئی بات کیا ہے۔ قوموں کی تاریخ اٹھا کے دیکھو کتنی قومیں ایسی گزری ہیں جنہوں نے اپنے پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے بعد ان کا انجام کیا ہوا۔ آج وہ تاریخ میں عبرت کے طور پر یاد کی جاتی ہیں۔ میں تمہیں اس اندوہناک انجام سے بچانا چاہتا ہوں۔ لیکن تم اسی کھائی میں گر کر مرنا چاہتے ہو۔ تو یاد رکھو میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں میں نے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہر طرح کے

Marfat.com

حالات اور ہر طرح کے ماحول میں، میں نے اللہ تعالیٰ کا دین تمہیں پہنچایا۔اس طرح میں اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو چکا ہوں۔ مجھے صرف اللہ تعالیٰ کا پیغام واضح طور پر تمہیں پہنچانا تھا وہ پوری طرح پہنچا چکا ہوں اب تم جانو اور تمہارا انجام جانے۔لیکن اب جو کچھ ہوگا اس کی پرسش مجھ سے نہیں ہوگی کیونکہ میں اپنی ذمہ داری ادا کر چکا، البتہ تم اپنی ذمہ داری ادا نہ کرنے پر پکڑے جاؤ گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

(کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح خلق کی ابتداء کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے، بے شک یہ اللہ تعالیٰ پر بہت آسان ہے۔ ۱۹)

آیت ۲۳ تک جملہ معترضہ ہے

یہاں سے لے کر آیت ۲۳ تک پانچ آیتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تضمین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ایک جملہ معترضہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت کو روک کر کفارِ مکہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ کفارِ مکہ کی کافرانہ زندگی کی بنیاد دو گمراہیاں ہیں۔ایک شرک و بت پرستی اور دوسری انکارِ آخرت۔شرک اور بت پرستی کی تردید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت پرزور انداز میں لیکن اختصار کے ساتھ اپنی قوم سے خطاب فرمایا اور آخرت کے صرف ذکر اور انتباہ پر اکتفاء کرتے ہوئے خطاب مکمل فرما دیا۔ یہ واقعات چونکہ کفارِ مکہ کو ان کی اصلاح کے لیے سنائے جا رہے ہیں اس لیے پروردگار نے اپنی طرف سے اس بحث کو مکمل کرنے کے لیے آخرت کے حوالے سے چند باتوں کا اضافہ فرمایا ہے۔اور اس میں دلیل کی بنیاد عام انسانی مشاہدہ پر رکھی ہے جن میں کفارِ مکہ بھی شامل ہیں۔ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ عجیب لوگ ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے سے انکار نہیں۔ یہ اپنے آپ کو اسی کی مخلوق سمجھتے ہیں۔لیکن جو چیز ان کے عقیدے اور مشاہدہ کے نتیجے سے خود بخود ثابت ہوتی ہے اسے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ بے شمار اشیاء عدم سے وجود میں آ رہی ہیں جن میں افرادِ انسانی بھی ہیں۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر نوع کے کتنے افراد ہیں جو موت کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی جگہ خالی نہیں رہتی بلکہ ویسے ہی اور افراد وجود میں آ جاتے ہیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی عمل سے یہ لوگ اس کے خالق ہونے کا اقرار کرتے ہیں لیکن مٹ جانے والی اشیاء کی جگہ اللہ تعالیٰ ویسی ہی اشیاء پے در پے وجود میں لا رہا ہے۔اعادہ کے اس عمل کے نتیجے کو ماننے سے انکار ہے۔اگر وہ صرف خالق ہوتا تو ایک دفعہ تمام انواع اور ان کے افراد کو پیدا کر کے چھوڑ دیتا۔مر جانے والوں اور مٹ جانے والوں کی جگہ دوسرے افراد کبھی نہ لیتے تو دنیا کی آبادی بہت جلد ختم ہو جاتی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس طرح اس کائنات کا خالق ہے اسی طرح اپنی مخلوقات جیسی مزید مخلوقات کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔اور قیامت اور آخرت اللہ تعالیٰ کی اسی قدرت کے ظہور کا نام ہے۔قیامت میں جن و انس کے وہ افراد جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق سے وجود میں آئے اور پھر اپنی زندگی گزار کے مر گئے انہیں از سرِ نو زندہ کر کے جواب دہی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا تاکہ اس کے کامل عدل کا ظہور ہو سکے۔ یہ جس طرح اخلاق کا تقاضا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو ہمارے مشاہدے میں آتی رہتی ہیں ان کا اتمام بھی ہے۔لیکن یہ بات اعجوبے سے کم نہیں کہ آخرت کا انکار کرنے والے اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کا تو اقرار کریں اور اسے خالق مانیں اور اسی قوتِ تخلیق سے پیدا کی ہوئی مخلوق کو دوبارہ زندہ کرنے کے عمل کو ماننے سے انکار کر دیں۔حالانکہ جو کام پہلے ہو چکا اسے دوبارہ کرنا یقیناً پہلے کی نسبت آسان ہوتا ہے۔

Marfat.com

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۚ ۲۰

(اے پیغمبر! کہہ دیجیے کہ تم زمین میں چلو پھرو پھر دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی ہے پھر اللہ بارِ دگر زندگی بخشے گا، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۰)

قیامت کا انکار کرنے والوں کو مشاہدے اور غور کی دعوت

اب قیامت کا انکار کرنے والوں کو وسیع مطالعے اور مشاہدے کی دعوت دی جا رہی ہے کہ تم اپنے تجارتی اسفار میں مختلف ممالک سے گزرتے ہو، وہاں کے حالات کا گہری نظر سے جائزہ لو تمہیں قسم قسم کی مخلوق نظر آئے گی جو اپنی شکل وصورت، اپنی خصوصیات اور اپنے اثرات وغیرہ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ کتنی قومیں ہیں جن کے تمرد اور سرکشی کے باعث ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور وہ تباہ کر دی گئیں۔ تو کیا وہ سرزمین ابھی تک خالی پڑی ہے۔ یقیناً وہاں نئے لوگ بسے جو سب ان کی تباہی کے بعد پیدا ہوئے۔ تو جو پروردگار اس وقت زمین پر یہ تخلیق کے مختلف رنگ دکھا رہا ہے اس کے بارے میں یہ تصور کہ وہ دوبارہ انسانوں کو زندہ نہیں کر سکتا کس قدر مہمل تصور ہے۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ۲۱

(وہ جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جس پر چاہے رحم فرماتا ہے، اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے۔ ۲۱)

ضابطۂ خداوندی

زمین پر بسنے والوں کا عام مشاہدہ اور ان کی تاریخ کے ورق الٹنے سے تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ بڑے سے بڑے کافر کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن جب اس کی مشیت اور حکمت کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ ایسے لوگوں کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر اس کی بے پناہ قدرت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔ البتہ اس کا چاہنا حکمت اور عدل کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے رحم وکرم سے نوازتا ہے۔ اس میں بھی اس کا عدل بھی کارفرما ہوتا ہے اور اس کا فضل بھی شاملِ حال ہوتا ہے۔ اور انسانوں پر اس کی یہ گرفت اور قوموں پر اس کا نزولِ عذاب یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ تم سب ایک دن اللہ تعالیٰ کی طرف پھیرے جاؤ گے۔ جن لوگوں نے اس بنیادی بات کو سمجھنے سے انکار کیا ہے ان کے کھنڈرات تمہارے سامنے عبرت کے طور پر موجود ہیں اور وہ زبانِ حال سے گواہی دے رہے ہیں کہ وہ ذات جس کے عتاب کا وہ شکار ہوئے ہیں وہ دوبارہ زندہ کرنے اور قیامت لانے پر بھی قادر ہے۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۡ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۲۲

(نہ تم زمین میں عاجز کرنے والے ہو اور نہ آسمان میں، اور تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست اور کوئی مددگار نہیں۔ ۲۲)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مقابلہ نہیں ہوسکتا

اللہ تعالیٰ کی قدرت ایسی بے پایاں اور بے پناہ ہے کہ تم زمین میں کہیں بھی بھاگ جاؤ اور آسمان پر کہیں بھی چڑھ جاؤ تم اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ تمام اہلِ زمین کی طاقت مجتمع بھی ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کو عاجز نہیں کرسکتی۔ جب اس کی گرفت آتی ہے تو اس کی پکڑ سے کہیں پناہ نہیں ہوتی۔ زمین کا کوئی گوشہ اس کی حکمرانی سے باہر نہیں۔ اور آسمان کی کوئی بلندی اس کے علم سے خارج نہیں۔ لوگوں نے شریکوں کے بارے میں کیسے کیسے تصورات بنا رکھے ہیں اور نام نہاد سفارش کرنے والوں کو نہ جانے کیسا سہارا سمجھ رکھا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی کارساز نہیں جو انہیں بچاسکے۔ اور کوئی مددگار نہیں جو ان کی مدد کو پہنچ سکے اور انہیں پناہ دے سکے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ

اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ
اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ
بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ
بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا
لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ
اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ
اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾
وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا

Marfat.com

سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ
الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ۬ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ
الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا
بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ رَبِّ
انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾

رکوع: ۳۔ (اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۲۳) پھر حضرت ابراہیم کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا اسے قتل کر دو یا اسے جلا ڈالو۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے بچا لیا۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں۔ ۲۴) اور حضرت ابراہیم نے کہا تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانہ آگ ہوگا اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۲۵) پس لوط، ابراہیم پر ایمان لائے اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں، بے شک وہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔ ۲۶) اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور اس کی ذرّیت میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا، اور ہم نے اس کا اجر اس کو دنیا میں بھی دیا اور آخرت میں بھی وہ نیکوکاروں کے زمرے میں سے ہوگا۔ ۲۷) اور ہم نے لوط کو بھیجا جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ایک کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو جس کا ارتکاب تم سے پہلے کسی قوم نے بھی نہیں کیا۔ ۲۸) کیا تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہزنی کرتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو تو اس کی قوم کے پاس کوئی جواب اس کے سوا نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب لاؤ۔ ۲۹) حضرت لوط نے کہا اے میرے رب اس مفسد لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔ ۳۰)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

(اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۲۳)

Marfat.com

امید اور محرومی میں قولِ فیصل

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں ہر امید کے بہت سے اسباب ہیں اور ہر مصیبت سے بچ نکلنے کے بہت سے وسائل ہیں۔ اس لیے آدمی دونوں طرح کے احساسات کے تحت مختلف آستانوں کی دریوزہ گری کرتا اور مختلف سہاروں کی تلاش کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی اطاعت اور فرماں برداری کے حوالے سے امید کا بھی ایک ہی راستہ ہے اور عذاب سے بچ نکلنے کا بھی ایک ہی ذریعہ ہے۔ جو شخص ایمان کے بعد اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتا اور اس کے رسول کی سنت پر عمل کرتا ہے وہ اپنے ایمان وعمل پر بھروسے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت پر بھروسا کرتا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتا ہے اور قیامت کی جوابدہی سے انکار کرتا ہے اس کی محرومی کا بھی ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان وعمل کے ساتھ اپنی رحمت کی امید دلائی ہے اور اپنے فضل واحسان کے وعدے فرمائے ہیں۔ تو جو شخص نہ ایمان رکھتا ہے اور نہ عمل وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس طرح سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے لاتعلق قرار دے دیتا ہے۔ اور دوسرا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جزاء وسزا کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا اور جو شخص قیامت سے انکار کرتا ہے وہ درحقیقت جزاء وسزا کے نظام ہی کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح سے اس کی محرومی اس حد تک تکمیل کو پہنچ جاتی ہے کہ جس میں رحمت کے نفوذ کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ ایسا شخص اگر کسی چیز کا سزاوار ہے تو وہ وہی ہے جسے یہاں عذابِ الیم قرار دیا گیا ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

(پھر حضرت ابراہیم کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا اسے قتل کر دو یا اسے جلا ڈالو۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے بچا لیا۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں۔ ۲۴)

سرگزشت کا بقیہ حصہ، بگڑی ہوئی قوم کا جواب

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایسی زوردار تقریر کے بعد بجائے اس کے کہ اس قوم میں قبولیتِ دعوت کے کوئی آثار پیدا ہوتے انھوں نے بیک زبان کہا کہ اس سر پھرے نوجوان کی زبان کاٹ دو، اسے قتل کر دو یا اسے جلا دو۔ یہ شخص اس قابل نہیں کہ اسے زندہ چھوڑا جائے۔ یہ ہمارے دیوتاؤں کی توہین کرتا اور ہمارے متفقہ عقائد کا انکار کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر تو پوری قوم متفق تھی کہ ابراہیم کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ البتہ ہلاکت کے طریقے میں اختلاف تھا۔ کوئی قتل کرنے کی بات کر رہا تھا اور کوئی جلا ڈالنے کی۔ آخر اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ جلا دیا جائے۔ یہاں اگرچہ جلا دینے کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن سورۃ انبیاء اور بعض دوسری سورتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو جلانے کے لیے بہت بڑا الاؤ روشن کیا گیا۔ جب آگ کے شعلے خوب بھڑک اٹھے اور انگارے خوب چٹخنے لگے تو آپ کو ایک منجنیق پر باندھ کر الاؤ میں پھینکا گیا۔ اس وقت آگ پر اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا جس کو سورۃ انبیاء میں ذکر کیا گیا ہے۔ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ ”ہم نے کہا! اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا۔“ خبردار ابراہیم جلنے نہ پائے، اس لیے اپنی تپش کو روک لے اور اتنی ٹھنڈی بھی نہ ہونا کہ ٹھنڈک

Marfat.com

نقصان دہ ثابت ہو بلکہ سلامتی بن جا۔ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا نہیں گیا، یہ اقتدار کی طرف سے صرف ایک دھمکی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اگر پھینکا نہیں گیا تو پھر آگ کو ٹھنڈی ہونے اور سلامتی بن جانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ بعض لوگ اس بات کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ اگر آپؑ کو واقعی آگ میں پھینکا گیا تو آپؑ جلنے سے محفوظ کیسے رہے؟ حالانکہ اس میں سمجھ میں نہ آنے والی بات کوئی بھی نہیں۔ اس لیے کہ آگ میں جلانے کی صلاحیت ذاتی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اس کی یہ صلاحیت واپس لے لیتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ جلا نہیں سکتی۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ پروردگار اشیاء کو خواص دے کر ان خواص کا پابند ہو گیا ہے اور اب ان خواص کے اظہار کو روکنے کی کوئی صورت نہیں تو ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں بڑا غلط تصور رکھتا ہے۔ آگ ہمیشہ جلاتی ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے تو وہ جلانے سے انکار کر دیتی ہے۔ جس طرح آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے سے انکار کر دیا اور اس امت میں اسودِ عنسی نے جب ایک صحابیِ رسول کو آگ کے الاؤ میں پھینکا کیونکہ انہوں نے اس کی جھوٹی نبوت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آگ کو ان پر گلزار بنا دیا۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچا لیا۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ میں ایمان لانے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ ان میں سے جو نشانیاں ہم جیسے کوتاہ فہموں کو بھی سمجھ میں آتی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

ایمان لانے والوں کے لیے اس سرگزشت میں نشانیاں

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مشرک قوم میں پلے بڑھے، مشرک باپ کے فرزند تھے، آپؑ کا گھر بت گری کا مرکز تھا، لیکن جیسے ہی توحید کی حقیقت ان پر کھلی اور شرک کی کمزوری کو سمجھا تو آپؑ نے اپنے گھر اور اپنی قوم کے خیالات کو رد کر کے اپنے آپ کو توحید کا علمبردار بنا لیا۔ گھر کی شاہانہ زندگی کو لات ماردی۔ آرام و راحت چھوڑ کر پر صعوبت زندگی کا راستہ اختیار کر لیا۔

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ابوالانبیاء اور تمام مذاہب کے بزرگ سمجھے جاتے ہیں۔ اور آپؑ کی جلالتِ قدر میں کسی کو شبہ نہیں۔ بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو بھی آزمائشوں میں ڈالا۔ اور جب تک آپؑ آزمائشوں سے کندن بن کر نہیں نکلے اس وقت تک آپؑ کو امامت کے منصب پر فائز نہیں کیا گیا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ و دعوت کے راستے میں آپؑ نے نہایت کٹھن مصائب کا سامنا کیا۔ حتیٰ کہ آگ کے الاؤ میں بھی کودنا پڑا۔ لیکن کسی وقت بھی آپؑ کے ثباتِ قدم اور استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ آپ کے عمل نے یہ بات ثابت کر دی کہ اللہ تعالیٰ جنہیں اپنی معرفت سے نوازتا ہے اور یقین و ایقان کی قوت عطا کرتا ہے وہ تکلیفوں کے بڑے سے بڑے طوفان کے سامنے بھی جھکنا نہیں جانتے۔ وہ ہر مصیبت کا سامنا کرتے ہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و نصرت کا پیغام آ جاتا ہے۔

۴۔ حق ابتداء میں ایک نکلتی ہوئی کونپل کی طرح نازک دکھائی دیتا ہے، یوں لگتا ہے تیز ہوا کا کوئی جھونکا اسے جلا دے گا۔ اہلِ حق بھی ابتداء میں بہت تھوڑے اور بہت کمزور ہوتے ہیں۔ اور مخالفین اس قدر طاقتور ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی خدائی کا یقین ہوتا ہے۔ لیکن حق و باطل کی اس کشمکش میں کامیابی ہمیشہ حق اور اہلِ حق کو ملتی ہے، باطل ہمیشہ ناکام و نامراد رہتا ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے الاؤ میں جھونکا جا رہا تھا اور کوئی ایک زبان بھی ان کے حق میں بولنے کو تیار نہ تھی۔ اور پھر وہ وقت آیا جب ان کے نواؤں کی صدائے بازگشت ملکوں ملکوں سنی گئی اور وہ لوگوں کے امام بنائے گئے۔

Marfat.com

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٢٥

(اور حضرت ابراہیم نے کہا تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانہ آگ ہوگا اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۲۵)

تمہاری دوستی کی بنیاد صرف دنیا تک ہے

اِنَّمَا حصر کے مفہوم میں ہے۔ یعنی تم نے انفرادی زندگی کو بگاڑنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تعمیر بت پرستی کی بنیاد پر کی ہے۔ جس پروردگار کو تم خالقِ کائنات تسلیم کرتے ہو اسے نہ اپنی انفرادی زندگی میں دخیل مانتے ہو اور نہ اپنی اجتماعی زندگی میں، بلکہ اس کے ساتھ تم نے جن قوتوں کو شریک کر رکھا ہے اور ان کے بت بنا کر بیت اللہ میں سجا رکھے ہیں وہ تمہاری اجتماعیت کے در و بست پر اس حد تک قابض ہو گئے ہیں کہ تم نے انہیں سے عقیدت اور محبت کی بنیاد پر اپنی قومی زندگی کا شیرازہ باندھا ہے۔ تم بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ کا گھر مانتے ہو اور اس کے ساتھ عقیدت بھی رکھتے ہو، لیکن تمہاری قومی زندگی کا تشخص اس کے حوالے سے نہیں بلکہ بت پرستی کے حوالے سے ہے۔ تم اس قبیلے سے دوستی رکھتے ہو جس کا بت بیت اللہ کے صحن میں موجود ہے۔ اور ان لوگوں سے قومی رشتہ باندھتے ہو جو بت پرستی کے تصورات میں تمہارے ہمنوا ہیں۔ تمہاری آپس کی دوستیاں، رشتہ داریاں اور تمام مذہبی، معاشرتی، تمدنی، معاشی اور سیاسی تعلقات کا قیام اسی رشتے کا مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ جب بھی کہیں توحید کی آواز اٹھتی ہے اور ایک خدا کی بندگی کی طرف بلایا جاتا ہے تو تم اسے اپنی قومی زندگی کے لیے موت تصور کرتے ہو۔ اس لیے پوری قوت سے اس کا راستہ روکنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہو۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قیامت کے دن تمہاری اجتماعیت کی یہ بنیادیں باقی نہیں رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے ہٹ کر تمام رشتے اس روز اپنی قدر و قیمت کھو دیں گے، صرف ایک ہی رشتہ باقی رہے گا جس کی بنیاد خدائے واحد کی بندگی اور نیکی اور تقویٰ پر قائم ہوگی۔ کفر اور شرک اور گمراہی اور آزادروی پر قائم تمام رشتے وہاں کٹ جائیں گے۔ تمام مصنوعی محبتیں دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گی، جھوٹی عقیدتیں نفرت میں بدل جائیں گی، خونی رشتے بھی اپنی حرارت کھو دیں گے اور دنیا میں جو لوگ گمراہی کے امام بن کر لوگوں کی عقیدتوں کا مرکز رہ چکے ہوں گے قیامت کے دن جیسے ہی ان کے پیروکار انہیں دیکھیں گے تو وہ ان پر لعنت بھیجیں گے۔ اور ہر ایک اپنی گمراہی کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر اللہ تعالیٰ سے درخواست کرے گا کہ اس ظالم نے مجھے گمراہ کیا، اسے دہرا عذاب دیا جائے۔ قرآنِ کریم نے اس باہمی تو تکار کا جو عقیدت مندوں اور ان کے لیڈروں میں ہوگی کئی مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ جو لوگ دعوت کے اس دور میں اپنے زیردستوں کو اطمینان دلا رہے تھے کہ وہ ان کے طریقے پر چلتے رہیں قیامت کے دن وہ ان کی طرف سے جواب دہی کر لیں گے۔ ان کو یہ آگاہی دی جا رہی ہے کہ قیامت کے دن اس قسم کے لیڈر اور اس قسم کے پیرو سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔ ان سب کا ٹھکانہ آخر جہنم ہوگا اور یہ ایسا برا ٹھکانہ ہے جس میں کوئی کسی کا مددگار نہیں ہوگا۔

Marfat.com

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۶﴾

(پس لوط، ابراہیم پر ایمان لائے اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں، بے شک وہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔ ۲۶)

حضرت لوط علیہ السلام کا قبولیتِ ایمان اور جرأتِ حق

سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آگ کے الاؤ سے بخیریت تمام نکل آئے تو آپؑ نے اس وقت وہاں موجود لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ باتیں ارشاد فرمائیں۔ ممکن ہے یہ خیال رہا ہو کہ اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر طبیعتوں میں یقیناً ایک انقلاب آیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ میری باتوں سے ان کے ذہن کے بند دریچے کھل جائیں اور انہیں ایمان کی دولت نصیب ہو جائے ، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں سوائے حضرت لوط علیہ السلام کے کسی کو ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ نوجوان تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر آپؑ پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔ ممکن ہے کچھ اور لوگ بھی اپنے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صداقت کا اعتراف رکھتے ہوں۔ لیکن حکومت کی غضب ناکی کو دیکھتے ہوئے کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ ابراہیم ابھی جس عظیم آزمائش سے بچ کے نکلے ہیں وہ کسی ذاتی دشمنی کا نتیجہ تو نہ تھی بلکہ انہیں ان خیالات کی سزا دی جارہی تھی جن کی طرف وہ سب کو دعوت دے رہے تھے۔ اب اگر کوئی ان خیالات کو قبول کرنے کا اعلان کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ بھی ابراہیم کی طرح ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کو تیار ہے۔ ایسا حوصلہ بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔ صرف ایک حضرت لوط علیہ السلام تھے جنہوں نے ایک مومن کی جرأت کا اظہار کیا۔ کیونکہ ان کی فطرت نہایت سلیم، ان کے جذبات نہایت صالح اور قبولیتِ حق ان کے دل کی آواز تھی۔ وہ آئندہ چل کر نبی بننے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا نبی نبوت کے منصب پر ایک خاص عمر کو پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے فائز ہوتا ہے لیکن اس کی طبیعت میں وہ تمام جوہر پوشیدہ ہوتے ہیں جس کا اظہار آگے چل کر ہونے والا ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ بت پرستوں کے دیس میں رہتا ہے لیکن بت پرستی سے نفرت کرتا ہے۔ اسے نبوت سے پہلے یہ خبر تو نہیں ہوتی کہ ایمان کی تفصیلات کیا ہیں اور خدا پرستی کی تعریف کیا ہے۔ لیکن وہ کفر و شرک کی ہر آلودگی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی پسِ پردہ تربیت کے باعث بلند سیرت و کردار کی حامل زندگی گزارتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو انہی بنیادی خصوصیات کے باعث اظہارِ ایمان میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ اس پوری قوم میں قبولیتِ ایمان کی کوئی رمق باقی نہیں۔ اس شہر کا مزاج اور اس قوم کے جذبات صرف کفر و شرک کے لیے سازگار ہیں۔ بنا بریں اللہ تعالیٰ کے کسی پیغمبر کے لیے یہ سرزمین اب سازگار نہیں۔ یہ قوم پہلے ہی میرے خون کی پیاسی ہے اور میرے قتل کے لیے بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ میرا یہاں مزید قیام تبلیغ و دعوت کے نقطۂ نگاہ سے کسی طرح مناسب نہیں۔ اس لیے آپؑ نے اعلان کیا کہ اب میرا بظاہر کوئی ٹھکانہ نہیں، لیکن ساری زمین اللہ تعالیٰ کی ہے۔ میں اپنے اللہ ہی کی طرف ہجرت کی نیت سے جا رہا ہوں۔ وہ ضرور مجھے کوئی ٹھکانہ دے گا۔ وہ سب پر غالب ہے، اس کے فیصلے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ حکمت والا ہے، وہی جانتا ہے کہ یہ شہر مجھ سے کوئی فائدہ کیوں نہیں اٹھا سکا۔

Marfat.com

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾

(اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور اس کی ذرّیت میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا، اور ہم نے اس کا اجر اس کو دنیا میں بھی دیا اور آخرت میں بھی وہ نیکوکاروں کے زمرے میں سے ہوگا۔ ۲۷)

ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ کا انعام

اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے راستے پر نکلنے والوں کو بے یارومددگار نہیں چھوڑتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ہجرت کی تو آپؑ کی ہمرکابی میں حضرت لوط علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور پھر حضرت اسحاق علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمایا۔ اور آگے چل کر حضرت یعقوب علیہ السلام جیسا پوتا عنایت فرمایا، اور پھر ان کو ایسی برکت عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو نبوت کے لیے چن لیا۔ ان میں مسلسل انبیائے اکرام اٹھائے اور اس طرح سے اس خاندان کو اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور لوگوں کی اصلاح کا مرکز بنا دیا۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا ہی میں ان کی خدمات کا صلہ عطا فرمایا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے گروہ میں شمار ہوں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اور بھی بیٹے عطا فرمائے، لیکن ان کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہی میں نبوت اور کتاب کی نعمت نازل ہوتی رہی۔ آپؑ کے بیٹے مدیان، مدین جن کا مرکز رہا ان کی شاخ میں صرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ اور آپؑ کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے سرکارِ رسالت مآب ﷺ تک اڑھائی ہزار سال کی مدت میں کوئی نبی نہیں آیا۔ لیکن اتنی طویل مدت کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے قیامت تک کے لیے ہدایت و رہنمائی کا مرکز تبدیل ہو گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک یروشلم ہی ان کا مرکز رہا اور حضرت اسحاق کی اولاد ہی میں نبوت و کتاب کا نزول ہوتا رہا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی نبوت کے بعد اسماعیلی شاخ کو ایسا اعزاز نصیب ہوا کہ اب قیامت تک آنحضرت ﷺ ہی دنیا کے امام اور پیشوا ٹھہرے۔ لیکن یہ تینوں شاخیں چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شجرِ طوبیٰ کا ثمر ہیں اس لیے آپؑ پر یہ اللہ تعالیٰ کا وہ انعام ہے جس میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ بابل کے حکمرانوں اور مذہبی پروہتوں نے تو آپ کا نام مٹا دینا چاہا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام ایسا روشن کیا کہ مخالفین تو دنیا سے ایسے مٹے کہ آج دنیا میں ان کا کہیں نام و نشان نہیں، مگر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے جرم میں لوگوں نے جلا کر خاک کر دینا چاہا تھا اور پھر جسے بے سروسامانی کی حالت میں وطن سے نکلنے پر مجبور کیا اس کو اللہ تعالیٰ نے ایسی سرفرازی عطا فرمائی کہ چار ہزار برس سے دنیا میں اس کا نام روشن ہے اور دنیا کے تمام بڑے مذاہب انہیں بالاتفاق اپنا پیشوا مانتے ہیں۔

Marfat.com

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾

(اور ہم نے لوط کو بھیجا جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ایک کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو جس کا ارتکاب تم سے پہلے کسی قوم نے بھی نہیں کیا۔ ۲۸)

حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت

اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ وہ آپ کے ساتھ ہی ہجرت کرکے اپنے وطن سے نکلے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معیت میں وہ کہاں کہاں گئے اور کیسی کیسی صعوبتیں اٹھائیں۔ لیکن پھر ایک وقتِ مقرر پر اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت سے نوازا۔ اور بحیرۂ مردار کے پاس سدوم اور دوسری بستیوں میں ایک نہایت پاجی قوم میں آپ کی بعثت ہوئی۔ اس قوم میں اور بھی برائیاں تھیں جو مشرک قوموں میں بالعموم ہوتی ہیں۔ لیکن ایک برائی ایسی تھی کہ جو کسی دوسری قوم میں ایسی اجتماعی شکل میں کبھی نہیں پائی گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انفرادی طور پر بھی کسی قوم کا کوئی فرد اس میں ملوث نہیں رہا بلکہ اس قوم کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس برائی کو اپنی قوم کی پہچان بنا دیا تھا۔ اور یہ برائی ان کے ہاں فیشن کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ قرآنِ کریم نے اسے یہاں فاحشہ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ فاحشہ ایسی کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کو کہتے ہیں جس کے بدکاری اور بے حیائی ہونے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ مراد اس سے امرد پرستی ہے جسے عمومی زبان میں لواطت کہتے ہیں۔ یہ قوم بری طرح اس مرض کا شکار تھی۔ اور شرم وحیاء کا ہر ٹانکا ان کی اجتماعی زندگی سے کٹ چکا تھا۔ قرآنِ کریم نے ان کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کے لیے طنز کے انداز میں کچوکہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ تم جس بے حیائی کا ارتکاب کر رہے ہو اس روئے زمین پر کسی قوم نے آج تک اسے وہ حیثیت نہیں دی جو تم دے چکے ہو۔ اور کسی قوم نے بھی اس لعنت کو قومی تہذیب کی علامت نہیں بنایا۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

(کیا تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہزنی کرتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو تو اس کی قوم کے پاس کوئی جواب اس کے سوا نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب لاؤ۔ ۲۹)

فاحشہ کی وضاحت اور تباہ ہونے والی قوم کا جواب

گزشتہ آیتِ کریمہ میں جس برائی کو فاحشہ سے تعبیر کیا گیا ہے اس آیت میں اس کی وضاحت ہے کہ تم اس قدر پاجی واقع ہوئے ہو کہ تم مردوں کے پاس جاتے ہو۔ اس کی مزید وضاحت سورۃ الاعراف میں ان الفاظ میں کی گئی ہے اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَاۗءِ ''تم خواہشِ نفس پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو۔'' یعنی قدرت نے شہوت کا مرکز عورت کو بنایا تھا اور دونوں کے اتصال سے دونوں کی جنسی ضرورت پوری ہوتی تھی اور اس کے نتیجے میں توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہتا تھا، لیکن تم ایسے

Marfat.com

بدبخت ہو کہ تم نے اصل جگہ کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ وہ تعلق پیدا کرلیا ہے، بعض اہلِ علم کے نزدیک اگلے جملے میں اسی تعلق کے نتیجے کو بیان کیا گیا ہے کہ اس طرح سے تم فطرت کی راہ مارتے ہو۔ سبیل سے مراد یہاں فطرت کی راہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مرد، مردوں سے شہوت رانی کرنے لگیں اور آہستہ آہستہ عورتوں کی طرف مردوں کی رغبت بالکل ہی ختم ہوجائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا کہ قدرت نے مرد وعورت کو نسلِ انسانی کی بقاء اور افزائش کا ذریعہ بنایا تھا، لیکن اس بگڑی ہوئی صورتحال میں وہ اہلاکِ انسانی کا ذریعہ بن جائیں گے جو ظاہر ہے کہ فاطرِ فطرت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن بعض دیگر اہلِ علم نے تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ تم رہزنی کرتے ہو، یعنی تمہاری اخلاق گراوٹ کا حال یہ ہے کہ تم نے جنسی تعلق مردوں کے ساتھ جوڑ رکھا ہے اور انسان ہوتے ہوئے انسانوں کے ساتھ دشمنی کا عالم یہ ہے کہ تم قافلے لوٹتے ہو اور تمہاری وجہ سے راستے پرخطر ہوگئے ہیں اس کے بعد فرمایا کہ شرم وحیاء کا لبادہ تم نے اس حد تک اتار دیا ہے کہ تم اپنی مجلسوں میں علانیہ ایک دوسرے کے سامنے بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب شرم وحیاء کا آخری ٹانکا بھی ٹوٹ کر رہ جائے اور معاشرہ اور سوسائٹی تہذیب اور فیشن کے نام سے بے حیائیوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے۔ ان کی زبانیں بے حیائی کے ذکر سے غلیظ سے غلیظ تر ہوجائیں اور ان کا لٹریچر بے حیائی کے فخریہ اظہار کا نمونہ بن کر رہ جائے۔

قومِ لوط پر ان الزامات کو دیکھتے ہوئے حیرت ہونے لگتی ہے کہ کیا کوئی قوم اخلاقی طور پر اس قدر آوارہ اور بے حس بھی ہوسکتی ہے، لیکن جس کی نظر آج کے مغرب امریکہ اور کینیڈا وغیرہ پر ہے اس کے لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ برطانیہ کا باوقار ہاؤس باہم جنس پرستی کے بل کو قانونی شکل دے چکا ہے۔ ایسے کلب وجود میں آچکے ہیں جہاں آزادانہ اس قماش کے لوگ دادِ عیش دیتے نظر آتے ہیں۔ اور gay stil of life کے نام سے باقاعدہ لٹریچر تیار ہوچکا اور فلسفہ وجود میں آگیا ہے۔ لائبریریوں میں اسی نام سے مستقل پورشن قائم کردیے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ اس دور میں ہو رہا ہے جس دور کو علم ودانش کا دور کہا جاتا ہے۔ ٹھیک کا کسی نے:

یہ روشنی کا زمانہ، یہ ظلمتوں کا ورود
اس انجمن کے خداؤ بڑا اندھیرا ہے

حضرت لوط علیہ السلام کی اس ملامت آمیز تبلیغ ودعوت کے جواب میں آپ کی قوم نے یہ کہا کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہو اور تمہاری تکذیب سے اللہ تعالیٰ کا عذاب ہم پر آنے والا ہے تو تم وہ عذاب ہم پر لے آؤ، ہم اس عذاب کے لیے تیار ہیں۔

اور قرآنِ کریم میں دوسرے جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حضرت لوط کی تبلیغی کاوشوں کے جواب میں آپؑ کی قوم نے ایک دوسرے سے کہا کہ لوط اور اس کے گھر والوں کو اس بستی سے نکال باہر کرو، یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں، یہ ہمارے ساتھ رہنے کے قابل نہیں، ہم لطیف جذبات کے مالک ایسے کثیف لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٣٠﴾

(حضرت لوط نے کہا اے میرے رب اس مفسد لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔ ٣٠)

Marfat.com

حضرت لوطؑ کی فریاد بارگاہِ ایزدی میں

یعنی جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ ان کے لیے حضرت لوط علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت اور برائیوں پر تنقید ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ وہ ان سے عذاب کا مطالبہ کرنے لگے یا انہیں اپنے شہر سے نکالنے کا عزم کرنے لگے، تب حضرت لوط علیہ السلام نے یہ محسوس کرلیا کہ اب فیصلے کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے کہ الٰہی! میں نے اپنی قوم کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، لیکن ان کی ضد اور ان کا بگاڑ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ میری تمام تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ اور اب یہ قوم مجھے ہی مٹا دینے یا نکالنے پر تل گئی ہے، اب تو میری مدد فرما اور اس مفسد قوم کو تباہ کردے۔

وَلَمَّا جَاۤءَتْ رُسُلُنَآ

اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ
اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝٣١ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ
كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝٣٢ وَلَمَّآ اَنْ جَاۤءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْۗءَ
بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ
اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝٣٣
اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۤءِ
بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝٣٤ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ ۝٣٥ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝٣٦

Marfat.com

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٣٧﴾
وَعَادًا وَّثَمُوْدَاْ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ
الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿٣٨﴾
وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۗ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ
فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿٣٩﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا
بِذَنْبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ
اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ
مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿٤٠﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ
الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ
الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٤٢﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ
نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿٤٣﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٤٤﴾

رکوع: ۴۔ (جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے، انہوں نے کہا ہم اس بستی والوں کو ہلاک کر دینے والے ہیں، اس بستی کے رہنے والے سخت ظالم ہو چکے ہیں۔ ۳۱) حضرت ابراہیم نے کہا اس بستی میں تو لوط بھی ہے، فرشتوں نے جواب دیا ہم خوب جانتے ہیں جو اس میں ہے، ہم اس کو اور اس کے اہل کو بچا لیں گے، مگر اس

Marfat.com

کی بیوی کو، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ ۳۲) جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور دل تنگ ہوئے، اور (انہیں پریشان دیکھ کر) فرشتوں نے کہا، نہ ڈرو اور نہ رنج کرو، ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو سوائے تمہاری بیوی کے نجات دینے والے ہیں، اور وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ ۳۳) ہم اس بستی کے لوگوں پر ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔ ۳۴) اور ہم نے اس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ان لوگوں کے لیے جو سوچنا سمجھنا چاہیں۔ ۳۵) اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، تو اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور یومِ آخرت کے امیدوار رہو اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو۔ ۳۶) تو انہوں نے اس کو جھٹلا دیا، آخر کار ایک سخت زلزلے نے انہیں آ پکڑا، پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ ۳۷) اور عاد اور ثمود کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا اور واضح ہیں تم پر ان کے رہنے کی جگہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا اور اس طرح ان کو صحیح راہ سے برگشتہ کر دیا حالانکہ وہ بڑے ہی ہوشیار لوگ تھے۔ ۳۸) اور قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے زمین میں گھمنڈ کیا حالانکہ وہ ہمارے قابو سے باہر نکل جانے والے نہ تھے۔ ۳۹) پس ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا، پس ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور ان میں سے بعض کو زبردست دھماکے نے آ پکڑا، اور ان میں سے کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کسی کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۴۰) ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں مکڑی کی مثال کی طرح ہے جس نے ایک گھر بنایا اور بے شک سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے، کاش وہ اس حقیقت کو جانتے۔ ۴۱) بے شک اللہ خوب جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو وہ اس کے سوا پکارتے ہیں اور وہی زبردست اور حکمت والا ہے۔ ۴۲) یہ مثالیں لوگوں کی فہمائش کے لیے بیان کرتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ ۴۳) اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، بے شک اس میں اہلِ ایمان کے لیے ایک نشانی ہے۔ ۴۴)

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

(جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے، انہوں نے کہا ہم اس بستی والوں کو ہلاک کر دینے والے ہیں، اس بستی کے رہنے والے سخت ظالم ہو چکے ہیں۔ ۳۱)

Marfat.com

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت اور قومِ لوط کے لیے عذاب لے کر آئے

حضرت لوط علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو ان کی قوم پر عذاب لانے کے لیے بھیج دیا، لیکن وہ آپؑ کے پاس جانے سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر آئے۔ یہ بشارت وہ ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ یعنی وہ یہ بشارت لے کر آئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حضرت اسحاق علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمائے گا۔ وہ لمبی عمر پائیں گے، شادی کی عمر کو پہنچیں گے پھر اللہ تعالیٰ انہیں حضرت یعقوب علیہ السلام جیسا بیٹا عطا کرے گا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے اور پوتے دونوں کی ایک ساتھ بشارت دی گئی تاکہ آپ کی خوشیوں میں اضافہ ہو کہ اللہ تعالیٰ صرف آپ کو بیٹا ہی نہیں دے گا بلکہ صاحبِ اولاد بیٹا دے گا اور آپ کا پوتا بھی صاحبِ اولاد ہوگا اور پھر اس گھر کو اللہ تعالیٰ نبوت اور کتاب کا مرکز و مہبط بنائے گا۔ اس بشارت کے ساتھ ساتھ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی بھی خبر دی کہ اب ہم اس بستی کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ اشارہ قومِ لوط کے علاقے کی طرف تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت فلسطین کے شہر حبرون (موجودہ الخلیل) میں رہتے تھے۔ اس شہر کے جنوب مشرق میں چند میل کے فاصلے پر بحیرۂ مردار کا وہ حصہ واقع ہے جہاں پہلے قومِ لوط آباد تھی اور اب جس پر بحیرہ کا پانی پھیلا ہوا ہے۔

آیت کے آخر میں قومِ لوط پر عذاب کی علت بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ہلاک کیے جانے کا فیصلہ اس لیے ہوا ہے کہ انہوں نے فطرت کی راہ سے انحراف کر کے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب کر کے اپنے اوپر جو ظلم اوڑھ رکھا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دھرتی کو ایسے لوگوں سے پاک کر دیا جائے۔ جو درخت پھل دینے کی بجائے تعفن پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے اور جو زمین فصل اگانے کی بجائے سیم اور تھور کو پیدا کرتی ہے اور جو عمارت سایہ دینے کی بجائے سانپوں کو بھٹ بن جاتی ہے اسے کبھی باقی نہیں رکھا جاتا۔ اس کی تباہی میں خلقِ خدا کا بھلا ہوتا ہے۔

قَالَ اِنَّ فِيۡهَا لُوۡطًا‌ ؕ قَالُوۡا نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِيۡهَا ۖ لَـنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ﴿۳۲﴾

(حضرت ابراہیم نے کہا اس بستی میں تو لوط بھی ہے، فرشتوں نے جواب دیا ہم خوب جانتے ہیں جو اس میں ہے، ہم اس کو اور اس کے اہل کو بچا لیں گے، مگر اس کی بیوی کو، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔ ۳۲)

حضرت لوطؑ سے متعلق حضرت ابراہیمؑ کی تشویش اور اس کا جواب

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ یہ فرشتے قومِ لوط پر عذاب لے کر جا رہے ہیں تو آپؑ نے پریشان ہو کر حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں پوچھا کہ وہ بھی تو اس بستی میں ہیں، ان کا کیا بنے گا۔ فرشتوں نے بتایا کہ ہم اس کے اہلِ خانہ اور اس پر ایمان لانے والوں کو اس عذاب سے محفوظ رکھیں گے۔ لیکن ان کی بیوی وہ عذاب کی نذر ہو جائے گی کیونکہ وہ اپنے عظیم شوہر کے ساتھ مخلص نہیں اس کا تعلق عقیدے کے اعتبار سے اپنی قوم کے ساتھ ہے۔ اندازہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیغمبر کے ساتھ برسوں کا تعلق بھی ایمان کے بغیر کام نہیں آتا۔ اس کے ساتھ وہی عادلانہ سلوک ہوتا ہے جو باقی کافروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ
وَلَا تَحْزَنْ ۗ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

(جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور دل تنگ ہوئے، اور (انہیں پریشان دیکھ کر) فرشتوں نے کہا، نہ ڈرو اور نہ رنج کرو، ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو سوائے تمہاری بیوی کے نجات دینے والے ہیں، اور وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ ۳۳)

حضرت لوط علیہ السلام کی آزردگی اور فرشتوں کی تسلی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے رخصت ہو کر فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی سخت آزردہ اور تنگ دل ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ فرشتے خوبصورت نوخیز لڑکوں کی شکل میں تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو اس کا علم نہیں تھا کہ یہ فرشتے ہیں۔ وہ انہیں نوعمر لڑکے سمجھ کر اپنی قوم کی بداخلاقی کا تصور کر کے کانپ اٹھے۔ وہ جانتے تھے کہ جیسے ہی میری قوم کے لوگوں کو ان خوبرو نوجوانوں کے آنے کی خبر ہوگی وہ دیوانہ وار میرے گھر کا رخ کریں گے اور وہ ان لڑکوں کو حوالے کرنے کا مطالبہ کریں گے۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ میں اپنے ان عزیز مہمانوں کو نہ تو ان بدکردار لوگوں سے بچا سکتا ہوں اور نہ ان بدکرداروں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ اگر میں ان سے معذرت کردوں کہ آپ یہاں سے فوراً نکل جائیں تو اس سے بڑی بے مروتی کیا ہوگی، میری شرافت اسے گوارا نہیں کر سکتی۔ سورۃ ہود اور دوسری سورتوں میں یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ ان لڑکوں کی آمد کی خبر سن کر شہر کے بہت سے اوباش حضرت لوط علیہ السلام کے مکان پر ہجوم کر کے آئے اور اصرار کرنے لگے کہ اپنے ان مہمانوں کو بدکاری کے لیے ہمارے حوالے کردو۔ حضرت لوط علیہ السلام نے لاکھ منت سماجت کی، لیکن ان بدمعاشوں نے ایک نہیں سنی۔ فرشتوں نے جب دیکھا کہ حضرت لوط علیہ السلام بے بسی کی تصویر بنے ان بدبختوں کی منت سماجت کر رہے ہیں تو انہوں نے اپنا پردہ اٹھا دیا اور حضرت لوط علیہ السلام کو اطمینان دلایا کہ ہم چھوکرے نہیں، فرشتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور نہ آپ تک پہنچ پائیں گے، ہم ان کے لیے فیصلہ کن عذاب لے کر آئے ہیں اور مزید یہ کہہ کر حضرت لوط علیہ السلام کو تسلی دی کہ آپؑ اپنی اور اپنے متعلقین کے باب میں کوئی اندیشہ نہ کریں ہم آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو اس عذاب سے بچا لیں گے۔ البتہ آپ کی بیوی آپ کے ساتھ نہیں جائے گی وہ اپنی قوم کے ساتھ مبتلائے عذاب ہوگی۔

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾

(ہم اس بستی کے لوگوں پر ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔ ۳۴)

Marfat.com

قوم لوط پر عذابِ الٰہی فرشتوں کے توسط سے

حضرت لوط علیہ السلام کو یہ اطمینان دلا کر کہ آپ اور آپ کے اہلِ خانہ اس عذاب سے محفوظ رہیں گے تو پھر انہیں اس فیصلۂ الٰہی کی خبر دی کہ ہم اس بستی والوں پر قہرِ آسمانی نازل کرنے والے ہیں۔ ''رجز'' سے مراد اس طرح کا عذاب ہے جو سننے اور دیکھنے والوں کے دلوں میں کپکپی پیدا کر دے اور من السمآء کے لفظ نے اس کی شدت اور ہولنا کی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ اگرچہ عذاب کا لفظ ہی دہلا دینے کے لیے کافی ہے لیکن جب عذابِ آسمانی یا قہرِ الٰہی کہا جاتا ہے تو اس کی شدت اور تباہی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان الفاظ سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ان بدبختوں نے اخلاق اور شرافت کے پرخچے اڑائے ہیں اسی طرح اب ان کے چیتھڑے اڑیں گے۔ اور آخر میں فرمایا کہ ان پر یہ عذاب اس وقت نازل کیا جا رہا ہے جب ان کی سرکشی اور نافرمانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر شدید ترین عذاب اس وقت بھیجتا ہے جب وہ قوم شدید ترین نافرمانی کی خوگر ہو جاتی ہے۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةً ۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٣٥﴾

(اور ہم نے اس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ان لوگوں کے لیے جو سوچنا سمجھنا چاہیں۔ ۳۵)

قوم لوط کی بستی عقل والوں کے لیے نشانی ہے

قومِ لوط کی یہ بستی جس جگہ آباد تھی وہ علاقہ قریش کے تجارتی قافلوں کا راستہ تھا۔ اس لحاظ سے ان بستیوں کا تباہ ہونا اور عذابِ الٰہی کا شکار ہونا ایک ایسا واضح نشان تھا جسے ہر گزرنے والا قافلہ دیکھ سکتا تھا۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کھلی نشانی سے مراد بحیرۂ مردار ہے جسے بحرِ لوط بھی کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کئی جگہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں جس شاہراہِ عام سے گزرتے ہو وہ ایک ایسی کھلی نشانی ہے جو تمہارے سامنے قومِ لوط کی تاریخ کھول کر رکھ سکتی ہے اور تم اس میں اپنا انجام دیکھ سکتے ہو۔ موجودہ زمانے میں یہ بات قریب قریب یقین کے ساتھ تسلیم کی جا رہی ہے کہ بحیرۂ مردار کا جنوبی حصہ ایک ہولناک زلزلہ کی وجہ سے زمین میں دھنس جانے کی بدولت وجود میں آیا اور اسی دھنسے ہوئے حصے میں قومِ لوط کا مرکزی شہر سدوم واقع تھا۔ اس حصے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی بستیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔

قوموں پر کس طرح عذاب آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون کب حرکت میں آتا ہے، قومِ لوط کی یہ بستی ہر طرح سے اس کا ایک واضح نشان ہے لیکن ایسے آثار سے فائدہ اٹھانے کے لیے عقل درکار ہے۔ جو لوگ عقل نہیں رکھتے یا عقل سے کام نہیں لیتے وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ان کو نظر کچھ بھی نہیں آتا۔ کتنے ماہرینِ اثریات ہیں جو تمام کھنڈروں کے ایک ایک نقش کو پڑھ لینے میں بڑے ہوشیار ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان سے کوئی اخلاقی سبق حاصل کریں وہ صرف کلچر تلاش کرتے ہیں۔ نتیجہ سب کو معلوم ہے:

عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

Marfat.com

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۳۶﴾

(اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، تو اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور یومِ آخرت کے امیدوار رہو اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو۔ ۳۶)

مزید چند تاریخی حوالے اختصار کے ساتھ

اس سورۃ کے آغاز میں تمہیدی طور پر چند بنیادی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں اور پھر ان کی تائید اور وضاحت کے لیے چند انبیائے کرام کی سرگزشتیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں۔ اب انہیں باتوں کو مزید اجاگر کرنے کے لیے نہایت اختصار کے ساتھ چند تاریخی حوالے دیے جا رہے ہیں جن سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے کسی رسول نے انسانوں کی ہدایت کے لیے تبلیغ و دعوت کا آغاز کیا ہے اور کچھ لوگوں نے اس دعوت سے متاثر ہو کر ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہیں آزمایا نہ گیا ہو۔ ایمان ایک ایسی گہری وابستگی کا نام ہے جس کا دعویٰ ضرور آزمایا گیا ہے۔ چنانچہ یہی بات ان حوالوں سے بھی پوری طرح واضح فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح مخالفین کو تنبیہ کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم اپنے پیغمبروں اور ان پر ایمان لانے والوں کو ضرور امتحان میں ڈالتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم انہیں لاوارث چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کو اذیتیں پہنچانے والوں اور ان کی دعوت کا راستہ روکنے والوں کو ایک خاص حد تک ڈھیل دی جاتی ہے لیکن جب پیمانہ بھر جاتا ہے اور ان کی سرکشی انتہاؤں کو چھونے لگتی ہے تو پھر ہم انہیں پکڑ لیتے ہیں۔ چنانچہ چند معذب قوموں اور معذب افراد کے حوالے سے اس حقیقت کو بھی مبرہن کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے سب سے پہلے اہلِ مدین یعنی قومِ شعیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہم اس کی تفصیل گزشتہ سورتوں میں پڑھ چکے ہیں۔ یہ قوم بھی قریش کی طرح تجارت پیشہ قوم تھی۔ اور انہوں نے اس میدان میں اس قدر ترقی کی تھی کہ قریش شاید اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس کی اصلاح کے لیے جب حضرت شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا گیا اور انہوں نے انہیں ایک خدا کی بندگی کی دعوت دی اور آخرت کا خوف دلا کر متنبہ کیا کہ تم نے جس طرح کاروباری زندگی کو خیانت اور دھوکے کے کاروبار میں تبدیل کر دیا ہے اور اپنے اس دھوکے کے کاروبار سے جو دولت تم نے کمائی ہے اس کے بل بوتے پر تم نے زمین کو فساد سے بھر دیا ہے، اس سے باز آ جاؤ۔ بجائے مفسد بننے کے مصلح بن کر زندگی گزارو اور ظلم اور سرکشی کی بجائے حق و عدل کے علمبردار بنو۔ لیکن قومِ شعیب نے آپؑ کی ایک بات نہ سنی اور اپنی ناعاقبت اندیشی میں تباہی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اور انہوں نے آج کی طرح یہ سمجھا کہ تجارت کبھی جھوٹ اور فریب کے سوا نہیں ہو سکتی۔ اور دولت اپنے ساتھ خیال اور عمل کی جس بے راہ روی کو لے کر آتی ہے اگر اسے اختیار نہ کیا گیا تو دولت حاصل کرنے کا کیا فائدہ۔

فَکَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۳۷﴾

(تو انہوں نے اس کو جھٹلا دیا، آخرکار ایک سخت زلزلے نے انہیں آ پکڑا، پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ ۳۷)

Marfat.com

حضرت شعیب علیہ السلام کی تکذیب پر اہلِ مدین پر عذاب

حضرت شعیب علیہ السلام کی تمام تر تبلیغی کاوشوں کے جواب میں قومِ شعیب نے کسی بات پر کان دھرنے کی بجائے ان کی تکذیب کردی اور صاف کہا کہ ہم تجھے اللہ تعالیٰ کا نبی ماننے سے انکار کرتے ہیں اور تمہیں ایک جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی تبلیغی مساعی کی وجہ سے چونکہ ان پر اتمامِ حجت ہو چکا تھا اور انہیں سمجھانے بجھانے کی حد تک کوئی کمی باقی نہیں رہی تھی تو پھر اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں آ پکڑا۔ وہ اپنے تجارتی کاروبار کی انتہائی کامیابیوں کو دیکھ کر یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں اور ہماری کامیابیوں پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ دولت ہمیشہ ہمارے گھر کی کنیز بنی رہے گی اور دنیا کی آسائشیں ہمیشہ ہمارا مقدر رہیں گی۔ لیکن انہیں ایک زلزلے نے تہ وبالا کردیا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔ ان میں سے ایک ایک آدمی زندگی کی تلاش میں اپنے گھروں کے آنگن میں ڈھیر ہوگیا۔ اوندھے منہ لاشیں پڑی تھیں اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا۔ اور یہ ان لوگوں کی لاشیں تھیں جو اپنی موت کے تصور کو بھی اپنے لیے ناممکن سمجھتے تھے۔

وَعَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۗ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿٣٨﴾

(اور عاد اور ثمود کو بھی ہم نے ہلاک کردیا اور واضح ہیں تم پر ان کے رہنے کی جگہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا اور اس طرح ان کو صحیح راہ سے برگشتہ کردیا تھا حالانکہ وہ بڑے ہی ہوشیار لوگ تھے۔ ۳۸)

آیت کے آغاز میں فعل اَخَذْنَا محذوف ہے۔ عاد اور ثمود دو مشہور قومیں ہیں، ان کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ قومِ عاد جنوبی عرب کے اس علاقے میں آباد تھی جو ابِ احقاف، یمن اور حضرموت کے نام سے معروف ہے۔ اہلِ عرب اس قوم سے خوف واقف تھے۔ ان کے واقعات سینہ بہ سینہ پورے عرب میں پھیل چکے تھے۔

عاد و ثمود کا حوالہ

قومِ ثمود حجاز کے شمالی حصہ میں آباد تھی۔ رالغ سے عقبہ تک اور مدینہ وخیبر سے تیما اور تبوک تک کا سارا علاقہ ان کے زیرِ تصرف تھا آج بھی یہ علاقہ ان کے آثار سے معمور ہے۔ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ سے ان کے ان محلات کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے پہاڑوں کو کھود کر بنائے تھے اور یہ ان کی رہائش گاہیں تھیں۔ اور ان میں سے بہت سے محلات کے کھنڈرات آج بھی وہاں موجود ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمدن و تعمیر کا فن اس قوم میں کس حد تک عروج پر تھا اور ان کے بعض کارناموں سے ان کی سائنسی مہارت سے بھی آدمی مبہوت ہو جاتا ہے۔ سائنسی علوم میں اپنی تمام تر مہارت اور تمدن و تعمیر میں تمام تر ترقی کے باوجود ان کا حال یہ تھا کہ شیطان نے انہیں ہوائے نفس اور سفلی خواہشات کا ایسا خوگر بنا دیا تھا کہ وہ انہیں باتوں کو اپنی تہذیب اور ثقافت کا معیار سمجھتے تھے۔ اور صراطِ مستقیم ان کی نگاہوں سے ایسے اوجھل ہوئی تھی کہ اس کا تصور بھی ان کے لیے اجنبی بن کر رہ گیا تھا حالانکہ وہ لوگ دنیوی اعتبار سے بڑے ہی ہوشیار لوگ تھے۔ مُسْتَبْصِرِيْنَ سے ان کی

Marfat.com

دنیوی مہارت اور ان کے تمدنی فنون میں بصیرت کی طرف اشارہ ہے جن چیزوں کا تعلق جسمانی ضرورتوں سے ہے اور جن چیزوں سے دنیا کی ہمہمی ہے۔ اور نفسانی خواہشیں جن کے حصول میں دلچسپی رکھتی ہیں اور ہر غلط سلط طریقے سے جس طرح سے دولت کو سمیٹا جا سکتا ہے ان میں سے ہر بات میں وہ پوری طرح اتارو تھے۔ لیکن آخرت کی دنیا ان کے لیے ایک افسانہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا تصور محض ایک واہمہ تھا۔ اخلاقی مسلمات محض ڈھکوسلے تھے۔ قرآنِ کریم نے دوسری جگہ ایسے لوگوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ ''وہ دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں لیکن وہ آخرت سے غافل ہیں۔'' شیطان نے ان ہی کے اعمال کی خوشنمائی سے ان کے گرد ایک ایسا حصار کھینچ رکھا تھا کہ وہ اس حصار سے باہر نکل سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اور وقت کے علوم و فنون میں مہارت کے باوصف وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ آخرت کیا چیز ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئے۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۙ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿٣٩﴾

(اور قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے زمین میں گھمنڈ کیا حالانکہ وہ ہمارے قابو سے باہر نکل جانے والے نہ تھے۔ ۳۹)

تاریخ کے چند نمایاں متکبرین

یہاں بھی آیت سے پہلے فعل اَخَذْنَا محذوف ہے۔ تاریخ کی بعض اقوام سے استدلال کرنے کے بعد اب تاریخ کے بعض نمایاں افراد سے استشہاد کیا جا رہا ہے جو اسی فکر اور اسی طرزِ زندگی کے نمائندہ تھے جس کی وجہ سے متذکرہ قومیں ہلاک ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے پہلے قارون کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اشرافِ قریش کو زیادہ تر مماثلت قارون کے کارناموں سے تھی اس نے بھی جلبِ زر اور دولت کی فراوانی کو اپنا مقصدِ زندگی بنا رکھا تھا اور اسی کے حصول کے لیے اس نے اپنی قوم سے رشتہ توڑا، اللہ تعالیٰ کے نبی کی قرابت داری بھی اس کے کام نہ آسکی۔ اور انبیاء کی اولاد ہوتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کے دین کی مخالفت کو اس نے اپنا وطیرہ بنا لیا۔ قریش میں یوں تو ہر بڑا آدمی اسی راستے کا مسافر تھا لیکن ابولہب خاص طور پر قریش کا قارون کہلانے کا مستحق تھا۔ چنانچہ اس کے انجام سے اشرافِ قریش کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم جو طرزِ عمل اختیار کر چکے ہو اور دولت ہی کو سب کچھ سمجھ کر غریب مسلمانوں کا مذاق اڑاتے اور نبی کریم ﷺ کو غربت کا طعنہ دیتے ہو۔ کاش تمہیں احساس ہوتا کہ یہ دولت اپنے اندر کیسا زہر رکھتی ہے۔

اس کے بعد فرعون اور ہامان کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ایک وقت کا مطلق العنان حکمران اور دوسرا اس کا وزیر اعظم تھا۔ دونوں کو اقتدار کے نشے نے اندھا کر رکھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بے سروسامانی ان کے لیے قبولیتِ ایمان کے راستے کا پتھر بن گئی تھی۔ اقتدار اور دولت سے محبت نے انہیں بصیرت سے بالکل محروم کر دیا تھا۔ اس لیے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عظیم معجزات کو دیکھ کر بھی راہِ راست کو

Marfat.com

پہچاننے سے عاجز رہ گئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہچاننے کے باوجود انہوں نے حق کو قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کے نتیجے میں اقتدار اور سیادت سے محروم ہونا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا راستہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ملتا ہے۔ تکبر اور تمرد اس راستے کی وہ تاریکیاں ہیں جس میں آدمی سب کچھ گم کر بیٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت کو جانتے ہوئے بھی وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت اگر آ گئی تو ہم اس سے بچ کر کبھی نہیں نکل سکیں گے۔ چنانچہ اسی فریب نظر کا شکار ہو کر آخر اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾

(پس ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا، پس ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور ان میں سے بعض کو زبردست دھماکے نے آ پکڑا، اور ان میں سے کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کسی کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۴۰)

خلاصۂ کلام

اب یہ آخر میں متذکرہ بالا تمام اقوام و افراد کا انجام ایک ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، لیکن سب سے پہلے اس بات پر توجہ دلائی گئی ہے کہ ہم نے ان میں سے جسے بھی پکڑا ہے اس کے جرم اور گناہ کی پاداش میں پکڑا ہے۔ جاہلیت کے دور میں یہ جو بات مشہور ہو گئی تھی اور آج بھی بعض جہلاء یہ بات کہتے ہیں کہ پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کن کاموں میں راضی ہے اور کن کاموں میں ناراض، اور نہ جانے بعض دفعہ کیوں اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور وہ آفتیں اور مصیبتیں نازل کرنے لگتا ہے۔ یہاں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور گرفت ہمیشہ جرائم اور گناہوں پر آتی ہے۔ تمرد اور سرکشی عذاب کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ متذکرہ بالا قومیں اور افراد بھی اپنے جرائم ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ کسی کو کنکر پتھر برسا دینے والی طوفانی ہوا سے تباہ کیا گیا۔ جس طرح قومِ لوط کو نہایت ہولناک تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ اور قومِ عاد، ثمود اور مدین پر صَيْحَه یعنی زلزلے کا عذاب آیا۔ قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا اور فرعون اور ہامان غرق کر دیے گئے۔ لیکن یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ انہیں بار بار رسولوں کے ذریعے بتلایا گیا کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان لا کر اپنا فرض انجام نہ دیا تو تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ بلکہ اپنے طرزِ عمل میں کسی طرح کی تبدیلی لانے کی بھی زحمت نہ کی۔ چنانچہ اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا برسا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔

Marfat.com

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۖ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۗ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾

(ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا دوسرے سرپرست بنالیے ہیں مکڑی کی مثال کی طرح ہے جس نے ایک گھر بنایا اور بے شک سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے، کاش وہ اس حقیقت کو جانتے۔ ۴۱)

شرک اور اہلِ شرک کی تمثیل

اوپر جتنی قوموں اور جتنے افراد کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب شرک کے مرض میں مبتلا تھے اور جن قوتوں کو انہوں نے اپنا معبود بنا رکھا تھا اور ان کا گمان یہ تھا کہ وہ ہمارے حامی و مددگار اور سرپرست ہیں ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے میں انہیں دخل ہے۔ وہ خوش ہوں تو انسان کی قسمت سنور جاتی ہے، ناراض ہوں تو انسان کی قسمت کے بگاڑ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ البتہ ان کی پوجا پاٹ اور نذر و نیاز سے ان کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور اس طریقے سے ان کی مہربانی اور سرپرستی کا اعزاز حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے وہ دنیا میں بھی ہماری حفاظت کریں گے اور زندگی کی تمام ضروریات کی کفالت کریں گے اور آخرت میں بھی ہمیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچائیں گے۔ اوپر کے تاریخی واقعات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جب ان مشرک قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو جن قوتوں کو انہوں نے اپنا اوتار، دیوتا یا کارساز بنا رکھا تھا کوئی بھی ان کے کام نہ آیا۔ اور آج تاریخ میں وہ عبرت کی علامت بنے ہوئے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے جن سہاروں پر بھروسا کیا وہ ایسی سیدھی بات نہ سمجھ سکے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ان سہاروں کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایسے موہوم سہارے، خیالی معبود یا انسانی آستانے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں مکڑی کے جالے کی مانند ہیں۔ مکڑی اپنے جالے سے گھر بناتی ہے اور وہ اپنے زعم میں اسے ایک قلعہ سمجھتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ اتنا کمزور اور بے ثبات ہوتا ہے کہ ہوا کے ایک جھونکے کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن مکڑی کو اپنے گھر کے بودے پن کا کبھی احساس نہیں ہوتا۔ مشرک افراد اور مشرک قوموں کو بھی یہی حال ہوتا ہے۔ وہ اپنے غلط عقائد پر بھروسا کرتی ہیں اور سائنس پر ایمان لانے والے لوگ اپنی ٹیکنالوجی کو سب سے بڑی قوت سمجھتے ہیں۔ لیکن نہ جانے انہیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرتوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں۔ اور مکڑی کا جالا نہایت کمزور اور بے وقعت چیز ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا فائدہ کسی قوم یا فرد کو اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٤٢﴾

(بے شک اللہ خوب جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو وہ اس کے سوا پکارتے ہیں اور وہی زبردست اور حکمت والا ہے۔ ۴۲)

اللہ تعالیٰ ہر چیز کی حقیقت سے آگاہ ہے

اوپر کی تمثیل سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ مشرکین نے جن دیویوں اور دیوتاؤں یا دیگر قوتوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے ان کی تحقیر میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے اور دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لیے ابلاغ کو ایک حربے کے طور پر کام میں لایا گیا ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔ اس تمثیل میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بالکل حقیقت ہے۔ تمام جھوٹے معبودوں کی قوت اللہ تعالیٰ کی قوت کے مقابلے میں اتنی بھی

Marfat.com

نہیں جیسے مکڑی کا جالا ہوتا ہے۔ یہ تمثیل بھی تقریبِ فہم کے لیے ہے، حقیقت نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی بڑی سے بڑی قوت کی بھی کوئی حقیقت نہیں جسے مثال میں بیان کیا جاسکے جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی عظمت اور ہیبت کا عالم یہ ہے کہ وہ عزیز ہے یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ غلبے اور بلندی کا کوئی تصور بھی ہمیں اس کے قریب نہیں لے جاسکتا۔ اس کی شان میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ۔ کوئی اس کے غلبے کو چیلنج نہیں کرسکتا۔ اور جب وہ پکڑنا چاہے تو کوئی اس کی گرفت سے بچ کر نکل نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ حکیم بھی ہے۔ حکیم کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ ہر کام کا کوئی نہ کوئی مقصد اور کوئی نہ کوئی غایت ہوتی ہے۔ انسانوں کو نہ صرف پیدا کیا بلکہ حواس اور عقل عطا کرنے کے ساتھ ساتھ وحیِ الٰہی کی رہنمائی سے بھی بہرہ ور کیا اور زمین کی خلافت کا تاج پہنایا اور بہت کچھ اختیارات دے کر زمینی معاملات میں فی الجملہ آزادی عطا فرمائی۔ اس صورتحال کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی موثر، آزاد اور فعال مخلوق سے کبھی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ اور پھر اس باز پرس میں عدل کو بروئے کار نہیں لایا جائے گا۔ اور یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ عدل کو بروئے کار لانے کے لیے قانونِ مجازات کی ضرورت ہے۔ تو جو ذات عزیز بھی ہو اور عادل بھی اس کی یہاں یہ تصور بھی گناہ ہے کہ کوئی قوت اس کے غلبے اور عدل کو متاثر کرسکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مشرکین کے تصوراتی معبود نہ اللہ تعالیٰ کے غلبے کو چیلنج کرسکتے ہیں اور نہ اس کے عدل پر سرِ مو اثر انداز ہوسکتے ہیں، تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں۔ جو احمق لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں آخر وہ کیا سمجھ کر کرتے ہیں۔ لیکن دنیا میں حماقتیں ہمیشہ رہی ہیں نہ پہلے ان کا علاج ہوا ہے اور نہ آج ہوسکتا ہے۔

وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُھَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾

(یہ مثالیں لوگوں کی فہمائش کے لیے بیان کرتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ ۴۳)

مثال کے فہم کے لیے علم شرط ہے

اس آیتِ کریمہ میں اَمْثَالُ سے اشارہ ان تمام امثال و واقعات کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔ انسانی کمزوری یہ ہے کہ وہ واقعات یا مثالوں کو ہمیشہ واقعات یا مثال سمجھ کر محظوظ تو ہوتا ہے لیکن اثر قبول نہیں کرتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے دفع الوقتی کا ذریعہ سمجھتا ہے جبکہ قرآنِ کریم ان مثالوں کو اس لیے بیان کرتا ہے کہ لوگ ان سے سبق حاصل کریں ان میں کوئی نصیحت ہے تو اپنی زندگی کے لیے نصیحت کو نور بنائیں۔ اور اگر کوئی عبرت ہے تو اس سے سبق حاصل کریں۔ جس طرح دیے سے دیا جلتا ہے، اسی طرح شخصیت سے شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ شخصیات کے واقعات شخصیت کے حُسن و قبح پر اثر انداز ہونے چاہئیں۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب شخصیات کا مطالعہ کرنے والا اور مثالیں پڑھنے والا اپنے اندر علم کی روشنی رکھتا ہو۔ اس کی فطری صلاحیت زندہ اور عقل زنگ آلود نہ ہوئی ہو۔ ایسا شخص ہر شخصیت کو اپنے لیے آئینہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ہر واقعہ کو غور و فکر کا موضوع بناتا ہے۔ اس سے اس کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے جو اس کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ علم کتابی علم کا فیضان ہو بلکہ بسا اوقات آفاق و انفس کا مطالعہ اور انسانوں کو جاننے کی صلاحیت اس راستے کی روشنی کا سامان کرتی ہے۔

Marfat.com

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۴﴾

(اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، بے شک اس میں اہلِ ایمان کے لیے ایک نشانی ہے۔ ۴۴)

آسمان وزمین کی گواہی

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی آسمان وزمین کی تخلیق اور اس کے نظام پر غور کرے گا اس کے لیے اس بات کو ماننے بغیر چارہ نہیں کہ یہ دنیا نہ تو کسی خالق کے بغیر وجود میں آ گئی ہے اور نہ یہ مختلف دیوتاؤں کی کوئی بازی گاہ یا رزم گاہ ہے۔ اس کے تخلیق کے عمل میں ایسا تناسب، ایسی حُسنِ ترتیب، ایسی گرفت، ایسی علم کی ہمہ گیری اور ایسی پراز حکمت کارفرمائی ہے جس میں کسی دوسرے کی دخل اندازی کا تصور بھی محال ہے۔ اسی طرح اس کے نظام میں ایسی یکسانی، ایسی ہم آہنگی، متخالف عناصر میں ایسی مناسبت وموافقت اور تعمیل واطاعت میں ایسی پابندی ہے کہ جسے دیکھ کر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ایک علیم وحکیم اور عزیز ومقتدر ذات نے اس کی تخلیق ایک مقصدِ حق کے ساتھ کی ہے اور اس کا نظام ایک مقصدِ حق کو بروئے کار لانے کے لیے کام کر رہا ہے۔ یہاں کی ہر تخلیق مقصدِ حق کی ترجمان معلوم ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے کامل عدل کا یہ تقاضا ہے کہ ایک دن اس مقصدِ حق کو سامنے لایا جائے اور اس کے مطابق قانونِ مجازات کو کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس طرح سے حق وباطل کھل کر سامنے آ جائیں گے اور ذمہ داری سے زندگی کو گزارنے والے اور بے فکری سے دادِ عیش دینے والے منطقی انجام سے دوچار ہوں گے۔

آخر میں فرمایا کہ اس میں اہلِ ایمان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ یعنی زمین وآسمان کی تخلیق میں توحید کی صداقت اور شرک ودہریت کے بطلان پر ایک صاف شہادت موجود ہے مگر اس شہادت کو صرف وہی لوگ پاتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی پیش کی ہوئی تعلیمات کو مانتے ہیں۔ اور جو لوگ ان کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں انہیں سب کچھ دیکھنے پر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ
تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ
مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ
اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ
اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ

Marfat.com

يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ
بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ
كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿٤٨﴾ بَلْ
هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ
بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ
رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٥٠﴾
اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾ ع

رکوع: ۵۔ (اے پیغمبر! اس کتاب کی تلاوت کیجیے جو آپ کی طرف وحی کی جارہی ہے اور نماز قائم کیجیے، یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۴۵) اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ سے جو بہتر ہو، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ ۴۶) اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بھی کتاب اتاری، پس وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دے رکھی ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے بعض اس پر ایمان لا بھی رہے ہیں اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔ ۴۷) اے پیغمبر! آپ اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ (اگر ایسا ہوتا) تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ ۴۸) بلکہ یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔ ۴۹) اور وہ کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی جانب سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں، کہہ دیجیے، نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۵۰) کیا ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جارہی ہے، بے شک اس کے اندر رحمت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ ۵۱)

Marfat.com

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

(اے پیغمبر! اس کتاب کی تلاوت کیجیے جو آپ کی طرف وحی کی جارہی ہے اور نماز قائم کیجیے، یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۴۵)

مخالفین کی پرواہ نہ کریں اور تلاوت اور نماز کا اہتمام رکھیں

نبی کریم ﷺ اور مسلمان جن نامساعد حالات میں تبلیغ ودعوت کا فریضہ انجام دے رہے تھے گزشتہ چار رکوعوں میں ان پر صبر وثبات اور توکل علی اللہ کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ ایسے حالات کا سامنا صبر واستقامت کے ساتھ ہی کیا جاسکتا ہے۔ سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے اس آیتِ کریمہ کے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ نہایت ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کریں، لیکن مخالفین کے آئے دن بڑھتے ہوئے مطالبات اور مسلمانوں کی ایذ رسانی میں تیزی اور نئی سے نئی دھمکیوں پر آپ کبھی پریشان نہ ہوں اور ان کی مخالفت سے متاثر ہو کر کبھی بھی تبلیغ ودعوت کا کام ہلکا نہ ہونے دیں۔ آپ اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں، یہ لوگ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، آپ نہایت اطمینان سے جو قرآنِ کریم آپ پر وحی کیا جارہا ہے انہیں پڑھ کر سنائیں۔ یعنی جو نئے نئے احکام آرہے ہیں وہ ان لوگوں تک پہنچائیں، ان کے اعتراضات کا جو جواب نازل کیا جارہا ہے وہ انہیں پڑھ کر سنائیں۔ دین کے اساسی موضوعات پر نہایت زوردار دلائل دیے جارہے ہیں ان سے انہیں باخبر کریں۔ غرضیکہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں قرآنِ کریم ہی آپ کی دعوت کی بنیاد، آپ کی آواز، آپ کے لیے تائید ونصرت کی ضمانت اور مخالفین کے بڑھتے ہوئے اعتراضات کا جواب ہے اس لیے ہر آنے والی وحی آپ لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔ اس طرح سے آپ کی تبلیغ ودعوت کا کام روز بروز تیز ہوتا جائے گا۔ رہی یہ بات کہ مخالفین آپ کی مخالفت میں اور تیز ہوجائیں گے تو اس کے لیے دوسرا حکم دیا کہ آپ نماز قائم کریں یعنی نماز کا اہتمام کریں کیونکہ نماز اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ونصرت اور اس کی مدد کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ مخالفین کی ایذاؤں اور تکلیفوں کے مقابلے میں پامردی سے کھڑے رہنا آسان نہیں، روز بروز آپ کی اور صاحبِ ایمان لوگوں کی آزمائشوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ہم اگرچہ اس بات پر قادر ہیں کہ مخالفین کو طاقت کے ذریعے تباہ کردیں یا ان کے دلوں کو آپ کی دعوت کے لیے کھول دیں۔ لیکن یہ وہ فطری طریقہ نہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ انسانوں کی دعوت اور پیغمبروں کی تائید ونصرت کے لیے اختیار فرمایا ہے۔ اس سورۃ کا تو موضوع ہی یہ ہے کہ ایمان کے راستے میں ہمیشہ آزمائشیں آتی ہیں اس راستے پر چلنے والوں کے لیے کوئی لمحہ آرام کا نہیں ہوتا۔ ہم بجائے اسباب کی فراہمی کے آپ کو ایسی دو تدبیریں بتارہے ہیں جن سے مسلمانوں میں ایک ایسی مضبوط سیرت اور زبردست صلاحیت پیدا ہوگی جس سے آپ مخالفتوں اور طغیانیوں کے طوفانوں کے مقابلے میں کھڑے رہ سکتے ہیں۔ ان میں پہلی چیز تلاوتِ قرآن اور دوسری چیز اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام، اللہ تعالیٰ کا نور اور اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اس میں جہاں تعلیم وتبیین کے حوالے سے افادیت رکھی گئی ہے وہیں اس سے وابستگی اور اس سے قلبی تعلق کے نتیجے میں قوت بھی فراہم کی گئی ہے۔ جیسے جیسے ایک انسان اللہ تعالیٰ کے کلام سے اپنا رشتہ استوار کرتا چلا جاتا ہے، ویسے ویسے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اسے اپنے حصار میں لیتی چلی جاتی ہیں۔ اس

Marfat.com

سے وابستگی کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی بیان کردہ ایک ایک بات پر ایسا بے پناہ یقین و ایمان ہو کہ جسے بڑی سے بڑی مخالفت بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ اور دوسری شرط اس کے احکام کی ایسی بندگی اور اطاعت ہو کہ حالات کا کوئی دباؤ اور مخالفتوں کا کوئی جبر اس میں کمزوری اور تساہل نہ پیدا کر سکے۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے اللہ تعالیٰ کی صفت اور کلام ہونے پر ایسا یقین اور ایسی وارفتگی ہو کہ قرآنِ کریم کا ہر بول دل میں ٹھنڈک بن کر اترتا جائے۔ دل کی ہر دھڑکن اس کی تائید میں حرکت میں آئے اور اس سے دوری، بے چینی اور بے قراری بن جائے، اس کے اوامر و نواہی پر دل پگھلتا جائے اور اس کے اشاروں پر دماغ کی گرہیں کھلتی جائیں۔ روح کی آسودگی، قلب کا اطمینان اور دماغ کی رعنائی اس کے ایک ایک شوشے کی رہینِ منت ہو کر رہ جائے۔ اس طرح سے قرآنِ پاک کی تلاوت نہ صرف پڑھنے والے کے لیے قوت کا باعث بنتی ہے بلکہ سننے والے کے اندر بھی ایک انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے بیشمار ارشادات اس پر شاہد و ناطق ہیں اور بیسیوں صحابہ کرام ؓ کی تلاوت کی کیفیت اس کی گواہ ہے۔

نماز کی تاثیر دوگونہ ہے

حالات کے مقابلے کے لیے جو دوسری چیز بتلائی گئی ہے وہ اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ نماز میں اللہ تعالیٰ نے جو حیرت انگیز اثر رکھا ہے اس کی حیثیت دوگونہ ہے۔ ایک طرف تو وہ اللہ تعالیٰ سے وابستگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آدمی سر سے پاؤں تک اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتا چلا جاتا ہے اور دل و دماغ کی تمام رعنائیاں اس کے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قطرہ ہو کر سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور اس کے اندر قوت و طاقت کا وہ احساس ابھرنے لگتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اور دوسری طرف نماز سیرت و کردار کی تعمیر اور پختگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ مکہ بلکہ عرب کا سارا ماحول بے حیائیوں اور بدکرداریوں سے اٹا پڑا تھا۔ انسانی سیرت و کردار کی کوئی چول سیدھی نہ تھی۔ نیت اور احساس سے لے کر انفرادی اور اجتماعی معاملات تک کہیں بھی راستی دکھائی نہ دیتی تھی۔ انسان، انسان کہلاتے ہوئے بھی درندوں سے بڑھ کر درندہ بن چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود معاشرے میں ایسے لوگ ضرور موجود تھے جو برے ہونے کے باوجود اچھائیوں کے قدردان تھے۔ اہلِ عرب کے معروفات میں بہت حد تک خیر غالب تھا۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں انتہائی برے ہو کر بھی اچھائی کے طلبگار تھے۔ قرآنِ کریم کی تلاوت اور نماز کے اہتمام نے جب مسلمانوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کیں، ہر فرد میں ایک نیا فرد جنم لینے لگا، برسوں کے بگڑے ہوئے دنوں میں نیکی کی تصویر بننے لگے، زندگی کی ہر سطح پر مسلمانوں کے معاملات اور اعمال دوسروں کے لیے خوشگوار تبدیلی کا احساس دلانے لگے تو طبیعتوں میں یہ سوال خود بخود اٹھنے لگا کہ آخر ان میں یہ انقلاب کس سبب سے پیدا ہو رہا ہے۔ یہ اسی شہر کے پروردہ اور اسی ماحول میں پروان چڑھنے والے آخر دوسروں سے مختلف کیوں ہیں۔ یہی سوال مخالفین کے لیے تشویش کا باعث بننے لگا اور مسلمانوں کے لیے قوت کا سامان بن گیا۔ جو طبیعتیں نہ دلیل کے زور کو مانتی تھیں نہ تلوار کی کاٹ کو، وہ عمل کی اس تبدیلی سے سوچنے پر مجبور ہو گئیں۔ اور اسی سے قبولیتِ ایمان کا راستہ کھلا۔

سوال یہ ہے کہ نماز سے آخر یہ تبدیلی کیوں آئی؟ جو شخص بھی نماز کی حقیقت اور اس کی حالت پر غور کرے گا اس کے لیے اس کا ادراک کوئی مشکل نہیں۔ ایک شخص اللہ تعالیٰ کے وجود کے یقین کے ساتھ اس کی بندگی کا اعتراف کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اس کی غلامی کا قلادہ گلے میں ڈالتا ہے اور غلام بن کر ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی بڑائی کی تسبیح کرتا ہے پھر اسی کی نازل کردہ کتاب کی تلاوت کرتا ہے

Marfat.com

پھر جوشِ بندگی میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک جاتا ہے اور بار بار اپنے رب کی عظمت کے گن گاتا ہے۔ پھر اس کے سامنے کھڑا ہوجاتا ہے اور اسے پکارتا ہے۔ بے قراری بڑھتی ہے تو سرزمین پر رکھ دیتا ہے۔ اور یہ وہ سب کچھ اس احساس کے ساتھ کرتا ہے کہ میرا خدا مجھے دیکھ رہا ہے، وہ میری باتیں سن رہا ہے۔ میں بے وضو اس کے سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ بے حد پاک ذات ہے۔ میں قیام وقعود اور سجود میں اس کے ذکر کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کرسکتا کیونکہ وہ مجھے دیکھتا بھی ہے اور میری ان کہی باتوں کو سنتا بھی ہے۔ ایسے احساسات کے ساتھ وہ دن میں پانچ مرتبہ اپنے مالک کے حضور حاضر ہوتا ہے اور پھر راتوں کو اٹھ اٹھ کر بے قراری سے اپنے اللہ کو یاد کرتا ہے۔ اس سے اس کے ضمیر میں جو زندگی پیدا ہوتی ہے اور اس کے رگ و پے میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا احساس اتر جاتا ہے کیا اس احساس کی موجودگی میں یہ تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ کبھی اپنے رب کی نافرمانی کرے گا۔ کیونکہ اس کے تمام احساسات کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے، اس کی یاد سب سے بڑی ہے، اس کی یاد کی موجودگی میں کسی دوسرے کی یاد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس کے حضور میں کسی گناہ کا تصور پنپ نہیں سکتا۔ کیونکہ نماز کی اس مشق نے اس کے دل و دماغ میں یہ بات بسادی ہے کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔ چوکیدار جاگ رہا ہو تو کوئی نقب نہیں لگا سکتا۔ افسر دیکھ رہا ہو تو ماتحت خیانت نہیں کرسکتا۔ جسے اللہ تعالیٰ کے دیکھنے اور سننے کا یقین ہوجائے اور اس کا دل و دماغ پوری طرح اس قالب میں ڈھل جائے کہ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حصار میں ہوں، اس کے سیرت و کردار میں کوئی خرابی کیونکر پیدا ہوسکتی ہے اور یہ بے عیب اور محفوظ کردار کسی بھی جماعت کی وہ قوت ہے جو سب سے بڑی تبلیغ و دعوت اور سب سے بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

(اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ سے جو بہتر ہو، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ ۴۶)

یہود کے ذکر کی وجہ اور ان سے متعلق ہدایات

یہ سورۃ اگرچہ مکی ہے اور مکہ معظمہ میں یہود سے کوئی سروکار نہ تھا کیونکہ ان کے تینوں قبیلے مدینہ منورہ میں آباد تھے اور ہجرت کے بعد ان سے واسطہ پڑنے والا تھا۔ اس لیے اس آیت میں اہلِ کتاب کا ذکر اور ان سے بحث و جدال کی صورت میں ہدایات عجیب سی بات معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب اگرچہ مکہ معظمہ میں اپنا وجود نہ رکھتے تھے لیکن جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں اس زمانے میں اہلِ کتاب کھل کر حق و باطل کے اس معرکے میں قریش کی معاونت کر رہے تھے۔ بعض دفعہ ان کو سوالات لکھ کر دیتے کہ وہ حضور سے پوچھیں۔ اور بعض دفعہ کسی اور طرح سے مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کرتے۔ اس سے اس بات کا امکان پیدا ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کو براہِ راست اہلِ کتاب سے مکالمہ کرنا پڑے۔ اس لیے گزشتہ آیات میں جس طرح قریش اور دیگر اہلِ عرب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے

Marfat.com

ہدایات دی گئیں، اسی طرح اہلِ کتاب کے بارے میں ضروری ہدایت دی گئی جس کا حاصل یہ ہے کہ اہلِ کتاب چونکہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، اپنا ایک دعوتی پس منظر رکھتے ہیں، ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتابیں موجود ہیں، وہ بنی اسماعیل کی طرح دینی معاملات میں بالکل بے خبر لوگ نہیں۔ اس لیے جب ان سے بات کرنے کا موقع پیدا ہو تو اس طرح سے بات کی جائے جو ان کے حالات کے پیشِ نظر بہتر ہو۔ کیونکہ ایک داعی اور مبلغ کے سامنے صرف یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخاطب اور مخالف کو بحث میں خاموش کر دے یا اس کو بے بس کر دے۔ بلکہ اس کے سامنے اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت کو مخاطب کے دل و دماغ میں اتار دے تاکہ وہ اسے قبول کر لے یا کم از کم سوچنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ جب بحث میں دلآزاری تک نوبت نہ پہنچے اور گفتگو میں احساسِ ذات کا موقع پیدا نہ ہو۔ اپنے نقطۂ نگاہ میں کسی تبدیلی اور کمی بیشی کیے بغیر دوسرے کے احساسات کا لحاظ کرنا ایک داعی کے لیے سب سے پہلی ضرورت ہے۔ اور یہ وہ طریقہ ہے جسے یہاں احسن قرار دیا گیا ہے۔ ہاں اگر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے جو بات کو سمجھنے کی بجائے الجھانے کی فکر میں ہوں۔ وہ اپنی ذات کی تعمیر کی بجائے اپنی ذات کی تشہیر کا ارادہ رکھتے ہوں۔ انہیں اس بات سے غرض نہ ہو کہ ان کا نقطۂ نگاہ صحیح ہے یا غلط۔ وہ صرف دوسروں کو ہدف بنانے کی فکر میں ہوں۔ ایسے لوگوں سے بحث ضیاعِ وقت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ ایسے موقع پر قرآنِ کریم نے مختلف مواقع پر مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ ایسے لوگوں کو سلام کہہ کے رخصت ہو جانا چاہیے۔ یعنی ان سے الجھنے کی بجائے کنارہ کش ہو جانا بہتر ہے۔ لیکن اگر اہلِ کتاب میں سے بہتر اور سمجھدار لوگوں سے واسطہ پڑے جو بات کو سمجھنا چاہتے ہوں تو ان کے لیے بنیادی ہدایت یہ دی گئی کہ گفتگو کے ایسے مقدمات ترتیب دیے جائیں جو جانبین میں مسلمات کا درجہ رکھتے ہوں۔ پھر ان کو بنیاد بنا کر بات کو آگے بڑھایا جائے۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ ان سے تم یہ کہو کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائے ہیں جو کتاب ہماری طرف نازل کی گئی ہے۔ اور اسی طرح ہم اس کتاب کو بھی مانتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے۔ یعنی ہم جس کتاب پر ایمان لائے ہیں وہ تمہاری کتابوں کی مکذب نہیں بلکہ ان کی مصدق ہے۔ تمہاری کتابوں میں آخری نبی اور آخری کتاب سے متعلق جو پیشگوئیاں تھیں وہ اب تک اپنے ظہور کے مصداق کی منتظر تھیں۔ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری اور قرآنِ کریم کے نزول سے وہ مصداق ظہور میں آ گیا۔ تو اگر تم واقعی صحیح روش رکھنے والے لوگ ہو اور صحیح بات کو پسند کرتے ہو تو تمہیں اس رسول اور اس کتاب سے چڑنے کی بجائے ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ کیونکہ تمہاری کتابوں نے جس رسول اور جس کتاب کی خبر دی تھی آج تک وہ تمہارے لیے ایک سوالیہ نشان تھا۔ اب جبکہ وہ تشریف لے آئے ہیں اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ تمہاری کتابوں کی خبر سچی تھی تو اس سے تمہارا ہی سر اونچا ہوا ہے۔ تمہیں تو آگے بڑھ کر اسے سب سے پہلے قبول کرنا چاہیے۔ اب اگر تم نے ضد میں آ کر ان کو جھٹلا دیا تو تم دوسرے لفظوں میں خود اپنے آپ کو اور اپنے صحیفوں کو جھٹلاؤ گے۔

اسی طرح ان سے یہ بھی کہو کہ ہم بھی ایک معبود کو مانتے ہیں اور تم بھی ایک معبود کو مانتے ہو۔ کیونکہ تورات اور انجیل اور دوسرے تمام صحائف توحید کی ہی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو باتیں توحید کے خلاف ہیں ہم نے ان کو چھوڑ کر خالصتاً توحید کا راستہ اختیار کیا ہے اور اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالے کر دیا ہے۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم توحید کے بھی مدعی ہو اور ساتھ ہی تم نے اپنے اندر ایسی باتیں بھی جمع کر رکھی ہیں جو اس عقیدے سے صریحاً ٹکراتی ہیں۔ بس ہماری دعوت تمہارے لیے صرف یہ ہے کہ جس طرح ہم نے خالصتاً توحید کو اختیار کیا ہے اور اس سے متناقض ہر چیز چھوڑ دی ہے، اسی طرح تم بھی اپنا یہ تناقض ختم کر کے مسلم بن جاؤ۔

Marfat.com

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ
وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۝

(اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بھی کتاب نازل کی ہے تو وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دے رکھی ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے بعض اس پر ایمان لا بھی رہے ہیں اور ہماری آیات کا تو صرف کافر ہی انکار کرتے ہیں۔ ۴۷)

قرآن کی دعوت کا انداز

گزشتہ آیت میں بحث و دعوت کے جس بہترین طریقہ کی وضاحت کی گئی ہے اور مسلمانوں کو اہل کتاب سے بحث کرنے کا جو بہترین طریقہ سکھایا گیا ہے ہم نے آپ کی طرف جو کتاب نازل کی ہے وہ اسی طریقے کے مطابق نازل کی ہے۔ یعنی اس کتاب کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کی نئی بات کی دعوت دے رہی ہے اور وہ کوئی ایسا دین پیش کر رہی ہے جو پہلے نبیوں اور رسولوں کے پیش کردہ دین سے یکسر مختلف ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ یہ کتاب پچھلی کتابوں کی مصدق بنا کر نازل کی گئی ہے، مکذب نہیں۔ اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ پچھلی امتوں نے اپنے اوپر نازل کردہ کتابوں کی تعلیمات میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دیں، بعض حقائق میں تحریف کی گئی، بعض حقیقتوں کو چھپا دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا دین جس صاف و شفاف شکل میں نازل کیا گیا تھا اس پر اپنی خواہشات کے دھبے ڈال دیے گئے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا دین از سر نو اپنی اصلی شکل میں نازل کیا جائے۔ اور دوسری ضرورت یہ لاحق ہوئی کہ مرور زمانہ سے نئے مسائل پیش آئے۔ انسان کے ذہنی افق میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں، انسانی عقل و دانش نے اپنے سفر میں نئی نئی منازل دریافت کیں۔ ان نئی ضرورتوں کے پیش نظر اور انسان کے عقلی بلوغ کو دیکھتے ہوئے ایک جامع اور مکمل دین نازل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ قرآن کریم کی شکل میں تکمیل دین کا اعلان کیا گیا اور انسان کو ایسا ہدایت نامہ دیا گیا ہے جو قیامت تک اس کی ضروریات کے لیے کافی ہوگا اور وقت کے ساتھ ساتھ نئے تقاضوں کے پیدا ہونے کی صورت میں اجتہاد کی ایک تعلیم دی گئی جس سے ہر زمانے کے تقاضوں کا جواب دینا ممکن ہو گیا۔ اور انسانی ہدایت کے سفر میں کسی خلا پیدا ہونے کا اندیشہ جاتا رہا۔

اس آیت کے دوسرے حصے میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس سے پہلے جن لوگوں کو کتاب عطا فرمائی ہے ان میں یہودی بھی ہیں اور نصاریٰ بھی۔ ان میں بیشتر لوگ تو ایسے ہیں جو اپنی انا اور جاہلانہ تعصب میں بالکل اندھے ہو چکے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات بالکل قابل قبول نہیں کہ کوئی پیغمبر بنی اسماعیل میں سے تشریف لائے۔ لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے فی الواقع اللہ تعالیٰ کی کتاب سے راست تعلق قائم رکھا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کے باوجود حق شناسی سے محروم نہیں ہوئے۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں کیا کچھ تصرفات کر چکے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو قرآن کریم نے معروف کے صیغے سے یاد کیا ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ اگر آپ نے قرآن کریم کے بتائے ہوئے تبلیغ و دعوت کے اصولوں کی پاسداری کی اور ان لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کو ٹھیک طرح سے پیش کیا تو یہ لوگ اس کتاب پر ضرور ایمان لائیں گے۔ چنانچہ حبشہ کے نصاریٰ میں سے بہت سے لوگ اور مدینہ کے یہود میں سے بعض اہل علم جن کے دلوں میں حق کی روشنی تھی وہ اسلام کی آغوش میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔

Marfat.com

مزید فرمایا کہ انھی لوگوں میں سے جو اس وقت قرآنِ کریم کے ہم عصر ہیں وہ اہلِ کتاب بھی ہو سکتے ہیں اور اہلِ عرب بھی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے بہت سے لوگ ایمان بھی لا رہے ہیں۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ قرآنِ کریم جیسی کتاب کا انکار اہلِ کتاب ہوں یا اہلِ عرب، صرف وہی لوگ کریں گے جو انکار پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں، اور کٹے کافر ہیں۔ وہ دعویٰ کچھ بھی کرتے ہوں لیکن حقیقت میں ان کا ایمان کسی چیز پر نہیں۔ وہ دنیا میں کسی بھی وابستگی کے پابند ہو کر زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں ایسے لوگ کسی کتاب پر بھی ایمان لانے والے نہیں۔ اور قرآنِ کریم جیسی کتاب جو ہر لحاظ سے ایک انقلابی کتاب ہے اسے اس طرح کے لوگ کیسے قبول کر سکتے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

(اے پیغمبر! آپ اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے،
(اگر ایسا ہوتا) تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ ۴۸)

آنحضرت ﷺ کی رسالت نہایت سادہ اور محکم دلیل

یوں تو یہ بات ساری دنیائے کفر سے کہی گئی ہے لیکن سابقہ آیات میں چونکہ اہلِ کتاب کا ذکر ہو رہا ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ کتاب کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اگر وہ خاندانی تعصب سے نکل سکیں اور انانیت کو راستے میں حائل نہ ہونے دیں تو آنحضرت ﷺ اور قرآنِ کریم کی صداقت کے لیے ایک نہایت سادہ اور واضح دلیل پیش کی جا رہی ہے جو ایک غیر جانبدار آدمی کے لیے اپنے اندر بے پناہ تاثیر رکھتی ہے۔ اور یہ دلیل قرآنِ کریم نے اس سے پہلے متعدد مواقع پر مختلف اسالیب میں پیش فرمائی ہے۔
دلیل کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ امی محض تھے۔ مکے کا ہر فرد گواہ ہے کہ آپ نے عمر بھر نہ کوئی کتاب پڑھی اور نہ کبھی قلم کو ہاتھ میں لیا۔ چونکہ کتاب سے دلچسپی اسی شخص کو ہوتی ہے تو پڑھنا جانتا ہو۔ اور قلم اس کی ضرورت ہے جو لکھنے سے واقف ہو۔ آپ نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔ بچپن سے لے کر کہولت تک آپ کی زندگی کا ایک ایک دن لوگوں کے سامنے گزرا ہے۔ آپ کو دیکھنے اور جاننے والے ایک دو نہیں، ہزاروں تھے۔ کبھی کسی نے آپ کو نہ پڑھتے دیکھا اور نہ لکھتے دیکھا۔ لیکن جیسے ہی چالیس سال کی عمر کے بعد آپ غارِ حرا سے اترے تو آخر یکلخت کیا تبدیلی آئی کہ آپ کی زبان سے حکمت و معرفت کے پھول جھڑنے لگے۔ آپ نے ایک ایسی کتاب پڑھ کر لوگوں کو سنانا شروع کی جس میں کتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیائے سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ اور تمدن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر ایسی معرکۃ الآراء بحثیں کی گئیں۔ اور سابقہ امتوں نے اپنی کتابوں میں جو تحریفیں اور ترامیم کی تھیں ان میں سے بہت سوں کا پردہ چاک کیا۔ کتنے ایسے احکام تھے جن کی تکمیل کی گئی۔ اور کتنے تاریخ کے ایسے سربستہ راز تھے جن کی عقدہ کشائی کی۔ غرضیکہ اس کتاب کا ایک ایک صفحہ اپنے اندر علم و معرفت اور حقیقت و دانش کا ایسا سامان رکھتا ہے کہ جس کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس یہ نہیں کہہ سکتا کہ کوئی امی شخص کبھی ایسی باتیں لکھ سکتا ہے۔ لازماً اسے یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ یہ سب کچھ علمِ وحی کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔ یہ ایک ایسی واضح دلیل ہے کہ جس کا انکار ممکن نہیں۔
آخر میں فرمایا کہ اگر نبی کریم ﷺ پڑھے لکھے ہوتے اور لوگوں نے آپ کو کبھی مطالعہ اور تحقیق میں مصروف دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ کہنے کا موقع ہو سکتا تھا کہ قرآنِ کریم آپ کے اپنے علم و دانش کا شاہکار ہے اور آپ نے یہ سب کچھ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا ہے۔

Marfat.com

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

(بلکہ یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔ ۴۹)

آیت کے دو مفہوم

اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ هُوَ کا مرجع قرآنِ کریم کو قرار دیا جائے۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں کو صحیح علم نصیب ہوا ہے جو علم کے قدر آشنا اور علم کی حدود سے آگاہ ہیں انہیں قرآنِ کریم کو تسلیم کرنے میں کوئی تأمل نہیں۔ کیونکہ ان کی کتابوں میں قرآنِ پاک کی تعلیمات کے بارے میں جو کچھ خبریں دی گئی ہیں جب قرآنِ کریم میں وہ سب کچھ موجود پاتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ یہ تو وہی کتاب ہے جس کا ہمیں انتظار تھا۔ وہ اپنے نبیوں کی پیشگوئی کے مطابق پہلے سے اس کے منتظر تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے بعض جگہ سچے اہلِ کتاب کے جذبات قرآن اور آخری رسول سے متعلق نہایت واضح الفاظ میں ذکر فرمائے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کے سامنے قرآن کریم پڑھا گیا تو وہ والہانہ جذبے کے ساتھ اس کی طرف بڑھے اور بہتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ هُوَ کا مرجع نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ ایک اُمّی ہیں۔ آپ کا کتابی علم سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ نہ آپ پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ بایں ہمہ آپ کی زبان سے ایک ایسی کتاب کا جاری ہونا جس کی فصاحت و بلاغت، علم و دانش، حیرت انگیز علمی کمالات، تاریخ کے سربستہ رازوں کا انکشاف، اہلِ کتاب کی خیانتوں پر گرفت اور انسانی زندگی کی بھلائی کے لیے ایک نہایت مرتب نظامِ زندگی ایسے علمی بینات ہیں جن کی توجیہ اس کے سوا ممکن ہی نہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور قرآنِ کریم کی یہ خصوصیات اور خود آپ کے ذاتی کمالات یہ وہ روشن نشانیاں ہیں جو آپ کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں۔ اور پھر عرب کے بگڑے ہوئے ماحول میں مکہ حرم ہونے کے باوجود جس طرح تمام تر برائیوں کا مرکز تھا آپ کا ایک ایسی پاکیزہ زندگی گزارنا جس میں کسی کو انگلی رکھنے کی کبھی گنجائش نہ ملے اور ایک ایسا بے عیب کردار پیش کرنا کہ ہر جاننے والا جس کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ آپ کے اندر کردار کی یہ پاکیزگی، کمالات کی بلندی اور قرآنِ کریم جیسی کتاب کی تلاوت و تعلیم کے سررشتہ کی اگر کوئی تلاش شروع کردے اور یہ سراغ لگانے کی کوشش کرے کہ وہ کون سے اسباب تھے جس نے آپ جیسی حیرت انگیز شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں کام کیا ہے تو وہ مکے کے ماحول کو دیکھتے ہوئے کبھی اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ چونکہ آپ کی شخصیت اور اس وقت کے معاشرے کے حالات میں کوئی مناسبت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آپ کے علمی کمالات کے پیچھے کہیں کوئی علمی سرچشمہ نظر نہیں پڑتا۔ اور انسانوں کی بھلائی کے لیے آپ کی بے چینی اور بے کلی کے پس منظر میں ہمیں کوئی دوسری شخصیت دکھائی نہیں دیتی۔ بنابریں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ آپ کی ذات درحقیقت بہت سی روشن نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ اور جو لوگ علم رکھنے والے ہیں وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں تعریف و تائید کے جذبات پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ البتہ اس سے انکار صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کی ناقدری کرکے اپنے سینوں اور دلوں کو تاریک کرلیا ہے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں۔

Marfat.com

وَقَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٥٠﴾

(اور وہ کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی جانب سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں، کہہ دیجیے، نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۵۰)

اعتراض اور اس کا جواب

آنحضرت ﷺ کی نبوت پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے ان میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ سورۃ چونکہ مکی ہے اس لیے موقعِ کلام کے تقاضے سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اعتراض قریش کی جانب سے ہوا ہوگا۔ لیکن قریش چونکہ تاریخ نبوت سے بہت حد تک ناآشنا تھے وہ بہت کم جانتے تھے کہ نبوت کیا ہوتی ہے اور معجزات کسے کہتے ہیں۔ اس لیے ان کی طرف سے یہ اعتراض کہ آپ پر ویسی نشانیاں کیوں نہیں نازل کی گئیں جیسے پہلے انبیاء پر نازل ہوئیں، ایک خلاف حقیقت بات ہے۔ اس لیے معمولی تدبر سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ اعتراض یہود کی طرف سے انہیں سکھایا گیا ہوگا۔ اور وہ مفید مطلب جان کر اسے شہرت دیتے ہوں گے۔ پروردگار نے اعتراض نقل کرنے کے بعد نہایت بے پروائی سے اس کا جواب دیا۔ یہاں تک کہ اعتراض کرنے والوں کو مخاطب کرنا بھی پسند نہیں فرمایا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ کے واسطے سے ان کو جواب دے دیا گیا ہے کہ تمہارا یہ اعتراض کہ مجھ پر معجزات نازل کیوں نہیں کیے گئے اور نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں نہایت نامعقول بات ہے۔ اس لیے کہ میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری اصلاح کے لیے رسول بنا کے بھیجا ہے۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچاؤں، اس کے دیے ہوئے علم کے مطابق اس کی وضاحت کروں اور تبلیغ ودعوت کی جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے اسے باحسن طریق انجام دینے کی کوشش کروں، سو میں وہ کر رہا ہوں۔ معجزے دکھانا، میرے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جب چاہے گا تو میرے ہاتھ سے کسی معجزے کا اظہار کردے گا۔ رسول ہونے کی حیثیت سے دو حقیقتیں قابلِ غور ہیں ایک پیغمبر کی ذات اور دوسرا اس پر اترنے والا کلام اور پیغام۔ تمہیں اگر میری ذات پر کوئی اعتراض ہے تو وہ پیش کرو۔ اور جو میں پیغام پیش کر رہا ہوں اس میں کوئی کمزوری ہے تو نشان دہی کرو۔ رہی معجزے کی بات تو یہ میرے فرائض میں سے نہیں۔ میرا فرض تو صرف یہ ہے:

میں ان کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات ان کی
میں ان کی محفل سجا رہا ہوں، چراغ میرا ہے رات ان کی

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾

(کیا ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جارہی ہے،
بے شک اس کے اندر رحمت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ ۵۱)

Marfat.com

اعتراض کا دوسرا جواب

گزشتہ آیت میں جو اعتراض کیا گیا ہے یہ اس کا دوسرا جواب ہے کہ تم نے میری نبوت کی تائید میں نشانیوں کا مطالبہ کیا ہے تو کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایک ایسی کتاب اتاری ہے جو اپنے دعوے پر خود حجت ہے۔ جس کی نظیر نہ پہلے موجود ہے اور نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔ اگر اس کی بجائے کوئی حسی معجزہ نازل کیا جاتا تو وہ یقیناً ایک وقتی چیز ہوتی۔ اور اگر کوئی عذاب کی نشانی دکھائی جاتی تو نہ جانے وہ کیسی آفت ہوتی اور کس شکل میں نمودار ہوتی۔ قرآنِ کریم ایک ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گا۔ اور اہلِ دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز رہیں گے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا انتہائی فضل و کرم ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب اتاری جو انسانوں کے لیے دائمی رحمت اور نصیحت ہے بشرطیکہ وہ اس کی قدر کریں اور ایمان لائیں۔ ان کے لیے اس کتاب کی موجودگی میں کتاب اور صاحبِ کتاب کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی نشانی یا معجزے کی ضرورت نہیں ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ
بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾
وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ
الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ
بِالْعَذَابِ ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ
الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا
مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ
وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۫
ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

Marfat.com

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿58﴾ ڰ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿59﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَاۗبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ
اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿60﴾ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿61﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ
يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿62﴾
وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ
مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿63﴾ ع

رکوع: ۶۔ (کہہ دیجیے! میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے، وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کا انکار کیا وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ ۵۲) اور یہ لوگ آپ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اگر اس کے لیے ایک مدت مقرر نہ کر دی گئی ہوتی تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا، وہ یقیناً ان کے اوپر اچانک آ جائے گا اور ان کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی۔ ۵۳) یہ آپ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے۔ ۵۴) جس دن عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ان کو ڈھانپ لے گا اور ارشاد ہوگا کہ اب چکھو، سزا ان کرتوتوں کی جو تم کرتے تھے۔ ۵۵) اے میرے بندو! جو ایمان لائے ہو بے شک میری زمین بہت کشادہ ہے، پس میری ہی بندگی کرو۔ ۵۶) ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔ ۵۷) اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی خوب صلہ ہے

Marfat.com

کارگزاروں کا۔ ۵۸) جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہر حال میں بھروسا رکھا۔ ۵۹) اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی، اور وہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ ۶۰) اور آپ ان سے پوچھیں کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، تو وہ کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہیں۔ ۶۱) اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۶۲) اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے کس نے پانی اتارا، پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندہ کیا اس کے مردہ ہو چکنے کے بعد، تو وہ ضرور کہیں گے، اللہ نے۔ کہہ دیجیے! الحمد للہ، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔ ۶۳)

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

(کہہ دیجیے! میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے، وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کا انکار کیا وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ ۵۲)

آنحضرت ﷺ کو تسلی اور مخالفین کو تنبیہ

قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایسے واضح دلائل کے بعد جیسے کہ قریبی آیات میں پیش کیے گئے ہیں مشرکینِ مکہ اگر ایمان لانے کی بجائے نشانیوں کا مطالبہ کرتے اور قسم قسم کے اعتراضات اٹھاتے ہیں تو آپ ان باتوں کی بالکل پرواہ نہ کریں، حقیقت یہ ہے کہ ان کے دل تسلیم کر چکے ہیں کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب ہے۔ رہے اعتراضات تو وہ تو محض ایک ڈوبنے والی کشتی کا آخری سہارا ہیں۔ گروہی عصبیت اپنی مصنوعی شریعت اور جاہلانہ رسم و رواج پر جمود کو بچانے کے لیے محض ایک شور مچایا جا رہا ہے۔ ایسے لوگوں سے بحث مباحثہ کرنا بیکار ہے، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیجیے۔ یہ اپنی سچائی کے ہزار دعوے کریں وہ ان کی نیتوں اور ان کے عزائم کو خوب جانتا ہے۔ قیامت کے دن ان کی نیتوں اور عزائم کے حوالے سے وہ فیصلہ کرے گا۔ البتہ ایک بات ان مخالفین کو یاد رکھنی چاہیے کہ اگر انہوں نے اپنی زندگی تباہ کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یہ جانیں اور ان کا خدا جانے۔ لیکن ان کی ہمدردی کے لیے یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ جو لوگ باطل پر جان بوجھ کر ایمان لائیں گے اور پیغمبر کی دل آویز دعوت اور دلائل سے بھرپور گفتگو کے بعد بھی وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کریں گے تو انہیں اس بارے میں یکسو رہنا چاہیے کہ یہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے نامراد ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾

Marfat.com

(اور یہ لوگ آپ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اگر اس کے لیے ایک مدت مقرر نہ کر دی گئی ہوتی تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا، وہ یقیناً ان کے اوپر اچانک آئے گا اور ان کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی۔ ۵۳)

کافروں کی طرف سے استعجال بالعذاب کا مطالبہ اور اللہ تعالیٰ کا قانونِ عذاب

آنحضرت ﷺ جب قریش کے سامنے اللہ تعالیٰ کا دین پیش کرتے اور انہیں ایمان لانے کی دعوت دیتے تو وہ پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر آپؐ کی تکذیب کرتے اور آپ کی بات سننے سے بھی انکار کر دیتے تو اس پر آنحضرت ﷺ انہیں بعض دفعہ عذاب کی دھمکی دیتے۔ اور نہایت ہمدردانہ لہجے میں وارننگ دیتے ہوئے فرماتے کہ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب تم پر آ سکتا ہے۔ لیکن وہ بجائے اس سے اثر لینے کے نہایت ہٹ دھرمی سے آپؐ کو زچ کرنے کے لیے یہ کہتے کہ ہم نے تو آپ کی تکذیب کر دی اور آپ کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، تو اگر اس پر عذاب آیا کرتا ہے تو آپ ہم پر عذاب کیوں نہیں لاتے، ہم تو شدت سے اس کے منتظر ہیں۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ قوموں پر عذاب اچانک نہیں آ جاتا اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ جب تک وہ مدت گزر نہیں جاتی اس وقت تک اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں آتا۔ وہ مدت قوموں کے اخلاقی زوال کے پیمانے سے ناپ کر مقرر کی جاتی ہے۔ اور یہ صرف پروردگار ہی جانتا ہے کہ وہ پیمانہ کب لبریز ہوتا ہے اور کب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حرکت میں آتا ہے۔ قریش پر عذاب کا بھی ایک وقت مقرر ہو چکا ہے، جب وہ وقت آ جائے گا تو ان پر اس طرح اچانک عذاب آئے گا کہ انہیں اس کے آنے کا سان گمان بھی نہیں ہوگا۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۵۴ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۵۵

(یہ آپ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے۔ ۵۴)
جس دن عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ان کو ڈھانپ لے گا اور ارشاد ہوگا کہ اب چکھو، سزا ان کرتوتوں کی جو تم کرتے تھے۔ ۵۵)

قریش کی بے بصیرتی پر تعجب کا اظہار

یہاں قریش کے مطالبۂ عذاب کا ذکر دوبارہ کیا گیا ہے، بظاہر یہ تکرار معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ اعادہ اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ تعجب اس بات پر کیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ نہایت جسارت کے ساتھ بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عذاب ان سے بہت دور ہے۔ حالانکہ جہنم کا عذاب جو ان کے کرتوتوں کے باعث مقدر ہو چکا ہے وہ ان سے دور نہیں بلکہ انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ یہ اوپر اور نیچے سے جہنم کے حصار میں ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جہنم تو عالمِ آخرت کا معاملہ ہے، دنیا سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن کاش انہیں معلوم ہوتا کہ جن اعمال سے ان کی شخصیت کا تار و پود بن رہا ہے وہی اعمال جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ اگر عمل کرنے والا ہر وقت اعمال کے نرغے میں ہے اور وہی

Marfat.com

اعمال جہنم کی آگ کو دھکانے والے ہیں تو پھر جہنم ان سے دور ہوا یا قریب ہوا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ جو عذاب ان کے اس قدر قریب ہے یہ اسے دور سمجھ کر بار بار مطالبہ کر رہے ہیں۔ دنیا کی صف لپٹنے کی دیر ہے جہنم کا عذاب ان کو اوپر نیچے سے ڈھانک لے گا۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا، لو! اب اس عذاب کا مزہ چکھو۔ تب انہیں اندازہ ہوگا کہ ہم جس عذاب کا مطالبہ کرتے تھے اسے تو ہم نے اپنے لیے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ اور یہ کیسا فریب نظر تھا جس میں ہم مبتلا تھے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾

(اے میرے بندو! جو ایمان لائے ہو بے شک میری زمین بہت کشادہ ہے، پس میری ہی بندگی کرو۔ ٥٦)

مظلوم مسلمانوں سے خطاب اور ہجرت کی ہدایات

مکہ معظمہ میں ہر ایمان لانے والے کے لیے جس طرح زندگی دشوار کی جارہی تھی وہ تاریخ کی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر پڑھا لکھا آدمی واقف ہے۔ اس سورۃ کے آغاز میں بھی انہیں لوگوں کو حوصلہ دیا گیا ہے اور بعض اشتباہات کا ازالہ بھی فرمایا گیا ہے۔ اب اس آیت میں نہایت دلنوازی کے انداز میں ان سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اگر مکہ کی سرزمین تمہارے ایمان کی وجہ سے تمہارے لیے واقعی تنگ کر دی جائے اور تمہارے لیے یہاں سانس لینا مشکل ہو جائے تو تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے دین پر ایمان اور اللہ تعالیٰ کی بندگی ایک ایسی دولت ہے جسے کسی قیمت پر چھوڑا نہیں جاسکتا۔ ایک مومن کی زندگی بھی اسی سے ہے اور آخرت بھی اسی سے۔ جہاں تک قوم و وطن کا تعلق ہے وہ ہر انسان کی ضرورت ہیں، لیکن انہیں ایمان پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ دونوں میں تصادم کی صورت میں وطن سے ہجرت کرنا لازم ہو جاتا ہے لیکن ایمان پر آنچ آنے نہیں دی جاتی۔ اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ وطن تم سے ایمان کی قربانی مانگتا ہو تو پھر تمہیں وطن چھوڑ کر ہجرت کر جانا ہوگا۔ ہجرت یقیناً بے حد مشکل عمل ہے۔ گھر سے بے گھر ہونا اور وطن سے بے وطن ہونا یقیناً ایک بہت بڑی قربانی ہے۔ لیکن ایمان کے لیے اس آیت میں اس قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ وطن چھوڑتے ہوئے دل شکستہ اور مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی زمین بہت وسیع ہے۔ جب تم اس راستے میں نکلو گے تو کوئی نہ کوئی سرزمین تمہارا خیر مقدم کرے گی۔ بس شرط یہ ہے کہ بندگی صرف میری کرنی ہوگی، کسی اور کی بندگی کا تصور بھی ایک مومن کے لیے جائز نہیں۔ آج کے دور میں قوم اور وطن کو جو حیثیت دے دی گئی ہے اسلام اسے قبول نہیں کرتا۔ وہ ایک مومن کو قوم اور وطن کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور اس سے محبت کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن جہاں تک پرستش کا تعلق ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، اس کے سوا ہر پرستش حرام ہے۔ اسی لیے اقبال نے کہا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

Marfat.com

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾

(ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔ ۵۷)

ہجرت کے سفر میں فکر جان بچانے کی نہیں، ایمان بچانے کی ہونی چاہیے۔

یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

آدمی چندروزہ زندگی کے لیے ایسی کمزوری کیوں دکھائے جو اسے اپنے رب کے سامنے شرمسار کردے۔ آخرت کی ہمیشہ رہنے والی زندگی میں ایمان اور عملِ صالحہ کا سکہ چلے گا، اور یہی دولت وہاں کام آئے گی۔ تو آدمی فکر اس دولت کی کرے جو ہمیشہ کی زندگی کی ضامن ہے۔ اس کی کیا فکر، جو آج ہے تو کل نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ۖ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾

(اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کا۔ ۵۸) جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہر حال میں بھروسا رکھا۔ ۵۹)

ہجرت میں پیش آنے والے مصائب کا صلہ

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرتے، صعوبتیں اٹھاتے اور بعض دفعہ جان کا نذرانہ پیش کردیتے ہیں ان کے بارے میں یہ گمان نہ کیا جائے کہ ان کی یہ ساری قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔ ہماری نگاہوں میں چونکہ دنیا بسی ہوئی ہے، اس لیے ہماری نظر اسی کے حوالے سے نفع ونقصان کے پیمانوں پر جمی رہتی ہے۔ لیکن اگر ہم آخرت کو اپنی منزل بنالیں تو پھر ہمیں یہ جاننے میں دشواری نہیں ہوسکتی کہ یہاں کے ہر عمل کا معاوضہ حقیقت میں یہاں نہیں ملتا بلکہ آخرت میں ملے گا۔ جو لوگ یہاں اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایمان وعمل کے چراغ جلائیں گے اور ایثار و قربانی کے پھول کھلائیں گے ان کی محنت ضائع نہیں جائے گی۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں ایسی بلند و بالا عمارتوں میں رکھے گا جس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اور یہ جو کچھ انہیں ملے گا یہ ان کی کارگزاری کا صلہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے کارگزاروں کو کبھی محرومی کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ البتہ وہ کارگزاری اللہ تعالیٰ کے یہاں انعام کی مستحق ٹھہرتی ہے جو ہر طرح کے حالات میں اللہ تعالیٰ کی بندگی پر ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسے میں کبھی کمی نہ آنے پائے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾

(اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی، اور وہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ ۶۰)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی زمین کی طرح اس کا خوانِ کرم بھی وسیع ہے

ہجرت کرنے والے کے لیے دو پریشانیاں مستقل تشویش کا باعث ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ اپنا وطن، گھر بار اور اپنی قوم چھوڑنے کے بعد نجانے کہیں کوئی مستقر مل سکے گا یا نہیں۔ کوئی ٹھکانہ ہاتھ آئے گا تو کیسا ہوگا، کیسے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ گزشتہ آیتِ کریمہ میں اس کا اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا کہ میری راہ میں ہجرت کرنے والے میرے بندے ہیں، انہیں اطمینان ہونا چاہیے کہ میری زمین ان کے لیے بڑی وسیع ہے۔ جب وہ مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے نکل کھڑے ہوں گے تو میری زمین ان کے لیے اپنی آغوش کھول دے گی۔ انہیں ایسے ٹھکانے میسر آئیں گے جن کا انہیں سان گمان بھی نہیں ہوگا۔اور ایسے مسافر نواز ملیں گے جو کافر قوم سے ہزار درجہ بہتر ہوں گے۔

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دوسری پریشانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطمینان دلایا ہے کہ تم روزگار کی فکر کرتے ہو اور تمہیں اندیشہ ہے کہ نئے شہر اور نئے وطن میں کھائیں پئیں گے کہاں سے۔ یہاں سے تو ہم خالی ہاتھ نکلیں گے تو وہاں ہماری معاش کی فکر کون کرے گا۔اس فکر کے علاج کے لیے فرمایا کہ تم دیکھتے ہو کہ بے شمار چرند و پرند، آبی حیوانات اور مختلف قسم کے جانور تمہارے سامنے ہوا، خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں۔ ان کے معاش کا انتظام کون کرتا ہے۔ ان میں سے کون ایسا ہے جس کی کمر پر اس کا رزق لدا ہوا ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اپنے گھونسلوں، اپنی کچھاروں اور اپنے بھٹوں سے نکلتے ہیں اور کسی کو اس میں شبہ نہیں ہوتا کہ ہم خالی پیٹ واپس آئیں گے۔ شام کو جب یہ لوٹتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ آخر انہیں کون رزق دیتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی زمین بہت کشادہ ہے، اسی طرح اس کا خوانِ کرم بھی بہت کشادہ ہے۔ کتنے بڑے تن و توش کے جانور ہیں جن کی غذا کئی انسانوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔اور سمندر میں کتنی ایسی مخلوقات ہیں جن کی غذا سینکڑے لوگوں سے زیادہ ہوگی۔ لیکن ان میں سے کسی کو کبھی بھوکا نہیں دیکھا گیا۔اور نہ یہ نظر آتا ہے کہ ان کے لیے رزق کے گودام الگ بھر کے رکھے گئے ہوں اور انہیں اطمینان ہو کہ ہم یہاں سے اپنا رزق حاصل کرلیں گے۔ بس انہیں صرف ایک اطمینان ہے کہ جس پروردگار نے پیدا کیا ہے وہ ہمیں روزی بھی دے گا۔ اسی اطمینان سے وہ اچھلتے کودتے، خوشیاں مناتے زندگی گزار دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی ہدایت کے لیے جانے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے عرض کیا کہ الٰہی! تعمیلِ ارشاد سے انکار نہیں، لیکن میں پیچھے پہاڑوں میں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ آیا ہوں۔ یہاں میں آگ کی تلاش میں آیا تھا تاکہ سردی سے بچاؤ کا ان کے لیے کوئی انتظام کردوں۔ مجھے اجازت دی جائے کہ میں کوئی ٹھکانہ تلاش کر کے ان کو وہاں ٹھہرا دوں اور پھر اطمینان سے فرعون کے پاس جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم جس چٹان پر کھڑے ہو اس پر عصا مارو۔ چٹان پھٹی تو نیچے ایک چھوٹی چٹان نظر آئی۔ حکم ہوا اس پر بھی عصا مارو۔ وہ بھی پھٹی۔ اس کے نیچے ایک پتھر دکھائی دیا۔ حکم ہوا کہ اس پر بھی ضرب لگاؤ۔ پتھر ٹوٹا تو اس کے نیچے سے ایک جانور نکلا جو تازہ گھاس کھا رہا تھا۔ پروردگار نے فرمایا کہ میں اگر تین پتھروں کے نیچے ایک جانور کو غذا دے سکتا ہوں تو کیا تمہارے بیوی بچوں کو غذا نہیں دوں گا۔ یہی وہ سہارا ہے جو بے سہارا انسان کی سب سے بڑی قوت ہے۔ بشرطیکہ انسان اس بات پر یقین پیدا کرلے کہ میں جس اللہ کے بھروسے پر نکلا ہوں وہ جس طرح حیوانوں کو رزق دیتا ہے اسی طرح مجھے بھی دے گا۔ میں جب بھی اسے پکاروں گا، وہ میری پکار سنے گا۔اور میری حالت جو بھی ہوگی وہ کبھی اس سے بے خبر نہیں ہوگا۔

Marfat.com

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾

(اور آپ ان سے پوچھیں کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، تو وہ کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہیں۔ ۶۱)

گزشتہ ہدایات پر دلائل

گزشتہ آیات میں اُس سرزمین سے ہجرت کی ترغیب دی گئی ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی بندگی مشکل کر دی جائے اور طاغوت کی بندگی پر مجبور کیا جائے۔ اور راستے کی مشکلات کے حوالے سے اللہ ہی پر بھروسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب انہی باتوں پر دلائل دیے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلی یہ بات کہ اگر کسی سرزمین میں اللہ تعالیٰ کی بندگی ممکن نہ رہے تو ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ بندگی چھوڑنے کی بجائے اس سرزمین کو چھوڑ دے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے جو اہلِ عرب کے یہاں بھی ایک مُسلّم حقیقت تھی۔ انہیں اس بات سے انکار نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق و مالک ہے۔ تو ان سے کہا جا رہا ہے کہ جب زمین کا خالق اور مالک وہ ہے تو پھر اس کی زمین پر اس کی بندگی کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کا کیا جواز ہے۔ اور اس کی بندگی سے روکنے کی کیا تک ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہے کہ گھر کے مالک سے گھر پر تصرف کا اختیار چھین لیا جائے۔ اور ان لوگوں کے حوالے کر دیا جائے جن کا اس گھر سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جس طرح اس بات کو دنیا کا کوئی شخص جائز تسلیم نہیں کر سکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر غیر اللہ کی بندگی اور ان کی حکومت کا کوئی جواز نہیں۔ مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صرف زمین اور آسمان کا خالق ہی نہیں بلکہ اس نے سورج اور چاند کو بھی مسخر کر رکھا ہے۔ اور اہلِ عرب اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں جبکہ سورج اور چاند کے باعث زمین پر حیوانی اور انسانی زندگی کا امکان پیدا ہوا ہے اور انہیں کی وجہ سے یہ زندگی جاری و ساری ہے۔ تو جس کی مخلوق اور جس کی قدرت سے مسخر کُرّوں کی وجہ سے انسان زمین پر آباد ہے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ اس کی بندگی کو زمین پر ناممکن بنا دیا جائے اور جن قوتوں کو نہ تو تخلیقِ کائنات میں کوئی دخل حاصل ہے اور نہ وہ کسی طرح بھی ان کُرّوں کے تصرفات میں دخیل ہیں۔ تو انہیں اللہ تعالیٰ کی بندگی میں شریک کر کے ان کی بندگی کا جواز پیدا کر دیا جائے۔ یہ ایک ایسا تضادِ فکر ہے جس پر تعجب کا اظہار ہی کیا جا سکتا ہے۔ آیت کے آخری الفاظ سے ان کے اسی تضادِ فکر پر اظہارِ تعجب فرمایا گیا۔ اور جو لوگ اس تضادِ فکر و عمل کو رد کر کے فکری اور عملی یکسوئی کے راستے پر چلنے کے لیے ہجرت کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ وہ بجا طور پر اس کے مستحق ہیں کہ ان کی تحسین بھی کی جائے اور ہر طرح سے ان کی مدد بھی کی جائے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾

(اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۶۲)

Marfat.com

رزق کے خزانے اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں

یہ آیتِ کریمہ پہلی آیت کا منطقی نتیجہ ہے۔ پہلی آیت ۶۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق پروردگار ہے اور سورج اور چاند کو اسی نے اہلِ زمین کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب زمین اس کی مخلوق ہے اور زمین پر اثر انداز ہونے والے اجرامِ فلکی اسی کی قوت سے مسخر ہیں تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ رزق کے خزانوں کا مالک کوئی اور بن بیٹھے۔ زمین کی قوتِ روئیدگی اسی کے حکم سے ہر چیز کو اگاتی ہے۔ اور سورج اسی کے حکم سے پانی کے ذخیروں سے بھاپ اٹھا کر بادل بناتا اور زمین کی سیرابی کا کام کرتا ہے۔ اور پھر سورج ہی کی گرمی ہے جو پیداوار کو پکاتی ہے اور چاند کی شعاعیں اور اس کی روشنی پھلوں میں مٹھاس پیدا کرتی اور دانے میں گداز پیدا کرتی ہے۔ اور جب اس طرح سے غلہ تیار ہو کر کھلیانوں کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ رزق دینے میں کوئی دوسری قوتیں بھی شریک ہیں۔ اور رزق کے کشادہ کرنے یا تنگ کرنے میں کسی اور کا بھی ہاتھ ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی کے پاس یہ استحقاق ہے اور نہ قدرت۔ اور نہ کوئی ایسے علم و حکمت کا مالک ہے جس سے وہ جان سکے کہ کس کو رزق پہنچا ہے اور کس کو نہیں پہنچا۔ اور نہ وہ بندوں کے احوال و مصالح سے باخبر ہے۔ اس لیے عقل و دانش کی بات یہ ہے کہ اس بات کا یقین پیدا کیا جائے کہ رزق کے خزانے بھی اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ وہ جس کا چاہتا ہے رزق وسیع کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اور اس کے علم کی بے پناہی کا حال یہ ہے کہ وہ رزق کی تفصیل سے بھی واقف ہے اور جو رزق کے محتاج ہیں ان کے احوال و مصالح سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ ٦٣

(اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے کس نے پانی اتارا، پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندہ کیا اس کے مردہ ہو چکنے کے بعد، تو وہ ضرور کہیں گے، اللہ نے۔ کہہ دیجیے! الحمدللہ، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔ ۶۳)

مشرکین کے فکری تضاد کی ایک مثال

اہلِ عرب کی ضروریاتِ زندگی میں پانی کو بے حد اہمیت حاصل تھی۔ انسانی جسم کے علاوہ زمین کی سیرابی کا یہی ایک ذریعہ تھا جو کبھی آسمان سے اترتا اور کبھی چشموں کی صورت میں زمین سے ابلتا۔ لیکن جب بارش مدتوں تک نازل نہیں ہوتی تھی تو چشمے بھی ویران ہو جاتے تھے۔ اس سے نہ صرف ان کے جانوروں کے ریوڑ مرنے لگتے بلکہ ہمہ نوع قسم کی بربادی اور تباہی عام ہو جاتی۔ تو پانی کی اس اہمیت کے پیشِ نظر نبی کریم ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ اگر آپ ان سے سوال کریں کہ پانی کو آسمان سے کون نازل کرتا ہے؟ اور پانی کے نازل ہو جانے کے بعد تم دیکھتے ہو کہ وہ زمین جو ہر طرف ہلاکت اگلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اس میں زندگی کے آثار جھلکنے لگتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین مخمل کا لباس پہن لیتی ہے۔ تالابوں میں آبی جانور تیرنے لگتے ہیں اور ہر طرف رنگ و نور کا ایک سیل بہنے لگتا ہے۔ رگِ سنگ میں بھی لہو کی گردش رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ پانی کس نے نازل کیا؟ تو اہلِ عرب جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے نازل کیا ہے۔ آپ ان سے

Marfat.com

کہئے کہ اگر تمہیں واقعی اس بات کا اقرار ہے تو پھر شکر کا سزاوار اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ تو تم اس کے ساتھ دوسروں کی عبادت کس بنا پر کر رہے ہو۔ یہ قدم قدم پر تم جس فکری تضاد کا شکار ہو اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ تم میں سے اکثر لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ کیونکہ عقل بھی یہ ماننے کی روادار نہیں ہو سکتی کہ زمین کا مالک اللہ تعالیٰ، تصرفات اس کے قبضے میں، رزق وہ دیتا ہے، پانی کے خزانے اسی کی دسترس میں ہیں۔ لیکن کس قدر حماقت کی بات ہے کہ بندگی میں دوسروں کو شریک کر لیا جائے۔ عقل کبھی بھی اس تضادِ فکر کو قبول نہیں کر سکتی۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَ
اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾ فَاِذَا
رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ
اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۣ
فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ
النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ
يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ
كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى
لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ
وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٦٩﴾ ع

رکوع: ۷۔ (اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا، اور دارِ آخرت ہی ہے جو اصل زندگی کی جگہ ہے، کاش یہ لوگ اس کو جانتے۔ ۶۴) اور جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی سے دعا مانگتے ہیں، پس جب وہ ان کو خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ اس کے شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔ ۶۵) تا کہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کی ناشکری کریں اور چند دن اور بہرہ مند ہو لیں، پس وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۶۶) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک پر امن حرم بنایا، اور حال یہ ہے کہ لوگ ان کے گرد و پیش سے

Marfat.com

اچک لیے جاتے ہیں، کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔ ۶۷) اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جبکہ وہ اس کے پاس آچکا ہے، کیا ایسے کافروں کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہوگا۔ ۶۸) اور جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں گے ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔ ۶۹)

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾

(اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا، اور دارِ آخرت ہی ہے جو اصل زندگی کی جگہ ہے، کاش یہ لوگ اس کو جانتے۔ ۶۴)

کفار کی گمراہی کا اصل سبب

اس آیتِ کریمہ میں کفار کی گمراہی کے اصل سبب کو منکشف فرمایا گیا ہے۔ جس طرح ایک بچہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کھیل کود کا کوئی ذریعہ تلاش کر لیتا ہے اور پھر اس میں ایسا مگن رہتا ہے کہ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ بچوں میں سے ایک بادشاہ بن جاتا ہے اور باقی درباری بن جاتے ہیں۔ حالانکہ نہ وہ بادشاہ ہے اور نہ دوسرے لڑکے درباری ہیں۔ لیکن وہ اسی کو ایک حقیقت سمجھ کر اس میں کھوئے رہتے ہیں۔ اور جب کھیل کود سے فارغ ہوتے ہیں تو جیسے گھر سے خالی ہاتھ آئے ہوتے ہیں ویسے ہی لوٹ جاتے ہیں۔ انسان بھی دنیائے فانی کی دلفریبیوں میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ دنیا میں میرا قیام چند دنوں یا چند سالوں سے زیادہ نہیں۔ حالانکہ ان کے سامنے بڑے بڑے حوادث گزرتے ہیں جو یہاں کی ہر چیز کی بے ثباتی کو نمایاں کر دیتے ہیں۔ لیکن انسان اپنی بے بصیرتی اور کم نگاہی سے کبھی دستبردار نہیں ہوتا۔ ٹھیک کہا شاعر نے:

جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سو نمونے
مگر تجھ کو اندھا کیا رنگ و بو نے

انسان جن مفادات کے لیے زندگی بھر دیوانوں کی طرح محنت کرتا اور پسینہ بہاتا ہے اسے خوب معلوم ہے کہ وہ مفادات ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں۔ جس عہدہ و منصب اور مالداری کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دیتا اور بعض دفعہ انسانیت کو تماشا بنا دیتا ہے اسے خوب معلوم ہے کہ یہ چار دن کی چاندنی ہے اس کے بعد اندھیری رات ہے۔ جس طرح لہو ولعب وقتی طور پر دل کے بہلاوے کا سامان مہیا کرتے ہیں اسی طرح دنیا کی نیرنگیاں اور دلفریبیاں بھی دل کے بہلاوے کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں کسی کو پائیداری اور ثبات حاصل نہیں۔ یہ دنیا قدر و قیمت والی چیز اس صورت میں بن سکتی ہے جب آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے۔ اور ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول، انسانیت کی بھلائی اور اللہ تعالیٰ کے دین کی بالادستی کے لیے کیا جائے۔ اس صورت میں انسان اس چند روزہ زندگی کے بدلے میں ابدی پادشاہی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اگر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور انسان اسی زندگی سے دل لگا کر اسی کی دلفریبیوں کو اپنی منزل بنا لے۔ اور یہیں کا عیش و عشرت

Marfat.com

اور شوکت وحشمت کا سامان اس کا مقصد ٹھہرے تو نتیجہ اس کا اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ جس طرح بچے کھیل کود کر خالی ہاتھ گھروں کو چلے جاتے ہیں، یہ بھی دس بیس یا ساٹھ ستر سال دل بہلا کر موت کے دروازے سے خالی ہاتھ گزر کر اس عالم میں پہنچے گا جہاں جا کر یہ راز کھلے گا کہ ہم نے زندگی کو بچوں کی طرح لہو ولعب سمجھا اور انہیں کی طرح اسی کو ساری زندگی سمجھ کر اپنی زندگی اور اس کی ساری توانائیاں اس میں کھپا کے آخرت میں پہنچے ہیں اور ان بچوں کی طرح ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ نتیجہ معلوم ہے کہ اس خود فریبی کے نتیجے میں انسان کو پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں لے گا۔ اور انجام اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوگا۔

آخر میں فرمایا کہ کاش یہ لوگ جانتے کہ دنیا کی موجودہ زندگی صرف ایک مہلتِ امتحان ہے اور انسان کے لیے اصل زندگی جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے آخرت کی زندگی ہے۔ تو وہ دنیا کی زندگی کا ایک ایک لحہ لہو ولعب میں ضائع کرنے کی بجائے ان کاموں میں استعمال کرتے جو ابدی زندگی میں کامیابی وکامرانی کی ضمانت بن سکے۔

فَإِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۗ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

(اور جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی سے دعا مانگتے ہیں، پس جب وہ ان کو خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ اس کے شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔ ۶۵) تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کی ناشکری کریں اور چند دن اور بہرہ مند ہولیں، پس وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۶۶)

دنیا کے سرمستوں کی ایک مثال

گزشتہ آیتِ کریمہ میں کفار کی گمراہی کا اصل سبب دنیا کے ساتھ ان کی گرویدگی کو بیان کیا گیا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کی اسی خود فریبی، مفاد پرستی اور دنیوی محبت کو ایک مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ یعنی ان کی مثال ایسی ہے جیسے کشتی کے مسافر۔ وہ بحری سفر میں کشتی کو اپنے لیے عافیت کا ذریعہ جان کر اس میں سوار ہوتے ہیں۔ جب تک ہوا ساز گار رہتی ہے تو کشتی نہایت رواں دواں انداز میں محوِ سفر رہتی ہے۔ اور یہ لوگ کشتی میں بیٹھے ہوئے اس قدر اپنی باتوں، کھانے پینے اور دوسری دلچسپیوں میں کھوئے رہتے ہیں کہ انہیں کبھی بھول کر بھی خیال نہیں ہوتا کہ ہوا کبھی ناموافق بھی ہوسکتی ہے اور یہ کشتی جو ہماری عافیت اور نجات کا ذریعہ ہے خطرے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ لیکن جیسے ہی مخالف طوفانی ہواؤں کا زور بڑھتا ہے اور کشتی کسی گرداب میں پھنس کر ڈگمگانے لگتی ہے۔ اور کشتی کے سوار یوں محسوس کرتے ہیں کہ اب شاید ہم کبھی کنارے تک نہ پہنچ سکیں۔ اس وقت انہیں خدا یاد آتا ہے۔ اور اس سے دعائیں کرتے ہوئے مخلصانہ عہد کرتے ہیں کہ اگر ہم اس طوفان سے بچ نکلے تو ہم ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مخلصانہ بندگی کریں گے اور کبھی اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ لیکن جب کشتی گرداب سے نکل آتی ہے تو یہ پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنانے لگتے ہیں اور اپنی پہلی سرمستیوں اور گمراہیوں میں کھو جاتے ہیں اور یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے ابھی اپنے اللہ سے کیا عہد کیا تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ ابھی پروردگار نے انہیں ایسی صورتحال سے نکالا جس میں انہیں موت نظر آ رہی تھی۔

Marfat.com

بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان پر ان میں شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوتے ان کی پرانی ناشکری کی عادت لوٹ آتی ہے اور وہ پہلے سے زیادہ کفرانِ نعمت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی پروردگار فرماتا ہے کہ ہم انہیں مزید ڈھیل دیتے ہیں تاکہ وہ ہماری نعمتوں سے اور چند دن متمتع ہو لیں۔ لیکن عنقریب وہ جان لیں گے کہ ان کی یہ روش انہیں کس برے انجام تک پہنچا کے چھوڑتی ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

(کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنایا، اور حال یہ ہے کہ لوگ ان کے گرد و پیش سے اچک لیے جاتے ہیں، کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔ ٦٧)

کشتی کے غافلوں اور قریش میں وحدتِ فکر و عمل

روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ گزشتہ آیت میں دنیا کے فریب میں مبتلا لوگوں کی مثال کشتی کے مسافروں سے دی گئی تھی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں قریش کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا ہے کہ ان کا حال بھی کشتی کے مسافروں سے مختلف نہیں ہے۔ جس طرح کشتی کے مسافر جب تک ہوا سازگار رہتی ہے تو وہ بھول کر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے جس نے انہیں سازگار ہوا، آبِ دریا کی تسخیر اور کشتی کی بے چون و چرا خدمت سے نوازا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گویا کہ کشتی اور ابر و ہوا سب ان کے تابع فرمان ہیں۔ لیکن وہ اپنی سرمستیوں میں کھوئے ہوئے شکر تو دور کی بات ہے اس کا احساس بھی قریب نہیں آنے دیتے۔ یہی حال مکے میں رہنے والے قریش کا ہے۔ ان کی تاریخ اللہ تعالیٰ کے احسانات سے معمور ہے۔ ایک مستقل احسان حرم کا وجود ہے جس کی وجہ سے انہیں اس طرح کا امن اور سکون میسر ہے کہ مکہ ان کے لیے سفینۂ نجات بن گیا ہے جبکہ ان کے گرد و پیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دیہاڑے اچک لیے جاتے ہیں۔ نہ کسی کی جان کے لیے امان ہے اور نہ کسی کا مال محفوظ۔ پورا عرب بدامنی کا جہنم بنا ہوا ہے۔ اشہرِ حرم کے سوا پورا سال بدامنی کے شعلے اہلِ عرب کو جلائے رکھتے ہیں۔ افراد تو خوف کا شکار ہیں ہی، قافلے بھی لوٹ لیے جاتے ہیں۔ لیکن انہیں مکہ معظمہ میں صرف اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے حرم کے باعث ایک ایسا سکون میسر ہے کہ کسی طرح کا کوئی خطرہ انہیں لاحق نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی ناشکری کا عالم یہ ہے کہ حرم کے کونے کونے میں انہوں نے بتوں کو لا بٹھایا ہے۔ اور خود بھی ان کی پوجا کر رہے ہیں اور لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دیتے ہیں۔ کاش ان سے کوئی پوچھے کہ تمہیں حرم کی وجہ سے امن جیسی جو عظیم نعمت میسر ہے جبکہ سارا عرب اسے ترس رہا ہے تو کیا یہ حرم ان بتوں نے بنایا ہے یا ان قوتوں نے جنہیں تم اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتے ہو۔ کیا اتنے بڑے احسان کو دیکھ کر بھی تم جس باطل یعنی شرک پر ایمان رکھتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفران کرتے ہو سے توبہ نہیں کرو گے، کیا تمہیں اس سے شرم نہیں آئے گی۔

Marfat.com

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِىْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

(اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جبکہ وہ اس کے پاس آچکا ہے، کیا ایسے کافروں کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہوگا۔ ۶۸)

عقلِ عام سے ایک سوال

قریش کے خیالات اور طرزِ عمل کو دلائل سے رد کرنے کے بعد عقلِ عام کے سامنے سوال رکھ دیا ہے کہ کیا ایسا شخص جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اختیارات کو تسلیم کر لینے کے باوجود غیر اللہ کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائے اور اس پر ستم یہ ڈھائے کہ اپنی اس جسارت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرے کہ ان باتوں کا حکم ہمیں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اسی لیے ہمارے آباؤ اجداد اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے رہے ہیں جبکہ اس انتساب کی نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے اور نہ سند۔ ایک ایجادِ بندہ ہے جس پر اصرار کیا جارہا ہے۔ عقل اس بات کا فیصلہ کرے کہ ایک بے سند بات جو محض اپنے دل سے گھڑلی گئی ہے اور نہایت ناروا جسارت کرتے ہوئے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جارہا ہو، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہوسکتا ہے۔ اور جو شخص یہ حرکت کرتا ہے کیا کوئی شخص اس سے بڑھ کر ظالم ہوسکتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور قریش نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور آپ کی تکذیب کی ہے۔ اب معاملہ دو حال سے خالی نہیں کہ اگر آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جھوٹا دعویٰ کیا ہے تو آپ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر قریش نے اللہ تعالیٰ کے سچے نبی کی تکذیب کی ہے تو پھر ان سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ اور آپ کی پاکیزہ سیرت اور آپ کا بلند کردار اور آپ کا زندگی بھر کا ریکارڈ گواہی دیتا ہے کہ آپ جھوٹا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ آپ کے دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ قریش آپ کی تکذیب کرکے ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے۔ تو کیا ایسے کافروں کا ٹھکانہ جہنم نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

لَمَّا جَآءَهٗ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ تو اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں ان کی تشریف آوری سے قریش کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اب ان کے لیے معاملہ پہلے سے زیادہ سنگین ہوگیا ہے۔ پہلے تو ان کے پاس یہ عذر ہوسکتا تھا کہ ہم اگر شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں تو ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایسا ہی پایا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ لیکن اب جبکہ آنحضرت ﷺ ہدایت کے ساتھ تشریف لے آئے اور آپ نے حق کو پوری طرح واضح کر دیا اور باطل کا باطل ہونا دلائل سے ثابت کر دیا تو اب ان کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اب شرک کا ارتکاب اور آپ کی تکذیب ایک ایسا جرم ہے جو اس جرم کے کرنے والوں کو جہنم میں پہنچا کے چھوڑے گا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾

(اور جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں گے ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔ ۶۹)

Marfat.com

جہاد اور مجاہدہ کا مفہوم اور اہلِ ایمان کو بشارت

معمولی سے معمولی محبت کی راہ طویل بھی ہے اور کٹھن بھی۔ قدم قدم پر مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے۔ جوان راستوں سے آشنا ہیں وہ ہر نئے مسافر کو اس راستے کی مشکلات پر شکایت کرتے یا روتے دھوتے دیکھ کر ہمیشہ نصیحت کرتے ہیں کہ یہ راستہ صبر و استقامت کا راستہ ہے، شکایت کا راستہ نہیں۔ اور جو آدمی اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے یہ محبت سب سے پاکیزہ محبت ہے اور اس کا راستہ سب سے کٹھن راستہ ہے۔ اس راستے کی مشکلات سب راہوں سے زیادہ شدید اور سب سے زیادہ جان لیوا ہیں۔ اس میں ذرا سی بھی آمیزش منزل کو کھوٹا کر دیتی ہے اور معمولی بے دلی منزل کو دور کر دیتی ہے۔

لغتِ عرب میں جہاد کا یہ مفہوم بیان کیا گیا ہے اَلْجِهَادُ وَالْمُجَاهَدَةُ اِسْتِفْرَاغُ الْوُسْعِ فِيْ مُدَافَعَةِ الْعُدُوْ ''دشمن سے بچاؤ کے لیے اپنی امکانی قوت و طاقت کو صرف کر دینا جہاد اور مجاہدہ کہلاتا ہے۔'' دشمن سے مراد دو طرح کے دشمن ہیں، ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ ظاہری دشمن کفار و منافقین ہیں جن سے میدانِ جنگ میں دو دو ہاتھ کیے جاتے ہیں۔ اسے بھی جہاد کہتے ہیں۔ اور باطنی دشمن ہوائے نفس اور شیطان کے وسوسے ہیں۔ ان سے برسرِ پیکار ہونا بھی جہاد ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے جَاهِدُوْا اَهْوَاءَ كُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَاءَ كُمْ ''اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف بھی اسی طرح جہاد کرو جیسے تم ظاہری دشمنوں سے جہاد کرتے ہو۔''

''فِيْنَا'' کی قید سے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جہاد اصل میں اس سرتوڑ کوشش کو کہتے ہیں جس میں کوئی دنیوی مقصد پیشِ نظر نہ ہو۔ جس کا مقصد اور منزل صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہو۔ اگر اس میں کوئی سا دنیوی مقصد نیت میں یا عمل میں شامل ہو گیا تو اس سے روحِ جہاد نکل جائے گی۔ گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور دینِ حق کی سربلندی کے لیے ظاہری اور باطنی دشمنوں سے برسرِ پیکار رہتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہوتا ہے کہ وہ ان پر اپنے راستے کھول دیتا ہے۔ سبل، سبیل کی جمع ہے۔ یعنی وہ راستہ جو منزل تک بآسانی پہنچا دے۔ ایک مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا اور دین کی سربلندی کے سوا اور منزل کیا ہو سکتی ہے۔ جب کوئی مومن اس راستے میں اپنا سب کچھ جھونک دیتا ہے تو یہ منزل اس کے لیے آسان کر دی جاتی ہے۔ آیت کے آخری جملے میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن اسے احسان کا نام دے کر اس راستے کی جدوجہد کو بلند ہدف دے دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے لیے جو بشارت دی گئی ہے اس سے بہتر یا بڑی بشارت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی معیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معیت کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت ناتمام مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ جس طرح پانی کا قطرہ سمندر میں مل کر سمندر کا ایک حصہ بن جاتا ہے اسی طرح ایک فانی انسان اللہ تعالیٰ کی معیت کا تاج پہن کر اس کے ان انعامات کا مستحق بن جاتا ہے جنھیں کبھی فنا نہیں۔ وہ اس جنت میں داخل ہو گا جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اور اس کے ذکر میں کبھی انقطاع نہیں ہو گا۔

''مع'' کے لفظ سے شاید یہ تصور دینا بھی مقصود ہو کہ راہِ محبت کے راہ رو اپنے آپ کو تنہا خیال نہ کریں۔ ان کا مالک اور ان کا محبوب پروردگار ان کے ساتھ ہے۔ وہ ہر مشکل مرحلہ پر ان کی دستگیری کرے گا۔ وہ جب بھی کوئی مشکل محسوس کریں گے اس کی توفیق آگے بڑھ کر ان کو سنبھال لے گی۔ انسان اپنے اندر جتنی بیچارگی رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معیت سے بہرہ ور ہو کر اتنی ہی بے نیازی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اسی سے شاید اللہ تعالیٰ کے دین کے دشمنوں کو بھی یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ میرے بندوں کو کبھی بے یار و مددگار نہ سمجھیں۔ وہ بظاہر کمزور سہی لیکن پشت پناہی انھیں اس کی حاصل ہے جس سے بڑا کوئی نہیں۔

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ الرُّوْمِ

(۳۰)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الرُّوْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الـرُّوْم ہے جواس کی دوسری آیت غُـلِبَـتِ الـرُّوْمُ سے ماخوذ ہے۔اس سورۃ میں چھ رکوع ساٹھ آیتیں آٹھ سوانتیس کلمات، تین ہزار پانچ صد چونتیس حروف ہیں۔

مقامِ نزول:۔ مکہ معظمہ ہے۔

شانِ نزول:۔ رومیوں اورایرانیوں کی وہ ہولناک جنگ ہے جس میں سب سے پہلے ایرانیوں نے رومیوں کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا،لیکن پھر رومی اپنے ملک کے دفاع کے لیے اٹھے اورانہوں نے دوبارہ اپنے مقبوضات ایرانی حکومت سے واپس لیے۔ایرانی غلبے کے پیش نظر دوردور تک اس کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا کہ رومی کبھی دوبارہ اٹھ سکیں گے۔لیکن قرآنِ کریم نے دنیا کو یہ خبر دے کر چونکا دیا کہ ایرانی اگرچہ عرب سے متصل اردن، شام اور فلسطین پر قابض ہوگئے ہیں لیکن وہ عنقریب پھر غالب آئیں گے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی یہ خبر دس سال سے پہلے حیرت انگیز طور پر سچی ثابت ہوئی جس نے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور آنحضرت ﷺ کی نبوت ورسالت پر مہرِ تصدیق ثبت کردی۔

زمانۂ نزول:۔ اردن، شام اور فلسطین پر ایرانیوں کا غلبہ ۶۱۵ عیسوی میں مکمل ہوا تھا۔اس لیے پوری صحت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سورۃ اسی سال نازل ہوئی۔

تاریخی پس منظر:۔ نوشیرواں عادل کی وفات کے بعداس کا چہیتا بیٹا ہرمز تختِ ساسان کا وارث بنا۔جب تک اس نے اپنے باپ کے بزرجمہر جیسے نیک نفس اور پاک طینت مشیروں کے مشوروں کو آویزۂ گوش بنائے رکھا اس وقت تک ملک کا نظام نہایت خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔لیکن جب بزرجمہر پیرانہ سالی کے باعث امورِ سلطنت سے الگ ہوکر گوشہ نشین ہوگیا تو ہرمز آہستہ آہستہ خوشامدی اور بددیانت مشیروں میں گھرتا چلا گیا۔جس کسی نے صحیح رائے دینے کی کوشش کی اسے دربارِ شاہی سے نکال دیا گیا یا قتل کردیا گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ظلم و ستم عام ہوگیا اور نظم ونسق تباہی کی انتہا کو پہنچ گیا۔لوگوں نے تنگ آکر علمِ بغاوت بلند کردیا۔کئی صوبے خودمختار بن بیٹھے اور بعض باج گزار حکمرانوں نے خراج ادا کرنے سے انکار کردیا۔ملک کے حالات کو بگڑتے ہوئے دیکھ کر ہمسایوں نے سرحدوں پر غارت گری شروع کردی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ترکستان کا خاقان تین چار لاکھ ترکوں کی جمعیت لے کر ایران کی سرحد پر آپہنچا اور ظاہر یہ کیا کہ وہ رومیوں کے مقابلہ میں ہرمز کی امداد کے لیے لشکرِ جرار لے کر آیا ہے۔ناعاقبت اندیش ہرمز نے اعتماد کرتے ہوئے اس کی فوجوں کے لیے شہروں کے دروازے کھول دیے۔تب اندازہ ہوا کہ وہ دوستی کے پردے میں درحقیقت ملک پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہے۔اس نازک وقت میں ایران کا ایک قابلِ قدر امیر بہرام آگے بڑھا اور دس بارہ ہزار بہادر سپاہیوں کو لے کر ترکوں کی ٹڈی دل فوج کو شکستِ فاش دی۔ ہرمز بجائے اس کے کہ وہ بہرام کا شکرگزار

Marfat.com

ہوتا اس کے دل میں اس کے خلاف حسد کی آگ سلگنے لگی۔ وہ اس کے خلاف کارروائی کیا ہی چاہتا تھا کہ رومیوں کے اچانک حملہ نے اسے انتقامی کارروائی سے روک دیا۔ بہرام کو بظاہر بڑی عزت کے ساتھ رومیوں کے مقابلے کے لیے مقرر کیا گیا۔ لیکن ہرمزاس کی کامیابیوں پر خوش ہونے کی بجائے اس کے خلاف انتقامی کارروائی کے لیے پَر تولنے لگا۔ بہرام چونکہ اپنی فتوحات سے ہردلعزیزی حاصل کر چکا تھا اس لیے قوم نے اس کا ساتھ دیا اور ہرمز کے خلاف عام بغاوت ہوگئی۔ بہرام نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ہرمز کا بڑا بیٹا خسرو دوم کسی طرح شہر سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ حالات ذرا پرسکون ہوئے تو ساسانی شہزادہ بنڈوز کی ترغیب پر وہ دوبارہ دارالسلطنت میں آیا۔ عمائدینِ سلطنت نے اسے دیکھ کر تاجِ شاہی اس کے سر پر رکھ دیا اور ہرمز جو ابھی تک جیل میں تھا اسے ایک عام عدالت میں بطور مجرم پیش کیا گیا۔ وہ نہایت ناگفتہ بہ حالت میں عدالت میں پیش ہوا تو اس نے مطالبہ کیا کہ خسرو کو معزول کر دیا جائے اور اس کے چھوٹے بیٹے کو تخت نشین کیا جائے۔ لیکن اس کی یہ خواہش ٹھکرا دی گئی۔ خسرو اگرچہ تختِ شاہی پر متمکن ہو چکا تھا لیکن بہرام نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ رفتہ رفتہ اعلانِ جنگ تک بات پہنچی۔ خسرو میں مقابلہ کی تاب نہ تھی، حالات بھی اس کے حسبِ حال نہ تھے اس نے رومی سلطنت کو قریب دیکھ کر وہاں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ صرف تیس پہرہ دار سپاہیوں کی معیت میں رومی مملکت میں پناہ گزین کی حیثیت سے داخل ہوا۔ سرحدی حکام نے اسے پناہ دی، اسے بڑے احترام کے ساتھ رومی بادشاہ ماریس کے پاس پہنچا دیا۔ قیصر نے اس کا شاہانہ استقبال کیا۔ قیمتی تحائف سے نوازا اور اپنے بہادر اور وفا شعار جرنیل نارسس کو ایک لشکرِ جرار دے کر حکم دیا کہ وہ خسرو کا کھویا ہوا تخت اسے واپس دلائے۔ اس عرصہ میں لوگ بھی بہرام سے دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔ اس لیے بہرام کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوئے۔ اس نے اگرچہ دو جگہ دریائے زور کے کنارے اور میڈیا کی سرحد پر خسرو کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن شکست کھائی۔ وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں زہر خورانی سے ہلاک ہوگیا۔

خسرو شاہِ روم ماریس کی اس اعانت اور عنایت کے باعث اسے اپنا باپ کہا کرتا تھا اور اس کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اور اس کی خواہش تھی کہ کسی وقت میں اس احسان کا بوجھ اتاروں۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا یہ ہوا کہ یورپ میں ماریس کے خلاف حالات بگڑنے لگے۔ ان حالات کا اثر مشرق پر بھی پڑا۔ پھر بادشاہ کی چند غلطیوں کے باعث لوگ اس سے متنفر ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے ایک معمولی فوجی فوکس کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا۔ فوکس اگرچہ غیر معروف آدمی تھا لیکن اس نے شاہِ روم کی نامقبولیت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ بادشاہ ماریس نے جب حالات کو تیزی سے بگڑتے دیکھا تو اپنی بیوی اور نو بچوں کو لے کر ایک چھوٹی سے کشتی میں ایشیائے ساحل کی طرف بھاگ نکلا، مگر بادِ مخالف نے اسے ایک جگہ پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ آخر گرفتار ہوا۔ اسے شاہی تخت سے اتار دیا گیا اور فوکس کو بیزنطینی مملکت کے تخت پر فائز کر دیا گیا۔ فوکس نے اپنے حامیوں پر انعام واکرام کی بارش کر دی۔ ان کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ کلیسا کو خوب نوازا۔ آخر یوحنا کے کلیسا میں لے جا کر اسے خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ ماریس ابھی زندہ ہے تو اس نے جلادوں کو بھیج کر اسے منگوایا۔ اس کے سامنے اس کے پانچوں بیٹوں کو یکے بعد دیگرے قتل کر دیا گیا۔ پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں سرعام لٹکوا دیے۔ ان کی لاشوں کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔

جب خسرو کو ان خونی واقعات کا علم ہوا تو وہ آپے سے باہر ہوگیا اور اعلان کیا کہ وہ اپنے محسن اور باپ ماریس، اس کی بیوہ، اس کے بچوں اور بچیوں کا انتقام فوکس سے ضرور لے گا۔ چنانچہ اس نے فوکس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور رومی سلطنت پر چڑھائی کر دی اور چند سال کے اندر وہ فوکس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈیسا (موجودہ اورفا) تک اور دوسری طرف شام

Marfat.com

میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ روم کے اعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا انہوں نے افریقہ کے گورنر ہرقل سے ساز باز شروع کر دی کہ وہ روم کا تخت سنبھالے۔ ہرقل بوڑھا ہو چکا تھا اس لیے اس نے اپنے جواں سال بیٹے ہرقل ثانی کو اس مہم کے لیے نامزد کیا۔ وہ ایک طاقتور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا۔ فوکس کو پابجولاں حاضر کیا گیا۔ ہرقل نے فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کا سر کاٹ کر اس کی لاش کو نذرِ آتش کیا گیا۔ یہ ۶۱۰ عیسوی کا واقعہ ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر فائز کیا گیا۔ اس کے بعد صاحب تفہیم القرآن نے اس تاریخی واقعہ کی جو تفصیل لکھی ہے ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔

خسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے پر اسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی اور اب اس جنگ کو اس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو رومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں۔ اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہرقل آ کر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا، کنیسۃ القیامہ (Holy Sepulchre) برباد کر دیا گیا۔ اصل صلیب جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیح نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریا کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انہوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

''سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام''

''تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسا ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟''

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکۂ معظمہ میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی قیادت میں، اور شرک کے پیروکار سرداران قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو روم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اس وقت سلطنتِ روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران

Marfat.com

کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآنِ مجید کی یہ سورۃ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ ''قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آ جائیں گے، اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔'' اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دور دور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ یک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشین گوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف روم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضہ میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون (Chalcedon موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں مگر اس نے جواب دیا کہ ''اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پا بہ زنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کر لے۔'' آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (Carthage، موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض، انگریز مؤرخ گبن کے بقول، قرآنِ مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آ جائے گی بلکہ غلبہ تو درکنار اس وقت تو کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔

Gibbon, Decline and Fall of the Roman Empirr, Vo. II, P, 788,)
(Modern Library, New York.

قرآنِ کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفارِ مکہ نے ان کا خوب مذاق اڑایا اور ابی بن خلف نے حضرت ابو بکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آ گئے تو دس اونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی کریم ﷺ کو اس شرط کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن میں فِی بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آئے ہیں، اور عربی زبان میں بِضْع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے ابی سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ سو اونٹ دے گا۔

Marfat.com

۶۲۲ء میں ادھر نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور ادھر قیصر ہرقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحر اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہوا جہاں اس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اسقفِ اعظم سرجیس (Sergius) نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض دی۔ ہرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں ارمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربائیجان میں گھس کر زرتشت کے مقامِ پیدائش ارمیاہ (Clormumia) کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گولیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہو گئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوئ کی فیصلہ کن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنتِ ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرد (دسکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہرقل کے لشکر عین طیسفون (Ctesiphon) کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رونما ہوئی۔ وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیے گئے، اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں سے ہلاک ہو گیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی جسے قرآن "فتح عظیم" کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور یہی سال تھا جس میں خسرو کے بیٹے قباد ثانی نے تمام رومی مقبوضات سے دستبردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر "مقدس صلیب" کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المقدس گیا، اور اسی سال نبی کریم ﷺ عمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی۔ عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ ابی بن خلف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اونٹ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انہیں لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے کیونکہ شرط اس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جوئے کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا، مگر اب حرمت کا حکم آچکا تھا، اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کی بجائے صدقہ کر دیا جائے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سب سے پہلے رومیوں کی مغلوبیت کا ذکر فرما کر اپنی قدرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک پیش گوئی فرمائی گئی کہ ساری دنیا یہ سمجھ رہی ہے کہ اب رومی سلطنت کا خاتمہ قریب ہے۔ مگر چند سال گزرنے نہیں پائیں گے کہ صورتحال بدل جائے گی، جو آج مغلوب ہے وہ غالب ہو جائے گا۔ پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دنیا میں قوموں کے ردوبدل کے جو واقعات پیش آتے ہیں وہ اتفاقی واقعات کے طور پر پیش نہیں آتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک مبنی بر عدل سنت کے طور پر ظہور میں آتے ہیں۔ اور ہر تبدیلی کے پیچھے اس کا حکم کارفرما ہوتا ہے۔ اور پھر اسی ضمن میں جنگِ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔

Marfat.com

پھر انسان کی کوتاہیٔ فکر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ انسان اپنی سطح بینی کی وجہ سے وہی کچھ دیکھتا ہے جو بظاہر اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ مگر اس ظاہر کے پردے کے پیچھے جو کچھ ہے اس کی اسے خبر نہیں ہوتی۔ یہ ظاہر بینی جب دنیا کے ذرا ذرا سے معاملات میں غلط فہمیوں اور غلط اندازوں کی موجب ہوتی ہے اور محض اتنی سے بات نہ جاننے کی وجہ سے کہ کل کیا ہونے والا ہے آدمی غلط تخمینے لگا بیٹھتا ہے تو پھر بحیثیتِ مجموعی پوری زندگی کے معاملے میں ظاہرِ حیاتِ دنیا پر اعتماد کر بیٹھنا اور اسی کی بنیاد پر اپنے پورے سرمایۂ حیات کو داؤں پر لگا دینا کتنی بڑی غلطی ہے۔

پھر یہ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا کے نظام اور اس کی تاریخ پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ اس کے خالق نے اس کو کھیل تماشا نہیں بنایا ہے۔ اس وجہ سے یہ لازماً جزاء وسزا پر منتہی ہوگی۔ پھر قوموں کی تاریخ سے بھی یہ بات واضح کی گئی ہے۔ اور جو لوگ اس کا انکار کر رہے ہیں ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کر رہے ہیں۔ پھر قیامت پر مسلسل دلائل دیے گئے ہیں۔ اہلِ ایمان کے لیے فلاح وکامرانی کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اہلِ کفر کی نامرادی کو واضح کیا گیا ہے۔ اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کے لیے مختلف سہارے تلاش کر رکھے ہیں ان کی بے حقیقتی واضح کی گئی ہے۔ انسان کی عبادت واطاعت کا اصلی حقدار اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں۔ کائنات کی ہر چیز اسی کی حمد وتسبیح میں مصروف ہے۔ انسانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ صبح وشام اسی کی تسبیح کریں۔

قیامت کے وجود پر جن دلائلِ آفاق وانفس سے استدلال کیا گیا ہے یہی دلائل چونکہ توحید پر بھی دلالت کرتے ہیں اس لیے چوتھے رکوع کے آغاز سے تقریر کا رخ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی طرف پھر گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کو دینِ فطرت قرار دیتے ہوئے اس کے تقاضوں اور اس کے آثار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس دینِ فطرت کو بگاڑا ہے ان کو زجر وتنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اب ان کے محاسبہ کا وقت آ گیا ہے۔ اور ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپؐ صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہیں اور فیصلہ کے دن کا انتظار کریں۔

خاتمۂ کلام میں بارش کی تمثیل سے یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ جس طرح بارش سے مردہ زمین یکایک زندگی سے آشنا ہو جاتی ہے اور زندگی وبہار کے خزانے اگلنے شروع کر دیتی ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ کی بعثت اور آپؐ پر اترنے والی وحی انسانیت کے حق میں ایک بارانِ رحمت ہے جس سے فائدہ اٹھانے والے اپنی دنیا وآخرت کو سنوار لیں گے اور خیر وفلاح ان کا مقدر بن جائیں گے۔

آنحضرت ﷺ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اندھا اور بہرہ ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں آپؐ ہرگز ان سے بددل نہ ہوں۔ غور کرنے والوں کے لیے قرآن کافی ہے۔ ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کو کوئی معجزہ بھی راہِ راست پر نہیں لا سکتا۔ آپؐ صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جائیں، اللہ تعالیٰ کا وعدۂ نصرت پورا ہو کر رہے گا۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٦٠	سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ (٣٠)	رُكُوْعَاتُهَا ٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿٢﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿٣﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ
وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٤﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٥﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ
وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا
مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٧﴾ اَوَلَمْ
يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ
النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴿٨﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَشَدَّ
مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا
وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ

Marfat.com

كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝٩ؕ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا
السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝١٠ؑ

رکوع: ۱۔ (ا ل م۔ ۱) رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے۔ ۲) اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد عنقریب وہ غالب آ جائیں گے۔ ۳) چند سالوں میں، اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی، اور اس وقت اہلِ ایمان مسرور ہوں گے۔ ۴) اللہ کی مدد سے، وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔ ۵) یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ ۶) وہ لوگ دنیا کی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل غافل ہیں۔ ۷) کیا انہوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ایک مدتِ مقرر کے ساتھ، اور بے شک لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ ۸) اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے، وہ ان سے قوت میں زیادہ تھے اور انہوں نے زمین کو زرخیز بنایا اور اسے آباد کیا تھا اس سے زیادہ جتنا انہوں نے آباد کیا اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے، پس اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ ۹) پھر ان لوگوں کا انجام جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں، برا ہوا، اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ۱۰)

الٓمّٓ ۝١ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝٢ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝٣
فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝٤
بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝٥

(ا ل م ۔ ۱) رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے۔ ۲) اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد عنقریب وہ غالب آ جائیں گے۔ ۳) چند سالوں میں، اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی، اور اس وقت اہلِ ایمان مسرور ہوں گے۔ ۴) اللہ کی مدد سے، وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔ ۵)

Marfat.com

گزشتہ سورۃ سے ربط

سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ کا مرکزی مضمون جس پر اس سورۃ کو ختم کیا گیا ہے وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنے راستے پر چلنے والوں کو مصائب میں ڈال کر امتحان تو ضرور لیتا ہے لیکن جب وہ اس امتحان میں کامیاب اترتے ہیں تو پھر ان کو نوازتا بھی خوب ہے۔اور جہاں تک مخالفین کا تعلق ہے وہ اہلِ ایمان کی بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر مذاق اڑاتے ہیں۔انہیں بار بار تنبیہ کی گئی ہے کہ یہی لوگ مستقبل کے امین ہیں۔اللہ تعالیٰ زمین پر انہیں سرفرازی عطا فرمانے والا ہے۔تم ان کی بے سروسامانی کو دیکھ کر حد سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو ورنہ وہ وقت دور نہیں جب تم ہزیمت سے دوچار کر دیے جاؤ گے۔لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان حقائق کا نزول ہو رہا تھا تو جزیرۂ عرب کے ہمسائے میں رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ جاری تھی۔ایرانی جو آتش پرست ہونے کی وجہ سے مشرکینِ عرب کے قریب تھے وہ مسلسل فتوحات حاصل کرتے جا رہے تھے۔حتیٰ کہ عرب کی قریبی سرزمین یعنی شرقِ اردن، شام اور فلسطین پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔تو مشرکینِ عرب خصوصاً اہلِ مکہ نے بغلیں بجانا شروع کر دیں اور مسلمانوں سے کہنے لگے کہ تم جو ہمیشہ یہ کہتے رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے ماننے والوں کو سرفراز کرتا ہے اور شرک کرنے والوں کو نا کام کرتا ہے۔آج ایران و روم کی جنگ میں تمہارے سامنے جو منظر واضح ہوتا جا رہا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔آتش پرست فتح یاب ہو رہے ہیں۔اور جو لوگ تمہاری طرح آسمانی مذہب کے داعی، وحیِ الٰہی کے نام لیوا، نبوت اور کتاب پر ایمان رکھنے والے اور آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں وہ مسلسل شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں جو کچھ بتایا جاتا رہا ہے وہ سراسر بہلاوا ہے، حقیقت وہ ہے جو ہمیں ایران اور روم کی آویزش میں نظر آ رہی ہے۔مسلمان جو پہلے ہی اذیت رسانیوں کے باعث حد درجہ آزردہ تھے رومیوں کی شکست سے اور زیادہ آزردہ ہو گئے۔ایک تو وہ اپنی طرح انہیں توحید، نبوت اور آخرت پر ایمان رکھنے کے باعث اپنے قریب سمجھتے تھے۔اور دوسرا اس لیے بھی کہ ابھی تک اسلام کی دعوت ان تک نہیں پہنچی تھی، لیکن وہ پہلی آسمانی کتابوں کے ماننے والے تھے اس لحاظ سے وہ کافر نہیں کہے جا سکتے تھے۔البتہ یہود کو کافر کہا جا سکتا تھا کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنے کی وجہ سے کفر کا ارتکاب کر چکے تھے۔اس لحاظ سے مسلمانوں کے لیے رومیوں کی شکست اپنی شکست محسوس ہوتی تھی۔اور اہلِ مکہ ایرانیوں کی فتح کو اپنی فتح قرار دے رہے تھے۔پیشِ نظر آیات کے نزول نے مسلمانوں کے لیے حوصلے کا سامان کیا۔اور کفار کے لیے ایک ایسی صورتحال پیدا کر دی جو ان کے لیے لمحۂ فکریہ بھی تھی اور اگر قرآنِ کریم کی پیشگوئی پوری ہو جاتی ہے تو ایک طرح سے ان کے لیے موت کا درجہ رکھتی تھی۔صاف صاف ارشاد فرمایا کہ تمہاری قریبی سرزمین یعنی شرقِ اردن، شام اور فلسطین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں۔اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے چھپایا نہیں جا سکتا۔لیکن تمہیں آگاہ رہنا چاہیے کہ یہ مغلوبیت زیادہ دنوں تک نہیں چلے گی، وہ عنقریب اپنی شکست سے زخمی شیر کی طرح اٹھیں گے اور چند ہی سالوں میں نہ صرف اپنے مقبوضات واپس لے لیں گے بلکہ ایران کی کمر توڑ کر رکھ دیں گے۔

بِضۡعِ سِنِیۡنَ کا مفہوم

قرآنِ کریم کا عمومی اسلوب یہ ہے کہ پروردگار اپنی پیشین گوئی کو کبھی متعین انداز میں پیش نہیں فرماتے۔لیکن اس آیتِ کریمہ میں فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ فرما کر پیشین گوئی کے وقت کو متعین فرما دیا ہے۔کیونکہ بِضۡعِ کے لفظ کا اطلاق دس سے کم کم پر ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مفتوح قومیں اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے پرعزم بھی ہوں جب بھی اس کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔لیکن رومی دس سال سے کم عرصہ میں نہ صرف اپنی شکست کا داغ دھو ڈالیں گے بلکہ ایران کے سب سے بڑے آتش کدہ اور دارالسلطنت کو تباہ و برباد کر دیں گے۔

Marfat.com

مسلمانوں کو چونکہ قرآن کریم کے ایک ایک حرف پر یقین تھا اس لیے حضرت صدیق اکبرؓ نے ابی ابنِ خلف کی طرف سے اس شرط کو قبول کرلیا کہ اگر قرآنِ کریم کی دی ہوئی خبر دس سال سے کم عرصہ میں پوری نہ ہوئی تو حضرت صدیق اکبرؓ سے ایک سو اونٹ ادا کریں گے۔اور اگر یہ خبر صحیح ثابت ہوئی تو ابی کو سو اونٹ ادا کرنے ہوں گے۔ہم تعارف میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اس خبر کے وقوع پذیر ہونے پر حضرت صدیق اکبرؓ نے ابی کے وارثوں سے سو اونٹ وصول کیے اور آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے مطابق انہیں صدقہ کردیا گیا کیونکہ اس وقت قمار کی حرمت نازل ہو چکی تھی۔حربی کافروں سے مال تو لیا جاسکتا ہے لیکن استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

اس پیشگوئی کے وقت کے تعین کے ساتھ اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔مسلمانوں کے لیے یہ بات کہنا آسان ہوگیا کہ تم ایرانیوں کی فتح پر بغلیں بجا رہے ہو، بس چند سالوں کی بات ہے حقیقت تمہارے سامنے کھل کر آجائے گی۔اور ایک طرح سے مسلمانوں کی تبلیغ ودعوت کے لیے ایک بہت بڑی دلیل بھی ہاتھ آگئی کہ تم ہمیشہ نشانیاں طلب کرتے ہو قوموں میں انقلاب سے بڑھ کر کون سی نشانی ہوسکتی ہے۔دس سال کا عرصہ قوموں کی زندگی میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔تم دیکھو گے اگلی دہائی شروع ہونے سے پہلے تمہارے ہم مذہب شکست کھا چکے ہوں گے۔اور آنحضرت ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب اپنی صداقت منوا چکی ہوگی۔اس طرح سے آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایک ایسی قطعی دلیل قائم ہوجائے گی جس سے انکار کرنا کسی عقل دشمن کے سوا کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

ایک حقیقت کا انکشاف

اس کے بعد مزید ایک حقیقت منکشف فرمائی گئی ہے۔وہ یہ کہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ہم اس کے مصالح اور حکمتوں سے آگاہ نہیں ہوسکتے۔لیکن روم وایران کی جنگ نے اس حقیقت کو واضح کردیا ہے کہ قوموں کی زندگی میں اتنے بڑے بڑے انقلابات محض اتفاقاتِ زمانہ اور گردشِ روزگار سے پیش نہیں آتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیش آتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ رومیوں کو فتح عطا فرمائے گا تو مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس نصرت پر خوشیاں منائیں گے۔اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو چونکہ کسی حد تک رومیوں سے اپنائیت کا تعلق ہے اس لیے جب آتش پرستوں پر انہیں فتح نصیب ہوگی تو قرآنِ کریم کی پیشین گوئی کے پورا ہونے اور رومیوں کے فتح یاب ہونے پر مسلمان خوشی منائیں گے۔اور دوسرا مطلب ایک اور ہے جس کی طرف دھیان شاید اس وقت نہ جاسکا ہو جب یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔لیکن جب رومیوں کو فتح ہوئی ہے تب معلوم ہوا کہ اس فتح میں ایک اور فتح بھی شامل تھی۔کیونکہ ابن عباس، ابو سعید خدری، سفیانِ ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ کا بیان ہے کہ ایرانیوں پر رومیوں کی فتح اور جنگِ بدر میں مشرکین پر مسلمانوں کی فتح کا زمانہ ایک ہی تھا۔اس لیے مسلمانوں کو دہری خوشی ہوئی۔یہ بات ایران اور روم کی تاریخوں سے بھی ثابت ہے۔کیونکہ ۶۲۴ء وہ سال ہے جس میں جنگِ بدر ہوئی ہے اور یہی وہ سال ہے جس میں قیصرِ روم نے زرتشت کا مولد تباہ کیا ہے۔اور ایران کے سب سے بڑے آتش کدہ کو مسمار کردیا ہے۔

Marfat.com

بِنَصْرِ اللّٰهِ کا مفہوم

بِنَصْرِ اللّٰهِ ...... اس کا تعلق سَیَغْلِبُوْنَ سے بھی ہوسکتا ہے اور یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ رومیوں کے مغلوب ہونے کے بعد اب عنقریب جو غلبہ ملنے والا ہے اس کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید ہوگا۔ اس نے رومیوں کو ایرانیوں سے پٹوا کر انہیں بیدار ہونے کا موقع دیا ہے۔ اور اب ان کی نصرت فرما کر انہیں سنبھلنے کا موقع بھی دے گا اور مزید امتحان میں بھی ڈالے گا۔ اسی طرح مسلمان آج جبکہ ادھیڑے کھدیڑے جارہے ہیں رومیوں کے غلبے کے دن خوش ہوں گے۔ لیکن یہ خوشی صرف رومیوں کے غلبے کی وجہ سے نہیں ہوگی بلکہ اس کا حقیقی سبب بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد ہوگی، جس کے نتیجے میں جنگِ بدر کی صورت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو قریش کی خونخوار قوت پر غیر متوقع طور پر واضح غلبہ عطا فرمائے گا۔ ایک طرف رومیوں کا غالب آنا مسلمانوں کے لیے اس وجہ سے خوشی کا باعث ہوگا کہ قریش ایرانیوں کے غلبے کو اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل سمجھتے تھے اور اس دلیل کے شکست ہوجانے سے مسلمانوں کو نظریاتی طور پر سپورٹ ملے گی۔ اب قریش کے ساتھ حق و باطل کے پہلے معرکے میں مسلمانوں کی واضح فتح ان کے لیے رومیوں کے غلبے سے بڑھ کر خوشی کا باعث ہوگی۔ کیونکہ اس سے یہ بات ثابت ہوجائے گی کہ حقیقی قوت اللہ تعالیٰ ہی کی قوت ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے فتح عطا فرماتا ہے۔ لیکن اس کی مشیت چونکہ حق و عدل پر مبنی ہے اس لیے وہ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے عدل و حکمت کی رو سے اس کی مدد کے سزاوار ہوتے ہیں۔ عزیز ورحیم کا حوالہ شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۶

(یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ ۶)

وَعْدَ اللّٰهِ ...... یہ مفعول مطلق ہے، اس کا عامل محذوف ہے۔ تقدیرِ کلام یوں ہے وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا اس کا مقصد وعدے کو مؤکد کرنا ہے۔ ایرانیوں کے غیر معمولی غلبے اور رومیوں کی ذلت ناک پسپائی کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اب رومی دوبارہ اٹھ سکیں گے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب رومی سلطنت چند دنوں کی مہمان ہے۔ لیکن توقع اور حالات کے بالکل برعکس قرآنِ کریم کی پیشگوئی ظاہر بین دماغوں کے لیے ایک انہونی بات تھی۔ اسی وجہ سے کفار کو مزید مذاق اڑانے کا موقع مل گیا۔ پروردگار نے اس پیشگوئی کو مؤکد کرنے کے لیے اسے وعدے سے تعبیر فرمایا۔ اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وعدے کی خلاف ورزی کبھی نہیں کیا کرتا۔ لیکن اکثر لوگ چونکہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں اس لیے وہ اسے معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اشارہ اس بات کی طرف بھی فرمایا کہ ہر فیصلے کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا مخفی ہاتھ کام کرتا ہے۔ جو لوگ اس مخفی ہاتھ پر یقین نہیں رکھتے ان کے لیے ایسے حقائق کو تسلیم کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اب یہ سب کچھ کھل کر ان کی نگاہوں کے سامنے آجائے گا۔

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۷

(وہ لوگ دنیا کی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل غافل ہیں۔ ۷)

Marfat.com

انسان کی کوتاہیِ فکر

اوپر کی آیات سے ہر غور کرنے والے پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انسان ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے اندازے بھی لگاتا ہے اور نتائج بھی اخذ کرتا ہے۔ اور بعض دفعہ اسی بنیاد پر اصول بھی وضع کرتا ہے۔ لیکن اسے کبھی اس بات کا خیال نہیں آتا کہ میں جن ظاہری اسباب پر اپنے خیالات کی بنیاد رکھ رہا ہوں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ان ظاہری حالات کے پیچھے کوئی اور قوت بھی کارفرما ہو جسے میری نگاہیں دیکھ نہیں پاتیں۔ اوپر کی آیات نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اگر ظاہری حالات ہی حقیقی اسباب کا درجہ رکھتے اور وہی انقلاب کا باعث ہوتے ہیں تو پھر ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کے دوبارہ اٹھنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ان کے ظاہری حالات میں اس بات کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ایرانی اپنی تمام تر فتوحات کے باوجود دوبارہ مغلوب ہو جائیں گے۔ اور رومی ہولناک تباہی اور ذلت کی راکھ سے پھر زندہ ہو کر اٹھیں گے۔ اس لیے جب قرآنِ کریم نے ان کے دوبارہ غالب آنے کی خبر دی تو ظاہر بین نگاہوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن حالات نے ثابت کر دیا کہ ظاہر کے پردے میں کوئی اور قوت بھی کارفرما ہے جو درحقیقت ہر طرح کی تبدیلی پر قادر ہے۔

انسان کی یہ کمزوری صرف یہیں تک محدود نہیں کہ وہ ظاہری حالات سے نتائج اخذ کرتا ہے بلکہ اس کی بے بصیرتی اور بے خبری کا عالم یہ ہے کہ جو حقائق اس کی نظروں سے اوجھل ہیں وہ اسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ ہر بات کو یا تو حواس سے جانچ کر مانتا ہے اور یا عقل کے ترازو میں تول کر تسلیم کرتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایسے لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ نہ ان کے حواس قیامت کو محسوس کرتے ہیں اور نہ ان کی عقل قیامت کا ادراک کر سکتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ قیامت اور آخرت کا انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ گزشتہ آیات میں ایرانیوں اور رومیوں کی جنگ کا جو نتیجہ ہم دیکھ چکے ہیں اگر اسی میں تدبر سے کام لیا جائے تو یہ باور کیے بغیر چارہ نہیں کہ اگر ہمارے ہوش و خرد کے پیمانے ہی حقائق کے معاملے میں فیصلہ کن ہوتے تو ہم وہ صورتحال نہ دیکھتے جو دیکھ چکے ہیں۔ اسی سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی صرف یہی نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ اور موت کا بھی صرف وہی تصور نہیں جو ہم سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس میں ہمیں ان تصورات کو قبول کرنا پڑے گا جو اللہ تعالیٰ کے رسول لے کر آئے۔ کیونکہ انہیں مانے بغیر ان حقائق کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں جن کی طرف گزشتہ آیات نے اشارے کیے ہیں۔

آیت کا ایک اور پہلو سے مفہوم

اس آیت کو ایک اور پہلو سے دیکھیں تو ایک اور حقیقت کی طرف بھی رہنمائی ملتی ہے، وہ یہ کہ اہلِ دنیا عموماً حیاتِ دنیا کے ظاہر پر نظریں جمائے رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھی غذا، اچھا لباس، اچھی رہائش، اچھی سواری انسان کا مطلوب ٹھہرتی ہیں۔ پھر ان ہی چیزوں میں قدم آگے بڑھتا ہے تو تکلفات کی دنیا شروع ہو جاتی ہے اور بنیادی ضرورتوں کو آدمی بہتر سے بہتر طریقے سے حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب اس میں غلو کا شکار ہوتا ہے تو یہی ضروریات تکلفات سے آگے بڑھ کر تعیّشات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور پھر مقاصدِ زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس حالت کو پہنچ کر انسان ان ضروریات کا حصول زندہ رہنے کے لیے نہیں کرتا بلکہ زندگی کو اس کا خادم بنا دیتا ہے۔ اس کی ساری زندگی اور اس کی بہترین صلاحیتیں ان ہی چیزوں کو بہتر سے بہتر شکل دینے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ علم جس کا مقصد معرفتِ حق اور معرفتِ حقائق سمجھا جاتا تھا اسے بھی انسان اس لیے حاصل کرتا ہے تاکہ بہتر سے بہتر ملازمت حاصل کر سکے یا کاروبار کو زیادہ

Marfat.com

سے زیادہ ترقی دے سکے۔اور پھر یہ دھن اس پر اس طرح سوار ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا جغرافیہ مطبخ اور بیت الخلاء میں گھر کر رہ جاتا ہے۔اور اس کی زندگی کا طواف صرف ایک مطاف کے گرد جاری رہتا ہے جسے معدہ کہتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان ہوتے ہوئے بھی ساری زندگی حیوانیت کی نمود و پرداخت اور زیبائش و آرائش میں صرف کر دیتا ہے۔قرآنِ کریم نے ایسے ہی لوگوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ ''اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ زندگی کا لطف اٹھانے میں لگے رہتے ہیں اور اس طرح کھانے میں مصروف رہتے ہیں جیسے چارپائے کھاتے ہوں۔'' دوسری جگہ ارشاد فرمایا ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ''چھوڑ دو انہیں کہ کھاتے رہیں اور زندگی سے لطف اٹھاتے رہیں اور آرزوئیں انہیں بہلاتی رہیں، عنقریب جان لیں گے۔'' ایسے لوگ چونکہ حیوانی زندگی کے رسیا ہو کر انسانی احساسات اور اخلاقی تصورات سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں اور ان کا ہدف زیادہ سے زیادہ انسانی ضروریات کو حاصل کرنے تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔تو وہ کبھی اس بات پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے اور موت کس چیز کا نام ہے۔ہمیں اللہ تعالیٰ نے زندگی کی جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور ہوش و خرد سے نوازا ہے اور عمل کی فی الجملہ آزادی بخشی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اخلاقی حسیات سے بھی نوازا ہے اور ہم اپنی زندگی کے تجربے میں عمل اور ردعمل کو قدم قدم پر بروئے کار آتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اچھائی اور برائی کا بھی ایک تصور ہمارے ذہنوں میں موجود ہے اور یہ احساس بھی تقریباً ہر انسان میں پایا جاتا ہے کہ نیکی کی جزاء اور برائی کی سزا ملنی چاہیے۔تو کیا ان تصورات کا خود بخود یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسانی زندگی کے خاتمے کے بعد ایک ایسا دن آنا چاہیے جس دن انسانی زندگی کے اعمال کا جائزہ لیا جائے،اس کے اچھے اعمال کی جزاء دی جائے اور برے اعمال کی سزا دی جائے۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام تصورات کے ہوتے ہوئے بھی انسان کی غفلت اور ہوائے نفس کا دباؤ اتنا شدید ہے کہ انسان ہمیشہ آخرت سے غافل رہتا ہے۔ یہی حال قریش اور دیگر مشرکینِ مکہ کا ہے۔وہ دنیا کے عیش کے لیے ہر بات کو سمجھتے اور ہر محنت کے لیے تیار رہتے ہیں۔اس کے لیے کیسی بھی مشقت اٹھانی پڑے انہیں کبھی اس سے انکار نہیں۔لیکن آخرت میں جواب دہی کا تصور چونکہ ان کے دل و دماغ کی آواز نہیں اس لیے غفلت ان پر غالب رہتی ہے۔اور یہی ان کی زندگی کا حادثہ ہے جس نے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝۸

(کیا انہوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا، اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ایک مدتِ مقرر کے ساتھ، اور بے شک لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ ۸)

انسان کو تفکر کی دعوت

انسان کا یہ طرزِ فکر کہ وہ دنیا ہی کو انسانی تگ و تاز کا اصل میدان اور اسی میں زیادہ سے زیادہ ترقی کو مقصدِ زندگی سمجھتا ہے۔اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ میں آخرت کا تصور جگہ نہیں بنا پاتا۔انسان کو اس فکری گمراہی اور عملی کوتاہی سے نکالنے کے لیے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں انسانوں کو تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے کہ اگر انسان باہر کی دنیا میں غور و فکر سے پہلے اپنے من کی دنیا میں اتر کر دیکھتا تو اس

Marfat.com

پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان میں سے کسی چیز کو بھی بے غایت و مقصد محض کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں فرمایا بلکہ ہر چیز ایک غایت و مقصد رکھتی ہے اور اسے ایک مقررہ مدت کے لیے پیدا فرمایا گیا ہے۔ انسان جیسے جیسے کائنات کی ایک ایک چیز پر غور و فکر کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت پوری طرح کھلتی چلی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب اس کائنات کی ہر چیز اپنے اندر ایک غایت و حکمت رکھتی ہے اور اس کے لیے ایک مدت بھی مقرر ہے تو یہ کس طرح تصور کیا جاسکتا ہے کہ انسان جس کی حیثیت ایک برترین مخلوق کی ہے اور جسے بعض غیر معمولی صفات دے کر پیدا کیا گیا ہے اسے بے مقصد اور عبث پیدا کیا گیا ہو یعنی نہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد ہو اور نہ اس کے لیے کوئی وقت مقرر کیا گیا ہو۔ وہ خودرو پودوں کی طرح پیدا ہوا اور مل دل کے ختم ہو جائے یا اسے شتر بے مہار بنا کر یہاں بھیجا گیا ہو کہ وہ جہاں چاہے چرتا پھرے اور آخر موت کا شکار ہو جائے۔ جب کائنات کی ہر چیز ایک مقصد رکھتی ہے تو انسان ہی کو آخر مقصد سے آزاد کس طرح چھوڑا جاسکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بھی اسی حقیقت کو مزید نمایاں کرتے ہوئے صاحبِ ایمان لوگوں کی صفت کے طور پر بیان فرمایا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو نے یہ کارخانہ عبث پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات اس سے پاک ہے کہ تو ایسے عبث کام کرے۔ یقیناً تو نے ہماری بھی زندگی کا ایک مقصد رکھا ہے اور اس مقصد کے حصول ہی میں ہماری نجات ہے۔ اس لیے اے ہمارے رب ہمیں عذاب نار سے بچائیو۔ یہ تو وہ حقیقت ہے جو تفکر و تدبر کے بعد خود بخود نمایاں ہوتی ہے، لیکن انسان کا حادثہ یہ ہے کہ وہ کبھی اس پہلو سے غور کرنے کی زحمت نہیں کرتا۔ ہمیشہ اس پر ہوائے نفس کا غلبہ رہتا ہے۔ زندگی کی لذتیں فلسفہ بن کر اسے گھیرے رہتی ہیں۔ عزت و شہرت کا بھوت ہمیشہ سر پر سوار رہتا ہے جو کسی اور طرف متوجہ ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایسے لوگ ظاہر ہے اصل حقیقت سے کبھی بہرہ ور نہیں ہوتے۔ اس لیے ان میں سے اکثر لوگ اپنے رب کی ملاقات سے انکار کرتے ہیں چونکہ اس کے اقرار سے زندگی کے تصورات تبدیل کرنے پڑتے ہیں۔ عیش و عشرت سے کنارہ کش ہو کر ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ حیوانیت سے نکل کر انسانیت کے دائرے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ یہ ایسا مشکل کام ہے جو ہوس اور خواہش کے مارے ہوئے لوگوں کے لیے آسان نہیں۔ اس لیے وہ اس راستے پر آنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے۔

اس آیت کی مزید تشریح میں صاحبِ تفہیم القرآن نے ایک نوٹ لکھا ہے جو استفادہ کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اس فقرے میں آخرت کی دو مزید دلیلیں دی گئی ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود سے باہر کے نظامِ کائنات کو بنظرِ غور دیکھے تو اسے دو حقیقتیں نمایاں نظر آئیں گی:

ایک یہ کہ یہ کائنات برحق بنائی گئی ہے۔ یہ کسی بچے کا کھیل نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے اس نے ایک بے ڈھنگا سا گھروندا بنا لیا ہو جس کی تعمیر اور تخریب دونوں ہی بے معنی ہوں۔ بلکہ یہ ایک سنجیدہ نظام ہے، جس کا ایک ایک ذرہ اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ اسے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے، جس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے، جس کی ہر شے بامقصد ہے۔ انسان کا سارا تمدن اور اس کی پوری معیشت اور اس کے تمام علوم و فنون خود اس بات پر گواہ ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کے پیچھے کام کرنے والے قوانین کو دریافت کر کے اور ہر شے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اسے تلاش کر کے ہی انسان یہاں یہ سب کچھ تعمیر کر سکا ہے۔ ورنہ ایک بے ضابطہ اور بے مقصد کھلونے میں اگر

Marfat.com

ایک پتلے کی حیثیت سے اس کو رکھ دیا گیا ہوتا تو کسی سائنس اور کسی تہذیب و تمدن کا تصور تک نہ کیا جا سکتا تھا۔ اب آخر یہ بات تمہاری عقل میں کیسے سماتی ہے کہ جس حکیم نے اس حکمت اور مقصدیت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے اور اس کے اندر تم جیسی ایک مخلوق کو اعلیٰ درجہ کی ذہنی و جسمانی طاقتیں دے کر، اختیارات دے کر، آزادیٔ انتخاب دے کر، اخلاق کی حس دے کر اپنی دنیا کا بے شمار سروسامان تمہارے حوالہ کیا ہے، اس نے تمہیں بے مقصد ہی پیدا کر دیا ہوگا؟ تم دنیا میں تعمیر و تخریب، اور نیکی و بدی، اور ظلم و عدل، اور راستی و ناراستی کے سارے ہنگامے برپا کرنے کے بعد بس یونہی مر کر مٹی میں مل جاؤ گے اور تمہارے کسی اچھے یا برے کام کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا؟ تم اپنے ایک ایک عمل سے اپنی اور اپنے جیسے ہزاروں انسانوں کی زندگی پر اور دنیا کی بے شمار اشیاء پر بہت سے مفید یا مضر اثرات ڈال کر چلے جاؤ گے اور تمہارے مرتے ہی یہ سارا دفترِ عمل بس یونہی لپیٹ کر دریا برد کر دیا جائے گا؟

دوسری حقیقت جو اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کسی چیز کے لیے بھی ہیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک عمر مقرر ہے جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہی معاملہ بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں جتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں وہ سب محدود ہیں۔ ایک وقت تک ہی وہ کام کر رہی ہیں، اور کسی وقت پر انہیں لامحالہ خرچ ہو جانا اور اس نظام کو ختم ہو جانا ہے۔ قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث ان فلسفیوں اور سائنسدانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی جو دنیا کو ازلی و ابدی قرار دیتے تھے۔ مگر موجودہ سائنس نے عالم کے حدوث و قِدَم کی اس بحث میں، جو ایک مدتِ دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی، قریب قریب حتمی طور پر اپنا ووٹ خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے۔ اب دہریوں کے لیے عقل اور حکمت کا نام لے کر یہ دعویٰ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی۔ پرانی مادہ پرستی کا سارا انحصار اس تخیل پر تھا کہ مادہ فنا نہیں ہو سکتا، صرف صورت بدلی جا سکتی ہے، مگر ہر تغیر کے بعد مادہ مادہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اس عالمِ مادی کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ لیکن اب جوہری توانائی (Atomic Energy) کے انکشاف نے اس پورے تخیل کی بساط الٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ بات کھل گئی ہے کہ قوت مادے میں تبدیل ہوتی ہے اور مادہ پھر قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہیولیٰ۔ اب حرکیاتِ حرارت کے دوسرے قانون (Second Law of Thermo-Dynamics) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ عالم مادی نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی۔ اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا ہی چاہیے۔ اس لیے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پر اٹھ کر قیامت کا انکار کرے گا؟

Marfat.com

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ؕ کَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْھُمْ قُوَّۃً
وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَ عَمَرُوْھَاۤ اَکْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْھَا وَجَآءَتْھُمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ؕ فَمَا کَانَ اللّٰہُ
لِیَظْلِمَھُمْ وَلٰکِنْ کَانُوْۤا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝۹ ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْۤاٰۤی اَنْ
کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوْا بِھَا یَسْتَھْزِءُوْنَ ۝۱۰

(اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے، وہ ان سے قوت میں زیادہ تھے اور انہوں نے زمین کو زرخیز بنایا تھا اور اسے آباد کیا تھا اس سے زیادہ جتنا انہوں نے آباد کیا اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے، پس اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ ۹) پھر ان لوگوں کا انجام جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں، برا ہوا، اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ۱۰)

تاریخ سے استدلال

آخرت کے وجود پر دلائلِ آفاق اور دلائلِ انفس دینے کے بعد اب تاریخ سے استدلال کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ انسان بسا اوقات دلائل سے وہ اثر قبول نہیں کرتا جو مشاہدات سے کرتا ہے۔ جبکہ مشاہدات بھی انسانوں کی زندگی اور ان کے اعمال سے متعلق ہوں۔ کیونکہ انسانوں میں ہزاروں اختلافات کے باوجود مشترک قدریں اتنی زیادہ ہیں کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کے حالات سے متاثر ہونا اور ایک قوم کا دوسری قوموں کے انجام سے عبرت پکڑنا ایک فطری بات معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کے پیشِ نظر قریش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ کیا یہ لوگ زمین میں سفر نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ قریش تجارت پیشہ لوگ تھے اور ان کے تجارتی قافلوں کا مختلف ممالک میں جانا ایک حقیقت تھا۔ اس لیے ان کے سفر کے ذکر سے صرف اگلی بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ یہ لوگ یقیناً سفر کرتے ہیں تو کیا یہ اپنے سفر کے دوران ان قوموں کے کھنڈرات اور آثار کا مشاہدہ نہیں کرتے جو ایک زمانے میں نہایت کروفر سے زندگی گزار رہی تھیں لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو گئیں۔ آخر وہ اپنے اس اندوہناک انجام تک کیسے پہنچیں۔ کھنڈرات سے تو جانور بھی گزرتے ہیں لیکن انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ ان کھنڈرات کے آئینہ میں تاریخی حقائق کو پڑھنے کی کوشش کریں۔ لیکن انسان جب گزرتا ہے تو وہ ہر اثر اور ہر اینٹ کے پیچھے تاریخ تلاش کرتا ہے۔ تو یہ لوگ بھی جب ان قوموں کے آثار سے گزرتے ہیں تو کیا اس بات پر غور نہیں کرتے کہ آخر یہ قومیں اپنے اس انجام سے کیسے دوچار ہوئیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ جب کوئی قوم مادی ترقی کے عروج پر پہنچتی ہے اور وہ زمین کے ذرائع کو نہایت کامیابی سے استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور ایک شاندار تمدن کو جنم دیتی ہے تو یہی اصل میں اس کی زندگی کے مقاصد ہیں جنہیں کامیابی سے انجام دینے کے بعد ان کی تباہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس دنیا میں بھی نہایت ٹھاٹ اور کامیابی کی زندگی گزارتی ہیں، اور آخرت میں بھی انہیں نہایت کامرانیوں سے نوازا جائے گا۔ اگر یہ بات واقعی حقیقت ہوتی تو پھر ان تباہ ہونے والی قوموں کو آج تک زمین پر کامیاب قوموں کی

Marfat.com

مثال بن کر زندہ رہنا چاہیے تھا۔ کیونکہ ان کی زمینی ترقی میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ نہایت طاقتور لوگ تھے، انہوں نے زمین کے خزانے نکالنے میں کوئی کمی نہیں کی تھی اور زمین کو اپنے کارناموں سے اس طرح آباد اور سیراب کیا تھا کہ آج تک ان کے تاریخی آثار ان کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ لیکن ان کے تمام کارنامے ان کی تعمیری کاوشیں اور ان کی تمدنی کامیابیاں ان کو تباہی سے نہ بچا سکیں۔ اگر یہ چیزیں کسی قوم کی بقا کی ضمانت ہوتیں تو ان قوموں کو کبھی نہیں مٹنا چاہیے تھا۔ اس لیے قریش کو سوچنا چاہیے کہ جس دنیوی ترقی اور مال و دولت کی بہتات نے انہیں فریب دے رکھا ہے۔ انہیں چیزوں نے پہلی قوموں کو تباہ کیا اور یہی چیزیں انہیں بھی تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں۔ یہی فریب نظر ہے جس نے ہمیشہ قوموں کو تباہ کیا ہے اور اسی فریب کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ رسول بھیجے اور وہ ان کے پاس ایسے واضح دلائل اور کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے جس سے حقیقت کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن ان کی قوموں نے اس طرح آنکھیں بند رکھیں کہ کوئی نشانی بھی ان کی آنکھیں کھولنے پر قادر نہ ہو سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب میں پکڑ لیا۔ لیکن یہ عذاب میں پکڑا جانا ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے انذار کی کچھ پرواہ نہ کی، بلکہ انہوں نے نہایت جسارت کے ساتھ ان آیات کو جھٹلایا اور ان کا تمسخر اڑایا جسے اللہ تعالیٰ کے نبی لے کر آئے تھے۔ حاصل کلام یہ کہ تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ انسان ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہا ہے کہ دنیوی ترقی، ضروریاتِ زندگی کی بہتات، وسائلِ رزق کی فراوانی، تہذیبی اور تمدنی ضرورتوں کی تعمیر، راحت و آرام اور بقا و دوام کا سروسامان یہ وہ اسباب ہیں جس سے انسانی زندگی میں کامیابی و کامرانی اور آسودگی و شائستگی کی ضمانت ملتی ہے۔ جو قومیں ان چیزوں میں ترقی کر جاتی ہیں اور زمین پر طاقت کی علامت بن جاتی ہیں انہیں کوئی ناکام نہیں کہہ سکتا۔ لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان قوموں کے پاس اللہ تعالیٰ کے نبی آئے انہوں نے نہایت واضح دلائل کے ساتھ اپنی حقانیت ان پر واضح کی۔ اور انہیں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ تمہارے ان تصورات نے تمہیں صرف دنیا کے خول میں بند کر دیا ہے۔ تم اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی کے تصور سے آشنا ہی نہیں ہو۔ تمہیں کبھی اس کا خیال نہیں آتا کہ تمہاری اس زندگی کا کوئی مقصد بھی ہے۔ اور تمہیں جو عمر کی صورت میں مہلتِ عمل ملی ہوئی ہے اس کے بارے میں کبھی جواب طلبی بھی ہوگی۔ اور کبھی وہ دن آئے گا جب تمہیں اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ایک ایک عمل کا جواب دینا پڑے گا۔ لیکن چونکہ تمہیں ان تصورات سے کوئی سروکار نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے اخلاق تباہ ہو گئے ہیں، تمہارے معاملات سے دیانت و امانت نکل گئی ہے، تم جواب دہی سے آزاد ہو کر شتر بے مہار بن گئے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نبی تمہیں اس سے روکتے ہیں لیکن تم ان کی بات سننے کے روادار نہیں ہو۔ وہ بار بار تمہیں انذار کر رہے ہیں۔ لیکن تم اس کا مذاق اڑاتے ہو۔ اس طرح سے تم نے اپنے اوپر ظلم کا جو رویہ اختیار کر رکھا ہے یہ تمہیں ایک دن تباہی کی طرف لے جائے گا۔ چنانچہ آخر یہی ہوا کہ جب وہ اپنی روش بدلنے کے لیے تیار نہ ہوئے، یعنی اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی تکذیب کروائی، اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا اور اپنی سرمستیوں میں بڑھتے چلے گئے تو آخر یہی ان کے اعمال اور ان کے کرتوت ان کی تباہی اور ہلاکت کا سبب بنے۔ اور آج قریش بھی انہیں کی طرح بے محابا اس انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قانون بے لاگ ہے۔ اس لیے انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ جب وہ پکڑنے پہ آئے گا تو کوئی انہیں بچا نہیں سکے گا۔

Marfat.com

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ
يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا
بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾
وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي
الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾
وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾
يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ ع

رکوع: ۲۔ (اللہ ہی خلق کی ابتداء کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۱) (اور جس دن قیامت برپا ہوگی اس دن مجرم مایوس ہوجائیں گے۔ ۱۲) اور ان کے شریکوں میں سے کوئی ان کا سفارشی نہ ہوگا، اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کریں گے۔ ۱۳) اور جس دن قیامت برپا ہوگی اس دن (سب انسان) الگ الگ ہوجائیں گے۔ ۱۴) پس جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے وہ ایک شاندار باغ میں مسرور ہوں گے۔ ۱۵) اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ ۱۶) (پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے ہو اور جس وقت تم صبح کرتے ہو۔ ۱۷) اور اسی کے لیے حمد ہے آسمانوں اور زمین میں، اور (تسبیح کرو) عشاء کے وقت بھی، اور جس وقت تم ظہر کرتے ہو۔ ۱۸) وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے، اسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے۔ ۱۹)

Marfat.com

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

(اللہ ہی خلق کی ابتداء کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۱)

قانونِ مجازات کے دن کا ذکر دلائل کے ساتھ

اس سے پہلے مختلف دلائل اور تاریخی استشہاد سے قانونِ مجازات کو زندگی کے تقاضے کے طور پر پیش فرمایا۔ اب قانونِ مجازات کے اس دن کو واضح طور پر پیش کیا جا رہا ہے جس سے ہر ایک کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اور اس دن کے وقوع پذیر ہونے کو منطقی انداز میں اس طرح بیان فرمایا ہے جس سے انکار کرنا مشکل ہے۔ بظاہر انداز دعوے کا ہے، لیکن اس کے اندر دعویٰ کی دلیل بھی موجود ہے۔ ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا ہر فرد اس بات کو تسلیم کرتا ہے اور ویسے بھی یہ ایک قطعی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق ہے۔ اسی نے خلق کی ابتداء کی اور وہ خلق سب کے سامنے ہے۔ جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں یا اس کے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں وہ بھی اسی کی خلق میں شامل ہیں۔ اگر اس کا خالق ہونا اور خلق کی ابتداء کرنا ایک مُسلّمہ امر ہے تو پھر اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اس کے اعادہ پر بھی قادر ہے، کیونکہ جو کسی چیز کا آغاز کرتا ہے اس کے بارے میں یہ خیال کیا جائے کہ اب وہ اس کا اعادہ نہیں کر سکتا یعنی اسے دوبارہ نہیں بنا سکتا یہ سراسر ایک نامعقول بات ہے۔ کیونکہ ابتداء میں کسی چیز کو بنانا اعادہ سے ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے لیے خلق کی ابتداء میں کوئی مشکل نہیں تو اس کے اعادہ میں کیا مشکل ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس سے آسان ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو اس بات سے انکار ہو کہ اللہ تعالیٰ انسان کا اعادہ نہیں کر سکتا اسے اس بات سے بھی انکار کر دینا چاہیے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کرنے میں ابتداء فرمائی تھی۔

آیت کے دوسرے حصے میں منکرین کے مغالطے کو رفع فرمایا ہے۔ منکرینِ آخرت اول تو قیامت کے وقوع ہی کو نہایت مستبعد خیال کرتے تھے۔ اور اگر مفروضہ کے درجے میں مانتے بھی تھے تو ان کا گمان یہ تھا کہ ہمارا لوٹنا اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ ان معبودوں کی طرف ہوگا جنہیں ہم ہمیشہ پوجتے رہے ہیں اور ان کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں اتنا قرب حاصل ہے کہ ان کی شفاعت کے بعد ہم نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے محفوظ ہو جائیں گے بلکہ ہمیں اس کی عنایات کا استحقاق مل جائے گا۔ ان کا یہ غلط خیال یہ کہہ کر رد فرما دیا کہ قیامت کے دن یہ لوگ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے اور وہاں کسی کی سفارش نہیں چلے گی۔ سب کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہوگا اور وہ اپنے عدل کے مطابق ہر ایک کے ساتھ معاملہ کرے گا۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾

(اور جس دن قیامت برپا ہوگی اس دن مجرم مایوس ہو جائیں گے۔ ۱۲)

روزِ آخرت مجرموں کی حالت

يُبْلِسُ ...... ابلاس سے ہے جس کے معنی ہیں سخت مایوسی اور صدمے کی بنا پر کسی شخص کا گم سم ہو جانا۔ قیامت کے دن جب قیامت کے مخالفین کو اچانک اس سے واسطہ پڑے گا تو وہ انتہائی مایوس، حیران اور ششدر رہ جائیں گے۔ انہیں اس طرح اچانک قیامت کے برپا ہونے کا تصور تک نہ تھا۔ وہ زندگی بھر اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اور اگر کبھی اقرار کیا بھی تو نہایت بے نیازی اور بے دلی کے ساتھ۔ اب جبکہ

Marfat.com

اچانک انہیں ایک ایسی حقیقت دکھائی دے گی جسے وہ محض ایک واہمہ سمجھتے تھے تو ان کی حالت اس مجرم جیسی ہوگی جو حالتِ جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑا جائے اور جس سے بچ نکلنے کی کوئی امید نہ ہو۔ زبان بند ہو کر رہ جائے گی اور جسم حرکت کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔

بظاہر تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں شاید ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو دنیا میں انکارِ آخرت کا جرم کرتے رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو کسی حد تک قیامت کو ایک حقیقت سمجھتے تھے لیکن وہاں کی جواب دہی کو انہوں نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کی بجائے ہمیشہ اپنے نفس کی بندگی کرتے رہے۔ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ کر اسی کی تعمیر میں لگے رہے۔ یہیں کی کامیابیاں اور ناکامیاں ان کے دماغ پر چھائی رہیں۔ اب جبکہ اچانک انہیں قیامت سے واسطہ پڑے گا تو وہ حواس باختہ ہو جائیں گے۔ اور انہیں مایوسی میں کچھ سجھائی نہیں دے گا کہ وہ کیا کریں۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

(اور ان کے شریکوں میں سے کوئی ان کا سفارشی نہ ہوگا، اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کریں گے۔ ۱۳)

مشرکین کی مایوسی کا سبب

مشرکین کی مایوسی کا سبب ایک یہ بھی ہوگا کہ جن شرکاء کی شفاعت کے بھروسے پر انہوں نے کبھی توحید کا راستہ اختیار نہ کیا اور جس نے بھی انہیں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایمان اور عملِ صالح کے بغیر بخشش کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جنہیں تم اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھ بیٹھے ہو اور تمہارا گمان یہ ہے کہ وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچالیں گے، وہ تو خود قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے غضب سے لرزاں و ترساں ہوں گے۔ تو ان لوگوں نے بجائے ان کی بات سمجھنے کے انہیں اپنا دشمن سمجھا اور ان سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آج جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ان شرکاء میں سے کوئی بھی ان کی سفارش کرنے والا نہیں تو ان کی امیدیں مایوسی میں بدل جائیں گی۔ آخر وہ صاف صاف اس بات کا اقرار کریں گے کہ ہم نے جن قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا کہ یہ ہماری سفارش کریں گے، آج ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری یہ سوچ اور یہ عمل سراسر غلط تھا۔ اس لیے وہ انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک ماننے سے انکار کر دیں گے۔ لیکن اس روز ان کا یہ انکار کسی کام نہیں آئے گا۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾

(اور جس دن قیامت برپا ہوگی اس دن (سب انسان) الگ الگ ہو جائیں گے۔ ۱۴)

ایک اہم حقیقت کا انکشاف

اس آیتِ کریمہ میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یوں تو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے ہر فرد کو ایسی صلاحیتوں اور خصوصیات سے نوازا ہے کہ وہ بجائے خود ایک ایسی مکمل اکائی ہے کہ جو اپنے ذاتی نظریات و اعمال کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس کے اندر احساسات کی ایک دنیا آباد ہے، عقل کا فانوس روشن ہے، قوتِ ارادی موجود ہے جس نے اسے استقامت اور

Marfat.com

عزیمت کا راستہ دکھایا ہے۔ لیکن ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوصف دوسرے افراد کے ساتھ اس قدر متعلق اور وابستہ ہے کہ دوسروں کے بغیر نہ آسانی سے اس کی زندگی گزرتی ہے اور نہ وہ زندگی کے اہداف میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اسی بنیادی ضرورت کے تحت وہ معاشرے میں رہتا، سماج کا ایک جزو بن کر زندگی گزارتا اور کسی نہ کسی اجتماعی قوت سے رشتہ رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس ضرورت نے انسان میں جس طرح اجتماعی زندگی کا شعور پیدا کیا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی میں دراڑیں بھی پیدا کی ہیں۔ وہ اگر ایک قبیلے اور برادری کا آدمی ہے تو اسی کے انتساب کو عزیز رکھتا ہے۔ جو وہ زبان بولتا ہے اسی زبان کی بنیاد پر ایک گروہ کا حصہ بنتا ہے۔ وہ جس وطن میں رہتا ہے وہی وطن اسے باقی اوطان سے کاٹ دیتا ہے۔ اسی طرح معاشی اور سیاسی مفادات اسے ایک مخصوص گروہ کا حصہ بننے پر مجبور کردیتے ہیں۔ یہ گویا اس کی وابستگی کی بنیادیں ہیں، اس سے ہٹ کر وہ کسی اور وابستگی کو اہمیت نہیں دیتا۔ قوم، نسل، وطن، زبان، قبیلہ، برادری اور معاشی وسیاسی مفادات یہ اس کی جتھہ بندیوں کے عنوان ہیں۔ لیکن اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ زندگی کا اصل حسن بلکہ اس کی استواری، صحتِ عقیدہ اور اخلاق وکردار کی پاکیزگی سے آتی ہے۔ اگر اس بنیاد پر کوئی جماعت وجود میں آتی ہے تو وہ خیر و بھلائی کی قوت بن جاتی ہے جس سے نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس میں متذکرہ بالا وابستگیاں نقصان کی بجائے فائدے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ لیکن اس بنیاد سے کٹ کر جو چیز بھی وابستگی کی بنیاد بنے گی اور اس سے کوئی گروہ تیار ہوگا وہ ظاہر ہے ایک وحدت ضرور ہوگا، لیکن دوسری اپنی جیسی وحدتوں کے لیے ایک چیلنج بن جائے گا اور یہیں سے تفرقہ، انتشار اور نفرت کو راستہ بنانے کا موقع ملے گا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ زمین پر انسانوں نے ہمیشہ ایسی ہی وابستگیوں کو اپنی گروہ بندی کا ذریعہ بنایا ہے اور اس سے زمین فساد سے بھر گئی ہے جبکہ انسان ایک اکائی ہے۔ اس کے افراد جسدِ واحد کے اعضاء کی طرح ہیں۔ ان میں کوئی تقسیم بھی قابلِ قبول نہیں، بجز ایک تقسیم کے، اور وہ، وہ تقسیم ہے جو عقیدہ واخلاق سے وجود میں آتی ہے۔ ایمان لانے والے اور خدائی ہدایت پر نظامِ زندگی کی بنیاد رکھنے والے ایک امت ہیں، خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور کفر وفسق کی راہ اختیار کرنے والے ایک دوسری امت ہیں خواہ ان کا تعلق کسی نسل ووطن سے ہو۔ اسلام نے دنیا میں بھی اسی بنیاد پر ایک امت تشکیل دی۔ اور آخرت میں بھی اسی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے سے الگ الگ ہوجائیں گے۔ چنانچہ اہلِ ایمان الگ ہوجائیں گے اور کافر الگ ہوجائیں گے۔ اور اسی بنیاد پر آخرت میں معاملہ کیا جائے گا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ۝۱۵ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝۱۶

(پس جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے وہ ایک شاندار باغ میں مسرور ہوں گے۔ ۱۵) اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ ۱۶)

Marfat.com

آخرت میں انسانوں میں تقسیم

قیامت میں انسانوں کی تقسیم کو ان دونوں آیات میں کھول کر بیان فرمایا گیا ہے۔ کہ وہاں جب انسانوں کو الگ الگ ہونے کا حکم دیا جائے گا تو ان کی تقسیم کسی نسب، خون، رنگ یا جغرافیے کی بنیاد پر نہیں ہوگی بلکہ ایمان و کفر کے حوالے سے ہوگی۔ جنہوں نے دنیا میں ایمان و عمل کو بنیاد بنا کر زندگی گزاری ہوگی وہ ساری دنیا اور ساری امتوں سے چھانٹ کر الگ ایک گروہ کے طور پر کھڑے کر دیے جائیں گے۔ اور یہی لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی عنایات کا مورد بنیں گے۔ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ انہیں ایک نہایت بلند مرتبہ اور پر فضاء باغ میں رکھا جائے گا جس میں ان کے اندر باہر اور ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ناچ رہی ہوں گی۔

رَوْضَةٍ ...... کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے، یعنی جنت کے باغوں میں سے وہ ایک نہایت شاندار باغ ہوگا۔ اس کے واحد ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ ایک ہی باغ ہوگا۔ بلکہ اس سے مراد ایسے باغات ہیں جن میں سے ایک ایک باغ بھی اپنے اندر نہایت عظمت و شان رکھتا ہے۔ اس کی اپنی ذاتی سرسبزی اور حُسنِ منظر کے ساتھ ساتھ راحت و آرام اور عیش و تنعم کے جتنے اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے اندر موجود ہوں گے۔

دوسری آیت میں دوسرے گروہ کا ذکر فرمایا گیا ہے جن میں ہر طرح کا کافر چاہے اس کا تعلق کسی غلط مذہب سے ہو یا الحاد و زندقہ سے، شرک کی کسی قسم سے ہو یا نافرمانی و بغاوت سے۔ ان سب کو ایک گروہ میں شمار کیا جائے گا اور الگ کر دیا جائے گا۔

مُحْضَرُوْنَ ...... اس سے کافروں کے اس گروہ کی ذلت اور بے بسی کا اظہار مقصود ہے۔ یعنی وہ عذاب میں اس طرح باندھ کر اور گھسیٹ کر لائے جائیں گے جس طرح سزا یافتہ قیدی لائے جاتے ہیں جبکہ دنیا میں ان کا تمرد اور سرکشی ایک مسئلہ بنی رہی۔ لیکن آج ذلت کی تصویر بنے اور زنجیروں میں جکڑے جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔

فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِيۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِيۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ﴿۱۷﴾ وَلَـهُ الۡحَمۡدُ
فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَعَشِيًّا وَّحِيۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾

(پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے ہو اور جس وقت تم صبح کرتے ہو۔ ۱۷) اور اسی کے لیے حمد ہے آسمانوں اور زمین میں، اور (تسبیح کرو) عشاء کے وقت بھی، اور جس وقت تم ظہر کرتے ہو۔ ۱۸)

توحید اور قانونِ مجازات کا تقاضا

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک اور ہر لحاظ سے یکتا ہے اور اس کے قانونِ مجازات کے تحت ہر انسان کو اس کی عدالت میں پیش ہونا اور جزاء و سزا سے گزرنا ہے۔ تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ ہی کی تسبیح کرے۔ اور اس تسبیح کا کوئی ایک محدود وقت نہیں بلکہ صبح بھی اسی سے روشن ہونی چاہیے اور شام اور عشاء میں بھی اسی کا نور جگمگانا چاہیے۔ اور مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو مشرکانہ خیالات پھیلا رکھے ہیں اور بعض نقائص کا اللہ تعالیٰ کی طرف انتساب کرتے ہیں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہمہ وقت ان سے پاک اور منزہ ہونے کا اعلان واظہار کرنا چاہیے۔ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ اوقاتِ تسبیح کے درمیان ایک جملہ معترضہ ہے جو دراصل اس تردد کا ازالہ کر رہا ہے کہ صبح وشام اور ظہر اور عشاء میں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کا حکم دیا جا رہا ہے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں بلکہ انسانوں کے لیے ان کی دیگر مصروفیات کو دیکھتے ہوئے کم سے کم اوقات میں اس کا حکم دیا گیا ہے ورنہ آسمان وزمین کے ہر گوشے میں اللہ تعالیٰ ہی کی حمد کا ترانہ گونج رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات انسانوں کی تسبیح وتحمید کی محتاج نہیں بلکہ انسان خود اس کا محتاج ہے، کیونکہ اس کی تسبیح وتحمید تو کائنات کے ہر گوشے میں ہو رہی ہے اور کائنات کی ایک ایک چیز اس میں مصروف ہے۔ البتہ جو لوگ اس حمد وتسبیح سے گریز کر رہے ہیں انہیں اپنی بدنصیبی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

تسبیح کے لیے جن اوقات کا ذکر فرمایا گیا ہے اگر ان میں غور وفکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ اوقات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی بڑی نشانی کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ رات دن میں داخل ہوتی ہے یا دن رات میں داخل ہوتا ہے یا سورج سمتِ راس سے جھکتا ہے یا رات تاریک ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی چار اوقات انسان کے دل ودماغ اور اس کے معمولات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان اوقات میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور ساتھ ہی ساتھ غور وفکر بھی کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی یہ نشانیاں اس پر منکشف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ وہ ان نشانیوں کے واسطے سے معرفتِ حق سے آشنا ہو سکتا ہے۔

بعض اہلِ علم نے ان آیات میں تسبیح سے مراد نماز لی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات کو عیوب ونقائص سے منزہ کرنے کا اعلان ہے تو اس کے لیے صبح وشام اور ظہر وعصر کے اوقات کی پابندی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ عقیدہ تو مسلمان کو ہر وقت رکھنا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقات کی پابندی کے ساتھ تسبیح کرنے کا حکم سے مراد نماز ہی ہو سکتی ہے۔ البتہ اس آیتِ کریمہ میں اوقاتِ نماز میں سے فجر اور ظہر کا ذکر تو واضح طور پر موجود ہے اور اگر تُمْسُوْنَ میں عصر اور مغرب دونوں کو شامل کر لیا جائے اور عَشِیًّا سے عشاء کو مراد لے لیا جائے تو تمام اوقاتِ نماز اس آیت میں آ جاتے ہیں۔ البتہ قرآنِ کریم کی دیگر آیات میں اوقاتِ نماز کی طرف اشارے ہیں اور نبی کریم ﷺ نے ان اشاروں کو متعین اوقات میں متعین اعمال کی شکل دے کر پوری تفصیل سمیت نماز کو امت پر لازم کیا ہے۔ البتہ منکرینِ حدیث کی یہ جسارت حیران کن ہے کہ وہ ان تصریحات کے باوجود نظامِ صلوٰۃ کو نظامِ ربوبیت کا مفہوم پہناتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے۔

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾

(وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے، اسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے۔ ۱۹)

Marfat.com

منکرینِ قیامت کی غلط فہمی کا ازالہ

اخراج کے معنی جس طرح کسی چیز کو نکالنے کے آتے ہیں، اسی طرح پیدا کرنے کے بھی آتے ہیں۔منکرینِ قیامت ازسرنو زندگی کو بہت مستبعد خیال کرتے تھے۔ان کے استبعاد کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ تم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ زندہ انسانوں اور حیوانات میں سے فضلات کو خارج کیا جارہا ہے۔ظاہر ہے کہ جن میں زندگی کا نام تک نہیں۔اسی طرح بے جان مادے کے اندر زندگی کی روح پھونک کر بے شمار جیتے جاگتے حیوانات، نباتات اور انسان وجود میں لائے جارہے ہیں۔حالانکہ ان مادوں میں قطعاً کوئی زندگی نہیں ہوتی۔پھر اس کو مثال کے طور پر سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ تم زمین کو دیکھتے ہو وہ بالکل خشک اور مردہ ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ بارش کے ایک چھینٹے سے اس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار کر دیتا ہے۔یہ وہ حقیقت ہے جس میں تم خود شامل ہو۔کیا اس سے یہ بات سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ایک دن مرکھپ جانے کے بعد تم بھی زندہ نکال کھڑے کیے جاؤ گے۔کیونکہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔نہ اس کے لیے زندہ کو مردہ کرنا مشکل ہے اور نہ مردہ کو زندہ کرنا۔بارش کی صورت میں ہم اپنی نگاہوں سے موت سے زندگی برآمد ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت صاف دکھائی دیتی ہے۔ہر طرف مردنی چھائی ہوتی ہے لیکن اچانک آدمی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ:

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ
اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ
مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمِنْ
اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ
وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ

Marfat.com

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ
بِاَمْرِهٖ ۭ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ڰ مِّنَ الْاَرْضِ ڰ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿٢٥﴾
وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ
يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ
الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٧﴾

رکوع: ۳۔ (اوراس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر دیکھتے دیکھتے تم بشر بن کر روئے زمین پر پھیلتے چلے جارہے ہو۔ ۲۰) اوراس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اوراس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔ ۲۱) اوراس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اورزمین کی پیدائش اورتمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ بے شک اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں، اصحابِ علم کے لیے۔ ۲۲) اوراس کی نشانیوں میں سے رات اور دن میں تمہارا سونا اوراس کے فضل کو تمہارا تلاش کرنا ہے، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور سے سنتے ہیں۔ ۲۳) اوراس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو دکھاتا ہے بجلی، جس میں خوف بھی ہے اور امید بھی، اور اتارتا ہے آسمان سے پانی، پس زندہ کر دیتا ہے اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۲۴) اوراس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جب وہ تم کو زمین سے پکارے گا تو تم دفعتہً نکل پڑو گے۔ ۲۵) آسمانوں اورزمین میں جو بھی ہیں اس کے بندے ہیں، سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ ۲۶) اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے، اور آسمانوں اورزمین میں اسی کے لیے سب سے برتر صفت ہے، اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔ ۲۷)

Marfat.com

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝٢٠

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر دیکھتے دیکھتے تم بشر بن کر روئے زمین پر پھیلتے چلے جا رہے ہو۔ ۲۰)

انسان کا وجود، قدرتِ الٰہی کا مشاہدہ

عقیدہ سے متعلق بیشتر گمراہیوں کا سبب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت ومشیت اور حکمت ودانش کے بارے میں صحیح تصور قائم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ وہ جب زمین پر انسانی حکومتوں کے انتظام وانصرام کو دیکھتا ہے تو اسے یقین ہوجاتا ہے کہ ایک بڑا بادشاہ اپنی تمام تر قوت وہیبت کے باوجود تنہا کسی ملک کا نظام نہیں چلا سکتا، اس لیے اس نے نیچے سے اوپر تک انتظامی یونٹ بنا رکھے ہیں اور انہیں اختیارات میں شریک کر رکھا ہے۔ وہ ان کے واسطے سے پوری مملکت کا نظام چلاتا ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یقیناً خالق ومالک ہے لیکن وہ اس عظیم کائنات کا نظام تنہا نہیں بلکہ ان تمام قوتوں کے واسطے سے چلاتا ہے جنہیں اس نے اپنے اختیارات میں شریک کر رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام جو توحید پیش کر رہا ہے جس میں غیر اللہ کی شرکت کا شائبہ تک ممنوع ہے وہ سراسر ناقابلِ فہم ہے۔ شرک کائنات کے نظام کو چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی اختیار کردہ ایک ضرورت ہے۔ اس لیے ہم اسی ضرورت کے تحت ان قوتوں کو پکارتے اور پوجتے ہیں جنہیں خود پروردگار نے اختیارات دے رکھے ہیں۔ اسی طرح جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک چیز فنا ہوجانے کے بعد دوبارہ وجود میں نہیں آتی تو ان کے لیے اس بات کا قبول کرنا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے کہ اربوں کھربوں مخلوق جو گزشتہ طویل زمانے میں فنا ہوتی رہی ہے وہ ایک دن ازسرِ نو زندگی کا لباس پہن لے گی اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوکر اپنی زندگی کے ہر عمل کا حساب دے گی۔ یہ وہ تصور ہے جو اسے قیامت کو ماننے سے انکار پر مجبور کرتا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وحکمت کو ایک ایسی مثال سے واضح فرمایا ہے جو خود انسان سے متعلق ہے۔ گویا انسان کو اپنے حوالے سے غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے تاکہ اسے اندازہ ہوسکے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے بارے میں جس فکری کوتاہی کا شکار ہے اس کی خود اپنی ذات اس کے خلاف حجت ہے۔ ارشاد فرمایا گیا کہ غور کرو کہ تم اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہو، لیکن کبھی تم نے سوچا ہے کہ تمہارا مادۂ تخلیق کیا ہے؟ چند بے جان مادے ہیں جو زمین میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کچھ کاربن، کچھ کیلشیم، کچھ سوڈیم، اور ایسے ہی چند مزید عناصر۔ انہیں کو ترکیب دے کر تم جیسی حیرت انگیز ہستی کو پیدا کیا گیا ہے، اور اس کا نام انسان رکھا گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جن عناصر سے اسے ترکیب دیا گیا ہے ان میں سے کسی میں بھی نہ زندگی ہے نہ احساسات اور نہ ہی ایسی کوئی اور غیر معمولی قوت۔ لیکن انسان کے اندر احساسات بھی ہیں اور جذبات بھی۔ شعور بھی ہے اور فکری گہرائی بھی۔ تعقل بھی ہے اور تخیل بھی۔ اور پھر اسی پر بس نہیں، ہر انسان کے اندر ایک مادۂ تولید رکھ دیا گیا ہے جس کی بدولت کروڑوں اور اربوں انسان وہی ساخت اور وہی صلاحیتیں لیے ہوئے بے شمار موروثی اور بے حد وحساب انفرادی خصوصیات کے حامل نکلتے چلے آرہے ہیں۔ اور اب حال یہ ہے کہ زمین کی وسعتیں انسانی تخلیق وایجاد کے سامنے سمٹتی چلی جارہی ہیں۔ اس صورتحال پر تدبر کی نظر ڈالو کہ یہ سب کچھ ان عناصر کی اپنی خصوصیات میں سے ہے جن پر انسان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یا خود انسان اس قابل تھا کہ وہ اپنے اندر ایسی حیرت انگیز صلاحیتوں

Marfat.com

کو پیدا کر لیتا۔ غور وفکر کے بعد اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہی جاسکتی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ بے پناہ قدرتوں کی مالک اور بے انتہا حکمتوں کی حامل ذات ہے کہ جس کی ادنیٰ قدرت سے انسان کو وجود ملا۔ اور پھر اس کی قدرت ہی سے انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اور اسی کی حکمتِ عدل کے نتیجے میں آخرت برپا ہوگی اور انسان جزاء وسزا سے گزرے گا۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔ ۲۱)

انسان کے وجود سے خارج کی چند نشانیاں

اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کا کمال یہ ہے کہ اس نے صرف انسان کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ وہ چیزیں بھی پیدا فرمائیں جو اس کی مقصدِ تخلیق کی بجا آوری میں معاون ہوسکتی تھیں اور جن سے اس کی شخصیت کی تکمیل ہوتی تھی۔ اور پھر اس تخلیقی عمل میں ایسے احساسات کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رأفت ورحمت کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ ان میں سے سب سے پہلے جس احسان کا ذکر فرمایا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی صرف ایک صنف پیدا نہیں فرمائی بلکہ اسے دو صنفوں میں تقسیم فرمایا جسے ہم مرد اور عورت کے نام سے جانتے ہیں۔ اور کمالِ تخلیق یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کا جوڑا بنایا۔ اور مزید حیرانی کی بات یہ ہے کہ مرد وعورت دونوں کی بناوٹ کا بنیادی فارمولا ایک ہے۔ دونوں انسان ہونے میں یکساں ہیں مگر دونوں ایک دوسرے سے مختلف جسمانی ساخت، مختلف ذہنی اور نفسی اوصاف اور مختلف جذبات اور داعیات رکھتے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تمام اختلافات کے باوجود ان دونوں میں حیرت انگیز مناسبت رکھی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مرد کی شخصیت عورت کے بغیر اور عورت کی شخصیت مرد کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ دونوں کو اس طرح ایک دوسرے کا جوڑا بنایا گیا ہے کہ دونوں میں ایک دوسرے کے لیے طلب اور ایک دوسرے کو قبول کرنے کے لیے خلاء موجود ہے۔ اور اس خلاء کو بھرنے کے لیے دونوں کے اندر ایک کشش رکھی گئی ہے تاکہ دونوں کی شخصیتوں کی تکمیل میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اور اس حیرت پر حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت دیکھتے ہیں کہ ساری دنیا میں نوعِ انسانی پھیلی ہوئی ہے اور آغازِ آفرینش سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، لیکن کسی ملک یا کسی علاقے اور کسی دور میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کہیں صرف لڑکے ہی پیدا ہوئے ہوں اور کسی قوم میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی چلی گئی ہوں، بلکہ ایک تناسب کے ساتھ دونوں کی تخلیق ہر دور میں اور ہر خطۂ زمین پر جاری رہی ہے۔ اور اس معاملے میں انسان کو اثر انداز ہونے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اور اسی سلسلے میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پروردگار ان دونوں صنفوں کے افراد کو اس طرح پیدا فرما رہا ہے کہ لڑکے ہر جگہ مردانہ خصوصیات لیے ہوئے پیدا ہوتے ہیں اور لڑکیاں نسوانی خصوصیات لے کر آتی ہیں۔ اور دونوں الگ الگ خصوصیات کے باوجود ایک دوسرے کے لیے

Marfat.com

شدید طلب رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی میں اضافے اور بقاء کے لیے مؤثر ذریعہ بنایا ہے۔ کسی دور میں بھی یہ خطرہ پیدا نہیں ہوا کہ نسلِ انسانی کا سلسلہ رکتا دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح بعض جانوروں کے بارے میں ان کی نسل کے مٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، ایسا اندیشہ یہاں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اور کبھی اس کے لیے نہ تعلیم کو اپنا رول ادا کرنا پڑا اور نہ ذریعۂ ابلاغ کو۔ یہ چیز فطرتِ انسانی میں اس قدر گہری اتار دی گئی ہے کہ مرد و عورت انسانی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں لیکن انسانوں میں اضافے سے کبھی جی نہیں چراتے۔ کہیں کہیں کبھی کمی بیشی کا سوال تو پیدا ہوتا ہے لیکن یکسر انقطاع کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور حیران کر دینے والی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت میں جس طرح ایک دوسرے کے لیے ایک اضطراب رکھا اور کشش پیدا فرمائی ہے جس سے قافلۂ انسانی آج تک رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح اس کو انسانی تہذیب و تمدن کو وجود میں لانے کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ جس طرح دونوں اصناف میں ایک دوسرے سے اتصال کے لیے طلب موجود ہے، اسی طرح ہر وقت ایک دوسرے کے قریب رہنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اسی سے گھر بنانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اسی ضرورت کے تحت گھروں کے ساتھ دوسرے گھر بنتے ہیں اور افراد میں اضافے کے ساتھ خاندان اور قبیلہ وجود میں آتا ہے۔ اور اس کے عوامل کو بروئے کار لاتے ہوئے تمدن کو نشو و نما ملتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو اس آیتِ کریمہ میں مؤدت یعنی محبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آغاز میں یہ محبت جنسی محبت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس سے انسان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ پھر اس میں گہرائی پیدا ہوتی ہے تو یہ محبت ذمہ داری کی شکل اختیار کر کے بچوں کی پرورش کا باعث بنتی ہے۔ پھر اس کا مزید دائرہ پھیلتا ہے تو خاندان اور معاشرے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے عمر آگے بڑھتی ہے ویسے ویسے جنسی طلب میں کمی آتی جاتی ہے اور ایک وقت آتا ہے جب بچوں کی افزائش رک جاتی ہے۔ لیکن میاں بیوی میں اگرچہ اضطراب کی کیفیت نہیں رہتی لیکن جذب و کشش میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اب وہی محبت رحمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی وجہ سے میاں بیوی بڑھاپے میں ایک دوسرے کے خیر خواہ، ہمدرد و غمگسار اور شریکِ رنج و راحت بن جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے جیون ساتھی کے لیے جوانی سے بڑھ کر رحیم و شفیق ثابت ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے سکون پاتے اور سکون دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تنہائی میں شریک اور ایک دوسرے کا حوصلہ باندھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ہمدردی و غمگساری کا جذبہ جو بڑھاپے کو آسان کر دیتا ہے اسی کو یہاں رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کا بے جان مادے سے پیدا ہو کر حیران کن صلاحیتوں کا مالک بن جانا، پھر اس کی دوسری صنف کا وجود میں آنا اور دونوں میں جنسی محبت اور اضطراب کا پیدا ہونا، پھر اس اضطراب کا سکون کا باعث بننا اور اسی سے تہذیب و تمدن کا وجود میں آنا اور پھر بڑھاپے میں ایک دوسرے کے لیے رحمت بن جانا، کیا یہ سب کچھ کسی اندھی طاقت کا کیا دھرا ہے یا یہ سب کچھ آپ سے آپ وجود میں آ گیا ہے یا یہ ممکن ہے کہ ایسا کرنے والے خدا ایک سے زیادہ ہوں۔ جو شخص بھی غیر جانبداری سے ان حقائق پر غور کرے گا اسے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی رحمت کا ظہور ہے۔ جس سے اس نے اہلِ زمین کو نوازا ہے۔ غور کیجئے! اس سے بڑھ کر اور نشانی کیا ہو سکتی ہے۔

تھوڑے سے تدبر کے بعد ایک اور واضح نشانی دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے۔ اور ہر چیز اپنے مقصدِ وجود کی تکمیل اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر کرتی ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس دنیا کا بھی ایک جوڑا ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔ اور اسی آخرت سے اس دنیا کی غایت کی تکمیل ہوتی ہے۔

Marfat.com

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾

(اوراس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اورزمین کی پیدائش اورتمہاری زبانوں اورتمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔بے شک اس کےندر بہت سی نشانیاں ہیں، اصحابِ علم کے لیے۔ ۲۲)

اہلِ علم کوتخلیقِ ارض وسما، زبانوں اوررنگوں کی نشانیوں کی طرف ہدایت

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی آسمانوں اورزمین کی پیدائش ہے۔ان کا عدم سے وجود میں آنا اور بے شمارقوتوں کاان کے اندرانتہائی تناسب اورتوازن کے ساتھ کام کرنا، اور کہیں کسی خرابی کاظہور میں نہ آنا اورکسی کُرّے کادوسرے کُرّے کے ساتھ تصادم نہ ہونا، اور ایک حیرت انگیز نظم وترتیب کے ساتھ ہرایک کااپنے اپنے فرائض کوانجام دینااورکبھی کسی فیصلے میں تخلف نہ ہونا، ان میں سے ہر بات اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے جواللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق اوراس کی وحدانیت پردلالت کرتی ہے۔اوراگراس بات پرغورکیاجائے کہ وہ ابتدائی قوت (Energy) کہاں سے آئی جس نے مادے کی شکل اختیار کی، پھر مادے کے بہت سے عناصر کیسے بنے۔پھران عناصر کی اس قدر حکیمانہ ترکیب سے اتنی حیرت انگیز مناسبتوں کے ساتھ یہ حیرت انگیز نظامِ عالم کیسے بن گیااوراب یہ نظام کروڑہا صدیوں سے کس طرح ایک زبردست قانونِ فطرت کی بندش میں کسا ہوا چل رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے۔اسی طرح اگر ایک دوسرے پہلو سے دیکھیں کہ ایک طرف آسمانوں کی ایک وسیع اورناپیداکنار کائنات ہے۔اوردوسری طرف یہ کُرۂ زمین ہے۔بظاہر دونوں میں کتنی دوری ہے۔ لیکن اس دوری کے باوجوددونوں میں اتنا گہرا اتصال ہے کہ کوئی عقلمند آدمی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ دونوں الگ الگ خالقوں کی قدرت سے وجود میں آئے اورالگ الگ ارادوں کے تحت گردش کررہے ہیں، بلکہ ان کی باہمی سازگاری پکارپکار کرشہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی قدیروحکیم ذات دونوں پرحکمران ہےاوردونوں کوایک مشترک مقصد کے لیے مسخر کیے ہوئے ہے۔

اورآیتِ کریمہ میں دوسری نشانی جس کا ذکرفرمایا گیاہے، وہ زبانوں اوررنگوں کا اختلاف ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ سب انسانوں میں قوائے نطقیہ یکساں ہیں۔نہ منہ اورزبان کی ساخت میں کوئی فرق ہےاورنہ دماغوں کی ساخت میں۔مگرزمین کے مختلف خطوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔اور ہرشخص کا لہجہ اورتلفظ اورطرزِ گفتگودوسرے سے مختلف ہے۔اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کامادۂ تخلیق اوران کی بناوٹ کاانداز ایک ہے۔مگررنگ اس قدرمختلف ہیں کہ کسی قوم کارنگ اور ہےاورکسی کااور۔حتیٰ کہ ایک ماں باپ کے گھرپیداہونے والے بچے رنگوں میں ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف بلکہ متفاوت ہیں۔اور یہ تفاوت مخلوقات میں ہرطرف نمایاں دکھائی دیتا ہے۔یہاں صرف سمجھانے کے لیے صرف دوہی چیزوں کاذکرکیا گیا ہےورنہ مختلف مخلوقات میں بنیادی یکسانی کے باوجود بے شمار اختلافات موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا یہ کارخانہ چندخودکارمشینوں سے وجود میں آیا ہےاورنہ چل رہا ہے۔قدرت کی کوئی ایسی ٹکسال نہیں ہے جس میں ڈھل ڈھل کرایک ہی طرح کی چیزیں نکلتی چلی آرہی ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی وسیع قدرت ہے جہاں سے ڈیزائن، نقش ونگار، نئے نئے

Marfat.com

تناسب اور نئے نئے اوصاف کے ساتھ بن بن کر نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کی بنائی ہوئی ہر چیز اپنی ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ اور ہر تخلیقی شاہکار اپنے یہاں عجیب وغریب تضادات کے باوجود حیرت انگیز تناسب رکھتا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارِ تخلیق ایک خالق کی قدرت کا شاہکار ہے، ورنہ اس تنوع اور اختلاف میں جو یکسانی نظر آتی ہے اور اس تخالف میں جو تناسب نظر آتا ہے وہ کبھی دکھائی نہ دیتا۔ بلکہ ہر تضاد اور ہر تخالف اپنے الگ الگ اظہار کی صورت میں ہر چیز کی تباہی کا باعث بن جاتا، جس سے بجائے تخلیق کی وحدت کے تباہی کی مختلف صورتیں وجود میں آتیں اور یہ نظام تباہ ہو کر رہ جاتا۔ ان میں سے ہر مخلوق اور ہر منظر کے اندر اصحابِ علم و دانش کے لیے نشانیاں مضمر ہیں اور ہر کثرت کے اندر ایک وحدت پوشیدہ ہے جو غور وفکر کی دعوت دے رہی ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

(اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن میں تمہارا سونا اور اس کے فضل کو تمہارا تلاش کرنا ہے،
یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور سے سنتے ہیں۔ ۲۳)

آیت کے ترجمے کی وضاحت

اس آیت کی توجیہ کی ایک صورت یہ ہے وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ کا عطف مَنَامُكُمْ پر کیا جائے۔ ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات بنائی جس میں تم سوتے ہو۔ اور دن بنایا جس میں تم اس کے فضل یعنی رزق کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہو۔ رزق کے حصول کے لیے چونکہ دن کی روشنی کی ضرورت تھی اس لیے اس نے تمہیں دن کی روشنی مہیا کی۔ اور آرام کے لیے تاریکی کی ضرورت تھی، اس لیے رات کی تاریکی پیدا فرمائی، تاکہ دونوں ضرورتیں باحسن طریق پوری ہو سکیں۔ لیکن اس آیت میں دونوں یعنی رات اور دن کو ایک ساتھ بیان فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو خوب علم تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب انسان بعض خطوں میں یا بعض انسان دن کی بجائے راتوں کو رزق کے حصول میں لگے رہیں گے۔ اور آرام انہیں دن کے اوقات میں کرنا پڑے گا۔ یہ اگرچہ فطری طریقے سے کسی حد تک انحراف ہوگا لیکن حالات کا جبر انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دے گا۔ اس لیے یہاں دونوں کو ذکر فرمایا، کہ تم جو صورت بھی اختیار کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں ویسے ہی ڈھال دے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

نیند اور حصولِ رزق کی جدوجہد سے استدلال

ایک اور بات کی طرف بھی شاید اشارہ کرنا مقصود ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات جس طرح خالق ہے، اسی طرح وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی حکمت نے جس طرح اس کی صفتِ تخلیق کو حرکت دی اور باقی کائنات کے ساتھ انسان کو وجود ملا۔ اسی طرح اس کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ وہ اپنی دوسری مخلوق کے ساتھ ساتھ انسانوں پر رحمت وشفقت کا معاملہ فرمائے۔ چنانچہ اس نے ایک طرف اگر رات اور دن کو پیدا فرمایا تو ساتھ ہی اس نے

Marfat.com

انسانوں کو نیند کی دولت بھی عطا فرمائی، کیونکہ اس سے بڑھ کر کون واقف ہوسکتا ہے کہ انسان مسلسل محنت نہیں کر سکتا۔ اسے ہر چند گھنٹوں کی محنت کے بعد چند گھنٹے آرام کی بھی ضرورت ہے تاکہ اس کی قوتِ کارکردگی بحال ہوسکے اور اس کے اعصاب شکست وریخت سے محفوظ رہیں۔ اور پھر نیند کو اس طرح انسان پر مسلط فرمایا کہ انسان بعض دفعہ کثرتِ کار کے ہجوم میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن نینداس کے رستے میں حائل ہوجاتی ہے۔ وہ ہزار کوشش کرے بالآخر نیند کے آگے سپر انداز ہونا پڑتا ہے۔ اور اس طرح سے وہ صحت کی تباہی سے بچ جاتا ہے۔ ویسے بھی نیند اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص نیند سے محروم ہوجائے۔ آرام کے وقت نیند کا نہ آنا ایک ایسی اذیت ہے جسے وہی آدمی محسوس کرسکتا ہے جو اس اذیت سے گزرا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا ایک ایسے انسان کو نیند جیسی نعمت عطا کرنا جو حواس، عقل اور ہوش مندی جیسے اوصاف رکھتا ہے۔ بظاہر ایک کمزوری دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

اسی طرح رزق کا حصول انسان کی زندگی کی بقاء کے لیے از بس ضروری ہے۔ کیونکہ غذا کے بغیر کوئی شخص بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے احسانات کا کیا کہنا کہ اس نے اگر ایک طرف وسائلِ رزق کی فراوانی سے انسان کو مالا مال کیا ہے تو دوسری طرف غذا کے حصول کے لیے طبیعت میں ایک طلب بلکہ تڑپ بھی رکھی ہے جس کی وجہ سے انسان مسلسل محنت کرتا، دماغ سوزی کرتا ہے اور دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوں گے اور جو ہیں کبھی انہیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، جو حصولِ رزق کے لیے سرگرمی نہ دکھاتے ہوں۔ یہ سرگرمی دکھانے کا شوق اور اس میں تکلیف کی پرواہ نہ کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ایک نعمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل اور دماغ میں رکھ دیا ہے۔ مزید اس کا فضل یہ ہے کہ وہ رزق کی تلاش کے نئے نئے ذرائع انسان کو الہام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ ایسے ایسے غیر معمولی طریقوں سے رزق حاصل کرتے ہیں جن کا عام طور پر سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس شخص کے دل میں جسے وہ رزق دینا چاہتا ہے ایسے طریقوں کا القاء کرتا ہے۔ اور انسان اگر اس کے مطابق محنت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو بات کو سنیں۔ اس سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ یہ ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ان آیات میں تفکر کریں، اور صاحبِ علم ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ تفکر اور علم دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ علم تفکر کے بغیر آگے نہیں بڑھتا، اور علم کے بغیر تفکر نہیں ہوتا۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ نشانیاں ان لوگوں کے لیے ہیں جو غور سے سنیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حصولِ علم کا ایک ذریعہ سماع بھی ہے۔ کیونکہ جو شخص سننے کی زحمت نہیں کرتا اور علم و دانش رکھنے والے لوگوں کی باتوں پر توجہ نہیں دیتا، اس کے اندر نہ علم آتا ہے اور نہ تفکر پیدا ہوتا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو دکھاتا ہے بجلی، جس میں خوف بھی ہے اور امید بھی، اور اتارتا ہے آسمان سے پانی، پس زندہ کر دیتا ہے اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہوجانے کے بعد، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۲۴)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر امید و بیم سے استدلال

اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں جو اللہ تعالیٰ کی بعض صفات اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کو بجلی کی چمک دکھاتا ہے۔ بجلی کڑکتی ہے اور کبھی کوندے کی طرح چمکتی ہے، اسے دیکھ کر دل امید اور خوشی سے بھر جاتے ہیں، پانی کو ترسی ہوئی زمین بارش کی امید میں کھل اٹھتی ہے، کسان کے چہرے پر رونق آجاتی ہے، وہ مرجھائی ہوئی فصلوں کو تصور ہی میں سرسبز ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور اسے امید پیدا ہوجاتی ہے کہ اب بارش ہوگی جس سے غلے کی فصل لہلہائے گی اور وہ وقت دور نہیں جب میرا گھر غلے سے بھر جائے گا اور سوکھے ہوئے جوہڑ جس سے جانوروں کو پانی ملتا اور بعض دفعہ انسانوں کے بھی پینے کے کام آتا ہے وہ بھی پانی سے سیراب ہوں گے، صاف ستھرا اور نیا پانی ہماری ضرورتوں کی کفایت کرے گا۔ اس طرح سے ہر طرف امید کے چراغ روشن ہوجاتے ہیں۔ اور کبھی اسی بجلی سے خوف کی کیفیت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کی کڑک سے ڈر کر لوگ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور اس سے جس بارش کی امید پیدا ہوتی ہے اس کے بارے میں دل میں وسوسہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ اللہ خیر کرے، کہیں ایسی طوفانی بارش نہ ہو جو سب کچھ بہالے جائے، اور کہیں بارش کی بجائے ژالہ باری نہ شروع ہوجائے جس سے ہر طرح کی فصل تباہ ہو کر رہ جائے۔ کہیں بجلیاں نہ برسنے لگیں اور ہر چیز کو بھسم کرکے رکھ دیں۔ اور کبھی ہوش مند لوگوں میں یہ خوف بھی پیدا ہونے لگتا ہے کہ جس بجلی کو ہم ابرِ رحمت کی بشارت سمجھ رہے ہیں، اللہ نہ کرے وہ قوم پر عذاب کا پیغام نہ ہو۔ جس طرح عاد و ثمود نے بادل کو ابرِ رحمت سمجھا اور اس سے بارش کی امید میں خوشیاں مناتے ہوئے باہر نکل آئے۔ لیکن انہیں اندازہ نہ تھا کہ یہ بادل ان کے لیے تباہی کا سامان بن کے آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کس قدر بے پناہ ہے کہ وہ بادل بھیج کر انسانوں کے تاریک گھروں میں امید کے چراغ روشن کرسکتا ہے۔ اور اگر چاہے تو اسی بادل کے ذریعے انہیں نیست و نابود بھی کرسکتا ہے۔ نعمت اور نقمت دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان کا سرمایہ امید و بیم ہے جس سے اس کی زندگی کو صحیح رخ ملتا اور صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق ہوتی ہے اور اس کا تمام سررشتہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مشرکین کا یہ خیال کہ وہ کسی کو رحمت لانے والا اور کسی کو عذاب نازل کرنے والا سمجھتے ہیں، سراسر ایک حماقت ہے۔ بجلی کی چمک، اگر غور کیا جائے تو اس حماقت میں ہدایت کا چراغ روشن کرسکتی ہے۔

دوسری نشانی اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں اور دوسری مخلوقات کو پیدا کرنے کے بعد اس کائنات کے معاملات سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں جاکر نہیں بیٹھ گیا بلکہ وہ اس کائنات کے تمام امور کی براہِ راست نگرانی اور تدبیر کرتا ہے۔ وہ زمین پر بسنے والوں کو رزق دینے کے لیے وہ تمام اسباب مہیا کرتا ہے جن سے اہلِ زمین کو رزق مہیا ہوسکتا ہے۔ اس نے زمین میں روئیدگی کے بے شمار خزانے رکھے ہیں۔ اس کی سیرابی کے لیے بارش نازل فرماتا ہے، پھر زمین کے نیچے اس نے پانی کے ذخیرے جمع کر رکھے ہیں۔ ان ذخیروں سے چشموں اور کنوؤں کی شکل میں انسان کو پانی مہیا ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر سردیوں میں برف جمتی اور گرمیوں میں اسی کو پگھلا کر میدانی علاقوں میں دریاؤں اور ندیوں کی شکل میں پھیلا دیتا ہے اور پہاڑوں میں چشمے ابلتے اور آبشاریں گرتی ہیں۔ رزق رسانی کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے پروردگار کے حکم سے وہ برابر اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔ اسی سے اس کے باقی کارخانۂ قدرت کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پروردگار کا انسانوں کو پیدا کرنا، پھر ان کی زندگی کے تمام امکانات اور ضروریات کو نہایت تدبیر اور تدریج

Marfat.com

کے ساتھ بروئے کار لانا، اور تمام اسباب کے درمیان گہری ہم آہنگی رکھنا، کیا ایک اِلٰہ کی الوہیت کے علاوہ کسی اور بات پر بھی دلالت کرتا ہے۔ کیا اس تدبیر وانتظام میں کوئی ایسا رخنہ نظر آتا ہے جس میں کسی اور کی دخل اندازی کا امکان ہو سکے۔ لیکن یہ باتیں انہیں لوگوں کو سمجھ میں آسکتی ہیں جو صحیح طریقے سے عقل کو کام میں لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ ۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ ۗ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿٢٥﴾

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جب وہ تم کو زمین سے پکارے گا تو تم دفعۃً نکل پڑو گے۔ ۲۵)

ایک اور نشانی کا ذکر

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک مزید نشانی یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ تمہیں اس بات کا تو یقین ہے کہ زمین و آسمان اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائے لیکن تم یہ بات بھول جاتے ہو کہ اس نے جس طرح ان کو پیدا فرمایا ہے اسی طرح ان کا مسلسل قائم رہنا اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہے۔ اور اس عظیم الشان کارگاہِ ہستی کا پیہم چلتے رہنا بھی اسی کے حکم کی بدولت ہے۔ اگر ان کے قیام و قرار سے وہ ایک لحہ کے لیے بھی بے نیاز ہو جائے تو یہ تمام کارخانۂ ہستی ایک لحہ کے لیے بھی برقرار نہ رہ سکے۔ جس طرح اس کی مرضی کے بغیر کوئی مخلوق وجود میں نہیں آسکتی، اسی طرح اس کے حکم کے بغیر کوئی چیز باقی بھی نہیں رہ سکتی۔

قیامت کے انکار کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اہلِ عرب یہ سمجھتے تھے کہ پہاڑوں جیسی مضبوط چیز کو ان کی جگہ سے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ اور وہ چونکہ زمین پر ایستادہ ہیں اس لیے زمین کا تباہ ہونا بھی ممکن نہیں۔ ان کی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پہاڑ تو ایک معمولی مخلوق ہیں، آسمان اور زمین اور ان کے درمیان اور ان کے اندر پھیلی ہوئی تمام کائنات صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہے۔ اور یہ اس وقت تک قائم ہے جب تک اللہ تعالیٰ ان کو قائم رکھنا چاہے۔ اور جب اس کو منظور ہوا کہ اس نظام کو درہم برہم کر کے ایک دوسرا نظام قائم کر دیا جائے تو اسے اس کے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ وہ زمین کی طرف سے تمہیں بلانے کے لیے ایک ہی پکار پکارے گا، اور تم سب دفعۃً زمین سے نکل پڑو گے۔ اسے دوسری دفعہ حکم دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس کے ایک حکم سے زمین کے ہر گوشے سے انسان نکل کر میدانِ حشر میں پہنچ جائیں گے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿٢٦﴾

(آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اس کے بندے ہیں، سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ ۲۶)

Marfat.com

سابقہ آیت پر دلیل

اس سے پہلے کی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک پکار پر زمین کے ہر گوشے سے انسان نکل آئیں گے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ایک پکار پر سب انسانوں کا اپنی اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہونا اس لیے ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے سب اسی کی مخلوق، اسی کے مملوک اور اسی کے فرمانبردار ہیں۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کرسکے اور اس کی پکار سن کر تعمیل سے پہلوتہی کرے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۲۷﴾

(اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے، اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے سب سے برتر صفت ہے، اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔ ۲۷)

سابقہ دلیل کی مزید تسہیل

تبلیغ و دعوت کا اصول یہ ہے کہ بعض دفعہ بات کو بار بار کہا جاتا ہے۔ البتہ اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کہنے کا انداز ایسا پرشکوہ اور دلآویز ہو کہ سننے والا اس پر توجہ دیے بغیر نہ رہ سکے۔ اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ اگر پہلی دلیل کا اعادہ کیا جائے تو اس میں مزید اضافہ بھی ہونا چاہیے۔ اہلِ عرب کا قیامت کے بارے میں جو تصور تھا وہ ایک ایسے مرض کی شکل میں ڈھل چکا تھا کہ جس کی اصلاح بے حد مشکل دکھائی دیتی تھی۔ اسی لیے قرآنِ کریم کا معجزانہ اسلوب اور آنحضرت ﷺ کا نہایت حکیمانہ انداز ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ اسی سورۃ میں اس سے ایک رکوع پہلے یہی بات ارشاد فرمائی گئی کہ تم اس بات کو مانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی جملہ کائنات اور تمہارا خالق ہے، اور تم ایک مخلوق کے طور پر اس کے سامنے ہو۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ تمہیں یہ کہا جاتا ہے کہ تمام مخلوقات کی ہلاکت کے بعد اللہ تعالیٰ تمہیں از سرِ نو زندہ کرے گا اور قانونِ جزاء و سزا کے مطابق تمہیں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہوگی، تو تمہیں فوراً حیرانی آ پکڑتی ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے، حالانکہ ہر عقلمند آدمی یہ بات سمجھتا ہے کہ جو کام ایک دفعہ کیا جاسکتا ہے اس کا اعادہ بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن نہ جانے تمہیں اس میں کیا استعجاب معلوم ہوتا ہے۔ اب اسی دلیل کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ کسی بنائی ہوئی چیز کو دوبارہ بنانا پہلی دفعہ کی نسبت زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اور اس بات کو ایک عام عقل کا آدمی بھی سمجھتا ہے، تو پھر تم قیامت کے وقوع سے انکار کیوں کرتے ہو۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ، مَثَلٌ یہاں صفت کے مفہوم میں آیا ہے، لیکن اس کے ساتھ اَلْاَعْلٰی کی صفت لگا کر ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے۔ غلط فہمی یہ ہے کہ ہم جب قرآنِ کریم پڑھتے ہیں یا ویسے اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور پر انہیں الفاظ میں صفات ذکر کی جاتی ہیں جو ہماری اپنی زبان میں مستعمل ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کی صفات بھی ہماری صفات کی طرح ہیں۔ اس لیے ایک تو اس بات پر توجہ دلائی گئی ہے کہ ہماری زبان کے الفاظ میں اس کی صفات کا ذکر کرنا دراصل تقریبِ فہم کے

Marfat.com

لیے ہے۔ اور اسی مقصد کے لیے تمثیلی صورت بھی اختیار کی گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہماری صفات اور اس کی صفات ایک جیسی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ایسی اعلیٰ صفات ہیں جن کا انسان اپنے لیے تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تمام اعلیٰ صفتوں کا حقدار ہے۔ کوئی دوسرا ان صفات میں اس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ پھر ان صفات میں سے خاص طور پر دو صفتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، یعنی عزیز و حکیم۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر چیز پر غالب ہے، ہر ایک سے بالاتر اور سب سے عظیم ہے۔ اور دوسرا یہ کہ وہ غالب ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی ہے۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہے، اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں، اس کے ارادے میں اس کی حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی دخیل نہیں۔

ضَرَبَ

لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۚ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ
كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾
بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ
مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ
حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ
اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾
مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾
مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۚ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ
فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ
اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ
يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ

Marfat.com

أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَإِذَآ
أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۖ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ ۢبِمَا قَدَّمَتْ
أَيْدِيْهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿٣٦﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۗ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٣٧﴾ فَاٰتِ
ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۗ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۖ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَمَآ اٰتَيْتُمْ
مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ
اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿٣٩﴾
اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۗ هَلْ
مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۗ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى
عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٤٠﴾

رکوع: ۴۔ (وہ تمہیں خود تمہارے اندر سے ایک مثال دیتا ہے، کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں تمہارے حصہ دار ہیں اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا فرمایا ہے، یوں کہ تم (اور وہ) برابر کے حصہ دار بن گئے ہو، حتیٰ کہ تم ڈرنے لگو ان سے جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے ڈرتے ہو، اس طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۲۸) مگر یہ ظالم بے دلیل اپنی ہوائے نفس کے پیچھے چل رہے ہیں تو کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو، ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ ۲۹) پس

Marfat.com

اے پیغمبر! آپ یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف کرلیں اور قائم ہو جائیں اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ۳۰) اسی کی طرف متوجہ ہو کر اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور نہ ہو جاؤ مشرکین میں سے۔ ۳۱) ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور گروہوں میں بٹ گئے، ہر گروہ اسی پر مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔ ۳۲) جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو پکارتے ہیں، اسی کی طرف رجوع کر کے، پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انہیں چکھا دیتا ہے تو یکایک ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کا شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔ ۳۳) تاکہ ناشکری کریں اس کی جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے، اچھا مزے کرلو، عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا۔ ۳۴) کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل اتاری ہے جو ان چیزوں کی شہادت دے رہی ہو جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۳۵) جب ہم لوگوں کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر اترانے لگتے ہیں اور اگر ان کے اعمال کے سبب سے ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔ ۳۶) کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ ۳۷) پس قرابت دار اور مسکین و مسافر کو اس کا حق دو، یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتے ہیں، اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۳۸) اور جو روپیہ تم سود پر دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مالوں میں بڑھتا رہے، تو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ تم دیتے ہو اللہ کی رضا جوئی کے لیے، تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کے یہاں اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں۔ ۳۹) اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہیں رزق دیا، پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا، کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو، وہ پاک ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۴۰)

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

(وہ تمہیں خود تمہارے اندر سے ایک مثال دیتا ہے، کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں تمہارے حصہ دار ہیں اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا فرمایا ہے، یوں کہ تم (اور وہ) برابر کے حصہ دار بن گئے ہو، حتیٰ کہ تم ڈرنے لگو ان سے جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے ڈرتے ہو، اس طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۲۸)

Marfat.com

توحید پر نفسیاتی دلیل

گزشتہ آیات میں توحید اور آخرت کا ذکر ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایسی نشانیاں بیان کی گئی ہیں جن میں توحید کے دلائل بھی ہیں اور انہیں سے آخرت کے وقوع پر بھی استدلال کیا گیا ہے۔ اب پیشِ نظر آیات میں خالص توحید پر کلام شروع ہو رہا ہے۔ اس میں توحید کے مختلف گوشوں پر دلائل دیے جا رہے ہیں، ان دلائل میں سے بعض ایسے ہیں جن کا تعلق انسانی نفسیات سے ہے۔ چنانچہ سب سے پہلی دلیل ایک مثال کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے، جو عام فہم بھی ہے اور دلنشیں بھی۔ دلیل کو سوال کی شکل دیتے ہوئے پوچھا گیا ہے کہ تمہارے زیرِ تصرف کچھ ایسے انسان ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی طرح پیدا فرمایا ہے لیکن وہ حالات کی کسی افتاد سے تمہارے قبضے میں آ گئے ہیں اور اب وہ تمہارے غلام اور تمہارے مملوک ہیں۔ وہ تمہارے احکام کے مطابق شب و روز تمہاری خدمت بھی کرتے ہیں اور ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو تمہاری کمائی کا ذریعہ ہیں۔ یعنی تمہیں ہر طرح سے ان کے فوائد پہنچ رہے ہیں جبکہ ان کا وجود تمہاری تخلیق کا رہینِ منت نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلوق ہیں۔ کیا تم اپنے زیرِ تصرف چیزوں اور اس مال و دولت میں جو تمہیں اللہ تعالیٰ ہی نے عطا کر رکھی ہیں انہیں برابری کا حق دے چکے ہو۔ اور تم ہر طرح سے ان کا یہ حق تسلیم کرتے ہو کہ وہ جو تصرف چاہیں اس مال و دولت میں کریں جس میں تم نے انہیں اپنا شریک بنا لیا ہے۔ اور تم اگر اپنے طور سے کوئی فیصلہ کرنا چاہو تو محض اس خیال سے نہ کر سکو کہ وہ شاید تم سے جھگڑا کریں یا اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ اس کا جواب واضح ہے کہ تم اپنے غلاموں کو یہ آزادی دینا کبھی گوارا نہیں کرو گے، اور ان کا یہ حق تم کبھی تسلیم نہیں کرو گے حالانکہ نہ جانے کتنے کاموں میں تم ان کے محتاج ہو۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کائنات کی ہر چیز کا خالق بھی ہے اور مالک بھی، اور اسے تمام مخلوقات پر ہر طرح کے تصرف کا حق بھی ہے۔ اور مخلوق میں سے کسی کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ اس کے کسی کام پر معترض ہو سکے یا دخل دے سکے۔ لیکن اس کے باوجود تم اس کے ساتھ بے جان مورتیوں اور فنا ہو جانے والے انسانوں کو شریک بناتے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے کتنے اختیارات ہیں جو تم نے انہیں سونپ رکھے ہیں۔ تم خود ہی سوچو کہ یہ کیسی بے انصافی اور حماقت کی بات ہے کہ تم اپنی مال و دولت اور اپنے معاملات میں تو کسی کو شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے بے تکلف شریک بناتے ہو۔ حالانکہ تمام اعلیٰ صفات اور برتر حقوق کا اصلی حقدار زمین و آسمان میں صرف وہی ہے۔ یہ شرک کی ایسی نفسیاتی دلیل ہے کہ جو شخص ذرا بھی انسانی معاملات میں جھانک کر دیکھے گا وہ کبھی اس کی کاٹ کا انکار نہیں کر سکتا۔

علامہ قرطبی نے اس آیت کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کفارِ عرب جب حج کے لیے احرام باندھتے تھے تو ان الفاظ سے تلبیہ کہتے۔ لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک الا شریکاً ھو لک تملکه وما ملک ”اے اللہ! ہم حاضر ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں، ہم حاضر ہیں۔ سوائے اس کے جس کو تو نے خود اپنا شریک بنایا ہے، تو اس کا بھی مالک ہے اور اس چیز کا بھی تو مالک ہے جس کا وہ مالک ہے۔“ یہی وہ شرک ہے جس کی تردید اس آیتِ کریمہ میں کی گئی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہم اپنی آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اس سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس دلیل سے پروردگار کے پیشِ نظر اپنی وحدانیت کو جس طرح کھول کر بیان کرنا تھا اس کی تکمیل ہو گئی۔ اور دوسری

Marfat.com

بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس دلیل کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ علوم وفنون کو جاننے کی ضرورت نہیں، ایسی سادہ عقل جو تحفظات سے آلودہ نہ ہو وہ بھی اسے سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ ہماری یہ دلیل ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل سے کام لینا چاہیں۔ لیکن جن لوگوں کو عقل سے زیادہ کچھ اور چیزیں عزیز ہیں وہ ایسی واضح دلیلوں کے بعد بھی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ
مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۹

(مگر یہ ظالم بے دلیل اپنی ہوائے نفس کے پیچھے چل رہے ہیں تو کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے
جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو، ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ ۲۹)

ہوائے نفس کی پیروی کرنے والوں کا انجام

بعض دفعہ انسان کسی صحیح بات کو بھی قبول کرنے میں اس لیے تأمل کرتا ہے کہ وہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسی صورت میں بات کہنے والے کا فرض یہ ہے کہ وہ آسان سے آسان دلیل کے ذریعے اپنے مخاطب کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ مخاطب اگر واقعی حُسنِ نیت سے تہی دامن نہیں تو وہ دلیل کی قوت سے بات کو سمجھ جاتا ہے۔ کیونکہ دلیل کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ وہ مشکل بات کو آسان کر کے سننے والے کے ذہن میں اتار دے۔ لیکن اگر حادثہ یہ ہو جائے کہ مخاطب عقل رکھتے ہوئے بھی عقل کی قوت کھو بیٹھے یعنی وہ ایسے تحفظات کا شکار ہو جائے جن کی موجودگی میں وہ صحیح سے صحیح بات کو قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکے یا اس کے نفس کی خواہشات اس قدر اس کی عقل پر غالب آ جائیں کہ عقل اپنا کام کرنے سے معذور ہو جائے تو ایسے شخص پر دلیل بھی کارآمد نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عقل یقیناً اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ زندگی کے مسائل میں وہ صحیح ترین رہنما ہے۔ لیکن جب اسے اس کے دائرۂ کار سے باہر استعمال کیا جائے یا اس پر ایسے حقائق کو سمجھنے کا بوجھ ڈالا جائے جو اس کی رسائی سے باہر ہیں۔ مثلاً اس کی حدود، محسوسات اور معقولات تک ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اسے مابعد الطبعیات، الٰہیات، عالمِ غیب، عالمِ ملکوت، عالمِ برزخ، عالمِ آخرت اور ایسی ہی دوسری چیزوں میں جو عقل کی حدود سے ماورا ہیں، استعمال کرے اور پھر عقل صحیح نتائج دینے سے معذور رہے تو اس میں غلطی عقل کی نہیں، اسے غلط جگہ استعمال کرنے والے کی ہے۔ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے

اور دوسری شرط یہ ہے کہ عقل، عقلِ سلیم ہو۔ اس پر نہ تحفظات کا غلبہ ہو اور نہ ہوائے نفس کا۔ کیونکہ ان دونوں کی موجودگی میں عقل اپنی قوتِ کارکردگی سے محروم ہو جاتی ہے۔ خواہشات جنسی ہوں یا مفاداتی، ہوس درہم و دینار کی ہو یا عہدہ و منصب کی۔ یہ اپنے اندر اس قدر کشش

Marfat.com

اور اپیل رکھتی ہے کہ عقل عموماً اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور یہ ایسی کمزوری ہے جس میں جاہل بھی مبتلا ہے اور عالم بھی، نوجوان بھی اس کا اسیر ہے اور بزرگ بھی۔ حتیٰ کہ جن لوگوں کو ہماری تاریخ بڑے لوگوں کی صف میں شمار کرتی ہے ان میں بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جن میں سے ایک مشہور نام ڈاکٹر فرائیڈ مین کا ہے جس کی مشہور کتاب ''دی لیگل تھیوری'' ہے۔ اس میں اس نے نہایت زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ دنیا میں اخلاق نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ صحیح ہے یا غلط ہے، یہ ہونا چاہیے یا نہیں ہونا چاہیے، یہ سراسر جذباتی باتیں ہیں۔ انسان کو ہر وہ کام کرنا چاہیے جو اس کی خواہشِ نفس چاہتی ہو۔ عقل کا کام یہ نہیں کہ وہ نفس کی خواہش پر پہرے بٹھائے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ نفس جو چاہے اس کے لیے آسانیاں پیدا کرے اور اس کے صحیح ہونے پر دلائل مہیا کرے۔ گویا عقل ہوائے نفس کی ایجنٹ اور وکیل ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جو صدیوں پہلے فرقۂ باطنیہ کے رہنما کہہ چکے ہیں۔ اور ''الفرق بین الفرق'' کے مصنف نے فرقۂ باطنیہ کے مشہور لیڈر عبیداللہ القیروانی کا ایک خط بھی نقل کیا ہے جس سے ان خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ اور آج یورپ کا بیشتر حصہ اور امریکہ اور کینیڈا جیسے ممالک کے دانشور خواہشِ نفس کی نمائندگی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ زنا کا جواز تو اب پرانی بات ہوگئی۔ چند سال پہلے ہم جنس پرستی جیسی لعنت کو باقاعدہ قانون کی شکل دے کر سندِ جواز دے دی گئی ہے۔ اور ان چند سالوں میں عقل نے ایسی بے حیائی جس پر قومِ لوط پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا کے حق میں ایک پورا فلسفہ تیار کر دیا جسے Gay Style of Life کے نام سے ہر بڑی لائبریری میں ایک مستقل پورشن کی حیثیت سے رکھا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کو اخلاق سے متعلق کوئی بات سمجھانا اور ان میں بے حیائی کی شناعت پیدا کرنا اگرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جب کوئی قوم اپنی عقل کو ہوائے نفس کے تابع کر دیتی ہے اور ان کی زندگی کے ہر فیصلے پر اس کی پرچھائیں پڑجاتی ہیں تو ایسی قوم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ عقل کی کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوجائے۔ کیونکہ اس سطح پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آتا ہے۔ اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے قانون کی زد میں آ کر صحیح عقل کی قوت سے محروم ہوجاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے گمراہ کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ کوئی حق پسند آدمی جب اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی توفیق طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طلبِ صادق کے مطابق اس کے لیے زیادہ سے زیادہ اسبابِ ہدایت پیدا فرما دیتا ہے۔ اور کوئی ایسا شخص جو گمراہی ہی کو ہدایت قرار دے چکا ہے اور خواہشِ نفس کا اسیر ہو کر عقل کو مسموم کرچکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے گمراہی ہی کے راستوں پر چلنا آسان کر دیتا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہ مشرک لوگ شفاعت کے غلط عقیدہ کو اپنے لیے ایک بہت بڑا سہارا سمجھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے تو کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کی شفاعت نہیں کرتے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڷ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

(پس اے پیغمبر! آپ یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف کرلیں اور قائم ہوجائیں اس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ۳۰)

Marfat.com

دینِ فطرت کی پیروی کا حکم

فعل سے پہلے فــا تاکید کے لیے ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرتِ کاملہ دلائل وشواہد سے ثابت ہوگئی، وقوعِ قیامت کے بارے میں شکوک وشبہات کا ازالہ ہوگیا۔ اور اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا کہ انسان کا خالق و مالک اور خالق ذی اختیار اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ تو اب اس کے بعد عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ہر طرف سے منہ پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف رخ جما لیا جائے۔

اَقِمْ، اَقَامَ الْعُوْد سے ماخوذ ہے۔ یعنی لکڑی کو ایسا درست اور سیدھا کرنا کہ اس میں کجی کا نام ونشان تک نہ رہے۔ آیت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنا رخ دینِ اسلام کی طرف اس طرح پھیر دو کہ صراطِ مستقیم پر چلنے اور اسلام کو منزل ٹھہرانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ ہر قدم منزل کی طرف اٹھے اور نقوشِ قدم صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہ پائیں۔ اسی تاکید میں مزید اضافے کے لیے حَنِیْفًا کی شرط عائد کی گئی۔ یہ اَقِمْ کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ اس کی اصل اَلْحَنَفُ ہے۔ اس کا معنی ہے **المیل من الضلال الی الاستقامة**۔ یعنی گمراہی سے رخ پھیر کر ہدایت اور راستی کی طرف متوجہ ہونا، اور ہر طرف سے کٹ کر یکسو ہو جانا۔

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا۔ **فطرة** کا وزن اور معنی **خلقة** ہے۔ یعنی آفرینش اور اختراع۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ روح المعانی میں علامہ آلوسی نے اس آیت کا معنی بیان کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''یہ دین عقلِ سلیم سے کلیۃً ہم آہنگ اور فہمِ صحیح کے عین مطابق ہے۔ اسی لیے فطری طور پر انسان نہ اس سے منہ موڑ سکتا ہے، نہ اس کا انکار کر سکتا ہے۔'' مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسان اس فطرت پر پیدا فرمائے ہیں کہ ان کا کوئی خالق اور کوئی رب اور کوئی معبود اور مطاعِ حقیقی ایک اللہ کے سوا نہیں ہے۔ اسی فطرت پر انسانوں کو قائم رہنا ہے۔ اگر وہ خود مختاری کا رویہ اختیار کریں گے تو فطرت کے خلاف چلیں گے۔ اور اگر بندگیِ غیر کا طوق اپنے گلے میں ڈالیں گے، تب بھی اپنی فطرت کے خلاف کام کریں گے۔ اسی مضمون میں متعدد احادیث میں نبی کریم ﷺ نے واضح فرمایا ہے جن میں سے صرف ایک حدیث پیشِ خدمت ہے۔ صحیحین کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: **مامن مولود یولد الاعلی الفطرة فابواه یهودانه اوینصرانه اویمجسانه کماتنتج البهیمة بهیمة جمعاء، هل تحسون فیها من جدعاء** ''ہر بچہ جو کسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اصل انسانی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، یہ ماں باپ ہیں جو اسے بعد میں عیسائی یا یہودی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہر جانور کے پیٹ سے پورا کا پورا صحیح سالم جانور برآمد ہوتا ہے، کوئی بچہ بھی کٹے ہوئے کان لے کر نہیں آتا۔ بعد میں مشرکین اپنے اوہامِ جاہلیت کی بنا پر اس کے کان کاٹتے ہیں۔''

ایک خطبہ جمعہ میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میرا رب فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تمام بندوں کو حنیف پیدا کیا تھا، پھر شیاطین نے آکر انہیں ان کے دین سے گمراہ کیا، اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا اسے حرام کیا، اور انہیں حکم دیا کہ میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک ٹھہرائیں جن کے شریک ہونے پر میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔

Marfat.com

فطرۃ اللہ کا منصوب ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے پہلے فعل محذوف ہے اور یہ اس کا مفعول ہے۔ فعل محذوف وہ ہوگا جو سابق فعل سے مستفاد ہو۔ اس لحاظ سے اَقِیْمُوْا یا اِتَّبِعُوْا یا اِلْزِمُوْا یا اس کا ہم معنی کوئی اور فعل یہاں محذوف مانا جاسکتا ہے۔ فعل کو حذف کرنا اور مفعول کو ذکر کرنا اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کی ساری توجہ مفعول پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی زور دے کر یہ بات فرمائی جارہی ہے کہ تمہیں ہر طرف سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی فطرت پر قائم ہو جانا چاہیے اور اس کے اتباع کو اپنا طرزِ عمل بنا لینا چاہیے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں اسے زندگی کا لازمہ ٹھہرا دینا چاہیے۔ کیونکہ یہی دینِ قیم ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے۔ پھر اس پر مزید زور دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا ہے اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا رب، اس کا معبود اور اس کا مطاعِ حقیقی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ نہ اس کی بندگی میں کوئی شریک ہے، نہ اس کی عبادت میں اور نہ اس کی غیر مشروط اطاعت میں۔ یہی اللہ تعالیٰ کا سیدھا دین ہے۔ یعنی زندگی کا یہی صحیح طریقہ ہے کہ جس میں عبادت، بندگی اور اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور اس کی حاکمیت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ کبریائی اسی کو زیب دیتی ہے۔ انسانوں کو ابدی قانون دینا اسی کا حق ہے کیونکہ تحلیل و تحریم کا حق اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔ جو شخص یا جو قوم اس میں تبدیلی کی کوشش کرتی ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدلتی ہے۔ انسان اپنی ذات میں بندہ ہے وہ خدا نہیں بن سکتا۔ اور نہ کسی اور کو خدا بنانے سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ انسان اپنی جہالت اور نادانی سے کبھی اللہ تعالیٰ کی بندگی سے نکل کر اپنے بندہ ہونے کا انکار کرتا ہے۔ اور کبھی قانون سازی کو اپنا حق سمجھ کر یا اللہ تعالیٰ کے قانون کو رد کر کے خدائی اختیارات کو استعمال کرتا ہے تو تب بھی وہ بندگی کی حدود سے نکل جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسے جس فطرت پر پیدا کیا تھا اسے پامال کر دیتا ہے۔ یہ وہ جہالت اور بے علمی ہے جس نے ہمیشہ انسانوں کی دنیا و آخرت تباہ کی۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

(اسی کی طرف متوجہ ہو کر اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور نہ ہو جاؤ مشرکین میں سے۔ ۳۱) ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور گروہوں میں بٹ گئے، ہر گروہ اسی پر مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔ ۳۲)

دینِ فطرت کے تقاضے

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ...... یہ فَاَقِمْ وَجْهَكَ کی ضمیر خطاب سے حال پڑا ہوا ہے۔ فراء نے تقدیرِ کلام یوں ذکر کی ہے فَاَقِمْ وَجْهَكَ وَمَنْ مَّعَكَ مُنِيْبِيْنَ یعنی آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ توبہ اور اخلاص سے دینِ فطرت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ آیت کے آغاز میں آنحضرت ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے جو فرمایا گیا تھا وہ صرف آپؐ کی ذات کے لیے نہ تھا بلکہ وہ خطاب آپؐ کو امت کے وکیل کی حیثیت سے تھا۔ اور اب مُنِيْبِيْنَ سے اس خطاب کی وسعت کو واضح کر دیا گیا ہے۔ یعنی وہ حکم صرف آنحضرت ﷺ کے لیے نہیں تھا بلکہ درحقیقت امت کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ یعنی جس نے بھی آزادی و خود مختاری کا رویہ اختیار کر کے اپنے مالکِ

Marfat.com

حقیقی سے انحراف کیا ہے یا جس نے بھی بندگی غیر کا طریقہ اختیار کر کے اپنے اصلی اور حقیقی رب سے بے وفائی کی ہے اسے اپنی روش سے باز آ جانا چاہیے۔ کیونکہ اسے فطرتِ اسلام پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور فطرتِ اسلام صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی، عبادت اور اطاعت کا نام ہے۔ گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لیے حنیفیت کی قید لگائی تھی۔ اور اب اس میں انابت اور تقویٰ کا اضافہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی دماغ اور عقل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے میں یکسوئی پیدا کرے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا دل بھی پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ چکا ہو۔ اس کے دل کے احساسات اللہ تعالیٰ کی شریعت کے تابع ہو چکے ہوں۔ اس کے اندر خشیتِ الٰہی اپنی جگہ بنا چکی ہو۔ اسی طرح وہ حدودِ الٰہی کی پاسداری کو اپنی زندگی کا طریقہ بنا چکا ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام اوصاف سراسر قلب کے افعال ہیں۔ اور انسان کی کمزوری یہ ہے کہ قلبی کیفیتیں جب تک کسی جسمانی عمل کی شکل اختیار نہیں کرتیں اس وقت تک ان میں استحکام پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ اس بات کا اطمینان ہوتا ہے کہ یہ کیفیتیں برقرار رہیں گی۔ اس لیے پروردگار نے ان کیفیتوں میں استحکام اور استواری پیدا کرنے کے لیے اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا۔ کیونکہ نماز ایک ایسا عمل ہے جس میں آدمی اگر ایک طرف حنیفیت کا پیکر بن جاتا ہے تو دوسری طرف انابت الی اللہ اور تقویٰ کی دولت سے بھی بہرور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نماز کی نیت باندھتے ہی آدمی ہاتھ اٹھا کر ہر تعلق سے دستبردار ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اور پھر ہاتھ باندھ کر غلاموں کی طرح جب اللہ تعالیٰ کی تسبیحات میں مصروف ہو جاتا ہے تو صرف اسی کی غلامی کا اقرار کرتا اور اسی کی بڑائی کے گن گاتا ہے۔ پھر اللہ ہی سے ہدایت کی دعا مانگتا اور ہر حالت میں اسی سے استعانت کرتا ہے۔ پھر اللہ کی کتاب کی تلاوت سے اس کے قانون کی بالا دستی کا اعلان کرتا ہے۔ پھر بندگی اور فروتنی کے جتنے امکانات ہیں رکوع، سجود اور قعود کے ذریعے بجالاتا اور اللہ تعالیٰ سے گہری وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ اور ہر روز پانچ وقت پابندی کے ساتھ بغیر کسی جبر کے اس تعلق کو بار بار دہراتا ہے۔ اس طرح سے پوری اسلامی زندگی اس کے دل و دماغ میں اتر جاتی ہے۔ اور پھر پانچ وقت کی یہ مشق وہ تنہائی میں انجام نہیں دیتا بلکہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ مل کر جماعت کی صورت میں اسے ادا کرتا ہے۔ اس سے اگر ایک طرف اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ کی بندگی کو فروغ ملتا، اس سے وابستگی گہری ہوتی اور ماحول پاکیزگی اختیار کر لیتا ہے تو ساتھ ہی مخالف قوتیں بھی یہ دیکھ کر مرعوب ہو جاتی ہیں کہ ان لوگوں میں الف سے لے کر "ی" تک ہر فرد ایک ہی سوچ کا مالک، ایک ہی ذات کا چاکر، ایک ہی نظریئے کا پرستار، ایک ہی چوکھٹ پر سر جھکانے والا، ایک ہی آستانے پر دستِ سوال دراز کرنے والا اور ایک ہی کی رضا کا طالب اور سائل ہے۔ اس سے دیکھنے والوں پر جو اثر پڑتا ہے اس پر مسلمانوں کے قرونِ اولیٰ کی تاریخ شاہد ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ مشرک نہ بن جاؤ۔ یعنی ان سے دور رہو۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں وہی تعلیم دی تھی جو آج تمہیں دی جا رہی ہے۔ لیکن انہوں نے شرک کا رویہ اختیار کر کے اس دین کو جو انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام دے کر گئے تھے پارہ پارہ کر ڈالا۔ انہوں نے انہیں ایک خدا کی تعلیم دی تھی، انہوں نے سینکڑوں خدا بنا کر اللہ تعالیٰ کے اس گھر میں جسے توحید کا مرکز بنایا گیا تھا لا رکھے۔ اور ہر قبیلے کا الگ الگ معبود اس گھر میں جمع کر کے توحید کے اس مرکز کو شرک کا تیرتھ بنا دیا۔ اب یہ لوگ توحید کو بھول کر شرک ہی کو اپنا دین بنا چکے ہیں۔ اور چونکہ ہر قبیلے کا معبود جدا ہے اس لیے ہر قبیلہ اپنے معبود کی پرستش کرتا اور اپنے رسم و رواج کی پابندیوں کو دین سمجھتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔ اور اپنے مزعومات کے خلاف کوئی بات سننے کا روادار نہیں۔ اہلِ کتاب بھی اسی طرح فرقوں میں بٹ کر تباہ ہوئے۔ اور ہر فرقہ اپنی ہی ہدایت پر اصرار کرتا رہا۔ مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رسی کو چھوڑ کر مختلف وابستگیاں اختیار کی جاتی ہیں تو اس کا نتیجہ ہمیشہ تفرقوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ دیکھنا تم کبھی یہ روش اختیار نہ کرنا۔

Marfat.com

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ٝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

(جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو پکارتے ہیں، اسی کی طرف رجوع کر کے، پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انہیں چکھا دیتا ہے تو یکا یک ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کا شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔ ۳۳) تا کہ ناشکری کریں اس کی جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے، اچھا مزے کر لو، عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا۔ ۳۴)

توحید کے اثبات اور شرک کا رد، انسانی رویے سے

توحید کے اثبات اور شرک کے رد میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے طرزِ عمل سے استدلال فرمایا ہے۔ اور روئے سخن قریش اور ان کے ساتھ دیگر مشرکین کی طرف بھی ہے۔ قریش کا طرزِ عمل یہ تھا اور یہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں مشرکین کا ہمیشہ یہی معمول رہا ہے کہ جب وہ کہیں پانی میں سفر کرتے اور کشتی کہیں گرداب میں پھنس جاتی تو شروع شروع میں وہ اپنے بتوں کا نام لے لے کر مدد طلب کرتے۔ لیکن پھر ان کے اندر سے ہی یہ آواز اٹھتی کہ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو، تمہیں خوب معلوم ہے کہ جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے وہ تمہارے کسی کام نہیں آ سکتے تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگتے، نہایت توجہ اور عاجزی کے ساتھ رو رو کر اپنی غلطیوں کا اقرار کرتے، اپنے مشرکانہ رویے پر ندامت کا اظہار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی کشتی کو گرداب سے نکال دیتا۔ اور یا کسی اور مصیبت میں گرفتار ہوتے تو اللہ تعالیٰ کو نہایت خشوع سے پکارنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ دستگیری فرماتا۔ لیکن جیسے ہی انہیں مصیبت سے نکلنے کا موقع ملتا اور وہ یہ سمجھتے کہ اب ہم عافیت کی جگہ پہنچ گئے ہیں تو پھر وہ اپنے شریکوں کو پکارنے لگتے۔ اور ان میں سے ایک گروہ باقاعدہ ان کے شریک ہونے کا اعلان کرتا۔ اور اپنے مشرکانہ مزعومات پر فخر کا اظہار بھی کرتا۔ جو شخص بھی اس صورتحال پر غور کرے گا وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اگر شرک واقعی ایک حقیقت ہے اور ان کے دلوں کی آواز ہے تو پھر مصیبت میں گرفتار ہونے کے بعد یہ ان قوتوں کو کیوں نہیں پکارتے اور ان بتوں کا نام کیوں نہیں لیتے جنہیں یہ اللہ تعالیٰ کا شریک بنا چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل گواہی دیتے ہیں کہ الٰہ اور معبود اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں۔ اور مصیبتوں میں کام آنے والا صرف وہی ہے باقی سب وہم ہے۔ حضرت عکرمہؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک کشتی میں یمن کو جا رہے تھے کہ وہ کشتی بھنور میں پھنس گئی۔ لوگوں نے پہلے اپنے بتوں کو مدد کے لیے پکارا، پھر مایوس ہو کر سب نے کہا کہ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی لمحے حضرت عکرمہؓ کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر واقعی یہی حقیقت ہے تو پھر ہم نے نبی کریم ﷺ سے لڑائی کیوں باندھ رکھی ہے۔ وہ یہی بات کئی سالوں سے ہمیں سمجھا رہے ہیں اور ہم ان کی بات سننے کے بھی روادار نہیں۔ چنانچہ وہیں سے واپس پلٹے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر اسلام قبول کر لیا۔

دوسری آیت میں لام امر کا ہے جو تہدید اور دھمکی کا معنی دیتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس لام کو لامِ عاقبت قرار دیا ہے۔ لیکن پس منظر میں تعجب کا اظہار بھی ہے کہ ان لوگوں کا عجیب حال ہے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے یہ مانتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ انہیں رزق اللہ تعالیٰ کے خزانے سے مل رہا ہے۔ ان کی آسائشیں اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ کھاتے اس کا ہیں

Marfat.com

لیکن گن دوسروں کے گاتے ہیں۔اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔انہیں تہدید آمیز انداز میں فرمایا گیا ہے کہ وہ ہماری نعمتوں کی جتنی چاہیں ناشکری کرلیں ہمارے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔وہ دنیا کی نعمتوں کے خوب مزے لوٹیں ہم انہیں پکڑنے میں جلدی نہیں کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اگر دنیا کی نعمتوں کی قدر ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافر کو کبھی پانی کا گھونٹ نہ دیتا۔جتنا کوئی اس کی ناشکری کرتا ہے وہ اتنی زیادہ نعمتوں کی بارش برساتا ہے تاکہ اس کا جرم اچھی طرح کھل کر سامنے آجائے۔عنقریب تم جان لوگے کہ اس ناشکری کا انجام کیا ہوتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ یہ جاننا قیامت کے روز ہوگا۔کیونکہ دنیا دار العمل ہے دار الجزاء نہیں۔انسان کے محدود علم کے حوالے سے عنقریب کا تصور اس کی اپنی زندگی تک محدود ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں چونکہ زمانے میں تقسیم نہیں۔نیز اس کے یہاں ایک دن پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔اس لیے جب وہ کسی چیز کو قریب کہتا ہے تو وہ اس کے اپنے علم کے مطابق ہوتی ہے۔اور خود ہمارا حال بھی یہ ہے کہ موت کے بعد ہمارے اندازے بھی بدل جائیں گے۔جب قیامت کے دن ہمیں اٹھایا جائے گا تو نہ جانے کتنے اٹھنے والے کہیں گے کہ ہمیں ہماری نیند سے کس نے اٹھا دیا، ہم ابھی تو سوئے تھے۔اور قرآنِ کریم نے اصحابِ کہف کا واقعہ لوگوں کو دکھایا اور بعد کی آنے والی نسلوں کو سنایا، تاکہ لوگوں کو اندازہ ہوسکے کہ دور و قریب کا فریب یہ ہماری کوتاہیِ فکر کا نتیجہ ہے۔جب ہم دوسری دنیا میں داخل ہوں گے تو خود ہم پر ہماری کوتاہیِ فکر کی حقیقت کھل جائے گی۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿٣٥﴾

(کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل اتاری ہے جو ان چیزوں کی شہادت دے رہی ہو جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۳۵)

مشرکین سے ایک سوال

مشرکین جن قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے جب ان سے پوچھا جاتا تو وہ اپنے شرک کی تائید میں اللہ تعالیٰ ہی کو دلیل کے طور پر پیش کرتے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو چونکہ اسی طرح شرک میں مبتلا دیکھا ہے تو یقیناً ان پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل نازل کی گئی ہوگی۔اس لیے وہ اس پر عامل رہے اور ہم بھی اسی لیے اس طرزِ عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ اسے رد فرماتے ہوئے یہ سوال کر رہے ہیں کہ اگر ہم نے ایسی کوئی دلیل نازل کی تھی تو اس کی کوئی سند، کوئی گواہی ہونی چاہیے جبکہ مشرکین کے پاس ایسی کوئی گواہی موجود نہیں اور ایسی کوئی سند نہیں جسے وہ گواہی کے طور پر پیش کرسکیں کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے ان کے شرک کے حق میں کوئی بات ارشاد فرمائی تھی، جبکہ ان کی ان حماقتوں کی تائید نہ عقل کرتی ہے نہ ان کے اپنے اندرونی احساسات۔خود ان کا اپنا حال یہ ہے کہ جب وہ بے بسی اور بے کسی کی حالت میں مبتلا ہوتے ہیں اور کوئی طاقت انہیں سہارا دینے والی نہیں ہوتی تو بے ساختہ دوسرے تمام خود تراشیدہ معبودوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور پوری انابت کے ساتھ اسے پکارتے ہیں۔لیکن جب یہ بے بسی کی حالت ان سے ختم ہوتی ہے تو وہ پھر اپنی شرک کی وادیوں میں کھو جاتے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کا اصلی سبب انسان کی غفلت ہے۔کوئی ایسی دلیل نہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کی ہو۔جب یہ غفلت کی حالت قدرت کی کسی تنبیہ کی وجہ سے دور ہوجاتی ہے تو یہ اصل حقیقت کو دیکھنے لگتے ہیں۔اور جب حالات بدل جاتے ہیں تو پھر یہ اپنی پہلی حالت کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

Marfat.com

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿٣٦﴾

(جب ہم لوگوں کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر اترانے لگتے ہیں اور اگر ان کے اعمال کے سبب سے ان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔ ۳۶)

انسان کی متلون مزاجی سے استدلال

گزشتہ آیتِ کریمہ میں انسان کی بے اعتدالی اور زندگی کے فیصلوں کے بارے میں ناہمواری پر تنقید کرتے ہوئے انسان کی حالت سے استدلال کیا گیا ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ مستحکم بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے تمام فکری دعووں کے باوجود ہمیشہ احوال وظروف کی گرفت میں رہتا ہے۔ ہر تغیر اس کے فکر پر اثر انداز ہوتا اور اس کے فیصلوں کی تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ اب انسان کی اسی بے اعتدالی کو مزید نمایاں کرتے ہوئے اس کے چھچھورپن اور کم ظرفی پر گرفت کی گئی ہے۔ بظاہر اسے دیکھو تو یوں لگتا ہے کہ اس کی فکری پرواز آسمانوں کی خبر لاتی ہے اور ہر امکان کے اندر جھانک کے دیکھ لیتی ہے۔ لیکن حال اس کا یہ ہے کہ اس نے جن حقائق کو اخلاقی اقدار کے طور پر قبول کر رکھا ہے اور جن صفات کو مکارمِ اخلاق سے تعبیر کرتا ہے ان پر کبھی استقامت نہیں دکھاتا۔ اس کی کم ظرفی کا عالم یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اسے دولت وثروت سے نوازتا ہے اور اسے عزت ووجاہت نصیب ہوتی ہے تو وہ اسے اپنی خوبیوں کا ثمر اور اپنی کوششوں کا حاصل سمجھتا ہے اور اسے غلط فہمی یہ ہو جاتی ہے کہ میں نہ جانے اپنی ذات میں کس قدر عظیم ہوں کہ یہ سب کچھ مجھے اپنی عظمت کی وجہ سے مل رہا ہے۔ اس غلط فہمی میں اس پر فخر وغرور کا ایسا نشہ چڑھتا ہے کہ نہ اسے خدا کی یاد آتی ہے اور نہ کبھی اپنے انجام کی فکر ہوتی ہے۔ مخلوقِ خدا کو وہ اپنے مقابلے میں اتنا چھوٹا سمجھتا ہے کہ کسی کے حق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ لیکن جب کبھی اس پر زوال کا سایہ پڑتا ہے، دولت کی چھاؤں ڈھلنے لگتی ہے اور حکومت واقتدار کی زمین پاؤں تلے سے نکلنے لگتی ہے تو اچانک فخر وغرور کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ اس پر ایسی دل شکستگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کر گزرتا ہے اور بجائے حالات کا سامنا کرنے کے اپنی جان ہار دیتا ہے۔ ایسا انسان جو اچھے دنوں میں اپنی پہچان گم کر دے اور برے دنوں میں اپنا مقام بھول جائے تو کیا اسے یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں فیصلے کرنے لگے اور خلق اور خالق کے تعلق کو اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دے۔ بہادر شاہ ظفر نے اسی کے قریب بات کہتے ہوئے کہا:

ظفر آدمی نہ اسے جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی ہو جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ...... یہاں ایک حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انسانوں کے ساتھ معاملات میں مختلف اوقات میں دو سنتوں میں سے کسی ایک سنت کا ظہور ہوتا ہے جن میں سے ایک سنت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو ابتلاء میں مبتلا کرتا ہے۔ یعنی نیکوں کی بھی آزمائش ہوتی ہے اور بروں کی بھی۔ اور اکثر حالات میں اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تربیت اس کی مقتضی ہوتی ہے۔ اور دوسری سنت یہ ہے کہ وہ بعض دفعہ دنیا ہی میں برے لوگوں کو ان کے برے کرتوتوں کی سزا دیتا ہے۔ ان کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو ان کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے جو شخص شریعت کا تارک اور بدعمل آدمی ہے اسے جب کوئی تکلیف پہنچے تو اسے اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے۔ بقول اکبر:

Marfat.com

جب میں کہتا ہوں کہ یااللہ! میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

ابتلاء میں حالات اچھے ہوں تو شکرادا کرنا چاہیے، اور برے ہوں تو صبر کرنا چاہیے۔ اور بلا اور سزا میں اپنے اعمال کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

(کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ ۳۷)

تدبر کی دعوت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں کفار و مشرکین کی کم ظرفی پر تنقید کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ یہ خوشحال ہوتے ہیں تو اکڑنے اور اترانے لگتے ہیں۔ اور حالات بگڑتے ہیں تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ ذرا غور کرتے تو انہیں احساس ہو جاتا کہ رزق کے خزانے ان کے قبضے میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ رزق میں وسعت و تنگی، اس کی مشیت اور حکمت سے ہوتی ہے۔ اترانے کا حق تو اسے ہے جس کا رزق اس کے اپنے اختیار میں ہو۔ اور مایوس اسے ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کی صفتِ رزاقی کو ناکام ہوتے دیکھ چکا ہو۔ جب ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات ممکن نہیں، تو پھر نہ اترانا جائز ہے اور نہ مایوس ہونا، بلکہ صحیح رویہ یہ ہے کہ بندہ نعمت پر شکر کرے اور آزمائش پر صبر کرے۔ لیکن یہ لوگ چونکہ ان بنیادی باتوں سے بے بہرہ ہیں اس لیے زندگی میں اعتدال سے محروم ہیں۔

آخر میں فرمایا جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی نعمت سے نوازا ہے اس صورتحال میں ان کے لیے سمجھنے کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ جن میں سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ کفر اور شرک انسانی زندگی کی ایک ایسی کمزوری ہے جس کی وجہ سے انسان میں کبھی صحیح اخلاق پیدا نہیں ہوسکتے۔ انسان کی شخصیت کبھی استوار نہیں ہوسکتی اور اس کی زندگی میں کبھی اعتدال نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس ایمان باللہ کے نتیجے میں انسان کے اندر یہ سوچ پیدا ہو جاتی ہے کہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ کیونکہ رزق کے خزانوں کا وہی مالک ہے۔ اس لیے بہتر سے بہتر حالت اس کے اندر کبھی فخر و غرور پیدا نہیں کرتی۔ وہ ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہے۔ اور اگر کبھی اسے رزق کی تنگی یا کسی اور پریشانی سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ حالت میرے لیے ایک آزمائش ہے اور اگر میں نے اس پر صبر کا حق ادا کیا تو اللہ تعالیٰ کسی وقت بھی اس حال کو بدل سکتا ہے۔ اس لیے مایوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں صراطِ مستقیم پر چلتا اور اعتدال کو اپنا رویہ بنائے رکھتا ہے۔ رزق کی فراوانی سے اس کے اندر شکر کی فراوانی پیدا ہوتی ہے۔ مخلوقِ خدا کے ساتھ تواضع اور فیاضی سے پیش آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کرکے زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور رزق میں تنگی کے باعث اس میں کبھی مایوسی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ ایسی حالت میں صبر سے کام لیتا ہے اور خودداری کو اپنا حصار بنائے رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ رزق کی کشادگی کسی کی کامیابی کی دلیل نہیں اور نہ رزق کی تنگی کسی کی ناکامی یا بے وقار ہونے کی علامت ہے۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں بندے کے امتحان کے لیے ہیں، کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ آخرت میں ہوگا۔

Marfat.com

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾

(پس قرابت دار اور مسکین و مسافر کو اس کا حق دو، یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتے ہیں، اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۳۸)

اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا صحیح طریقہ

قرآنِ کریم نے بار بار یہ بات واضح فرمائی ہے کہ رزق دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے رزق کی فراوانی پر کسی کے لیے اس بات کی گنجائش نہیں کہ وہ اس پر اترائے اور فخر و غرور کا اظہار کرے، وہ اسے اپنے اب وجد کی وراثت سمجھے یا اسے اپنے فضل و کمال کا ثمرہ گمان کرے۔ اس کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی شکر گزاری کرے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں شکر گزاری کا طریقہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال عطا فرمایا ہے تم اس کے مالک نہیں ہو بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ تم نے جن قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لے کر یہ مال حاصل کیا ہے وہ قوتیں اور صلاحیتیں بھی اللہ تعالیٰ کی دین ہیں۔ اس لیے اس مال کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر اپنی ضرورت کے مطابق اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔ اور اگر تمہارے قرابت داروں میں کچھ لوگ ضرورت مند ہیں یا تمہارے معاشرے میں کچھ مسکین ہیں جنہیں حالات کی گردش نے زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے کر دیا ہے یا کوئی مسافر ہیں جنہیں کوئی افتادِ احتیاج کا شکار بنا چکی ہے تو یہ سب تمہاری مدد کے مستحق ہیں۔ اس لیے اپنے مال میں سے ان کی مدد کرو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات واضح فرمائی کہ یہ مدد کوئی خیرات نہیں بلکہ ان کا حق ہے جو تمہیں بہرصورت ادا کرنا ہے۔ اس لیے جب ان کی مدد کرو تو یہ سمجھ کر کرو کہ میں انہیں خیرات نہیں دے رہا بلکہ ان کا حق ادا کر رہا ہوں۔ یہ میرا ان پر احسان نہیں۔ نہ میں کوئی ایسی بڑی ہستی ہوں اور وہ کوئی حقیر لوگ ہیں جنہیں میں اپنا ممنون کر رہا ہوں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ زائد مال دے کر میری آزمائش کی ہے کہ میں اس مال کے حقداروں تک اسے پہنچاتا ہوں یا نہیں۔ یہی درحقیقت وہ طریقہ ہے جس سے مالی معاملات میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے اور معاشرے اور ملک میں معاشی بہتری کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ جس ملک میں معاشی وسائل کی فراوانی ہو لیکن ہر شخص جو مال کے کسی حصے پر قابض ہو جائے وہ اسے اپنی ملکیت جانے اور بجا طور پر یہ سمجھے کہ میں اس مال میں غیر محدود اختیارات رکھتا ہوں اور میرے گرد و پیش میں بسنے والے مسلمان مجھ پر کسی طرح کا کوئی حق نہیں رکھتے، تو ایسا معاشرہ یا ایسا ملک کبھی بھی معاشی مسائل سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ مالی ہوس، ہوائے نفس کی حکمرانی، حبِ زر اور سرمائے کو بڑھانے کے لیے بلا امتیاز ہر طریقے کو بروئے کار لانے کا اختیار یہ انسان کی وہ کمزوریاں ہیں جن کی موجودگی میں غریب، غریب تر ہوتا ہے اور امیر، امیر تر ہو جاتا ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے جب ایسے معاشرے پر سوشلزم کا عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ اسلام نے اس کے لیے آسان طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وسائل کی افزائش کے ساتھ ساتھ دل و دماغ میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہر شخص اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی فکر بھی کرے۔ حلال و حرام کا تصور دلوں میں راسخ کر دیا جائے، اپنے مال میں دوسروں کا حق تسلیم کیا جائے، اپنے پاس اگر ایک روٹی بھی ہے تو اسے تقسیم کر کے دوسروں تک بھی پہنچایا جائے۔ اس سے نہ مال کی محبت پیدا ہوتی ہے، نہ ہوسِ زر بڑھتی ہے، نہ ارتکازِ زر کو راستہ ملتا ہے اور نہ لوٹ کھسوٹ کا کلچر پروان چڑھتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کی رضا بھی ملتی ہے اور یہی لوگ آخر دنیا و آخرت میں کامیاب ہوتے ہیں۔

Marfat.com

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

(اور جو روپیہ تم سود پر دیتے ہو تا کہ وہ لوگوں کے مالوں میں بڑھتا رہے، تو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ تم دیتے ہو اللہ کی رضا جوئی کے لیے، تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کے یہاں اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں۔ ۳۹)

انسانی سوچ کی اصلاح اور ربا کا مفہوم

عام انسانوں کی سوچ اس دائرے سے باہر نہیں نکلتی کہ اپنے مال میں سے کسی کو اگر مدد کے طور پر کچھ دے دیا جائے یا کسی بھلائی کے کام پر خرچ کر دیا جائے یا کسی رفاہی کام پر صرف کر دیا جائے تو اس سے یقیناً مال میں کمی آتی ہے، بڑھنے کا کوئی سوال نہیں۔ مال کے بڑھنے کا ایک طریقہ تو تجارت ہے جس کی اسلام نے ترغیب بھی دی ہے، لیکن اس میں امکانات دونوں طرح کے ہوتے ہیں کہ مال بڑھ بھی سکتا ہے اور کبھی نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن مال کے یقینی طور پر بڑھنے اور کبھی نقصان کا اندیشہ تک نہ ہونے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ کسی کو سودی قرض کے طور پر مال دیا جائے۔ گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ تم اگر اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہو اور زندگی میں فلاح وکامرانی کے متلاشی ہو اور یہ بھی چاہتے ہو کہ تمہاری دولت معاشرے میں تیزی سے گردش میں آئے اور زیادہ ہاتھوں میں پہنچ کر زیادہ بڑھوتری کا سبب بنے تو اس کی صورت یہ ہے کہ قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مال میں رکھا ہے۔ لیکن تم یہ سمجھتے ہو کہ لوگوں کو سود پر پیسہ دے کر تم اپنے مال میں یقینی طور پر اضافہ کر سکتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایسا مال اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑھتا نہیں بلکہ کم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مال بڑھتا ہے وہ مال وہ ہے جو تم زکوٰۃ کے طور پر دیتے ہو۔ زکوٰۃ سے یہاں فریضۂ زکوٰۃ مراد نہیں بلکہ ہر وہ خیرات اور سخاوت ہے جس کا ذکر گزشتہ آیت میں کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو اس کی افزائش کا حال یہ ہوگا کہ جس آدمی نے ایک دانہ بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا ہوگا وہ قیامت کے دن پہاڑ سے بڑھ کر اس کی افزائش دیکھے گا۔ لیکن دنیا میں بھی جس طرح سودی مال کم ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا ہوا مال بڑھتا ہے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ وہ پہلی آیت ہے جس میں سود کے نقصان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ جس چیز کو آئندہ چل کر حرام قرار دینے والا ہوتا ہے اس کی شناعت اور خرابی کو بہت پہلے سے آہستہ آہستہ دماغوں میں اتارنا شروع کر دیتا ہے اور پھر وہ وقت آجاتا ہے جب اسے حرام کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ تصور ضرور دے دیا گیا ہے کہ انسان بڑا کوتاہ نظر واقع ہوا ہے۔ وہ بظاہر دور تک دیکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی نظر اسی زندگی تک محدود رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے اصل مستقبل یعنی آخرت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن ایک مومن کی سوچ عام انسان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ دنیا سے آگے بڑھ کر آخرت کو بھی دیکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا میں روپیہ پیسہ دنیا کے بینکوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس کا فائدہ ممکن ہے کبھی دنیا میں پہنچ جائے، لیکن حقیقی فائدہ جب ہے جب وہ پیسہ خدا کے بینک میں جمع ہو، تا کہ وہ اس کی ابدی زندگی میں کام آئے۔ تو سود میں چونکہ مال اللہ تعالیٰ کے یہاں یعنی آخرت میں نہیں بڑھتا۔ وہ اس صورت میں بڑھتا ہے جب لوگوں کا حق اس میں سے ادا کر دیا جائے۔ اس لیے ایک مومن کی اصل سوچ یہ ہونی چاہیے کہ وہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی فکر کرے۔

Marfat.com

بعض اہلِ علم نے آیت میں رِبا سے سود نہیں بلکہ تحفے اور عطیے مراد لیے ہیں جو اس نیت سے دیے جائیں کہ تحفہ لینے والا اس سے کئی گنا زیادہ اس کے بدلے میں تحفہ دے۔ یا اس کے نتیجے میں کوئی اور فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے یہ مفہوم محلِ نظر ٹھہرتا ہے۔ اگر اس کو مراد لے بھی لیا جائے تو تب بھی اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس نیت سے بھی تحفہ یا عطیہ دیا جائے تو وہ اگرچہ حرام نہیں لیکن معیوب ضرور ہے۔ اور یہ بات تو آیت نے واضح کر دی کہ ایسے تحفے دینے سے مال میں برکت نہیں ہوتی۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ؕ ھَلْ مِنْ شُرَکَآئِکُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِکُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۴۰﴾

(اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہیں رزق دیا، پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا، کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو، وہ پاک ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۴۰)

شرک کی مذمت میں ایک جامع دلیل

گزشتہ آیات میں شرک کے مختلف مظاہر اور مصادیق پر ہمہ پہلو تنقید اور شرک سے پیدا ہونے والے مفاسد اور فکری اور عملی الجھنوں پر تبصرہ کرنے کے بعد ایک جامع بات ارشاد فرمائی ہے جس سے شرک کے مہمل ہونے اور جن قوتوں کو شریک ٹھہرایا جاتا ہے ان کے بے فائدہ ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور پھر زندگی کی بقاء کے لیے تمہاری روزی کا سامان کیا۔ پھر زندگی کے سفر کے اختتام پر تمہیں وہ موت دیتا ہے اور زندگی میں جیسے کچھ تم نے اعمال کیے ہیں ان کی جزاء وسزا کے لیے تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہی انسان کی چار بنیادی ضرورتیں ہیں اور زندگی کے چار اہم عنوان ہیں۔ تو کیا ان میں سے کسی ایک تبدیلی میں بھی ان شریکوں نے کوئی سی خدمت انجام دی ہے یا کسی کام میں ہاتھ بٹایا ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو اس کا ثبوت دو۔ اور اگر ان ذمہ داریوں میں کسی ذمہ داری کے ادا کرنے میں وہ شریک نہیں رہے اور تم نے انہیں اللہ کا شریک بنا رکھا ہے تو پھر بتاؤ وہ کس مرض کی دوا ہیں۔ نہ وہ دنیا میں تمہارے کام آئے اور نہ وہ آخرت میں تمہارے کام آئیں گے۔ تو تم نے آخر انہیں خدا کے ساتھ شریک کیوں ٹھہرا رکھا ہے۔

پھر ان مشرکین کی طرف سے رخ پھیر کر خود ہی اس بات کا جواب ارشاد فرمایا ہے اور ان سے منہ اس لیے پھیر لیا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کی خرابی اور اعمال کے فساد کے باعث اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے مخاطب ہو۔ نیز اس سے اللہ تعالیٰ کے غضب کی طرف بھی رہنمائی ملتی ہے اور مشرکین کی بے وقعتی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے اور بہت بلند و برتر ہے ان چیزوں سے جنہیں اس کا شریک ٹھہرایا جاتا ہے۔ چاہے وہ انسان ہوں یا جن، فرشتے ہوں یا دیوی دیوتا، اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات میں کسی کا شریک ہونا انسانی دماغ کی خرابی کی علامت کے سوا اور کچھ نہیں۔ نہ اسے عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے اور نہ کبھی کسی صحیح مذہب نے اس کی اجازت دی ہے۔

بعض اہلِ علم نے اس آیت کے مفہوم کی وضاحت میں یہ بات کہی ہے کہ مشرکینِ قریش کو براہِ راست یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے اور تم جیسے دوسرے مشرکین نے جس طرح زمین کو فساد سے بھر دیا ہے اور تمہاری بداعمالیوں نے جس طرح انسانی زندگی دشوار کر دی ہے اور زمین میں ہر طرف قتل اور خونریزی، بدامنی اور بے چینی، جان مال اور آبرو کی رسوائی اور زندگی کے ہر شعبے میں تباہ کن بگاڑ پھیل گیا ہے، اب وقت آ گیا

Marfat.com

ہے کہ ان خرابیوں کا خمیازہ انسان کو بھگتنا پڑے۔ اور ان نتائج سے دوچار ہونا پڑے جو ایسی صورتحال کا لازمی نتیجہ ہے۔ تو کیا ان تباہ کن حالات میں جن قوتوں کو تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے کیا وہ تمہاری کوئی مدد کریں گی، جبکہ اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا، وہی روزی دیتا ہے، موت بھی اس کے اختیار میں ہے اور دوبارہ زندہ بھی وہی کرے گا۔ تم اپنے ان شریکوں کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انہوں نے ان کاموں میں سے کوئی کام بھی سرانجام دیا ہو۔ تو پھر سوچ لو اگر تم نے اسلام کی دعوت قبول نہ کی تو اس صورتحال سے تم کس طرح عہدہ برآ ہو سکو گے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي
النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾ قُلْ
سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۚ
كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ﴿٤٢﴾ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ
قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ﴿٤٣﴾
مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنْفُسِهِمْ
يَمْهَدُونَ ﴿٤٤﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ ۚ
إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿٤٥﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ
وَلِيُذِيقَكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ
فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٤٦﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا
إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا ۚ
وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٧﴾ اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ
فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا

Marfat.com

فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ
اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ
اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ
وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ وَلَىِٕنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا
لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ
الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ
ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع

رکوع: ۵۔ (خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کی اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تا کہ اللہ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ وہ باز آئیں۔ ۴۱) اے پیغمبر! ان سے کہئے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو پہلے گزر چکے ہیں، ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔ ۴۲) پس اپنا رخ دینِ قیم کی طرف سیدھا رکھئے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس کے ٹل جانے کی کوئی صورت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے، اس دن یہ لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔ ۴۳) جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے، اور جنہوں نے نیک اعمال کیے وہ بے شک اپنے لیے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ ۴۴) تا کہ اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں اور عملِ صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزاء دے، یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ ۴۵) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو بشارت دینے والی بنا کر تا کہ وہ تم کو اپنے رحمت سے بہرہ مند کرے، اور تا کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تا کہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ ۴۶) اور ہم نے آپ سے پہلے رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا، پس وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے، تو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جنہوں نے جرم کیا، اور اہلِ ایمان کی نصرت ہم پر لازم تھی۔ ۴۷) اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پس وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلا دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ بارش بادلوں میں سے

Marfat.com

نکلتی چلی آتی ہے، پس جب وہ اس بارش کو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے تو وہ یکا یک خوش ہو جاتے ہیں۔ ۴۸) حالانکہ وہ اس کے نازل کیے جانے سے قبل، اس خوشی سے پہلے، بالکل مایوس تھے۔ ۴۹) پس اللہ کی رحمت کے آثار کو دیکھو کہ وہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو کس طرح جلا اٹھاتا ہے، بے شک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۵۰) (اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو اس کے بعد وہ کفر کرتے رہ جائیں گے۔ ۵۱) اے پیغمبر! آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے، اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جا رہے ہیں۔ ۵۲) اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ دکھا سکتے ہیں، آپ تو بس ان کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائیں، پس وہی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ۵۳)

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾

(خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کی اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ اللہ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ وہ باز آئیں۔ ۴۱)

بر و بحر میں فساد انسانی اعمال کا نتیجہ ہے

بر و بحر کے الفاظ معنوی احاطہ پر دلیل ہوتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اعتقادی ہو یا عملی، فساد برپا ہو گیا ہے۔ یعنی زندگی کا کوئی شعبہ بھی فکری اور عملی ابتری سے بچا ہوا نہیں ہے۔ اس میں ممکن ہے روم و ایران کے درمیان ہونے والی لڑائی کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اس لڑائی کی آگ نے پورے شرق اوسط کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اور اس وقت کی متمدن دنیا کا یہی علاقہ مرکز تھا۔ اس زمانے کی دو بڑی سلطنتیں اسی علاقے میں تھیں۔ بظاہر تو یہ ابتری اس علاقے میں جنگ کا نتیجہ معلوم ہوتی تھی لیکن حقیقت میں جنگ بجائے خود فکر و عمل کی خرابی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر جنگ کی طرف بھی اشارہ سمجھا جائے تو مقصود یہ نہیں ہے کہ جنگ نے حالات خراب کیے ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ انسانوں کے اپنے اعمال نے حالات کو تباہ کیا ہے، اسی سے جنگ کو وجود ملا اور اس نے اس تباہی میں مزید اضافہ کیا۔ اس لیے اصل توجہ کے لائق انسان کی فکر و نظر کا بگاڑ اور اس کے نتیجے میں وجود میں آنے والے اعمال ہیں جنھوں نے بر و بحر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں رہا۔ وہ فکر و نظر کی خرابی کیا ہے۔ وہ وہی ہے جس کی طرف قرآنِ کریم بار بار اشارہ کر رہا ہے کہ انسان جب تک اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات میں وحدہ لاشریک، اس کی صفات میں یکتا، اس کے حقوق میں بے بدل اور اس کے احکام میں مطاعِ مطلق اور اس کے وجود میں حاضر و ناظر اور اس کی قدرت میں بے پناہ اور اس کے علم میں بے پایاں تسلیم نہیں کرتا اور اس کے ساتھ ساتھ جواب دہی کے لیے آخرت کا یقین دل میں نہیں اتارتا اس وقت تک اس کے اعمال میں سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان سے بے نیاز ہو کر اگر وہ طاقتور ہے تو فرعون بن بیٹھے گا اور انسانوں سے اپنی

Marfat.com

بندگی کرائے گا۔ اور اگر وہ کمزور ہے تو یا شتر بے مہار بن کر زندگی گزارے گا یا انسانوں میں سے کسی کی غلامی میں شب و روز بسر کرے گا۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا فرمانبردار نہیں تو اس کی زندگی کے اعمال کی نہ کوئی جہت ہوگی نہ منزل۔ وہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو آزاد سمجھے گا اور جو جی میں آئے گا کرے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ نہ کوئی گھر سلامت رہے گا نہ کوئی ہمسایہ ظلم و تعدی سے بچے گا نہ معاشرہ حُسنِ معاشرت سے آگاہ ہو سکے گا اور نہ انسانی زندگی اپنے اندر کوئی سا حُسن پیدا کر سکے گی۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتا تو تب اس کی حیوانیت کو بگٹٹ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور اس کی تنہائیوں میں پاکیزگی آنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وہ اعمال ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو پہلے بھی زخم دیے ہیں اور آج بھی دے رہے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے کے زمانے کو عہدِ جاہلیت کہتے ہیں، جس میں انسانی بگاڑ اس قدر ہمہ گیر اور اس قدر شدید تھا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے محفوظ نہیں تھا۔ خانگی زندگی اجڑ چکی تھی، ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا، ہر قبیلے نے اپنا الگ خدا بنا رکھا تھا جس سے ضرورت کے وقت مرادیں مانگتا اور بندگی بجالاتا تھا، لیکن ویسے پوری زندگی ہَوائے نفس کے زیرِ اثر گزر رہی تھی۔ انسانی جان، مال اور آبرو بے قدر و قیمت ہو چکے تھے۔ خود انسان، انسان کا دشمن تھا۔ اخلاق اس حد تک تباہ ہو چکے تھے کہ شرم و حیاء، لحاظ اور مروت، رحم دلی اور ہمدردی، دیانت و امانت، غرضیکہ تمام اقدارِ انسانیت اپنی معنویت اور عملی تعبیر کھو چکے تھے۔ اور اس تباہی کی ہمہ گیری کا عالم یہ تھا کہ اس کا شکار صرف عالمِ عرب نہیں بلکہ اس دور کی پوری دنیا تھی۔ رومیوں اور ایرانیوں کے ظلم نے دنیا کو جہنم بنا رکھا تھا۔ آج بظاہر ہم علم و ہنر کے دور میں جی رہے ہیں، لیکن درحقیقت عہدِ جاہلیت پوری طرح زندہ ہو چکا ہے۔ انسان کی خدا فراموشی، نوامیسِ فطرت سے سرتابی اور اسلام کے پیش کیے ہوئے نظامِ حیات سے روگردانی بالکل اسی سطح تک پہنچ گئی ہے جیسی ہم عہدِ جاہلیتِ اولیٰ میں دیکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ خشکی میں کہیں امن ہے، نہ سمندر کی بے کراں وسعتوں میں کوئی گوشۂ عافیت نظر آتا ہے۔ زمین پر جگہ جگہ میزائل کے اڈے قائم ہیں جہاں سے ایک براعظم سے دوسرے براعظم پر ایٹم بم برسا کر ہر چیز کو خاک سیاہ بنایا جاسکتا ہے۔ سمندر کی سطح بلکہ سمندروں کو ابلتے ہوئے جہنم میں تبدیل کر سکتا ہے۔ کُرۂ ہَوائی میں بڑی بلندیوں پر امریکہ کا ہَوائی بیڑہ جو ہزاروں طیاروں پر مشتمل ہے ہر وقت مصروفِ پرواز رہتا ہے۔ اس میں مہلک قسم کے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم فٹ کر دیے گئے ہیں۔ ایک سگنل سے وہ قیامت برپا کر سکتے ہیں۔ بڑی قوتیں مہلک سے مہلک اسلحہ بنانے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے ملکی ثروت کو پانی کی طرح بہا رہی ہیں۔ یہ تباہی کے اسباب جو بڑے سے بڑے فساد کو جنم دے سکتے ہیں اور بہت حد تک دے بھی چکے ہیں پرانے عہدِ جاہلیت سے کہیں بڑا حادثہ ہے جس سے آج انسانیت دوچار ہے۔ اور اس کا سبب صرف انسانی کرتوت ہیں جو انسان کے بگڑ جانے کے باعث مسلسل ظہور میں آرہے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکمل عذاب نہیں بلکہ ایک تنبیہ ہے تاکہ انسانوں کی کرتوتوں کا کچھ مزہ ان کو چکھایا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور اس کے بھیجے ہوئے دین سے انکار کے نتیجے میں دو قسم کے عذاب آیا کرتے ہیں۔ ایک ہے تنبیہی اور دوسرا ہے فیصلہ کن۔ قریش سے کہا جارہا ہے کہ تم نے اپنے اعمال سے اپنے آپ کو ایک تنبیہی عذاب کا مستحق بنالیا ہے۔ اور اس عذاب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مخاطب قوم کو مختلف تکالیف اور حوادث کا شکار بناتا ہے۔ لیکن ان کی بیخ کنی نہیں کرتا، اور موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی روش بدلنا چاہیں تو بدل لیں۔ لیکن اگر وہ اپنی روش نہیں بدلتے تو پھر ان پر وہ فیصلہ کن عذاب آتا ہے جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ آج ہم بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہیں۔ ہمارے ملک کا

Marfat.com

بہت بڑا حصہ اس سے پہلے زلزلے کی نذر ہو چکا ہے اور آج ایک بڑے حصے کے رہنے والے اپنے گھروں سے بے گھر ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں اذیتوں کا شکار ہیں۔ ان کی آبادیاں مسمار کر دی گئی ہیں۔ وہ موسم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ بہت محدود سطح پر ان کی دیکھ بھالی کا انتظام ہو رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے تا کہ وہ بھی اور ملک کے دوسرے حصوں کے رہنے والے بھی سبق سیکھیں اور اپنی اصلاح کریں۔ لیکن اگر ہم نے اپنی اصلاح کرنے کی کوشش نہ کی اور حالات کو بدلنے کے لیے اپنا اپنا فرض انجام نہ دیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ عذاب بھی آ سکتا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿۴۲﴾

(اے پیغمبر! ان سے کہیے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو پہلے گزر چکے ہیں، ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔ ۴۲)

تاریخ سے استدلال

قریشِ مکہ چونکہ آنحضرت ﷺ کی تنبیہات اور عذاب کی دھمکیوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ خالی خولی دھمکیاں ہیں جس کا کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ محض ہمیں ڈرایا جا رہا ہے تا کہ ہم آپؐ کی دعوت قبول کر لیں۔ اور باقی اہلِ دنیا کا بھی حال اس سے مختلف نہیں تھا۔ ان کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی گرفت ایک بے معنی سے بات ہو کر رہ گئی تھی۔ اور وہ جیسے جیسے زندگی گزار رہے تھے اسی پر مطمئن تھے اور اپنی سوچ اور اپنے اعمال کو بالکل برحق سمجھتے تھے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ آپؐ ان لوگوں سے کہیں کہ میں تمہیں جن حقائق کی طرف بلا رہا ہوں اور جن کے انکار کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرا رہا ہوں یہ محض زبانی باتیں نہیں بلکہ اس کے پیچھے تاریخ کی شہادت موجود ہے۔ تم سرزمینِ عرب کے مختلف علاقوں سے گزرتے ہو اور تمہارے تجارتی قافلے ایسے راستوں سے گزرتے ہیں جہاں بہت سی معذب قوموں کی تاریخ بکھری ہوئی ہے اور تم ان کی تاریخ سے واقف ہو۔ تم اگرچہ امی قوم ہو لیکن ان قوموں کے حالات سینہ بہ سینہ تم تک پہنچ چکے ہیں۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ ان قوموں کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول آئے۔ انہوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، اس پر ایمان لانے کی دعوت دی، ان کے اعمال کی درستگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شریعت پیش کی، انہیں مکارمِ اخلاق سے آگاہ کیا اور اس بات سے بھی باخبر کیا کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو یاد رکھو تمہاری بداعمالیوں اور بے ایمانیوں کی وجہ سے دنیا میں بھی تم پر عذاب آئے گا اور آخرت میں بھی تم پکڑے جاؤ گے۔ چنانچہ جب انہوں نے پیغمبروں کی کسی بات پر کان نہیں دھرے تو بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ آج بھی ان کے کھنڈرات اور ان کے آثار ان کی کہانی سنانے کے لیے موجود ہیں۔ تم غور کرو کہ آخر ان قوموں پر عذاب کیوں آیا اور پھر خود ہی فرمایا کہ ان میں سے بیشتر لوگ شرک کے مرض میں مبتلا تھے اور یہ ایسا مرض ہے کہ جو قوم بھی اس کا شکار ہوتی ہے وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا نشانہ بنتی ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ شرک سے مراد صرف شرک فی العبادت نہیں بلکہ یہ ایک وسیع اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ اسی طرح کوئی شخص چاہے وہ کیسے ہی بڑے مرتبے کا مالک ہو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک نہیں۔ اس کے سوا نہ کسی کے

Marfat.com

سامنے سر جھکایا جاسکتا ہے، نہ کسی کی غیر مشروط اطاعت ہوسکتی ہے نہ کسی کو حاکمیتِ مطلقہ زیب دیتی ہے، صرف اسی کی بے ہمتا ذات ہے جو سروری کے لائق ہے اور اس کی کبریائی کو کسی کی عظمت چیلنج نہیں کرسکتی۔ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے یہ نسبتیں تسلیم کرے گا وہ شرک کا ارتکاب کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی معافی کا کوئی امکان نہیں۔ پہلی قومیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسی شرک کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اور اے عرب کے لوگو! تم بھی اسی شرک کی وجہ سے تباہی کے کنارے پہنچ چکے ہو۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾

(پس اپنا رخ دینِ قیم کی طرف سیدھا رکھئے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس کے ٹل جانے کی کوئی صورت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے، اس دن یہ لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔ ۴۳)

آنحضرت ﷺ کی طرف التفات

قریشِ مکہ اور دیگر اہلِ دنیا کو تاریخ کا آئینہ دکھانے کے بعد آنحضرت ﷺ سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جہاں تک تبلیغ و دعوت اور افہام و تفہیم کا تعلق ہے آپؐ نے اس میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ تنبیہ اور تہدید بھی بہت کچھ ہوچکی۔ اگر یہ ہٹ دھرم اور شامت زدہ لوگ آپؐ کی بات نہیں مانتے تو آپؐ ان کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ آپؐ پر اللہ تعالیٰ نے جو دین اتارا ہے اس کا راست تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ اور مزید یہ کہ اسے اختیار کر لینے اور اپنا لینے کے بعد زندگی میں کوئی کجی باقی نہیں رہتی۔ آپؐ کا اور آپؐ کی پیروی میں مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ آپؐ اسی کے ساتھ یکسو ہو کر دلجمعی کے ساتھ اپنا تعلق جمائے رکھیں۔ آپؐ کی تبلیغ و دعوت کا ہدف اس کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو۔ اور مسلمانوں کا کوئی عمل کبھی بھی اس فطری دین سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ اسی دین کے حوالے سے قیامت کے دن مسؤلیت ہوگی۔ اس مسؤلیت سے بچنے کی ہر وقت فکر کیجئے۔ اس دن کا آنا ایسا اٹل ہے کہ اس کی آمد میں کوئی شبہ نہیں۔ اور جب وہ دن آجائے گا تو کسی کی مجال نہیں کہ اس کو ٹال سکے۔ اور نہ خود اللہ تعالیٰ اسے ٹالنے والا ہے۔ آج ان مشرکین کو گمان یہ ہے کہ اگر وہ دن آ ہی گیا تو ہمارے شرکاء و شفعاء ہمیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچالیں گے اور ہم ان کی شفاعت سے اس دن سرخرو ہو کر نکلیں گے، لیکن یہ ان کی خام خیالیاں ہیں۔ اس دن سب متفرق ہو جائیں گے۔ جنہیں اپنی شفاعت کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ ان کے کام نہ آسکیں گے۔ وہاں سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی، کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو شفاعت کا اعزاز بخشے اور کسی کے حق میں اجازت دے دے۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

(جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے، اور جنہوں نے نیک اعمال کیے وہ بے شک اپنے لیے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ ۴۴) تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں اور عملِ صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزاء دے، یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ ۴۵)

Marfat.com

قیامت میں کفر کا نتیجہ

قیامت کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آج کافر لوگ اپنے کفر پر نازاں ہیں اور ایمان لانے والوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ کفر دنیا میں ان کے لیے ترقی اور کامیابی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ لیکن قیامت کے دن یہی کفران کے لیے وبالِ جان ثابت ہوگا۔ اس دن ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزاء یا سزا ملے گی۔ کافر لوگ چاہے کچھ بھی گمان کریں لیکن اس روز کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا اور کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں ہوگا۔ اسی طرح جو لوگ عملِ صالح کر رہے ہیں۔ وہ درحقیقت اپنے ہی مستقبل کو سنوار رہے ہیں اور یہی عملِ صالح قیامت کے دن ان کے لیے ایسا سرمایہ ثابت ہوگا کہ جس سے ان کے لیے فوز و فلاح کا راستہ کھلے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن انسان کے اعمال ہی کام آئیں گے، کوئی دوسرا اس کے کام نہیں آئے گا۔ اور انسان کی بداعمالیاں اس کے لیے وبالِ جان ثابت ہوں گی اور کوئی اسے چھڑانے والا نہیں ہوگا۔

قیامت کے آنے کا مقصد

اگلی آیت کا تعلق درحقیقت گزشتہ سے پیوستہ آیت میں قیامت کے ذکر سے ہے۔ یعنی قیامت کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان و عملِ صالح والوں کو اپنے فضل سے صلہ دے۔ اس لیے کہ جب دنیا میں اہلِ کفر کی غیر معمولی اکثریت ہو اور ایمان لانے والے کے لیے اذیت رسانی کی بھٹیاں کھلی ہوئی ہوں اور ایک ایسی زندگی کو اختیار کرنا ہو جس میں ہر طرف آزمائشیں ہی آزمائشیں ہوں تو ایسے حالات میں ایمان کا راستہ اختیار کرنا اور عملِ صالح سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا یقیناً ایک ایسا مجاہدہ ہے جس کی قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہیں۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایسے جانثاروں اور سرفروشوں کو نظر انداز فرما دیتا۔ اس لیے صاف صاف فرمایا کہ ہم قیامت کو اس لیے لائیں گے تاکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہیں انہیں ہم ان کے ایمان و عمل کا صلہ دیں۔ اور دنیا میں انہوں نے اس کی خاطر جو دکھ اٹھائے ہیں اس پر انعام دیں۔ لیکن ساتھ ہی ایک عجیب بات فرمائی کہ ہم ان کو ایمان و عمل کا صلہ دیتے ہوئے صرف ان کے ایمان و عمل کی قدر و قیمت کو نہیں جانچیں گے تاکہ اس کے مطابق صلہ دیں بلکہ اپنے فضل و کرم کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ انہوں نے اپنی ہمت اور توانائی کے مطابق ایمان اور اخلاص کی شمع روشن کی اور تمام تر موانع کے باوجود عمل کے چراغ جلائے۔ ہم بھی اس کا صلہ دیتے ہوئے اپنے فضل و کرم کی بارش برسائیں گے۔ رہی یہ بات کہ فضل و کرم کی انتہا کیا ہوگی اور اس کی وسعت کا عالم کیا ہوگا یہ ایسی بات ہے جس کے لیے تخلیق نہیں کیا گیا کوئی پیمانہ۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں فرماتا۔ بظاہر یہ سادہ سا جملہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی یکتا و بے مثال ذات کا کسی کو اپنی پسند سے نکال دینا اتنی بڑی محرومی ہے اور اس میں ایسی نفرت و کراہت چھپی ہوئی ہے کہ جس کی تعبیر سے قلم قاصر ہے۔ اہلِ ایمان کے مرتبہ و مقام کا کیا کہنا کہ قیامت برپا ہی اس لیے کی جائے گی تاکہ انہیں انعام و تحسین سے نوازا جائے اور اہلِ کفر کی بدنصیبی کا کیا ٹھکانہ کہ یہ بات کہہ کر ان کا ذکر ختم کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں پسند نہیں کرتا۔ اب وہ کسی بھی جہنم میں گریں اور کیسی بھی خواری کا شکار ہوں، اللہ تعالیٰ کو اس کی کیا پرواہ۔

Marfat.com

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٤٦﴾

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو بشارت دینے والی بنا کر تاکہ وہ تم کو اپنی رحمت سے بہرہ مند کرے، اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ ۴٦)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی

گزشتہ آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ اس میں جو نفرت و کراہت چھپی ہوئی ہے اسے صرف محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس نفرت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کفار پر زمینی زندگی تنگ کردے۔ انہیں بے شک تباہ و برباد نہ کرے لیکن جینا ان کے لیے مشکل بنادے تاکہ وہ اپنے کفر و شرک کا انجام دنیا میں بھی دیکھیں۔ لیکن پیشِ نظر آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ وہ کافروں پر بھی رزق کے دروازے بند نہیں کرتا۔ ان کے رزق کا دارومدار چونکہ بہت حد تک نزولِ باراں پر ہے، اس لیے جب وہ بارش کی طرف سے ناامید ہونے لگتے ہیں اور قحط سالی ان کی اجتماعی زندگی کو ہلا کے رکھ دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان پر ایسی ہوائیں بھیجتا ہے جو ابرِ رحمت کی بشارت بن کر آتی ہیں۔ پھر بارش نازل فرما کر انہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرتا ہے۔ مردہ زمین ازسرِنو زندہ ہوجاتی ہے، ہر طرف زندگی کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں، ٹنڈ منڈ درخت ہرے ہوجاتے ہیں، زمین مخمل کا لباس پہن لیتی ہے، نئے نئے شگوفے پھوٹنے لگتے ہیں، پانی کے اجڑے ہوئے ذخیرے پھر سے بھر جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت اسی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ ایک اور طرح کی ہواؤں کو بھی بھیجا جاتا ہے جو جہاز رانی میں مددگار ہوتی ہیں۔ بادبانی کشتیاں اسی بادِ موافق کے ذریعے چلتی ہیں اور یہی کشتیاں اور بحری جہاز دور دراز ملکوں میں تجارتی سامان لے جانے کا ذریعہ بنتے ہیں اور اس سے جزیرۂ عرب جیسے زندگی کے وسائل سے محروم قطعۂ زمین پر رہنے والوں کی دولت و ثروت کا باعث بنتے ہیں۔ اسی ذریعے سے اہلِ عرب ملکوں ملکوں گھومتے اور تجارت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کیا وہ لوگ جن کے کفر کے باعث اللہ تعالیٰ انہیں پسند نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود اس قدر نعمتوں کے دروازے ان پر کھول رکھے ہیں تاکہ وہ ان نعمتوں پر شکر گزاری کا حق ادا کرکے جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنا چاہیں تو یہ دروازہ ہر وقت ان کے لیے کھلا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیتِ کریمہ کو دوسرے پہلو سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیات میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے۔ کیونکہ جب یہ آیات نازل ہورہی تھیں، کفار کی طرف سے مخالفت اور ایذا رسانی کا عمل پوری قوت سے جاری تھا۔ صورتحال یہ ہوگئی تھی کہ کسی طرف سے بھی آنحضرت ﷺ کی دعوت کی قبولیت کے آثار نمایاں ہوتے دکھائی نہ دیتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسلامی دعوت ایک ایسی بندگلی میں پہنچ گئی ہے جس سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔ اور اہلِ مکہ اور گردوپیش کے علاقوں کے رہنے والوں نے پوری طرح اپنے دل اس دعوت کے لیے بند کرلیے تھے۔ چنانچہ اس ماحول میں پروردگار تسلی دیتے ہوئے یہ فرما رہے ہیں کہ جس طرح بارش کے نزول سے پہلے جس

Marfat.com

کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، ہوائیں رک جاتی ہیں اور فضا اس طرح گھٹ کر رہ جاتی ہے کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ اور عرب میں یہ کیفیت بعض دفعہ بہت طویل ہو جاتی تھی۔ اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب آسمان کے دروازے بارانِ رحمت کے لیے کبھی نہیں کھلیں گے۔ لیکن ایسی ناامیدی کے زمانے میں اچانک ٹھنڈی ہوائیں ابرِ رحمت کے لیے خوشخبری دیتی ہوئی آتی ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ایک ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جلتی بلتی زمین کو اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا تو کیسے ممکن ہے کہ جن ناموافق حالات میں اسلامی دعوت گھر کر رہ گئی ہے اور ہر طرف کفار کی مخالفت نے ایک حبس کی کیفیت پیدا کر دی ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدلنے کے لیے اسباب پیدا نہ فرمائے۔ یقیناً تائید و نصرت کی ایسی ہوائیں چلیں گی جن سے اسلامی دعوت کی کھیتی پھر سے ہری بھری ہو جائے گی۔ اور انہیں بند دروازوں سے حق کو قبول کرنے والے نکلیں گے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے مدینے کی طرف سے قبولیت کی ہوائیں آنے لگیں اور ہجرت کے چند ہی سال بعد عرب کا مرکزِ اعصاب یعنی مکہ سرنگوں ہو گیا۔ اور پھر نہایت مختصر وقت میں پورا جزیرہ اسلام کی آغوش میں آ گیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۭ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۷

(اور ہم نے آپ سے پہلے رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا، پس وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے، تو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جنہوں نے جرم کیا، اور اہلِ ایمان کی نصرت ہم پر لازم تھی۔ ۴۷)

گزشتہ آیت کی وضاحت تاریخ کے آئینہ میں

گزشتہ آیت میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو جو تسلی دی گئی ہے، اسے تاریخ کی روشنی میں واضح فرمایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کفار کو تنبیہ بھی کی گئی ہے، یعنی یہ بات واضح کی گئی ہے کہ آپ دنیا میں پہلے رسول نہیں، آپ سے پہلے بھی ہم نے رسول بھیجے ہیں۔ کئی رسولوں کے حالات آپ پر نازل کیے جا چکے ہیں۔ وہ بھی آپ کی طرح اپنی قوموں کی طرف کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ انہوں نے ان نشانیوں سے بھی استدلال کیا جو کائناتِ فطرت میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں جن سے انسان کو اپنی زندگی میں ہر آن سابقہ پیش آتا ہے۔ چنانچہ اسی کی ایک مثال گزشتہ آیت میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ایسے معجزات بھی لے کر آئے جو یہ بات واضح کرنے کے لیے کافی تھے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول اور فرستادہ ہیں۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے رسول کے ہاتھ پر کسی ایسے خرقِ عادت کام کا ظہور ہوتا ہے جس کے کرنے سے ساری دنیا عاجز ہوتی ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی قدرت ہے۔ جیسے عصائے موسیٰ اور ید بیضا۔ یا حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کے ہاتھ سے کوڑھیوں کا ٹھیک ہونا، اندھوں کا بینا ہو جانا، بعض مردوں کا زندہ ہو جانا، مٹی کی بنی ہوئی مورتیوں کا پرندوں کی طرح اڑنے لگنا وغیرہ۔ اور آنحضرت ﷺ کی انگلی کے اشارے سے چاند کا دو ٹکڑے ہونا، کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، چند آدمیوں کا کھانا سینکڑوں لوگوں کے لیے کافی ہو جانا، پانی کے چند قطروں کا ذخیرۂ آب کی شکل اختیار کر لینا۔ اس کے علاوہ انبیاء کی غیر معمولی پاکیزہ سیرت اور انسانی معاشرے پر ان کے حیات بخش اثرات، ایسی نشانیاں لے کر آئے لیکن قوموں نے ان نشانیوں اور حجتوں کی قدر

Marfat.com

کرنے کی بجائے مجرمانہ روش اختیار کی۔ نہ صرف انکار و تکذیب سے کام لیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی زندگی کے پیچھے پڑ گئے۔ اور ان کے بارے میں ہر غلط سے غلط حرکت کو انہوں نے اپنا حق سمجھ لیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان سے ان جرائم کا انتقام لیا۔ رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو وہاں سے نکال لیا اور ان پر ایسا عذاب نازل ہوا جس سے ان کی جڑ کٹ کر رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تاریخ کی یہ شہادت یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ ہم نے اپنے رسولوں اور صاحبِ ایمان لوگوں کو کبھی بے بسی کی حالت میں نہیں چھوڑا۔ جب مخالفین کی طرف سے حق کو ختم کرنے کی کوششیں ہوتی ہیں تو پھر ہم اہلِ حق کی مدد کرتے ہیں۔ یہ ہماری سنت ہے۔ اب اگر اہلِ مکہ یا اہلِ عرب نے آپ اور آپ کی دعوت کے ساتھ یہی کچھ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو ہم بھی آپ کی مدد کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا دین غالب آئے گا اور یہ لوگ اپنے بدترین انجام کو پہنچیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے واقعی ایسی ہی مدد فرمائی۔ پورے جزیرۂ عرب میں اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا اور مخالفین کی بڑی تعداد اسلام کی آغوش میں آ گئی یا تحلیل ہوگئی۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾

(اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پس وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلا دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ بارش بادلوں میں سے نکلتی چلی آتی ہے، پس جب وہ اس بارش کو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے تو وہ یکایک خوش ہو جاتے ہیں۔ ۴۸) حالانکہ وہ اس کے نازل کیے جانے سے قبل، اس خوشی سے پہلے، بالکل مایوس تھے۔ ۴۹)

فَتُثِيْرُ سَحَابًا، تُحَرِّكُهٗ، تُنْشِرُهٗ، كِسَفًا، یہ كِسْفَةٌ کی جمع ہے، اس کا معنی ہے ٹکڑا۔ اَلْوَدْقُ، بارش۔

اپنی قدرتِ قاہرہ کی وضاحت ایک مثال سے

گزشتہ آیت میں رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو جو بشارت دی گئی ہے اس میں قطعیت پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر رسول کی مخالفت کرنے والی قوم کو انتقام کا نشانہ بنایا ہے، جب ان کی مخالفت جرم کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اور اس طرح سے اہلِ ایمان کی مدد فرمائی۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اہلِ ایمان کی مدد ہم نے اپنے اوپر لازم کرلی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سنت کے مطابق آنحضرت ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کی بھی مدد کی جائے گی۔ لیکن مسلمان جب حالات کے بگڑے ہوئے تیور دیکھتے تھے اور مسلمانوں کی قلتِ تعداد اور مخالفت کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر نظر جاتی تھی تو اللہ تعالیٰ کے اس وعدے پر اعتماد کے باوجود مسلمانوں کے دل کانپنے لگتے اور دماغوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگتے تو اللہ تعالیٰ نے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ایک مثال کے ذریعے اپنی قدرتِ قاہرہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ حالات کے تابع ہمیشہ انسانوں کی تدبیریں ہوتی ہیں۔ اور وہ حالات کے

Marfat.com

نشیب وفراز کو دیکھتے ہوئے کسی بات کی امید پیدا کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ کوئی بڑی سے بڑی تدبیر بھی اس کی تدبیر اور قدرت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس لیے خشک سالی اور قحط کے زمانے میں چاہے حالات کچھ بھی ہوں لیکن اللہ تعالیٰ جب زمین کی حالت بدلنے کا فیصلہ کرلیتا ہے پھر اس کا پورا پراسیس حرکت میں آتا ہے اور اس کا تجربہ ومشاہدہ ہر شخص بارش کے نزول سے پہلے کرتا ہے۔ وہ پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو اٹھاتی اور ابھارتی ہیں، پھر ان بادلوں کو اپنی حکمت کے مطابق جس طرح چاہتا ہے فضا میں پھیلاتا اور ٹکڑے ٹکڑے کردیتا ہے۔ اور یہ بھی امکان ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہو کہ انہیں تہ بہ تہ کردیتا ہے۔ اب جبکہ آسمان کے منہ پر اور زمین کے سر پر بادلوں کا سائبان تن جاتا ہے اور ایک سناٹے کی کیفیت ہوجاتی ہے جس میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اب کیا ہونے والا ہے کہ اچانک ان بادلوں کے درمیان سے بارش پھوٹ پڑتی ہے اور قطروں پہ قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں۔ اور پھر ایسا بھی نہیں کہ اس بارش پر کسی کا کنٹرول نہ ہو اور یہ جہاں چاہے برس جائے، ایسا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا جہاں حکم ہوتا ہے یا اس کی مشیت ہوتی ہے وہیں بادل پہنچ کر برستا ہے۔ تو بارش کے برسنے کے بعد وہ لوگ جو کل تک ہر طرح کی مایوسیوں کا شکار تھے خوش وخرم ہوجاتے اور خوشیاں منانے لگتے ہیں۔ بالکل اسی طرح مسلمان آج حالات کے دباؤ کے باعث تائید ونصرت کے حوالے سے مایوسی کا شکار ہورہے ہیں۔ یا انہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت بہت بعید دکھائی دیتی ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت بارانِ رحمت کی طرح برسے گی تو مسلمان اس دن شاداں وفرحاں ہوجائیں گے۔

فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

(پس اللہ کی رحمت کے آثار کو دیکھو کہ وہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو کس طرح جلا اٹھاتا ہے، بے شک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۵۰)

بارش سے بعث بعد الموت پر استدلال

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور بارش کا ذکر یکے بعد دیگرے کیا ہے۔ اس میں شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح بارش کے نزول سے مردہ زمین زندہ ہوجاتی ہے، کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اور ہر طرف زندگی کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں اور انسان کی مادی زندگی کے لیے بارش کا نزول رحمت ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح آسمانی وحی کا نزول اور پیغمبروں کی تشریف آوری، اخلاق و روحانیت کی اجڑی ہوئی دنیا کے لیے زندگی کا پیغام بن کر آتی ہے۔ انسان میں انسانیت از سرِ نو پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہے، اقدارِ انسانیت پھلنے پھولنے لگتی ہے، فضائل ومحامد کے پھول کھلنے لگتے ہیں، جو سرزمین جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہوتی ہے وہیں رحمت ومودت اور ہمدردی وغمگساری کی پھوار برسنے لگتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے جہنم جنت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

جو پروردگار بارش کے نزول سے مردہ زمین کو زندہ کرسکتا ہے اور موت کو زندگی میں تبدیل کرسکتا ہے اور آسمانی وحی کے نزول سے انسانیت کو نئی زندگی عطا فرماسکتا ہے۔ اور دو ٹانگوں والے نام نہاد انسان پھر سے شرفِ انسانی کے پیکر بن جاتے ہیں۔ اس کی قدرت سے

Marfat.com

یہ کیا بعید ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کردے۔ ہم بارش سے ظاہری زندگی کو پیدا ہوتے دیکھتے ہیں اور نزولِ وحی سے روحانی اور معنوی زندگی کی نمود دکھائی دینے لگتی ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ جس پروردگار کی قدرت کی یہ شان ہے اور جو ہر لحاظ سے اپنے بندوں کے لیے رحیم و کریم ہے تو اس کی قدرت سے کیا یہ بعید ہے کہ وہ اپنی رحمت کے مقتضیٰ پر التفات فرماتے ہوئے انسانوں کو نئے سرے سے پیدا کرے اور جزاء و سزا کا دن لائے تا کہ اہلِ ایمان اپنی قربانیوں کا صلہ پائیں۔ اور جن جرائم پیشہ لوگوں نے حق کو پامال کیا اور انسانوں پہ ظلم ڈھائے ان کو سزا دے کر انصاف اور عدل کے تقاضوں کو پورا کرے۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿٥١﴾

(اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو اس کے بعد وہ کفر کرتے رہ جائیں گے۔ ۵۱)

ایک استدراک

گزشتہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو حکمت کی جان اور عقیدے کی اصلاح کی کلید ہے۔ کیونکہ انسان مذہب کے غیر مرئی حقائق اور غیب کی باتوں کو صرف اس لیے ماننے سے انکار کردیتا ہے کہ وہ ان کے وقوع کو مستبعد سمجھتا ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقینِ کامل ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی کسی بات کے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اخلاقی زندگی میں بہت سی اخلاقی قدریں ایسی ہیں جن کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل اور بھروسے سے ہے۔ اور اس میں کمزوری صرف اس وقت آتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین کمزور ہوتا ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ جو اللہ مردہ زمین کو زندہ کرنے پر قادر ہے اور آسمانی وحی کے ذریعے انسانی اخلاق و کردار کو جلا بخشنے کی قدرت رکھتا ہے اس کے لیے یہ کیا مشکل ہے کہ وہ ایسی ہوا بھیجے جس سے سرسبز اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں زرد ہو کر ویران ہو جائیں۔ لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کھیتیاں لہلہاتی ہیں اور بارش سے زندگی عود کر آتی ہے تو وہ خوش ہوتے اور خوشیاں مناتے ہیں۔ لیکن جب اس کی قدرت کا ظہور ایسی ہوا کی صورت میں ہوتا ہے جو ہر طرح کی سرسبزی کو جلا دیتی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے لگتے ہیں۔ اگر انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین ہوتا تو بارش کے نزول پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے اور ایسی ناموافق ہوا چلنے پر اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے اور اسی سے بھلائی کی دعا کرتے۔

اس آیت میں شاید اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیامِ رحمت لے کر آتے ہیں تو لوگ اس نعمت کی قدر کرنے کی بجائے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کے کفر کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشیں اترتی ہیں تو اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر کیا ہوتا تو وہ اس ابتلاء سے بچے رہتے۔ لیکن جب ان کے اپنے کرتوتوں کے باعث ان پر آزمائشیں آئیں تو بجائے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے کے زبانِ طعن دراز کرنے لگے۔ جن لوگوں کے تلون کا یہ عالم ہو ان سے کسی خیر کی توقع کرنا عبث ہے۔ اس سے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ ان لوگوں کے طرزِ عمل سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ اور وہ وقت دور نہیں جب آپ کے کام کے نتائج آپ کے سامنے ہوں گے۔

Marfat.com

فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِھٰدِ الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِھِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾

(اے پیغمبر! آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے، اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جا رہے ہیں۔ ۵۲) اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ دکھا سکتے ہیں، آپ تو بس ان کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائیں، پس وہی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ۵۳)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

انسان کو حیوان پر جو شرف حاصل ہے وہ دو وجہ سے ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فی الجملہ آزادیٔ عمل اور آزادیٔ رائے عطا کی ہے جو حیوان کو میسر نہیں۔ جب یہ اپنی آزادی سے کام لے کر کوئی فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر اس فیصلے کی تکمیل کے لیے اپنے حواس سے بھی کام لیتا ہے اور اپنی عقل کو بھی استعمال کرتا ہے لیکن جب فیصلہ کرنے میں غلطی کرتا ہے تو جن حواس سے حیوان اپنے معمولات کو انجام دینے کے لیے کام لیتا ہے یہ انہیں بھی معطل کر دیتا ہے اور یا ان سے غلط کام لیتا ہے۔

اس کے شرفِ فضیلت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حواس اور عقل کے علاوہ قلبی بصیرت بھی عطا کی ہے۔ اسے محبت و خشیت کا مرکز بنایا ہے، اسی میں مکارمِ اخلاق پلتے ہیں، اور اس میں وہ کیفیات جنم لیتی ہیں جن کی وجہ سے اس کے اندر ایک ایسی نورانیت پیدا ہوتی ہے جس کی برکت سے وہ فرشتوں سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے اس عظیم عطیے کو ضائع کر دیا جائے تو نہ اس میں ایمان کا نور روشنی دیتا ہے نہ اس میں محبت و خشیت کا چراغ روشن ہوتا ہے، نہ اس میں ہمدردی و غمگساری اور جانفروشی اور جانسپاری اور ایثار و استقامت کے فضائل پیدا ہوتے ہیں اور نہ اس میں وہ کیفیات جنم لیتی ہیں جن کے نتیجے میں انسان کو نورِ بصیرت عطا ہوتا ہے۔ تو پھر یہ دل ایک مردہ دل ہے جس میں کوئی ہدایت اثر انداز نہیں ہوتی، کوئی نصیحت کام نہیں کرتی، اور کسی اخلاقی خوبی کا شعور پیدا نہیں ہوتا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے انس سے پیدا کیا ہے۔ انسانوں کی محبت اس کی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن کتنے ایسے لوگ ہیں جو انسانوں کا خون بہا کر شرفِ انسانیت کو ذلیل کر کے اور مکارمِ اخلاق کی پامالی کو اپنی زندگی کی کامیابی سمجھتے ہیں۔ انہیں انسان کی تکلیف سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ راحت ملتی ہے۔ اور کسی اخلاقی قدر کی مخالفت کرتے ہوئے انہیں کوئی اچنبھا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایک بڑے آدمی نے جب اپنے بیٹے کے ولیمے پر رقص کا انتظام کیا تو بعض قریبی عزیزوں نے ٹوکا۔ تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ رقص کوئی بازاری عورتوں سے نہیں کرایا جائے گا بلکہ اپنی بہو بیٹیاں ناچیں گی، اس میں خرابی کی کیا بات ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ دل کی پاکیزگی جب رخصت ہو جاتی ہے تو کیسی کیسی عجیب باتیں ظہور میں آتی ہیں۔

پیشِ نظر دونوں آیتوں میں انہیں حقائق کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ قریش اور اہلِ مکہ اگر آپ پر ایمان نہیں لاتے اور آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تو آپ اس پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ

Marfat.com

ان کے دل مردہ ہو چکے ہیں۔ دل کی زندگی جن چیزوں سے عبارت ہے یہ اس سے تہی دامن ہو چکے ہیں۔ اس لیے جب آپ اُن باتوں کی دعوت دیتے ہیں جن کا تعلق دل کی پاکیزگی اور دل کے شعور سے ہے تو یہ لوگ اس کا ادراک کرنے سے ہی عاجز ہیں، اسے قبول کیسے کریں گے۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اور پھر تنبیہ کرتے ہوئے کہا:

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو حواس کے صحیح استعمال سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ لیکن غلط فیصلے کے نتیجے میں انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ حواس کو استعمال کرنے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ چونکہ مردہ دل ہیں آپ کی نصیحت ان کے دلوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور اسی طرح ان کے غلط فیصلوں کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ آپ کی کسی بات کو سننے کے بھی روادار نہیں۔ بلکہ جب آپ ان کو کوئی بات سنانا چاہتے ہیں تو یہ پشت پھیر کر بھاگ نکلتے ہیں، بلکہ آپ کو دیکھتے ہی انہیں اعراض کا دورہ پڑتا ہے۔ تو اگر یہ لوگ سنتے تو شاید اس کا کوئی بہتر نتیجہ نکل سکتا۔ لیکن یہ تو سننے ہی سے انکاری ہیں۔ تو ایسے لوگوں کو آپ بات کیسے سنائیں گے اور کیسے ہدایت دیں گے۔

نگاہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے صحیح کام لینے کی کوشش کرے تو ہدایت تک پہنچنا مشکل نہیں۔ لیکن ان کفار کا حال یہ ہے کہ یہ ہر صحیح بات کو دیکھنے سے اندھے ہو چکے ہیں۔ ایسے لوگ جو دل کے نور سے بھی محروم ہیں اور سماع کی قوت سے بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اعراض کی جسارت بھی رکھتے ہیں اور مزید یہ کہ انہوں نے ہر صحیح بات دیکھنے سے انکار کو اپنی روش بنالیا ہے۔ ایسے لوگوں کو ہدایت کی نہ تو کوئی بات سنائی جاسکتی ہے اور نہ انہیں گمراہی سے روک کر ہدایت کا راستہ دکھایا جاسکتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگ اگر آپ کی بات سننے اور قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو اس کی ذمہ داری سراسر ان پر ہے، انہوں نے مسلسل ہٹ دھرمی اور انکار کی وجہ سے اپنی صلاحیتیں کھودی ہیں۔ تو آپ ان سے کسی قسم کی توقع نہ رکھیں۔ کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دے رہے ہیں جس میں پوری زندگی کی تبدیلی کی دعوت ہے۔ ایک ایسے انقلاب کی دعوت ہے جو انسان کو نئے سرے سے انسان بناتا اور انسانی معاشرے کو نیا اسلوب عطا کرتا ہے۔ ایسی دعوت کو صرف وہ لوگ سن سکتے ہیں اور آپ بھی انہیں کو سنا سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین رکھتے ہوں۔ جو اللہ تعالیٰ کی قدرت، رحمت اور اس کے عدل کی ان نشانیوں کو مانتے ہوں جو آفاق وانفس میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور جو ان کو نہ مانتے ہوں انہیں سمجھانے کی کوشش کرنا بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے۔

سیاقِ کلام کے مطابق جو بات واضح ہوتی ہے ہم نے اختصار سے اسے عرض کرنے کی کوشش کی۔ البتہ بعض مفسرین نے اس موقع پر سماعِ موتی کی بحث چھیڑی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے ایک مختصر سا نوٹ لکھا ہے، ہم اسے نقل کر رہے ہیں۔

Marfat.com

سماعِ موتیٰ پر استشہاد

اس مسئلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد سے اختلاف چلا آتا ہے۔ اور دونوں جانب سے نصوص قرآن وحدیث پیش کی گئی ہیں۔ یہاں ایک بات سمجھ لو کہ یوں تو دنیا میں کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ کے بدون نہیں ہوسکتا مگر آدمی جو کام اسباب عادیہ کے دائرہ میں رہ کر باختیار خود کرے وہ اس کی طرف منسوب ہوتا ہے اور جو عام عادت کے خلاف غیر معمولی طریقہ سے ہوجائے اسے براہ راست حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ مثلاً کسی نے گولی مار کر کسی کو ہلاک کردیا یہ اس قاتل کا فعل کہلائے گا اور فرض کیجئے ایک مٹھی کنکریاں پھینکیں جس سے لشکر تباہ ہوگیا، اسے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے تباہ کردیا باوجودیکہ گولی سے ہلاک کرنا بھی اسی کی قدرت کا کام ہے ورنہ اس کی مشیت کے بدون گولی یا گولہ کچھ بھی اثر نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰـكِنَّ اللّٰـهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (انفال رکوع ۲) یہاں خارق عادت ہونے کی وجہ سے پیغمبر اور مسلمانوں سے "قتل" "رمی" کی نفی کرکے براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی۔ ٹھیک اسی طرح اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى کا مطلب سمجھو۔ یعنی تم یہ نہیں کرسکتے کہ کچھ بولو اور اپنی آواز مردے کو سنا دو۔ کیونکہ یہ چیز ظاہری اور عادی اسباب کے خلاف ہے۔ البتہ حق تعالیٰ کی قدرت سے ظاہری اسباب کے خلاف تمہاری کوئی بات مردہ سن لے اس کا انکار کوئی مومن نہیں کرسکتا۔ اب نصوص سے جن باتوں کا اس غیر معمولی طریقہ سے سننا ثابت ہوجائے گا اسی حد تک ہم کو سماع موتی کا قائل ہونا چاہیے۔ محض قیاس کرکے دوسری باتوں کو سمع کے تحت میں نہیں لاسکتے۔ بہرحال آیت میں "اسماع" کی نفی سے مطلقاً سماع کی نفی نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ
قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ
وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬
مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ
اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ ؗ
فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ
الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا

Marfat.com

لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍؕ وَ لَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

رکوع: ۶۔ (اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت بخشی، پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا، وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ سب کچھ جاننے والا ہے، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ۵۴) اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں۔ اسی طرح ان کی عقلیں اوندھی ہو جاتی رہی ہیں۔ ۵۵) جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم قیامت تک رہے ہو، سو یہ حشر کا دن ہے لیکن تم جانتے نہیں تھے۔ ۵۶) پس اس دن ان لوگوں کو ان کی عذر خواہی کچھ نفع نہ دے گی جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوگا اور نہ ان سے یہ کہا جائے گا کہ وہ اللہ کو راضی کریں۔ ۵۷) ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثال بیان کی ہے، اور اگر آپ ان کے پاس کوئی نشانی بھی لے آئیں تو جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ ۵۸) اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر کر دیا کرتا ہے ان لوگوں کے دلوں پر جو جاننا نہیں چاہتے۔ ۵۹) پس اے پیغمبر! آپ صبر کریں، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور ہرگز ہلکا نہ پائیں آپ کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔ ۶۰)

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةًؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾

(اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت بخشی، پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا، وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ سب کچھ جاننے والا ہے، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ۵۴)

توحید، قدرتِ قاہرہ اور قیامت پر دلیل

یہ سورۃ کا آخری رکوع ہے۔ اس لیے اب تک قرآنِ کریم نے جن مباحث پر دلائل پیش کیے ہیں انہیں نہایت احسن طریق سے سمیٹتے ہوئے یکجا صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل بھی ہے، اس کی بے پناہ قدرت کا اثبات بھی ہے، اس کے وسیع علم کا حوالہ بھی ہے اور انسان کی بے بسی اور بے بصیرتی کا ذکر بھی ہے اور اسی سے قیامت اور آخرت کے آنے کی طرف اشارہ بھی

Marfat.com

ہے۔فرمایا یہ جارہا ہے کہ تم اپنے اللہ کے بارے میں کیسی حماقتوں کا ارتکاب کرتے ہو۔کبھی کسی کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو،کبھی اس کی قدرت کی ناتمامی کے وہم میں پڑ جاتے ہو اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی صفات بہت سی قوتوں کو تفویض کردیتے ہو،کبھی اس کی قدرتوں کا صحیح ادراک نہ کرنے کے باعث بعث بعد الموت کو مستبعد از عقل سمجھتے ہو۔اور کبھی اپنے بارے میں غلط اندازے لگاتے ہوئے عجیب وغریب دعوے کرنے لگتے ہو۔حالانکہ تمہاری بے بسی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حال یہ ہے کہ اس نے تمہیں ناتوانی سے پیدا کیا۔اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تمہاری تخلیق ایک حقیر پانی کے قطرے سے کی۔اور پھر کس طرح رحم مادر میں تم عرصۂ دراز تک مختلف حالتوں میں رہے ہو،اور پھر تم زمین پر اس حال میں آئے کہ تم بے بسی کی منہ بولتی تصویر تھے۔اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اس حال میں پیدا کیا کہ جب تمہیں اس نے ماں کے پیٹ سے نکالا تو تم کچھ نہیں جانتے تھے۔تمہارے حواس تک معطل تھے اور تم اس حد تک بے بس تھے کہ مرغی کا بچہ بھی تم سے زیادہ احساس رکھتا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ اس نے رحمِ مادر میں بھی تمہیں خوبصورت شکل دی۔خون کی غذا دے کر تمہاری افزائش کی۔اور پھر زمین پر لا کر تمہاری زندگی کے تمام امکانات پیدا فرمائے اور افزائش کے اسباب پیدا کیے۔اور تمہاری ناتوانی کو رفتہ رفتہ توانائی میں تبدیل کیا۔چند ہی سالوں میں تم دوڑنے بھاگنے،کھیلنے کودنے اور لکھنے پڑھنے کے قابل ہوگئے۔پھر اس قوت میں مزید اضافہ کیا اور تمہیں جوانی کی توانائیاں اور صلاحیتیں بخشیں،تمہاری شریانوں میں خون کی جگہ پارہ دوڑنے لگا،تمہاری دماغی رعنائیاں ایجاد واختراع کی نئی دنیا بسانے لگیں،تمہاری قوت نے جغرافیے بدلے،نئی تاریخ بنائی اور دنیا کو علم وہنر سے بھر دیا۔لیکن پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت نے تمہاری یہ ساری قوتیں زوال کے راستے پر ڈال دیں۔تم سب کچھ پا کر اس کو باقی رکھنے پر قادر نہ رہے۔اور بڑھاپے میں اسی ناتوانی کی حالت میں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔کیا اس میں ہر قدم پر تمہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا علم نظر نہیں آتا۔اور ساتھ ہی ساتھ تمہیں اپنی ذات کا تلون،فکری ناتوانی اور اکثر غلط فیصلوں کو صحیح سمجھنے کی حماقت کا احساس نہیں ہوتا۔اور تمہیں اس بات کا یقین نہیں پیدا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق میں کسی کی معاونت کا محتاج نہیں،وہ جو چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔اس کے علم کی وسعتوں کو کوئی نہیں نہیں پہنچ سکتا۔اور اس کی قدرتوں کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾

(اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں۔اسی طرح ان کی عقلیں اوندھی ہوجاتی رہی ہیں۔ ۵۵)

قیامت میں مجرمین کی کیفیت

قریش کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ جب انہیں نبی کریم ﷺ قیامت کے دن سے ڈراتے ہیں کہ یہ دنیا ہمیشہ نہیں رہے گی ایک دن اس دنیا کی صف لپیٹی جانے والی ہے۔قیامت برپا ہوگی اور سب لوگ اپنی اپنی قبروں سے نکل کر زندگی بھر کے اعمال کی جواب دہی کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے۔وہاں نہ دولت کام آئے گی نہ کوئی انسانی جتھا کام آئے گا۔ایمان وعمل کی بنیاد پر جزاء وسزا کا فیصلہ ہوگا۔تم نے آج اگر اس کے لیے تیاری نہ کی تو سوچ لو اس دن کیا کرو گے۔تو وہ جواب میں کہتے کہ اولاً تو قیامت آئے گی ہی نہیں اور اگر آئی بھی تو ابھی اس کے آنے میں لامحدود زمانہ حائل ہے۔تو جو واقعہ ایک طویل زمانے کے بعد ہونے والا ہے ہم آج ہی اس کے لیے فکرمند ہو کر اپنی زندگی کو

Marfat.com

بدرنگ کیسے کرلیں۔اور اپنا عیش مکدر کیسے کرلیں۔ان سے فرمایا جارہا ہے کہ یہ سراسر تمہاری کم عقلی اور علمی کم مائیگی ہے جس کی وجہ سے تمہیں قیامت کے بارے میں فکرمندی پیدا نہیں ہورہی۔تم ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھتے ہو،ان کے جنازے اٹھتے ہیں،انہیں لحد میں اتارا جاتا ہے۔تو جو شخص لحد میں اتر گیا اس کی زندگی اور زندگی کے اعمال ختم ہوگئے۔گویا اس کی قیامت آگئی۔اب وہ اپنے اعمال کی نہ اصلاح کرسکتا ہے اور نہ اس میں اضافہ کرسکتا ہے۔اسے جب بھی قیامت کے لیے اٹھایا جائے گا اسے اس سے کیا فرق پڑے گا کہ وہ جلدی اٹھایا گیا ہے یا دیر سے۔لیکن مشرکین اور گمراہ لوگوں کی سوچ ہمیشہ یہی رہی کہ ہم اتنا عرصہ پیشتر ایک موہوم واقعہ کے لیے فکرمند نہیں ہوسکتے۔ابھی تو ایک زمانہ پڑا ہے،جب حشر کا دن آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کی حماقت پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ آج تو تم قیامت کے ظہور کو بہت دور سمجھتے ہو،تمہارے خیال میں زندگی،موت،برزخ اور حشر ونشر کے بہت طویل مراحل راستے میں حائل ہیں۔لیکن قیامت کے دن جب تمہیں اٹھایا جائے گا تو اس وقت تمہارا حال یہ ہوگا کہ تم قسمیں کھا کھا کر آپس میں کہو گے کہ ہمارا یہ سارا زمانہ جو گزرا ہے ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔ہم تو ابھی سوئے تھے،نہ جانے ہمیں کیوں اٹھا دیا گیا۔آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ تمہاری عقلوں کے اوندھے ہوجانے کا نتیجہ ہے۔تم دنیا کی زندگی میں بھی دھوکہ کھاتے رہے ہو اور اب بھی تم فریب کا شکار ہو۔نہ دنیا کی زندگی بہت طویل تھی اور نہ اب تم بہت جلدی اٹھائے گئے ہو۔اصل حقائق کا اندازہ کرنے کی توفیق سے جس طرح تم دنیا میں محروم تھے،آج بھی محروم ہو۔اس لیے بہتر یہ ہے کہ اپنی فکری بےبسی اور کم مائیگی کا احساس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لاؤ تاکہ تمہیں وہ ان حقائق سے بہرہ ور کرے جن کے سمجھنے سے تم قاصر ہو۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٥٦﴾

(جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم قیامت تک رہے ہو، سو یہ حشر کا دن ہے لیکن تم جانتے نہیں تھے۔ ۵۶)

صاحب ایمان وعلم کی ہوشمندی

مجرم لوگ جب قسمیں کھا کھا کر یہ کہیں گے کہ ہم تو دنیا یا برزخ میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے تو آخر آج ہم سے یہ لمبا چوڑا حساب کیوں لیا جارہا ہے۔تو وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایمان نصیب ہوا،یعنی وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ موت کی حقیقت کیا ہے اور مرنے کے بعد کیا ہوگا اور کیا قیامت برپا ہوگی یا نہیں اور آخرت کی حقیقت کیا ہے۔ان حقائق کا جواب عقل کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کا صحیح جواب وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر نازل کیا ہے اور آج نبی کریم ﷺ اسی علم کے حوالے سے آخری رسول بن کر آئے ہیں۔ہمیں اسی علم سے اپنے آپ کو بہرہ ور کرنا ہے اور اسی کے مطابق زندگی کو سنوارنا ہے۔یہ ایمان اور علم جن لوگوں کو نصیب ہوگیا دنیا میں ان کی عقلیں بھی سلامت رہیں اور ان کی زندگی کے تمام معاملات بھی ٹھیک نہج پر چلتے رہے۔اور یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قیامت کے دن کسی گھبراہٹ اور پریشانی سے واسطہ نہیں پڑے گا۔وہ ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے کہیں گے کہ تم نے دنیا میں بھی غلط

Marfat.com

اندازے لگائے کہ یہ دنیا بہت طویل ہے اور قیامت کبھی نہیں آئے گی۔ اور آج بھی تم اسی خواب پریشاں میں گھوم رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا وہ نوشتہ جو لوحِ محفوظ کہلاتا ہے اس کی رو سے آج کا دن قیامت کا دن ہے اور تم اس قیامت تک عالمِ برزخ میں رہے ہو۔ لیکن تم چونکہ عالمِ غیب کے اس علم سے بے بہرہ رہے ہو اور پیغمبر کی بات کبھی تم نے سن کر نہ دی۔ اور اگر کبھی سنی تو اس پر یقین نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم دنیا میں بھی ہر فیصلہ غلط کرتے رہے ہو اور آج بھی تم غلط اندازے لگا رہے ہو۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٥٧﴾

(پس اس دن ان لوگوں کو ان کی عذر خواہی کچھ نفع نہ دے گی جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوگا اور نہ ان سے یہ کہا جائے گا کہ وہ اللہ کو راضی کریں۔ ۵۷)

قیامت یوم الجزاء ہے کسی عمل کا موقع نہیں

جن لوگوں نے دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے حقوق سے انکار کر کے اپنے اوپر ظلم کیا اور اپنے مقصدِ زندگی کے حوالے سے قدم قدم پر غلطیاں کیں۔ انہیں جب قیامت کا یقین ہو جائے گا کہ واقعی آج کا دن وہی دن ہے جس میں ہمیں اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے اور ہم سے ہماری ہر زیادتی اور ہر کوتاہی کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی تو تب ان کی انتہائی خواہش ہوگی کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے حضور معذرت کرنے کا موقع ملے۔ اور کسی طرح معافی مانگ کر رو دھو کر اپنے اللہ کو راضی کر لیں۔ اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ ہزار معذرت کی کوشش کریں اللہ تعالیٰ ان کی معذرت اور عذر خواہی کو قبول نہیں کرے گا اور ان کی پشیمانی انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ اور نہ ان سے یہ چاہا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کریں کیونکہ ان باتوں کا موقع انہیں دنیا میں دیا جا چکا ہے۔ آج تو بدلے کا دن ہے، کام کا وقت تو گزر چکا اور غلطیوں پر معافی کا موقع بھی جاتا رہا۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَلَئِن جِئْتَهُم بِآيَةٍ لَّيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ﴿٥٨﴾

(ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثال بیان کی ہے، اور اگر آپ ان کے پاس کوئی نشانی بھی لے آئیں تو جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ ۵۸)

ہدایت کی ہر بات قرآن نے بیان کر دی ہے، منکرین نشانی دیکھ کر بھی ہدایت قبول نہیں کرتے

معاندین کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے رسول انہیں ایمان کی دعوت دیتے اور زندگی کے وہ حقائق بیان کرتے جنہیں تسلیم کرنے سے ان کی دنیا اور عاقبت سنور سکتی ہے تو وہ بجائے اس پر غور کرنے کے کسی نہ کسی نشانی اور معجزے کی طلب شروع کر دیتے۔ یہی طریقہ قریش کا بھی تھا۔ وہ آنحضرت ﷺ سے عجیب و غریب اور نئے سے نئے معجزے کا تقاضا کرتے تھے۔ سورۃ کے آخر میں نہایت قطعی اور محکم انداز میں فرمایا گیا ہے کہ غلط زندگی سے نکل کر صحیح زندگی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے، دلائل کو پرکھنے کی زحمت کرنا پڑتی ہے،

Marfat.com

پیغمبر کی دعوت کو سمجھنے اور اس پر اطمینان پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کے لیے افہام و تفہیم اور دلیل و شواہد کی دنیا میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ معجزات دیکھ کر یا حیران کن اور چونکا دینے والی نشانیوں سے زندگی میں تبدیلی نہیں آتی۔ چنانچہ اس ضرورت کو اللہ تعالیٰ نے تسلیم فرمایا اور اس کے لیے جیسی تعلیمات جیسے دلائل جیسی ترغیب و نصیحت کی ضرورت تھی قرآن نے ان میں سے ہر چیز کو مثالوں کے ذریعے سے واضح فرمایا اور ہر بات کو مختلف پیرایوں مختلف طریقوں سے دماغوں میں اتارنے کی کوشش فرمائی۔ لیکن قریش اور دیگر اہلِ مکہ بجائے اس سے مستفید ہونے کے اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور آپ کی مسلسل دعوت کے جواب میں نئے نئے معجزات طلب کرتے رہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے اور مخالفین پر اتمامِ حجت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ افہام و تفہیم کی ضرورت تو پوری ہو چکی، رہی کسی نئی نشانی کی بات تو اگر آپ ان کے سامنے کوئی ایسی نشانی بھی لے آئیں گے جو بہت چونکا دینے والی ہو، تو جن لوگوں نے نہ ماننے کی قسم کھا رکھی ہے وہ اسے باطل قرار دیں گے، یعنی اسے جادو کہیں گے، شعبدہ بازی قرار دیں گے یا کوئی اور ایسی بات جس سے وہ سننے والوں کو مطمئن کر سکیں۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾

(اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر کر دیا کرتا ہے ان لوگوں کے دلوں پر جو جاننا نہیں چاہتے۔ ۵۹)

ہٹ دھرمی دلوں پر مہر کا باعث بنتی ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب لوگ کسی بات کو سننے اور سمجھنے کی بجائے ہٹ دھرمی کا طریقہ اختیار کر لیتے ہیں اور معقولیت کی بجائے جہالت کا طرز اپنا لیتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سمع و بصر اور دماغ و دل سے بہرہ ور فرمایا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔ یعنی قبولیتِ ایمان اور حق کو سمجھنے کی صلاحیت ان سے سلب کر لی جاتی ہے۔ اب اگر کوئی داعی ان سے بات کرے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی دیوار سے مخاطب ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

(پس اے پیغمبر! آپ صبر کریں، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور ہرگز ہلکا نہ پائیں آپ کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔ ۶۰)

دعوت کے راستے کی فیصلہ کن ہدایت

آیتِ کریمہ میں خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ سے ہے لیکن روئے سخن صحابہ کرامؓ سے لے کر قیامت تک آپؐ کی امت کی طرف ہے۔ کیونکہ حق و باطل کی جس کشمکش سے آنحضرت ﷺ اور آپؐ پر ایمان لانے والے گزر رہے تھے وہ آپ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہر دور میں یہ کشمکش جاری رہے گی۔ اہلِ حق کو ہر طرح کے حالات سے سابقہ پیش آتا رہے گا۔ کیونکہ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

Marfat.com

آنحضرت ﷺ تو صبر واستقامت میں بے مثال تھے اور صحابہ کرامؓ بھی بہت حد تک آپؐ کی تصویر تھے۔ بعد کے آنے والی امت سے فرمایا جارہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش اور مسلمانوں اور کافروں کی لڑائی اور آئے دن کے فتنوں کے طوفانوں میں دیکھنا کبھی کمزوری نہ دکھانا۔ حالات کیسے بھی ناگفتہ بہ ہوں اور اہلِ کفر کی قوتیں کیسی ہی منہ زور کیوں نہ ہوں کبھی ان کے سامنے کمزوری کا اظہار نہ ہونے دینا۔ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی اہلِ حق کا شیوہ ہونا چاہیے۔ تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے پر چلنے والوں کو کامیابی و کامرانی کی نوید دی ہے اور ہمیشہ غالب رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کے وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے اور حق کی تصویر بن کر ایمان و عمل کی شمع کی روشنی میں باطل کے مقابلے کے لیے نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی سرنگوں نہیں ہونے دے گا۔ مزید فرمایا کہ ہر دور کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انسان یقین کی دولت سے محروم ہوجاتا ہے۔ شرک اس کے عقیدے کی قوت کو تلپٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ حُبِ دنیا اور ضروریاتِ زندگی کے مقصد بن جانے کے باعث انسانوں کا باہمی اعتماد اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ رزاقیت پر یقین ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ لوگ بجائے اس کے کہ اپنی اس کمزوری کا ادراک کریں وہ ہر اس قوت کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو انہیں یقین کی طرف دعوت دیتی ہے۔ اور شیطانی قوتیں یہ سمجھتی ہیں کہ اگر اس شمع کو بجھایا نہ گیا تو ایک دن اس کی روشنی شکوک و شبہات کے تمام اندھیروں کو ختم کر کے رکھ دے گی۔ اس لیے آنحضرت ﷺ سے براہ راست فرمایا جارہا ہے وَلَا یَسْتَخِفَّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ۔ مولانا مودودی اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> دشمن تم کو ایسا کمزور نہ پائیں کہ ان کے شور و غوغا سے تم دب جاؤ، یا ان کی بہتان و افترا کی مہم سے تم مرعوب ہوجاؤ، یا ان کی پھبتیوں اور طعنوں اور تضحیک و استہزاء سے تم پست ہمت ہوجاؤ، یا ان کی دھمکیوں اور طاقت کے مظاہروں اور ظلم و ستم سے تم ڈر جاؤ، یا ان کے دیے ہوئے لالچوں سے تم پھسل جاؤ، یا قومی مفاد کے نام پر جو اپیلیں وہ تم سے کر رہے ہیں ان کی بنا پر تم ان کے ساتھ مصالحت کر لینے پر اتر آؤ۔ اس کے بجائے وہ تم کو اپنے مقصد کے شعور میں اتنا ہوشمند، اور اپنے یقین و ایمان میں اتنا پختہ اور اس عزم میں اتنا راسخ اور اپنے کیرکٹر میں اتنا مضبوط پائیں کہ نہ کسی خوف سے تمہیں ڈرایا جاسکے، نہ کسی قیمت پر تمہیں خریدا جاسکے، نہ کسی فریب سے تم کو پھسلایا جاسکے، نہ کوئی خطرہ یا نقصان یا تکلیف تمہیں اپنی راہ سے ہٹا سکے اور نہ دین کے معاملہ میں کسی لین دین کا سودا تم سے چکایا جاسکے۔ یہ سارا مضمون اللہ تعالیٰ کے کلام بلاغت نظام نے اس ذرا سے فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ "یہ بے یقین لوگ تم کو ہلکا نہ پائیں۔" اب اس بات کا ثبوت تاریخ کی بے لاگ شہادت دیتی ہے کہ نبی کریم ﷺ دنیا پر ویسے ہی بھاری ثابت ہوئے جیسا اللہ تعالیٰ اپنے آخری نبیؐ کو بھاری بھرکم دیکھنا چاہتا تھا۔ آپ سے جس نے جس میدان میں بھی زور آزمائی کی اس نے اسی میدان میں مات کھائی اور آخر اس شخصیت عظمیٰ نے وہ انقلاب برپا کر کے دکھا دیا جسے روکنے کے لیے عرب کے کفر و شرک نے اپنی ساری طاقت صرف کر دی اور اپنے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ

(۳۱)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام لقمان ہے۔ اس سورۃ میں حکیم لقمان نے جو نصیحتیں اپنے بیٹے کو کی تھیں وہ نقل کی گئی ہیں۔ اس مناسبت سے اس کا نام لقمان رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول:۔ یہ نبوت کے مکی دور کے وسط میں نازل ہوئی۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب قریش کی طرف سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو روکنے کے لیے جبر وظلم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور ایمان لانے والوں کو ہراساں کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے تھے۔ اس میں نئے مسلمان ہونے والے نوجوانوں کو بتایا گیا ہے کہ ہر چند اسلام نے والدین کو بہت حقوق دیے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بعد انہیں کے حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ اگر وہ اپنے بچوں کو اسلام قبول کرنے سے روکیں اور اپنے حقوق کے حوالے سے یہ دعویٰ کریں کہ تم پر چونکہ ہماری اطاعت فرض ہے اس لیے اگر ہماری اجازت کے بغیر تم اسلام قبول کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے ہمارا حق ضائع کیا اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کے یہاں مجرم ہو گئے۔ اس طرح سے اگر وہ تمہیں شرک کرنے پر مجبور کریں تو ان کی اطاعت ہرگز نہ کی جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات سورۃ العنکبوت میں بھی کہی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سورتیں ایک ہی دور میں نازل ہوئی ہیں۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں اولیت کس کو حاصل ہے۔ لیکن قرآنی ترتیب میں چونکہ سورۃ العنکبوت کو پہلے رکھا گیا ہے اس لیے یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ سورۃ العنکبوت سورۃ لقمان سے پہلے نازل ہوئی ہوگی۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سب سے پہلے اس کتاب کی اہمیت کو ذکر فرمایا گیا ہے جس کا تعلق اس کے مضامین سے بھی ہے اور عملی زندگی میں اس کے نفاذ سے بھی۔ پھر اسے ہدایت و رحمت قرار دے کر اس کی اہمیت کو مزید نمایاں کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ ایسی پُر از حکمت کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے چند شرائط پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اور یہ وہی شرائط یا صفات ہیں جن کا ذکر سورۃ البقرۃ کے آغاز میں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد حکیم لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی تھیں ان کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت میں جس طرح توحید پر زور اور شرک کی مذمت پر اصرار کیا گیا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ جس کو بھی اللہ تعالیٰ نے عقلِ سلیم عطا فرمائی ہے اس نے ہمیشہ اس حقیقت کا نہ صرف اقرار کیا بلکہ جہاں تک اس سے ہو سکا دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ کیونکہ توحید کی دعوت در حقیقت فطرتِ سلیم کی دعوت ہے۔ اور عقلِ سلیم فطرتِ سلیم کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں در حقیقت

Marfat.com

وہ اپنی فطرت سے جنگ لڑتے ہیں۔ مزید آں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توحید کی دعوت دیارِ عرب میں کوئی نئی بات نہیں۔ ماضی میں بھی ایسے سچے دانشور گزرے ہیں جنہوں نے اسے حکمت و دانش کا تقاضا سمجھا ہے۔ اور انہوں نے وہی باتیں کہی تھیں جو آج نبی کریم ﷺ فرما رہے ہیں۔ انہیں میں لقمان نام کے حکیم بھی تھے۔ وہ اگرچہ کوئی بڑی نسبی شرافت نہیں رکھتے تھے۔ سیاہ رنگ اور واجبی سی شکل کے مالک تھے، لیکن اپنے علم و دانش اور حکمت کی وجہ سے عرب بھر میں ان کا شہرہ تھا۔ لوگ ہمیشہ ان کے نصائح اور اقوال کو بڑی عزت واحترام سے نقل کرتے اور بڑی اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو جن باتوں کی نصیحت کی تھی وہ وہی باتیں ہیں جن کی دعوت قرآنِ کریم دے رہا ہے۔ انہوں نے توحید پر زور دیا اور شرک کی مذمت کی اور شرک کو ظلمِ عظیم قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر نہیں، البتہ حکمت و دانش سے اس کو حصۂ وافر ملا ہے اور عرب کے لوگ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ وہ جب ان باتوں پر زور دیتا ہے جو قرآنِ کریم اور نبی کریم ﷺ کی دعوت کی بنیاد ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عقلِ سلیم اسی دعوت کے حق میں ہے۔ جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ در حقیقت عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیم سے نبرد آزما ہیں۔

نوجوانوں میں سے جب کوئی آنحضرت ﷺ کی دعوت پر ایمان لاتا تھا تو قبیلے کے بڑے بوڑھے اسے بلا کر سمجھاتے کہ ہر مذہب نے ماں باپ کے حقوق کو تسلیم کیا ہے اور بڑوں کا احترام سکھایا ہے۔ ہم تمہیں اس حق کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی دعوت کو قبول مت کرو۔ اس سورۃ میں قرآنِ کریم نے یہ دکھایا ہے کہ تم نوجوانوں کو اسلام کی جن تعلیمات سے روکتے ہو، لقمان نے اپنے بیٹے کو انہیں باتوں پر کاربند رہنے کی نہایت دلسوزی سے نصیحت کی تھی۔ تم خود اندازہ کرو کہ تمہارا رویہ خود علم و حکمت سے بھی دشمنی کے مترادف ہے۔

مزید فرمایا گیا ہے کہ انسان کو جتنی بھی ظاہر اور باطنی نعمتیں میسر ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا انکار مشرکین کو بھی نہیں۔ لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ ان باتوں کے اعتراف کے باوجود توحید کو ماننے سے انکار کرتے اور شرک پر اصرار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ اور جب انہیں آنحضرت ﷺ کی دعوت یا لقمان جیسے کسی حکیم کی حکمت کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ بڑے پندار کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اپنے باپ دادا کے طریقے کی پیروی کریں گے۔ چاہے ان کے باپ دادا شیطان کے پیروکار ہی کیوں نہ رہے ہوں۔

مخالفین کی تردید میں خود ان کے اعترافات سے استدلال کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ تمام آسمان وزمین کا خالق اللہ ہی ہے۔ ہر چیز اس کے قبضۂ تصرف میں ہے۔ وہ ہر ایک سے بے نیاز ہے، اس کو اس بات کی قطعاً حاجت نہیں کہ کوئی کسی کام میں اس کا ہاتھ بٹھائے، وہ خود ستودہ صفات ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ اس کے سوا شکر کا مستحق اور کون ہوسکتا ہے جبکہ اس کی قدرت وحکمت کی نشانیاں اس قدر تمہارے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ہیں کہ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر مزید سات سمندروں کے اضافے کے ساتھ روشنائی بن جائیں، جب بھی اس کی تمام نشانیوں کو قلمبند کرنا ممکن نہیں۔

آخر میں کشتی کی تمثیل سے مخالفین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تمہیں جو کچھ حاصل ہے اس کا حق یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بنو، اور اس دن کو یاد رکھو جس دن نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آسکے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے۔ اس دن کا آنا ایک امرِ قطعی ہے۔ تمہیں اس کی حقیقی فکر کرنا چاہیے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۳۴	سُوْرَةُ لُقْمٰنَ مَكِّيَّةٌ (۳۱)	رُكُوْعَاتُهَا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝۱ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۲ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝۳
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۶ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ
لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۷
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝۸ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۹ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ
وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا
فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝۱۰ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ

Marfat.com

الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١١﴾ ع

رکوع: ۱۔ (ا ل م۔ ۱) یہ کتابِ حکیم کی آیات ہیں۔ ۲) سراپا ہدایت اور رحمت ہے محسنین کے لیے۔ ۳) جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۴) ''یہی لوگ ہیں، جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ ہیں، جو کامیاب ہیں۔ ۵) اور لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو مقصدِ حیات سے غافل کر دینے والی باتوں کو خرید کر لاتے ہیں تا کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بغیر کسی علم کے گمراہ کریں اور ان آیات کا مذاق اڑائیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۶) اور جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتے ہیں گویا ان کو سنا ہی نہیں، گویا ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے، آپ انہیں ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں۔ ۷) البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں۔ ۸) جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے اور وہ غالب و حکیم ہے۔ ۹) اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمہیں نظر آئیں، اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے تا کہ وہ تمہیں لے کر لڑھک نہ جائے اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلا دیے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا، اور اس میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں۔ ۱۰) یہ تو ہے اللہ کی تخلیق تو اب مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے بلکہ یہ ظالم لوگ ایک صریح گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۱۱)

الٓمّٓ ﴿١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾

(ا ل م۔ ۱) یہ کتابِ حکیم کی آیات ہیں۔ ۲)

پہلی آیت حروفِ مقطعات پر مشتمل ہے اور حروفِ مقطعات کی تفسیر سورۃ البقرۃ کے آغاز میں ہو چکی ہے۔

دوسری آیت میں قرآنِ کریم کو کتابِ حکیم کہا گیا ہے اور مزید یہ فرمایا ہے کہ یہ سورۃ کتابِ حکیم کی آیات ہیں۔ کتابِ حکیم میں حکیم کا لفظ کتاب کی صفت واقع ہوا ہے۔ صاحب لسان العرب نے لکھا ہے کہ جب یہ لفظ قرآنِ کریم کی صفت ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے الحاکم لکم وعلیکم یعنی قرآنِ کریم ایک ایسی قوتِ حاکمہ ہے جس کا فیصلہ دوٹوک اور بے لاگ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ حق کی حمایت میں بولتی اور باطل کا بطلان واضح کرتی ہے۔ اس میں کسی غلط بات کا گزر نہیں ہوتا۔ راستی پر چلنے والوں کی ہمیشہ حمایت کرتی ہے اور حق سے روگردانی کرنے والوں کی مذمت کرتی اور ان کے انجام کی خرابی کو واضح کرتی ہے۔ یہ صرف کتابِ نصیحت نہیں بلکہ کتابِ قانون بھی ہے جس کے تحت مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اور اس کا فیصلہ مسلمان امت میں اس طرح نافذ ہوتا ہے کہ جس کے ماننے یا انکار کرنے پر اسلام اور کفر کا دارومدار ہے۔

Marfat.com

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝۳

(سراپا ہدایت اور رحمت ہے محسنین کے لیے۔ ۳)

اس آیت میں قرآنِ کریم کی دو بنیادی صفات بیان کی گئی ہیں، ہدایت اور رحمت۔ سب سے پہلی ہدایت کی وضاحت پیشِ خدمت ہے۔

ھدیٰ کی وضاحت اور تسہیل

قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنے ظاہری حسن اور معنوی وسعت و جامعیت کے اعتبار سے اپنے اندر ایک اعجازی شان رکھتا ہے۔ بظاہر سیدھے سادے الفاظ کھائی دیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں ان کے اندر مفہوم و معنی کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ اسی لفظِ ہدایت کو دیکھئے لفظ نہایت سادہ اور سہل ہے۔ لیکن معنوی وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے ایک سے زیادہ معنی ہیں اور معنی اور مفہوم میں حیرت انگیز وسعت ہے۔ اب ہم اس کی تھوڑی سے تفصیل عرض کرتے ہیں۔

ھــــدیٰ اور ہدایت۔ دونوں مصدر ہیں۔ اور دونوں کا معنی رہنمائی ہے۔ ہدایت کا لفظ قرآن کریم نے استعمال نہیں کیا۔ البتہ ھــدیٰ یا الھــدیٰ تقریباً دو سو جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور ہر جگہ اس کی معنوی وسعت کے اعتبار سے قرائن کی مدد سے مفہوم کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ ھــدیٰ یا الھــدیٰ کا معنی تو رہنمائی ہے۔ لیکن رہنمائی کے مصداق بیسیوں ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے مفہوم میں تبدیلی کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ ایک راہ چلنے والا کسی واقف حال سے رستہ پوچھتا ہے یعنی اسے اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس رہنمائی کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں۔

رہنمائی کی متعدد صورتیں

۱۔ رہنمائی دینے والا اس مسافر کو وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ یا چھڑی کے اشارے سے منزل کی سمت بتا دیتا ہے اور راستے کے کچھ نشانات واضح کر دیتا ہے۔ اسے اراء الطریق کہتے ہیں۔

۲۔ بتانے والا محسوس کرتا ہے کہ راستہ بڑا پر پیچ ہے مسافر زبانی رہنمائی سے شاید منزل تک نہ پہنچ سکے اور اس کی فکرمندی دیکھ کر وہ خود بھی فکرمند ہو جاتا ہے۔ اب وہ بجائے اسے ہاتھ کے اشارے سے بتانے کے اسے اپنے ساتھ لیتا ہے اور اسے اس کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اسے ایصال الی المطلوب کہتے ہیں۔

۳۔ کبھی رہنمائی محسوس چیزوں میں نہیں ہوتی بلکہ رہنمائی کی ضرورت معنوی، نظریاتی اور فکری ہوتی ہے۔ یعنی ایک آدمی زندگی سے متعلق تصورات میں الجھا ہوا ہے۔ وہ اس کی حقیقت اس کی ضروریات اور اسکے مسائل کو سمجھنا چاہتا ہے لیکن الجھ کر رہ گیا ہے اب ضرورت ہے کہ اسے ایسی رہنمائی دی جائے جو اس حوالے سے اسے یکسو کر دے۔ اس فکری رہنمائی کے لیے اسے زندگی سے متعلق ایسے واضح تصورات اور اس پر کامیابی سے چلنے والے واضح نقوش قدم مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اپنی فکری الجھنوں سے بھی نجات پالے اور عملی مثالیں اس کی فکر کو عملی توانائی بھی دے دیں۔

Marfat.com

۴۔ اجتماعی زندگی اپنے سفر پر رواں دواں ہے۔اس کے اجتماعی ادارے وجود میں آچکے ہیں۔افراد کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے۔حکومت وریاست اور افرادِ ریاست کا باہمی تعلق تشکیل پا رہا ہے۔اب ضرورت ہے کہ ایک ایسا آئین وجود میں آئے جو تمام اجتماعی اور اداراتی ضرورتوں کو اور فرد سے لے کر حکومت وریاست تک ہر طرح کی رہنمائی کا حق ادا کر سکے۔

۵۔ سمتِ سفر اور منزل کے متعین ہو جانے یا ریاست کے ہمہ نوعی اداروں کے وجود پا جانے کے بعد اور قوم کی شیرازہ بندی ہو جانے کے بعد کبھی ایسی صورتحال بھی پیدا ہوتی ہے کہ ذمہ داریوں کی شدت کا احساس کرتے ہوئے اور راہ کی مشکلات کو محسوس کرتے ہوئے حوصلے ٹوٹنے لگتے ہیں۔اور آمادۂ عمل ہونے سے پہلے ہی ہمتیں جواب دینے لگتی ہیں۔اس صورت میں بھی رہنمائی کی ضرورت ہے، جو حوصلوں کو باندھ سکے اور ہمتوں کو توانا کر سکے۔

یہ کم سے کم رہنمائی کی ضرورتیں اور صورتیں ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہر ضرورت دوسرے سے مختلف ہے۔ایسے تمام مواقع پر راہنمائی کی ایک ہی شکل تو ہو نہیں سکتی۔ ہر نئی ضرورت پیدا ہو جانے کے بعد رہنمائی بھی ایک نئی شکل میں متشکل ہو گی۔شکل کچھ بھی ہو اور قالب کوئی بھی اختیار کیا جائے اسے بہر حال رہنمائی ہی کہا جائے گا۔لیکن اس سے یہ تو اندازہ ہو رہا ہے کہ رہنمائی یا ہدایت لفظ کی صورت میں تو ایک ہے لیکن معنوی وسعت کے اعتبار سے اس کے کتنے رنگ اور کتنی صورتیں ہیں۔

متذکرہ بالا پانچوں ضرورتوں کو سامنے رکھ کر دیکھئے۔کہ پہلی صورت میں جب کہ زندگی کا مسافر منزل تک پہنچنے کا راستہ پوچھنا چاہتا ہے اور یہ اس کے سفر کی بالکل ابتداء ہے اور ابھی وہ اس میدان میں بالکل نووارد ہے۔ہدایت کے احساس نے ابھی اس کے اندر جنم لیا ہے۔قرآن اس کے لیے بھی ہدایت ہے۔وہ صرف سمتِ سفر معلوم کرنا چاہتا ہے تو قرآن انگلی اٹھا کے اسے سمتِ سفر بتا دیتا ہے۔اور راستے کے کچھ نشانات بھی واضح کر دیتا ہے۔تو اس آیت کریمہ میں قرآن کریم کو اس حوالے سے بھی ہدایت کہا گیا ہے۔اور یہی وہ چیز ہے جسے ''هُدًی لِلنَّاس'' کہا گیا ہے۔لیعنی یہ قرآن سب لوگوں کے لیے ہدایت ہے کہ وہ سب لوگوں کو راستہ دکھاتا ہے۔

دوسری صورت میں جبکہ اس کی فکرمندی میں اضافہ ہو چکا ہے۔اب وہ بہر صورت منزل تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہے اور زندگی کے نشیب وفراز نے اسے پریشان کر دیا ہے۔اب وہ خود کو رہنما کے حوالے کر کے التجا کرتا ہے کہ مجھے منزل تک پہنچنے کے لیے مدد کی جائے۔تو قرآن اس کے لیے بھی ہدایت ہے۔ارشاد فرماتا ہے۔ ''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا'' جو لوگ ہم تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے بے چین ہوتے ہیں ہم ان کے لیے اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔

نمبر ۳ میں ہم نے جس ضرورت کا ذکر کیا ہے کہ انسان فکری طور پر الجھ کر رہ جاتا ہے وہ چلنا چاہتا ہے لیکن اسے راستہ نہیں ملتا۔قرآن کریم اس کے لیے بھی ہدایت ہے کہ وہ اسے اس طرح فکری رہنمائی دیتا ہے کہ قرآن کریم کا مطالعہ اس میں قلبی نور و بصیرت پیدا کر دیتا ہے۔اب مشکل سے مشکل مراحل میں بھی اس کی بصیرت اسے رہنمائی دیتی ہے اور دل کا نور راستہ روشن کرتا ہے۔اسی کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی '' کہ جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کی قلبی بصیرت میں اضافہ فرماتا ہے۔''

Marfat.com

اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی اور اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آئینی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کا ذکر ہم نے نمبر چار پر کیا ہے۔ قرآن کریم اس کے لیے بھی رہنما بن کر آیا ہے۔ یعنی وہ صرف کتاب نصیحت ہی نہیں بلکہ ضابطہء حیات اور اسلامی ریاست وحکومت کا آئین بھی ہے۔ اس لیے فرمایا "اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ" (کہ بے شک شریعت اور آئین تو اللہ ہی کا آئین ہے) (یعنی قرآن کریم)

نمبر ۵ میں ہم نے جس ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کریم یہ ضرورت بھی پوری کرتا ہے یعنی حوصلوں کو باندھتا اور توانا کرتا ہے اور اس لحاظ سے اسے ہدایت کہا گیا ہے۔ جس طرح "اصحاب کہف" کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ چند لڑکے کے بالے تھے۔ جب وہ ایمان لے آئے تو حالات کی طغیانی ان کے حوصلوں کو توڑنے لگی۔ تو اللہ فرماتا ہے: "زِدْنٰهُمْ هُدًى وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" (ہم نے پھر ان کی ہدایت میں اضافہ کیا یعنی ان کے دلوں کو باندھ دیا اور حوصلوں کو توانا کردیا)

ہم نے رہنمائی اور ہدایت کی چند آسان ضرورتیں آپ کے سامنے واضح کیں اور آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے رہنمائی کا حق ادا کرتا ہے۔ اور اس متنوع رہنمائی کو جس کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں صرف ایک لفظ ھُدًى سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے آپ اس لفظ کی وسعتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

رحمت کا مفہوم

دوسری صفت جو ذکر فرمائی گئی ہے وہ رحمت ہے۔ رحمت ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس سے انسان کو قلبی سکون، دماغی آسودگی، اعضاء وجوارح کی برجستگی اور معاملات میں ہمواری اور اعتدال اور مجموعی طور پر زندگی میں فلاح وکامرانی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ جب کوئی شخص اسلام کا دامن پکڑ لیتا ہے تو اسلام اس کے دل ودماغ اور زندگی کے لیے ایسی ٹھنڈک بن جاتا ہے جو تکلیفوں میں مبتلا ہونے کے بعد بھی اسے بے چین نہیں ہونے دیتا۔ اور اگر مسلمان معاشرہ اسلامی نظام کو اپنا اجتماعی نظم اور مقصد بنا لیتا ہے اور اس کی زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کی ہی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔ بارشیں وقت پر ہوتی ہیں، حکمران اللہ تعالیٰ کی نعمت بن جاتے ہیں، باہمی معاملات میں خوش اسلوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا ہر معاملہ اپنے نہج کے مطابق انجام پذیر ہوتا ہے اور انسان زندگی کو بوجھ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر مقصدِ زندگی پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

رحمت کا تعلق آخرت سے بھی ہے۔ اس لحاظ سے رحمت جنت کا دوسرا نام ہے۔ جو لوگ دنیا میں ایمان اور عملِ صالح سے اپنے آپ کو آراستہ کرلیں گے آخرت میں انہیں جنت کی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی وہ رحمت ہے جو صرف صاحبِ ایمان لوگوں کا حصہ ہے۔

لیکن یہ ہدایت ورحمت جو اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمتیں ہیں یہ ہر ایک کے نصیب میں کہاں۔ یہ تو صرف ان لوگوں کو میسر آئیں گی جو اس کا واقعی حق ادا کریں گے۔ اس کے لیے محسنین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو صرف ضروریاتِ دین کو تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے دل ودماغ کو اس کے انوار سے ہمیشہ مزین رکھتے ہیں۔ اور جن کے اعضاء وجوارح سے نیکی کا صدور محض اتفاقاً نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی سنت کو اپنے لیے زندگی کا نظام بنا لیتے ہیں اور رحمت کی طلب میں ہمیشہ سرگرداں رہتے ہیں۔ بدی کا اول تو ان سے صدور نہیں ہوتا، اور اگر کبھی ہو جائے تو وہ اس کی تلافی کے لیے استغفار اور توبہ کا اس قدر سرمایہ جمع کردیتے ہیں کہ اس کے تصور سے نیکیوں کی بہار آجاتی ہے۔ اور مزید یہ بات کہ وہ نیکی اور بھلائی کی کسی سطح پر رکنے اور ستانے والے لوگ نہیں ہوتے بلکہ وہ بہتر سے بہتر نیکی اور بہتر سے بہتر بھلائی کی طلب میں اپنی صلاحیتوں کا ہر قطرہ نچوڑ دینے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔

Marfat.com

الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ ۴
اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ۵

(جونماز کا اہتمام کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ۴) ''یہی لوگ ہیں، جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ ہیں، جو کامیاب ہیں۔ ۵)

محسنین کی تین صفات

اس آیتِ کریمہ میں محسنین کی تین صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان تین صفات کے ذکر سے محسنین کے بنیادی خدوخال واضح کردیے گئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ بس انہیں تین صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ تین صفات ایسی ہیں جن پر باقی تمام نیکیوں کا دارومدار ہے۔ اور ان تینوں اعمال کے بروئے کار لانے سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں اور عادات میں جو تبدیلی آتی ہے اس سے خودبخود وہ نیکیاں وجود پذیر ہوتی ہیں جو محسنین کی پہچان ہیں۔ چنانچہ ہم ایک ترتیب سے الگ الگ ان تینوں کا ذکر کرتے ہیں۔

اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی اس اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اقامت کا معنی ہے کسی چیز کو کھڑا کرنا یا اس طرح سیدھا کرنا کہ اس میں کوئی ٹیڑھ باقی نہ رہے۔ قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے ایک سفر کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ جس میں ایک جگہ بتایا گیا ہے کہ ایک گاؤں میں انہوں نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک دیوار گرا چاہتی ہے تو انہوں نے اسے سیدھا کردیا۔ اس کے لیے قرآن کریم نے تعبیر اختیار کی ''فاقامه'' پس اس نے اسے سیدھا کردیا تو یہاں دیکھئے اقامة ٹیڑھی دیوار کے سیدھا کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ تو اس لفظ کے معنی پر غور کرتے ہوئے کئی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ نماز قائم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ نماز صرف اللہ ہی کے لیے پڑھی جائے کسی اور کو اس میں شریک نہ کیا جائے اس میں دکھاوے کی آلائش تک شامل نہ ہو۔ ریاکاری کی پرچھائیں نہ پڑنے پائے۔ نماز چونکہ اللہ کے لیے ہے اس لیے اسی کے گھر کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی جائے اور دل کا رخ صرف اللہ کی طرف رہے اور کوشش یہ کی جائے کہ نماز میں مکمل یکسوئی حاصل ہو، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْن ''اور اسی کی طرف اپنا رخ کرو ہر نماز کے وقت اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔

۲۔ نماز اس طرح پڑھی جائے جس سے محسوس ہو کہ واقعی اللہ کو یاد کیا جارہا ہے۔ یعنی آدمی نماز کا ہر رکن ادا کرتے ہوئے خشوع وخضوع میں ڈوبا ہوا ہو۔ آدمی پر اللہ کی خشیت بھی طاری ہو اور اس کی محبت سے دل لبریز بھی ہو۔ اور یہی وہ نماز ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ''ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازیں خشوع وخضوع سے ادا کرتے ہیں''۔

Marfat.com

۳۔ نماز کو وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا، نہ تعجیل سے کام لینا نہ تاخیر سے۔ کیونکہ نہ وقت سے پہلے نماز ادا ہوتی ہے، نہ وقت کے بعد۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا ''بے شک نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی سے فرض کی گئی ہے''

۴۔ نماز کا اس طرح ادا کرنا جس میں فرائض واجبات، سنن، اور آداب تک کا لحاظ رکھا جائے۔ اگر فرض یا واجب کی پابندی نہ کی گئی تو نماز نہیں ہوگی اور اگر سنت سے لاپرواہی کی گئی تو نماز مکروہ ہوگی اور اگر آداب کا خیال نہ رکھا گیا تو نماز بے برکت ہو جائے گی۔ اس لیے حقیقی نماز وہی ہے جو ان تمام پابندیوں کے ساتھ ادا کی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ جلدی جلدی نماز پڑھ رہا ہے۔ نہ قیام درست ہے نہ قعود، نہ رکوع میں سلامتی ہے نہ سجدے میں، بس جلدی جلدی نماز نمٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس طرح عموماً ہم نماز پڑھتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے اسے بلا کر فرمایا نماز دوبارہ پڑھو، تم نے جو کچھ نماز کے طور پر کیا ہے یہ نماز نہیں ہے، کیونکہ نماز میں تعدیلِ ارکان بھی ضروری ہے۔

۵۔ پانچ نمازیں فرض ہیں، کوئی پڑھنا اور کوئی چھوڑ دینا، اسے نماز قائم کرنا نہیں کہتے۔ یہ تو اپنے نفس کی نماز ہوئی کہ جب جی چاہا پڑھ لی اور جب جی چاہا چھوڑ دی۔ اس لیے فرمایا حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ نمازوں کی محافظت کرو۔ اور نمازیوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ ''وہ اپنی نمازوں پر برابر قائم رہتے ہیں''۔

۶۔ جماعت کی پابندی کرنا:۔ قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ نے اس کی بے حد تاکید فرمائی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ''اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ''، یعنی جماعت کی پابندی کرو اور آنحضرت ﷺ نے رحمت للعالمین ہونے کے باوجود ارشاد فرمایا کہ ''جو لوگ اذان سننے کے بعد گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں اور جماعت میں شریک نہیں ہوتے، میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی سے نماز پڑھانے کے لیے کہوں اور خود ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ اگر مجھے بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کا خیال نہ ہوتا تو میں ایسا ضرور کر گزرتا''۔

۷۔ جماعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی شیرازہ بندی جس کا اہم ذریعہ جماعت کے اندر نمازیوں کی صفوں کا سیدھا رکھنا ہے یہ بھی اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: تَسْوِيَةُ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَةِ الصَّلٰوةِ ''صفوں کا برابر کرنا بھی اقامت صلوٰۃ کا ایک جز ہے''۔ اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے یہاں تک ارشاد فرمایا کہ ''جس قوم کی صفیں ٹیڑھی ہوتی ہیں اندیشہ ہے کہ ان کے دل نہ ٹیڑھے کر دیے جائیں''۔

اقامتِ صلوٰۃ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری

۸۔ جہاں قرآنِ کریم نے اقامت صلوٰۃ کی نسبت پوری امت یا ان کے امام کی طرف کی ہے تو وہاں اس سے مراد ایک تو اجتماعی نمازوں کا قیام ہے جس میں جمعہ، جماعت اور عیدین کی نمازیں شامل ہیں اور دوسرے اس میں حکومت اسلامی کی سب سے پہلی ذمہ داری سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی خطۂ زمین میں مسلمانوں کو حکومت دے دے تو ان کی سب سے پہلی ذمہ داری نماز کا قائم کرنا ہے۔ ارشاد فرمایا اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ''اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں معروف کا حکم دیں اور برائی سے روکیں''۔ اس آیت کو پھر پڑھیے اور اندازہ فرمایئے کہ جس

Marfat.com

طرح قرآنِ کریم اپنے استفادہ کرنے والوں میں سب سے پہلی عملی صفت اقامتِ صلوٰۃ قرار دیتا ہے۔ اسی طرح یہاں مسلمان حکومت کی پہلی ذمہ داری اقامت صلوٰۃ ٹھہرا رہا ہے۔ اگر تدبر سے کام لیں تو اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک عظیم عمارت ہے، جو پانچ بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے اور یہی پانچوں اس کے ستون ہیں۔ جن پر یہ عمارت ایستادہ ہے۔ ان میں پہلا اور اہم تر ستون نماز ہے یہ ارکان اسلام میں سے ایسا رکن ہے جو سب سے پہلے امت مسلمہ پر فرض کیا گیا اور قیامت کے روز سب سے پہلے اسی سے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اسی کے بارہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا اَلصَّلٰوۃُ فَارِقٌ بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ ''نماز حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے''۔ مزید فرمایا: اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ مَن اَقَامَھَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّین وَمَنْ ھَدَمَھَا فَقَد ھَدَمَ الدِّیْن ''نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے اسے قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اسے گرادیا اس نے دین کو گرادیا''۔ کسی آدمی کے اسلام کی شناخت اور علامت یہی نماز ہے کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد نماز کا وقت داخل ہوتے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص دعوائے ایمان میں سچا ہے یا جھوٹا۔ قرآنِ پاک میں فرمایا: فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ اگر یہ توبہ کریں اور نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو یعنی ان کے ایمان کو معتبر جانو۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ مسلمانوں کا لشکر اگر کسی آبادی پر گذرے اور معلوم نہ ہو کہ اہل بستی مسلمان ہیں یا غیر مسلم تو اذان کہو اگر بستی سے اذان کا جواب ملے تو اس بستی کو مسلمان جانو اور ان سے مسلمانوں جیسا سلوک کرو۔ کیونکہ نماز ہی اہل اسلام کی پہچان ہے۔ ارکان اسلام میں سے کوئی رکن بجز زکوٰۃ کے ایسا نہیں جس کی قرآن وسنت میں اس تکرار کے ساتھ تاکید آئی ہو جیسی تاکید نماز کے لیے آئی ہے۔ قرآنِ کریم میں بار بار اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (نماز قائم کرو) فرمایا گیا ہے۔ نمازوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا۔ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوَاتِ (نمازوں کی حفاظت کرو) ترک نماز پر شرک کے اندیشہ کا اظہار کیا گیا کہ نماز قائم کرو ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں مشرک نہ ہو جاؤ۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اور شرک ایسی برائی ہے جس کا تصور بھی ایک مسلمان کے لیے ناقابل قبول ہے۔ مسلمانوں کو صرف اقامتِ صلوٰۃ پر عمل کرنے کا ہی حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسے ہر مسلمان اور مسلمان معاشرے کی پہچان اور روح قرار دیا گیا اور اسے مسلمانوں کی ایسی صفت قائمہ و مستمرہ ٹھہرایا گیا جو مسلمانوں سے کبھی منفک نہیں ہو سکتی یعنی جس طرح برف سے ٹھنڈک، آگ سے تپش، چاند سے چاندنی، سورج سے روشنی اور موتی سے آب الگ نہیں ہو سکتی اسی طرح ایک مسلمان بلکہ مسلمان معاشرہ سے نماز کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد فرمایا گیا: وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ''وہ مسلمان ہمیشہ اور ہر حالت میں نمازوں کی محافظت کرتے ہیں''۔ جس طرح ان کے جسموں سے ان کی روحوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ان کی دینی زندگی نمازوں کے اہتمام اور اس کے اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔

نماز کی پابندی نہ کرنا نفاق کی علامت ہے

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام جس کسی مسلمان کو مسجد سے چند نمازوں میں غائب دیکھتے، تو اس کی مزاج پرسی اور تیمارداری کے لیے اس کے گھر کا رخ کرتے، انہیں یقین ہو جاتا کہ وہ یقیناً بیمار ہے یا اسے کوئی عذر لاحق ہے۔ ان کے لیے یہ بات ناقابل تصور تھی کہ کوئی مسلمان بدوں عذر بھی کبھی نماز باجماعت یا مسجد سے بیگانہ رہ سکتا ہے اور اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ غیر حاضر شخص کوئی معقول عذر نہیں رکھتا تو انہیں اس کے منافق ہونے کا یقین ہو جاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ترک نماز نہیں بلکہ اہتمام نماز میں سستی کو بھی منافقین کی علامت قرار دیا۔ ارشاد فرمایا: وَاِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی ''جب وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو ڈھیلے ڈھالے اور کسمسائے ہوئے''۔ پروردگار کی نگاہ میں یہ مسلمان کا شیوہ نہیں پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں آخر منافقین نہ چاہتے ہوئے بھی نماز کیوں پڑھتے تھے؟ اس کی دو وجوہ تھیں۔

Marfat.com

ا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان معاشرہ میں رہنے اور خود کو انہیں میں سے ظاہر کرنے کے لیے نماز میں شرکت ضروری ہے ورنہ مسلمان انہیں کبھی مسلمانوں میں شمار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انہیں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد خوب معلوم تھا مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ ''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا''۔

۲۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو جس سانچے میں ڈھالا گیا تھا اس میں نماز کا اہتمام نہ کرنے والوں کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ جس طرح ایک صحت مند معدہ مکھی یا کسی ایسی ہی کسی چیز کو قبول نہیں کرتا بلکہ اگل دیتا ہے۔ اسی طرح صحت مند مسلمان معاشرہ کبھی بے نماز کو برداشت نہیں کرتا بلکہ بے نماز آدمی اکل کھرے معاشرے میں کھوٹ کی طرح الگ ہو جاتا ہے کیونکہ پروردگار نے اس مسلمان معاشرے کے معماروں یعنی انبیاء کرام کی یہ ذمہ داری ٹھہرائی تھی کہ وہ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور اپنے ماننے والون کو بھی اس کا حکم دیں اور اس کا آغاز اپنے گھر سے کریں آں حضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے وَأْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا ''اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس کی پابندی کیجیے۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قرآن کریم میں قیامت تک کے لیے محفوظ فرما دی گئی۔ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ''اے رب مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا''۔ ایسے معاشرے میں ترک نماز کی کہاں گنجائش رہ سکتی ہے۔ جس میں یہ بات دل و دماغ میں اتار دی گئی ہو کہ نماز زندگی میں بجز جنون اور بے ہوشی کے کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہو سکتی۔ اگر گھر کا سکون میسر نہیں حالت سفر درپیش ہے، تو سفر کی رواروی میں بھی نماز چھوڑی نہیں جا سکتی۔ البتہ قصر پڑھو یعنی دو رکعت نماز کافی ہے اور اگر بیماری کا عذر ہے تو عذر کے مطابق نماز پڑھو۔ یعنی قیام پر قادر نہیں ہو تو بیٹھ کر پڑھو بیٹھ بھی نہیں سکتے تو لیٹ کر سر کے اشارے سے پڑھو اور اگر اتنی بھی ہمت نہیں تو آنکھوں کے اشارے سے پڑھ لو، اور اگر وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کر لو۔ خود نہیں کر سکتے تو دوسرا کرا دے اور اگر جنگ کی حالت درپیش ہو تو صلوۃ الخوف یعنی ''خوف کی نماز'' پڑھو۔ اندازہ فرمائیے! جنگ کی ہولناکیوں میں غذا میسر نہیں آرام کا موقعہ نہیں جان کے لالے پڑے ہیں مگر نماز بہر حال پڑھنی ہے اگر مسلسل فائرنگ اور گولہ باری کی وجہ سے کسی طرح بھی نماز نہیں پڑھی جا سکتی، تو پھر جب موقع ملے جو نمازیں قضا ہو گئی ہیں انہیں پڑھ لو۔ جیسا کہ غزوۂ خندق میں آنحضرت ﷺ کی دو نمازیں کفار کے مسلسل حملے کی وجہ سے قضاء ہو گئی تھیں تو آپ ﷺ نے انہیں قضا پڑھا لیکن نمازوں کے قضا ہو جانے کا رنج اتنا شدید تھا کہ آپ ﷺ کی زبان سے ان کفار کے لیے بددعا نکلی۔ حالانکہ آپ ﷺ سراپا رحمت تھے اور کبھی اپنی ذات کے لیے کسی کو کبھی حرف ناملائم بھی نہیں فرمایا اور طائف کے پتھر کھا کر بھی بددعا نہیں فرمائی۔ لیکن نماز کے معاملہ میں آپ بہت حساس واقع ہوئے تھے کیونکہ نماز فی الحقیقت اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا اقرار و اعلان ہے اور اس کی مداومت اور پابندی اس عہد وفا کی پاسداری ہے اس لیے جب آپ اس عہد وفا کو شکست ہوتا دیکھتے تو اس دھرتی پر سایۂ رحمت ہونے کے باوجود غضبناک ہو جاتے۔ آنحضرت ﷺ کے نماز کے بارے میں شدید حساس ہونے اور نماز کی اہمیت و عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مرض الوفات میں جبکہ نقاہت کے باعث آپ کی آواز جواب دے رہی تھی اور چند لمحوں بعد آپ واصل بحق ہونے والے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے لب مبارک جنبش کرتے ہوئے دیکھے تو میں نے لبوں سے کان لگا دیئے۔ آپ فرما رہے تھے: اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ''لوگو! نماز کی پابندی کرنا اور زیردستوں سے حسن سلوک سے پیش آنا''۔ جس تحفہ کو عالمِ لامکاں سے شب معراج آپ اپنے رب سے لے کر آئے تھے، دنیا سے دمِ واپسیں اسی کی یاددہانی فرما رہے تھے۔ مسلمان معاشرے میں اسی تاکید و اہتمام کا اثر تھا کہ عالم اسلام پر غیر ملکی استعمار کے مکروہ سایہ پڑنے تک مسلمانوں میں ہر طرح کا عیب تلاش کیا جا سکتا ہے مگر بے نماز ہونا یعنی ترک نماز، یہ برائی

Marfat.com

مسلمانوں میں کبھی نہ تھی کیونکہ مسلمان خوب جانتے تھے کہ اسلام اور پروردگار سے ہمارے تعلق کا یہ آخری ٹانکا ہے اگر یہ بھی ٹوٹ گیا تو پھر رسمی تعلق تو شاید باقی رہ جائے حقیقی تعلق باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کے تحفظ کے لیے غلط کار اور بدعمل حکمرانوں کو بھی آخر حد تک زیادہ سے زیادہ برداشت کرنے کا حکم دیا مگر اس برداشت کی آخری حد یہ بیان فرمائی کہ جب تک وہ تمہیں اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتے رہیں یعنی اس کے بعد انہیں برداشت کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ قرآنِ حکیم نے گزشتہ قوموں کے حوالے سے ان کی جس آخری برائی اور گمراہی کو بیان فرمایا ہے جس کے بعد وہ ہلاکت سے نہ بچ سکے۔ وہ یہی نماز کو ضائع کردینے کی حالت ہے ارشاد پاک ہے۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ''پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کردیا اور شہوات کے پیروکار ہوگئے''۔ پھر اللہ کا قانون حرکت میں آیا اور نامرادی وخسران اور تباہی و بربادی ان کا مقدر بن گئی۔ واحسرتا! آج امت مسلمہ اپنی اس متاع بے بہا کو گم کر چکی بالخصوص اس کا طبقۂ خواص اس کی اہمیت، افادیت اور عظمت کو بالکل بھلا چکا ہے۔

متذکرہ بالا تفصیل سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اسلام میں نماز کا کیا مقام اور کیا اہمیت ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ جس فریضہ الٰہی کی دین میں یہ اہمیت ہو اسے قائم کرنا اگر اسلامی حکومت کی پہلی ذمہ داری نہ ٹھہرائی جائے پھر اور کس کی ٹھہرائی جائے۔

نماز کا اہتمام بحالی امن کا پیش خیمہ ہے

اقامتِ صلوٰۃ کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری ٹھہرانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر متمدن اور مہذب حکومت کی ذمہ داریوں میں سب سے پہلی ذمہ داری یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ ملک کے نظم ونسق کو بہتر بنائے۔ لوگوں کی جان مال اور عزت محفوظ ہو۔ راستے خطرات سے پاک ہوں، لوگ رات کو آرام کی نیند سو سکیں، ملک کا ہر شہری اپنے آپ کو ہر حال میں محفوظ تصور کرے۔ اسلامی حکومت کی بھی سب سے پہلی یہی ذمہ داری ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پروردگار نے اسلامی حکومت پر اس ذمہ داری کو عائد کرنے سے پہلے ایک اور ذمہ داری عائد کی ہے اور یہ ضمانت دی ہے کہ اگر حکومت اس ذمہ داری کی ادائیگی میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ دوسری ذمہ داری خود بخود ادا ہو جاتی ہے کہ پہلی ذمہ داری سے مراد میری یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا اپنے اللہ سے تعلق درست کردے۔ ہر مسلمان ہر وقت اس بات کا یقین رکھے کہ جس خالق و مالک نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس نے میری زندگی کے اسباب پیدا کیئے ہیں اور جس نے مجھے قوتِ احساس اور قوتِ ادراک سے نوازا ہے، وہی پروردگار ہر وقت مجھے دیکھتا ہے، میں ہر وقت اس کی نگرانی میں ہوں اس کے متعین کردہ نگران میرے ایک ایک عمل کو محفوظ کر رہے ہیں۔ مرنے کے بعد ایک دن ایسا آئے گا جب میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا اور پھر مجھے اپنے ایک ایک عمل کا اپنے پروردگار کو حساب دینا ہوگا۔ اسی طرح اسلامی حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر مسلمان کے دل میں یہ بات راسخ کردے کہ تم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں از اول تا آخر اللہ ہی کے بندے ہو۔ اسی کی بندگی اور اسی کی اطاعت تم پر لازم ہے۔ وہی ایک ذات ہے جو تمہاری زندگی کی حقیقی راہنما تمہاری کمزوریوں میں وہی تمہارا سہارا ہے اور تمہاری سرفرازیاں بھی اسی کی دین اور اسی کی امانت ہیں۔ تم ہر حال میں اللہ کے بندے ہو بندگی کا حق ادا کرنا اور اس کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرنا تمہاری معراج ہے۔ کسی بھی ملک کے رہنے والوں میں اگر یہ تصورات پختہ کر دیے جائیں تو اندازہ فرمایئے! کیا اس ملک میں جرم پرورش پا سکتا ہے؟ جو شخص ہر وقت اللہ کی ذات کو اپنے دماغ میں مستحضر رکھتا ہے وہ

Marfat.com

کسی بھی ذمہ داری کی ادائیگی میں خیانت کیسے کرسکتا ہے؟ وہ کسی شخص پر ظلم کیسے کرسکتا ہے؟ وہ کسی کے مال میں دست درازی کیسے کرسکتا ہے ؟اس کے سامنے سر جھکانے والا سرکشی کا رویہ کیسے اختیار کرسکتا ہے؟ اندازہ فرمایئے! اگر اس تبدیلی کے بعد واقعی انسان ہر طرح کے گناہ اور جرم سے بچ جاتا ہے اور اگر معاشرہ اس قالب میں ڈھل جائے تو پورا معاشرہ گناہوں اور جرائم سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ تو اس کے بعد نظم ونسق کی بحالی اور لاء اینڈ آرڈر کی بہتری کے لیے اور کچھ کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اس لیے پروردگار نے سب سے پہلے مسلمانوں کو اس بنیادی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا۔ کیونکہ نماز ہی ہے جس کے ذریعے اسلامی معاشرے میں متذکرہ بالا تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ایک آدمی جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اللہ اکبر کہتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنی ضروریات، اپنی خواہشات، دنیا کے تقاضوں، اور دنیا کی تمام نام نہاد عظمتوں کا انکار کرتے ہوئے صرف اللہ کی بڑائی کا اعتراف کرتا ہے اور ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہر چیز کو پس پشت پھینکتا ہے اور اللہ کی بندگی کا اقرار کرتے ہوئے ہاتھ باندھ لیتا ہے۔ اس کے بعد اسی کی ثناء کرتا ہے، اسی کی حمد بیان کرتا ہے، اسی کی بندگی کا اعتراف کرتا ہے اور صرف اسی سے مدد طلب کرتا ہے اور پھر اسی کے ضابطہء حیات کی تلاوت کرتا ہے، پھر اسی کے سامنے رکوع، سجود اور قعود سے بندگی کی تکمیل کرتا ہے۔ یہ سب کچھ امت اسلامیہ کا ایک فرد بھی کرتا ہے اور پوری امت بھی کرتی ہے، اسی کا نام نماز ہے۔ اگر یہ نماز شعوری طور پر پڑھی جائے اور اس کے تمام تقاضوں کو بروئے کار لایا جائے اور اس کے مقاصد میں سے کم از کم اس بات کو ذہن نشین کر لیا جائے اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ کہ میری یاد کے لیے نماز کو قائم کرو۔ اور اس کے منفی پہلو کو بھی مضبوط ہاتھوں سے تھام لیا جائے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ''بے شک نماز بے حیائی کے کاموں سے اور گناہ سے روکتی ہے''۔ تو تصور کیجیے! اللہ کی یاد کے ساتھ گناہوں کا وجود کیسے باقی رہ سکتا ہے اور بے حیائی اور گناہوں کو روکنے کے عزم کے ساتھ جرم کیسے جنم لے سکتا ہے؟ یہ اللہ کا دیا ہوا حیرت انگیز نظام ہے کہ اس نے ایک عبادت کے ذریعے پوری اجتماعی زندگی کو ہر طرح کی دراڑوں سے محفوظ کر دیا اور اسے ایک ایسے اہم کام کا ذریعہ بنا دیا جو حکومتوں کی پہلی ذمہ داری ہے اور جس کی ادائیگی آج بھی دنیا بھر کی حکومتوں کے لیے مشکل ہو رہی ہے میری ان گزارشات سے یہ بات سمجھنا آسان ہو گیا ہوگا کہ قرآنِ کریم نے اسلامی یا مسلمان حکومت کے لیے سب سے پہلے نماز قائم کرنا ضروری کیوں قرار دیا۔ لیکن اپنی کوتاہی فکر اور بدنصیبی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ جب بھی کہیں جزوی طور پر بھی مسلمانوں نے اقتدار پا کر اقامتِ صلوٰۃ کے فریضہ کو انجام دینے کی کوشش کی ہے تو ہمارے دانشوروں کا گروہ ہاتھ جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گیا ہے کہ آپ کو سب سے پہلے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ حل کرنا چاہیے لوگوں کی محرومیوں کا علاج کرنا چاہیے اور لوگوں کے مسائل حل کرنے چاہئیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ نماز صرف اولین فریضہ ہی نہیں بلکہ مسلمان معاشرے کی تبدیلی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جس کے نتیجے میں خود بخود ایک صالح انقلاب آتا ہے جو مسلمان معاشرے کے لیے خوشگوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوتا ہے۔

اللہ سے تعلق کی درستی کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کا تعلق دوسرے انسانوں اور دوسرے مسلمانوں سے درست ہو جائے۔ یوں تو وہ ہر مخلوق سے مسلمانوں کے تعلق کی درستی کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن انسانوں اور بطور خاص مسلمانوں سے صحیح تعلق کی استواری کا نماز ہی کی طرح تاکید کرتا ہے کیونکہ جب ایک نمازی نماز کے لیے مسجد جاتا ہے اور نماز کے دوران اور نماز کے ماحول میں جس طرح اللہ سے قرب نصیب ہوتا ہے اسی طرح مسلمانوں سے بھی قربت کا موقع ملتا ہے اپنے دینی بھائیوں کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ قرنِ اول کے مسلمان ہماری طرح بے گانوں کی طرح نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ وہ باہمی ایک

Marfat.com

دوسرے سے قربت اور حالات سے آگاہی کو بھی ضروری سمجھتے تھے اور پھر مسلمانوں کا امام نمازوں اور جمعہ کی جماعت کے وقت مسلمانوں کو ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات اور ضرورتوں سے بھی آگاہ رکھتا تھا اور بعض دفعہ مسلمانوں کی ضرورتوں کی طرف متوجہ بھی کرتا تھا۔ اگر نمازوں کے اوقات کے علاوہ کبھی کوئی ایسی مالی ضرورت پیش آجاتی یا کوئی حالات کے ہاتھوں ستایا ہوا مسلمانوں کا قافلہ مسجد میں پہنچ جاتا تو الصلوٰۃ جامعۃ کی صدا گونجنے لگتی اور مسلمان کشاں کشاں مسجد میں پہنچ جاتے اور آنے والے بے نواؤں اور بے کسوں کے دکھوں کا مداوئی کیا جاتا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو چیتھڑے پہنے ہوئے دیکھا تو باوجود اس کے کہ آپ ﷺ خطبے کے لیے منبر پر رونق افروز ہو چکے تھے آپ ﷺ نے اسے کھڑے ہو کر سنتیں پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ تاکہ لوگ اس کی زبوں حالی اور بے کسی کو دیکھ لیں اور خود بخود اس کی مدد کے لیے آگے بڑھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز جس طرح اللہ سے تعلق کو استوار کرتی ہے اسی طرح مسلمانوں کے باہمی تعلق کو مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا گیا: وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ”اور وہ زکوٰۃ دیتے ہیں۔“

زکوٰۃ دوسرا استون ہے

محسنین کی دوسری صفت زکوٰۃ کی صورت میں بیان کی جارہی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہم دیکھتے ہیں کہ پروردگار نے مسلمانوں کی تعمیر کردار، شیرازہ بندی، اللہ تعالیٰ اور دین سے گہری وابستگی اور انتہا درجے کا نظم وضبط، پیدا کرنے کے لیے نماز کا جابجا حکم دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں بیشتر مواقع پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین کا دوسرا ستون ہے۔ انبیائے کرام کی دعوتی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے بالعموم یہ بات ضرور کہی ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے یعنی نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ضرور کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانی کمزوریوں میں ہوائے نفس نے جو مظاہر پیدا کیے ہیں اس کی اکثر صورتوں کا علاج تو نماز سے ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک حبِّ مال اور اس کے نتیجے میں انسانی حقوق سے لاپرواہی بلکہ بے رحمی اور شقاوت کا تعلق ہے اسے دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کیونکہ جو شخص زکوٰۃ کی حقیقت کو سمجھ کر اس پر عمل کرتا ہے وہ مال کی محبت میں غیر متوازن نہیں ہوتا۔ اسی طرح مالی طور پر محتاج لوگوں کی جو ضرورتیں امراء کی دولت سے متعلق ہیں ان سے صرفِ نظر نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ جس طرح اپنے دل ودماغ اور اعضاء وجوارح کی ترجیحات کا جواب اللہ کے سامنے دینا ہے اسی طرح بندوں کے حقوق اور ان کے تعلق کے حوالے سے بھی سخت بازپرس کا اندیشہ ہے اور اسلام کا اصل حسن ہی یہ ہے کہ وہ جس طرح اپنے ماننے والوں کو اللہ کے آستانے پر جھکا کر اللہ کے دامن سے وابستہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے ذریعے مالداروں کو غریبوں کے ساتھ مربوط بھی کرتا ہے۔ اس طرح ایک مسلمان خلق اور خالق دونوں سے صحیح بنیادوں پر اپنے تعلق کو استوار کر لیتا ہے۔

زکوٰۃ سے مراد انفاق فی سبیل اللہ ہے

یہ سورۃ چونکہ مکی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ زکوٰۃ قانونی اور اصطلاحی حیثیت سے مدینہ منورہ میں فرض ہوئی۔ اس لیے اس سورۃ میں زکوٰۃ کا لفظ اصطلاحی معنوں میں مراد نہیں لیا جا سکتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم نے مکی سورتوں میں بھی بیشتر مواقع پر زکوٰۃ کا ذکر فرمایا اور اس کی ترغیب بھی دی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد اصطلاحی زکوٰۃ نہیں بلکہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

Marfat.com

جس طرح نماز باجماعت اجتماعیت کی روح اور اللہ سے مضبوط تعلق کو پیدا کرتی ہے اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ غریبوں اور امیروں کو اجتماعیت کا درس دیتا اور باہمی روابط کو مضبوط کرتا ہے۔ اگر چند آدمی اکٹھے بیٹھ کر اللہ کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن ان میں سے صاحب استطاعت غریب اور محتاج کو اپنے کھانے میں شریک نہیں کرتے تو ان کے اندر حقیقی وحدت پیدا نہیں ہوسکتی اور وہ کبھی اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوسکتے کہ ہم ایک امت کے افراد ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے اعضاء کی مانند ٹھہرایا ہے۔ اس لیے یہاں انفاق فی سبیل اللہ کو محسنین کی صفت کے طور پر بیان فرما کر ان کی حقیقی قوت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۴)

''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

آخرت کا مفہوم

آخرت کا معنی تو ہے دوسری زندگی۔ جو قیامت کے بعد جن وانس کو ملے گی، لیکن اس کا اطلاق چند عقائد وحقائق پر ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک پر یقین آخرت کے یقین کو مکمل کرتا ہے۔

1۔ ان میں سے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں میں یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے غیر ذمہ دار نہیں بنایا۔ وہ کوئی خود کاشتہ پودا نہیں، جو یونہی مل دل کے ختم ہوجائے اور نہ وہ شتر بے مہار ہے جو جدھر منہ اٹھائے چلتا پھرے۔ بلکہ اس کی زندگی کا ایک مقصد ہے اور اس مقصد کے مطابق زندگی گزارنے کا اسے پابند بنایا گیا ہے۔ قیامت کے دن جسے آخرت کہا گیا ہے، اس سے اس مقصد کے حوالے سے باز پرس ہوگی۔ مختصر یہ کہ باز پرس کا یقین رکھنا اور اس کے لیے ایک دن کے آنے کا یقین رکھنا یہ آخرت کا پہلا تصور ہے۔

2۔ دوسری بات یہ کہ دنیا کا موجودہ نظام اور دنیا کی یہ زندگی دائمی اور ابدی نہیں۔ ایک وقت ایسا آئیگا جب یہ پورا کارخانہ تباہ ہوجائے گا۔ زمین پھٹ جائے گی آسمان ٹوٹ پھوٹ جائیں گے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ ہر طرف تباہی اور موت کی حکومت ہوگی۔

3۔ تیسری بات یہ کہ جس طرح دنیا کو موت کا شکار ہونا ہے اور اس زندگی کو ہمیشہ باقی نہیں رہنا، اسی طرح یہ تباہی اور بربادی بھی ہمیشہ نہیں رہے گی اس دنیا کے خاتمے کے ایک عرصہ بعد اللہ تعالیٰ ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں تمام نوع انسانی کو جو ابتداءِ آفرینش سے لے کر قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا اور پھر انہیں میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا۔ جہاں سب کے اعمال کا حساب ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

4۔ چوتھی بات یہ کہ جو لوگ اللہ کے فیصلے کے نتیجے میں نیک قرار پائیں گے، وہ جنت میں جائیں گے اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور جو لوگ اپنی بداعمالیوں کے باعث بد ثابت ہوں گے، وہ جہنم کی نذر کردیے جائیں گے۔

5۔ پانچویں یہ بات کہ قیامت کے دن کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ایمان وعمل پر ہوگا۔ جس نے زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزاری ہوگی، وہ کامیاب ٹھہرے گا۔ اس لیے کامیابی اور ناکامی کا دارومدار موجودہ زندگی کی خوشحالی یا بدحالی پر نہیں، بلکہ حقیقی

Marfat.com

کامیاب وہ ہے، جو آخرت میں جہنم سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا۔ دنیا میں اگر کسی نے کبھی خوشی نہیں دیکھی اور ساری زندگی دکھوں میں گزاری۔ لیکن اس کی پوری زندگی پر ایمان وعمل کی حکمرانی رہی اور اس نے ہمیشہ اپنے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کی، تو اس کی دنیا کی محرومیاں آخرت میں اس کے لیے توشہ ثابت ہوں گی۔ لیکن جس نے دنیا میں عیش وعشرت میں زندگی گزاری، اس کا یہ عیش و عشرت قیامت میں اس کے لیے حسرت کا سامان بن جائے گا۔

یہ چند عقائد اور حقائق ہیں جن پر یقین رکھنے کو ایمان بالآخرت کہتے ہیں۔

یہاں غور فرمایئے کہ آخرت کے ساتھ ''ایمان'' کے لفظ کی بجائے ''ایقان'' کا لفظ آیا ہے یہ نہیں کہا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ''وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں'' بلکہ فرمایا وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

ایمان اور ایقان میں فرق

''ایمان'' کے معنی تصدیق کرنے اور مان لینے کے ہیں۔ اس کی ضد کفر وانکار اور تکذیب ہے۔ ''ایقان'' کا معنی یقین کرنے کے ہیں۔ اس کی ضد گمان اور شک ہے۔ جس طرح کسی شے پر یقین رکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس پر ایمان بھی رکھتا ہو، اسی طرح کسی چیز پر ایمان رکھنے کے لیے اس پر یقین کرنا شرط نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آدمی کا ایمان محض گمان غالب پر مبنی ہو اور وہ آہستہ آہستہ گمان کی منزل سے نکل کر یقین کی منزل تک پہنچ جائے اور اس طرح اس کے ایمان کی تکمیل ہوجائے۔ دونوں کی مثالیں قرآن کریم اور تاریخ میں موجود ہیں۔ فرعون اور آلِ فرعون کے بارے میں قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا کہ ان لوگوں نے مسلسل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر دل سے یقین کرلیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن وہ اپنی سرکشی اور ظلم کے باعث ایمان لانے سے محروم رہے۔ ابوجہل کی یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ میں محمد (ﷺ) کو جھوٹا نہیں کہتا، میں جانتا ہوں اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن میں اس پر ایمان اس لیے نہیں لاسکتا کہ ایمان لانے کے بعد بنی ہاشم کا قبیلہ ہمیشہ کے لیے ہم سے بڑھ جائے گا اور مزید یہ کہ ہمیں جو عزت حاصل ہے، وہ ایمان لانے کے بعد باقی نہیں رہے گی، کیونکہ اسلام تو ہر طرح کے تفاوت کو ختم کر دیتا ہے۔ وہاں تو صرف تقویٰ سے عزت ملتی ہے، خاندانی انتساب سے کچھ نہیں ملتا۔ دور نہ جایئے، برطانیہ کا مشہور ادیب برنارڈ شا، اسلام کو سچا مذہب سمجھتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ آج کے دور میں اگر کوئی مذہب چل سکتا ہے، تو وہ صرف اسلام ہے اور اگر کوئی شخصیت آج کے دور کی رہنما ہوسکتی ہے، تو وہ صرف محمد (ﷺ) ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسلمان نہ ہوا اور ایسا تو بارہا ہوتا ہے کہ آدمی غالب گمان پر کسی چیز کو تسلیم کر لیتا ہے، لیکن پھر تجربے سے اس کا غالب گمان یقین میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ یقیناً ایسے لوگ قرنِ اول میں بھی ہوں گے کہ جو جب ایمان لائے تو یقین کی معراج پر نہ تھے۔ بالخصوص فتح مکہ کے موقع پر ایمان لانے والوں میں ایسے لوگوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کا ایمان یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ یقین بہرحال انسانی شعور اور انسانی احساسات کی سب سے اعلیٰ منزل ہے۔ اس کے بعد عمل، ایثار اور شہادت کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی، تو آخرت پر ایمان لانے کو اسی یقین کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ کیونکہ آخرت کا عقیدہ ہی فرد اور قوم دونوں کی زندگیوں میں انقلاب کا سبب بنتا ہے۔ جس آدمی کو یقین آجائے کہ مجھے اپنے ایک ایک عمل اور زندگی کے ایک ایک لمحے کا اللہ کو حساب دینا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ کب اللہ کی طرف سے بلاوا آجائے، ایسا شخص کبھی گناہ کے قریب بھی نہیں جاسکتا۔

Marfat.com

اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ ق وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

''یہی لوگ ہیں، جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ ہیں، جو کامیاب ہیں۔''

ہدایت کا تکمیلی مفہوم

جن لوگوں نے پورے احساس اور شعور کے ساتھ قرآنِ پاک سے استفادہ کیا اور جس کے نتیجے میں ان کے اندر متذکرہ بالا صفات پیدا ہوگئیں یہی وہ لوگ ہیں، جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ یہاں ہدایت اپنے تکمیلی مفہوم میں ہے۔ یعنی یہی وہ لوگ ہیں، جن کے لیے قرآنِ پاک کے دیے ہوئے نظامِ زندگی پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ جنہیں قلبی نور اور بصیرت عطا ہوتی ہے، ان کے فکر میں کوئی کجی ہوتی ہے اور نہ ان کے عمل میں کوئی

کمزوری:۔ اللہ کے ہر حکم اور قرآنِ کریم کی ہر آیت سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآن کی ہر بات انہیں اپنے دل کی آواز محسوس ہوتی ہے وہ اسلامی زندگی کے تقاضوں کی طرف لپکتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اللہ ان کو دنیا میں بھی فلاح کی دولت سے نوازتا ہے اور آخرت میں بھی فلاح ان کا نصیب ہوگی۔ اہلِ لغت کہتے ہیں کہ فلاح کا لفظ دنیا اور آخرت کی ہر طرح کی بھلائیوں کو محیط ہے۔ دنیا میں جب کسی شخص یا کسی معاشرے کے افراد کو یہ فلاح کی دولت ملتی ہے، تو وہ ہر طرح سے آسودہ ہو جاتے ہیں اور قیامت کے دن اللہ کے فضل و عنایت سے وہ اس طرح نہال ہوں گے کہ ان کے تصور کے پیمانے ان نعمتوں اور خوشیوں کو ناپنے سے قاصر رہ جائیں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ ق

وَّیَتَّخِذَهَا هُزُوًا ط اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ○

(اور لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو مقصدِ حیات سے غافل کر دینے والی باتوں کو خرید کر لاتے ہیں تا کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بغیر کسی علم کے گمراہ کریں اور ان آیات کا مذاق اڑائیں، یہی لوگ ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ٦)

لَهْوَ الْحَدِیْثِ کا مفہوم

علامہ آلوسی نے حضرت حسن بصریؒ سے لَهْوَ الْحَدِیْثِ کی یہ تفسیر نقل کی ہے کل ماشغلک عن عبادة الله و ذکره من السمر والاضاحیک والخرافاة والغناء ونحوها (روح المعانی) ''یعنی ہر وہ بات لہوالحدیث ہے جو تجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر سے غافل کر دے۔ رات گئے تک قصہ گوئیاں، ہنسانے والے چٹکلے، ہر طرح کی خرافات، گانا بجانا وغیرہ اس میں شامل ہیں۔'' مقصود یہ ہے کہ جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر سے غافل کرتی ہے اور جن چیزوں سے اسلامی اقدار، اسلامی تہذیب و ثقافت، اسلام کی سربلندی اور اسلامی خدمات سے توجہ ہٹ کر اس سے متضاد طرزِ زندگی کی طرف راغب ہوتی ہے وہ لہوالحدیث ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

Marfat.com

شانِ نزول

اس آیت کا شانِ نزول علامہ ابنِ ہشام نے سیرت ابنِ ہشام میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ پھر اسی روایت کو اسباب النزول میں واحدی نے کلبی اور مقاتل سے نقل کیا ہے۔ علامہ آلوسی نے اس کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ کفارِ مکہ کی شدید مخالفت کے باوجود جب دینِ اسلام روز بروز پھیلتا چلا گیا اور قرآن کا حُسنِ اعجاز لوگوں کے دلوں میں اترنے لگا اور روز بروز اسلام کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا تو قریش کے سربرآوردہ لوگوں میں فکرمندی کی لہر دوڑ گئی۔ باہم مشورے ہونے لگے۔ نضر بن حارث نے کہا کہ تم جس طرح اس شخص کا مقابلہ کر رہے ہو، اس میں تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نہ وہ شاعر ہے نہ مجنوں، نہ وہ ساحر ہے نہ کاہن۔ تو آخر ان الزامات کا اس کی دعوت پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک چال چلی۔ تجارت پیشہ آدمی تھا، اپنے کاروبار کے سلسلے میں مختلف ممالک ایران، عراق، شام وغیرہ میں اس کی بکثرت آمدورفت رہتی تھی۔ وہاں سے وہ رستم واسفندیار کے قصے، بادشاہوں کی جنگوں کی کہانیاں خرید کر لے آیا۔ اور جب نبی اکرم ﷺ لوگوں کو کلامِ الٰہی پڑھ کر سنانے لگتے تو وہ بالمقابل اپنی مجلس جماتا۔ اور لوگوں کو دلچسپ افسانے اور بے سروپا کہانیاں سناتا، جو عام لوگوں کی تفریحِ طبع کا باعث ہوتیں۔ چنانچہ کئی لوگ قرآنِ کریم سننے کی بجائے اس کی مجلس میں شرکت کو ترجیح دیتے۔ اس ظالم نے فقط اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس نے کئی پری پیکر لونڈیاں بھی خرید رکھی تھیں جو رقص وسرود کے فن میں بھی ماہر تھیں۔ جب اسے پتہ چلتا کہ فلاں شخص اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے تو وہ ان مہوشوں کو اس کے اوپر مسلط کر دیتا جو گاتیں، ناچتیں اور ہر ذلیل حرکت سے اس کے دل کو لبھاتیں۔ حتیٰ کہ وہ حق کے حُسنِ دلکش سے بے خبر ہو جاتا۔

اس شانِ نزول سے قریش کے ایک ذمہ دار آدمی نے قریش کے مشورے سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو بے اثر کرنے کے لیے جو منصوبہ تیار کیا یہ کوئی نیا منصوبہ نہیں اور نہ صرف نضر بن حارث کے دماغ کی ایجاد ہے بلکہ ہر دور میں جب بھی اللہ تعالیٰ کے نبی انسانوں کی اصلاح کے لیے تشریف لائے ہیں اور انہوں نے انسان کے سامنے یہ راز واشگاف فرمایا ہے کہ تمہاری زندگی ایک قیمتی سرمایہ ہے، اس کو صحیح راستے پر چلا کر تم آخرت کی وہ نعمتیں حاصل کر سکتے ہو جن کی خوبصورتی اور قدروقیمت کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کا یہ دور جو تم گزار رہے ہو یہ اسی آخرت کی تیاری کے لیے ایک مہلتِ عمل ہے۔ اگر تم نے اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کے احکام کی بجا آوری، اس کے رسول کی اطاعت، اور اس کے بندوں کی خدمت اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے استعمال کیا اور اس راہ میں آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تو یہ زندگی تمہارے لیے اخروی نعمتوں کے حصول کا بہت بڑا ذریعہ بن جائے گی۔ لیکن اگر تم نے اسے ہوائے نفس کی پیروی، دولت وثروت کے حصول اور انسانوں کے سروں پر مسلط رہنے کے لیے استعمال کیا تو یہی زندگی آخرت میں ناکامی اور سزا کا باعث ثابت ہوگی۔ تو وہ لوگ جنہوں نے مادی زندگی، ہوائے نفس، دولت وثروت، حکومت وریاست، اور من مرضی کی زندگی کو اپنا معبود بنا رکھا تھا انہوں نے اس دعوت اور اس تعلیم کو بے اثر کرنے کے لیے شروع شروع میں تو طاقت استعمال کی۔ اور جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والے اس طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے، تو پھر انہوں نے وہ طریقہ اختیار کیا جس سے لوگوں کے سفلی جذبات کو بھڑکانے اور نفسانی خواہشات کو غذا بہم پہنچانے، اور اسی زندگی کو منزل ٹھہرا کر اسی کے شب وروز میں ڈوب جانے، اور اسی کے عیش وتنعم میں کھو جانے کو منزل قرار دینے کی تلقین کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اسی طریقہ سے ہر دور میں گمراہ انسانوں نے دوسرے انسانوں کو راہِ راست سے دور کیا۔ اور آج بھی ہم

Marfat.com

اسلام دشمن قوتوں کو اسی راستے پر چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ وہ نوجوانوں کے شہوانی جذبات کو مشتعل کرنے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں اور سنگین ذمہ داریوں سے غافل کر کے انہیں عیش و نشاط کا خوگر بنانے میں شب و روز لگے ہوئے ہیں۔ ہماری فلم انڈسٹری، شبینہ کلبیں، ثقافتی تقریبیں اور مینا بازار قیامت برپا کر رہے ہیں۔ خود تعلیم کا ہدف بدل چکا۔ جنسی تعلیم کو باقاعدہ نصاب میں شامل کر لیا گیا ہے، مخلوط تعلیم سے جوانیوں کو بدراہ کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسان کو مقصدِ حیات سے غافل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی طریقہ نضر بن حارث نے اختیار کیا۔ جیسے ہی نبی کریم ﷺ لوگوں کے سامنے قرآنِ کریم کی تلاوت شروع کرتے، وہ مقابلے میں اپنی منڈلی جما کر کبھی قصے کہانیاں سنانا شروع کر دیتا اور کبھی گانے والی لونڈیوں کے گانے سے لوگوں کو مسحور کرنے کی کوشش کرتا۔ مقصود صرف یہ تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے ہٹایا جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت اور دینی احکام کو طعن و تشنیع کا موضوع بناتا۔ مسلمانوں کی خستہ حالی اور تنگدستی کا مذاق اڑاتا۔ اور لوگوں کو یہ باور کراتا کہ یہ لوگ مذہب اور دین کے نام پر تمہاری زندگی کی خوش اسلوبی اور تمہاری تفریحات اور تمہاری خوش عیشی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے تمہارے شیرازے کو بکھیر کے رکھ دیا ہے۔ زندگی کا حُسن روز بروز غارت ہوتا جا رہا ہے۔ تم جس خوش عیشی میں آج تک شب و روز گزارتے جا رہے ہو، ان کی باتیں قبول کرنے کے بعد تم کبھی اس زندگی کی شکل تک نہ دیکھ پاؤ گے۔ یہ بھوکے ننگے لوگ تمہاری دولت کے دشمن ہیں۔ یہ خود تو تباہ ہوئے ہیں تمہیں بھی تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت ضمیر کا سودا کر چکے ہیں۔ شرافت، نیکی اور انسانی قدریں ان کے اندر سے رخصت ہو چکی ہیں۔ انہیں صرف اپنی عیش کوشی سے غرض ہے، ان کی نوخیز نسلیں تباہ ہوتی ہیں تو ہوتی رہیں۔ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ آج انہوں نے جس طرح اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو تمسخر بنایا ہے کل کو اسی کی سزا کے طور پر سب کے سامنے ان کی رسوائی کا سامان کیا جائے گا۔ عذاب تو دوسروں کو بھی ہوگا لیکن ان کا عذاب رسوا کر دینے والا عذاب ہوگا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا
كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٧

(اور جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتے ہیں گویا ان کو سنا ہی نہیں، گویا ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے، آپ انہیں ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیں۔ ۷)

قریش کا اصل مرض

قریش کے اصل مرض کی نشان دہی فرمائی گئی ہے کہ ان میں نضر بن حارث جیسے لوگ اس لیے پائے جاتے ہیں کہ یہ لوگ حق کے مقابلے میں اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا اصل مرض استکبار ہے۔ چنانچہ جب انہیں ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو نہایت تکبر کے ساتھ اس طرح پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں گویا انہوں نے ان کو سرے سے سنا ہی نہیں، گویا ان کے دونوں کان بند ہیں، اس لیے کوئی چیز ان کو سنائی ہی نہیں دیتی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان کا پندار اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ہماری باتیں ان کے لیے لائق توجہ ہی نہیں ہیں۔ ایسے

Marfat.com

لوگ اگر ہماری آیات کے مقابلے میں رستم اور اسفندیار کے قصے سننا پسند کریں اور آنحضرت ﷺ کی دلآویز شخصیت کی تلاوت کے مقابلے میں گانے کو ترجیح دیں تو ان سے ہدایت کی کہاں توقع ہو سکتی ہے۔ ان کا تو ایک ہی علاج ہے کہ آپ انہیں عذابِ الیم کی خوشخبری سنا دیں۔ انہیں چونکہ ہر معاملے میں خوشیاں درکار ہیں، تو یہ اس قابل ہیں کہ انہیں دردناک عذاب کی خوشی کی خبر دی جائے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ جَنّٰتُ النَّعِيۡمِ ۙ﴿۸﴾ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۹﴾

(البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں۔ ۸) جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے اور وہ غالب وحکیم ہے۔ ۹)

ایمان وعمل کا صلہ

قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جب وہ جرائم پیشہ لوگوں متکبرین اور کافروں کی سزاؤں کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ساتھ اہلِ جنت پر اپنے انعامات کا ذکر بھی فرماتا ہے۔ یعنی ترغیب اور ترہیب پہلو بہ پہلو چلتی ہیں۔ اچھائی اور برائی اور ہر ایک کا انجام ساتھ ساتھ دکھائی دیتا ہے تاکہ کوئی شخص اگر صحیح راستے پر چلنا چاہے تو اس کے سامنے تصویر کے دونوں رخ کھلے ہوں۔ اسی اسلوب کے مطابق یہاں بھی پہلے ان لوگوں پر عذاب کا ذکر کیا گیا ہے جو دعوتِ حق کو ناکام کرنے کے لیے ہر گھٹیا سے گھٹیا طریقہ استعمال کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کے مقابلے میں نہایت تکبر کا اظہار کرتے ہیں۔ اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کے بالمقابل ان لوگوں کا صلہ بیان ہو رہا ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لائے، ان کی دعوت کو قبول کیا اور اپنی زندگیوں کو ان اعمال سے سجایا جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ کے رسول نے انہیں دی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے آنحضرت ﷺ کے ساتھ شب وروز کوشاں رہے۔ ان کی ان کاوشوں کا صلہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی جنتیں عطا فرمائے گا جو ہر قسم کی نعمتوں سے بھرپور ہوں گی۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ انہیں جنت کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کی اجازت ہوگی۔ اور وہ جس نعمت سے بھی متمتع ہونا چاہیں گے تو ان کے لیے کوئی مانع نہ ہوگا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ جنت کی نعمتیں ان کے لیے نہیں ہوں گے بلکہ خود جنتوں کا انہیں مالک بنا دیا جائے گا۔ کسی شخص کو کسی عظیم نعمت سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا اور کسی کو اس کا مالک بنا دینا دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ یہ لوگ صرف جنت کی نعمتوں کے سزاوار نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ جنتیں ان کی تحویل میں دے دی جائیں گی۔ وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی عطاء ہوں گی لیکن ان پر ان کا ذاتی استحقاق تسلیم کر کے انہیں مزید عزت دی جائے گی۔ مزید فرمایا کہ بڑی سے بڑی نعمت بھی اگر کسی شخص کو چند روز کے لیے دی جائے تو جیسے جیسے اس نعمت کے چھوٹ جانے کا وقت قریب آتا جاتا ہے، نعمت کا مزہ مکدر ہوتا جاتا ہے۔ بلکہ یہ سوچ کر ہی دل غم سے بھر جاتا ہے کہ یہ شب وروز کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ اس لیے اہلِ جنت کے بارے میں فرمایا کہ جنت پر ان کا استحقاق چند روزہ نہیں بلکہ ابدی ہوگا اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، کبھی وہاں سے انہیں نکلنا نہیں ہوگا۔

Marfat.com

مسلمانوں کو جب آخرت کی ابدی پادشاہی کی خوشخبری سنائی جاتی تھی اور جنت کی نعمتوں پر ان کے استحقاق کا ذکر ہوتا تھا تو کافر اس کا مذاق اڑاتے تھے کہ یہ آج کے بھوکے ننگے جنہیں زندگی کی کوئی راحت میسر نہیں یہ مستقبل کی پادشاہی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور اس فریب میں مبتلا ہیں کہ آخرت کی نعمتیں انہیں کے لیے ہیں۔ چنانچہ کافروں کی ان باتوں کا منہ توڑ جواب دینے اور مسلمانوں کے دکھے ہوئے دلوں پر خوشیوں کا مرہم رکھنے کے لیے نہایت تاکید سے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاحب ایمان لوگوں کو جنتیں دینے کا جو ذکر فرمایا ہے یہ محض ایک خوش کن خبر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے وعدے کبھی ٹلا نہیں کرتے۔ اور مزید یہ بات بھی کہ اسے اپنے وعدے پورا کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا۔ نہ اس کے لیے جنت عطاء کرنا مشکل ہے اور نہ ان ظالموں کو سزا دینا اس کے لیے کوئی مسئلہ ہے۔ وہ عزیز ہے، ہر چیز پر غالب۔ وہ جو کرنا چاہے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور اس کے ارادوں کو عملی جامہ پہننے میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح جب وہ کافروں اور ظالموں کو سزا دے گا تو یہ بھی اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ اس نے یہ کائنات بے غائت اور بے حکمت نہیں بنائی۔ وہ حکیم ہے اور اس کے ہر کام کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے اپنی زندگی یہ سمجھ کے گزاری کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے محض کھیل تماشے کے لیے پیدا کی ہے اور یہ کسی حکیم کی تخلیق نہیں بلکہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے تو اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو سزا دے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝۱۰

(اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمہیں نظر آئیں، اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ تمہیں لے کر لڑھک نہ جائے اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلا دیے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا، اور اس میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں۔ ۱۰)

عزیز و حکیم کی شواہد سے وضاحت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عزیز و حکیم ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس کے عزیز و حکیم ہونے پر دلائل و شواہد کی طرف توجہ دلائی۔ جو شخص بھی ان دلائل و شواہد پر ایک نظر ڈالے گا اگر اس کی عقل بالکل جواب نہیں دے گئی تو وہ اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ اس کائنات کا خالق واقعی عزیز یعنی ہر چیز پر غالب و مقتدر ہے۔ اس کی قدرت بے پناہ ہے۔ کائنات کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے تو انسانی عقل متحیر ہو جاتی ہے۔ وہ جب آسمان کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ایک ایسی سقفِ نیلگوں کو ہمارے سروں پر تان دیا گیا ہے جس کی نہ ابتداء دکھائی دیتی ہے اور نہ انتہا۔ اور مزید حیران کن بات یہ ہے کہ اس کے نیچے کوئی ستون بھی دکھائی نہیں دیتا۔ آخر یہ بے کراں گنبد کس کے سہارے کھڑا ہے۔ اس عالمِ افلاک میں بے شمار عظیم الشان ستارے اور سیارے اپنے اپنے مقام پر قائم اور گردش میں ہیں۔ اس کا ایک ایک کُرّہ غیر معمولی وسعت اور طاقت کا مالک ہے۔ لیکن انہیں کس چیز نے تھام رکھا ہے کہ یہ نہ اپنے مدار سے نکلتے ہیں اور نہ ان کی گردش میں کبھی تبدیلی آتی ہے۔ اور نہ کبھی آج تک کوئی کُرّہ غیر متوازن ہو کر گرا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ نے ان کو ایسے ستونوں پر اٹھا رکھا ہے

Marfat.com

جو تمہیں دکھائی نہیں دیتے۔ آج کی علمی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک قانونِ جذب وکشش ہے جس نے اس نظام کو تھام رکھا ہے۔ ممکن ہے یہی حقیقت ہو، لیکن کوئی خبر نہیں انسان کا قدم تحقیق میں آگے بڑھے تو کبھی اسے یہ معلوم ہو کہ اس سے بڑھ کر بھی یہاں کوئی حقیقت کارفرما ہے۔

انسان زمین جیسے چھوٹے ٹکڑے پر آباد ہے اور یہ زمین بھی ایک نہیں، سات ہیں۔ اور اس میں انسان کی بودوباش اور غذاء کی فراہمی کے لیے جو انتظامات کیے گئے ہیں وہ بجائے خود انسانی دسترس سے ماورا حیران کن حقائق ہیں جو اللہ تعالیٰ کے غالب اور مقتدر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ انہیں اسباب میں سے پانی کا اترنا بھی ہے جو بجائے خود حیران کردینے والا عمل ہے۔ اور پھر زمین کی ساخت اور ہیئت کے بارے میں انسان جو کچھ جان سکا ہے اس سے بہت سے اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے زمین پر پہاڑوں کو جما کر ان تمام اندیشوں کا سدباب کردیا ہے۔ اب زمین کی دونوں حرکتیں اپنی اپنی جگہ ایسی متوازن ہیں کہ زمین انہیں کسی ایک طرف لے کر لڑھک نہیں سکتی۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ اسے حکم دے دے۔ اور پھر اسی زمین پر بسنے والے انسانوں اور دیگر مخلوقات کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا عالم یہ ہے کہ اس نے زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگادیں۔ زمین کی پیداوار کو دیکھیں تو اس قدر متنوع ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے۔ اور اگر درختوں پر لٹکتے ہوئے قسم قسم کے پھلوں کو دیکھیں تو اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت انسان کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۠ ﴿۱۱﴾

(یہ تو ہے اللہ کی تخلیق تو اب مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے بلکہ یہ ظالم لوگ ایک صریح گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۱۱)

شرک کے ابطال میں نہایت واضح دلیل

گزشتہ آیتِ کریمہ میں چند تخلیقات کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے سوال کیا ہے کہ اے اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے لوگو! یہ ساری چیزیں تو اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، اس کے علاوہ بھی کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ نے پیدا فرمایا ہے اور تمہیں بھی اس بات کا اعتراف ہے، تو اب بتاؤ کہ تم اس کے سوا دوسری چیزوں کو جو پوجتے ہو، ان کے سامنے سرنیاز جھکاتے ہو، ان سے دعائیں مانگتے اور حاجتیں طلب کرتے ہو، انہوں نے کیا پیدا کیا ہے۔ ان کا کوئی تخلیقی عمل ان کی کسی قدرت کا اظہار، اس سے کسی حکمت کا صدور اگر کہیں ہوا ہے تو بتاؤ۔ زمین وآسمان تو ایک طرف رہے انہوں نے کہیں کوئی چڑیا بھی پیدا کی ہو تو دکھاؤ۔ اور اگر ان کا کائنات کی کسی چیز کے بنانے میں بھی کوئی دخل نہیں تو پھر تم نے انہیں اپنا معبود کیوں بنا رکھا ہے، کیوں ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہو، کیوں ان کی آستانہ بوسی کرتے ہو، اپنی حاجتوں کے لیے ان کے سامنے کیوں دستِ سوال پھیلاتے ہو۔ جب تم خود اعتراف کرتے ہو کہ ان کے پاس فریاد رسی اور حاجت روائی کی کوئی طاقت نہیں اور وہ کسی چیز کے بنانے کا اختیار نہیں رکھتے تو آخر تم کس مقصد کے لیے انہیں پکارتے ہو۔ بگڑی بنانے کے لیے کسی کو پکارنا جبکہ وہ کچھ بھی نہ بنا سکتا ہو تو اس سے زیادہ بے عقلی کی بات اور کیا ہوگی۔ آخر میں فرمایا کہ یہ ظالم لوگ جو اپنے اختیار کا غلط استعمال کر رہے ہیں ان کے پاس اس شرک کے جواز کے لیے کوئی دلیل نہیں۔ بس ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں وہ اپنے آباؤاجداد کی تقلید میں پڑے ہوئے ہیں اور کسی طرح بھی اس سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔

Marfat.com

وَلَقَدْ

اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ یَّشْكُرْ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ
لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ
وَهُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾
وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّ
فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ﴿۱۴﴾ وَ
اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا
وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ
ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ
اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی
السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾
یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ
عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ
لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ
مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ
اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ﴿۱۹﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۲۔ (اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار رہو، اور جو شکر گزار رہو گا تو اپنے لیے ہی ہو گا، اور جو ناشکری کرے گا تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔ ۱۲) اور یاد کرو جبکہ لقمان نے اپنے بیٹے سے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ ۱۳) اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں تاکید کی ہے، اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ ۱۴) اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو، تو ان کی بات ہرگز نہ مان، دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ، مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے، پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے، اس وقت میں تمہیں بتادوں گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۱۵) اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہو، خواہ وہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں یا زمین میں ہو اللہ اسے نکال لائے گا، بے شک اللہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔ ۱۶) اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو، نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو، اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو، یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں۔ ۱۷) اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۸) اور اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اور اپنی آواز کو ذرا پست رکھ، بے شک سب آوازوں سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔ ۱۹)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾

(اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار رہو، اور جو شکر گزار رہو گا تو اپنے لیے ہی ہو گا، اور جو ناشکری کرے گا تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔ ۱۲)

حکمتِ لقمان سے استدلال

شرک کی تردید میں ایک نہایت مؤثر اور راست دلیل دینے کے بعد اب ایک اور پہلو سے شرک کی تردید کی جارہی ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ اہلِ عرب کا خیال یہ تھا کہ محمد ﷺ جس توحید کو پیش کر رہے ہیں اور جس طرح پرزور طریقے سے شرک کی تردید کر رہے ہیں، یہ سراسر ان کا اپنا نقطۂ نگاہ ہے۔ اگر شرک ایسی ہی قابلِ مذمت چیز ہوتی تو ہمارے آباؤ اجداد شرک کا رویہ کیوں اختیار کرتے جبکہ ان میں بڑے بڑے دانشور گزرے ہیں کبھی کسی نے شرک کی مذمت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ چنانچہ ان کے اس غلط تصور کے ابطال کے لیے یہاں قرآنِ کریم حضرت لقمان کے پند و نصائح اور ان کی زندگی سے یہ بات ثابت کر رہا ہے کہ شرک کی مذمت صرف رسول کریم ﷺ نے نہیں فرمائی بلکہ جن

Marfat.com

لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت و معرفت سے کچھ حصہ ملا ہے انہوں نے ہمیشہ اپنے زیر اثر لوگوں کو انہیں باتوں کی تعلیم دی ہے جن کی تعلیم آج نبی کریم ﷺ اور قرآنِ کریم دے رہا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں حضرت لقمان کا ذکر کیا جا رہا ہے اور ان کے ذکر کا سبب یہ ہے کہ اہلِ عرب ایک حکیم اور دانا شخص کے طور پر انہیں جانتے پہچانتے تھے۔ ان کی حکمت کا عرب بھر میں شہرہ تھا۔ ان کے بعض پڑھے لکھے لوگوں کے پاس صحیفۂ لقمان کے نام سے ان کے حکیمانہ اقوال کا ایک مجموعہ بھی موجود تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے مدینے کا سب سے پہلا شخص جو نبی کریم ﷺ کو ملا اور آپؐ کی دعوت سے متاثر ہوا وہ سوید بن صامت تھا۔ وہ مدینہ میں اپنی لیاقت، بہادری، شعر و سخن اور شرف کی بنا پر کامل کے لفظ سے پکارا جاتا تھا۔ اس نے جب آنحضرت ﷺ کی تقریر سنی تو آپؐ سے عرض کیا کہ آپؐ جو باتیں پیش کر رہے ہیں، ایسی ہی ایک چیز میرے پاس بھی ہے۔ آپؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا مجلۂ لقمان۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت تک اہلِ عرب میں لقمان کی حکمت زندہ تھی۔ اور پڑھے لکھے لوگ ان کا مجلّہ بھی اپنے پاس رکھتے تھے۔

لقمان کی شخصیت

تاریخی اعتبار سے لقمان کی شخصیت کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ ابنِ عباسؓ کے نزدیک وہ ایک حبشی غلام تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کا بیان ہے کہ وہ نوبہ کے رہنے والے تھے۔ سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ وہ مصر کے سیاہ رنگ لوگوں میں سے تھے۔ یہ تینوں اقوال اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے قریب قریب ہیں۔ لیکن عرب کی مشہور روایات کی رو سے لقمان قومِ عاد کے ایک فرد اور یمن کے بادشاہوں میں سے تھے۔ جب قومِ عاد پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو جو لوگ اس عذاب سے محفوظ رہے وہ حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ اس قوم کا جو حصہ یمن میں آباد ہوا، لقمان اس کی نسل میں سے تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کے حسب و نسب کی بحث نہیں چھیڑی، صرف یہ کہا ہے کہ تم انہیں بطور ایک حکیم اور دانا کے صرف جانتے نہیں مانتے بھی ہو۔ ان کی حکمت و دانش پر مشتمل بہت سے اقوال آج بھی تمہاری زبانوں پر ہیں۔ اور جو مجلّہ ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان میں کتنی باتیں شرک کے خلاف کہی گئی ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کی جن نصیحتوں کو ذکر فرمایا ہے اس کے حتمی انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں اہلِ عرب میں ان کے حوالے سے معروف تھیں۔ اور اس بات سے تو کسی کو انکار نہ تھا کہ لقمان ایک حکیم تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم و دانش اور حکمت سے نوازا تھا۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اسی بات کو بنیاد بنا کے فرمایا کہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار رہو۔ کیونکہ حکمت کا اولین ثمر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔

حکمت کا اولین ثمر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے

اللہ تعالیٰ جس بندے کو اس دولت سے بہرہ مند فرماتا ہے اس کا اولین اثر جو اس پر مترتب ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جب اس بات پر غور کرتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اس کے جسمانی اعضاء و جوارح، اس کی جسمانی توانائی، اس کے حواس، اس کا جوہرِ عقل، اس کی دماغی رعنائیاں، اس کے اندر خیر و شر کے امتیاز کا شعور، پھر اس کی بقاء کے لیے غذاء کے مختلف وسائل اور اس کی زندگی کی رہنمائی کے لیے عقل اور شعور کے ساتھ ساتھ وحیِ الٰہی کا سلسلہ، ان میں سے کوئی سی چیز بھی میری اپنی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ تو جس پروردگار نے مجھ پر اس قدر احسانات کیے ہیں کیا میری زبان کو ان کا اعتراف نہیں کرنا چاہیے۔ کیا میرے

Marfat.com

جسم و جان کو اس کی اطاعت میں کوشاں نہیں ہونا چاہیے، کیا میرے دل و دماغ کی قوتوں کو اس کی رضا کی طلب میں پگھلنا نہیں چاہیے اور وہ جن کاموں میں راضی ہے اور مجھ سے جس طرح کی قربانیاں چاہتا ہے کیا مجھے ان سے کبھی بھی پس و پیش کرنا چاہیے۔ ہرگز نہیں، بلکہ اس کی نعمتوں کی شکرگزاری یہ ہے کہ میری زبان، میرا ذہن، میرا دل اور میرے اعضاء و جوارح اسی کے احکام کی اطاعت اور اسی کے دین کی سربلندی میں مرتے اور کھپتے رہیں۔ اور مجھ پر دوسری مخلوقات کے حوالے سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں اس میں کبھی مجھ سے کوتاہی سرزد نہ ہونے پائے۔ یہ وہ شکرگزاری کا جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حکمت کے طور پر حضرت لقمان کو عطا کیا تھا، اور اسی کی تعلیم ہر پیغمبر نے دی ہے۔

دفع دخلِ مقدر

مزید فرمایا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں سے اپنی شکرگزاری کا جو مطالبہ کیا ہے تو اس میں اس کا کوئی اپنا نفع ہے۔ اس کا اپنا کوئی نفع نہیں، بلکہ اسے اس نے اپنے بندوں ہی کے نفع کے لیے پسند فرمایا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کا شکرگزار رہتا ہے اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس مقصد کے سائے میں گزرتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر فیصلہ ہمیشہ اپنی حدود میں محدود رہ کر ہوتا ہے اور وہ کبھی اپنے حدود سے تجاوز کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ شکرگزاری کے جذبے سے ایک طرف آدمی میں استغناء پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ سرتاپا ایثار بن جاتا ہے۔ لیکن جو شخص اس جذبے سے محروم رہتا ہے اور وہ شکرگزاری کی بجائے ناشکری اور کفرانِ نعمت کرتا ہے وہ اپنی دنیا کو بھی دکھوں سے بھر دیتا ہے اور اپنے آپ کو آخرت کی خوشیوں سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ رہا اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ نہ کسی کی شکرگزاری اسے فائدہ پہنچاتی ہے اور نہ کسی کی ناشکری سے اسے کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کی بے نیازی کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہے۔ اور یہ تمام صفات اس کی ذاتی ہیں۔ کسی شخص کا رویہ نہ اس میں اضافہ کر سکتا ہے نہ کمی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اسی بے نیازی کا نتیجہ ہے کہ کوئی شخص چاہے اس کا کیسا ہی ناشکرا اور اس کے احسانات کی کیسی ہی ناقدری کرنے والا ہو، لیکن اس دنیا میں وہ کسی کو اپنے رزق و فضل سے محروم نہیں کرتا۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿١٣﴾

(اور یاد کرو جبکہ لقمان نے اپنے بیٹے سے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ ۱۳)

لقمان کی پہلی نصیحت

اللہ تعالیٰ جس شخص کو حکمت سے بہرہ ور فرماتا ہے اسے یہ بات جاننے میں دیر نہیں لگتی کہ اصل حکمت اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری ہے۔ اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے راستے پر چل نکلتا ہے تو اس پر خود بخود یہ بات کھل جاتی ہے کہ جب تمام نعمتوں کا عطا کرنے والا پروردگار ہے اور ہر نعمت پر اس کا شکر واجب ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کیا جائے۔ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کا نتیجہ ہے۔ اور اس کی ہر نعمت جو مخلوقات کو پہنچ رہی ہے وہ اس کی عطا و بخشش کی رہینِ منت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدا بھی وہی کرتا ہے اور عطا بھی وہی کرتا ہے۔ تو پھر کسی اور کی شرکت کا اس میں سوال کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ بات ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو از راہِ نصیحت فرمائی

Marfat.com

کہ اے میرے بیٹے! اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ کیونکہ یہ ایک ایسی نامعقول، خلافِ واقعہ اور خلافِ حق بات ہے جس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا ظلم کہلاتا ہے۔ جوتے کو سر پر رکھ لینا اور ٹوپی کو پاؤں میں پھنسا لینا یہ دونوں کے ساتھ ظلم ہے۔ کیونکہ دونوں کو اپنے اپنے محل سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ ہر عظمت اس کے سامنے جھکے۔ اس کی رزق رسانی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ زبان و دل پر اسی کی حمد و ثناء ہو۔ زندگی کے ہر معاملے میں اس کی رہنمائی اور نفع رسانی اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ ہر لحاظ سے اس کا شکر ادا کیا جائے۔ لیکن جب کسی دوسری قوت کو جوان تمام صفات سے تہی دامن ہے ان حقوق میں شریک کیا جائے گا تو یہ ظلمِ عظیم ہے، جس سے بڑی زیادتی اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت لقمان نے یہ نصیحتیں اس وقت فرمائی ہیں جب وہ اپنے بیٹے سے مخاطب تھے۔ گیا گزرا باپ بھی اپنے بیٹے کو کبھی غلط بات کہنا پسند نہیں کرتا۔ اس کا اپنے بیٹے کے ساتھ اخلاص کا ایک ایسا رشتہ ہے جس کی ہمسری کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ تو حضرت لقمان کا اپنے بیٹے کو بڑی دلسوزی کے ساتھ یہ نصیحت کرنا اور شرک کو ظلمِ عظیم قرار دینا یہ بات بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ شرک کو بدترین فعل سمجھتے تھے۔ اور ان کے نزدیک شرک نہایت ہولناک گمراہی کا نام تھا۔

دوسری وجہ ان کی نصیحت کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو حکمت و دانش کی دولت عطا فرماتا ہے وہ اپنی اولاد کو شرک کے راستے پر چلنے سے روکتا ہے۔ وہ شرک سے اپنی اولاد کو اس طرح بچاتا ہے جیسے آگ اور طاعون سے بچایا جاتا ہے۔ اس سے قریش کو یہ بتانا مقصود ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا کی ان کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو شرک سے بچاتے تھے۔ اور تمہارا طرزِ عمل یہ ہے کہ تم اپنی اولاد کو دینِ شرک پر قائم رہنے اور نبی کریم ﷺ کی دعوتِ توحید سے منہ موڑ لینے پر مجبور کر رہے ہو۔ اس سے اندازہ کرلو کہ تم اپنی اولاد سے خیر خواہی کر رہے ہو یا بدخواہی۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي
وَلِوَالِدَيْكَ ۭ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿۱۴﴾ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ
عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ۚ ثُمَّ إِلَيَّ
مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾

(اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں تاکید کی ہے، اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ ۱۴) اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں، تو، تو ان کی بات ہرگز نہ مان، دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ، مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے، پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے، اس وقت میں تمہیں بتادوں گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۱۵)

Marfat.com

نصائح کے ضمن میں جملہ معترضہ

یہ دو آیتیں حضرت لقمان کی نصیحت کے ضمن میں جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کا حق ادا کرنے کی نصیحت کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حق کے پہلو بہ پہلو اپنے حق کا ذکر انہوں نے خلافِ ادب سمجھا۔ اس لیے آگے بڑھ کر انہوں نے قیامت کا ذکر شروع کر دیا۔ ان کی حکمت و دانش سے یہی امید کی جاسکتی تھی۔ لیکن حقوق کے ضمن میں پروردگار نے جو ایک فطری ترتیب رکھی ہے اس کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد والدین کے حق کا ذکر کیا جاتا۔ چنانچہ پروردگار نے اس خلاء کو اپنی طرف سے بھر دیا اور ان دو آیتوں سے انسان پر جو اس کے والدین کا حق ہے اس کی وضاحت فرمادی۔ اور اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ شکر دراصل ایفائے حقوق کا نام ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کے بعد والدین کے حقوق سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سب سے پہلا حق اس کی عبادت ہے۔ لیکن والدین کا تمام تر حق خدمت سے تعلق رکھتا ہے، عبادت سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ اور یہ بھی اشارہ فرمادیا کہ خدمت باپ اور ماں دونوں کی اولاد پر لازم ہے۔ لیکن ماں حقِ خدمت میں باپ سے زیادہ توجہ کی مستحق ہے۔ بچے کے لیے باپ کی قربانیاں یقیناً بے مثال ہیں۔ لیکن ماں نے جس طرح دکھ پر دکھ اور مشقت پر مشقت اٹھا کر بچے کو اپنے پیٹ میں رکھا اس کی مثال ممکن نہیں۔ اور پھر دو سال تک اپنا خونِ جگر بچے کے منہ میں نچوڑا۔ یہ بجائے خود ایثار کی لاجواب مثال ہے۔ اس لیے ہر انسان پر جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر لازم ہے اسی طرح والدین کا بھی شکر لازم ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور غیر مشروط اطاعت کی جائے گی۔ لیکن والدین کی خدمت اور مشروط اطاعت ہوگی۔ اور یہ سب کچھ اس احساس کے تحت ہوگا کہ ایک روز میری طرف ہی پلٹ کر آنا ہے۔ وہاں جس طرح ہر عمل کا حساب ہوگا، اسی طرح نیتوں کا بھی احتساب ہوگا۔

ماں باپ کا حق چونکہ اللہ تعالیٰ کے حق کے تابع ہے اس لیے اگر کبھی ماں باپ اپنے حق کے حوالے اللہ تعالیٰ کے حق میں مداخلت کی کوشش کریں اور اس کی ذات اور صفات یا حقوق میں کسی اور کو شریک کرنے کا حکم دیں اور اولاد کو اگر اس کی تعمیل سے انکار ہو تو وہ بار بار اپنے حق کا حوالہ دیں تو واضح طور پر ہدایت فرمائی گئی کہ اس میں کبھی ان کی بات نہ ماننا۔ کیونکہ کسی بھی مخلوق کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں نہیں کی جاسکتی۔ اور شرک صرف نافرمانی ہی نہیں بلکہ سب سے بڑا جرم ہے۔ البتہ مشرک اور غیر مسلم والدین کے بارے میں یہ اجازت مرحمت فرمائی کہ دنیا کے معاملات میں ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آیا جائے، ان کی ضروریات حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان کی ہدایت کے لیے برابر دعا بھی کی جائے۔ حضرت اسماءؓ کی والدہ مکہ معظمہ سے آئیں اور اپنی بیٹی سے مالی مدد کی طالب ہوئیں۔ حضرت اسماءؓ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ میری والدہ ابھی تک ایمان نہیں لائیں، وہ مجھ سے مالی تعاون چاہتی ہیں تو کیا میں ان کی مدد کرسکتی ہوں۔ تو آپ ؐ نے فرمایا ضرور کرو۔

شرک کے معاملے میں والدین کی اطاعت نہ کرنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ صرف شرک ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں صرف اس شخص کے راستے پر چلا جاسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار اور اس کے راستے پر چلنے والا ہے اور جو پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ چکا ہے۔ کیونکہ صرف یہی وہ شخص ہے جس کی پیروی اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑنے کا ذریعہ بن سکتی ہے

Marfat.com

اور دلوں میں اس بات کو پوری طرح پیوست کرسکتی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔اس وقت ہر ایک کا عمل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کے اپنے اعمال کے مطابق ہوگا۔اگر والدین نے حدود سے تجاوز کیا ہوگا تو وہ اس کی سزا بھگتیں گے۔اور اگر اولاد نے فرقِ مراتب کا پورا لحاظ رکھا ہوگا تو وہ اس کا صلہ پائیں گے۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۶﴾

(اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہو، خواہ وہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں یا زمین میں ہو اللہ اسے نکال لائے گا، بے شک اللہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔ ۱۶)

دوسری نصیحت آخرت سے متعلق

گزشتہ آیات حضرت لقمان کی نصیحتوں کے درمیان ایک جملہ معترضہ تھا جسے پروردگار نے حضرت لقمان کی نصیحتوں میں جو خلاء رہ گیا تھا اسے بھرنے کے لیے ارشاد فرمایا تھا۔اور خلاء کا سبب کوئی سہو نہیں تھا بلکہ حضرت لقمان نے ادب کے تقاضے کے طور پر اس کے ذکر سے احتراز کیا تھا، اب اسی سلسلۂ نصیحت کو پھر شروع کیا جا رہا ہے۔نصیحت کے آغاز میں حضرت لقمان نے بیٹے کو شرک سے اجتناب اور توحید کی تعلیم دی ہے۔توحید اگرچہ تمام عقائد کی اساس اور ان کا خلاصہ ہے، لیکن عملی زندگی میں توحید کے بعد بنیادی عقیدہ آخرت کا عقیدہ ہے۔چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں حضرت لقمان اپنے بیٹے کو آخرت کی یاددہانی کرا رہے ہیں۔آخرت پر یقین لانے کے راستے میں مشرکین کو جو رکاوٹ پیش آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم کی بے پناہی اور اس کی قدرت کے لامتناہی ہونے میں ان کی کوتاہی اور نارسائی ہے۔انہوں نے اپنے مزعومات کے مطابق یہ فرض کرلیا ہے کہ انسان کا مکمل فنا ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے شاید بعید ہے۔اسی طرح اس کے بیشمار اعمال کا حساب لینا یہ بھی مستبعد از عقل ہے کیونکہ ہر شخص کے زندگی کے اعمال اس قدر لامتناہی ہیں کہ ان کا کسی طرح استقصاء نہیں کیا جاسکتا۔ان کی ان دونوں کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا کہ بیٹا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور اس کے علم کا کوئی کنارہ نہیں۔اگر کسی شخص کا عمل اچھا ہو یا برا، رائی کے دانے کے برابر بھی ہوا، خواہ وہ کسی چٹان یا گھاٹی کے نیچے چھپا ہوا یا آسمان کی بے کنار وسعتوں میں یا زمین کی پہنائیوں میں کہیں مخفی ہو اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہیں کہ وہ اسے نکال لائے۔کیونکہ ہر انسان کا ہر عمل اس کے علم میں بھی ہے اور اس کو انسان کے سامنے پیش کر دینا اس کی قدرت میں بھی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لطیف یعنی نہایت باریک بین ہے۔کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہ سکتی۔اور وہ نہایت باخبر بھی ہے، کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں رہ سکتی۔

اِنَّهَآ میں ضمیر وہ ہے جسے ضمیر قصہ یا ضمیر شان کہا جاتا ہے۔اس میں متکلم ضمیر کو اپنے معہودِ ذہنی کے مطابق لاتا ہے۔یہاں معہودِ ذہنی "حَبَّةٍ خَرْدَلٍ" کے برابر عمل ہے۔اس وجہ سے حَبَّة کی رعایت سے ضمیر مونث لائی گئی ہے۔

Marfat.com

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝17

(اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو، نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو، اور جو مصیبت تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو، یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں۔ ۱۷)

تین نصیحتیں

توحید اور آخرت کے بارے میں تاکید کرنے کے بعد حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو اقامتِ صلوٰۃ کی نصیحت فرمائی۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد صرف نماز پڑھنا نہیں بلکہ اس کے لیے ہر طرح کا اہتمام بروئے کار لانا ہے اور ان تمام تعلیمات کو پیشِ نظر رکھنا ہے جو آنحضرت ﷺ سے نماز کے بارے میں منقول ہیں۔ اور ان مقاصد کو بھی سامنے رکھنا ہے جو نماز کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے چاہئیں۔ اور پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی بندگی کا جو تصور کارفرما ہے اسے بروئے کار لانا اس کے مفہوم و معنی کا ایک حصہ ہے۔ اور مزید یہ کہ صلوٰۃ ہی ایک ایسا عمل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت، ذات و صفات اور حقوق میں اس کی وحدت، پھر زندگی کے ہر ہر عمل کی جواب دہی کا استحضار اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی، فروتنی اور انتہائی تذلل کا اظہار اس کے اولین فوائد میں سے ہے۔ اس لیے حضرت لقمان نے بطورِ خاص بیٹے کو اقامتِ صلوٰۃ کی نصیحت کی۔

نصیحت میں دوسری بات یہ فرمائی کہ نیکی کا حکم دو، اس کے لیے معروف کا لفظ استعمال فرمایا۔ معروف کا اطلاق ہر اچھائی اور بھلائی پر ہوتا ہے جو معاشرے میں اچھائی کے طور پر ہر سلیم الفطرت آدمی قبول کر چکا ہو۔ اور اس کے علاوہ ہر وہ نیکی جس کا قرآن و سنت میں حکم دیا گیا ہے یا نبی کریم ﷺ نے اسے پسند فرمایا ہے۔ اور یہ اظہارِ پسندیدگی، قول، عمل اور خاموشی تینوں صورتوں میں معتبر ہے۔ اور مزید یہ بات بھی کہ اس کا اطلاق شریعت کے تمام احکام پر ہوتا ہے، خواہ ان کا تعلق حقوق العباد سے ہو یا حقوق اللہ سے۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں چونکہ اس کا ذکر صلوٰۃ کے بعد آیا ہے اس لیے قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس میں وہ تمام کام شامل ہیں جو حقوق العباد کی ادائیگی سے تعلق رکھتے ہوں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاق، یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں اور دوسرے مستحقین کی مدد۔ اور ایسے ہی وہ تمام کام جن کا تعلق اجتماعی زندگی کی بھلائی اور رفاہیت سے ہو۔

ان تمام کاموں سے روکنے کی نصیحت فرمائی ہے جو معروف کی ضد ہیں۔ یعنی جن باتوں سے شریعت نے روکا ہے یا معاشرے کا اجتماعی احساسِ خیر ان سے ابا کرتا ہے ایسی سب چیزیں اس میں شامل ہیں۔ حضرت لقمان نے مزید کہا کہ جب تم لوگوں کو نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے تو انسانوں میں بگڑے ہوئے لوگوں کے گروہ تمہیں برداشت نہیں کریں گے۔ اور اگر ان کے بس میں ہوا تو وہ تمہیں مصائب کا نشانہ بنا دیں گے۔ ایسے حالات میں مصائب سے گھبرا کر نیکی کا حکم دینے اور برائی کو روکنے سے رک نہ جانا، کیونکہ یہ اس راہ کی لازمی سنت ہے جسے برداشت کیے بغیر نیکی کا فروغ ممکن نہیں اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی بندگی کے غالب آنے کی کوئی امید نہیں۔ اس لیے اس راہ میں نہایت حوصلہ مندی اور احساسِ عزیمت کی ضرورت ہے۔ یہ ایسا کام ہے جس کی سعادت اللہ تعالیٰ کے عظیم بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اور کتنے ایسے عظیم بندے گزرے ہیں جو اس راہ میں کام آ چکے ہیں۔ اس لیے اس کام کو بے دلی سے کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اور کبھی بھی کم ہمتی کو قریب نہ آنے دینا۔ اس راستے میں نہ کوئی رخصت کا تصور ہے اور نہ کسی طرح کی کوتاہی کا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر بے انتہاء اجر و ثواب رکھا ہے۔

Marfat.com

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝۱۸ۚ

(اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۸)

تصعیر خد کا مفہوم اور اس سے ممانعت

''صعر'' عربی زبان میں ایک بیماری کو کہتے ہیں جو اونٹ کی گردن میں پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اونٹ دونوں طرف گردن نہیں پھیر سکتا بلکہ ایک ہی طرف پھیرے رکھتا ہے۔ اسی سے محاورہ پیدا ہوا۔ فُلَانٌ صَعَّرَ خَدَّهٗ ''فلاں شخص نے اونٹ کی طرح اپنا کلہ پھیر لیا۔'' یعنی تکبر کے ساتھ پیش آیا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی محاورے کی زبان میں بات کی گئی ہے۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ بیٹا کبھی کسی چھوٹے آدمی سے منہ پھیر کر بات نہ کرنا، یہ تکبر کا انداز ہے اور تکبر اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ جب اسے اللہ تعالیٰ عہدہ و منصب یا مال و دولت دیتا ہے تو وہ غریبوں اور ماتحتوں سے منہ پھیر کر تکبر سے بات کرتا ہے، تم کبھی ایسا نہ کرنا۔

تکبر کی چال کی ممانعت

دوسری نصیحت یہ کی کہ زمین پر اکڑ کر نہ چلنا۔ جس طرح گفتگو اور میل جول میں تکبر کا انداز اختیار کرنے سے روکا، اسی طرح چال اور رفتار میں بھی عاجزی اور وقار کی نصیحت کی اور کبر و غرور کی چال سے منع کیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں بھی اخلاقی ہدایات کے سلسلہ میں یہ ہدایت گزر چکی ہے۔ البتہ وہاں انسان کی بے بسی، کمزوری اور عاجزی کو نمایاں کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ تم آخر زمین پر اکڑ کر کیوں چلو، جبکہ تمہارا حال یہ ہے کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ یہ خدا کی قدرت و عظمت کے آثار ہیں جو تمہارے اپنے مسکن یعنی زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہ تمہیں ہر وقت یاد دلاتے ہیں کہ تم بندہ ہو اور بندہ کو عاجزی زیب دیتی ہے۔ اور کبریائی اور عظمت اللہ تعالیٰ کی شان ہے جس کا اظہار اس کی بعض عظیم مخلوقات سے بھی ہوتا ہے۔ تو جو شخص سر اٹھا کر چلتا ہے اور گردن اکڑا کے چلتا ہے اور بار بار زمین پر پاؤں پٹختا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دماغ میں کبر کی ہوا بھری ہوئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا عاجز بندہ اور دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان نہیں سمجھتا بلکہ بڑی چیز گمان کرتا ہے۔ اور یہ چال انسان کے اندر کی کمزوریوں کو اس طرح نمایاں کر دیتی ہے کہ چلتے ہوئے اس کا ہر قدم اور دیکھتے اور بولتے ہوئے اس کے چہرے کے انداز بتا دیتے ہیں کہ یہ شخص خود پسندی کا مریض ہے۔ اور بجائے اپنی عقل اور دین کی گرفت میں آنے کے نفس کی گرفت میں آیا ہوا ہے۔ اس لیے حضرت لقمان نے خاص طور پر اپنے بیٹے کو اس سے روکا۔ اور قرآنِ کریم نے اور بھی مختلف مواقع پر مسلمانوں کو ہدایت دیتے ہوئے کبر و غرور کو بدترین عادت قرار دیا۔ اور اس طرح کی رفتار سے منع فرمایا۔ انہیں ہدایات کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ اس طرح چلتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا لیکن زمین پر اللہ تعالیٰ کے دین کے نفاذ کی ذمہ داری کو پورا کرنے والا چلتا ہے۔ اور جب کسی شخص کو ایسی تکبر کی چال یا مسکینی سے چلتا ہوا دیکھتے تھے تو وہ انہیں ناگوار گزرتا تھا۔ ایک شخص کو حضرت عمر فاروقؓ نے نہایت مسکینی سے سر جھکائے ہوئے چلتے ہوئے دیکھا، تو ڈانٹتے ہوئے فرمایا، سر اٹھا کر چل، اسلام مریض نہیں۔ ایک دوسرے شخص کو مریل چال چلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ ظالم ہمارے دین کو کیوں مارے ڈالتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو تکبر کے انداز میں چلتے ہوئے دیکھا تو آنحضرت ﷺ نے اسے ٹوکا، اور کبر و غرور کی ہمیشہ مذمت فرمائی۔ اور آیت کے آخر میں اسی سلسلے میں سخت تنبیہ بھی فرمائی۔ فرمایا، اللہ تعالیٰ کسی اکڑنے

Marfat.com

والے، یعنی کسی خود پسند اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا، اور پسند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے عذاب کا مستحق ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کسی کو پسند نہ کرنا یہ اس کے غیظ وغضب کی علامت ہے اور اس کے نتیجہ میں کیا ہوسکتا ہے ہم اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝۱۹

(اور اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اور اپنی آواز کو ذرا پست رکھ، بے شک سب آوازوں سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔ ۱۹)

چال میں میانہ روی اور آواز میں فروتنی اور احساسِ ذمہ داری

اوپر کی آیت میں دو نصیحتیں حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کیں۔ ایک یہ کہ لوگوں سے بے رخی سے پیش نہ آنا۔ اور دوسری یہ کہ زمین پر اکڑ کر نہ چلنا۔ ان دونوں نصیحتوں کو نہی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ بری عادتیں ہیں ان سے بچ کے رہنا۔ اب انہی دونوں باتوں کو مثبت انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ اکڑ کر نہ چلنے کا مفہوم یہ ہے کہ چال اور رفتار میں اعتدال، میانہ روی، تواضع اور فروتنی پیدا کرو۔ دیکھنے والا یہ گمان کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا عاجز بندہ جا رہا ہے جس میں بندگی کی فروتنی بھی ہے اور ذمہ داری کا احساس بھی۔ اور بے رخی سے بات نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دھیمے لہجے میں نہایت عاجزی اور ہمدردی سے دوسروں سے بات کرو۔ ضرورت بلند آواز سے بولنے کی ہے تو بلند آواز سے بولو۔ کیونکہ بعض دفعہ بوڑھے لوگوں کو حوصلہ دینے کے لیے زور سے بولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر سننے والے قریب، پڑھے لکھے اور مہذب لوگ ہوں تو آہستگی سے بات کرو۔ اور آہستگی کی بھی ایک سطح نہیں ہوسکتی اس میں بھی حسب ضرورت تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ہی قسم کی آواز پر پیدا نہیں فرمایا بلکہ اس کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ اپنی آواز کو پست بھی کرسکتا ہے اور بلند بھی۔ تو وہ اپنی صلاحیت کو موقع اور محل کے مطابق استعمال کرسکتا ہے۔ البتہ جس آواز سے نفرت سکھائی گئی، حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو اس سے بچانا چاہا، وہ آواز وہ ہے جسے گدھے کی آواز کہا گیا ہے۔ گدھے کی آواز میں قدرت نے بلندی کے ساتھ ساتھ کراہت کا پہلو بھی رکھا ہے۔ اور مزید یہ بات بھی کہ اسے یہ صلاحیت نہیں دی گئی کہ وہ اپنی آواز میں کمی بیشی بھی کرسکتا ہو۔ وہ جب بھی بولتا ہے ایک ہی آواز اور ایک ہی رفتار سے ہینکتا ہے جس سے سننے والوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کو ایسا لب ولہجہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حُسنِ بیان اور حُسنِ کلام کی نعمت سے نوازا ہے۔ اسے اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ گدھے کی طرح ہمیشہ اپنا حلق اور لوگوں کے کان پھاڑنے کی کوشش کرے۔ اور لوگوں پر رعب جمانے اور انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے کرخت اور سخت لب ولہجہ اختیار کرے۔

ان ہدایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لقمان کو کسی نہ کسی طرح کی سیادت حاصل تھی۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے تو ان کی عمر کی شام ڈھل رہی تھی اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے حالات کے مطابق ان کا بیٹا جانشین ہوگا۔ اس لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ ان کے جانشین میں اچھی سیادت کے لیے جو صفات ہونی چاہئیں وہ اپنے بیٹے پر واضح کردی جائیں۔ اسی لیے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں فرمائیں ان میں اصلاحِ عقیدہ کے ساتھ ساتھ حُسنِ اخلاق، حُسنِ معاشرت اور حُسنِ حکومت سب کچھ شامل تھا۔

Marfat.com

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ

مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ
بَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی
وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ
مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰی عَذَابِ
السَّعِیْرِ ﴿۲۱﴾ وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَی اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ
بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی ؕ وَاِلَی اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا یَحْزُنْكَ
كُفْرُهٗ ؕ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُهُمْ قَلِیْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰی عَذَابٍ غَلِیْظٍ ﴿۲۴﴾
وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ
الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ
وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۷﴾ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۲۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ
فِی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؗ كُلٌّ یَّجْرِیْۤ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّ

Marfat.com

اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٩﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٣٠﴾ ع

رکوع: ۳۔ (کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اس نے تمام کردی ہیں تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں، پھر بھی لوگوں میں ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر کسی علم، ہدایت اور کتابِ منیر کے جھگڑا کرتے ہیں۔ ۲۰) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا اس صورت میں بھی جبکہ شیطان ان کو عذابِ دوزخ کی طرف بلا رہا ہو۔ ۲۱) جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور وہ خوب کار بھی ہو تو بے شک اس نے مضبوط رسی تھام لی، اور انجام کار تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۲۲) اور جو شخص کفر کرتا ہے اس کا کفر آپ کو غم میں مبتلا نہ کرے، انہیں پلٹ کر آنا تو ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں، یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ ۲۳) ہم تھوڑی مدت انہیں دنیا میں مزے کرنے کا موقع دے رہے ہیں پھر ان کو ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔ ۲۴) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا، تو وہ ضرور کہیں گے، اللہ نے۔ کہیے، الحمدللہ۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ۲۵) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔ ۲۶) اور اگر زمین میں جو درخت ہیں قلم بن جائیں اور سمندر سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہیں ہوں گی، بے شک اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۲۷) (اور تم کو پیدا کر دینا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا بس ایسا ہی ہے جیسے ایک متنفس کو پیدا کر دینا اور جلا اٹھانا، بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ ۲۸) کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ ہی ہے جو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، ہر ایک گردش کرتا ہے ایک مقررہ وقت تک، اور یہ کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۲۹) یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو جو لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں، اور بے شک اللہ ہی برتر اور عظیم ہے۔ ۳۰)

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿٢٠﴾

Marfat.com

(کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اس نے تمام کردی ہیں تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں، پھر بھی لوگوں میں ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر کسی علم، ہدایت اور کتاب منیر کے جھگڑا کرتے ہیں۔ ۲۰)

توحید اور شکر پر دلائلِ آفاق سے استدلال

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اسی کے شکر پر زور دیا گیا ہے۔ اور اسی کی تائید میں لقمان کی حکمتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اب اسی پر دلائلِ آفاق سے استدلال کیا جارہا ہے۔ اور انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ ہر مخاطب کی قوتِ مشاہدہ کو متوجہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ جو بات دلیل میں کہی جارہی ہے وہ ایسی بات نہیں جس کا تعلق دماغ کے گہرے غور وفکر سے ہو اور اسے سمجھنے کے لیے کسی بڑی عقل کی ضرورت ہو۔ کیونکہ ہر شخص بچشمِ سر دیکھتا ہے کہ وہ اپنی شب و روز کی زندگی میں جن نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے یہ نعمتیں اس کی اپنی قوت یا تدبیر سے اس کی دسترس میں نہیں آئیں۔ بلکہ وہ سراسر اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں۔ مثلاً وہ جس زمین پر چلتا ہے اور آسمان کی جس چھت کے نیچے رہتا ہے اور پھر زمین کی مختلف نعمتوں سے مستفید ہوتا ہے، اس کے ابلتے ہوئے چشموں سے پیاس بجھاتا ہے، آسمان سے برستی بارشوں سے سیرابی کا سامان کرتا ہے اور پھر زمین کی فیض رسانی سے غلہ، نباتات اور قسم قسم کے پھل حاصل کرتا ہے۔ سورج کی روشنی اس کے چولھوں کو دہکاتی اور اس کے غلے کو پکاتی ہے۔ ہوا اس کے لیے مختلف خدمات انجام دیتی ہے۔ غرضیکہ بے شمار نعمتیں ہیں جو اس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ہیں اور زندگی کی کوئی ضرورت ایسی نہیں جس کا انتظام اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے نہ کردیا ہو۔ ان ظاہری نعمتوں کے ساتھ ساتھ باطنی نعمتیں بھی ہیں جن کا دماغ کی رعنائیوں، عقل کی رسائیوں اور قلب کے سوز و گداز سے تعلق ہے۔ اور کتنے ایسے احساسات ہیں جن کا روح کی بالیدگی سے رشتہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ظاہری اور باطنی نعمتیں جن کا شمار ممکن نہیں، کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور نے عطا کی ہیں یا یہ سب کچھ انسان کی اپنی صلاحیت اور محنت کا نتیجہ ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور شکر کا سزاوار کیونکر ہوسکتا ہے اور اس کے ساتھ الوہیت میں کس طرح شریک ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

تسخیر کا مفہوم

یاد رہے کہ آیتِ کریمہ میں آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو انسانوں کے لیے مسخر کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہتر ہے کہ اس کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ تسخیر میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ کسی چیز کو کسی کے تابع کردیا جائے اور اسے تصرف کا اختیار دے دیا جائے کہ جیسے چاہے اسے استعمال کرے۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس چیز کو کسی کے سپرد تو نہ کیا جائے البتہ ایک ضابطے کا پابند کردیا جائے جس کی وجہ سے وہ ہر اس شخص کو نفع پہنچانے کی پابند ہو جو اس سے مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مفہوموں کے مطابق انسان کے لیے چیزوں کو مسخر کیا ہے۔ مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات اور مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے اختیار میں دی گئی ہیں اور ہر طرح کے تصرف کی اس میں آزادی دی گئی ہے۔ لیکن چاند سورج وغیرہ ان کو انسان کی خدمت کا پابند کردیا گیا ہے۔ سورج اس بات کا مکلف کیا گیا ہے کہ وہ انسان کو روشنی بہم پہنچائے، اس کی فصلوں کو پکائے اور اس کی آبیاری کے لیے سمندروں سے بھاپ اٹھائے۔ اسی طرح چاند کو بھی بعض ضوابط کے تحت انسان کو افادہ کا پابند کردیا گیا ہے۔ وہ غلے میں گداز پیدا کرتا ہے، پھلوں میں مٹھاس پیدا کرتا ہے، سمندر میں جوار بھاٹا کا باعث بنتا ہے وغیرہ۔

Marfat.com

مشرکین کا بے دلیل مجادلہ

حیرانی کی بات ہے کہ اتنی واضح دلیلوں کے باوجود ایسے انسانوں کی کمی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بحث کرتے اور جھگڑا کرتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں بہت سے اشکالات ہیں۔ حالانکہ نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے نہ کوئی رہنمائی اور نہ کسی روشن کتاب کی کوئی سند انہیں حاصل ہے۔ علم سے مراد دلیل بھی ہوسکتی ہے خواہ وہ عقلی ہو یا نقلی۔ اس سے مراد وہ علم بھی ہوسکتا ہے جو ظن وگمان کے مقابلے میں یقین پیدا کرتا ہے ھدیٰ سے مراد رہنمائی ہے، جس کی عملی صورت اللہ تعالیٰ کے نبی اور ان کے راستے پر چلنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی لیے سبیل المومنین کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس سے کتاب اللہ کی ہدایت بھی مراد ہوسکتی ہے۔ چنانچہ کتابِ منیر سے پہلے اس کا ذکر خاص سے پہلے عام کے ذکر کے طور پر ہے۔ لیکن زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس سے انبیاء علیہم السلام کی وہ رہنمائی مراد لی جائے جو کتاب کی تشریحات کی صورت میں بھی ہوتی ہے اور اس کی عملی تعبیرات کی صورت میں بھی۔ اور کتابِ منیر سے مراد نزولِ قرآن کے بعد قرآنِ کریم جیسی روشن کتاب ہے۔ جس نے جہالت اور تعصب کی ہر تاریکی کو روشن کر دیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿٢١﴾

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا اس صورت میں بھی جبکہ شیطان ان کو عذابِ دوزخ کی طرف بلا رہا ہو۔ ۲۱)

بے دلیل مجادلہ کی مثال

گزشتہ آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ لوگوں میں ایسے ہٹ دھرم لوگ بھی ہیں جو دلیل کی بات ماننے کی بجائے ایسی باتوں پر اصرار کرتے ہیں جن کا علم یا دلیل سے کوئی رشتہ نہیں۔ گویا ان کا مجادلہ سراسر علم کی تائید کے بغیر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں ان کے ایسے ہی مجادلے کا ذکر کیا جارہا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی کتاب کی پیروی کرو اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے نبی پر نازل کیا جارہا ہے اس کا اتباع کرو۔ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نے جس طریقے پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے۔ اس سے ہٹ کر ہم کوئی نئی راہ اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ اندازہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی ذات اور اس کا حُسنِ کردار بجائے خود ایک ایسی مضبوط دلیل ہے کہ جس پر جھوٹ کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اور اس پر نازل ہونے والی کتاب اپنے اندر ایسے مضبوط دلائل اور ایسا اعجاز رکھتی ہے کہ اسے جھٹلانا ممکن نہیں۔ لیکن یہ اس کے جواب میں ایک ایسی بات کہتے ہیں جس کا علم اور عقل کی دنیا میں کوئی وزن نہیں۔ آباؤ اجداد بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے اُن کی اولاد۔ اور یہی اولاد اگلی نسلوں کے لیے آباؤ اجداد کی حیثیت اختیار کرلے گی۔ تو کیا اس وقت کوئی شخص اس بات کو دلیل کے طور پر کہہ سکتا ہے کہ چونکہ ہمارے آباؤ اجداد یہ کہتے تھے۔ اس لیے ہمارے لیے اس سے بڑی سند کوئی نہیں ہے جبکہ یہ آج اپنی ذات کو نہیں بلکہ اپنے آباؤ اجداد کو دلیل سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں نے غلطیاں ہمیشہ کی ہیں اور آج بھی کررہے ہیں۔ اس لیے کسی کا

Marfat.com

دنیا سے چلے جانا غلطی کی سند نہیں بن سکتا۔ غلطی اس وقت بھی غلطی تھی اور آج بھی غلطی ہے۔ اس لیے عقل اور دلیل کی بات یہ ہے کہ تم نے آج بے سوچے سمجھے جس طرح اگلوں کی پیروی کی ہے اسی طرح انہوں نے بھی کی ہوگی۔ اب دانشمندی اور حق پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جس کتاب کی تم کو دعوت دی جا رہی ہے اس کو سنو، اس پر غور کرو اور اس کے دلائل کی روشنی میں اپنے عقائد و اعمال کا جائزہ لو۔

آیت کا دوسرا حصہ جس میں فرمایا گیا ہے کہ کیا تم اس صورت میں بھی اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کرو گے جبکہ شیطان ان کو عذابِ دوزخ کی طرف بلا رہا ہو۔ بعض اہلِ علم نے "یدعوھم" ضمیر مفعول کا مرجع آباء کو قرار دیا ہے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ مشرکین سے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنے آباء کی اس صورت میں بھی پیروی کرو گے جبکہ شیطان انہیں جہنم کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو۔ یعنی وہ بجائے حق پرستی اور حق پسندی کے راستے پر چلنے کے دوسرے راستوں پر چلتے رہے۔ اور بجائے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کے شیطان کی اطاعت کرتے رہے۔ تو کیا تم پھر بھی ان کی پیروی کرنے پر اصرار کرو گے۔

بعض اہلِ علم نے یدعوھم کی ضمیر کا مرجع آباء کو نہیں بلکہ خود اس کے کہنے والوں کو قرار دیا ہے۔ یعنی یہ لوگ تقلیدِ آباء کے تعصب میں مبتلا ہو کر جس طرح حق کے راستے سے دور نکلتے جا رہے ہیں اور شیطان انہیں اسی روش پر زیادہ سے زیادہ راسخ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شیطان کی یہ کوشش درحقیقت عذابِ جہنم کی طرف دعوت دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اگر تم نے آباء پرستی کے جنون میں حق کو قبول کرنے سے انکار جاری رکھا تو بالآخر اس کا نتیجہ جہنم کے عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

لمحۂ فکریہ

اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ ہمارے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کے رسول کی دلآویز شخصیت اور قرآنِ کریم جیسی معجزانہ کتاب کی طرف دعوت اور دوسری طرف تقلیدِ آباء پر جمود۔ جو شخص بھی اس پر غور کرے گا وہ سر پکڑ کر بیٹھ جائے گا کہ ان دونوں کا آخر آپس میں کیا مقابلہ ہے۔ اور لوگوں نے کس دلیل پر تقلیدِ آباء کی روش کو جاری رکھا ہوا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب کوئی رویہ قومی رویہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جب کوئی نظریہ قومی دین بن جاتا ہے اور جب کوئی کلچر قومی تہذیب کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جب کسی قوم کا چلن قومی روایت بن جاتا ہے تو پھر اس میں ایک قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ اس کے بارے میں بالکل اندھے ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ بھی قومی حوالوں سے اس گمراہی کی دعوت دیتے ہیں انہیں قومی تہذیب اور روایات کا محافظ سمجھا جاتا ہے اور عوام ان کے نعروں سے اس طرح مسحور ہو جاتے ہیں کہ اس کے خلاف وہ کوئی بات بھی سننے کے روادار نہیں ہوتے۔ نہ انہیں عقل کی بات اپیل کرتی ہے نہ ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے رسول کے ارشادات کی کوئی حیثیت ہوتی ہے۔ وہ نام اللہ تعالیٰ اور رسول کا لیں گے لیکن اپنے قومی تعصبات اور قومی رسم و رواج سے کبھی نکلنا گوارا نہیں کریں گے۔ آج مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اسی مرض میں مبتلا ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۭ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾

(جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور وہ خوب کار بھی ہو تو بے شک اس نے مضبوط رسی تھام لی، اور انجام کار تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۲۲)

Marfat.com

قیامت میں تفویض واحسان کام آئیں گے

تقلیدِ آباء کو اپنے عقیدے کی بنیاد سمجھنے والوں اور دلائل میں اسے سب سے بڑی دلیل قرار دینے والوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن باپ دادا کے طریقہ کی اندھی تقلید کام آنے والی چیز نہیں اور نہ کوئی اور سہارا کام آئے گا۔ وہاں تو صرف دو چیزیں کام آئیں گی۔ ایک تو یہ کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کامیاب وکامران ہوگا اور زندگی کے ہر معاملے میں اس شخص کے ساتھ ایک مضبوط سہارا ہوگا جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ یعنی اس نے یہ عہد کیا کہ میرا جسم وجان، میری صلاحیتیں، میری تسلیم ورضا کی قوت، میری عملی توانائیاں، میرا مال و دولت، میرا عہدہ ومنصب اور میرا اثر واقتدار سب اللہ تعالیٰ کی ذات پر قربان۔ میرا ہر ارادہ اس کے ارادے کے تابع اور میرا ہر فیصلہ اس کی شریعت کے اقتضاء کے مطابق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین میرا رہنما، میرا راستہ اور میری منزل ہوگا۔ اور دوسری یہ چیز کہ میں جس بات کا قول وقرار کر رہا ہوں میرا ہر عمل اس کی تائید کرے گا اور میں اپنی عملی توانائیوں کو اس طرح بروئے کار لاؤں گا کہ میرا ہر عمل اخلاص کی تصویر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی انتہائی کوشش ہوگا۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کو کمال درجہ خوبی واخلاص کے ساتھ بروئے کار لانے کی کوشش کروں گا۔ یہ وہ دو چیزیں ہیں جنہیں تفویض اور احسان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے مل جانے سے اسلام کا مفہوم مکمل ہو جاتا ہے اور یہی دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کامیابی وکامرانی کی ضمانت ہیں۔ اور یہی وہ مضبوط سہارا ہے جسے یہاں عروۃ الوثقیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ ایسی مضبوط رسی ہے جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے بعض لوگوں نے انہیں مضبوط زنجیر سے تعبیر کیا ہے۔

آخر میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ اس رسی کے سوا دوسری رسیاں بھی جو لوگوں نے تھام رکھی ہیں وہ بھی ان کے لیے کچھ کام آنے والی بن سکیں گی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمام امور بالآخر اللہ تعالیٰ ہی کے حضور پیش ہوں گے۔ وہی مولیٰ ومرجع ہے۔ اس کے سوا کوئی اور سہارا کام آنے والا نہیں۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۚ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾

(اور جو شخص کفر کرتا ہے اس کا کفر آپ کو غم میں مبتلا نہ کرے، انہیں پلٹ کر آنا تو ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں، یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ ۲۳)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ کافر جو کچھ کر رہے ہیں اور جس طرح اپنے کفر میں دلیر ہوتے جا رہے ہیں اور جس طرح اسلامی دعوت کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے ہر ممکن تدبیر عمل میں لا رہے ہیں۔ یقیناً ان میں سے ہر بات آپ کے لیے رنج اور تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ جب اپنی کاوشوں کو ناکام ہوتا دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انہیں ان کے برے انجام کی طرف بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں تو آپ دل گرفتہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے آپؐ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ کو اس سے غمزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کا کام ابلاغ

Marfat.com

اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے انذار ہے۔ آپ نے اس معاملہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی بلکہ اپنا سب کچھ اس راستے میں نچوڑ ڈالا ہے۔ اس پر بھی اگر یہ لوگ آپ پر ایمان نہیں لاتے تو خود اپنی قسمت بگاڑ رہے ہیں، آپ اس پر دل گرفتہ کیوں ہوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ کفار و مشرکین کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے پیغمبر اور مسلمانوں کو تکلیف دے کر تم خوشیاں مناتے رہو گے اور تم سے کبھی کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہیں آخر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پھر ہم تمہیں بتائیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو اور آج تمہیں اس کے بدلے میں کس انجام سے دوچار ہونا ہے۔ اور یہ بھی مت بھولو کہ ہم صرف تمہاری ظاہری کارروائیوں سے ہی واقف نہیں بلکہ تمہارے سینے جن خباثتوں سے اٹے ہوئے ہیں ہم ان سے بھی واقف ہیں۔ کسی سینے کا کوئی راز ہم سے مخفی نہیں۔ اس لیے ہر لحاظ سے ہم تمہاری گرفت کریں گے۔ اس لیے آج جو کچھ کر رہے ہو اس پر اچھی طرح غور و فکر کر لو۔

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿٢٤﴾

(ہم تھوڑی مدت انہیں دنیا میں مزے کرنے کا موقع دے رہے ہیں پھر ان کو ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔ ۲۴)

ایک تأثر کی اصلاح

حق و باطل کی کشمکش میں جبکہ اہلِ حق دعوت و تبلیغ کے میدان میں سر دھڑ کی بازی لگا چکے ہیں اور کشمکش پورے زوروں پر ہے اور اہلِ باطل تہیہ کر چکے ہوں کہ ہم حق کے قافلے کو آگے بڑھنے نہیں دیں گے اور اس نئی اٹھنے والی آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیں گے۔ ایسی صورتحال میں باطل روز بروز اپنے وسائلِ قوت کو بروئے کار لا کر اہلِ حق کو سراسیمہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اہلِ حق تمام تر اخلاص و عمل کے باوجود اس صورتحال سے یہ تأثر لیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آخر ہماری قربانیاں کب رنگ لائیں گی اور ہمارے برسرِ حق ہونے کو کب پھل ہونے کا موقع ملے گا۔ انہیں احساسات کو سامنے رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ اہلِ باطل کے وسائل کی فراوانی اور ان کے سامانِ راحت کو دیکھ کر متأثر نہ ہوں۔ جس طرح مچھلی کا شکاری مچھلی کو پکڑنے کے لیے کنڈی کے سرے پر گوشت کا ٹکڑا لگاتا ہے تاکہ مچھلی گوشت کا ٹکڑا کھانے کی ہوس میں کنڈی نگل جائے تو میں اسے باہر کھینچ لوں۔ ایسے ہی ہم انہیں عیش و عشرت کے سامان سے ایک محدود وقت کے لیے زیادہ سے زیادہ بہرہ ور کرتے ہیں۔ وہ جتنی حق کی مخالفت کرتے ہیں اتنا ہی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے متاعِ دنیا میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ وہ مچھلی کی طرح زیادہ سے زیادہ اس پر لپکتے ہیں۔ حتیٰ کہ وقت آجاتا ہے جب ان پر گرفت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گھروں میں عیش کی بانسری بجا رہے ہوتے ہیں کہ عذاب کا کوڑا ان کے سروں پر برسنے لگتا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہم انہیں مسلسل رزق کی فراوانی اور دنیوی مال و متاع کی حشر سامانی سے نوازتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ اسی میں مگن ہو کر زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے دین کی مخالفت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ موت آکر ان کی زندگی کا فانوس گل کر دیتی ہے اور پھر وہ دن بہت دور نہیں جسے قیامت کہتے ہیں۔ جب انہیں کھینچتے ہوئے میدانِ حشر میں لے جایا جائے گا پھر انہیں سخت ترین عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔

Marfat.com

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

(اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا، تو وہ ضرور کہیں گے، اللہ نے۔ کہیے، الحمدللہ۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ۲۵)

مسلمات سے اتمام حجت

اس سے پہلے تقلید آباء کے حوالے سے مشرکین کی جہالت اور حماقت کو واضح فرمایا گیا ہے، اب اسی طرح کی ایک مثال سے اسی مضمون کو مزید مبرہن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کی جہالت اور ہٹ دھرمی کا عالم یہ ہے کہ جن حقائق کا یہ خود اعتراف کرتے ہیں اور وہ ان کے عقیدہ کا حصہ بھی ہیں ہے ان مسلمات اور ان کے اعتراف سے جو نتائج منطقی طور پر سامنے آتے ہیں انہیں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ حالانکہ معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات سمجھتا ہے کہ جب کسی ایسی چیز کا اعتراف کیا جائے جو اپنا ایک لازمی نتیجہ رکھتی ہو تو پھر اس سے بڑی جہالت اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس کے نتیجے کو ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ مثلاً ایک شخص یہ کہے کہ سورج نکلا ہوا ہے، لیکن اس کی روشنی سے انکار کردے۔ کوئی شخص چاند کے طلوع ہونے کا اقرار تو کرے لیکن اس کی تابانی سے انکار کردے۔ کوئی شخص دریا کو بہتا ہوا دیکھے لیکن اس کی اٹھتی ہوئی موجوں سے انکار کرے تو ہر سننے والا شخص ایسے آدمی کو پاگل سمجھے گا یا ہٹ دھرم قرار دے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا بھی ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو خالق کائنات تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس بات کو نہیں سمجھتے کہ جو ذات خالق کائنات ہے اور اس کی تخلیق میں کوئی اس کا ساجھی نہیں۔ تو کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ الٰہ اور رب بھی اس کے سوا کوئی نہیں۔ عبادت، اطاعت اور بندگی کا مستحق بھی تنہا وہی ہے۔ تسبیح و تحمید بھی اس کے سوا کسی دوسرے کی نہیں کی جاسکتی۔ کسی اور کے سامنے استمداد کے لیے دستِ سوال بھی نہیں پھیلایا جاسکتا۔ دعائیں قبول کرنے والا اس کے سوا کوئی اور نہیں۔ انسانوں کے لیے شارع اور حاکم اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ تم اسے خالق تو مانتے ہو لیکن ان صفات میں تم نے دوسروں کو شریک کر رکھا ہے۔ معمولی عقل کا آدمی بھی یہ سمجھتا ہے کہ خالق کوئی اور ہو اور معبود کوئی اور، اس سے بڑا تضاد کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ اس لیے فرمایا کہ شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ تم اسے خالق تو مانتے ہو لیکن اس مسلمہ امر کے جو نتائج اور تقاضے ہیں اکثر لوگ اسے سمجھتے نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۶﴾

(آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔ ۲۶)

سابقہ حقیقت کی مزید وضاحت

اس آیتِ کریمہ میں سابقہ آیت میں بیان کردہ حقیقت کو مزید واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کی مخلوق و مملوک اور سب اسی کے دروازے کے سائل و محتاج ہیں۔ سب اسی کی طوعاً و کرہاً غلامی اور بندگی کر رہے ہیں۔ کوئی جسامت میں پہاڑوں سے بڑا ہو اور کوئی اپنے پھیلاؤ اور وسعت میں سمندروں

Marfat.com

پر محیط ہو، لیکن اس کی غلامی میں ہر ایک جکڑا ہوا ہے۔ انسان اپنی عقل کے بل بوتے اور قوت ایجاد کی وجہ سے چاہے کیسی بھی طاقت حاصل کر لے لیکن اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی غلامی سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ بے نیاز اور ستودہ صفات صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ اس لیے شکر کا سزاوار حقیقت میں تنہا وہی ہے۔ مشرکین نے جس جس حوالے سے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک کیا ہے انہوں نے اس بنیادی حقیقت سے اِبا کیا ہے جسے حماقت کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٧﴾

(اور اگر زمین میں جو درخت ہیں قلم بن جائیں اور سمندر سات مزید سمندروں کے ساتھ روشنائی بن جائیں اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہیں ہوں گی، بے شک اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۲۷)

بے شمار نشانیاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہیں

اللہ تعالیٰ کی ذات حواس کے ادراک سے ماوراذات ہے نہ اسے دیکھا جا سکتا ہے نہ اسے سنا جا سکتا ہے اور نہ عقل اس کا کماحقہ ادراک کر سکتی ہے۔ اس لیے بعض لوگوں کو اس کی ذات میں التباس پیش آیا اور انہوں نے کبھی کسی دیوتا اور کبھی کسی مظہرِ قدرت میں الوہیت کی نمود دیکھی اور اسے طاقت کا سرچشمہ گمان کر کے اس کے سامنے جھک گئے۔ اور بعض ایسے ذہنی طور پر بلید ثابت ہوئے کہ انہوں نے اینٹ پتھر کے خدا بنا لیے۔ یہ صحیح ہے کہ اسے دیکھا نہیں جا سکتا اور نہ اسے محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن کسی حقیقت کو جاننے کے لیے محسوس کرنا تو ضروری نہیں ہوتا بلکہ اس کا ادراک اس کی ذات سے نہیں اس کی صفات سے بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح معمار اپنی تعمیر، شاعر اپنے شعر، خطیب اپنے خطبے اور ایک نثر نگار اپنی نثر سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی پہچان کے لیے اس قدر نشانیاں ہیں اور اس قدر اس کے تخلیقی کارنامے ہیں جو اس کی قدرت وحکمت پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ اگر زمین کے سارے درخت قلم بن جائیں اور سات سمندروں کے اضافے سے سارے سمندر سیاہی بن جائیں تو قلم گھس جائیں گے اور سیاہی ختم ہو جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرنے والی نشانیاں اور اس کے کارنامے ختم نہیں ہوں گے۔ ان نشانیوں پر کلمات کا اطلاق اس لیے کیا گیا ہے کہ جس طرح کلمہ بولتا ہے اسی طرح ہر نشانی اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ ممکن ہے کسی کو یہ خیال آئے کہ اس آیت میں جو تعبیر اختیار کی گئی ہے وہ محض خیال آرائی معلوم ہوتی ہے یا مبالغے کا اسلوب ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ امر واقع کا بیان ہے۔ قلموں کا گھس جانا اور سمندروں کا ختم ہو جانا کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ کیونکہ ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کی جو بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں آج تک سائنس اپنی تمام تر تحقیق وایجاد کے باوجود جو کچھ جان سکی ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے کائنات کا علم قرار دیا جا سکے۔ ایک سائنسدان نے ٹھیک کہا ہم سمندر کے کنارے سیپوں سے کھیل رہے ہیں ہمیں کچھ خبر نہیں سمندر کی تہ میں کیسے موتی اچھل رہے ہیں۔ سمندر کے پانی کو واقعی اگر سیاہی بنا دیا جائے تو وہ شاید سمندر کے عجائب وغرائب کو بھی شمار نہ کر سکے۔ اور جن موجوداتِ عالم سے آج تک انسان واقف ہو سکا ہے شاید اس کی مکمل فہرست بھی تیار نہ کر سکے۔ چہ جائیکہ اس اتھاہ کائنات کی ساری موجودات ضبطِ تحریر میں لائی جا سکیں۔

Marfat.com

اس آیت میں جو تعبیر اختیار کی گئی ہے اس سے بتلانا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی عظیم ہے کہ انسان اس کی ذات کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت کیا کرے اس نے جو کائنات پیدا فرمائی ہے اس کی وسعت کا عالم یہ ہے کہ انسان کبھی اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل نہیں کر سکتا اور سمندروں کی سیاہی بھی اور زمین کے درختوں کے قلم بھی اس کو لکھنے سے عاجز ہیں۔ تو جو ذات اتنی عظیم ہو، کیا اس سے بڑھ کر اور کوئی بے ہودگی ہو سکتی ہے کہ اس کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک کر دیا جائے۔ اور انہیں معبود بنا لیا جائے جو اپنی زندگی اور بقا کے لیے اللہ تعالیٰ سے بھیک مانگتے ہیں اور ہر وقت اس سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

یاد رہے کہ سورۃ کہف میں اسی مضمون کو آیت ۱۰۹ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ وہاں **البحر** کے ساتھ **مداد** کا اضافہ بھی ہے۔ ہم اسی سے استفادہ کرتے ہوئے **البحر** کے بعد **مداد** کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اس کو ترجمے میں نمایاں کر دیا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی عزیز و حکیم ہے یعنی اس کائنات کی ہر چیز گواہی دے رہی ہے کہ اس کا خالق عزیز بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔ عزیز کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر غالب ہے۔ اس کے سامنے ہر چیز مغلوب ہے چاہے انسانوں کی نگاہ میں وہ کیسی ہی ناممکن الوجود ہو۔ اسی طرح اس کی تخلیقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کی ذات حکیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اور بغیر حکمت کے اس نے نہ کوئی چیز پیدا کی ہے اور نہ کوئی حکم دیا ہے۔ ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چونکہ وہ عزیز ہے اس لیے اس کے لیے قیامت کا برپا کر دینا اور از سر نو انسانوں کو زندہ کر دینا کوئی مشکل نہیں۔ کیونکہ وہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔ اور چونکہ وہ حکیم ہے اس لیے اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ انسانوں کو جزاء و سزا کے لیے از سر نو زندہ کرے۔ کیونکہ ایک معمولی آدمی بھی جسے اللہ تعالیٰ نے تھوڑی بہت عقل دے رکھی ہے کبھی کوئی بے مقصد کام نہیں کرتا، کیونکہ وہ اسے حکمت و دانش کے خلاف سمجھتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اتنی عظیم کائنات اور پھر اس میں انسان جیسی اشرف المخلوقات کو جو اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے بے مقصد پیدا کرے اور پھر اس پر کبھی اس سے باز پرس نہ کرے کہ اس نے اس مقصد کے مطابق زندگی گزاری ہے یا نہیں۔ اگر وہ ایسا کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ حکیم نہیں۔ اور اگر انسان کو مقصد کے حوالے سے باز پرس کا پابند نہ کرے تو یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

(اور تم کو پیدا کر دینا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا بس ایسا ہی ہے جیسے ایک متنفس کو پیدا کر دینا اور جلا اٹھانا، بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ ۲۸)

اس سے پہلے جو دلائل دیے گئے ہیں اور جس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے شواہد پیش کیے گئے ہیں یہ مختصر آیتِ کریمہ ان تمام دلائل اور اس کے مقدمات کا خلاصہ بلکہ اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس نتیجے کو سمیٹتے ہوئے فرمایا کہ تمہاری ذہنی خرابی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی قدرت کی وسعتوں سے ناآشنا ہو۔ اس لیے قیامت کا وقوع تمہیں مستبعد از عقل محسوس ہوتا ہے حالانکہ اس کی قدرت ایسی وسیع اور بے پناہ ہے کہ اس کے لیے کسی ایک چیز کو پیدا کرنا اور بے شمار چیزوں کو پیدا کرنا بالکل یکساں ہے۔ اس کے لیے جو تعبیر اختیار کی گئی ہے اس کی ہلکی سے وضاحت ضروری ہے۔ "اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ" اس میں مضاف محذوف ہے یعنی كَخَلْقِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ یا كَبَعْثِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے ایک نفس کو پیدا کر دینا اور تمام جہاں کو پیدا کر دینا اور اس کو اٹھا کھڑا کرنا یکساں ہے۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو وجود دینے کے لیے کلمۂ کن کہتا ہے اور وہ وجود میں آ جاتی ہے۔ چاہے وہ ایک چیز ہو چاہے ان کی تعداد اربوں تک ہو۔ یہ کلمۂ کن بھی شاید ہماری تفہیم کے لیے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں۔

Marfat.com

"اِنَّ اللّٰـهَ سَمِيْعٌ بَصِيْر" اس میں بھی ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے۔ مشرکین کو جو وقوعِ قیامت پر اعتراضات تھے ان میں ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ قیامت کے آنے کا اصل مقصد تو لوگوں کے اعمال کا حساب کتاب ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اتنی وسیع مخلوق کے احوال ومعاملات کا علم اللہ تعالیٰ کے لیے ممکن ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ لیکن جب ایک کی آواز سنائی دیتی ہے تو دوسرے کی آواز سنائی دینے کے باوجود سمجھ نہیں آتی۔ اور جب آدمی ایک چیز کا مشاہدہ کرتا ہے تو دوسری چیزیں اس کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سماعت میں ایک ہی وقت میں کروڑوں لوگوں کی آوازیں آئیں اور وہ انہیں سمجھے اور محفوظ کرلے۔ اور وہ کروڑوں لوگوں کے احوال دیکھے اور ان کو گرفت میں لے آئے۔ چنانچہ اس شبے کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی سماعت اور اس کی بصارت دوسری مخلوقات کی طرح نہیں۔ وہ بیک وقت ساری کائنات کو دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے۔ کوئی چیز اس کی بینائی کو مشغول نہیں رکھ سکتی اور کوئی آواز اس کی سماعت کو محدود نہیں کرسکتی۔ جس طرح اس کی قوتِ تخلیق کروڑوں انسانوں کو بیک وقت پیدا کرسکتی ہے، اسی طرح اس کی سماعت وبصارت بھی بیک وقت سب کچھ سنتی اور دیکھتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾

(کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ ہی ہے جو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، ہر ایک گردش کرتا ہے ایک مقررہ وقت تک، اور یہ کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۲۹)

چند مزید نشانیوں کی طرف اشارہ

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کی مزید چند نشانیوں کو ذکر فرمایا گیا ہے اور اس کے لیے استفہامیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نشانیاں ایسی ہیں جو عام انسانوں کی نگاہوں سے مخفی نہیں۔ لیکن اس میں جمع کے صیغہ کی بجائے واحد کے صیغہ سے خطاب فرمایا گیا ہے۔ اگرچہ یہ خطاب جمع پر بھی صادق آتا ہے کیونکہ معنی کے لحاظ سے اس میں واحد اور جمع میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ البتہ واحد کی صورت میں مخاطب گروہ کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے اور اس میں جمع کے مقابل میں زیادہ زور ہوتا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ ذرا غور کرو کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت وحکمت ہے کہ وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ یعنی دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں یکے بعد دیگرے پوری سرگرمی اور پابندیِ اوقات کے ساتھ آتے جاتے ہیں اور دونوں میں سے کبھی کوئی تخلف کرتا اور نہ پیشقدمی کرتا ہے۔ ان کے لیے جو نظامِ اوقات مقرر کردیا گیا ہے کیا مجال ہے جو اس سے سرِ موانحراف ہونے پائے۔ اس وقت بتانا مقصود یہ ہے کہ جس پروردگارِ عالم کی قدرت کا عالم یہ ہے کہ وہ رات اور دن اور سورج اور چاند کو اس طرح گردش دے رہا ہے کہ جس میں کبھی کسی غلطی کا امکان نہیں ہوتا کہ کیا اس ذات کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی اس کا شریک ہوسکتا ہے اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوسکتی ہے۔

Marfat.com

مزید فرمایا کہ اس نے سورج اور چاند کو اپنی مخلوق کی خدمت گزاری کے لیے مسخر کر رکھا ہے اور یہ دونوں ہر طرح کی پابندی کے ساتھ اپنی خدمت بجالانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ جب سے زمین پر آبادی ہوئی اور انسانوں کو بسایا گیا ہے تاریخ ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ کبھی سورج اور چاند کی خدمت گزاری میں انسانوں کو کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے اور یہ گردش اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت تک جاری رہے گی۔ جب وہ وقتِ مقرر آجائے گا تو ان کا وجود ختم ہو جائے گا۔ گویا جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کام پر لگایا نہیں تھا تو ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ اور جب تک وہ اپنا فرض انجام دے رہے ہیں تو ان کا وجود باقی رہے گا اور اس کے بعد وہ بے نور ہو کر گر جائیں گے۔ اس سے شاید یہ بتانا مقصود ہے کہ ان میں سے کوئی نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔ دونوں حادث ہیں اور اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ تو یہ کس قدر جہالت کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات جو ازلی اور ابدی ہے جس کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ اختتام۔ اس کے مقابلے میں حادث، فانی اور محتاج چیزوں کو معبود تسلیم کیا جائے۔

آخر میں فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ جس طرح اس کی قدرت ہر طرف اپنی نمود رکھتی ہے اور ہم جابجا اس کے مظاہر دیکھتے ہیں، اسی طرح اس کا علمِ محیط بھی تمام مخلوقات کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اگر اس کی قدرت اور علم میں یہ وسعت نہ ہوتی تو اس کی ربوبیت کا فیضان ہر کسی تک نہ پہنچ سکتا۔ اور چونکہ وہ ہر ایک سے باخبر اور اس کے اعمال کی خبر رکھتا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ لوگوں کے اعمال سے متعلق پوچھ گچھ نہ کرے۔ اور یہی وہ اصل مقصد ہے جس کا یقین نشانیاں دکھا کر دلوں میں اتارا جا رہا ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَالْحَقُّ وَاَنَّ مَایَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَالْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ﴿۳۰﴾

(یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو جو لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں، اور بے شک اللہ ہی برتر اور عظیم ہے۔ ۳۰)

کائنات میں نظم و ترتیب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہے

کائنات کے نظام میں جو نظم و ترتیب باقاعدگی، پابندی، افادیت اور رفاہیت پائی جاتی ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ معبودِ حقیقی صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ہر چیز کا سررشتہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ پوری کائنات پر اس کی مرضی اور اس کا حکم نافذ ہے۔ تکوینی معاملات میں اس کے حکم کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بے حد و بے کنار کائنات کا کوئی گوشہ ابتری کا شکار نہیں۔ ہر مخلوق، ہر کرّہ، ہر ستارہ اور سیارہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں سرِ مو کوتاہی نہیں کرتا۔ اور اگر کہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی اِلٰہ ہوتا جو اس کے خلق و تدبیر میں دخیل ہوتا تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔ اور زمین و آسمان کا درہم برہم نہ ہونا اور کائنات کے نظام کا ٹھیک ٹھیک چلنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مشرکین نے جن قوتوں کو معبود بنا رکھا ہے وہ سراسر باطل ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات حق ہے اسی کی عبادت و اطاعت سبیلِ حق ہے۔ اور وہی ہے جو علی بھی ہے اور کبیر بھی ہے۔ یعنی سب سے بلند و برتر اور سب سے عظیم۔ اس سے زیادہ گری ہوئی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ برتر کے مقابلے میں کہتر کے سامنے سر جھکایا جائے۔ اور عظیم کے مقابلے میں حقیر اور بے حقیقت چیزوں کو بندگی کا مستحق سمجھا جائے۔ انسان کی نہایت حیران کن گمراہی یہ ہے کہ وہ جب اکڑنے پہ آتا ہے تو خدائے بزرگ و برتر کے سامنے اکڑ جاتا ہے۔ اور جب جھکنے پہ آتا ہے تو دیویوں، دیوتاؤں، مظاہرِ قدرت، فرشتوں اور بتوں کے سامنے جھک جاتا ہے۔

Marfat.com

أَلَمْ تَرَ

أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ ۚ إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿٣١﴾ وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا
اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمَا
يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ ﴿٣٢﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا
يَوْمًا لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ
شَيْئًا ۚ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم
بِاللَّهِ الْغَرُورُ ﴿٣٣﴾ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ
يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي
نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٣٤﴾

رکوع: ۴۔ (کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تا کہ وہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے،
بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لیے۔ ۳۱) اور جب موجیں سائبانوں کی طرح
ان کو ڈھانپ لیتی ہیں تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں، اطاعت کو بالکل اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے، پس جب وہ ان کو نجات
دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی راہِ راست پر رہتا ہے اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار
اور ناشکرا ہے۔ ۳۲) اے لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو، اور ڈرو اس دن سے جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام
آئے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے کام آنے والا بن سکے گا، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ
ڈالے، اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکہ دینے پائے۔ ۳۳) بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، اور
وہی بارش اتارتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں پلتا ہے اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا اور نہ کسی شخص کو
یہ خبر ہے کہ وہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔ ۳۴)

Marfat.com

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَکُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ ﴿۳۱﴾

(کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تا کہ وہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لیے۔ ۳۱)

گزشتہ مضمون پر ایک تمثیل

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا ذکر ہو رہا ہے اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے چند اور نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اندازِ خطاب وہی اختیار کیا گیا ہے جو سابقہ آیت میں تھا۔ جس میں زور بھی ہے اور تاکید بھی۔ فرمایا تم کشتی یعنی بحری جہاز میں سفر کرتے ہو، کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ سمندر میں اس کا چلنا اور کسی حادثے کا شکار نہ ہونا سراسر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عنایت کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ بحری جہاز کتنا بھی مضبوط اور بحری سفر کے لیے کتنا بھی موزوں کیوں نہ ہو اور اس کے ملاح جہاز رانی کے فن سے کیسے ہی آشنا کیوں نہ ہوں بحری جہاز اسی وقت تک بے خطر آگے بڑھتا ہے جب تک سمندر میں ہولناک طوفان نہیں اٹھتے اور مخالفانہ زوردار ہواؤں سے اسے سابقہ پیش نہیں آتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو تو طوفان بھی اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ اور اگر اس کی نظرِ کرم پھر جائے تو سمندر میں طوفان اٹھتے دیر نہیں لگتی۔ پھر بحری جہاز کی مضبوطی اور ملاحوں کے تمام تر وسائل دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس صورتحال کو دیکھ کر بڑے سے بڑا دہریہ بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ناموافق حالات میں کشتی اور اس کے مسافروں کو بچانے والا ایک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن کشتی کی اس صورتحال سے فائدہ صرف وہ اٹھاتے ہیں جن کے اندر دو صفات ہوتی ہیں۔ پہلی صفت یہ کہ وہ صبار ہوں یعنی بہت صبر کرنے والے، کہ چاہے کیسے ہی حالات سے سابقہ پڑے ان کی استقامت میں کبھی فرق نہ آئے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ہر حال میں مؤثر اور حقیقی سہارا مانا ہے تو اچھے اور برے حالات میں وہ کبھی اس تصور میں دراڑیں نہ پڑنے دیں۔ اور دوسری صفت یہ کہ وہ شکور ہوں۔ یعنی بہت شکر ادا کرنے والے، کہ جیسے ہی اللہ تعالیٰ کسی نعمت سے نوازے وہ اس کا شکر ادا کریں۔ یا کسی مصیبت سے نکالے تو تب بھی اس کا شکر ادا کریں۔ وہ نمک حرام اور احسان فراموش نہ ہوں بلکہ نعمت کی قدر پہچاننے والے ہوں۔ جن لوگوں میں یہ دو خوبیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں وہ زندگی کے سفر میں کبھی صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہیں پاتے۔ کشتی کے سفر میں غیر یقینی صورتحال کا سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ اگر کشتی رواں دواں ہے اور دور دور تک کسی خطرے کا گمان نہیں تو تب بھی اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کی جائے۔ اور اگر ناموافق ہوا کے چلنے یا طوفان کے حملہ آور ہونے سے جان کے لالے پڑ جائیں تو تب بھی نہایت استقامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی سے فریاد کی جائے اور اسی سے امید باندھی جائے۔

وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ کَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَی الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا کُلُّ خَتَّارٍ کَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

Marfat.com

(اور جب موجیں سائبانوں کی طرح ان کو ڈھانپ لیتی ہیں تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں، اطاعت کو بالکل اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے، پس جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی راہِ راست پر رہتا ہے، اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہے۔ ۳۲)

مُقْتَصِدٌ ...... اقتصاد سے اسمِ فاعل ہے۔ اقتصاد راست روی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور توسط واعتدال کے معنی میں بھی۔ یہاں اگر راست روی کے معنی میں لیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور آیت کا آخری حصہ راست روی ہی کے معنی کو کھول رہا ہے اور یہ بھی اشارہ کر رہا ہے کہ مقتصد کے بعد وَاَكْثَرُهُمْ كٰفِرُوْنَ یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔

خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ...... یہ الفاظ گزشتہ آیت کے الفاظ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ کے مقابل میں استعمال ہوئے ہیں۔ خَتَّارٌ، خَتَرٌ سے مبالغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں بے وفائی اور عہد شکنی کرنے والا۔

سابقہ آیت کے اجمال کی تفصیل

یہ آیت دراصل سابقہ آیت کے اجمال کی تفصیل ہے۔ کشتی کے مسافر جب تک کشتی بے خوف وخطر بغیر کسی حادثے کے رواں دواں رہتی ہے تو ان کو کبھی خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نہایت محفوظ حالت میں سفر کر رہے ہیں۔ اور ہماری کشتی کا چلنا اللہ تعالیٰ کی چلائی ہوئی سازگار ہوا کا کرشمہ ہے۔ بلکہ وہ اسے اپنی ذہانت وفطانت اور اپنے کمالِ علم کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ لیکن جب دفعتاً کسی گوشے سے طوفانی ہوائیں نمودار ہوتی ہیں اور سائبانوں کی طرح اس طرح ان پر چھا جاتی ہیں کہ پوری طرح ان کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ تب ان کو خدا یاد آتا ہے اور پھر وہ نہایت عاجزی اور لجاجت سے اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے ہیں، سابقہ گناہوں پر معافی مانگتے ہیں اور آئندہ اطاعت ووفاداری کا عہد کرتے ہیں۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول فرما کر کشتی کو بخیریت تمام ساحل پر پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے ہیں اور راست روی ان کا شیوہ بن جاتا ہے۔ لیکن دوسرے ان کے ہمراہی ان کی اکثریت پھر اپنے کفر اور شرک کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ حالانکہ انہوں نے قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دیکھی ہیں اور ان کو بچشمِ سر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ طوفانوں میں گھرے ہوئے اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت کے بغیر کبھی ساحلِ مراد تک نہیں پہنچتے۔ لیکن یہ خود ساحل پر پہنچنے کے بعد صاف بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ نہ انہیں اپنا عہد و پیمان یاد آتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی کوئی نشانی یاد آتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو بدترین غدار ہیں، نقضِ عہد کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ناشکرے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۥ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾

(اے لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو، اور ڈرو اس دن سے جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام آئے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے کام آنے والا بن سکے گا، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے، اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکہ دینے پائے۔ ۳۳)

Marfat.com

آخری تنبیہ

گزشتہ کئی آیات میں انسان کو اس کے انجام سے باخبر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس پر ہر طرح کے دلائل قائم کیے گئے ہیں۔ بعض تمثیلات سے بھی کام لیا گیا ہے۔ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے اور آخرت کا بار بار ذکر کر کے اس کا تصور دلوں میں اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پیشِ نظر آیت میں آخری تنبیہ ہے کہ لوگو! اپنے رب کی پکڑ سے بچو۔ اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔ مراد، قیامت اور آخرت کا دن ہے۔ انسان اکثر معاملات میں جب اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے تو دوست احباب یا مال و دولت کے ذریعے سے کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔ سب سے قریبی رشتہ والدین اور اولاد کے درمیان ہے۔ بدتر سے بدتر حالات میں بھی عموماً یہ رشتہ شکست ہونے میں نہیں آتا۔ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اس رشتے کی حرارت رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔ لیکن قیامت کا دن ایسا ہولناک دن ہے جس میں نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام آئے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے کام آسکے گا بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ کتنا قریبی رشتہ بھی اس روز اپنی حیثیت کھو دے گا۔ ظاہر ہے کہ جب اس قدر قریبی تعلق بھی اس دن کام نہ آسکے تو اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

اسلوب میں تبدیلی

اس آیت کے اسلوبِ بیان کے حوالے سے ایک بات قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ باپ کے بیٹے کے کام نہ آسکنے کو تو عام معمول کے مطابق بیان فرمایا، لیکن بیٹے کا باپ کے کام نہ آسکنے کو اس طرح کے اسلوب سے بیان فرمایا ہے جس میں زیادہ تاکید پائی جاتی ہے۔ اس میں مبتداء کا اعادہ کیا گیا ہے اور فعل کی جگہ اسم لایا گیا ہے۔ ان دونوں نے اس جملے میں زور پیدا کر دیا ہے۔ یعنی باپ کا بیٹے کے کام نہ آنا بجائے خود حیران کن بات ہے، لیکن بیٹے کا باپ کے کام نہ آنا تو بہت ہی زیادہ حیران کر دینے والا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر باپ اپنے بیٹے کے بارے میں یہ تصور رکھتا ہے کہ وہ بڑھاپے میں میری لاٹھی ثابت ہوگا۔ اور دوسری یہ بات کہ بیٹا اپنی عمر اور صلاحیت کے اعتبار سے باپ کے مقابل میں زیادہ اس بات کا اہل ہوتا ہے کہ اپنے کمزور باپ کی مدد کر سکے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ بیٹے کے اندر جوانی کی وجہ سے فتوت وحمیت کا جذبہ بھی زیادہ قوی ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود قیامت کا دن ایسا ہولناک دن ہوگا کہ بیٹا بھی اپنے باپ کے کام نہ آسکے گا۔

ایک نکتہ

ایک اور بات پر بھی توجہ رہے کہ سورۃ عنکبوت اور اس سورۃ کی آیت ۱۵ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کے ابتدائی زمانے میں جب کوئی نوجوان اسلام قبول کرتا تھا تو اس کے بزرگوں کی طرف سے اس پر دباؤ ڈالا جاتا تھا اور اپنے باپ ہونے اور اپنی بزرگی کے حوالے سے یہ اصرار کیا جاتا تھا کہ ہر مذہب نے والدین کے حقوق کو تسلیم کیا ہے اور بزرگوں کے احترام پر زور دیا ہے۔ اس لیے تم ہماری بات کو ماننے کے پابند ٹھہرائے گئے ہو، نیز قیامت کے دن ہم تمہارے نیک و بد کی ذمہ داری قبول کریں گے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس کی بھی تردید کی جارہی ہے کہ وہاں کوئی کسی کی ذمہ داری قبول نہیں کرے گا، ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔

Marfat.com

تنبیہ پر زور

اپنی تنبیہ میں مزید زور پیدا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت برپا کرنے اور روزِ جزاء کے لانے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ بالکل یقینی اور حتمی ہے، اس میں کسی قسم کے تردد کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہیں دنیا کی زندگی سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ یہاں اس کے نافرمان اور اس کے ساتھ شرک کرنے والے خوشحال اور طاقتور ہیں اور اصحابِ ایمان نہایت ابتر زندگی گزار رہے ہیں۔ یہاں باطل کو مہلت ملی ہوئی ہے، اہلِ باطل سربلند ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والے نہایت دگرگوں حالات کا سامنا کررہے ہیں۔ اس صورتحال کو دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جزاء وسزا کا قانون حتمی ہے تو پھر یہاں صورتحال برعکس کیوں ہے؟ اس لیے فرمایا جارہا ہے کہ اس دنیا کا نظام مجازات کے اصول پر قائم نہیں۔ اس لیے تمہیں اس سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ دنیا دارالامتحان ہے اور اس امتحان کے نتائج کے ظہور کا دن آگے آنے والا ہے۔

اسی طرح تمہیں کوئی دھوکے باز اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکہ نہ دے سکے اور وہ تمہیں یہ باور کرانے میں کامیاب نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بے مقصد بناڈالی ہے اور وہ اس کے خیر وشر سے بالکل بے تعلق ہوکر الگ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ضرور قیامت کا دن لائے گا۔ اس روز نیک اعمال کا بدلہ نعمتوں کی صورت میں ملے گا اور برے اعمال کا بدلہ عذاب کی صورت میں ملے گا۔ غرور سے یہاں فریب نظر بھی مراد لیا جاسکتا ہے اور شیطان بھی۔ بیشتر اہلِ علم نے اس سے شیطان ہی مراد لیا ہے اور قرائن کے اعتبار سے یہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اور شیطان انسان کو کیسے کیسے فریب میں مبتلا کرتا ہے، اس کی سو نوعیتیں اور سو رنگ ہیں۔ کسی کو ہوسِ زر میں مبتلا کرکے محرومیوں کا ہوا دکھا کر عجیب وغریب خیالات میں الجھا دیتا ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں ایسے ایسے شبہات کی نذر کردیتا ہے جس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ کسی کے ذہن میں تقدیر کا غلط تصور بٹھا کر کبھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی پیدا کرتا ہے اور کبھی آخرت کو فریب قرار دیتا ہے۔ ان تمام باتوں سے روکتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ حیاتِ دنیا بھی تمہیں بہکانے نہ پائے اور کوئی دھوکے باز چاہے وہ شیطان ہو یا تمہارا اپنا نفس یا انسانوں کا کوئی گروہ تمہیں بدراہ نہ کرنے پائے۔ اسی میں تمہارے لیے عافیت ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾

(بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں پلتا ہے اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ وہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔ ۳۴)

یہ آیت درحقیقت ایک سوال کا جواب ہے۔ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ کبھی جواب سے پہلے سوال کا بھی ذکر کر دیتا ہے اور کبھی سوال کا ذکر کیے بغیر جواب دیتا ہے۔ اور سننے والوں کے ذہن میں چونکہ سوال موجود ہوتا ہے اس لیے وہ سمجھ جاتے ہیں کہ کس سوال کا جواب دیا جارہا ہے۔

Marfat.com

ایک سوال کا جواب

مخالفین کو جب قیامت سے ڈرایا جاتا تو وہ فوراً یہ سوال کرتے کہ جس قیامت سے ہمیں ڈرایا جارہا ہے آخر وہ کب آئے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف ڈراوا ہے اس کی حقیقت کوئی نہیں۔ اور اگر واقعی اسے آنا ہے تو پھر ہمیں بتا دیا جائے کہ اس کے آنے کا وقت کون سا ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ قیامت کے آنے کا ٹھیک وقت صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ اس گھڑی کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی اور کو نہیں دیا۔ قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر سوال کرنے والوں کو یہی جواب دیا ہے۔ حدیثِ جبرائیل میں حضرت جبرائیل کے پوچھنے پر کہ قیامت کب آئے گی آپ کا جو جواب منقول ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ جس سے سوال کیا جارہا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ یعنی نہ میں اس کا وقت جانتا ہوں نہ اے جبرائیل آپ اس کا وقت جانتے ہیں۔ البتہ اس کی علامات بتائی گئی ہیں اور آنحضرت ﷺ نے مختلف مواقع پر ان علامات کا ذکر فرمایا ہے تاکہ امت اپنے اندر ان علامات کو پیدا نہ ہونے دے تاکہ وہ قیامت کی ہولناکی سے محفوظ رہے۔ اور اگر وہ دیکھے کہ گردوپیش میں وہ علامتیں ظاہر ہونے لگی ہیں تو اپنے اعمال کا جائزہ لے کر قیامت کی تیاری کرے۔ اس کے بعد مزید چار چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ وہ چار چیزیں درحقیقت پہلی بات کی دلیل ہیں۔ یعنی اگر قیامت کے وقوع کا ٹھیک علم انسانوں کو نہیں دیا گیا تو یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔ اور اس سے قیامت کی حقیقت کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ زندگی میں کتنی ایسی حقیقتیں ہیں جن کے وقت اور ان کی نوعیت کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی عقلمند آدمی ان حقائق کا انکار نہیں کرتا۔ پھر اس کے ثبوت میں چار ایسی باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کے ساتھ انسان کی ہمیشہ سے دلچسپیاں رہی ہیں۔ اب اگر ان دلچسپیوں والی چیزوں کا بھی حتمی علم انسان کو نہیں ہوتا تو پھر یہ کیونکر ضروری ہے کہ ساری دنیا کے انجام کے وقت کا علم انسانوں کو ضرور دیا جائے۔

چار چیزوں سے استشہاد

ان چار چیزوں میں سے پہلی چیز بارش ہے، جس پر انسان کی خوشحالی اور بدحالی کا انحصار ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اس کے متعلق صرف اندازے لگا سکتا ہے اس کا حقیقی علم اس کے پاس نہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی اس بات کو جانتا ہے کہ کب اور کہاں اور کتنی مقدار میں بارش ہوگی۔ اور کون سی زمین اس سے فائدہ اٹھائے گی اور کون سی محروم رہے گی۔ محکمہ موسمیات نے اس معاملے میں بہت ترقی کی ہے، لیکن اس کی پیشگوئیاں ظن وتخمین سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکیں۔ اور اس کا علم تو کبھی کسی کو نہیں ہوتا کہ بارش رحمت ثابت ہوگی یا زحمت بنے گی، بارش کی مقدار کتنی ہوگی اور اس کے بارے میں کتنی تفصیلات ہیں جس سے انسان آج بھی ناواقف ہے۔

دوسری چیز مَا فِی الْاَرْحَامِ ہے۔ اس کا تعلق تو انسان کی بقائے نسل سے ہے، لیکن اس کے بارے میں بھی انسان بہت کم جان سکا ہے۔ انسان نہیں جانتا کہ عورت کے پیٹ میں پلنے والی چیز کیا ہے، وہ کس شکل میں ظاہر ہوگی، وہ اپنے ساتھ سعادت لے کے آئے گی یا شقاوت، زندہ پیدا ہوگی یا مردہ، زندگی دراز ہوگی یا محدود، وہ نیکیوں کی حامل ہوگی یا برائیوں کی، یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

تیسری چیز......کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کمائی کرے گا، کیا فرائض انجام دے گا اور کن حالات ومشاغل میں اس کی زندگی گزرے گی۔ انسان کیسی کیسی منصوبہ بندیاں کرتا ہے، کیسے کیسے پروگرام بناتا ہے۔ لیکن اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کون سی افتاد اس کے تعاقب میں ہے۔ اچانک ایک حادثہ اس کی تقدیر بدل دیتا ہے اور اس کے وقوع سے ایک منٹ پہلے تک کسی کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ افراد بھی اس

Marfat.com

صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں اور قومیں اور حکومتیں بھی۔ اچانک زلزلہ آتا ہے سب ترقیاتی کام دھرے رہ جاتے ہیں۔ اشیائے خوردنی کی مقدار کے پہلے سے تخمینے تیار ہوتے ہیں لیکن کسی بھی بلائے ناگہانی کا نزول سب تخمینے ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔

انسان کی زندگی کے لیے موت کا معاملہ سب سے اہم حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن آج تک انسان اتنی اہم حقیقت کے بارے میں بالکل بے خبر ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی اور کس سرزمین میں وہ مرے گا اور کہاں دفن ہوگا۔ جنگوں سے لوگ خیریت سے واپس آجاتے ہیں اور گھروں میں بیٹھے لوگ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ ایک جوانِ رعنا راہ چلتے ہوئے موت کا شکار ہوجاتا ہے۔ بڑے بڑے حکمران حفاظت کے حصار میں چلتے ہیں لیکن موت کا ایک وار انہیں ہمیشہ کے لیے سلا دیتا ہے۔ کینیڈی، انور سادات، اندرا گاندھی، شاہ فیصل، صدر ضیاء الحق اور ایسے ہی کتنے بڑے لوگ ہیں جو سرکاری دورے پر نکلے یا فوجوں کی سلامی لیتے ہوئے یا گھر بیٹھے موت کا شکار ہوگئے۔ حالانکہ ان کی حفاظت کے اسباب اور ان کی زندگیوں کے زائچے بنانے والے اہلِ علم اور قدم قدم پر ان کی نگرانی کرنے والے ڈاکٹر کبھی نہیں بتا سکے کہ موت آپ کے سر پر پہنچ چکی ہے۔ اور فلاں سرزمین پر آپ کو موت آئے گی۔ یہ چار چیزیں جن سے انسان کا سب سے قریبی تعلق ہے اور یہ سب سے زیادہ واضح حقیقتیں ہیں اور یہ زندگی کے وہ حقائق ہیں جن کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اگر آج تک انسان ان کے بارے میں مکمل طور پر باخبر نہیں ہوسکا تو قیامت کے وقت سے باخبر ہونا اس کے لیے کیوں ضروری ہے۔

امورِ غیب یہی پانچ ہی نہیں اور بھی ہیں

اس آیت کی تشریح کے ضمن میں یہ بات ذہن میں رہے کہ اس آیت میں پانچ باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، امورِ غیب ان ہی میں منحصر نہیں۔ یہ تو وہ پانچ باتیں ہیں جن کا انسان سے نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہے اس لیے ان کا ذکر کردیا گیا ہے۔ ورنہ امورِ غیب تو بے شمار ہیں جن کے بارے میں سورۂ نمل میں ارشاد فرمایا گیا قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ ''کہہ دیجیے زمین وآسمان میں جتنے بھی غیبی معاملات ہیں انہیں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔'' اس آیتِ کریمہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مطلق علمِ غیب اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے اور اس کا استقصاء ممکن نہیں۔ البتہ متذکرہ بالا آیتِ کریمہ میں جن پانچ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ ایسا مخصوص فرمایا ہے کہ بطور انباءِ غیب کے بھی کسی کو ان کا علم نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ دوسری مغیبات کا علم بہت کچھ انبیائے علیہم السلام کو بذریعہ وحی دے دیا جاتا ہے۔ لیکن اس پر بعض لوگوں نے اشکال کیا ہے کہ امت کے بہت سے اولیاء اللہ سے ایسے بے شمار واقعات منقول ہیں کہ انہوں نے کہیں بارش کی خبر دے دی یا کسی حمل کے متعلق بتلا دیا، بعض دفعہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی اطلاع دے دی، کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی کے مرنے کی جگہ متعین کر کے بتلا دی اور پھر یہ پیشگوئیاں مشاہدے سے صحیح بھی ثابت ہوگئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علمِ غیب دراصل اس علم کو کہا جاتا ہے جو سببِ طبعی کے واسطہ سے نہ ہو، بلاواسطہ خود بخود ہو۔ یہ چیزیں انبیائے علیہم السلام کو بذریعہ وحی اور اولیاء کو بذریعہ الہام یا بعض اہل علم کو حسابات اور اسبابِ طبعیہ کے ذریعے حاصل ہوجائیں تو وہ علم غیب نہیں بلکہ انباءِ الغیب ہیں جو کسی جزوی یا شخصی معاملہ میں کسی مخلوق کو حاصل ہوجانا آیتِ مذکورہ کے منافی نہیں۔ کیونکہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کا کلی علم جو تمام مخلوقات اور تمام حالات پر حاوی ہو، وہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو بذریعہ وحی یا الہام نہیں دیا۔ کوئی ایک آدھ واقعہ میں کوئی جزوی علم بذریعہ الہام حاصل ہوجانا اس کے منافی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ اس علم سے مراد علمِ قطعی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ الہام کے ذریعے علم جو کسی ولی کو حاصل ہوتا ہے وہ قطعی نہیں ہوتا، اس میں مغالطوں کے بہت احتمالات رہتے ہیں۔ اور نجومیوں وغیرہ کی خبروں میں تو روزمرہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ دس جھوٹ میں ایک صحیح کا بھی تناسب نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ

(۳۲)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام السَّجْدَةُ ہے۔اس کی پندرہویں آیت میں سجدہ کا مضمون آیا ہے۔اس کا نام اسی سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول:۔ یہ سورۃ مکی ہے۔یہ اس زمانہ میں نازل ہوئی ہے جب ابھی مخالفین کی طرف سے مخالفت میں شدت پیدا نہیں ہوئی تھی اور ابھی اس نے ظلم وستم کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔مضامین کے اشتراک کو دیکھتے ہوئے اس سورۃ کو گزشتہ سورۃ لقمان سے بہت مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ یہ سورۃ لقمان کے آگے پیچھے نازل ہوئی ہوگی۔

موضوع:۔ سورۃ کا موضوع بنیادی عقائد کا اثبات اور مخالفین کی طرف سے شبہات کا ازالہ ہے۔مخالفین کو تینوں بنیادی عقائد یعنی توحید، آخرت اور رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔اور مخالفین اس پر جو تبصرے کرتے اور استہزا کرتے تھے اس کی طرف اشارے ہیں اور ان کا جواب دیا گیا ہے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

قرآنِ کریم چونکہ کتابِ دعوت ہے کوئی ٹیکسٹ بک نہیں۔اس لیے قرآنِ کریم بعض سورتوں کا آغاز کرتے ہوئے اپنے تعارف سے ابتداء کرتا ہے۔اور یہاں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے۔کیونکہ مخالفین کو قرآنِ کریم کے منزل من اللہ ہونے سے انکار تھا۔وہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرنے کی بجائے اسے ایک افترا قرار دیتے تھے۔قرآنِ کریم نے اس کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ حق ہے، جس کا حق ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں۔اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے کیونکہ اسے ایسی قوم پر نازل کیا جارہا ہے جس کے اندر آج تک کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا۔اور مخالفین نے اس کی قدر نہ کی تو ان کا انجام وہی ہوگا جو اس سے پہلے ان امتوں کا ہوا ہے جنہوں نے انذار کرنے والوں کی تکذیب کی تھی۔

مزید فرمایا ہے کہ قرآن جن حقیقتوں کو تمہارے سامنے پیش کرتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی عقل وفکر کے لیے اجنبی نہیں۔جن دلائلِ آفاق کا ذکر کرتا ہے وہ تمہارے جانے پہچانے ہیں تمہاری اپنی ذات کو تم پر گواہ بناتا ہے اور پھر تمہیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے کہ خود اپنی حالت کو دیکھو اور کائنات کے نظام کو دیکھو، کیا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے وجود اور تمہارے دوبارہ پیدا کرنے پر دلالت نہیں کرتا؟

مزید فرمایا کہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں جو محض تفریحِ طبع کے طور پر پیدا کردی گئی ہے۔اسے اللہ تعالیٰ نے نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہے اور پھر اس کے تمام انتظامات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔تمام احکام اسی کی طرف سے صادر ہوتے اور اسی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔کوئی اس میں اس کا شریک وسہیم نہیں۔

Marfat.com

پھر عالمِ آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ایمان کے ثمرات اور کفر کے نتائج و عواقب بیان کر کے یہ ترغیب دی گئی ہے کہ لوگ برا انجام آنے سے پہلے کفر کو چھوڑ دیں اور قرآن کی اس تعلیم کو قبول کر لیں، اس سے ان کی عاقبت سنور جائے گی۔

پھر منکرینِ قیامت کے شبہات کا جواب دیا گیا اور ان کے اصل محرکِ انکار کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پھر قیامت کے دن جوان پر گزرنے والی ہے اس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس دن وہ اپنے تمرد اور اپنے کفر کا اعتراف کریں گے لیکن ان کا اپنے جرائم کو ماننا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان کا اظہار کرنا کسی کام نہیں آئے گا۔

مزید بتایا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ وہ انسان کے گناہوں اور لغزشوں پر یکا یک گرفت نہیں کرتا۔ اور عذاب نازل نہیں کرتا، بلکہ پہلے مختلف مصائب اور نقصانات کے ذریعے متنبہ کرتا ہے تا کہ ان کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ حق کی طرف پلٹ آئیں۔

پھر اس نے ایمان لانے والوں کی بعض خصوصیات کا ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ کبھی استکبار کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کی نگاہوں میں حق کی ایک عظمت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن کی آیات کو سن کر سر جھکا لیتے ہیں، ہمیشہ اپنے رب کو یاد کرتے اور اسی کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو وہ کچھ دے گا جس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی اور اس روز مومن اور کافر کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہوگا جس سے ہر شخص کو اندازہ ہو جائے گا کہ فرماں برداری کا انجام کیا ہے اور نافرمانی کا کیا۔

کفارِ مکہ کو قرآنِ کریم کے نزول پر بہت اعتراضات تھے اور اس کا نزول ان کی عقل کی گرفت میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ قرآنِ کریم نے واضح کیا کہ قرآنِ کریم کا نزول کوئی انوکھا واقعہ نہیں اور نہ پہلا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی کتابیں آ چکیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آنے والی کتاب کے بارے میں تو تم بھی جانتے ہو۔ تو آخر قرآنِ کریم کے نزول پر تم اس قدر تردد کا اظہار کیوں کر رہے ہو۔ البتہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جن لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اور آپ کی نبوت کا انکار کیا ان کا انجام کیا ہوا۔ اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے انہیں غلامی کی ذلت سے نکال کر امامت کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اب بھی یہی کچھ ہوگا، مخالفین خائب و خاسر ہوں گے اور آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والے آئندہ دنیا کی امامت کریں گے۔

کفارِ مکہ سے مزید کہا گیا ہے کہ تمہیں آج مسلمانوں کی بے بسی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے اور اسلام کو جس طرح تم نے مخالفت کے طوفانوں کے پیچھے چھپا دیا ہے اس سے بھی تمہیں غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ ایک زمین بالکل بے آب و گیاہ پڑی ہوتی ہے جسے دیکھ کر گمان تک نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر روئیدگی کے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ مگر ایک ہی بارش سے وہ اس طرح پھبک اٹھتی ہے کہ اس کے چپے چپے سے نمو کی طاقتیں پھوٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔

آخر میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ آپؐ کی فتح اور کامیابیوں کے بارے میں مذاق اڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ فیصلہ کن فتح کب نصیب ہونے والی ہے۔ آپ ان سے اعراض فرمائیں۔ اگر یہ کسی فیصلے ہی کے منتظر ہیں تو فیصلے کا وقت بھی دور نہیں۔ لیکن اس وقت انہیں ماننا کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ انہیں انتظار کرنے دیجیے اور آپؐ بھی انتظار کیجیے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ٣٠	سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ (٣٢)	رُكُوْعَاتُهَا ٣

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ (١) تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٢) اَمْ يَقُوْلُوْنَ
افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ
مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (٣) اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ
مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (٤) يُدَبِّرُ
الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ
مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (٥) ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (٦) الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ
الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (٧) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (٨)
ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (٩) وَقَالُوْۤا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ
ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ (١٠) قُلْ
يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (١١)

Marfat.com

رکوع: ۱۔ (ا۔ ل۔ م۔ ۱) (اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ ۲) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے بلکہ یہی آپ کے رب کی جانب سے حق ہے تاکہ آپ ایک ایسی قوم کو انذار کریں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا، شاید وہ ہدایت پا جائیں۔ ۳) وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا، اس کے سوا نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا، تو کیا تم لوگ نصیحت حاصل نہیں کرو گے۔ ۴) وہی آسمان سے زمین تک ساری دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، پھر یہ تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔ ۵) وہ غائب و حاضر کا جاننے والا عزیز و رحیم ہے۔ ۶) اس نے جو چیز بھی بنائی خوب ہی بنائی ہے، اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی۔ ۷) پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ ۸) پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی، اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو۔ ۹) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم زمین میں رَل مِل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے بلکہ یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ ۱۰) ان سے کہہ دیجیے کہ موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو اپنے قبضے میں لے لے گا، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۱)

الٓمّٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲﴾

(ا۔ ل۔ م۔ ۱) اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ ۲)

چند اہم باتوں کی طرف اشارہ

اس آیتِ کریمہ میں چند اہم باتوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ (۱) قرآنِ پاک کے نزول کے لیے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں، انزال اور تنزیل۔ انزال کا معنی ہے یکبارگی اتارنا۔ اور تنزیل کا معنی ہے تھوڑا تھوڑا اور نہایت اہتمام سے اتارنا۔ ان دونوں باتوں سے قرآنِ پاک کی عظمت، اہمیت اور حفاظت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ قرآنِ پاک وہ ہے جسے دو دفعہ اتارا گیا۔ ایک لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر۔ یہ یکبارگی ہوا۔ اور دوسرا آسمانِ دنیا سے نبی کریم ﷺ کے قلبِ مبارک پر۔ یہ تھوڑا تھوڑا نجماً نجماً ہوا تاکہ اچھی طرح آپؐ کے دل و دماغ میں پیوست ہو جائے اور لوگوں کے عمل کا حصہ بن جائے۔ اور نہایت اہتمام کے ساتھ نازل کیا گیا۔ یعنی اس کا نزول فرشتوں کی حفاظت میں حضرت جبریل امین علیہ السلام کی قیادت میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے ساتھ ہوا۔ جس کتاب کا اترنا اس شان کے ساتھ ہو اس کی عظمت اور اہمیت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ (۲) لَا رَيْبَ فِيْهِ اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کفارِ مکہ کو اصل انکار اسی بات سے تھا کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں بلکہ محمد ﷺ نے اپنے پاس سے گھڑ لی ہے۔ اس لیے خاص طور پر زور دے کر فرمایا گیا کہ اس کتاب کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ اس کتاب کے اندر ایسی شہادتیں موجود ہیں جو اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ کیونکہ یہ کتاب ایسی زبان میں نازل ہو رہی ہے جو عربی زبان ہونے

Marfat.com

کے باوجود اہلِ عرب کے تصور سے بھی بہت بلند ہے۔ ان کے ادباء اور خطباء اپنی تمام تر فصاحت و بلاغت کے باوجود اس کلام کی نقل اتارنے سے قاصر ہیں۔ جس عظیم ذات پر یہ کتاب نازل ہو رہی ہے وہ خود عرب کی سب سے زیادہ فصیح شخصیت ہیں۔ بااین ہمہ وہ خود جو زبان بولتے ہیں اسے قرآنِ کریم کی زبان سے کوئی نسبت نہیں۔ مزید یہ بات کہ اس کتاب میں جو نظامِ زندگی پیش کیا گیا اس کے مرتب و منظم ہونے، انسانی مسائل کے حل کرنے اور زندگی کے تمام شعبوں میں باہمی ربط و ضبط پیدا کرنے اور قانون اور اخلاق کو باہم پیوست کرنے اور دنیا اور آخرت کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے میں ایسا جامع واقع ہوا ہے اور اس کی ہر بات ایسی حتمی ثابت ہوئی ہے کہ آج تک اس کی کوئی دفعہ دوسری دفعہ سے متصادم نہیں ہوئی، اس میں کبھی کسی ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اسے کبھی از کار رفتہ اور زمانے کی رفتار سے پیچھے رہ جانے والا قرار نہیں دیا گیا۔ اس کی تازگی، شادابی اور شگفتگی اسی طرح ہے جیسے اس کے نزول کے وقت تھی۔ مزید یہ کہ اس کے علمی مسلمات کو آج تک چیلنج نہیں کیا جاسکا، اس کے تاریخی محاکے آج تک اپنی جگہ اٹل ہیں، اس کی پیش گوئیاں ثابت ہو چکیں یا آئندہ ثابت ہو جائیں گی، اس کی کسی بات کو آج تک غلط ثابت نہیں کیا جاسکا۔ یہ کم سے کم وہ شواہد ہیں جو قرآنِ کریم کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر اہلِ علم محسوس کرسکتا ہے۔

دوسری وجہ اس ذاتِ عزیز کی شخصیت ہے جس پر قرآنِ کریم نازل ہوا ہے اور اس کے لیے باہر سے سند لانے کی ضرورت نہیں۔ مکہ معظمہ کے رہنے والوں میں بیشتر لوگ خود اس کے چشم دید گواہ ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنا بچپن، لڑکپن، جوانی اور قبل از نبوت تمام عرصہ انہیں میں گزارا۔ آپ کا خاندان وہیں آباد تھا، آپؐ کے تمام عزیز وہاں تھے، آپ نے انہیں میں شادی کی، وہیں آپ کی اولاد پروان چڑھی، انہیں کے ساتھ آپ نے تجارت کی اور بیرونِ ملک سفر بھی کیے، وہ لوگ آپ کی زندگی کے ہر پہلو سے شناسا اور گواہ اور اس پر متفق تھے کہ انہوں نے آپ سے زیادہ راست باز، سنجیدہ اور پاکباز انسان کوئی نہیں دیکھا۔ آپؐ کا دشمن بھی کبھی یہ کہنے کی جرأت نہ کرسکا کہ آپ نے کبھی جھوٹ بولا تھا یا آپ کے سیرت و کردار میں کوئی عیب تھا۔ اور مزید یہ کہ آپ نے دعوئ نبوت سے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لیے کچھ حاصل تو کیا کرنا تھا البتہ جو کچھ اپنے پاس ہے وہ بھی کھو دیا اور فاقوں تک نوبت آگئی۔ کسی بدترین دشمن نے بھی کبھی آپ میں خودغرضی کا شائبہ تک محسوس نہیں کیا۔ غرضیکہ آپ کی زندگی کے شب و روز، آپ کا حُسنِ کردار، آپ کی بے لوثی، آپ کی استقامت اور آپ کی سچائی کی ایسی دلیلیں ہیں جن کا انکار کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ قرآنِ کریم کو خود پڑھ کے دیکھو اس کے ایک ایک لفظ سے صداقت پھوٹ رہی ہے۔ اور صاحبِ قرآن سے مل کر دیکھو اس کی زندگی کی سچائی گواہی دے رہی ہے کہ جب وہ یہ کہتا ہے کہ یہ کتاب مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے تو اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوسکتا۔

اس آیتِ کریمہ میں تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ہمارا پیغمبر جس کتاب کو پیش کر رہا ہے وہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ یعنی وہ رب العالمین کا نمائندہ، اس کا رسول، اس کی طرف سے اس کے احکام و فرامین کے مجموعے کو تمہارے پاس لے کے آیا ہے تاکہ تمہیں زندگی گزارنے کا طریقہ سکھائے۔ اس لیے تم اس کی کسی بات کو اس کی بات مت سمجھو بلکہ وہ رب العالمین کی بات ہے۔ اگر وہ بات اس کی ہوتی تو شاید اس کا انکار کسی حد تک گوارا ہوتا۔ لیکن رب العالمین کی کسی بات کا انکار، اندازہ کرسکتے ہو، کس قدر ہولناک نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ وہ فرماں روائے کائنات ہے اور اس کا رسول اس کا ایلچی اور سفیر ہے اور اس کی کتاب اس کے فرامین کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس آیت میں یہ فرمانا کہ یہ کتاب رب العالمین کی جانب سے ہے تو یہ محض مصدرِ کلام کا اظہار نہیں بلکہ اس میں ایک بہت بڑا انذار پایا جاتا ہے کہ اگر تم اس کا انکار کرو گے تو دنیا میں بھی عذاب آسکتا ہے ورنہ اس کی پاداش میں قیامت کے

Marfat.com

دن تمہیں بڑے برے انجام سے واسطہ پڑے گا۔ گویا اب اس کتاب اور منذر کے آجانے کے بعد تمہاری قسمت میزان میں ہے۔ اقرار کرو گے تو بچ جاؤ گے، انکار کرو گے تو مہلت ختم ہونے کے بعد لازماً تباہ کر دیے جاؤ گے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳

(کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے بلکہ یہی آپ کے رب کی جانب سے حق ہے تا کہ آپ ایک ایسی قوم کو انذار کریں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا، شاید وہ ہدایت پا جائیں۔ ۳)

اظہارِ تعجب

اس آیت کے پہلے جملے میں سوال نہیں بلکہ تعجب کا اظہار ہے۔ کہ یہ لوگ قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر بھی اتنی بڑی بات کہنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ اسے آنحضرت ﷺ نے اپنے جی سے گھڑ لیا ہے اور اسے افترا قرار دے رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے اندر ذرا بھی انصاف سے تعلق یا انسانیت کی کوئی رمق ہوتی تو وہ کبھی یہ بات کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنِ کریم کی کسی بات کا ان کا پاس جواب نہیں۔ اور آنحضرت ﷺ کی زندگی پر وہ کسی طرح کا الزام لگانے سے بھی قاصر ہیں۔ تو پھر آخر ان کے پاس اسے افترا قرار دینے کی کیا وجہ ہے؟

قرآن حق ہے

اس کے بعد فرمایا کہ یہ قرآنِ کریم افترا نہیں بلکہ یہی حق ہے تیرے رب کی جانب سے۔ اس پر مزید کسی دلیل دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ کیونکہ جس چیز کی صداقت دلیل سے زیادہ روشن ہو اس پر دلیل دینا اسے کمزور کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر کوئی شخص دن کا انکار کرے تو اسے دلیل سے قائل کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ تم چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر بھی دن کے وجود سے انکار کرتے ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دن کے اقرار کے لیے تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ تمہیں اپنی صحتِ دماغ کو ثابت کرنا ہوگا کیونکہ خرابی وہاں ہے یہاں نہیں۔

قرآن کریم کے اتارنے کا مقصد

مزید فرمایا کہ اس کتاب کو اہتمام کے ساتھ اتارنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس کتاب کے ذریعے ان لوگوں کو زندگی کے انجام سے ہوشیار کر دیں جن کے اندر آپ سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا۔ کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اس شہر مکہ کی آبادی کی بنیاد رکھی۔ پہلا خیمہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ نے لگایا۔ وہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام پلے بڑھے۔ انہیں دیکھ کر بنو جرہم کے ایک گزرتے ہوئے قافلے نے اپنے کچھ خیمے لگا لیے۔ آئندہ چل کر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے انہیں میں

Marfat.com

شادی کی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو انہیں کی ہدایت کے لیے نبوت دی گئی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے وہ خاندان وجود میں آیا جسے قریش کہتے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس خاندان سے پہلے موجود تھے وہ گویا اس کے مؤسس ہیں۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد پھر اس قوم کو انذار اور تنبیہ کرنے اور ان کی ہدایت کے لیے کوئی نبی اور رسول نہیں آیا۔ اڑھائی ہزار سال کے بعد نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ کے وجود کو ایک رحمت کے طور پر پیش کیا جارہا ہے کہ تمہیں ضرورت تھی کہ تمہاری دنیا و عقبیٰ کی بھلائی کے لیے کوئی انذار کرنے والا آتا۔ چنانچہ اتنے طویل عرصے کے بعد اللہ تعالیٰ نے قریش پر رحم فرمایا اور آپ کی بعثت فرمائی۔ تو قریش کو اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کا سامان فرمایا۔

قرآنِ کریم کا یہ کہنا کہ آپ سے پہلے ان میں کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا۔ تو میں عرض کر چکا ہوں کہ آبادی کے پھیلنے اور قوم کے وجود میں آنے میں ایک وقت لگتا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اٹھ جانے کے بعد یقیناً یہ ضرورتیں پوری ہوئیں اور پھر اس کے بعد کوئی نبی اور رسول نہ آیا تو اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ آج تک ان کے پاس کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ اہلِ مکہ اور دیگر اہلِ عرب ضروریاتِ دین سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اس لیے کہ اگرچہ باقاعدہ طور پر ان کے انذار کے لیے ان کے اندر کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا لیکن اس ضرورت کو کسی نہ کسی حد تک ضرور پورا کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی لائی ہوئی روشنی کسی نہ کسی طرح ان کے اندر کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی۔ مزید یہ کہ حضرت شعیب علیہ السلام بھی سرزمینِ عرب میں تشریف لائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے لیکن ان کے لائے ہوئے دین کی روشنی عربوں تک بھی پہنچتی رہی جس کی بدولت ضروریاتِ دین سے یہ لوگ بالکل تہی دامن نہیں ہوسکے۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی سرزمین کو ہدایت دینے والے سے خالی نہیں چھوڑتا۔ لیکن یہ ہدایت ضروری نہیں کہ نبی اور رسول ہی کے واسطے سے ہو۔ اگر اس کے مبلغین بھی کہیں پہنچ جاتے ہیں تو وہ اس ضرورت کو پورا کردیتے ہیں۔ اور جہاں کہیں بتمام و کمال اس ضرورت کو پورا نہیں کیا جاتا تو وہاں کے رہنے والوں سے اللہ تعالیٰ اعمال کے حوالے سے بازپرس نہیں کرے گا بلکہ ضروریاتِ دین کے حوالے سے پوچھے گا جس میں صرف توحید و آخرت شامل ہیں۔ چنانچہ عرب کی تاریخ کو جب گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو توحید کے پرستار اور بتوں سے نفرت کرنے والے تھے۔ ان کی ایک بڑی تعداد ہمیں اہلِ عرب میں ملتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے قریبی زمانے میں قس بن ساعدہ الایادی، امیہ بن ابی الصلت، سوید بن عمرو، ورقہ بن نوفل اور زید بن عمرو بن نفیل ایسے بیسیوں نام ہیں تاریخ نے جن کے حالات محفوظ رکھے ہیں ان کو حنفاء کہا جاتا تھا۔ یہ سب لوگ علی الاعلان توحید کو اصل دین کہتے تھے اور مشرکین کے مذہب سے اپنی بےتعلقی کا صاف صاف اظہار کرتے تھے۔ اسی طرح یمن میں چوتھی صدی عیسوی کے جو کتبات برآمد ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں وہاں ایک توحیدی مذہب موجود تھا۔ حضرت سعید بن زید جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں ان کے والد زید بن عمرو بن نفیل کے بارے میں حضرت موسیٰ بن عقبیٰ نے روایت کیا ہے کہ وہ قریش کو بت پرستی سے روکتے تھے اور بتوں کے نام پر قربانی دینے کو بہت برا کہتے تھے۔ اور مشرکین کے ذبائح کا گوشت نہ کھاتے تھے۔ ابوداؤد طیالسی نے حضرت سعید بن زیدؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ میرے والد کا جو کچھ حال تھا وہ آپ کو معلوم ہے کہ توحید پر قائم اور بت پرستی کے منکر تھے۔ تو کیا میں ان کے لیے دعائے مغفرت کرسکتا ہوں؟ فرمایا کہ ہاں، ان کے لیے دعائے مغفرت جائز ہے۔ وہ قیامت کے روز ایک مستقل امت ہو کر اٹھیں گے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی

Marfat.com

انبیائے سابقین کی تعلیمات کے آثار کچھ نہ کچھ باقی تھے جس سے کم از کم اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا تصور بہت حد تک زندہ تھا۔ اور یہ توحید چونکہ پورے دین کی اساس ہے ممکن ہے ان لوگوں سے توحید ہی کے بارے میں سوال کیا جائے۔ لیکن یہ الگ بات ہے کہ اہلِ عرب نے توحید کا علم رکھتے ہوئے بھی شرک کو اپنی شناخت بنا لیا تھا اور انہیں اپنے آپ کو مشرک کہتے ہوئے کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک مانتے تھے لیکن بہت ساری قوتوں کو اس کا شریک بھی بنا رکھا تھا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴

(وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا، اس کے سوا نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا، تو کیا تم لوگ نصیحت حاصل نہیں کرو گے۔ ۴)

توحید پر اعتراض کا جواب

نبی کریم ﷺ کی نبوت اور قرآنِ کریم پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیے جانے کے بعد اب مشرکینِ مکہ کے اس اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے جو وہ آنحضرت ﷺ کی دعوتِ توحید پر کرتے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے، مالک ہونے، رازق ہونے اور مدبر ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ ان تمام حوالوں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے کچھ دیویوں اور دیوتاؤں کو اور کچھ بزرگوں کو بھی معبود مان رکھا تھا۔ انہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر ایک اللہ کی ذات تمام کائنات کا نظام چلائے اور وہی سب انسانوں کی تنہا معبود اور کارساز ہو اور اس کے سوا نہ کوئی کسی کی حاجت پوری کر سکے، نہ دعائیں سن سکے، نہ کسی اور طرح کے اختیار کا مالک ہو سکے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے اعتراف کے باوجود انہیں اس بات پر اصرار تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اور بھی بہت سی قوتوں کو اپنے اختیارات میں شریک کر رکھا ہے۔ چنانچہ ان کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہارا خدا تو وہ ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز جو یہاں پائی جاتی ہے وہ اس کی مخلوق ہے۔ وہ اپنی ہر مخلوق کے بارے میں ہر چیز سے واقف ہے۔ ان کی ضرورتوں کو بھی جانتا ہے، ان کی کمزوریوں سے بھی آگاہ ہے۔ ظاہر ہے ان صفات میں کوئی دوسرا اس کا شریک و سہیم نہیں ہو سکتا۔ تو تم نے دوسروں کو کارساز اور معبود کیسے سمجھ رکھا ہے۔ تمہارا گمان شاید یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق تو یقیناً وہی ہے لیکن زمین اس کائنات کا چونکہ بہت دور کا گوشہ ہے جس کے حالات سے خالقِ ارض و سما کو خبر نہیں ہو سکتی ہے، اس نے ان کو پیدا ضرور کیا ہے لیکن پھر ان کا انتظام و انصرام دوسروں کے حوالے کر کے خود آرام کر رہا ہے۔ فرمایا، ایسا نہیں۔ اس نے اس کائنات کو نہایت اہتمام و انصرام سے چھ دنوں یعنی چھ ادوار میں پیدا کیا۔ وہ ایک ہی وقت میں تمام کائنات کو پیدا کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ لیکن کائنات کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اس نے ان کو چھ ادوار میں پیدا کیا ہے جس کا ہر دور ایک ہزار سال پر محیط ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ وہ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد کہیں آرام نہیں کر رہا بلکہ کائنات کے عرشِ حکومت پر جلوہ فرما ہے اور اس کے آخری کونے تک اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ اور اس نگرانی میں نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ اس کی آنکھ جھپکتی ہے اور اس کائنات کے انتظام و انصرام کی مشغولیت اسے تھکاتی بھی نہیں کیونکہ وہ ان سب چیزوں سے پاک ہے۔

Marfat.com

ارض وسما اور دیگر تمام مخلوقات کا خالق چونکہ پروردگار ہے اور وہی اس کائنات کا انتظام وانصرام بھی چلا رہا ہے، اسی کی قدرتِ کاملہ سے سلطنت کا ایک ایک گوشہ اپنے فرائض انجام دے رہا اور اپنے دائرہ کار میں پابند ہے۔ تم اسی سلطنت کے ایک کُرّہ کے باسی ہونے کی وجہ سے اس کے تکوینی نظام کے پابند ہو۔ اور ایک مکلف اور بااختیار مخلوق ہونے کی وجہ سے اس کے تشریعی نظام کی ذمہ داری بھی تم پر ہے۔ اس لحاظ سے تم ایک ایسے حصار میں ہو جس میں اگر ایک طرف تکوینی نظام کی پابندیاں ہیں تو دوسری طرف تشریعی نظام کی نزاکتیں ہیں جس کی قدرت اور جس کے نظام میں انسان گھرا ہوا ہے کیسی عجیب بات ہے کہ دوسروں کو شریک کرنے لگے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ کوئی دوسری طاقت اتنی احتیاجات اور پابندیوں کے باوجود بھی مصیبت میں تمہارے کام آسکتی ہے۔ اسی غلط فہمی کے ازالے کے لیے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی کارساز اور مددگار نہیں اور اگر اللہ تعالیٰ تمہیں پکڑ لے تو کوئی اس کے سامنے سفارش کرنے کی اس کی اجازت کے بغیر جرأت نہیں کرسکتا۔ کسی کے بس میں نہیں کہ تمہیں اس کے غضب سے بچا سکے۔ تو اتنی واضح باتوں کے باوجود تم نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿٥﴾

(وہی آسمان سے زمین تک ساری دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، پھر یہ تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔ ۵)

کائنات کے انتظام پر اللہ تعالیٰ کی گرفت

کائنات کے انتظام وانصرام کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی گرفت ایسی منضبط اور شدید ہے کہ کائنات کا کوئی معاملہ اور انسانی زندگی کا کوئی حوالہ اس کے اختیار سے باہر نہیں۔ زمین کائنات کا دور دراز گوشہ سہی اور آسمان کائنات کا بہت بلند وبالا حصہ سہی، لیکن آسمان سے لے کر زمین تک کوئی کام ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارادے کے بغیر وجود میں آتا ہو۔ ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور سے حکم صادر ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی رپورٹ اور روداد اللہ تعالیٰ ہی کے حضور پیش ہوتی ہے۔ وہ احکام صادر کر کے بے تعلق ہو کر نہیں بیٹھ جاتا۔ کارکنانِ قضاء وقدر جانتے ہیں کہ اختیارات کا سرچشمہ کہاں ہے اور ہر چیز کا سررشتہ کس کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر کام کے نتیجے کی روداد کس کے حضور پیش کرنی ہے۔ البتہ اس کی جناب سے فیصلے جو صادر ہوتے ہیں اور پھر اس کے جو نتائج اس کے حضور پیش ہوتے ہیں اس کی مدت ہمارے حساب سے ایک دن کی نہیں ہوتی بلکہ ایک ہزار سال کی ہوتی ہے۔ یعنی ہم ہر کام کا نتیجہ ایک دن یا چند دنوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ یعنی وہ جو کائنات کی بھلائی اور اہلِ دنیا کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے فیصلے کرتا ہے وہ ہمارے دنوں کے اعتبار سے روز روز کی بات نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے اپنے ایام کے اعتبار سے وہ فیصلے ظہور میں آتے ہیں۔ بعض اہلِ علم نے اس سے مراد قیامت کا دن لیا ہے۔ اور دوسری جگہ ایک دن کو پچاس ہزار سال کے برابر قرار دیا گیا ہے، اس سے بھی ان کے یہاں قیامت ہی کا دن مراد ہے۔ البتہ فرق اس لیے ہے کہ قیامت کے دن کی ہولناکی کے اعتبار سے ہر شخص کا احساس دوسرے سے الگ ہوگا۔ جتنا بڑا مجرم ہوگا اتنے ہی زیادہ خوف کا شکار ہوگا۔ اور خوف کی وجہ سے اس کے لیے دن کی درازی دوسروں سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔ کیونکہ شدید [illegible]یت کا ایک

Marfat.com

ایک لمحہ بعض دفعہ ایک سال پر بھاری ہوتا ہے۔ اور جو ایمان وعمل میں خوش نصیب واقع ہوئے ہوں گے ان کے یہاں دن کی درازی کہیں ایک ہزار سال اور بعضوں کو اس سے بھی کم معلوم ہوگی۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی نبی کریم ﷺ سے منقول نہیں۔ اس لیے حضرت ابنِ عباسؓ نے اس سے متعلق فرمایا هما یومان ذکرهما الله تعالی فی کتابه، الله تعالی اعلم بهما واکره ان اقول فی کتاب الله مالا اعلم یعنی ''وہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا اور اللہ ہی ان کی حقیقت کو جانتا ہے اور میں اس کو برا سمجھتا ہوں کہ قرآن میں وہ بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔'' لیکن قرآنِ کریم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق قیامت سے نہیں۔ کیونکہ سورۃ حج میں ارشاد فرمایا گیا ہے: وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ''یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں، اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا، مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تم لوگوں کے شمار سے ہزار برس ہوا کرتا ہے۔'' وہاں یہ آیت عذاب کے لیے لوگوں کی جلد بازی کے جواب میں وارد ہوئی ہے کہ جب ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا تو وہ کہتے کہ اس عذاب کی دھمکی ہم ایک مدت سے سن رہے ہیں، لیکن وہ آیا نہیں۔ اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا۔ ان کے جواب میں فرمایا کہ انسانی تاریخ میں خدا کے فیصلے دنیا کی گھڑیوں اور جنتریوں کے لحاظ سے نہیں ہوتے۔ کسی قوم سے اگر یہ کہا جائے کہ فلاں روش اختیار کرو گے تو اس کا انجام تمہیں یہ کچھ دیکھنا ہوگا تو وہ قوم احمق ہوگی۔ اگر اس کا مطلب یہ سمجھیں کہ آج وہ روش اختیار کی جائے اور کل اس کے برے نتائج سامنے آ جائیں۔ اس لیے خدا کے کاموں کو اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپو۔ تمہارے دن چوبیس گھنٹوں کے ہوتے ہیں اس وجہ سے تمہیں چند سالوں کی مدت بھی طویل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار سے ایک ہزار سال کے برابر کا ہوتا ہے۔ اور اسی کے حساب سے اس کے سارے پروگرام اور منصوبے بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی قوم کی بھلائی کے لیے یا اس کو سزا دینے کے لیے قوموں کے معاملات کے نتائج کب اس عمر کو پہنچتے ہیں جس سے صحیح اور حتمی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ذٰلِکَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۙ ﴿۶﴾

(وہ غائب وحاضر کا جاننے والا عزیز و رحیم ہے۔ ۶)

اللہ تعالیٰ کے انتظام اور تدبیر کی جامعیت

اس کا انتظام وانصرامِ سلطنت اور تدبیر امور اس قدر مکمل اور جامع ہے کہ نہ تو سلطنت کا کوئی گوشہ اس سے باہر ہے اور نہ اس کے کسی حکم کے نتیجہ خیز ہونے میں کوئی چیز مانع ہے۔ انسان بعض دفعہ اس کے فیصلوں میں تاخیر کی شکایت کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی قلتِ فکر اور نارسائی عقل سے چونکہ اپنے پیمانوں سے ناپتا اور تولتا ہے تو اسے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے منصوبے اللہ تعالیٰ کے دنوں کے حساب سے بنتے اور نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور اس کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ جس طرح اس کی انتظامی گرفت میں کوئی جھول نہیں اسی طرح اس کے علم کی وسعتیں بھی بے حد وبے کنار ہیں۔ انسان صرف ان باتوں کو جانتا ہے جن کا تعلق عالمِ شہادت سے ہے۔ یعنی جو محسوسات اور معقولات کے دائرے میں آتے ہیں۔ لیکن جن کا تعلق عالمِ غیب سے ہے ان کا جاننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ

Marfat.com

جس طرح عالمِ شہادت کو جانتا ہے اسی طرح عالمِ غیب کو بھی جانتا ہے۔ اور پھر اپنے علم کے مطابق جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کے ارادے کو بروئے کار آنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی کیونکہ وہ عزیز ہے۔ البتہ اس کے ہر کام ہر فیصلے میں رحمت کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ مخلوقات کی بھلائی کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہے۔ وہ سزا بھی دیتا ہے تو مہلتِ عمل کے خاتمے کے بعد، وہ حکم کی تعمیل چاہتا ہے لیکن انسانی کمزوریوں کے لحاظ کے ساتھ، وہ انسان کو تکلیفِ شرعی میں مبتلا کرتا ہے لیکن اس کی وسعت اور استطاعت کے مطابق، کیونکہ وہ رحیم و کریم ہے۔ اور اگر وہ کہیں اپنی قدرت کے مطابق انسانوں کی کوتاہیوں اور نافرمانیوں پر گرفت کرنے لگتا تو زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا باقی نہ رہتا۔

الَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍۚ ۞ ۷
ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍۚ ۞ ۸

(اس نے جو چیز بھی بنائی خوب ہی بنائی ہے، اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدائی مٹی سے کی۔ ۷) پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ ۸)

اللہ تعالیٰ کا حُسنِ تخلیق

اللہ تعالیٰ چونکہ عالم الغیب والشھادہ ہے اس لیے اس کے علم کی رسائی ہر حُسن و قُبح اور ہر اچھائی اور برائی کی تہہ تک ہے۔ اور اس کی رحمت، حُسنِ تخلیق اور جمال آرائی کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس لیے اپنی ان صفات کی وجہ سے اس نے جس چیز کو بھی پیدا فرمایا اور جو چیز بھی بنائی خوب بنائی۔ کائنات میں اس کی مخلوقات کا کوئی شمار نہیں۔ مخلوقات کی مختلف انواع ہیں جس کے افراد کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان میں سے کوئی ایسی چیز نہیں جو بے ڈھنگی اور بے تکی ہو۔ ہر چیز اپنا ایک الگ حُسن رکھتی ہے۔ بعض چیزیں بظاہر بے ڈھب سی معلوم ہوتی ہیں لیکن جب ان کے ماحول، دائرۂ کار اور فرائض کی نوعیت کے اعتبار سے دیکھا جاتا ہے تو تب معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس سے بہتر بنایا نہیں جاسکتا تھا۔ اونٹ کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ لیکن اونٹ سفینۂ صحرا ہونے کی نسبت سے جن بنیادی خصائص کا مالک ہے انہیں دیکھ کر اور اس کے تناسب کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے حُسنِ تخلیق کا وہ شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ مصر میں صرف اس کے جبڑے کی تحقیق کے سلسلے میں ایک ضخیم کتاب مرتب ہوئی جسے پڑھ کر آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ ہر ماحول کی مخلوق کو جیسی صفات کی ضرورت تھی ویسی صفات دی گئی ہیں۔ اور ہر مخلوق کی صفات کے اعتبار سے جیسا ماحول چاہیے تھا وہ ماحول دیا گیا ہے۔ اور پھر ہر چیز کو اس کی موزوں ترین شکل عطا کی گئی ہے۔ دیکھنے کے لیے آنکھ اور سننے کے لیے کان کی ساخت سے زیادہ موزوں کسی ساخت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہوا اور پانی جن مقاصد کے لیے بنائے گئے ہیں ان کے اوصاف اور ان کے مقاصد میں جیسی مناسبت اور یک رنگی نظر آتی ہے اسے محسوس کر کے آدمی ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کی ہر مخلوق صرف اپنے حُسنِ صورت ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے صفات و خصائص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور اس کے بے نہایت علم کی شاہد ہے۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی لے کر انسان اس پر غور کرے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے تبارک اللہ احسن الخالقین۔

Marfat.com

حُسنِ تخلیق کی مثال

پھر اپنے حُسنِ تخلیق کی مثال کہیں خارج سے لانے کی بجائے خود انسان ہی کی خلقت کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کے حُسنِ تخلیق کا شاہکار ہے اور اس کو قدرت نے جس طرح جوہرِ عقل، قوتِ ایجاد اور ذوقِ تسخیر سے مزین کیا ہے اسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے کسی بڑے قیمتی جوہر سے پیدا کیا ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حُسنِ تخلیق کے کیا کہنے' کہ ایسی عظیم مخلوق کی ابتداء مٹی سے فرمائی۔ اس سے اس کا قالب بنا اور اسی مٹی کے اندر سے اس کی زندگی کی حرکت نمودار ہوئی۔ یہ نظریہ جو قرآن نے پیش کیا ہے یہ بظاہر بہت سادہ ہے لیکن اس سے بڑھ کر حقیقت کوئی نہیں ہوسکتی۔ ڈارون اور اس کے پیروکار اگرچہ اسے ایک غیر سائنٹیفک نظریہ قرار دیتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ ان کے سائنٹیفک نظریات چند مفروضوں کے سوا کچھ نہیں جبکہ اس کے پیچھے وحیِ الٰہی کی قوت ہے۔ ان کی غیر سنجیدگی ملاحظہ ہو کہ آغازِ حیات کو ایک حادثہ قرار دیتے ہیں۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ ایک خلیے والے حیوان میں زندگی کی سادہ ترین صورت بھی اتنی پیچیدہ اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے۔ اسے بھی کوئی احمق آدمی ہی حادثہ قرار دے سکتا ہے، کوئی عقلمند آدمی ایسا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اگر جرثومہ بھی پیدا ہوا ہے تو وہ بھی براہ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہی سے وجود میں آیا ہے۔ تو اگر انسانی عقل اس کو ماننے پر مجبور ہے تو پھر یہ ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوعِ حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے وجود میں آیا تھا۔ اور اس میں مزید حیران کن بات یہ ہے کہ اس پہلے مرحلے کے بعد انسانی خلقت کا دوسرا مرحلہ جس سے انسان ہمیشہ پیدا ہوتے چلے آرہے ہیں وہ کتنا حیران کن ہے کہ پانی کی ایک حقیر بوند غیر معمولی خصائص و اوصاف رکھنے والے انسان کی تخلیق کا سبب ہے۔

ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ ۹

(پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی، اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو۔ ۹)

پہلے انسان کو تو اللہ تعالیٰ نے دستِ قدرت سے بنایا اور اس کا قالب مختلف دھاتوں اور مٹی سے تیار ہوا اور پھر اس میں روح پھونکی گئی۔ لیکن پھر اس پہلے انسان سے جو سلسلۂ توالد و تناسل چلا اس کے لیے حیران کن طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ پانی کی ایک بوند جسے مادۂ منویہ کہا جاتا ہے وہ شوہر سے بیوی کے رحم میں منتقل ہونے کے بعد انسانی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر درجہ بدرجہ وہ تکمیل کی طرف بڑھتا ہے۔ پہلے یہ پانی کا قطرہ خون بنتا ہے، پھر گاڑھا ہوتا ہے، گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس مرحلے پر پہنچ کر اللہ تعالیٰ اس کا تسویہ فرماتا ہے۔ یعنی اس کی صورت آرائی کرتا ہے، اس کا نک سک درست کرتا ہے، اس کی نوک پلک سنوارتا ہے، اس کے جسم کے سارے اعضاء و جوارح کو تکمیلی شکل عطا فرماتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ پھر اس کے بعد آخری مرحلے میں اس کے اندر روح پھونکتا ہے۔ اور یہی وہ روح ہے جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی مِلک اور اس کی صفات کا پرتو ہے۔ یقیناً یہ روح یا تو اس حیوانی روح سے مختلف ہے جس کی وجہ سے ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے۔ اور ہر حیوان اسی روح کے نفخ ہونے کے بعد زندگی سے آشنا ہوتا ہے۔ اور یا یہ اسی روح کی نفیس ترین شکل ہے جسے انسان کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور اسی کے نتیجے میں انسان کو فکر و شعور، عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار جیسی صفات عطا ہوتی ہیں۔ اور جن اہلِ علم کے نزدیک یہ روح، روحِ حیوانی سے الگ ہے وہ اسے روحِ ملکوتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا خیال

Marfat.com

ہے کہ یہ حیوانی روح کے ساتھ ایک نورِ یزدانی ہے جو انسان کو عطا ہوتا ہے اور اسی کے فیض سے انسان کے سمع و صبر اور فواد میں وہ روشنی پیدا ہوتی ہے جس سے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ دونوں صورتوں کا مآل ایک ہی ہے جس سے انسان کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے اور باقی مخلوقات پر اس کی برتری ثابت ہوتی ہے۔

مِنْ رُّوْحِہٖ ...... اس میں اللہ تعالیٰ نے روح کی اضافت اپنی طرف فرمائی ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے فی الجملہ اس روح کے اختصاص کا اظہار ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خاص فیوض و برکات میں سے ہے۔ لیکن عیسائیوں اور بعض دیگر گمراہ فرقوں نے روح کو ایک مستقل وجود قرار دے کر الوہیت میں ثنویت پیدا کی ہے۔ اور انہوں نے اسے اللہ تعالیٰ کا حصہ قرار دیا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ عیسائیوں نے اس اضافت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور انہیں ایک دوسرا خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں بالکل یہی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ لیکن کسی مذہب میں بھی حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ایسی کسی صفت کو منسوب نہیں کیا گیا۔ حالانکہ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ ”جب میں اس کی نوک پلک درست کر دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے سامنے سجدے میں گر جانا۔“ اس سے کسی نے یہ مفہوم اخذ نہیں کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔

یہاں تک اس آیتِ کریمہ میں انسان کا سارا ذکر صیغۂ غائب میں کیا گیا۔ لیکن روح پھونکنے کے بعد اسلوب میں تبدیلی آئی ہے، اب براہِ راست انسان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روح پھونکنے سے پہلے وہ خطاب کے لائق نہ تھا، روح پھونکنے کے بعد وہ اس قابل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اس سے خطاب کیا۔

کان اور آنکھوں سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ کان سے مسموعات کا علم حاصل کرتا ہے اور آنکھوں سے مشاہدات کا۔ اگرچہ حصولِ علم کے ذرائع اور بھی ہیں، لیکن یہ دو بڑے اہم ذرائع ہیں۔ اس لیے قرآنِ کریم نے جگہ جگہ ان دونوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد فواد، یعنی دل کا ذکر فرمایا۔ اس سے مراد وہ ذہن ہے جو حواس کے ذریعہ سے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے جو جزئیات سے کلیات بناتا ہے اور کلیات سے جزئیات کو اخذ کرتا ہے۔ آج کی سائنس اگرچہ دماغ اور دل کو فرائض کے اعتبار سے الگ الگ حیثیت دیتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم اور پہلی آسمانی کتابیں سوچنے سمجھنے، فیصلہ کرنے اور نتائج و عبر کو قبول کرنے کے حوالے سے دل ہی کی بات کرتی ہیں۔ زندگی میں تبدیلی لانے کے حوالے سے قلب اور فواد ہی کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ اور ہمارا قومی شاعر جو قرآنی زبان میں بات کرتا ہے وہ بھی سارا زور دل ہی کی اصلاح پر دیتا ہے۔ اب بعض سائنس دان بھی اس بات کا اعتراف کرنے لگے ہیں کہ غم اور خوشی کے اثرات کو محسوس کرنے اور تاثیر اور تاثر کے اعتبار سے دل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اور جہاں تک ذہن اور دماغ کا تعلق ہے علم کے تمام ذرائع اسی کو غذا بہم پہنچاتے اور اسی کی چاکری بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے تمام تاثرات اور معلومات کو دل کے حوالے کرتا ہے اور وہاں سے انسانی زندگی میں انقلاب آتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ باتیں اگر قابلِ قبول نہ بھی ہوں تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دل اور فواد اس جگہ کا نام ہے جہاں خیالات پیدا ہوتے، نکھرتے، ترتیب پاتے، مختلف شکلیں اختیار کرتے اور بالآخر مختلف اعمال اور مختلف رویوں کی صورت گری کرتے ہیں۔ آپ اس کا نام ذہن یا دماغ رکھ لیجیے یا اس کو دل کہہ لیجیے، مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

Marfat.com

آخر میں فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے تمام مراحلِ خلقت پر غور کرے کہ کس طرح پروردگار نے اس کی تخلیق کا آغاز کیا اور پھر اسے کمال تک پہنچایا۔ تو اس کا بال بال اپنے رب کی اس عنایت و ربوبیت کا شکرگزار رہوگا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انسانوں کو اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پروردگار فرماتا ہے کہ تم ان سارے احسانات کے باوجود بہت کم اپنے مالک کے شکرگزار ہوتے ہو۔

وَقَالُوْٓاءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰

(اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم زمین میں رَل مِل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے بلکہ یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ ۱۰)

آخرت پر اعتراض کا جواب

اس سے پہلے کی آیات میں رسالت اور توحید پر کفار کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اب اسلام کے تیسرے بنیادی عقیدے یعنی آخرت پر ان کے متعدد اعتراضات میں سے ایک بنیادی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن جواب کا انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ ان کے اعتراضات کو نظرانداز کرکے اصل بات کو جو ان کے اعتراض کا اصل سبب ہے اس کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور اصل اعتراض کو نظرانداز کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں اس اعتراض کو کتنا بھی مؤثر اور کاٹ دار سمجھتے ہوں حقیقت میں وہ ان کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔ لیکن جو انہیں اصل مرض لاحق ہے جسے وہ ذکر کرنا نہیں چاہتے اس کو نمایاں کرکے انہیں آئینہ دکھایا گیا ہے۔

اعتراض ان کا یہ تھا کہ جب ہم مرنے کے بعد آہستہ آہستہ خاک میں مل کر خاک ہوجائیں گے یعنی زمین ہمارے جسم کے ہر حصے کو کھا جائے گی اور ہماری ہڈیاں اور ہمارا گوشت پوست مٹی میں تبدیل ہوجائے گا اور ہمارے جسم کا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا اور ایک مدت گزرنے کے بعد ہماری قبروں کے نشانات بھی مٹ جائیں گے اور جو لوگ ہم سے صدیوں پہلے مرچکے ہیں ان کی تو خاک بھی اڑ چکی ہوگی۔ اس لحاظ سے ہم بالکل گم ہوچکے ہوں گے۔ تو کس قدر تعجب کی بات ہے کہ پھر ہمیں ازسرنو زندہ کیا جائے گا۔ اس اعتراض کا جواب پروردگار نے دینا پسند نہیں فرمایا۔ ایک تو اس لیے کہ متعدد مواقع پر اس کا جواب دیا جاچکا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اعتراض جن دو اجزاء پر مشتمل ہے وہ دونوں ہی اپنے اندر حماقت اور سفاہت کے سوا کچھ نہیں رکھتے۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم جب مٹی میں رَل مِل چکے ہوں گے تو دوبارہ کیسے زندہ ہوسکیں گے۔ انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک اس کا جسم ہے جو مٹی، پانی اور چند دوسری دھاتوں سے مل کر بنا ہے۔ اور دوسری روح ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔ موت جسم پر واقع ہوتی ہے، روح پر نہیں۔ قبر میں جسم اتارا جاتا ہے، روح تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے اصل مسکن میں پہنچ جاتی ہے۔ اور "ہم" سے جو چیز مراد لی جاتی ہے وہ درحقیقت روح ہے جسم تو اس کا ایک آشیانہ ہے جس کے اندر وہ رہتی ہے۔ جسم کے اعضاء کٹ جائیں، روح کا کوئی حصہ کٹنے میں نہیں آتا۔ اس لیے جو چیز مٹی بنے گی بحث اس کی زندگی کی نہیں۔ اسے پہلے بھی مٹی اور چند دھاتوں سے تیار کیا گیا تھا۔ مٹی بننے کے بعد واپس اس کے اجزاء اسی زمین میں رَل مِل جاتے ہیں۔ روح پر چونکہ موت نہیں آئی اس لیے قیامت کے دن جب اسے اٹھایا جائے گا تو روح کے مکان کو جو زمین میں اِدھر اُدھر بکھر چکا تھا دوبارہ اس کے اجزاء کو جمع کرکے اس کی اصلی شکل میں میدانِ حشر میں لا کھڑا کیا جائے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جسم کو موت آتی ہے تو اس کے اجزاء بکھر کر زمین

Marfat.com

میں مل جاتے ہیں۔ قیامت کے دن انہیں اجزاء کو دوبارہ جمع ہونے کا حکم دیا جائے گا جو زمین میں موجود ہوں گے۔ اور وہ روح جو اصل انسانیت سے عبارت ہے وہ پھر اپنے اس مسکن میں داخل ہو جائے گی وہ موت کا شکار نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ تو یہ بات اتنی واضح ہے کہ قرآنِ کریم نے اس حماقت کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں جاتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

ان کی اس سفاہت کو نمایاں کرنے کے بعد ان کے اصل مرض کی نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ لوگ اپنے اصل مرض کو چھپانے کے لیے اس طرح کی سفیہانہ گفتگو کرتے ہیں، ورنہ وہ حقیقت سے ایسے بے بہرہ بھی نہیں ہیں۔ ان کا اصل مرض یہ ہے کہ وہ اپنی بداعمالیوں اور بداطواریوں کو خوب جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنا نامۂ عمل جس طرح کے مظالم، حق تلفیوں اور اعمالِ بد سے تیار کیا ہے انہیں خوب معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کی جواب دہی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ مختلف قسم کے اعتراضات میں اپنے اس خوف کو چھپانا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے رب کے سامنے حاضری کیسے دیں اور اس کا سامنا کیسے کریں۔

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

(ان سے کہہ دیجیے کہ موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو اپنے قبضے میں لے لے گا، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۱)

آیت میں تین باتوں کی وضاحت

اس آیتِ کریمہ میں تین باتوں کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔ پہلی بات یہ کہ تمہیں موت خود بخود نہیں آ جاتی۔ جس طرح کوک سے چلنے والی گھڑی کوک ختم ہوتے ہی رک جاتی ہے۔ انسان پر موت واقع اس طرح نہیں ہوتی۔ غالب نے اسے فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے لیکن وہ بھی حقیقت سے بہت دور ہے۔ اس نے کہا:

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

زندگی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک پراسس مکمل ہونے کے بعد نفخِ روح سے آتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے ایک سسٹم کام کرتا ہے۔ اسی طرح موت بھی اچانک عناصر کے بکھر جانے سے واقع نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ایک فرشتہ ہے جس کا نام عزائیل ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں میں سے ہیں۔ ان کے ساتھ کارکنوں کی ایک فوج ہے جو ان کے ماتحت کام کرتی ہے اور حضرت عزائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عزائیل علیہ السلام کہتے ہیں کہ میں ہر شخص کو روزانہ پانچ مرتبہ دیکھتا ہوں۔ اس لیے ہر شخص کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اور جب حکم ہوتا ہے تو ٹھیک اسی شخص کی جان نکالتا ہوں اس میں کبھی غلطی نہیں

Marfat.com

کرتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مومن ہے کہ کافر۔ اسی حدیث میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے میں اپنے طور سے کسی مچھر کی بھی جان نہیں نکال سکتا۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تمام نوعِ انسانی کے افراد اس طرح متحضر ہوتے ہیں جس طرح ایک بڑے طباق میں بکھرے ہوئے دانے کہ اٹھانے والا جس دانے کو چاہتا ہے اٹھالیتا ہے، یہی حال موت کے فرشتے کا بھی ہے۔ یہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب کسی شخص کی جان نکالتا ہے تو اس کی وہ روح جسے بولنے والا ''انا'' کہہ کر یاد کرتا اسے پورے کا پورا وصول کرتا ہے۔ یعنی عقائد اور افکار اور اعمال و آداب سے جیسی کوئی شخصیت وجود میں آچکی ہے فرشتہ اسے جوں کا توں اپنے قبضے میں لے لیتا ہے اور اس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونے دیتا۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اس کے رب کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ جسم سے نکالی جانے والی شخصیت کبھی موت کا شکار نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت جسم سے اس کا علیحدہ کیا جانا جسم کی موت ہے اور اسی جسم کو مٹی کھاتی ہے اور وہ دوبارہ مٹی کے اجزاء میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور انہیں اجزاء کو دوبارہ اٹھا کر اس کے جسم کی شکل دی جائے گی۔ اور اسی میں روح داخل کرنے کے بعد اسے حساب کے لیے بارگاہِ حق میں پیش کیا جائے گا۔ اگر اس پورے پراسس پر غور کر لیا جائے تو مشرکین کے اس اعتراض کا جواب مل جاتا ہے کہ ہم مٹی میں مل دل جانے کے بعد کیسے از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے۔

دوسری بات اس میں یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جسم سے روح کا الگ کیا جانا یہ کوئی حادثاتی عمل نہیں بلکہ ایک منضبط نظم ہے جس کے تحت موت واقع ہوتی ہے۔ اس میں فرشتوں کی ایک بڑی تعداد اور ملک الموت موجود ہوتے ہیں اور یہ تمام کارروائی ان کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ اس لیے جب قیامت کا اعلان ہوگا تو ملک الموت اور ان کے معاون دیگر فرشتے چونکہ ایک ایک کو پہچانتے ہوں گے اس لیے ان کے لیے ان کو از سرِ نو اٹھا کھڑا کرنا اور میدانِ حشر میں پہنچا دینا ایک ایسا عمل ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ اور جس کے وقوع پذیر ہونے میں بھی کوئی دشواری نہیں۔

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ مشرکین یہ سمجھتے ہیں کہ اگر واقعی قیامت وقوع پذیر ہوئی تو ہمارے لیے تب بھی فکرمندی کی کوئی بات نہیں ہماری واپسی ان شرکاء و شفعاء کی طرف ہوگی جن کو ہم دنیا میں پکارتے رہے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے اعلان کے بعد ہر شخص کی واپسی اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہوگی۔ سب اس کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے اور اپنی اپنی باری پر سب کو جواب دہی کرنا ہوگی۔ وہاں کسی شریک اور شفیع کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا
وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ⑫ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا
كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ
الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ⑬ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ

Marfat.com

هٰذَا ۚ إِنَّا نَسِينَاكُمْ ۖ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾ إِنَّمَا
يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ
رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩ ﴿١٥﴾ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ
يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعْلَمُ
نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾
أَفَمَن كَانَ مُؤْمِنًا كَمَن كَانَ فَاسِقًا ۚ لَّا يَسْتَوُونَ ﴿١٨﴾ أَمَّا الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن
يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي
كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ
الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ
رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ ﴿٢٢﴾

رکوع: ۲۔ (اور کاش آپ دیکھتے جب یہ مجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے خوب دیکھ لیا اور سن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب یقین آ گیا ہے۔ ۱۲) (جواب میں ارشاد ہوگا) اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے، لیکن میری طرف سے یہ بات متحقق ہو چکی ہے، میں جنوں اور انسانوں سے جہنم کو بھر دوں گا۔ ۱۳) تو اب چکھو مزہ اس بات کا کہ تم نے اس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا، اب ہم نے بھی تم کو نظر انداز کر دیا ہے، تو چکھو ہمیشگی کے عذاب کا مزہ اپنے کرتوتوں

Marfat.com

کی پاداش میں۔ ۱۴) ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں جب یہ آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ۱۵) ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۱۶) تو کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان لوگوں کے واسطے ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک پوشیدہ ہے۔ ۱۷) بھلا وہ شخص جو مومن ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو فاسق ہے، دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ ۱۸) جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے باغ ہیں رہنے کے، مہمانی ان کاموں کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔ ۱۹) اور رہے وہ جنہوں نے نافرمانی کی، تو ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ اب اس دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ۲۰) اور ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے قریب کا عذاب بھی ضرور چکھائیں گے تا کہ یہ باز آ جائیں۔ ۲۱) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جائے پھر وہ اس سے اعراض کرے، ہم ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے۔ ۲۲)

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

(اور کاش آپ دیکھتے جب یہ مجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے خوب دیکھ لیا اور سن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دے تا کہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب یقین آ گیا ہے۔ ۱۲)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ کفارِ مکہ کے انکار و تکذیب اور ان کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ اور آپ کی دعوت کے جواب میں جس طرح یہ لوگ اکڑفوں دکھاتے ہیں اور پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے، کاش آپ قیامت میں ان کی وہ حالت دیکھیں جب یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر لعنت برس رہی ہوگی، ندامت اور شرمندگی سے سر اٹھانے کی ہمت نہیں کریں گے، ان کا جی چاہے گا کہ کاش زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں دھنس جائیں۔ آخر جب انہیں جواب دینے کی اجازت ملے گی تو دنیا میں باغیانہ رویے کا دفاع کرنے کی بجائے اعتراف کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا اور کان کھول کے سن لیا کہ ہم جن حقائق کا انکار کرتے رہے ان کے سراسر حق ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ ہم نے یقیناً بہت کوتاہیاں کیں، حدود سے تجاوز کیا اور حقیقتوں کو پامال کیا لیکن آج ہم پر ہر چیز کھل چکی ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ ہمیں ایک موقع دیں اور واپس دنیا میں بھیج دیں۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم نیک عمل کریں گے۔ یعنی کسی طرح بھی آپ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اب ہمیں یقین آ گیا ہے کہ جو کچھ ہمیں اللہ تعالیٰ کے رسول نے بتایا تھا وہی حق ہے اور وہی ہمارے لیے کامیابی کا راستہ ہے ہم اس پر چلنے کی انتہائی کوشش کریں گے۔

Marfat.com

یہاں اگرچہ لَوْ کا جواب محذوف رکھا گیا ہے کیونکہ انسانی تصور اور احساس میں ابھی وہ وسعت نہیں کہ وہ اس منظر کو سمجھ سکے جس میں اس وقت کافر مبتلا ہوں گے۔ لیکن ہم نے اپنے طور پر بات کو رواں رکھنے کے لیے اسے کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ محذوف کی ایسی تعبیر کرنا جو حسب موقع ہو وہ اہلِ علم کے نزدیک جائز ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

(جواب میں ارشاد ہوگا) اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے، لیکن میری طرف سے یہ بات متحقق ہو چکی ہے، میں جنوں اور انسانوں سے جہنم کو بھر دوں گا۔ ۱۳) تو اب چکھو مزہ اس بات کا کہ تم نے اس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا، اب ہم نے بھی تم کو نظر انداز کر دیا ہے، تو چکھو ہمیشگی کے عذاب کا مزہ اپنے کرتوتوں کی پاداش میں۔ ۱۴)

کفار کی درخواست کا جواب

گزشتہ آیتِ کریمہ میں کفار کی درخواست کا ذکر کیا گیا ہے کہ ہمیں دوبارہ دنیا میں جانے کا موقع دیا جائے تو ہم نیک اعمال کریں گے۔ پیشِ نظر دونوں آیات میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے دنیا میں انسان کو ایک امتحان کے لیے بھیجا۔ اور اس کے لیے ہم نے اسے حواس عطا کیے اور جوہرِ عقل سے نوازا۔ اور مزید حق شناسی کے لیے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں۔ اس طرح مکمل طور پر ان پر یہ بات واضح کر دی کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے ایک مکلف مخلوق کے طور پر پیدا کیا ہے۔ تمہاری زندگی کا مقصد عبدیت ہے، تمہیں اس زمین پر عبد بن کر اور اللہ تعالیٰ کو معبود مان کر اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنی ہے۔ تمہاری نفسانی خواہشات، تمہارے مفادات اور شیطانی قوتیں تمہیں اس راہ سے ہٹا کر اپنے راستوں پر چلانے کی کوشش کریں گی، دیکھنا تم ان کی پیروی نہ کرنا۔ اگر تم نے ہماری دی ہوئی ہدایات کے مطابق زندگی گزاری تو دنیا بھی تمہاری ہے اور آخرت بھی تمہاری ہے۔ اور اگر تم نفسانی خواہشات اور شیطانی وساوس کی پیروی میں لگے رہے تو پھر دنیا میں بھی عذاب آ سکتا ہے اور آخرت میں بھی یقینی طور پر جہنم میں جلائے جاؤ گے۔ اس طرح سے انسان کو اس کی طبعی عمر کی شکل میں ایک مہلتِ عمل دی گئی اور اپنی نعمتوں سے گراں بار کر دیا گیا۔ اور اسی کے مطابق قیامت کے دن اس کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو اس امتحان کی بجائے یہ بات منظور ہوتی کہ جو لوگ قیامت کے دن اس جرم میں پکڑے جائیں کہ انہوں نے دنیا کی مہلتِ عمل سے فائدہ اٹھا کر امتحان کی تیاری کی بجائے عیش و عشرت میں زندگی گزاری اور پھر وہ لوگ دوبارہ دنیا میں جانے کی اجازت مانگیں اس وعدے پر کہ اب ہم تیری فرماں برداری میں نیک اعمال کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے مطالبے پر انہیں واپس دنیا میں بھیج دے جبکہ جن حقائق پر غیب میں رہ کر ایمان لانے کا حکم دیا گیا تھا اور بن دیکھے پروردگار کے احکام کی اطاعت ان پر لازم کی گئی تھی تو قیامت کے دن جبکہ سب حقائق ان کے سامنے کھل جائیں گے تو اب دوبارہ دنیا میں بھیجنے سے تو وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لیے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ہی ہر صورت میں ہدایت دینا تھی تو پھر دنیا ہی میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ ہر شخص کو ہدایت دے کے بھیجتا یا براہِ راست

Marfat.com

اس کے دل میں ان تعلیمات کا القاء کر دیتا جن پر چلنا اس کے لیے ضروری تھا۔ تو دنیوی زندگی کو امتحان بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح سے ان کی درخواست کو رد کرنے کے بعد فرمایا کہ عدل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں جو مہلتِ عمل دی گئی تھی وہ تم نے ضائع کر دی۔ آج کا دن دار العمل نہیں دار الجزاء ہے۔ اب تمہارے لیے سزا یہ تجویز کی گئی ہے کہ جاؤ جہنم میں اپنے اعمال کی پاداش میں اور آج کے دن کے انکار کے جرم میں عذاب کا مزہ چکھو۔ اب تمہیں ہمیشہ اس جہنم میں رہنا ہے اور ہمیشہ کے لیے اس کے عذاب کو چکھنا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کی رحمت کبھی پلٹ کر تمہاری طرف متوجہ نہیں ہوگی۔ جس طرح تم نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور اس کے رسول کی دعوت کو نظر انداز کیا آج ہم نے بھی تمہیں نظر انداز کر دیا ہے، اب تم کسی نرمی کے مستحق نہیں ہو۔

وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ...... یہ اس فیصلہ کی طرف اشارہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے چیلنج کے جواب میں آگاہ فرما دیا تھا۔ سورۃ صٓ میں اس کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۞ قَالَ فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۚ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۞ (ص: ۸۲-۸۵) ''ابلیس نے کہا: تیرے عزت و جلال کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ بس ان میں سے تیرے خاص بندے ہی بچ رہیں گے۔ اللہ نے فرمایا کہ پھر یہ بات بھی حق ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں کہ میں بھی تجھ سے اور تیری ذریت سے اور ان انسانوں میں سے جو تیری پیروی کریں گے، سب سے جہنم کو بھر کے رہوں گا۔''

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۩ ۞ ۱۵ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۞ ۱۶ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ ۱۷

(ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں جب یہ آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ۱۵) ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۱۶) تو کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان لوگوں کے واسطے ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک پوشیدہ ہے۔ ۱۷)

قرآن پر ایمان لانے والوں کی صفات

اس سے پہلے کی آیات میں ان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں جو قرآنِ حکیم اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے گریز کر رہے تھے۔ اب پیشِ نظر آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ایمان لاتے ہیں یا آئندہ ایمان لائیں گے وہ کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے لیے کیا اجر و ثواب ہے۔ ان کی پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیات پڑھ کر نصیحت کی جاتی ہے یا یاد دہانی کرائی جاتی ہے تو وہ بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں بیان کردہ کسی بات پر جھگڑیں اور بحث

Marfat.com

کریں وہ فوراً سجدوں میں گر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے غلط خیالات سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کے ارشادات پر کان دھرتے اور ہر ہدایت پر سر جھکا دیتے ہیں۔ انہیں چونکہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے یہ اس کا کلام اور اس کے فرامین کا مجموعہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت چونکہ ان کے دلوں میں اتر چکی ہے اور خشیت اور انابت سے وہ اپنے دلوں کو آباد کر چکے ہیں تو جیسے ہی انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ فوراً سر سجدے میں رکھ دیتے ہیں یعنی سرتاپا تسلیم بن جاتے ہیں۔ اور چونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت بہت حد تک حاصل ہو چکی ہے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں یعنی جو صفات اس کے لائق نہیں ان سے اس کی تنزیہہ کرتے ہیں۔ اور جو صفات اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرتے ہیں۔ حمد اور تسبیح سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ دولت ان کو اس وجہ سے نصیب ہوتی ہے کہ ان میں استکبار نہیں۔ یعنی وہ حق کے مقابلے میں نہ اپنی خواہشات کو حائل ہونے دیتے ہیں اور نہ کسی ازم سے وابستگی ان کے لیے روکاٹ بنتی ہے۔ اور نہ آباؤ اجداد کی تقلید اور نہ معاشرے کا چلن ان کے پاؤں کی زنجیر بنتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی کبریائی پر قربان کر دیتے ہیں۔ وہ حق کو ہر حال میں ہر سطح پر ہر چیز سے بالا سمجھتے ہیں۔

مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری اور آخرت کی باز پرس کا خوف چونکہ ان پر غالب رہتا ہے اس لیے وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر گرم بستروں سے نکل کر اپنے رب کے حضور کھڑے ہو جاتے، اس کو پکارتے اور اس کی رضا کے طالب ہوتے ہیں۔ وہ اسی سے امید رکھتے ہیں اور اسی کے خوف سے دل کو معمور رکھتے ہیں۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو دے رکھا ہے وہ ہر حال میں اس کو خرچ کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ مالِ حرام کو اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی اپنا رزق قرار نہیں دیا۔ تو اس لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزقِ حلال میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ وہ حرام مال کے قریب بھی نہیں جاتے، مفت بھی مل جائے تو اس کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا حلال رزق ہوتا ہے اس لیے وہ یقیناً اسی میں سے خرچ کرتے ہیں چاہے اس کے شدید ضرورت مند کیوں نہ ہوں۔ وہ جانتے ہیں کہ حرام مال کو اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا بلکہ اس کی بارگاہ میں حرام مال پیش کرنا اس کی تقدیس کے خلاف ہے۔

یہ جو فرمایا گیا کہ ان کے پہلو ان کے بستروں سے الگ رہتے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بالکل سوتے نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ آرام کی فطری خواہش کے پیشِ نظر اور نیند کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سوتے بھی ہیں لیکن دھیان اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف لگا رہتا ہے۔ وہ بستروں پر اٹھنے کے لیے لیٹتے ہیں اور جب بارگاہِ حق میں کھڑے ہوتے ہیں تو نیند یا آرام کا جذبہ ان پر غالب نہیں آنے پاتا۔ علماء نے اس سے مراد قیامُ اللیل بھی لیا ہے اور نمازِ تہجد بھی۔ اور اگر کوئی شخص عشاء کی نماز باجماعت پڑھ کر سو جائے اور پھر کسی وجہ سے اٹھ نہ سکے اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی انہیں لوگوں میں شمار فرماتا ہے جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

تیسری آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان خوش نصیب بندوں کی شب بیداری اور انفاق کا صلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے لیے ایسی نعمتیں مقدر کر رکھی ہیں جو ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوں گی۔ اور وہ ایسی بے مثال اور انمول نعمتیں ہیں کہ دنیا میں کوئی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ متعدد کتبِ حدیث میں نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَالَا عَیْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ فراہم کر رکھا ہے جسے نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کبھی کسی کان نے سنا، اور نہ کوئی انسان اس کا تصور کر سکا۔''

Marfat.com

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ان خوش نصیب بندوں کو جو کچھ ملے گا وہ ان کے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہوگا۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس سے ان خوش نصیب بندوں کی قسمت کی بلندی بشری پیمانوں کو شکست دے رہی ہے۔ بلاشبہ ان کو جو کچھ ملے گا وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوگا کیونکہ انسانوں کے اعمال اس قابل کہاں کہ بارگاہِ حق میں بار پاسکیں۔ لیکن اس کے باوجود جب اللہ تعالیٰ انہیں ان نعمتوں کا حقدار ان کے اعمال کی وجہ سے قرار دے رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان کے اعمال کو نہ صرف قبول کیا بلکہ بارآور بھی فرمایا ہے۔ اس سے ان کی خوشیوں میں ایسا اضافہ ہوگا وہ شاید کسی اور چیز سے ممکن نہ ہو۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾

(بھلا وہ شخص جو مومن ہے اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو فاسق ہے، دونوں یکساں نہیں ہوسکتے۔ ۱۸)

مومن اور فاسق کا مفہوم اور ان میں عدم مساوات

مومن سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے اوصاف اوپر کی آیات میں بیان کیے گئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور معبودِ واحد مان کر اس قانون کی اطاعت کو زندگی کا رویہ بنا لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کرتے اور ہر وقت اس کے احکام کے سامنے گردن جھکائے رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں رزق دیتا ہے تو وہ استطاعت کے مطابق اس کے راستے میں خرچ بھی کرتے ہیں۔ اور اس کی اطاعت اور عبادت میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ اور فاسق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام سے باغی، اس کی حدود کو پامال کرنے والے اور اپنے نفس یا غیر اللہ کے پیروکار ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے افکار، طرزِ حیات اور اعمال میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ جس طرح ان کا طرزِ فکر اور طرزِ حیات یکساں نہیں اور دونوں الگ الگ راستوں کے مسافر ہیں، اسی طرح آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ الگ الگ معاملہ فرمائے گا۔ اور گزشتہ آیات میں تفصیل سے مومن اور فاسق دونوں کے الگ الگ انجام کو بیان فرمایا گیا ہے۔ وہ اپنے وفادار بندوں کو نعمتوں سے نوازے گا اور اپنے باغیوں اور طاغیوں کو سخت ترین سزائیں دے گا۔ اور ایسا وہ اس لیے کرے گا کہ اس کا ہر کام مبنی بر حکمت ہے۔ وہ جس طرح سب کا خالق ہے اسی طرح سب کے لیے عادل اور رحیم وکریم بھی ہے۔ اگر اس کے نزدیک یہ دونوں طرح کے لوگ یکساں ہوتے تو یہ اس کی صفتِ حکمت اور صفتِ عدالت کی صریحاً خلاف ورزی ہوتی۔ چنانچہ اسی حکمت کا تقاضا ہے کہ قیامت کا دن آئے، اس کے وفادار بندے وفاداریوں کا صلہ پائیں اور اس کے نافرمان، نافرمانیوں کی سزا بھگتیں۔

اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًا ۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

(جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے باغ ہیں رہنے کے، مہمانی ان کاموں کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔ ۱۹)

نُزُلٌ ...... اس ضیافت اور مہمانی کو کہتے ہیں جو مہمان کو سب سے پہلے ہلکی پھلکی پیش کی جاتی ہے جبکہ اصل کھانا اور دیگر لوازمات ابھی پیش کرنا باقی ہوتے ہیں۔

Marfat.com

صاحبِ ایمان وعمل کی جزاء

اس سے پہلے ارشاد فرمایا کہ مومن اور فاسق برابر نہیں ہیں۔ دنیا میں بعض دفعہ دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اور آرام وراحت اور دولت وثروت کے لحاظ سے بعض دفعہ فاسق مومن سے بہتر حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن طرزِ حیات، طرزِ فکر اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں سے تعلق رکھنے کے حوالے سے دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ اسی طرح آخرت میں اجر وثواب اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دونوں کی حیثیت کو واضح طور پر کھول کر رکھ دے گا۔ یہاں اسی کا بیان ہو رہا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور ہزار مشکلات کے باوجود وہ ایمان پر ثابت قدم رہے اور پھر نفس کی تمام اکساہٹوں اور حالات کی ناہمواریوں اور معاشرے کی بداطواریوں کے باوجود انہوں نے ہمیشہ حُسنِ عمل کا سرمایہ جمع کیا اور احکامِ شریعت کی پیروی میں زندگی گزاری۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنتوں میں ٹھکانا عطا فرمائے گا۔ ان کی قیام گاہیں وہ عظیم باغات ہوں گے جنہیں جنات کے نام سے یاد کیا گیا ہے لیکن وہ اپنی صفات کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔ اولین مہمانی کے طور پر انہیں ان جنتوں میں اتارا جائے گا جو ان کی قیام گاہیں بھی ہوں گی۔ چونکہ عام طور پر کسی عظیم مہمان کو جس گیسٹ ہاؤس میں اتارا جاتا ہے وہ اپنی زیب وزینت میں اصل قیام گاہ سے کہیں بڑھا ہوا ہوتا ہے اور وہاں چونکہ قیام مختصر ہوتا ہے اس لیے آؤ بھگت بھی خوب ہوتی ہے لیکن مستقل قیام گاہ کی شان وشوکت اور اس میں آؤ بھگت یقیناً ویسی نہیں ہوسکتی اس لیے کہ یہاں کا قیام تو ہمیشہ کے لیے ہے۔ لیکن یہاں اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا کہ آؤ بھگت تو ایسی ہوگی جیسی پہلی مہمانی میں ہوتی ہے، لیکن یہ عارضی قیام گاہیں نہیں ہوں گی بلکہ یہ ان کی مستقل قیام گاہیں ہوں گی۔ اور یہاں کے ناز ونعم اور استقبالیہ ٹھاٹھ باٹھ میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اور یہ سب کچھ انہیں یقیناً اللہ تعالیٰ کے فضل سے میسر آئے گا لیکن ان کے اعزاز کے لیے اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے منسوب کرے گا اور ان کی خوشی میں اضافے کے لیے فرمائے گا کہ یہ سب کچھ تمہارے حُسنِ عمل کا نتیجہ ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ ۭ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝

(اور رہے وہ جنہوں نے نافرمانی کی، تو ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ اب اس دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ۲۰)

نافرمانوں کی سزا

اہلِ ایمان کی جزا بیان کرنے کے بعد ان بدنصیبوں کی سزا بیان کی جارہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نافرمان تھے اور جنہیں فُساق وفُجار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس طرح اہلِ ایمان کی جزا جنت ہے، اسی طرح ان کی سزا جہنم ہے۔ وہ سیدھے اس میں دھکیل دیے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جہنم کا شدید ترین عذاب کون برداشت کرسکتا ہے۔ اس لیے وہ اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں گے۔ لیکن انہیں دوبارہ اسی عذاب میں دھکیل دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکلنے کی کوشش مت کرو اس لیے کہ یہاں سے نکل جانا کسی طرح ممکن نہیں۔

Marfat.com

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾

(اور ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے قریب کا عذاب بھی ضرور چکھائیں گے تاکہ یہ باز آجائیں۔ ۲۱)

عذابِ ادنیٰ اور عذابِ اکبر کا مفہوم

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور کسی طرح بھی اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ہماری طرف مبعوث کیے جانے والے واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور ہمیں ان پر ایمان لانا چاہیے۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے چھوٹی موٹی تکلیفیں پہنچاتا ہے۔ کبھی ان پر کوئی وبا بھیج دیتا ہے، کبھی زلزلہ آتا ہے، کبھی بارشیں روک دی جاتی ہیں اور کبھی سیلاب سے انہیں تباہ کیا جاتا ہے، کبھی فصلیں اجڑ جاتی ہیں اور قحط سالی کا سماں ہو جاتا ہے، کبھی تجارت خسارے میں چلی جاتی ہے۔ یہ مختلف حوادث ہیں جن سے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی قوموں کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تاکہ انہیں اس بات کا یقین پیدا ہو کہ وہ جس طرح زندگی گزار رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ من مرضی کے مالک ہیں کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں، یہ غلط ہے۔ یہ حوادث انہیں یہ بتانے کے لیے آتے ہیں کہ انہیں آزمائش کے طور پر فی الجملہ ایک آزادی دی گئی ہے، لیکن وہ مکمل طور پر خود مختار نہیں ہیں۔ انہیں اس بات کی آزادی تو ہے کہ وہ اپنے لیے جو چاہیں راستہ اختیار کریں لیکن اس بات کے وہ پابند ہیں کہ صحیح راستہ اختیار کرنے پر جزا کے مستحق ہوں گے اور غلط راستہ اختیار کرنے پر سزا ملے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کے نبی کی بعثت کے بعد اب ان کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی پر ایمان لائیں اور اس کی رہنمائی کو قبول کریں۔ یہ چھوٹے موٹے حوادث انہیں بار بار توجہ دلاتے ہیں کہ تمہارے اوپر بھی کوئی ذات ہے جو تمہیں کنٹرول کر رہی ہے اور یہ حوادث اس کی جانب سے تمہیں تنبیہ کرنے کے لیے آتے ہیں کہ اپنی حالت پر غور کرو اور کائنات کے مالک کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی فرماں روائی کو قبول کرو۔ اصل طاقت اسی حاکمِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی طرف سے جب کوئی آفت تمہارے اوپر آئے تو تمہاری کوئی تدبیر اسے دفع کر سکتی ہے اور نہ کسی غیر اللہ کا سہارا تمہارے کام آ سکتا ہے۔ یہ تنبیہات عذابِ ادنیٰ ہیں۔ یعنی اس دنیا میں بھیجی جانے والی سزائیں یا تکلیفیں جو درحقیقت حق کی طرف راغب کرنے اور رہنمائی کے لیے ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں عذابِ اکبر وہ عذاب ہے جو کفر و فسق کی پاداش میں آخرت میں ہوگا۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ یہاں عذابِ ادنیٰ سے مراد اس آیت میں وہ سزائیں ہیں جو آنحضرت ﷺ کی نبوت کے انکار کے نتیجے میں قریش کو دی گئیں۔ ان میں یقیناً وہ قحط بھی شامل ہے جو آنحضرت ﷺ کی دعا کے نتیجے میں اہلِ مکہ پر مسلط کیا گیا۔ اور اسی سلسلے کا عذاب غزوۂ بدر کی وہ شکست ہے جس نے قریش کی کمر توڑ دی اور اس کی سطوت و وجاہت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس میں بڑے بڑے سردار مارے گئے، ان کی قیادت کی پہلی صف تباہی کی نذر ہو گئی اور اس کی آخری شکل فتح مکہ تھی۔ قریش کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کے اندر قبولیتِ اسلام کا سلسلہ رکا نہیں۔ اور پھر فتح مکہ کے بعد ان کی اکثریت آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آئی۔ اس لیے ان پر اس قسم کا فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جیسے پہلی معذب قوموں پر آتے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آیتِ کریمہ میں عذابِ ادنیٰ سے مراد وہ عذاب ہے جو کسی قوم پر نبی کی تکذیب کے نتیجے میں آتا ہے۔ اور عذابِ اکبر سے مراد وہ عذاب ہے جو آخرت میں آئے گا۔ اور قریش نے چونکہ اسلام قبول کر لیا اس لیے وہ عذابِ ادنیٰ کی مکمل شکل سے محفوظ رہے۔

Marfat.com

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ...... اس میں عذابِ ادنیٰ کی غرض وغایت بیان کی گئی، کہ عذابِ ادنیٰ کی تکمیلی شکل سے پہلے اس کے بعض اجزاء مختلف تکالیف اور آزمائشوں کی شکل میں جھنجھوڑنے کے لیے آتے ہیں۔ اور جو قوم ان تنبیہات سے فائدہ اٹھاتی ہے جیسے قریش نے اٹھایا تو وہ دنیا میں عذاب سے بچ جاتی ہے۔ اور جو اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہیں وہ قومِ عاد وثمود کی طرح عذابِ ادنیٰ کا شکار دنیا میں ہوتے ہیں اور آخرت میں عذابِ اکبر کا شکار ہوں گے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۭ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ۝۲۲

(اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جائے پھر وہ اس سے اعراض کرے، ہم ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے۔ ۲۲)

باغی کی سزا کا سبب

گزشتہ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے باغی ہیں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ذرا غور کرو کہ ہم نے انسانوں کو زمین پر آباد کیا تو انہیں شعور اور عقل سے بہرہ ور فرمایا، انہیں حواس بھی عطا فرمائے، غور وفکر کی قوتوں سے نوازا، پھر اسی پر بس نہیں کی ان کی طرف اپنے نبی بھیجے اور کتابیں اتاریں اور ساتھ ساتھ ان کے حواس اور ان کی عقل کی رہنمائی کے لیے ایسے نشانیاں روشن کیں جن سے وہ بہت آسانی سے حقیقت تک پہنچ سکتے تھے۔ ان نشانیوں میں آفاق کی نشانیاں بھی ہیں اور وہ نشانیاں بھی ہیں جن کا تعلق انسان کی فطرت اور اس کے وجدان سے ہے۔ ایسی نشانیاں بھی ہیں جو انسان کی اندرونی زندگی سے عبارت ہیں، ایسی بھی ہیں جو انسان کے اخلاقی تصورات میں پائی جاتی ہیں۔ انسانی تاریخ کے مسلسل تجربات بھی کتنی نشانیاں ہمارے سپرد کرتے ہیں۔ کتنی نشانیاں ہیں جو آفاتِ ارضی وسماوی کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان تمام ذرائع سے مقصود صرف یہ ہے کہ انسان کو یہ بتایا جائے کہ تیرا کوئی خالق اور مالک بھی ہے، تجھ پر بہت سے خداؤں کی نہیں صرف ایک خدا کی حکومت ہے، اسی کی عبادت واطاعت تیرے لیے صحیح راستہ ہے، تجھے بے شمار خوبیاں دے کر اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ تو خودرو پودے کی طرح مَل دَل کے ختم ہو جائے بلکہ تیری زندگی کا ایک مقصد ہے اس مقصد کے مطابق زندگی گزارنا تجھ پر لازم کیا گیا ہے۔ تو خود مختار نہیں کہ جیسے چاہے زندگی گزارے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تیری رہنمائی کے لیے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے جو ہدایت بھیجی ہے اس کی پیروی تجھ پر لازم ہے۔ لیکن جو شخص ان باتوں کو قبول کرنے کی بجائے صرف خواہشِ نفس کی بات سنتا ہے وہ آنکھیں رکھتا ہے لیکن آنکھوں سے کام نہیں لیتا، وہ کان رکھتا ہے لیکن کام کی باتیں نہیں سنتا، اسے دل کی نعمت میسر ہے لیکن سوچنے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ ہر نصیحت کرنے والے کی نصیحت سے اعراض کرتا ہے اور ہر صحیح بات سے منہ پھیر لیتا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ اپنے دل ودماغ سے باطل کی ہمنوائی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو بتایئے اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا۔ کیا وہ اس قابل نہیں کہ جب وہ اپنی دنیا کی زندگی ختم کرنے اور اپنے امتحان کی مدت سے گزر جانے کے بعد اپنے اللہ کے سامنے حاضر ہو تو اسے اس بغاوت کی سزا دی جائے۔ اور جن نعمتوں کی اس نے ناقدری کی اس کا اس سے حساب مانگا جائے۔

Marfat.com

وَلَقَدْ

اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ

هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿٢٣﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

لَمَّا صَبَرُوْا ۛ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿٢٤﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٢٥﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ

اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿٢٦﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى

الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۭ

اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٢٧﴾ الثلثة وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٨﴾

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٢٩﴾

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿٣٠﴾ ع

رکوع: ۳۔ (ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی تو آپ اس کے ملنے سے شک میں نہ پڑیں، ہم نے اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا۔ ۲۳) تو ہم نے ان میں ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے، جب انہوں نے ثابت قدمی دکھائی اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ ۲۴) بے شک تیرا رب ہی قیامت کے روز ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں یہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ ۲۵) (کیا انہیں ہدایت نہ دی (اس بات) نے کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا جن کے رہنے کی جگہوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں، بے شک ان کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں، تو کیا یہ لوگ سنتے نہیں۔ ۲۶) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو ایک چٹیل زمین کی طرف ہانک کے لے جاتے ہیں، پھر اسی زمین سے وہ کھیتی اگاتے ہیں جس میں سے ان کے چوپائے

Marfat.com

بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی، تو کیا وہ دیکھتے نہیں۔ ۲۷) یہ لوگ کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۲۸) کہہ دیجیے! کہ فیصلہ کے دن ان لوگوں کو ایمان نفع نہیں دے گا جنہوں نے کفر کیا ہوگا اور نہ ان کو اس کے بعد مہلت دی جائے گی۔ ۲۹) تو آپ ان سے اعراض کیجیے اور انتظار کیجیے، بے شک وہ بھی منتظر ہیں۔ ۳۰)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۳﴾

(ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی تو آپ اس کے ملنے سے شک میں نہ پڑیں، ہم نے اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا۔ ۲۳)

ایک اعتراض کا جواب

یہ خاتمہ سورۃ کی آیات ہیں، ان آیات میں اسی مضمون کو سمیٹا جا رہا ہے جس سے سورۃ کا آغاز ہوا تھا۔ اس سے مقصود شاید یہ ہے کہ قرآنِ پاک کی حقیقی عظمت و اہمیت اور وجاہت و افادیت کو دل و دماغ میں اتار دیا جائے۔ اس آیتِ کریمہ میں خطاب بظاہر نبی کریم ﷺ سے ہے لیکن حقیقت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو آنحضرت ﷺ کی رسالت میں اور آپ کے اوپر کتابِ الٰہی کے نازل ہونے میں شک کر رہے تھے۔ لیکن ان سے براہِ راست خطاب اس لیے نہیں فرمایا گیا کیونکہ انہوں نے اپنے مسلسل اعراض و انکار سے اپنے آپ کو خطاب کے قابل نہیں چھوڑا۔ ان سے منہ پھیر کر آنحضرت ﷺ سے خطاب فرما کر اصل میں یہ بات ان کو سنائی جا رہی ہے۔ اور ان کے ایک اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ وہ بار بار اس اعتراض کو دہراتے تھے کہ ایک انسان چاہے وہ کردار و افکار میں کتنا بھی اجلا کیوں نہ ہو اس قابل نہیں ہو جاتا کہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا کلام سنے یا اس پر اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہو۔ کہاں اللہ تعالیٰ کی عظیم ہستی اور کہاں انسان کی پستی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد (ﷺ) جو اپنے اوپر کتاب نازل ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں یہ سراسر افتراء ہے۔ چنانچہ اس سورۃ کی آیات ۲ اور ۳ میں بھی اس اتہام کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ لیکن اب اس کا ایک اور جواب دیا جا رہا ہے جو پہلے جواب سے زیادہ سہل اور واضح ہے۔ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں کے اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ ایک بندے پر اللہ تعالیٰ کا کلام کیسے نازل ہو سکتا ہے، یہ تو بعید از امکان ہے۔ اس طرح سے وہ آنحضرت ﷺ کے دعویٰ نبوت اور نزولِ کتاب کو غیر معتبر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم نزولِ کتاب کو بعید از عقل سمجھتے ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں نزولِ کتاب کا واقعہ پہلی دفعہ پیش آیا ہے جبکہ اس سے پہلے متعدد رسولوں پر کتابیں نازل ہو چکی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم زیادہ رسولوں اور کتابوں سے واقف نہیں ہو۔ لیکن جزیرہ عرب میں تمہارے قرب و جوار میں بسنے والی قومِ یہود سے تم نے کئی دفعہ سنا ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک کتاب نازل ہوئی تھی جس کا نام تورات تھا اور وہ آج بھی ان کے علماء کے پاس موجود ہے۔ ان کے مدارس میں وہ کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ ان کی عدالتوں میں اس کے احکام کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ ترمیم اور تحریف کا شکار ہو چکی ہے لیکن تم اس کتاب سے اور جس پیغمبر پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے اس سے خوب واقف ہو۔ اس لیے قرآنِ کریم کے نزول کو تمہیں خلافِ عقل قرار دیتے ہوئے سوچنا چاہیے کہ تم ایک ایسی چیز کا انکار کر رہے ہو جس کا وقوع اس سے پہلے کئی دفعہ تاریخ میں ہو چکا ہے اور تم اسے تسلیم بھی کرتے ہو۔ اس لیے انکار کرنے والوں کو بجائے اسے شک کی نگاہ سے دیکھنے کے اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے۔

Marfat.com

مِنْ لِقَآئِهٖ میں ضمیر کے مرجع کی وضاحت

ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس حوالے سے کیا ہے کہ مِنْ لِقَآئِهٖ میں ضمیر کا مرجع کتاب ہے۔ یعنی جیسی کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی ویسی کتاب نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی ہے تو یہ کوئی غیر معمولی اور حیران کن بات نہیں۔ آپ اس میں کوئی شک نہ کریں۔ اس میں شک کرنے سے اگرچہ آنحضرت ﷺ کو روکا گیا ہے لیکن درحقیقت روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جنھیں قرآنِ کریم کے اللہ تعالیٰ کی کتاب ہونے میں شبہ تھا۔ البتہ بعض اہلِ علم نے جن میں حضرت ابن عباسؓ اور قتادہ جیسے اکابر شامل ہیں۔ ضمیر کا مرجع حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ آیت میں رسول اللہ ﷺ کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کی خبر دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک ملاقات شبِ معراج میں ہونا احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے اور قیامت میں ملاقات ہونا بھی بعض احادیث میں مذکور ہے۔ لیکن حضرت حسن بصریؒ نے اس کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک کتاب دی گئی اور لوگوں نے ان کی تکذیب کی اور ان کو ستایا، آپ بھی یقین رکھیں یہ سب چیزیں آپ کو بھی پیش آئیں گی۔ اس لیے آپ ان مصائب سے کبھی دل گرفتہ نہ ہوں۔ اس کو اس راہ کی ناگزیر سنت سمجھ کر قبول کریں۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک اس ضمیر کا مرجع الکتاب نہیں بلکہ وہ یومِ انتقام یا یومِ عذاب ہے جس کی گزشتہ آیات میں دھمکی دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کی تکذیب کرنے والوں کو ہم نے اس دنیا میں عذاب دیا اور آخرت میں بھی ان کو عذاب دیں گے، اسی طرح ہم نے جو تمہارے ذریعے سے کتاب اتاری ہے اس کی تکذیب کرنے والوں کو بھی ہم دنیا اور آخرت دونوں میں سزا دیں گے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع تو الکتاب ہی ہے البتہ کتاب کی تکذیب کا نتیجہ ہمیشہ یہ رہا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ تکذیب کرنے والوں کو ضرور سزا دیتا ہے۔ تو جب یہ بات اس کے نتیجے کے طور پر ثابت ہے تو خود اسی کو مرجع قرار دینا اور بعض شواہد سے اسے ثابت کرنے کی کوشش کرنا تکلف معلوم ہوتا ہے۔

کتاب ہدایت کے لیے ہے

آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہم نے اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا۔ یعنی موسیٰ پر جو کتاب ہم نے نازل کی تھی وہ محض تبرک کے طور پر یا ثواب کمانے کے لیے نہیں دی تھی بلکہ اسے ان کی زندگی کے لیے ہدایت بنایا تھا۔ یعنی وہ کتاب ان کے لیے کتابِ قانون بھی تھی اور کتابِ زندگی بھی۔ وہ ان کے لیے رہنما بھی تھی اور فلاح و کامرانی کی ضامن بھی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس کے کہ وہ لوگ صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ذلت و نکبت ان کی شناخت بن چکی تھی۔ اور وہ نہایت ناگفتہ بہ حالت میں زندگی گزار رہے تھے لیکن اس کتاب کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رہنمائی نے ان کی کایا پلٹ دی۔ وہ غلامی کی ذلت سے نکل کر اس کتاب کے فیض اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رہنمائی سے دنیا کی امامت کے منصب پر فائز ہو گئے۔ بظاہر یہ ان کے اعتراض کا جواب ہے لیکن حقیقت میں انھیں مستقبل کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے کہ تورات کی طرح قرآنِ کریم بھی کتابِ ہدایت بن کے آیا ہے اور نبی کریم ﷺ قیامت تک کی نوعِ انسانی کے لیے آئیڈیل بن کر تشریف لائے ہیں۔ ان دونوں کی رہنمائی میں یہ عرب کے گرے پڑے لوگ اٹھیں گے اور دنیا کی امامت پر فائز ہو جائیں گے۔ چنانچہ تاریخ نے یہ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ:

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

Marfat.com

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

(تو ہم نے ان میں ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے، جب انہوں نے ثابت قدمی دکھائی اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ ۲۴)

کتاب سے ہدایت لینے کا ثمرہ

جب بنی اسرائیل نے کتاب یعنی تورات کو ہدایت کے طور پر قبول کرلیا اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کی رہنمائی میں دے دی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو امامت وقیادت کے منصب پر فائز کردیا۔ ظاہر ہے کہ امامت وقیادت کا منصب اگرچہ پوری امت کا استحقاق ہوتا ہے لیکن ان میں عملی طور پر وہ لوگ اس منصب پر فائز ہوتے ہیں جن میں علمی اور عملی اوصاف دوسروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ امامت پر فائز لوگوں کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کی قیادت اپنے مفادات، اپنے تحفظات، اپنی ترجیحات، اپنی ہوائے نفس اور اپنی مرضی کے تابع نہیں ہے بلکہ وہ لوگوں کی رہنمائی اس طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ معاملہ سیاست کا ہو یا عدالت کا یا ایوان کو چلانے کا ان کی نکیل اور لگام کتاب اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ ایسی کسی بات کا تصور بھی نہیں کرتے جس میں اللہ تعالیٰ کے دین کی حیثیت تابع کی ہوجائے اور دوسری چیزیں متبوع بن کر رہ جائیں۔ ایسی امامت وقیادت کے راستے میں یقیناً ہمیشہ دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ شیطانی گروہ، نفسانی وساوس اور مختلف طبقات کے مفادات قدم قدم پر رکاوٹ بنتے ہیں۔ بعض نام نہاد اہلِ علم علمی تاویلوں کے زور سے منزل سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں، مختلف قسم کے دباؤ استعمال کیے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والے یہ رہنما اور امام ان تمام مشکلات اور موانع پر صبر واستقامت کی تصویر بن جاتے ہیں۔ اور یہ صبر ہمہ پہلو قسم کا ہوتا ہے۔ کسی معصیت کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے، یعنی صبر عن المعصیات کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت خود بھی کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کراتے ہیں۔ اور اگر اس راستے میں موانع پیش آتے ہیں تو وہ اطاعت پر صبر کرتے ہیں۔ جیسے حضرت صدیق اکبرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ سے زکوٰۃ لینے کے معاملے میں نہایت استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اسے صبر علی الطاعات کہتے ہیں۔ یہ دو کام کرنا یعنی معصیت سے بچنا اور اطاعت پر ثابت قدمی دکھانا ہر دور میں سب سے مشکل کام رہا ہے۔ اس راستے میں بے شمار مصائب سے واسطہ پڑتا ہے۔ انہیں بھی جب اس راستے میں مصائب سے واسطہ پڑتا ہے تو یہ لوگ ہر طرح کی مصیبتوں کو جھیلتے اور برداشت کرتے ہیں۔ اسے صبر علی المصائب کہا جاتا ہے۔ اور تیسری صفت ان کی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی اس کی کتاب کے احکام پر انتہا درجے کا یقین رکھتے ہیں۔ اور یہی صفت درحقیقت صبر واستقامت کی اساس اور بنیاد ہے۔ حالات کیسے بھی نامساعد کیوں نہ ہوں انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ اور اس بات پر بھی اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یقیناً اس راستے میں ہماری مدد فرمائے گا۔ بظاہر یہ آیتیں پڑھتے ہوئے اور تاریخ یہود کا مطالعہ کرتے ہوئے حیرانی ہونے لگتی ہے کہ کبھی اس قوم کے رہنما ان صفات کے حامل ہوتے تھے جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور بعد ان کے سیرت وکردار نے جو رنگ اختیار کیا اس کے لیے پہلے پارے کے دس رکوع پڑھ لینا ہی کافی ہے۔ لیکن آج جب ہم اپنی امت کو دیکھتے ہیں تو پھر حیرت کی کوئی بات نہیں رہتی۔ قومِ یہود نے اتنے بڑے بڑے لوگ پیدا نہیں کیے جتنے امتِ اسلامیہ نے کیے۔ اور ان کی تاریخ اتنی روشن نہیں جتنی مسلمانوں کی ہے۔ بایں ہمہ آج جب دنیا بھر میں پھیلے ہوئے عالمِ اسلام پر نظر پڑتی ہے تو آدمی دل مسوس کے رہ جاتا ہے کہ یا اللہ! یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے سینکڑوں سال تک دنیا کی امامت کی۔ ٹھیک کہا کسی نے:

Marfat.com

کبھی ان فاقہ مستوں نے رُخ ہستی سنوارا تھا
مگر آج ان کی اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی

اِنَّ رَبَّکَ ھُوَیَفْصِلُ بَیْنَـھُمْ یَوْمَ الْقِیٰـمَۃِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾

(بے شک تیرا رب ہی قیامت کے روز ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں یہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ ۲۵)

جب تک بنی اسرائیل کے علماء وامراء میں امامت وسیادت کے وہ اوصاف باقی رہے جس کا ذکر متذکرہ بالا آیتِ کریمہ میں کیا گیا ہے تو دنیا کی امامت وقیادت ان کے ہاتھ میں رہی۔لیکن جب یہ لوگ ان اوصاف سے تہی دامن ہو گئے تو پھر یہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ عقائد عبادات اور فقہی احکام تک دین کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہا جس میں انہوں نے اختلافات نہ پیدا کیے ہوں۔اب قرآنِ کریم کے آجانے کے بعد اور نبی کریم ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے بعد انہیں ایک موقع ملا تھا کہ وہ اپنے تعصبات سے بلند ہو کر آنحضرت ﷺ پر ایمان لاتے اور قرآن وسنت کی رہنمائی کو قبول کر لیتے۔لیکن انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اپنے آپ کو نسلی تفاخر کی نذر کر دیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلامتی کے راستے سے دور ہو جانے کی وجہ سے مزید اختلافات میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔اب دنیا میں تو ان اختلافات کے حل ہونے کی کوئی صورت نہیں۔اب تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان اختلافات کا فیصلہ فرمائے گا جن کی وجہ سے یہ ہدایت سے محروم ہو کر رہ گئے۔

اَوَلَمْ یَھْدِ لَـھُمْ کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰکِنِھِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ ؕ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾

(کیا انہیں ہدایت نہ دی (اس بات) نے کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا جن کی رہنے کی جگہوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں، بے شک ان کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں، تو کیا یہ لوگ سنتے نہیں۔ ۲۶)

پچھلی قوموں کی طرف اجمالی اشارہ

اس آیتِ کریمہ میں روئے سخن قریش کی طرف ہے۔انہیں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ ہم نے تمہارے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت کی تاریخ کے بعض اوراق الٹے ہیں اور اسی کی روشنی میں تم باقی قوموں کو بھی دیکھ سکتے ہو۔تم خوب جانتے ہو کہ جن جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی تکذیب کی اور ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور پھر انہیں ناکام کرنے کے لیے ان کی جان کے درپے ہو گئے تو آخر اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔فرعون اور اس کی بیشتر قوت بحرِ قلزم کی نذر ہو گئی۔عاد وثمود کی قومیں زمین کا رزق بن گئیں۔قومِ لوط پر پتھروں کی بارش کی گئی۔ایسی ہی کتنی قومیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنی طرف مبعوث ہونے والے رسولوں کو ماننے اور ان کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔اور پھر انہیں مٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔اور ان قوموں کی تاریخ کوئی ڈھکی چھپی بھی نہیں۔یہ قریش ان بستیوں میں سے گزرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی وجہ سے

Marfat.com

تباہ ہوئیں۔ تو کیا انہیں تاریخ کے ان حقائق سے یہ بات سمجھنے میں مدد نہیں ملتی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ رسول کو جھٹلانے والی قوم اس کے عذاب سے کبھی نہیں بچی۔ اور آج تم نے وہی طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔ تو کیا تم اس تاریخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے سبق سیکھنے کی کوشش نہیں کرو گے یا تم بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سامانِ عبرت بن جاؤ گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۭ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٢٧﴾

(کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو ایک چٹیل زمین کی طرف ہانک کے لے جاتے ہیں، پھر اسی زمین سے وہ کھیتی اگاتے ہیں جس میں سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی، تو کیا وہ دیکھتے نہیں۔ ۲۷)

الْاَرْضِ الْجُرُزِ...... چٹیل اور بنجر زمین کو کہتے ہیں۔

مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کی خبر بھی دی گئی ہے اور قریش کو تنبیہ بھی فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت قریش کی اذیت رسانیوں اور بے تحاشا مخالفتوں کے باعث آنحضرت ﷺ کی دعوت انتہائی مشکلات کا شکار محسوس ہو رہی تھی۔ اہلِ مکہ نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تبلیغ و دعوت کے سامنے کان بند کر لیے اور دل سخت کر لیے ہیں۔ اور منصوبہ بندیاں ہونے لگی ہیں کہ اس دعوت کے اسباب کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسے ہی حالات کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت ﷺ نے طائف کا سفر فرمایا کہ شاید وہاں اسلامی قوت کو کوئی دست و بازو میسر آئے اور اس دعوت کو آگے بڑھنے کا موقع ملے۔ لیکن وہاں جو کچھ ہوا تاریخ اس پر شاہد ہے۔ اس صورتحال کو دیکھ کر یقیناً مسلمان بھی انتہائی پریشانی محسوس کر رہے تھے اور قریش اس بے بسی کو دیکھ کر حد درجہ مسرور اور مطمئن تھے۔ چنانچہ اس پس منظر میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ بعض دفعہ ایک بنجر زمین جس میں دور دور تک کہیں ہریالی کا نشان تک نظر نہیں آتا اس میں ہر طرف اڑتی ہوئی دھول سے گمان سے ہوتا ہے کہ یہ زمین شاید کسی کھیتی کے بھی قابل نہیں۔ لیکن جب اس پر بارش برستی ہے یا دوسری جگہ سے بارش کا پانی وہاں پہنچ جاتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آنے لگتی ہے اور اس زمین کی قسمت ہی بدل جاتی ہے۔ آج اگرچہ مکے کی سرزمین اللہ تعالیٰ کی طرف سے برسنے والی ہدایت کی بارش سے محروم دکھائی دیتی ہے اور ان لوگوں کے دل بنجر زمین سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوتے ہیں لیکن کوئی تعجب نہیں کہ اس بارش کا یہ ریلا کسی ایسی سرزمین میں پہنچ جائے جہاں کی سرزمین لہلہاتی کشت زار میں تبدیل ہو جائے اور پھر وہاں سے مخلوقِ خدا کو وہ فائدہ پہنچے جس کا سان گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں شاید ہجرت کی طرف اشارہ ہے اور اس وقت مدینے کی سرزمین دارالہجرت بن جانے کے بعد جس طرح مرکزِ اسلام بننے والی تھی، شاید اس کی خبر دی گئی ہے۔ اور آخر میں فرمایا کہ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں؟ اور اس سے پہلے فرمایا تھا کہ کیا یہ لوگ سنتے نہیں؟ اس سے شاید ایک تو اس طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ سماعت سے بھی محروم ہو چکے ہیں اور بصارت سے بھی۔ بظاہر یہ زندہ لوگ ہیں لیکن حقیقت میں یہ بنجر زمینیں ہیں۔ لیکن اگر آج یہ حق کو قبول کر لیں تو جس طرح یہ ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ بارش سے بنجر زمین لہلہا اٹھتی ہے اسی طرح ان کی قسمتیں بھی بدل سکتی ہیں۔

Marfat.com

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾

(یہ لوگ کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۲۸)

جب مخالفین آنحضرت ﷺ کی دعوت کو روکنے کے لیے اپنی مخالفتوں اور مشکلات میں اضافہ کردیتے اور مسلمان حالات کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں تو وہ آنحضرت ﷺ سے دعا کی درخواست کرتے تو آپ انہیں تسلی دیتے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا، ان شاء اللہ اس کی مدد ضرور آئے گی اور ایک دن ضرور فتح اسلام کی ہوگی۔ تو یہی باتیں جب مسلمان کفار سے کہتے تو وہ مذاق اڑاتے ہوئے بار بار مطالبہ کرتے کہ آخر وہ فتح کب آئے گی؟ یعنی اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ غلبہ آخر اسلام کو نصیب ہوگا تو آخر وہ وقت کب آئے گا۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾

(کہہ دیجیے! کہ فیصلہ کے دن ان لوگوں کو ایمان نفع نہیں دے گا جنہوں نے کفر کیا ہوگا اور نہ ان کو اس کے بعد مہلت دی جائے گی۔ ۲۹)

آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ یہ لوگ بار بار فتح اور فیصلے کا مطالبہ کرتے ہیں تو انہیں شاید معلوم نہیں کہ فیصلہ حق کے غلبے اور کفر و شرک کی مکمل ناکامی کی صورت میں ہوتا ہے اور کفر اپنی زندگی میں کبھی ناکامی قبول نہیں کرتا۔ اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے اور ایسے لوگ اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ فیصلے کے دن کا اس طرح مطالبہ کرتے ہیں کہ گویا یہ ان کے غلبے کا دن ہے۔ حالانکہ یہ ان کے غلبے کا نہیں بلکہ مغلوبیت کا دن ہوگا۔ یہ اسے دیکھ کر تمنا کریں گے کہ اب انہیں مہلت دی جائے تاکہ وہ ایمان لے آئیں۔ لیکن نہ انہیں مہلت ملے گی اور نہ ان کا ایمان قبول کیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے آجانے کے بعد ایمان قبول نہیں کیا جاتا۔ فرعون نے ڈوبتے ہوئے اپنے ایمان کا اعلان کیا، لیکن اس کا ایمان قبول کرنے کی بجائے اسے بحرِ قلزم میں ڈبو دیا گیا اور اس سے یہ کہا گیا کہ اب تمہیں ایمان یاد آیا اس سے پہلے تم انتہائی نافرمان اور پرلے درجے کے مفسد رہے ہو۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

(تو آپ ان سے اعراض کیجیے اور انتظار کیجیے، بے شک وہ بھی منتظر ہیں۔ ۳۰)

آنحضرت ﷺ کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہ لوگ اگر اپنی نادانی کے باعث عذاب کو ایک مذاق سمجھ رہے ہیں اور بار بار اس کا مطالبہ کررہے ہیں تو ایسے نادانوں سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ وہ ان کے لیے جو مہلت مقدر کرچکا ہے اگر انہوں نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو یقیناً عذاب کا شکار ہوں گے۔ آپ بھی انتظار کیجیے کہ کب ان کی مہلت ختم ہوتی ہے۔ اور وہ تو یقیناً منتظر ہیں۔ انہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ اس انتظار کا نتیجہ آخر کیا نکلتا ہے۔

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ

(۳۳)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الاحزاب ہے۔ یہ نام اس سورۃ کی آیت ۲۰ کے فقرہ یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا سے لیا گیا ہے۔

مقامِ نزول:۔ یہ سورۃ مدنی ہے۔ کیونکہ یہ مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ اور اس کا زمانۂ نزول پانچ ہجری ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس سورۃ میں تین اہم واقعات پر بحث کی گئی ہے۔ (۱) غزوۂ احزاب، جو شوال پانچ ہجری میں پیش آیا۔ (۲) غزوۂ بنی قریظہ، جو ذیقعد پانچ ہجری میں ہوا۔ (۳) حضرت زینبؓ سے نبی کریم ﷺ کا نکاح۔ یہ بھی ذیقعد پانچ ہجری میں ہوا۔ ان واقعات کے زمانہ کو دیکھ کر حتمی انداز میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ سورۃ ذیقعد پانچ ہجری یا اس کے بعد کے قریبی زمانے میں نازل ہوئی ہے۔

تاریخی پس منظر:۔ متذکرہ بالا تین اہم واقعات اور ان سے متعلق احکام، چونکہ اس سورۃ کا اصل موضوع ہیں اور یہ واقعات اچانک پیش نہیں آئے بلکہ یہ ان تاریخی واقعات کا تسلسل ہیں جس نے مسلمانوں اور کفار کو ان تین واقعات تک پہنچایا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان واقعات کے اسباب کو جاننے کے لیے ان کا پس منظر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگِ احد میں آنحضرت ﷺ کے مقرر کردہ تیراندازوں کی غلطی سے جس طرح جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہوئی اور مسلمانوں کا جس قدر جانی نقصان ہوا عہدِ نبوت میں غزوات کی پوری تاریخ میں ایسا کہیں نہیں ہوا۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ جنگِ بدر کی فتح اور بنو قینقاع کے خروج کی وجہ سے جزیرۂ عرب میں مسلمانوں کی جو دھاک قائم ہوئی تھی اور اسلام کو جو عزت و وقعت ملی تھی اس کو بے حد نقصان پہنچا۔ مشرکینِ عرب، یہود اور منافقین یہ سمجھنے لگے کہ جنگِ بدر کی فتح ایک حادثاتی واقعہ تھا یا قریش کی غلطیوں کا نتیجہ تھا۔ حقیقت میں مسلمانوں کی قوت ویسی نہیں جیسی اس کی شہرت ہوگئی ہے، جنگِ احد نے ان کا بھرم کھول دیا ہے۔ جس سے مسلمان بھی شکست خوردگی کے احساس میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اس لیے یہ ٹھیک وقت ہے کہ ان پر ضرب لگائی جائے۔ چنانچہ دو مہینے نہ گزرے تھے کہ کفار کی جانب سے پے در پے پریشان کن خبریں آنے لگیں۔ قبیلہ بنو اسد نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کردیں، تو نبی کریم ﷺ کو حضرت ابوسلمہ کی زیرِ قیادت ایک لشکر بھیج کر اس کی سرکوبی کرنی پڑی۔ پھر صفر چار ہجری میں قبائل عضل اور قارہ نے آنحضرت ﷺ سے چند معلم اور مربی مانگے جو انہیں دینِ اسلام کی تعلیم دیں۔ آپؐ نے چھ اصحاب کو ان کے ساتھ کردیا، مگر انہوں نے رجیع پہنچ کر ان میں سے چار کو قتل کردیا اور دو کو مکہ معظمہ لے جاکر بیچ دیا۔ اسی ماہِ صفر میں بنی عامر کے ایک سردار کی درخواست پر آنحضرت ﷺ نے ایک تبلیغی وفد جو چالیس یا بعض روایات کے مطابق ستر انصاری نوجوانوں پر مشتمل تھا نجد کی طرف روانہ کیا۔ مگر ان کے ساتھ بھی غداری کی گئی اور بعض دیگر قبائل کو ساتھ لے کر حملہ کیا اور ان سب کو قتل کردیا۔ بنی نضیر کا قبیلہ جو ابھی تک مدینہ منورہ میں تھا، اب اس نے بھی پَر پرزے نکالے۔ مسلسل بدعہدیوں کا ارتکاب کیا۔ حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ آپؐ کو اس سازش کی اطلاع ہوگئی تو آپؐ نے اس بدعہدی اور سازش پر ان کو مدینے سے نکلنے پر مجبور کردیا۔ اسی طرح

Marfat.com

جمادی الاولیٰ میں بنی غطفان کے دو قبیلوں نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں۔ آنحضرت ﷺ خود ان کے مقابلے کے لیے نکلے۔ اس طرح سے جنگِ احد کی شکست سے جو ہوا اکھڑی تھی وہ کئی مہینوں تک اپنا اثر دکھاتی رہی۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی بیدار مغزی اور اولوالعزمی نے ہر موقع پر بروقت کارروائی کر کے ان تمام فتنوں کا سدِ باب فرمایا۔ اور اہلِ عرب کو یقین ہو گیا کہ ایک ایک قبیلے کا الگ الگ مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر انہیں نقصان پہنچانا ممکن نہیں۔ کیونکہ ان کی قیادت نہایت بیدار مغز اور ان کے پیروکار انتہائی وفادار اور جانثار ہیں۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ جزیرۂ عرب کے رہنے والے اپنی دشمنیاں بھول کر اجتماعی شکل میں اس نئی اٹھنے والی قوت سے ٹکرا جائیں اور انہیں تباہ و برباد کر دیں۔ چنانچہ بنی نضیر نے بیس سرداروں پر مشتمل ایک وفد تیار کیا کہ وہ تمام قبائل میں جا کر ان کو اس کے لیے ہموار کریں۔ سب سے پہلے یہ لوگ قریش کے پاس گئے اور انہیں مسلمانوں کے خلاف آمادۂ جنگ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اپنی مدد کا اس طرح یقین دلایا کہ قریش بھی اس پر یکسو ہو گئے۔ پھر یہ لوگ بنو غطفان کے پاس گئے۔ انہیں بھی اونچ نیچ سمجھا کر جنگ میں شرکت پر آمادہ کر لیا۔ پھر اس وفد نے بقیہ قبائلِ عرب میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں کو جنگ کی ترغیب دی۔ اس طرح سے وہ ایک بڑی جمعیت تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق جنوب سے قریش، کنانہ اور تہامہ میں آباد دوسرے حلیف قبائل نے مدینے کی جانب کوچ کیا۔ ان سب کا سپہ سالارِ اعلیٰ ابوسفیان تھا اور ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ مشرق کی طرف سے غطفانی قبائل نے کوچ کیا۔ اور شمال کی طرف سے بنی نضیر اور بنی قینقاع کے وہ یہودی آئے جو مدینے سے جلاوطن ہو کر خیبر اور وادی القریٰ میں آباد ہو گئے تھے۔ مجموعی طور پر ان سب کی تعداد محتاط روایات کے مطابق دس بارہ ہزار کہی جاتی ہے۔ یہ اتنا بڑا لشکر تھا کہ غالباً مدینے کی پوری آبادی عورتوں، بچوں بوڑھوں اور جوانوں کو ملا کر بھی اس کے برابر نہ تھی۔ اگر حملہ آوروں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مدینہ کی چار دیواری تک اچانک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کے لیے سخت خطرناک ثابت ہوتا۔ لیکن آنحضرت ﷺ چونکہ حالات سے باخبر رہتے تھے، آپؐ نے فوراً ہائی کمان کی مجلسِ شوریٰ منعقد کی اور دفاعی منصوبے پر صلاح مشورہ کیا۔ اہلِ شوریٰ نے غور و خوض کے بعد حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز پر خندق کھودنے کا فیصلہ کر لیا۔ آنحضرت ﷺ نے چھ دن کے اندر مدینہ کے شمالی غربی رخ پر ایک خندق کھدوائی اور کوہِ سلع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینہ کے جنوب میں باغات کی کثرت کی وجہ سے حملے کا اندیشہ نہ تھا۔ مشرق میں حرات (لاوے کی چٹانیں) ہیں جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کشی آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف احد کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہو سکتا تھا اور اسی جانب حضور ﷺ نے خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا۔ اہلِ عرب کی فوجیں جب وہاں پہنچیں تو انہیں ایک نئی صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ جس سے وہ بالکل ناآشنا تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ ایک دو دن میں جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن خندق نے ان کا راستہ روک لیا۔ لاچار انہیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے نہایت بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے خندق عبور کرنے کی کوشش کی لیکن مارے گئے۔ لیکن عمرو بن عبد ود جیسے بعض بہادر جنگجو پار اترنے میں کامیاب ہو گئے لیکن عمرو کے قتل کے بعد واپس بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اب ان کے پاس صرف ایک ہی تدبیر تھی کہ کسی طرح بنی قریظہ کے یہودی قبیلے کو غداری پر آمادہ کریں۔ یہ قبیلہ مدینہ کے جنوبی مشرقی گوشہ میں رہتا تھا۔ اور چونکہ مسلمانوں کے ان کے ساتھ باقاعدہ حلیفانہ تعلقات تھے اور اب تک ان کی طرف سے کبھی کوئی عہد شکنی نہیں ہوئی تھی، اس لیے مسلمانوں نے اس طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بال بچے ان گڑھیوں میں بھجوا دیے تھے جو بنو قریظہ کی جانب تھیں اور ادھر مدافعت کا کوئی انتظام بھی نہ کیا تھا۔ کفار نے اسلامی دفاع کے اس کمزور

Marfat.com

پہلو کو بھانپ لیا۔ چنانچہ بنونضیر کا یہودی سردار بنوقریظہ کے پاس بھیجا گیا تاکہ انہیں معاہدہ توڑ کر جنگ میں شامل ہونے کے لیے آمادہ کرے۔ شروع میں بنوقریظہ کے سردار نے بنونضیر کے سردار کی بات سننے سے انکار کردیا، لیکن اس نے مسلسل ترغیب جاری رکھی اور کہا کہ اے کعب! میں تمہارے پاس ہمیشہ کی عزت اور فوجوں کا بحرِ بے کراں لے کر آیا ہوں۔ اگر تم نے یہ موقع گنوا دیا تو ہمیشہ پچھتاتے رہو گے۔ اس طرح سے وہ مسلسل ترغیب دیتا رہا۔ آخر یہودی ذہن کی اسلام دشمنی اخلاق کے پاس ولحاظ پر غالب آ گئی اور بنی قریظہ عہد توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ بنوقریظہ نے ابتدائی مدد کے طور پر لشکر کو رسد پہنچانا شروع کردی۔ مسلمان چونکہ نہایت چوکنا اور ہوشیار تھے ان کے پہرے داروں نے ان کے بیس اونٹ پکڑ لیے۔ جس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ بنوقریظہ عہد توڑ چکے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے مزید اطمینان کے لیے حضرت سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ، عبداللہ بن رواحہ خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم کو تحقیق کے لیے روانہ کیا اور ہدایت کی کہ اگر بنوقریظہ واقعی عہد توڑ چکے ہوں تو صرف مجھے اشاروں اشاروں میں بتانا تاکہ عام مسلمان یہ بات سن کر پست ہمت نہ ہو جائیں۔ ان کو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بنوقریظہ پوری خباثت پر تلے ہوئے ہیں اور وہ ہر عہد و پیمان کو توڑ چکے ہیں۔ انہوں نے واپس آ کر اشارۃً صرف اتنا کہا عضل وقارہ، مقصود یہ تھا کہ جس طرح عضل وقارہ نے بدعہدی کی تھی، اسی طرح یہود بھی بدعہدی پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اگرچہ بات چھپا کر کہی، لیکن یہ خبر بہت جلدی مدینہ کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان کے اندر اس سے سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں طرف سے گھیرے میں آ گئے ہیں۔ اس صورتحال سے منافقین کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا اور انہوں نے حوصلے پست کرنے کے لیے طرح طرح سے نفسیاتی حملے شروع کر دیے۔ اور ایسی باتیں کہیں جن سے ایمان میں تزلزل پیدا کرنا مقصود تھا۔ ان میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ کر اپنے گھروں کو جانے کی اجازت مانگی کہ ہمارے گھر خطرے کی زد میں ہیں اور ہم نے ان کے دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا، اس لیے ہمیں واپس جانے کی اجازت دی جائے۔

ایک طرف تو لشکر کی صورتحال یہ تھی اور دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی یہ کیفیت تھی کہ آپؐ نے بنوقریظہ کی بدعہدی کی خبر سن کر اپنا سر اور چہرہ کپڑے سے ڈھک لیا اور دیر تک چت لیٹے رہے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر لوگوں کا اضطراب اور زیادہ بڑھ گیا۔ پھر اچانک آپ اللہ اکبر کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا، مسلمانو! اللہ تعالیٰ کی مدد اور خوشخبری سن لو۔ اس کے بعد آپؐ نے پیش آمدہ حالات سے نمٹنے کا پروگرام بنایا اور اسی پروگرام کے ایک جز کے طور پر مدینے کی نگرانی کے لیے فوج میں سے کچھ محافظ بھیجتے رہے۔ لیکن اس موقع پر ایک فیصلہ کن اقدام کی ضرورت تھی جس کے ذریعے دشمن کے مختلف گروہوں کو ایک دوسرے سے بے تعلق کردیا جائے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے بنی غطفان کے دو سرداروں عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف سے صلح کی بات چیت شروع کی۔ اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ مدینے کے پھلوں کی پیداوار کا 1/3 حصہ لے کر واپس چلے جائیں۔ مگر جب آپ نے حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس تجویز کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے بیک زبان عرض کیا، یارسول اللہ! اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے تو تب تو بلا چون و چرا تسلیم ہے۔ لیکن اگر آپ ہمیں بچانے کے لیے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ جب ہم لوگ مشرک تھے تو یہ کمینے ہم سے اس وقت بھی ایک حبہ خراج کے طور پر نہ لے سکے۔ اور اب تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا شرف ہمیں حاصل ہے تو کیا اب یہ ہم سے خراج لیں گے۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان صرف تلوار ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارا اور ان کا فیصلہ کردے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جب میں نے دیکھا کہ سارا عالمِ عرب تم پر پل پڑا ہے تو میں نے چاہا کہ ان کو ایک دوسرے سے توڑ دوں، تو میں یہ محض تمہاری خاطر کرنا چاہتا تھا۔

Marfat.com

اسی دوران قبیلہ بنو غطفان کی شاخ اشجع کے ایک صاحب نعیم بن مسعود مسلمان ہو کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک کسی کو بھی میرے قبولِ اسلام کا علم نہیں، آپؐ اس وقت مجھ سے جو خدمت لینا چاہیں میں اسے انجام دے سکتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا، تم جا کر دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی ترکیب کرو۔ چنانچہ وہ پہلے بنو قریظہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ قریش اور غطفان تو محاصرے سے تنگ آ کر واپس بھی جا سکتے ہیں، ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔ مگر تمہیں مسلمانوں کے ساتھ اسی جگہ رہنا ہے، وہ لوگ اگر چلے گئے تو تمہارا کیا بنے گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اس وقت تک جنگ میں حصہ نہ لو جب تک ان باہر سے آئے ہوئے قبائل کے چند نمایاں آدمی تمہارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیے جائیں۔ یہ بات بنو قریظہ کے دل میں اتر گئی اور انہوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یرغمال طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ بنو قریظہ کچھ ڈھیلے پڑتے نظر آ رہے ہیں، بعید نہیں کہ وہ تم سے یرغمال کے طور پر کچھ آدمی مانگیں اور انہیں محمد ﷺ کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کر لیں۔ اس لیے ذرا ان کے ساتھ ہوشیاری سے معاملہ کرنا۔

اس کے بعد جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی رات میں قریش نے یہود کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ہمارا قیام کسی سازگار یا موزوں جگہ پر نہیں ہے۔ گھوڑے اور اونٹ مر رہے ہیں۔ لہٰذا اِدھر سے آپ لوگ اور اُدھر سے ہم لوگ اٹھیں اور مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ لیکن یہود نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آج ہفتے کا دن ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ہم سے پہلے جن لوگوں نے اس دن کے بارے میں حکمِ شریعت کی خلاف ورزی کی تھی انہیں کیسے عذاب سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ علاوہ ازیں آپ لوگ جب تک اپنے کچھ آدمی ہمیں بطور یرغمال نہ دے دیں ہم لڑائی میں شریک نہ ہوں گے۔ قاصد جب یہ جواب لے کر واپس آئے تو قریش اور بنو غطفان نے کہا واللہ! نعیم نے سچ کہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کہلا بھیجا کہ خدا کی قسم ہم آپ کو کوئی آدمی نہ دیں گے، بس آپ لوگ ہمارے ساتھ اسی طرح نکل پڑیں۔ یہ سن کر یہود نے باہم کہا، واللہ! نعیم نے ہم سے سچ ہی کہا تھا۔ اس طرح دونوں فریق کا اعتماد ایک دوسرے سے اٹھ گیا۔ ان کی صفوں میں پھوٹ پڑ گئی اور ان کے حوصلے ٹوٹ گئے۔

اب محاصرہ پچیس دن سے زیادہ طویل ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی دعاؤں میں سوز و گداز اور عجز و الحاح بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں کی دعائیں سن لیں۔ اللہ تعالیٰ نے دشمنوں میں پست ہمتی پیدا فرما دی اور ساتھ ہی ایک سخت آندھی بھیجی جس میں سردی اور کڑک اور چمک تھی۔ اور اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آندھی کے زور سے دشمنوں کے خیمے الٹ گئے اور ان کے اندر شدید افراتفری برپا ہو گئی۔ قدرتِ خداوندی کا یہ کاری وار وہ نہ سہہ سکے۔ راتوں رات ہر ایک نے اپنے گھر کی راہ لی اور صبح جب مسلمان اٹھے تو میدان میں ایک دشمن بھی موجود نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے میدان کو دشمنوں سے خالی دیکھ کر فوراً ارشاد فرمایا **لن تغزو کم قریش بعد عامکم ھذا ولکنکم تغزونھم** ”یعنی اب قریش کے لوگ تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے، البتہ تم ان پر چڑھائی کرو گے۔“ اس کا مطلب یہ تھا کہ قریش اور ان کے حمایتی اپنی اقدامی قوت کھو چکے ہیں۔ اب وہ دفاعی جنگ لڑیں گے، اقدام کا موقع تمہارے پاس ہوگا۔ چنانچہ تاریخ نے یہی منظر دکھایا کہ تین ہی سال بعد مسلمانوں نے حملہ کر کے مکہ فتح کر لیا۔

غزوۂ خندق صحیح ترین قول کے مطابق شوال پانچ ہجری میں پیش آیا تھا اور مشرکین نے تقریباً ایک ماہ تک مدینہ منورہ کا محاصرہ جاری رکھا۔ جنگ کی مجموعی صورتحال کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ محاصرے کا آغاز شوال میں ہوا تھا اور خاتمہ ذیقعدہ میں ہوا۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس روز خندق سے واپس آئے بدھ کا دن تھا اور ذیقعدہ کے ختم ہونے میں صرف سات دن باقی تھے۔

Marfat.com

غزوۂ بنو قریظہ

دوسرا اہم واقعہ جو اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے وہ غزوہ بنو قریظہ ہے جو جنگِ خندق کے نتیجے کے طور پر وجود میں آیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ جس روز رسول اللہ ﷺ خندق سے واپس تشریف لائے اسی روز ظہر کے وقت جبکہ آپ حضرت ام سلمہؓ کے مکان میں غسل فرما رہے تھے حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے فرمایا کہ آپؐ نے ہتھیار رکھ دیے حالانکہ ابھی فرشتوں نے ہتھیار نہیں رکھے۔ اور میں بھی قریش کا تعاقب کر کے بس واپس چلا آ رہا ہوں اور اٹھیے اور اپنے رفقاء کو لے کر بنو قریظہ کا رخ کیجیے۔ آنحضرت ﷺ نے اسی وقت ایک صحابی سے منادی کروائی کہ جو کوئی سمع و اطاعت پر قائم ہو وہ عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک دیارِ بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے۔ اس کے بعد مدینے کا انتظام حضرت ابنِ ام مکتومؓ کو سونپا اور حضرت علیؓ کو جنگ کا پھریرا دے کر آگے روانہ فرما دیا۔ وہ بنو قریظہ کے قلعوں کے قریب پہنچے تو بنو قریظہ نے رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ حضرت علیؓ کے دستے کو دیکھ کر وہ یہ سمجھے تھے کہ یہ محض دھمکانے آئے ہیں۔ لیکن جب حضورؐ کی قیادت میں پورا اسلامی لشکر وہاں پہنچ گیا اور ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا گیا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

جب محاصرہ سخت ہو گیا تو یہود کے سردار کعب بن اسد نے یہود کے سامنے تین متبادل تجویزیں پیش کیں۔ (۱) یا تو اسلام قبول کر لیں اور محمد ﷺ کے دین میں داخل ہو کر اپنی جان، مال اور بال بچوں کو محفوظ کر لیں۔ واللہ! تم لوگوں پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وہ واقعی نبی اور رسول ہیں اور وہ وہی ہیں جنہیں تم اپنی کتاب میں پاتے ہو۔ (۲) یا اپنے بیوی بچوں کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیں، پھر تلوار سونت کر مسلمانوں کی طرف نکل پڑیں اور پوری قوت سے ٹکرا جائیں۔ اس کے بعد یا تو فتح پائیں یا سب کے سب مارے جائیں۔ (۳) یا پھر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ پر دھوکے سے ہفتے کے دن ہلہ بول پڑیں، کیونکہ انہیں اطمینان ہوگا کہ آج لڑائی نہیں ہوگی۔ لیکن یہود نے ان تینوں میں سے کوئی بھی تجویز منظور نہ کی، جس پر ان کے سردار کعب بن اسد نے کہا کہ تم میں سے کسی نے ماں کی کوکھ سے جنم لینے کے بعد ایک رات بھی ہوشمندی کے ساتھ نہیں گزاری۔ آخر کار انہوں نے اس شرط پر اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ کے حوالے کر دیا کہ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ ان کے حق میں جو بھی فیصلہ کر دیں گے اسے فریقین مان لیں گے۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کو اس امید پر حَکم بنایا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں اوس اور بنی قریظہ کے درمیان جو حلیفانہ تعلقات مدتوں سے چلے آ رہے تھے وہ ان کا لحاظ کریں گے۔ لیکن حضرت سعد دیکھ چکے تھے کہ پہلے دو یہودی قبیلوں کو مدینہ سے نکل جانے کا موقع دیا، تو وہ کس طرح سارے گردوپیش کے قبائل کو بھڑکا کر مدینے پر دس بارہ ہزار کا لشکر چڑھا لائے۔ اور یہ معاملہ بھی ان کے سامنے تھا کہ اس آخری یہودی قبیلے نے عین بیرونی حملے کے موقع پر بدعہدی کر کے اہلِ مدینہ کو تباہ کر دینے کا کیا سامان کیا۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا۔ اور جب مسلمان بنو قریظہ کی گڑھیوں میں داخل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ جنگِ احزاب میں حصہ لینے کے لیے ان غداروں نے پندرہ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے اور پندرہ سو ڈھالیں فراہم کر رکھی تھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید مسلمانوں کی شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ سارا جنگی سامان عین اس وقت مدینہ پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا۔ اس انکشاف کے بعد تو اس امر پر شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی کہ حضرت سعد نے ان لوگوں کے معاملہ میں جو فیصلہ دیا وہ بالکل حق تھا۔

Marfat.com

حضرت زینبؓ سے نکاح

تیسرا اہم واقعہ جس کا اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے وہ آنحضرت ﷺ کا حضرت زینبؓ سے نکاح کا واقعہ ہے۔ نکاح تو آنحضرت ﷺ نے اور بھی عورتوں سے کیے ہیں اور ان میں سے ہر نکاح اپنے اندر بہت سی حکمتیں رکھتا ہے، لیکن کسی نکاح کو قرآنِ کریم نے اس اہتمام کے ساتھ بیان نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو اس نکاح کا سبب ہے جو شرعی، معاشرتی اور اخلاقی لحاظ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اور دوسرے اس پر اٹھنے والے اعتراضات ہیں جو آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور اسلام کے لیے نہایت اہمیت کے حامل تھے۔ اس لیے اس واقعہ کے ضمن میں سب سے پہلے ہم اس سبب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے حضورؐ کو یہ نکاح کرنا پڑا، اس کے بعد اعتراضات سے تعرض کریں گے۔

حضرت زید بن حارثہؓ کو نبی کریم ﷺ نے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ چنانچہ وہ اب زید بن حارثہؓ کی بجائے زید بن محمد کے نام سے پکارے جانے لگے تھے۔ آپؐ کو چونکہ وہ بہت عزیز تھے اور پھر آپؐ یہ بھی چاہتے تھے کہ آزاد کردہ غلام کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا جائے کہ آزاد شخص اور اس میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اس لیے آپؐ نے اپنے خاندان میں اپنی پھوپھی کی لڑکی سے ان کے نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ جب آپؐ نے سلسلہ جنبانی کی تو ان کے خاندان نے اس کا بہت برا منایا اور خود آپؐ کی پھوپھی زاد حضرت زینبؓ کو بھی یہ بات پسند نہ آئی۔ کیونکہ قریش کے ایک معزز خاندان کی دخترِ نیک اختر کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام سے، عرب کی روایت کے یکسر خلاف تھا۔ کیونکہ جس شخص پر غلامی کا داغ لگ جاتا تھا وہ آزادی کے بعد بھی کبھی آزاد لوگوں کا ہمسر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کا فیصلہ آ جانے کے بعد کسی مومن مرد یا مومن عورت کے لیے ہرگز کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا، تو حضرت زینبؓ بھی اس پر راضی ہو گئیں اور ان کا خاندان بھی خاموش ہو گیا۔ اس طرح دونوں میں نکاح ہو گیا۔ لیکن طبیعتوں کی ناموافقت کوشش کے باوجود بھی موافقت میں تبدیل نہ ہو سکی۔ حضرت زیدؓ کو اس کا ہمیشہ احساس رہا کہ میں اپنی بیوی کا ہم پایہ نہیں۔ اور ممکن ہے کہ حضرت زینبؓ میں بھی کسی حد تک احساسِ تفوق پایا جاتا ہو۔ بہرحال آنحضرت ﷺ کی نصیحت کرنے کے باوجود دونوں دیر تک نباہ نہ کر سکے اور حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی۔

عرب میں کسی لڑکی کا مطلقہ ہو جانا کوئی بڑا واقعہ نہیں تھا۔ لیکن حضرت زینبؓ نے اس کو بڑا محسوس کیا۔ اور کچھ دائیں بائیں سے اکسانے والوں نے بھی ان کے احساس میں گہرائی پیدا کر دی۔ وہ سوچنے لگیں کہ ایک تو مجھے ایک ایسے شخص سے منسوب کیا گیا جو آزاد کردہ غلام تھا۔ لیکن میں نے اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خاطر قبول کر لیا۔ اور اب مجھے طلاق دے دی گئی ہے، یہ ایک دوسرا صدمہ ہے، جس نے ان کی شخصیت کو ہلا کر رکھ دیا۔ ادھر آنحضرت ﷺ محسوس فرما رہے تھے کہ میں بہت حد تک اس صورتحال کا ذمہ دار ہوں۔ اگر میں نکاح پر اصرار نہ کرتا تو یہ تکلیف دہ واقعہ بھی پیش نہ آتا۔ اب حضرت زینبؓ کی دلجوئی کی ایک ہی صورت تھی کہ آپؐ خود ان سے نکاح کر لیتے اور پروردگار نے اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا۔ لیکن آپؐ کے لیے ایسا کرنے میں اس لیے شدید تامل تھا کہ آپؐ جانتے تھے کہ اہلِ عرب منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا اور اس کی بیوی کو حقیقی بہو کا درجہ دیتے تھے جس سے نکاح کرنا ایسا ہی غلط تھا جیسے حقیقی بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا۔ یہ تبنیت اہلِ عرب کی معاشرتی اور سماجی زندگی میں بہت مضبوط جڑیں رکھتی تھی۔ اور اس رشتے کو بالکل حقیقی بیٹے کے رشتے کا درجہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک طرف تو حضرت زینبؓ کی دلجوئی کا معاملہ تھا، دوسری طرف جاہلیت کی اس رسم کی گرفت کی شدت جس کی وجہ سے متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کرنا گویا اپنے آپ کو طعن و تشنیع اور رسوائی کے حوالے کر دینے کے مترادف تھا۔ اور تیسری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اشارہ بھی ہو رہا تھا کہ یہی ایک موقع ہے جس سے فائدہ اٹھا کر اس قبیح رسم کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس رسم میں اتنی گہرائی تھی کہ محض اسے حرام کر دینے سے اسے جڑ سے اکھاڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کو ختم کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ

Marfat.com

کے حکم سے خود متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کریں۔ اس کے بعد کسی کے لیے پھر کوئی راستہ نکالنے کی صورت باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ اور آپؐ چونکہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تھے اس لیے آپ یہ بھی نہیں کرسکتے تھے کہ آپ اس عظیم کام کو اپنے بعد آنے والے کے لیے چھوڑ دیتے۔ کیونکہ اب کسی اور کو نبی کی حیثیت سے آنا ہی نہیں تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی بے حد اہمیت کی حامل تھی کہ یہ رسم صرف رسم نہیں تھی بلکہ درحقیقت اسلام کے قوانینِ نکاح و طلاق اور اس کے نظام میراث اور نظامِ اخلاق کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ منہ بولے بیٹے کو بیٹا کا درجہ دینے سے وراثت کا پورا نظام متاثر ہوتا تھا۔ محرم اور نامحرم کا نظام بگڑتا تھا۔ مصنوعی طریقے سے پیدا ہونے والے تقدس کے پیچھے مفاسد کی ایک دنیا آباد ہوتی نظر آتی تھی۔ مختصر یہ کہ ان بنیادی شرعی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اسلام کے نظامِ اخلاق کو مفاسد سے پاک رکھنے اور نظامِ میراث کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کریم ﷺ نے حضرت زینبؓ سے نکاح فرمالیا۔ لیکن جیسے کہ توقع تھی، نکاح ہوتے ہی آنحضرت ﷺ کے خلاف پراپیگنڈے کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مشرکین، منافقین اور یہود پہلے ہی گھات لگائے بیٹھے تھے، انہوں نے اس نکاح کے معاملہ کو ایک خداداد موقع سمجھا اور یہ خیال کیا کہ یہ ہمارے لیے ایک سنہری موقع ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی اس اخلاقی برتری کو ختم کردیں جو ان کی اصل طاقت اور ان کی کامیابیوں کا اصل راز ہے۔ چنانچہ ایسے ایسے افسانے تراشے گئے کہ الامان والحفیظ۔ یہ تک کہا گیا کہ معاذ اللہ محمد ﷺ بہو کو دیکھ کر عاشق ہوگئے تھے۔ بیٹے کو اس تعلق خاطر کا علم ہوگیا، اس نے بیوی کو طلاق دے دی۔ اور باپ نے اس کے بعد بہو سے بیاہ رچالیا۔ حالانکہ یہ بات لغو ہی نہیں، خلافِ عقل بھی تھی۔ کیونکہ حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر آپؐ کے سامنے گزری تھی۔ کسی وقت ان کو دیکھ عاشق ہوجانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آپ نے خود اصرار کرکے حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح کرایا تھا۔ ان کا سارا خاندان اس پر راضی نہ تھا کہ قریش کے اونچے گھرانے کی لڑکی ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہی جائے۔ مگر حضورؐ کے حکم سے سب مجبور ہوگئے۔ اگر فی الواقع حضورؐ کا کوئی میلان حضرت زینبؓ کی جانب ہوتا تو زید بن حارثہؓ سے ان کا نکاح کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ خود ان سے نکاح کرسکتے تھے۔ مگر بے حیاء مخالفین نے عشق کے ایسے افسانے تصنیف کیے اور پراپیگنڈے کے زور سے اس طرح انہیں پھیلایا کہ خود مسلمانوں کے لٹریچر میں آج تک اس کے اثرات محسوس ہورہے ہیں۔

یہ تین اہم واقعات ہیں جن کا ذکر اس سورۃ میں کیا گیا۔ لیکن ان ہنگامہ خیز واقعات کے ساتھ ساتھ اس دور میں جن معاشرتی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی گئی ان کے بارے میں بھی صرفِ نظر سے کام نہیں لیا گیا۔ چنانچہ حجاب کے ابتدائی احکام اسی سورۃ میں دیے گئے اور تکمیل ایک سال بعد سورۃ نور میں کی گئی۔ نکاح وطلاق کے مسائل تقریباً اسی دور میں مکمل ہوئے۔ آپ کی خانگی زندگی کے حوالے سے جتنے سوالات اٹھائے گئے ان کا جواب دیا گیا۔ خانگی زندگی کو پریشانیوں سے بچانے کے لیے ازواجِ مطہرات کو خاص ہدایات جاری کی گئیں۔ بلکہ انہیں پوری امت کے لیے نمونہ بنادیا گیا۔ پھر آگے چل کر امت کی تمام خواتین کے لیے پردے کی پابندی لازم کی گئی اور اس کے احکام دیے گئے۔ مسلمان چونکہ نہایت ناموافق حالات سے گزر رہے تھے، اس لیے ایمان واستقامت اور ایثار وانفاق کی تاکید بھی کی گئی اور فضائل بھی بیان کیے گئے۔ جہاد کی اہمیت واضح کی گئی اور اسے مسلمانوں کی زندگی کا لازمہ ٹھہرایا گیا۔ مدینہ میں منافقین ہمیشہ مارِ آستین بنے رہے، اس لیے ان کے بارے میں خاص ہدایات ارشاد فرمائی گئیں۔ مدینے میں یہود اپنا ایک خاص اثر رکھتے تھے۔ پڑھے لکھے تھے۔ مدراس کے نام سے ان کے مدارس بھی تھے۔ ان میں علماء اور مشائخ بھی تھے۔ لیکن اسلام دشمنی میں یہ سب سے پیش پیش تھے۔ اس لیے ان کے بارے میں خاص ہدایات جاری فرمائی گئیں اور ان کی روش سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی۔ آخر میں اس عظیم عہدہ وامانت کی یاددہانی کرائی گئی جس کا اہل صرف انسان کو بنایا گیا ہے اور اسی پر انسان کے تمام شرف کا انحصار ہے۔ اس لیے اس کی طرف بطورِ خاص توجہ دلائی گئی۔

Marfat.com

اٰیَاتُهَا ۷۳	سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِیَّةٌ (۳۳)	رُکُوْعَاتُهَا ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًاۙ(۱) وَّ اتَّبِـعْ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًاۙ(۲) وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا(۳)
مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِهٖۚ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ
الّٰٓـِٔیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْۚ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْؕ
ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْؕ وَ اللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ یَهْدِی السَّبِیْلَ(۴)
اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ
فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْؕ وَ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَاۤ
اَخْطَاْتُمْ بِهٖۙ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا(۵)
اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْؕ وَ
اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ
الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤى اَوْلِیٰٓىٕكُمْ مَّعْرُوْفًاؕ كَانَ
ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا(۶) وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ

Marfat.com

مِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۪ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۸

رکوع: ا۔ (اے نبی! اللہ سے ڈریں اور کفار اور منافقین کی باتوں پر کان نہ دھریں، بے شک اللہ علیم اور حکیم ہے۔ ۱) اور پیروی کیجیے اس چیز کی جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے وحی کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ ہر اس چیز سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔ ۲) اور اللہ پر توکل کیجیے اور اللہ وکیل ہونے کے لیے کافی ہے۔ ۳) اللہ نے کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں رکھے، اور نہ تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کر بیٹھتے ہو، تمہاری مائیں بنایا، اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے حقیقی بیٹے بنایا، یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں، اور اللہ حق کہتا ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ۴) منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے، اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے موالی ہیں، اس باب میں تم سے جو غلطی ہوئی اس پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں، البتہ تمہارے دلوں نے جس بات کا ارادہ کرلیا (اس پر مواخذہ ہے) بے شک اللہ غفور ورحیم ہے۔ ۵) نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں، اور ان کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں، اور رحمی رشتے رکھنے والے آپس میں دوسرے مومنین ومہاجرین کی بہ نسبت اللہ کی کتاب کی رو سے زیادہ حقدار ہیں، اِلَّا یہ کہ تم اپنے اولیاء واقرباء کے ساتھ کوئی حُسنِ سلوک کرنا چاہو، یہ حکم کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔ ۶) اور یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے ان کے عہد لیے، اور آپ سے بھی، اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ابنِ مریم سے بھی، اور ہم نے ان سے نہایت پختہ عہد لیا۔ ۷) تاکہ اللہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے (اور کافروں اور منافقوں سے ان کے کفر ونفاق کے بارے میں) اور کافروں کے لیے اللہ نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۸)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۱ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۲ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۳

Marfat.com

(اے نبی! اللہ سے ڈریں اور کفار اور منافقین کی باتوں پر کان نہ دھریں، بے شک اللہ علیم اور حکیم ہے۔ ۱) اور پیروی کیجیے اس چیز کی جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے وحی کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ ہر اس چیز سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔ ۲) اور اللہ پر توکل کیجیے اور اللہ وکیل ہونے کے لیے کافی ہے۔ ۳)

خطاب کا پس منظر اور اس کا مفہوم

ان آیات کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی ہیں جب حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ یہ نکاح چونکہ آنحضرت ﷺ کی خصوصی توجہ اور اصرار کی وجہ سے ہوا تھا جبکہ حضرت زینبؓ بھی اس سے ناخوش تھیں اور ان کا خاندان بھی اس پر راضی نہ تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے حکم کی وجہ سے وہ سب لوگ اس پر راضی ہوگئے۔ طلاق سے حضرت زینب کی شخصیتِ عرفی کو بہت دھچکا لگا اور ان کے خاندان کو بھی شدید صدمہ ہوا۔ اور آنحضرت ﷺ کو بھی اس سے نہایت رنج پہنچا۔ کیونکہ آپؐ یہ محسوس فرمارہے تھے کہ میرے اصرار اور حکم کی وجہ سے یہ نکاح ہوا تھا، اس لحاظ سے اس تمام صورتحال کا میں ذمہ دار ہوں۔ آپؐ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس کا تدارک کیا جائے۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ آپؐ خود حضرت زینبؓ سے نکاح کرلیں۔ اس طرح سے ان کی دلجوئی بھی ہوجائے گی، خاندان کی عزت میں بھی اضافہ ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ ایک بہت بڑی دینی ضرورت بھی پوری ہوجائے گی۔ وہ یہ کہ تبنیت یعنی منہ بولے بیٹے کا رشتہ عرب میں جو اہمیت اختیار کرچکا تھا اور جس کی وجہ سے بہت سے مفاسد پیدا ہورہے تھے جن کا تعلق نظامِ میراث کی شکست سے بھی تھا اور نظامِ اخلاق میں درآنے والی خرابیوں سے بھی، اس کا سدِ باب ہوجائے گا۔ چونکہ صدیوں سے اہلِ عرب میں یہ رسم رائج تھی، اس لیے نصیحت یا حکم کے ذریعے اس کا ختم ہونا ممکن نہ تھا۔ حتمی طور پر اس کے خاتمے کی ایک ہی صورت تھی کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے حکم سے خود اس رسم کو توڑیں۔ حضرت زینبؓ کو طلاق ہوجانے کے بعد قدرت نے یہ موقع پیدا کردیا تھا کہ حضرت زیدؓ چونکہ آپ کے متبنیٰ رہ چکے ہیں اور ان کی بیوی عرب روایت کے مطابق آپ کی بہو کا درجہ رکھتی ہے۔ اب جبکہ زید اسے طلاق دے چکے ہیں تو آپ کے نکاح کرنے سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہوتا۔ اور اس کی بیوی حقیقی بہو کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس لیے اس سے نکاح کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس طرح سے امید کی جاسکتی ہے کہ اس رسم کو بیخ و بن سے اکھاڑا جاسکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے لیے اشارے بھی کیے جارہے تھے۔ لیکن آنحضرت ﷺ یہ محسوس کرتے تھے کہ جنگِ احد کے بعد مسلسل دو سالوں میں قدم قدم پر جس طرح کفار اور منافقین نے مسلمانوں کے مقابلے میں زک اٹھائی ہے اس کی وجہ سے وہ حسد اور بغض میں جل رہے ہیں۔ نکاح کرنے سے انہیں پراپیگنڈا کرنے اور دل کے پھپھولے پھوڑنے کا ایک موقع مل جائے گا۔ اس سے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ جو اسلام کی طرف میلان رکھتے ہیں وہ پیچھے ہٹ جائیں گے۔ اور جن نومسلموں میں ابھی تک صلابتِ فکر اور عمل میں پختگی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ شکوک و شبہات کا شکار ہوجائیں گے۔ اس سے اسلام کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ چنانچہ اس پس منظر میں آنحضرت ﷺ کو نبی کے لفظ سے خطاب فرما کر آپ کے فریضۂ منصبی کی یاد دہانی کرائی جارہی ہے۔ یعنی آپ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہیں۔ آپ کا کام اندیشہ ہائے دور دراز کا لحاظ کرنا نہیں بلکہ اس منصب کی ادائیگی کی فکر کرنا ہے جس کے لیے آپؐ کو مبعوث کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ڈریں، کسی اور سے ڈرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ یہ بالکل وہی بات ہے اور ویسا ہی خطاب ہے

Marfat.com

جیسا سورۃ المائدہ میں ایسے ہی پس منظر میں کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ''اے رسول آپ اچھی طرح لوگوں کو وہ چیز پہنچا دیں جو آپ کے رب کی جانب سے آپ پر اتاری گئی ہے۔''

آپؐ کے اقدام سے چونکہ دورِ جاہلیت کی صدیوں پرانی رسم اپنی موت سے دوچار ہوگی تو اس کے نام لیوا یقیناً مدافعت کے لیے ہر ممکن تدبیر بروئے کار لائیں گے۔ آپ کی ذات کو ہدفِ طعن بنایا جائے گا اور آپ جس دین کے پیغمبر ہیں اس پر بھی طعن کیا جائے گا۔ آپ ان کفار اور منافقین کی کسی بات پر کان نہ دھریں، اگرچہ بظاہر مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت اس رسم کو نہ چھیڑا جائے، آئندہ چل کر کسی مناسب وقت پر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جائے۔ لیکن یہ بات ہمیشہ آپ کے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ علم اور حکمت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ فتنہ انگیزی کرنے والے کیا کچھ کریں گے اور آپ کی مخلصانہ کاوشیں جس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی وحی کام کر رہی ہے کیسے برگ و بار پیدا کریں گی۔

نبی کے لفظ سے خطاب جس طرح فریضۂ منصبی کی یاددہانی ہے، اسی طرح بلاشبہ آنحضرت ﷺ کے مقام و مرتبہ کا اظہار بھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جو خصوصی تعلق آپ سے رکھتے ہیں اس کی طرف اشارہ بھی ہے۔ گزشتہ انبیائے کرام کو جابجا نام لے کر خطاب فرمایا گیا ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کو ہمیشہ کسی خصوصی صفت یا خصوصی لقب سے یاد فرمایا گیا ہے، جس سے بتانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کے لیے سب سے زیادہ تقرب کے مراتب ہیں۔ اور آپؐ کے لیے تعظیم و تکریم کا ایک خصوصی مقام ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں کفار اور منافقین کا ذکر ایک ساتھ فرمایا گیا ہے۔ اس سے شاید یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ دونوں درحقیقت ایک ہی راستے کے مسافر اور ایک ہی منزل کے شناور ہیں۔ اسلام دشمنی میں دونوں ایک دوسرے کے معاون اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک سامنے آ کر وار کرتا ہے، دوسرا گھات لگا کر پسِ پشت حملہ کرتا ہے۔ کافر انکار بھی کرتا ہے اور دشمنی بھی۔ منافق بظاہر اقرار کرتا ہے، لیکن دشمنی میں کافر سے کم نہیں۔ اس لیے قرآنِ کریم نے ان کی سزا کو سب سے زیادہ شدید بتایا ہے۔

گزشتہ مضمون کا تسلسل مثبت انداز میں

پہلی آیت میں جو بات منفی انداز میں فرمائی گئی ہے پیشِ نظر آیت میں اسے مثبت پہلو سے ارشاد فرمایا گیا کہ آپ کا کام پراپیگنڈے سے متاثر ہونا اور لوگوں کی باتوں پر کان دھرنا نہیں بلکہ آپ کے ہاتھ میں وحیِ الٰہی کی مشعل ہے۔ آپ کو صرف اس کی روشنی میں چلنا اور دوسروں کو چلانا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ اطمینان بھی دلایا کہ آپ کے ہر اقدام و عمل سے اللہ تعالیٰ پوری طرح باخبر ہے۔ حتیٰ کہ آپ اس راستے میں جن خطرات سے دوچار ہوں گے یا فتنہ انگیزوں کی جس فتنہ انگیزی سے آپ کو واسطہ پڑے گا اور یا پراپیگنڈا کرنے والوں کی اڑائی ہوئی دھول آپ کے لیے پریشانی کا باعث بنے گی تو اس راستے میں آپ جیسی استقامت دکھائیں گے اور آپ کے ساتھ چلنے والے جس طرح کی ہمت کا مظاہرہ کریں گے ان میں سے کوئی بات بھی اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں۔ اس سے مزید برآں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ سے واحد کا خطاب درحقیقت امت کے وکیل کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اور جمع کا خطاب آپ کے معزز سرفروش ساتھیوں کو ان انعامات میں شریک کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جو آنحضرت ﷺ کے طفیل ان خوش نصیبوں کو بھی نصیب ہوں گے۔

Marfat.com

آیت میں توکل کا مفہوم

تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس سے شاید اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ چونکہ علم وحکمت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اوراس کی طرف سے اترنے والی وحی اسی سرچشمہ سے اترنے والی کرنیں ہیں جو مسلسل آپ کے دل پر اتاری جارہی ہیں۔تو آپ کو کسی اور طرف دھیان دینے کی بجائے نہایت دلجمعی کے ساتھ وحیِ الٰہی کی روشنی میں سفر جاری رکھنا چاہیے۔اور دوسرا شاید اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ تبلیغ ودعوت کا راستہ جان جوکھوں میں ڈالنا ہے۔اس راستے پر چلنے والا ہمیشہ مشکلات کا شکار ہوتا ہے۔قدم قدم پر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان مخالفتوں سے مرعوب ہونے کی بجائے آپ کو صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا چاہیے۔وہ آپ کے ہر عمل کو بھی دیکھ رہا ہے اور پیش آنے والی مشکلات کو بھی جانتا ہے اور وہ اس سے بھی باخبر ہے کہ آپ اسی کے عائد کردہ فریضے کو سرانجام دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔اس لیے ممکن نہیں کہ وہ آپ کو بے سہارا چھوڑے۔اس لیے آپ کا بھروسا اسی پر ہونا چاہیے۔وہی ذات ہے جو وکیل بننے کے لیے کافی ہے۔وکیل اسے کہتے ہیں جس پر پورا اعتماد کر کے اپنے معاملات اس کے سپرد کردیے جائیں۔اللہ تعالیٰ کا مطالبہ اپنے بندوں سے یہی ہے کہ وہ اس کے دیے ہوئے احکام کی ہر حال میں تعمیل کریں۔اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں۔اس راہ میں جو مشکلیں پیش آئیں گی ان سے عہدہ برآ ہونے کی وہی توفیق بخشے گا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝۴

(اللہ نے کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں رکھے،اور نہ تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کر بیٹھتے ہو،تمہاری مائیں بنایا،اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے حقیقی بیٹے بنایا،یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں،اور اللہ حق کہتا ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ۴)

فکر وارادہ کے تضاد پر تنبیہ

اوپر کی آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف الفاظ اور مختلف پیرایہ بیان میں ایک ہی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے،وہ یہ ہے کہ ایک مومن کا حقیقی رشتہ صرف اللہ تعالیٰ سے ہے۔اس کی حقیقی وابستگی صرف اس کی ذات سے ہے۔اسے اللہ تعالیٰ ہی کا تقویٰ اختیار کرنا چاہیے۔بجائے کفار اور منافقین کی باتوں پر کان دھرنے کے اللہ تعالیٰ ہی کے احکام کو حرزِ جان بنانا چاہیے۔جو وحی بھی اللہ تعالیٰ کے رسول کی طرف کی جارہی ہے اسی کا اتباع ہونا چاہیے اور اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ انسانوں کے تمام اعمال اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات میں بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہیے۔اسی کی ذات اس قابل ہے کہ اس پر اعتماد کرتے ہوئے تمام معاملات کو اس کے حوالہ کردیا جائے۔یہ فکر وعمل کی وہ یکسانی اور ہم آہنگی ہے جس کا سرچشمہ بھی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور جس کا مرجع بھی

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اسی کی ذات پر بھروسہ اور توکل اور ہر وقت اسی کا استحضار ایک مومن کے دل کا اصل سرمایہ ہے اور اسی سے اس کے دل کی آبادی ہے۔ اور اسی طرزِ فکر اور طرزِ عمل نے اس شخصیت کو وحدت عطا کی ہے اور یہی اس کی قوت کا اصل راز ہے۔ لیکن کفار اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک ماننے کے باوجود بندگی میں نہ جانے کس کس کو شریک کرتے ہیں۔ نہ جانے ان کا سر کہاں کہاں جھکتا ہے۔ کتنی محبتیں اور عقیدتیں ہیں جو ان کے دلوں میں آباد ہیں۔ کتنے خوف ہیں جو ان کے دلوں میں جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور منافقین کا طرزِ عمل تو بالکل واضح ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہر ممکن طریقے سے اس سے دشمنی بھی کرتے ہیں۔ یہ وہ تضادِ فکر و عمل ہے جس نے ہمیشہ انسان کو شرک کے راستے پر ڈالا اور توحید کے نور سے محروم رکھا اور یہی وہ بیماری ہے جس نے انسان کی شخصیت کو شکست و ریخت سے دوچار کیا جبکہ اس کے پہلو میں دل ایک ہے، دو نہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دل کی آبادی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل سے ہے۔ جو شخص شرک کا راستہ اختیار کرتا ہے اور بیک وقت اپنے دل میں مختلف قسم کے احساسات پالتا ہے تو وہ درحقیقت ایک دل نہیں، دو دل رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک دل میں متضاد خیالات پنپ نہیں سکتے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ دل میں اخلاص بھی ہو اور شرک بھی۔ اللہ تعالیٰ کا خوف بھی ہو اور اس سے بے خوفی بھی۔ کوئی شخص ایک ہی وقت میں مومن بھی ہو اور کافر یا منافق بھی۔ کیونکہ ایک دل تو متضاد خیالات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اور جو متضاد خیالات رکھتا ہے اس نے ایک دل کو دو دلوں میں تقسیم کر رکھا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے پہلو میں دو دل پیدا نہیں فرمائے۔

تضادِ فکر و ارادہ کی ایک مثال

اسی تضادِ فکر و ارادہ کی ایک مثال ظہار کا ذکر کر کے دی۔ ظہار دراصل عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ بیٹھتا کہ اَنْتِ عَلَیَّ كَظَهْرِ اُمِّیْ ''اب تو میرے اوپر میری ماں کی پیٹھ کی طرح حرام ہے۔'' تو اس کی بیوی اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوجاتی۔ ظھر کے معنی عربی زبان میں چونکہ پیٹھ کے ہوتے ہیں، اس سے ظہار کی اصطلاح وجود میں آئی۔ عرب جاہلیت میں یہ صورت طلاقِ مغلظہ کی طرح تھی، جس کے بعد کسی شخص کے لیے اپنی بیوی سے رجوع کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یعنی وہ عورت اس کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہوجاتی تھی۔ اسلام نے اس بات کو منکر اور جھوٹ قرار دیا۔ اور یہ بات واضح کی کہ تم اپنی ماؤں کو یقیناً اپنے دلوں میں ایک احترام کا حق دیتے ہو۔ ان سے تمہارا تعلق جنس کا نہیں، بلکہ ادب اور احترام کا ہے۔ اب اگر کسی وقت تم جہالت سے اپنی بیوی کو اپنی ماں کی پیٹھ سے تشبیہ دے دیتے ہو تو یہ ایک جہالت، نادانی اور حماقت ہے۔ لیکن اس بے ہودگی سے بیوی ماں نہیں بن سکتی۔ البتہ جو تم نے ایک غلط بات کہی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اس کی قیمت ادا کرو۔ وہ یہ کہ اگر تمہارے پاس غلام ہے تو غلام آزاد کرو۔ اور اگر غلام میسر نہ ہو تو مسلسل دو ماہ کے روزے رکھو۔ اور اگر اس کی قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ اس سے غصے اور جھنجلاہٹ میں بے ہودہ بات کہنے سے بھی روکا اور اس کی سزا بھی تجویز کی۔ لیکن گھریلو زندگی کو درہم برہم ہونے سے بچالیا۔ لیکن اسلامی شریعت کے اس حکم کے نازل ہونے کے بعد مخالفین نے اس کو بھی فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنالیا۔ اور آنحضرت ﷺ کو بدنام کرنے کے لیے کہا گیا کہ دیکھو اس شخص کا حال کہ اس نے ماں اور بیوی کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہیں رکھا۔ یعنی وہ جس تضادِ فکر و ارادہ کا شکار تھے اور اپنے دل کو متضاد چیزوں کا کباڑ خانہ بنا چکے تھے اسلام نے اس کی اصلاح بھی کی اور عائلی زندگی کو بھی درہم برہم ہونے سے بھی بچایا۔ لیکن مخالفین کو اپنے تضاد پر اتنا اصرار ہے کہ وہ اس کو حقیقت سمجھ کر آنحضرت ﷺ پر طعن توڑ رہے ہیں۔

Marfat.com

جس طرح یہ لوگ ظہار کے معاملے میں تضادِ فکر کا شکار تھے، اسی طرح منہ بولے بیٹوں کے معاملے میں بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ وہ انہیں اپنے صلبی بیٹوں کا درجہ دیتے تھے۔ کسی شخص کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے متبنیٰ کی منکوحہ سے اس کی وفات یا طلاق کے بعد نکاح کر سکے۔ اسلام نے اس خطرناک رسم کی بھی اصلاح فرمائی اور عملی طور پر اس کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپ حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیں تاکہ اس غلط رسم کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن کفار و منافقین نے اس کو بھی فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا کہ دیکھو اس شخص نے اپنے منہ بولے بیٹے کی منکوحہ سے نکاح کر لیا۔

لوگوں کے اپنی رسم پر اصرار کے جواب میں فرمایا، یہ تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔ یعنی تم نے خود گھڑ رکھی ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تمہیں جس بات کا حکم دے رہا ہے وہ صحیح راستہ ہے جس پر تمہیں چلنا چاہیے۔ جس کے نتیجے میں منہ بولا بیٹا نہ میراث کے مسائل میں تبدیلی کا سبب بن سکے گا، نہ مصنوعی رشتوں کے تقدس کی آڑ میں مفاسد پیدا ہو سکیں گے، اور نہ صلبی اور صہری رشتوں میں اللہ تعالیٰ کی تحلیل و تحریم کے حق کو چیلنج کیا جا سکے گا۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۗ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٥

(منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے، اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے موالی ہیں، اس باب میں تم سے جو غلطی ہوئی اس پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں، البتہ تمہارے دلوں نے جس بات کا ارادہ کر لیا (اس پر مواخذہ ہے) بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔ ۵)

تضادِ فکر کی ایک اور مثال

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا کہ تم جنہیں اپنے منہ بولے بیٹے بنا لیتے ہو اور انہیں پھر اپنے حقیقی بیٹوں کی طرح حقوق دیتے ہو، یہ تمہارا ایسا عمل ہے جس کی اخلاق اور انصاف کی دنیا میں کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹے نہیں بنایا۔ یعنی ان کو وہ حق نہیں دیا جو حقیقی بیٹے کا ہوتا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس حکم کی عملی صورت اور منطقی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے حکم دیا کہ تم اپنے منہ بولے بیٹوں کو اپنی طرف نسبت دینے کی بجائے ان کے حقیقی باپوں کی نسبت سے پکارو۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کے منہ بولے بیٹے حضرت زیدؓ کو زید بن محمد کی بجائے زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ اور اس طرح سے ان کی نسبت ان کے حقیقی باپ کی طرف کی گئی۔ پروردگار نے اس حکم کی علت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ حکم ہم نے اس لیے دیا ہے کہ یہی بات اللہ تعالیٰ کے قانون میں حق و باطل کے زیادہ قریب اور زیادہ موافق ہے۔ کیونکہ اس کی خلاف ورزی سے اسلام کا پورا نظامِ وراثت و قرابت متاثر ہوتا ہے اور اسلام نے جو اصولِ معاشرت دیے ہیں وہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان احکام کی بنیاد رحمی رشتوں اور انسانی فطرت کے جذبات و

Marfat.com

واعیات پر رکھی ہے۔ تو جو شخص کسی وقتی اشتعال کا شکار ہو کر کسی کو اپنا بیٹا بنالیتا ہے اور پھر اسے حقیقی بیٹے کے حقوق دے دیتا ہے تو وہ درحقیقت حق وعدل کا خون کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جن احساسات و جذبات پر نظامِ وراثت و نظامِ معاشرت کو تشکیل دیا ہے ان کو پامال کرتا ہے۔ اسی حقیقت واہمیت کے پیشِ نظر آنحضرت ﷺ نے نہایت شدت سے یہ بات ارشاد فرمائی جسے بخاری و مسلم اور ابوداؤد نے حضرت سعد بن وقاص کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ من ادعی الی غیر ابیه وهو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام ''جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا کہا درانحالیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں، اس پر جنت حرام ہے۔''

باپ کا علم نہ ہو تو پھر؟

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص کو بیٹا بنایا جاتا ہے اس کے حقیقی باپ کا علم نہیں ہوتا، تو پھر متذکرہ بالا حکم کے مطابق اسے کس کی طرف منسوب کیا جائے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر تم ان کے باپوں کے نام سے واقف نہیں ہو تو پھر بھی انہیں اپنا بیٹا کہہ کر مت پکارو، بلکہ وہ تمہارے بھائی اور تمہارے موالی ہیں۔ یعنی ان کی حیثیت تمہارے دینی بھائیوں جیسی ہے۔ جیسے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ تم اخوت کا رشتہ رکھتے ہو اسی طرح ان کے ساتھ بھی تمہارا رشتہ دینی اخوت کا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ تمہارے موالی بھی ہیں۔ بعض اہلِ علم نے تو اس کا ترجمہ رفیق کیا ہے۔ یعنی وہ تمہارے دوست ہیں، ان کے ساتھ بھائیوں اور دوستوں جیسا سلوک کرو۔ لیکن اس کا ایک اور مفہوم بھی ہے، وہ یہ ہے کہ جو غلام آزاد ہو جاتا تھا اسے مولیٰ کہا جاتا تھا۔ اور جو شخص یا جو قبیلہ اسے آزاد کرتا تھا اس کے ساتھ اس کا ''وِلا'' کا رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔ اور یہ اس خاندان یا اس شخص کو مولیٰ کہلاتا تھا۔ آزادی کے باوجود اس وِلا کے رشتے کی وجہ سے اگر اس کی موت کے بعد اس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو وہ قبیلہ اس کا وارث ہوتا۔ اور اگر اس پر کوئی افتاد پڑ جاتی جس کی وجہ سے کوئی اس پر مالی بوجھ آپڑتا تو وہ قبیلہ اس میں تعاون کرتا۔ اور اسی طرح یہ آزاد ہونے والا شخص بھی اس قبیلے کے ایسے اجتماعی معاملات میں مددگار رہتا۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی معاشرتی روایت کو باقی رکھتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ وہ تمہارا منہ بولا بیٹا تو نہیں ہو سکتا، البتہ آزاد کر دینے کی وجہ سے تمہارا اس سے وِلا کا رشتہ باقی رہتا ہے اور وہ تمہارا مولیٰ ہوگا۔ ایسے شخص کو مولی العتاقہ کہا جاتا ہے۔

دورِ جاہلیت میں حلف اور وِلا کا ایک اور رشتہ معتبر سمجھا جاتا تھا جسے اسلام نے بھی باقی رکھا۔ وہ یہ ہے کہ خاندان یا قبیلہ سے باہر کا کوئی شخص اگر کسی خاندان یا قبیلہ میں شامل ہونا چاہتا اور اس خاندان والے اس کو شامل کر لیتے تو وہ اس خاندان کا مولی سمجھا جاتا تھا۔ اور جملہ حقوق اور ذمہ داریوں میں خاندان اور قبیلے کا شریک بن جاتا۔ اگر وہ قتل ہو جاتا تو وہ خاندان یا قبیلہ اس کے قصاص کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح اگر وہ کوئی ایسا اقدام کر بیٹھتا جس کی بنا پر کوئی ذمہ داری عائد ہونے والی ہوتی تو وہ اس ذمہ داری میں بھی پورے خاندان اور قبیلہ کو بھی حصہ لینا پڑتا۔ اسے مولی الموالات کہا جاتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے اسی آیت سے اس حکم کو مستنبط کیا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں مزید فرمایا گیا کہ آج تک بربنائے جہالت اس سلسلے میں جو غلطیاں ہوتی رہی ہیں اس پر اللہ تعالیٰ گرفت نہیں فرمائے گا۔ لیکن اب اس حکم کے نازل ہو جانے اور اس کی غلطی پر تنبیہ کیے جانے پر بھی اگر کوئی شخص یہ غلطی کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر مواخذہ فرمائے گا۔ کیونکہ بےعلمی اور نادانی سے جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ چونکہ غفور و رحیم ہے اس لیے ان سے درگزر فرماتا ہے۔ لیکن اگر تنبیہ و تعلیم کے بعد بھی ان غلطیوں پر اصرار کیا جاتا ہے تو پھر وہ انہیں معاف نہیں کرتا بلکہ مواخذہ کرتا ہے۔

Marfat.com

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۶﴾

(نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں، اور ان کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں، اور رحمی رشتے رکھنے والے آپس میں دوسرے مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت اللہ کی کتاب کی رو سے زیادہ حقدار ہیں، اِلّا یہ کہ تم اپنے اولیاء و اقرباء کے ساتھ کوئی حُسنِ سلوک کرنا چاہو، یہ حکم کتابِ الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔ ۶)

اس آیتِ کریمہ میں فرقِ مراتب کی وضاحت کرتے ہوئے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے اس فرقِ مراتب کو سامنے رکھنا چاہیے۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے سے خلطِ مبحث پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں عقائد میں بھی خرابی پیدا ہوتی ہے اور ترجیحات بھی درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا اسلامی معاشرے میں مقام و مرتبہ

پہلی بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ انسانی تعلقات میں ہر تعلق کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ بہت سے تعلقات احترام کے حوالے سے وجود میں آتے ہیں اور بہت سے تعلقات محبت یا نفرت کے حوالے سے اپنا مقام پیدا کرتے ہیں۔ اور بعض ایسے تعلقات بھی ہیں جنہیں عقیدت نے وجود بخشا ہے۔ ان میں سے ہر تعلق اپنی حدود میں اہمیت بھی رکھتا ہے اور انسانی معاشرت میں استحکام کا باعث بھی بنتا ہے۔ لیکن اگر یہ رشتے ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جائیں اور ان میں فرقِ مراتب واضح نہ رہے تو یہیں سے انسانی معاشرت میں دراڑیں واقع ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ان بنیادی تعلقات اور رشتوں کی حدود کا جاننا اور ان کا لحاظ کرنا بہت ضروری ہے۔

مسلمان اسلامی حدود میں رہ کر جن تعلقات اور رشتوں کو اہمیت کے قابل سمجھتے ہیں ان میں سب سے اہم تعلق نبی کریم ﷺ سے مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اور یہ تعلق ایسا ہے جو دیگر تمام تعلقات پر حاوی ہے بلکہ ان کا حوالہ بھی ہے۔ اس تعلق کو کسی اور تعلق پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ باقی تمام تعلقات اس تعلق پر قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اس تعلق کی اہمیت واضح کرنے کے لیے اس آیت میں اَوْلٰی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ایک معنی تو ہے سب سے بہتر اور سب سے مقدم۔ اور دوسرا معنی ہے ''احق''، یعنی سب سے زیادہ حق رکھنے والا۔ لیکن انجام کے اعتبار سے دونوں معنوں میں کوئی فرق نہیں۔ جو مقدم ہوگا وہی احق ہوگا اور جو احق ہوگا وہی مقدم ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کا حق ہر مسلمان پر دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ ہے، بلکہ ہر مسلمان کی جان سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی ہر شخص کو اپنی جان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا جتنا اختیار ہے کسی اور کو نہیں۔ وہی اپنی ذات کے مَالَـهٗ وَمَا عَلَیْهِ کو سمجھتا ہے، وہی اس کی ضروریات اور احساسات کا ادراک رکھتا ہے اور وہی اس کے لیے ناگوار چیزوں کی پہچان رکھتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اپنی ذات اور اپنی جان کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے اور جب اسے منظور ہوتا ہے تو اسے مشکلات میں ڈال دیتا ہے۔ اور اس معاملے میں کوئی دوسرا دخل دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اور رسول کا حق ایسا ہے جو ہر لحاظ سے اس پر فائق اور مقدم ہے۔

Marfat.com

انسان کو دنیا میں اپنی جان کے ساتھ ساتھ اپنے والدین اور اپنی اولاد اور لوگوں میں سے بہت سے احباب سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ اور وہ ہر چیز کو ان پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) وَمِنْ نَفْسِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کے باپ اور اولاد اور اس کی جان اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔"

انسان زندگی میں پسند و ناپسند کا خود فیصلہ کرتا ہے یا دوسروں کے فیصلہ کو قبول کر لیتا ہے۔ اور اس پر اصرار بھی کرتا ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے حق کے حوالے سے فرمایا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن اور مومنہ کے لیے اس معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا۔ اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں جا پڑا۔ ہر انسان کے پاس اس کی جان اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس لیے خودکشی کو حرام قرار دیا گیا۔ لیکن اگر کبھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی حرمت پامال ہو رہی ہو اور اس کی حفاظت جان دے کر کی جاسکتی ہو تو جان قربانی کے لیے پیش کر دینا فرض ہو جاتا ہے۔ بلکہ جس دل میں ایسا جذبہ نہیں، اس کا ایمان ہزار دعووں کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں۔ ٹھیک کہا مولانا ظفر علی خان نے:

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

آنحضرت ﷺ کی بیویاں امت کی مائیں ہیں

آپ کے اسی تعلق کے حوالے سے ارشاد فرمایا گیا کہ آپ کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ کوئی شخص ان سے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ان کے بارے میں دل میں ایسا خیال لا سکتا ہے جو ان کی عزت و حرمت کے خلاف ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح بیٹا اپنی ماں کے ساتھ احترام کے دائرے میں رہ کر گھل مل کر بے تکلفی سے باتیں کرتا ہے اور انہیں بے حجاب دیکھ سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے ساتھ ان باتوں کا کوئی جواز نہیں۔ اس لیے انہیں تمام انسانوں سے پردہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ اور یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ اگر ان سے کوئی بات پوچھنی یا کوئی چیز لینی ہو تو پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر ان سے بات کرو۔ لیکن عزت و احترام اور عظمت و وجاہت کے اعتبار سے وہ نہ صرف امت کی مائیں ہیں بلکہ ماؤں سے بھی بڑھ کر فضیلت رکھتی ہیں۔ اور یہ فضیلت آنحضرت ﷺ کی تمام ازواجِ مطہرات کو یکساں طور پر حاصل ہے ان میں سے کسی کا استثناء جائز نہیں۔ لیکن مسلمانوں میں ایک گروہ کا رویہ اس معاملے میں نہایت عجیب ہی نہیں، تکلیف دہ بھی ہے۔ صاحب تفہیم القرآن اس بارے میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں کے ایک گروہ کے رویہ پر تنقید

لیکن ایک گروہ نے جب حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ان کی اولاد کو مرکزِ دین بنا کر سارا نظامِ دین انہی کے گرد گھما دیا، اور اس بنا پر دوسرے بہت سے صحابہؓ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کو بھی ہدفِ لعن و طعن بنایا، تو ان کی راہ میں قرآن مجید کی یہ آیت حائل ہوگئی جس کی رو سے ہر اس شخص کو انہیں اپنی ماں تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایمان کا مدعی ہو۔ آخر کار اس

Marfat.com

مشکل کو رفع کرنے کے لیے یہ عجیب وغریب دعویٰ کیا گیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی ازواجِ مطہرات میں سے جس کو چاہیں آپ کی زوجیت پر باقی رکھیں اور جسے چاہیں آپ کی طرف سے طلاق دے دیں۔ ابو منصور احمد بن ابو طالب طبرسی نے کتاب الاحتجاج میں یہ بات لکھی ہے اور سلیمان بن عبداللہ البحرانی نے اسے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا یا ابا الحسن ان ھذا الشرف باقٍ مادُمنا علیٰ طاعة الله تعالیٰ فایّتھن عصت الله تعالیٰ بعدی بالخروج علیک فطلّقھا من الازواج واسقطھا من شرف امّھات المؤمنین ''اے ابوالحسن! یہ شرف تو اسی وقت تک باقی ہے جب تک ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قائم رہیں۔ لہٰذا میری بیویوں سے جو بھی میرے بعد تیرے خلاف خروج کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے اسے تو طلاق دے دیجیو اور اس کو امہات المومنین کے شرف سے ساقط کر دیجیو۔''

اصولِ روایت کے اعتبار سے تو یہ روایت سراسر بے اصل ہے ہی لیکن اگر آدمی اسی سورۂ احزاب کی آیات ۲۸۔۲۹ اور ۵۱۔۵۲ پر غور کرے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے بھی خلاف پڑتی ہے کیونکہ آیتِ تخییر کے بعد جن ازواجِ مطہرات نے ہر حال میں رسول اللہ ﷺ ہی کی رفاقت کو اپنے لیے پسند کیا تھا انہیں طلاق دینے کا اختیار حضورؐ کو باقی نہ رہا تھا۔

علاوہ بریں ایک غیر متعصب آدمی اگر محض عقل ہی سے کام لے کر اس روایت کے مضمون پر غور کرے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ انتہائی لغو اور رسول پاکؐ کے حق میں سخت توہین آمیز افترا ہے۔ رسول کا مقام تو بہت بالاتر و برتر ہے، ایک معمولی شریف آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی وفات کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے گا کہ اگر کبھی تیرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو تو میری طرف سے تو اسے طلاق دے دیجیو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل البیت کی محبت کے مدعی ہیں ان کے دلوں میں صاحب البیت کی عزت و ناموس کا پاس کتنا کچھ ہے، اور اس سے بھی گزر کر خود اللہ تعالیٰ کے ارشادات کا وہ کتنا احترام کرتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

مسلمانوں کے باہمی حقوق کی بنیاد رحمی رشتوں پر ہے

رسول اللہ ﷺ اور آپ کی ازواجِ مطہرات کو امت میں جو امتیازی مقام حاصل ہے اور جس پہلو سے حاصل ہے اس کو بیان کرنے کے بعد عام مسلمانوں کے درمیان آپس کے تعلقات کے لیے ایک اصول کو بیان فرمایا۔ وہ اصول یہ ہے کہ رشتہ داروں کے حقوق ایک دوسرے پر عام لوگوں کی بہ نسبت مقدم ہیں۔ ان میں ترتیب وہی ہوگی جو قرابت میں ترتیب ہے۔ یعنی ان میں جو قرابت میں اقرب ہے وہ پہلے ہوگا اور جو قرابت میں بعد ہے وہ حقوق میں بھی بعد ہوگا۔ اور اسی فطری اصول کے مطابق تقسیم وراثت کا ضابطہ وضع کیا گیا ہے۔ یعنی تقسیم وراثت میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ بالفعل اس وقت ضرورت مند کون ہے۔ بلکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ رحمی رشتے میں زیادہ قریبی کون ہے۔ کیونکہ مالی حالات تو بدلتے رہتے ہیں اور اسی نسبت سے ضرورتیں کم و بیش ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن خون کے رشتے ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتے ہیں۔ وراثت کے علاوہ تعاون اور بھلائی میں بھی اسی اصول کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ، بال بچوں اور بھائی بہنوں کی ضروریات پورا کرنے کا سب سے پہلے ذمہ دار ہے۔ اس کے بعد باہر خیرات کی نوبت آتی ہے۔ زکوٰۃ دینے کا موقع آئے تو پہلے اپنے غریب رشتہ داروں کو دینا ہوگا۔ اس کے بعد دوسرے مستحقین کی باری آئے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی قریبی رشتہ داروں کو محروم رکھے اور باہر کے لوگوں میں خیرات بانٹتا پھرے۔

Marfat.com

اسی اصول کے تحت ایک اور بات بھی واضح کر دی گئی کہ مدینہ منورہ میں مہاجرین کی گزر بسر کے انتظام کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ نے انصار کے ساتھ ان کی مواخات کا نظام قائم کیا تھا۔ انصار نے اس سلسلے میں اس قدر ایثار سے کام لیا کہ ہر چیز میں مہاجرین کو شریک کر لیا۔ حتیٰ کہ دونوں ایک دوسرے کے وارث ٹھہرائے جانے لگے۔ اس آیتِ کریمہ میں واضح کر دیا گیا کہ تقسیم وراثت میں مواخات کا دخل نہیں بلکہ اولوالارحام ہی ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ مسلمانوں کے درمیان اسلامی اخوت کا جو مستقل رشتہ ہے وہ تو قائم رہے گا لیکن حقوق میں تقسیم رحمی رشتوں کے حوالے سے ہوگی۔ البتہ اس میں اتنی گنجائش رکھی گئی کہ بعض دفعہ بعض اعزہ واحباب ضرورت مند ہونے کی وجہ سے مدد کے محتاج ہوتے ہیں لیکن وراثت میں حقدار نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا چاہتا ہے تو وہ ان حدود کے اندر کر سکتا ہے جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں۔ مثلاً وہ ہبہ یا وقف سے کام لے سکتا ہے۔ یا ایک تہائی وراثت میں وصیت کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی اللہ تعالیٰ کے قانون میں یہ باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ مراد اس سے سورۃ النساء کی وہ آیات ہیں جن میں نظامِ وراثت کو بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى
وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ لِّيَسْـَٔلَ
الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

(اور یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے ان کے عہد لیے، اور آپ سے بھی، اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ابنِ مریم سے بھی، اور ہم نے ان سے نہایت پختہ عہد لیا۔ ۷) تا کہ اللہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے (اور کافروں اور منافقوں سے ان کے کفر و نفاق کے بارے میں) اور کافروں کے لیے اللہ نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۸)

انبیائے کرام میں منصبی وحدت

اس سورۃ کی پہلی دونوں آیتوں میں آپ کو نبی کے لفظ سے خطاب فرما کر آپ کے فرضِ منصبی کے حوالے سے ارشاد فرمایا گیا تھا کہ آپ پر جو کچھ نازل کیا جا رہا ہے آپ کو ہر صورت میں اسی کا اتباع کرنا ہے اور لوگوں کو اسی کی دعوت دینی ہے۔ اور تبلیغ و دعوت کے اس فریضہ کی انجام دہی میں کیسے بھی حالات پیش آئیں آپ کو صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے اور کسی کافر اور منافق کی بات پر کان نہیں دھرنا۔ اب اسی بات کو تاریخ کے حوالے سے مزید مؤثق کر دیا گیا ہے۔ اور اس تاکید کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ جس بات کی ہدایت ہم آپ کو کر رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں، ہم نے انہیں باتوں کا عہد ان تمام نبیوں سے بھی لیا تھا جن کا نام آج دنیا میں جانا پہچانا ہے۔ جن میں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ ابن مریم ہیں۔ یعنی پہلے مطلقاً تمام نبیوں سے عہد و میثاق کا ذکر کیا اور پھر خاص خاص جلیل القدر انبیاء کا حوالہ دے کر پوری تاریخ سامنے رکھ دی گئی ہے تا کہ اس عہد و میثاق کی اہمیت پوری طرح کھل کر سامنے آجائے۔ اور اس میں سب سے پہلے آنحضرت ﷺ سے عہد لینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ آخری نبی ہیں، آپ کا دائرۂ کار پوری نوعِ انسانی تک پھیلا ہوا ہے اور مزید یہ بات کہ یہ آیات آپ پر نازل کی جا رہی ہیں۔ اور اصل مقصود آپ ہی کو یاد دہانی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ عہد و میثاق کیا ہے؟ سورۃ الشوریٰ میں کی آیت ۱۳ میں ارشاد فرمایا گیا ہے شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ”اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تمہارے لیے وہ دین

Marfat.com

جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوح کو، اور جس کی وحی کی گئی ہے (اے محمدؐ) آپ کی طرف۔ اور جس کی ہدایت کی گئی ہے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو، اس تاکید کے ساتھ کہ تم قائم کرو اس دین کو اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کرو۔

اس آیت میں سب سے پہلے آنحضرت ﷺ اور پھر چند جلیل القدر انبیاء کا حوالہ دے کر واضح کر دیا گیا ہے کہ اقامتِ دین کا موجودہ تمام امتوں کے جلیل القدر انبیاء کو حکم دیا گیا تھا۔ اور یہی وہ عہد ہے جو سارے انبیائے کرام سے لیا گیا۔

یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمائی گئی۔ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَکَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا "تم خود بھی اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ وہ اس بہترین چیز کو پوری مضبوطی سے اختیار کرے۔

میثاق لینے کی اہمیت وحکمت

پھر اس عہد و پیمان کی اہمیت کو مزید اجاگر کرنے کے لیے فرمایا گیا کہ ہم نے ان تمام انبیاء سے مضبوط عہد لیا۔ میثاق بجائے خود مضبوط عہد کو کہتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ غلیظ کی قید اسے مزید محکم کرنے کے لیے لائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمام جلیل القدر انبیاء سے عہد لیا اور اس میں ہم نے بالکل نرمی اور مداہنت نہیں برتی، بلکہ ہر ایک سے مضبوط عہد لیا اور سب کو اس پر قائم اور استوار رہنے کی تاکید در تاکید فرمائی۔ مقصود صرف یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو یاد دہانی کرائی ہے کہ اس وقت آپ کے سامنے تبنیت کی رسم توڑنے کے لیے حضرت زینبؓ سے نکاح کا مسئلہ ہے اور آپ اس سلسلے میں اس لیے تأمل کر رہے ہیں کہ اس سے دشمنوں کو مذاق اڑانے اور اسلام کو زک پہنچانے کا موقع ملے گا۔ اور چونکہ معاملہ ایک خاتون سے شادی کرنے کا ہے اس لیے آپ کو یہ خیال بھی ہے کہ لوگ آپ کے اخلاق پر انگلیاں اٹھائیں گے اور آپ کو نفس پرستی کا طعنہ دیں گے۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آپ ہمارے پیغمبر ہیں اور تمام پیغمبروں سے ہمارا یہ پختہ معاہدہ ہے کہ ہم جو بھی حکم دیں گے وہ ہر صورت اسے بجالائیں گے۔ اسی طرح آپ سے بھی اسی میثاق کا تقاضا یہ ہے کہ آپ لوگوں کی باتوں کو خاطر میں نہ لائیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالانے کی کوشش کریں۔

دوسری آیت میں انبیائے کرام سے جو میثاق لیا گیا ہے اس کی حکمت اور مصلحت بیان فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول تبلیغ و دعوت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمامِ حجت کرنے کے لیے آتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنا فرض انجام دے لیتے ہیں تو تب وہ صاحبِ ایمان اور راست باز لوگ جو ان کی دعوت پر ایمان لاتے اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کی راست بازی کے بارے میں سوال کرے اور وہ اس میں سرخرو ہو کر انعامات کے مستحق ٹھہریں۔ اور کافروں اور منافقوں سے ان کے کفر و نفاق کے حوالے سے سوال کرے اور پھر وہ اپنے کفر و نفاق کے باعث سزا کے مستحق ٹھہریں۔ جب تک یہ اتمامِ حجت نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ کسی کافر یا گمراہ شخص کو سزا نہیں دیتا۔ کیونکہ اس نے محض اپنے عدل و رحمت کے باعث یہ بات اپنے اوپر لازم کر رکھی ہے کہ جب تک وہ کسی قوم پر اتمامِ حجت نہیں کرے گا یعنی کسی پیغمبر کو بھیج کر دعوت و تبلیغ اور انذار کا اہتمام نہیں کرے گا اس وقت تک وہ کسی قوم سے باز پرس نہیں کرے گا۔ اس کا موقع ظاہر ہے کہ اسی وقت آسکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کریں اور اس طرح سے لوگوں پر اتمامِ حجت کر دیں۔ اور آخر میں کافروں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی نبی کی تبلیغ و دعوت کو رد کر دینے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آجائیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسے کافروں کے لیے آخرت میں عذابِ الیم تیار کر رکھا ہے۔

Marfat.com

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ
عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا ۚ
وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٩﴾ إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ
أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَ
تَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ﴿١٠﴾ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا
شَدِيدًا ﴿١١﴾ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ
مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢﴾ وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ
يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۚ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِنْهُمُ
النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ إِنْ يُرِيدُونَ
إِلَّا فِرَارًا ﴿١٣﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا
الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ﴿١٤﴾ وَلَقَدْ كَانُوا
عَاهَدُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ
مَسْئُولًا ﴿١٥﴾ قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ
الْقَتْلِ وَإِذًا لَا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٦﴾ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ
مِنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَ
لَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧﴾ قَدْ

Marfat.com

يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ
اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۱۸﴾ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚۖ فَاِذَا
جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ
يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ
حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ
وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۹﴾ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ
يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي
الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَاۗىِٕكُمْ ۭ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا
اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲۰﴾ ع

رکوع: ۲۔ (اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جبکہ تم پر فوجیں چڑھ آئیں تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسے لشکر بھیجے جو تم کو نظر نہیں آئے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھنے والا ہے۔ ۹) یاد کرو جب وہ تم پر آچڑھے تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی، جبکہ آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ ۱۰) اس وقت اہلِ ایمان امتحان میں ڈالے گئے اور بری طرح ہلا دیے گئے۔ ۱۱) یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے کیے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ ۱۲) جبکہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں، پس تم لوٹ جاؤ، اور ان میں سے ایک گروہ نبی کریم (ﷺ) سے اجازت کا طلبگار تھا اور وہ کہتا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے، بس یہ لوگ بھاگنا چاہتے تھے۔ ۱۳) اور اگر شہر کے اطراف سے ان پر حملہ ہو جاتا ہے اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے، اور اس میں بہت ہی کم توقف کرتے۔ ۱۴) ان لوگوں نے اس سے پہلے

Marfat.com

اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی پرسش ہونی ہے۔ ۱۵) اے پیغمبر کہہ دیجیے، اگر تم موت یا قتل سے بھاگو گے تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا، اس وقت زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں ملے گا۔ ۱۶) اے پیغمبر کہہ دیجیے! کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے، اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے، اور یہ لوگ اپنے لیے اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی کارساز پائیں گے نہ کوئی مددگار۔ ۱۷) اللہ تم میں سے روکنے والوں کو بھی جانتا ہے اور اپنے بھائیوں سے کہنے والوں کو بھی کہ آؤ ہماری طرف، وہ جنگ میں بہت کم حصہ لیتے ہیں۔ ۱۸) سخت بخیل ہیں تم پر، جب کوئی خطرہ پیش آجائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کی طرف ایسے دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں گھومتی ہیں جیسے ان پر موت کی غشی طاری ہو، پھر جب خطرہ ٹل جائے تو مالِ غنیمت کی حرص میں تم سے تیزی اور طراری سے باتیں کریں گے، یہ لوگ ایمان نہیں لائے تھے، سو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیے اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ ۱۹) یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں، اگر وہ گروہ پھر آجائیں تو ان کی تمنا یہ ہوگی کہ کاش وہ جنگل میں دیہاتیوں کے پاس ہوتے اور وہاں سے تمہاری خبریں معلوم کرتے رہتے، اور اگر یہ تمہارے درمیان ہوتے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے۔ ۲۰)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ ۹

(اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جبکہ تم پر فوجیں چڑھ آئیں تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسے لشکر بھیجے جو تم کو نظر نہیں آئے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھنے والا ہے۔ ۹)

یہاں سے رکوع ۳ کے آخر تک وہ آیات ہیں جو غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ کے ختم ہونے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ اس لیے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات کا ذکر فرمایا ہے اور ان دونوں جنگوں پر تبصرہ بھی فرمایا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ جنگ میں شریک مختلف گروہوں کے احوال و کوائف کا بھی ذکر فرمایا ہے اور ان پر تنقید بھی فرمائی ہے۔

تمہیدی کلمات کے بعد اللہ تعالیٰ کے احسانات کی یاددہانی

اس سورۃ کے پہلے رکوع میں تمہید کے طور پر کچھ ہدایات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ پیشِ نظر آیات درحقیقت انہیں ہدایات کو مؤکد اور واضح کرنے کے لیے نازل کی گئی ہیں۔ تمہیدی ہدایات میں زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر اور اس کا تقویٰ کردار کی اصل بنیاد ہے۔ اس کو جو تصورات محکم کرتے ہیں ان میں پہلی بات یہ ہے کہ علم و حکمت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے ادھر ادھر کی باتوں کا اثر قبول کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ پیروی صرف ان باتوں کی کی جائے جو وحیِ الٰہی کے ذریعے نازل کی جارہی ہیں کیونکہ یہی ایک ذریعہ ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ اس راستے میں یقیناً بہت سی دشواریاں پیش آئیں گی اور بہت سے مصائب سے واسطہ پڑے گا۔ ایسے حالات میں بھروسہ اور توکل صرف اللہ تعالیٰ ہی پر کرنا ہے کیونکہ وہی ایسا سہارا ہے جو کبھی شکست نہیں ہوتا۔ اس کے بعد پیشِ نظر آیات کو ان باتوں کی دلیل

Marfat.com

کے طور پر پیش فرمایا ہے کہ تم اندازہ کرو کہ مدینے میں تمہاری مجموعی افرادی قوت تین ہزار سے زیادہ نہیں۔ ان میں بھی منافقین کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ اسلحۂ جنگ ضرورت سے کم اور مالی حالات کسی بڑی جنگ کا بوجھ برداشت کرنے سے عاجز، کہ اچانک ایک بہت بڑا لشکر تم پر حملہ آور ہوتا ہے جن کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق بارہ ہزار ہے۔ اور اس لشکر کا ایک ایک فرد عرب کی حربی صلاحیت کا نمائندہ ہے۔ ان میں بدویانہ جرأت و بسالت کی فراوانی ہے۔ اور پھر اس کے پس منظر میں یہ شدید جذبہ بھی کارفرما ہے کہ مسلمانوں کی اس نوزائیدہ قوت نے عرب کی تمام قابلِ ذکر قوتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ یہود کے دو بڑے قبیلے مدینے سے نکال دیے گئے ہیں۔ مکہ جو عرب قوت کا مرکز ہے انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی قوت ان کے لیے ناقابلِ شکست حصار ہے جو تنہا ان کے بس کا روگ نہیں۔ اور ملک کے دیگر قبائل بھی مختلف مواقع پر اپنی کوششوں میں ناکامی کا سامنا کر چکے ہیں۔ چنانچہ اس احساس نے انہیں ایک متحدہ طاقت بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ صرف عام شبخون مارنے کی نیت سے نہیں آئے بلکہ اسلامی قوت کو فنا کرنے کے جذبے سے اٹھے ہیں۔ بنو نضیر کے تین قبائل اسی جذبے کے نمائندہ بن کر سب سے پہلے قریش کے پاس پہنچتے ہیں اور انہیں اونچ نیچ سمجھا کر ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پھر غطفان اور ہوازن کو بھی ہم خیال بنانے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح سے یہ تین قوتیں مدینے پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ مکہ معظمہ سے قریش ابوسفیان کی قیادت میں اپنے حلیفوں کو ساتھ لے کر چار ہزار کا لشکر لے کر نکلتے ہیں۔ غطفان اور ہوازن، عیینہ بن حصین بن بدر اور عامر بن طفیل کی زیرِ سرکردگی روانہ ہوتے ہیں۔ اور مدینہ منورہ پہنچ کر بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب بنو قریظہ کو بھی اس متحدہ محاذ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیتا ہے حالانکہ ان کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ امن و صلح کا معاہدہ تھا۔

آنحضرت ﷺ کو جب دشمنوں کی ان تیاریوں کی خبر ہوئی تو آپ ؐ نے حضرت سلمانِ فارسیؓ کے مشورے سے مسلمانوں کو مدینہ کی ان سمتوں میں خندق کھودنے کا حکم دیا جن سے حملہ کا خطرہ تھا۔ چنانچہ شہر کی شمالی اور مغربی سمت میں ساڑھے تین میل لمبی ایک خندق صرف چھ دن میں کھودی گئی۔ اور یہ کام نہایت سرگرمی کے ساتھ ان تین ہزار مجاہدین نے انجام دیا جو حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ اور خود آنحضرت ﷺ نے بھی بنفسِ نفیس اس کام میں حصہ لیا۔ خندق کا کام مکمل ہو جانے کے بعد آپ ؐ کوہِ سلع کو پشت پر رکھ کر تین ہزار مجاہدین کو ساتھ لے کر دفاع کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ ان تمام تیاریوں کے باوجود یہ بات ظاہر ہے کہ بظاہر اسباب مسلمانوں کے لیے اتنے بڑے حملے کو روکنا ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے اخلاص، وفاداری، جانثاری اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید سے جس طرح سے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور دشمن ناکام و نامراد واپس جانے پر مجبور ہوا پیشِ نظر آیات میں انہیں میں سے بعض باتوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی احسان کا ذکر فرمایا کہ تم اس وقت کو یاد کرو کہ جب تم پر ایسے لشکر حملہ آور ہوئے جو اپنی افرادی اور اسلحی قوت میں تم سے بدرجہا زیادہ تھے اور تم کسی طرح ان کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ لیکن جب تم نے محض اللہ تعالیٰ کی قدرت پر بھروسہ کرتے ہوئے خندق کھود کر دفاع کا فیصلہ کر لیا اور کئی دنوں تک پیٹ پر پتھر باندھ کر اور راتوں کو جاگ کر ان کا مقابلہ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے توکل کی قدر فرمائی اور ان پر ایسی طوفانی آندھی بھیجی جس نے ان کے خیموں کی چوبیں اور طنابیں اکھاڑ دیں۔ ان کی دیگیں الٹ گئیں، سواری کے جانور تتر بتر ہو گئے۔ تاریکی کا یہ عالم کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اور اس پر مزید کرم یہ فرمایا کہ اس آندھی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایسی فوجیں بھی بھیجیں جو مسلمانوں کو نظر نہیں آئیں۔ اس سے اشارہ فرشتوں کی فوجوں کی طرف ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کی طرح کافروں نے بھی ان کو نہ دیکھا ہو۔ ممکن ہے انہیں مختلف شکلوں میں وہ دکھائی دیے ہوں اور اس سے کفار نے یہ محسوس کیا ہو کہ مسلمانوں کو کمک پہنچ گئی ہے جس نے ان کی جمعیت میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔

Marfat.com

کافروں کے ساتھ چونکہ حرب وضرب کا موقع نہیں آیا اس لیے فرشتوں کو بھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئی ورنہ ممکن تھا کہ جنگِ بدر کی طرح وہ جنگ میں شرکت کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے ہمیشہ اپنے بندوں کو ڈھارس بندھاتا اور حوصلے میں اضافہ کرتا ہے۔ اور کفار کے دلوں میں ہراس پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ میدان میں مقابلے سے نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت کے مختلف طریقے ہیں۔ وہ چونکہ ہمیشہ اپنے بندوں کو بھی اور دشمنوں کو بھی دیکھتا ہے اس لیے حالات کے مطابق مسلمانوں کی مدد کرتا ہے اور کافروں کی ہزیمت کا سامان کرتا ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ⑩

(یاد کرو جب وہ تم پر آچڑھے تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی، جبکہ آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ ۱۰)

مشرقی ومغربی دونوں سمتوں سے حملہ اور اس کی شدت

مسلمان اچانک جس فوجی یلغار سے دوچار ہوئے تھے اس کی مزید وسعت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت کو یاد کرو جب وہ لشکر تم پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ تمہارے اوپر سے بھی آئے اور تمہارے نیچے سے بھی۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ انہوں نے تمہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ مدینہ کی مشرقی طرف بلند اور مغربی سمت نشیبی ہے۔ دشمن کا حملہ دونوں طرف سے تھا۔ قبیلہ غطفان اور ان کے حلیفوں کا حملہ مشرق کی طرف سے ہوا تھا۔ اور قریش اور ان کے حلیفوں کی فوجیں مغرب کی طرف سے حملہ آور ہوئی تھیں۔ اور باقی مدینہ کے اطراف پہاڑوں، باغات اور لاوے کی چٹانوں کی وجہ سے کسی فوجی حملے کے لیے سازگار نہ تھے۔ ان دو طرفوں سے حملہ کیا جاسکتا تھا اور دشمن دونوں طرفوں سے حملہ آور ہوا تھا۔ ان کی کثرتِ تعداد اور اسلحی قوت کو دیکھ کر تم نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی قوت کا مقابلہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اور پسپائی اختیار کرنا ایک مومن کی شان نہیں۔ لیکن قوت اور ہیبت کی وجہ سے پریشانی ایسی تھی کہ جس کو دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آنکھیں پتھرا گئی ہیں اور خوف اور دہشت کی وجہ سے ایسا لگتا تھا کہ کلیجے اچھل کر منہ کی طرف آنے لگے ہیں۔ یہ انتہائی پریشانی کی تعبیر ہے جو صرف عربی زبان ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی رائج ہے۔ اور مزید فرمایا کہ صورتحال کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں عجیب وغریب گمان کرنے لگے۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اس سے مراد منافقین کے گروہ ہیں۔ مسلمانوں کے دل کی کیفیت کا ذکر تو آگے چل کر آرہا ہے۔ وہ تمام تر پریشانی کے باوجود اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے بارے میں یکسو تھے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو ایمان کے رشتے میں منسلک تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ سب ایمان ویقین کے مدارج میں یکساں نہ تھے۔ مخلص مسلمانوں کو تو کسی طرح کی پریشانی نہ تھی لیکن کمزور ایمان رکھنے والے یقیناً اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار تھے۔ لیکن اس ناچیز کا گمان یہ ہے کہ یہاں جس گمان کا ذکر ہے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے وعدوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ہے۔ بعض لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف

Marfat.com

سے نصرت آنے میں دیر کیوں ہوگئی ہے۔ دشمن ہمارے سر پر پہنچ گیا ہے، اگر وہ خندق عبور کرنے میں کامیاب ہوگیا تو پھر ایک قیامت برپا ہوجائے گی۔ ایسے میں نصرت کا نہ آنا یا تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی دلیل ہے کہ ہم سے کوئی ایسی کوتاہی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوگیا ہے۔ اور یا ہمیں وہ دولتِ شہادت سے نوازنا چاہتا ہے۔ بہرحال ان کے گمانوں کا تعلق ضعفِ اعتقاد یا برگشتگی سے نہیں تھا بلکہ اس کا مطلب صرف یہ تھا جیسے قرآنِ کریم نے سابقہ امتوں میں سے کسی مخلص گروہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی چیخ اٹھے، متیٰ نصر اللہ ، اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا الا ان نصر اللہ قریب ۔ یہاں بھی معاملہ ایسا ہی تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مخلص بندوں کو آزمائش سے ضرور گزارتا ہے تاکہ وہ کندن بن جائیں۔ ان پر جو عظیم ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس کی ادائیگی میں کمی نہ ہونے پائے۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾

(اس وقت اہلِ ایمان امتحان میں ڈالے گئے اور بری طرح ہلا دیے گئے۔ ۱۱)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اسی قانون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تک وہ اپنے چاہنے والوں کی اچھی طرح آزمائش نہیں کرلیتا اس وقت تک اس کی طرف سے نصرت نہیں اترتی۔ اور یہ آزمائش اس لیے نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید نہیں جانتا بلکہ آزمائش سے مقصود کردار کو پختہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کے توکل کو دلوں میں راسخ کرنا ہوتا ہے۔ اور ویسے بھی جب بھی کوئی شخص یا گروہ اللہ تعالیٰ سے اپنی وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ ایک ایسی محبت کا دعویٰ ہے جس سے زیادہ بلند مرتبہ اور پاکیزہ محبت اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اور محبت ہمیشہ آزمائی جاتی ہے۔ ٹھیک کہا کسی نے:

محبت کے مقدر میں کہاں آرام اے ہمدم
کہیں شعلہ، کہیں بجلی، کہیں سیماب ہوتی ہے

مسلمان بھی اس آزمائش میں بری طرح جھنجھوڑ دیے گئے۔ ایک طرف ہر جانب سے دشمنوں کی یورش۔ دوسری طرف اپنی صفوں میں منافقین کا وجود۔ اور تیسری طرف بنوقریظہ کا بدعہدی اور غداری پہ تل جانا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ سامنے ایک ایسا عظیم دشمن ہے جس کی قوت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ اور پیچھے ایک دشمن بیٹھا ہے جو کسی وقت بھی پیٹھ میں خنجر گھونپ سکتا ہے۔ اور منافقین کی صورت میں شہر کے اندر ایسے مارِ آستین موجود ہیں جو کسی وقت بھی فضا کو زہرناک کرسکتے ہیں۔ لیکن مسلمان اس آزمائش میں اس طرح پورے اترے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نصرت کے لیے اپنا استحقاق ثابت کردیا۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾

(یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے کیے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ ۱۲)

Marfat.com

منافقین کی ریشہ دوانیاں

کفار کی متحدہ طاقت نے مسلمانوں پر یلغار کر کے جو انتہائی نازک صورتحال پیدا کر دی تھی جس کا شدید اثر مسلمانوں پر تھا اور مسلمان اس خطرے کا دفاع کرتے ہوئے بری طرح جھنجھوڑ دیے گئے تھے، اسی کیفیت کو مزید واضح کرتے ہوئے پریشانی کے اسباب میں سے ایک اور سبب کا ذکر فرمایا جا رہا ہے وہ یہ کہ جن فوجی قوتوں نے مدینے کا محاصرہ کر رکھا تھا وہ تو جیسا کچھ پریشانی کا سبب تھیں ظاہر ہے لیکن مزید ایک سبب یہ تھا کہ خود مسلمانوں کے اندر مدینہ کے لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی تھے جن کا تعلق اسلام کے ساتھ مخلصانہ نہ تھا۔ شہر پر چونکہ اسلام کی حکومت قائم ہو چکی تھی اس لیے ان منافقین کے لیے کھلے عام کوئی کارروائی کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے وہ مارے باندھے مسلمانوں کے ساتھ ہر مہم میں شریک ہوتے رہے۔ اب بھی وہ بظاہر خندق کے مورچوں میں بیٹھے شہر کا دفاع کر رہے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ محاصرہ طول پکڑتا جا رہا ہے اور بنو قریظہ نے بھی مسلمانوں سے کیا ہوا دفاعی عہد توڑ ڈالا ہے تو اب ان کی زبانیں کھلنے لگیں اور ان کے اندر کا بغض زبانوں پر آنے لگا۔ ان میں دو گروہ تھے ایک تو وہ گروہ تھا جو دشمنی کے جذبات تو نہیں رکھتا تھا لیکن اس کے اندر ضعفِ عزم و ارادہ کا مرض پایا جاتا تھا۔ انہوں نے بھی جب حالات میں انقلاب دیکھا تو ان کا کمزور ایمان مزید تزلزل کا شکار ہوا۔ ان کو قرآنِ کریم نے یہاں منافقین کے نام سے یاد کیا ہے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کینہ و حسد اور بغض و عناد بھی رکھتا تھا۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے دلوں میں مرض ہے۔ مراد اس سے حسد اور بغض ہے۔ انہوں نے دوسرے مسلمانوں میں حوصلے پست کرنے کے لیے کہنا شروع کر دیا کہ ہم سے وعدے تو قیصر و کسریٰ پر غلبے کے کیے جاتے تھے اور یہاں حال یہ ہے کہ گھر سے قضائے حاجت کے لیے نکلنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے جو وعدے کیے جا رہے تھے کہ تمہیں ایمان کے نتیجے میں دنیا و آخرت میں فلاں فلاں نعمتوں سے بہرہ ور کیا جائے گا وہ فریب سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ یہ صورتحال مخلص مسلمانوں کے لیے بیرونی دشمنوں سے کم تکلیف دہ نہ تھی۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾

(جبکہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں، پس تم لوٹ جاؤ، اور ان میں سے ایک گروہ نبی کریم (ﷺ) سے اجازت کا طلبگار تھا اور وہ کہتا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے۔ بس یہ لوگ بھاگنا چاہتے تھے۔ ۱۳)

منافقینِ اعراب کا رویہ

منافقین کی معاندانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرمایا ہے کہ ان ہی میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو دوسرے منافقین سے یہ کہتا تھا کہ بیرونی دشمنوں کے محاصرے اور اندرونی دشمن کی تائید سے جو صورتحال پیدا ہوئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو، اب مدینے کا دفاع تو ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اب تو اپنے بچاؤ کی فکر کرنی چاہیے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ محاذِ جنگ سے نکلنے کی کوشش کرو اور واپس اپنے گھروں

Marfat.com

میں پہنچ جاؤ۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ملفوف انداز میں یہ بات کہہ رہے ہوں کہ تم نے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اسے اتار پھینکو۔ اب اپنے آبائی مذہب کی طرف پلٹ جاؤ۔ اس سے یہ امکان پیدا ہوجائے گا کہ ہم مدینے پر حملہ آوروں کے انتقام سے بچ جائیں۔ کیونکہ جب انہیں معلوم ہوجائے گا کہ ہم دل سے ان کے خیر خواہ تھے تو وہ یقیناً ہم سے تعرض نہیں کریں گے۔

بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ منافقین کا یہ گروہ مدینے کے رہنے والے لوگوں میں سے نہ تھا، بلکہ ان کا تعلق مدینہ کے قرب و جوار کے دیہات سے تھا اور یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عام طور پر اعراب کہا جاتا ہے۔ ان میں ایک اچھی خاصی تعداد کٹر منافقین کی تھی جو اسلام کی سیاسی طاقت سے مرعوب ہوکر مسلمانوں ہونے کے مدعی تو بن بیٹھے تھے لیکن انہیں اصل دلچسپی صرف اپنے مفادات سے تھی۔ سورۃ الحجرات میں قرآنِ کریم نے ان ہی کا ذکر کیا ہے۔ یہ عموماً غزوات میں شرکت سے حیلے بہانے سے دور رہتے۔ اور اگر کبھی نمائش کے طور پر کسی جنگ میں شریک ہوتے بھی تو انہیں اسلام سے زیادہ اسلام کے دشمنوں سے رسم و راہ رکھنے کی فکر رہتی تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔ ان کا مدینے والوں کو اہلِ یثرب کہہ کر پکارنا اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ خود یثرب کے رہنے والے نہ تھے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ لیکن جو بات ہم نے پہلے عرض کی ہے کہ یہ لوگ بھی مدینے ہی کے عام منافقین سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی غلط نہیں۔ رہا ان کا اہلِ یثرب کہنا تو یہ درحقیقت ان کے بغض کا اظہار اور ان کی دوربینی کی علامت ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یثرب کو اللہ تعالیٰ کے رسول نے مدینہ بنایا ہے۔ جب یہاں دشمنوں کا غلبہ ہوجائے گا تو یہ مدینہ پھر یثرب ہوجائے گا۔ اس لیے آنے والے دنوں کی تصویر دکھاتے ہوئے انہوں نے اپنے منافق بھائیوں کو اہلِ یثرب کہہ کر پکارا۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ یہ بات صرف منافقین ہی سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے بھی کہتے ہوں کہ حالات کے تیور کو پہچانو، دشمنوں کی اس دَل بادل فوج کے مقابل میں تمہارے لیے ٹھہرنا ممکن نہیں۔ اس لیے اب مزید محاذ آرائی اپنے آپ کو تباہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ بہتر ہے کہ اپنے اس ارادے سے واپس آجاؤ۔ اور محاذِ جنگ چھوڑ کر اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ، اس طرح سے ہوسکتا ہے دشمن تمہارے ساتھ کچھ نرم معاملہ کرے۔

منافقین کا عذرِ لنگ

ان منافقین نے جب یہ دیکھا کہ بنوقریظہ نے عہد شکنی کی ہے اور ہمارے گھر چونکہ ان کی گڑھیوں کے قریب ہیں اور ہم نے انہیں کے اعتماد پر اپنے بچوں اور عورتوں کو ادھر بھیج رکھا ہے، اب اس نئی صورتحال میں ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہوگئے ہیں، تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے گھروں کے غیر محفوظ ہونے کا حوالہ دے کر اجازت طلب کرنا شروع کردی۔ حالانکہ پورے شہر کا دفاع نبی کریم ﷺ کی ذمہ داری تھی اور اس میں وہ گھر بھی شامل تھے جو یہود کے ہمسائے میں تھے۔ حضورؐ نے اس نئی صورتحال کے مطابق ان گھروں کی حفاظت کے لیے فوراً کچھ مخلص مسلمانوں کو مقرر کردیا تھا۔ اس لیے یہ ان کا عذر صحیح عذر نہ تھا بلکہ بھاگ نکلنے کا ایک بہانہ تھا۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ ان کے گھر غیر محفوظ نہیں ہیں، وہ صرف بھاگنے کی فکر میں ہیں تاکہ اپنے گھروں میں پہنچ کر ایک تو وہ اپنے تئیں خطرے سے محفوظ ہوجائیں گے اور دوسرا انہیں دشمنوں سے ساز باز کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔

Marfat.com

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿١٤﴾

(اور اگر شہر کے اطراف سے ان پر حملہ ہو جاتا اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے، اور اس میں بہت ہی کم توقف کرتے۔ ۱۴)

منافقین کے اندر کے روگ کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام سے ان کا رشتہ زبانی حد تک ہے یا محض ایک فریب ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر دشمن کہیں شہر کے اطراف میں سے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ ان لوگوں کی آمادگی اور ان کا استقبال دیکھ کر اندازہ کر لیتا کہ یہ مسلمانوں میں سے نہیں بلکہ ہمارے اپنے ہیں۔ اور پھر وہ ان سے کہتا کہ آؤ مدینے کی تباہی اور مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے تم ہمارے ساتھ تعاون کرو، لیکن تمہیں اس کے لیے ارتداد کا راستہ اختیار کرنا ہوگا، کیونکہ تم اب تک اسلام کے مدعی رہ چکے ہو۔ تو انہیں نیا لبادہ اوڑھنے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ یہی وہ چیز ہے جسے یہاں فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ فتنہ ہر اس کوشش کا نام ہے جس سے اسلام یا مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ اور اسلامی نظام کو تلپٹ کرنے کا موقع پیدا ہو جائے۔ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شرکت بھی اس میں داخل ہے اور ارتداد بھی اسی کا حصہ ہے۔ تو جن لوگوں کا رویہ یہ ہو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہیں اسلام سے کتنا لگاؤ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی کیا قیمت سمجھتے ہیں۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ﴿١٥﴾

(ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی پرسش ہونی ہے۔ ۱۵)

منافقین کی بدعہدی

جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا ہے تو وہ کلمہ پڑھ کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتے ہوئے دراصل یہ عہد کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی سربلندی کو ہر چیز سے عزیز سمجھوں گا۔ اور مجھے اس دین کی حفاظت کے لیے اگر میدانِ جہاد میں بھی جانا پڑا تو میں اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ لیکن ان منافقین کا حال تو یہ ہے کہ انہوں نے اس عہد کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ کے سامنے بار بار یہ عہد بھی کیا تھا کہ ہم سے جنگِ احد میں جو کمزوری سرزد ہوئی ہم اس کی تلافی کے لیے آئندہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ ہم نے مختلف غزوات میں مختلف حیلوں سے جس طرح شرکت سے گریز کیا ہم اس کا اعادہ اب کبھی نہیں کریں گے۔ اور ہم میدانِ جنگ سے کبھی پشت نہیں پھیریں گے۔ چنانچہ ان کے اسی عہد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان کا عہد تو میدانِ جنگ میں ہر حال میں ثابت قدم رہنے کا تھا، لیکن اب ان کا حال یہ ہے کہ مختلف بہانوں سے محاذِ جنگ سے فرار کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی گھروں کو غیر محفوظ ہونے کے بہانے سے اور کبھی کسی اور حوالے سے آنحضرت ﷺ کے سامنے عرضیاں پیش کر رہے ہیں کہ ہمیں جانے کی اجازت دی جائے۔ حالانکہ یہ پہلا موقع ہے جس میں یہ سرفروشی دکھا کر اپنے عہد کو سچا ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے بہانوں سے اجازت طلبی کے ذریعے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے عہد میں سچے نہیں تھے۔ آخر میں انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے ہر عہد کی پرسش ہوگی۔ یوں تو پرسش ہر عمل کی ہوگی اور ہر جرم کے بارے میں بازپرس ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کے بارے میں خاص طور پر پوچھ گچھ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

Marfat.com

قُلْ لَّنْ یَّنْفَعَکُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۶﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجیے، اگر تم موت یا قتل سے بھاگو گے تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوگا، اس وقت زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں ملے گا۔ ۱۶)

ادائے فرض سے پہلے فرار کبھی مفید نہیں ہوتا

اگر کوئی شخص دین کی طرف سے عائد ہونے والے فرض کی ادائیگی میں قتل یا کسی اور نقصان کا اندیشہ محسوس کرتا ہے اور وہ اس فرض کی ادائیگی سے بھاگ جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے بھاگ رہا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے بھاگ کر کہیں جا سکتا ہے۔ کیونکہ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ خطرات میں گھرے ہوئے آدمی کو بھی مقررہ وقت پر ہی موت آتی ہے، وقت سے پہلے نہیں آتی۔ اور جو شخص اپنی صحت اور حفاظت کے اعتبار سے بالکل محفوظ حالت میں ہے اس کی زندگی میں اضافہ نہیں ہوجاتا، اس کی بھی موت کا جب وقت آئے گا تو ہزاروں حفاظتوں کے باوجود بھی موت کا شکار ہوجائے گا۔ اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ میدانِ جنگ بہرحال موت کی جگہ ہے اس میں دشمن کا کوئی حملہ بھی موت کا سبب بن سکتا ہے۔ اور میرے لیے محفوظ راستہ ایک ہی ہے کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ اولاً تو اس طرح زندگی میں اضافہ نہیں ہوسکتا اور اگر نظر بظاہر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کی زندگی میں اضافہ ہوگیا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی زندگی سے وہ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا پائے گا۔ کیونکہ اس طرح کے لوگوں کی زندگی برکت سے محروم ہوجاتی ہے۔ وہ اس چند روزہ زندگی میں جتنے دن گزارتے ہیں بے برکت زندگی گزارتے ہیں۔ مقصد سے لاتعلقی اور ادائے فرض سے پہلوتہی بجائے خود ضمیر کا کانٹا بن جاتی ہے۔ ایسا شخص زندہ بھی رہتا ہے تو اسے زندگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ایسی سزا ہے جس سے کبھی رستگاری نہیں ہوتی۔

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُکُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِکُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِکُمْ رَحْمَةً ؕ وَلَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۱۷﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجیے! کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے، اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے، اور یہ لوگ اپنے لیے اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی کارساز پائیں گے نہ کوئی مددگار۔ ۱۷)

اللہ تعالیٰ کا اختیارِ کامل

انسان کی بھول یہ ہے کہ وہ نفع اور نقصان اور زندگی اور موت اپنی تدبیر کے تابع سمجھتا ہے۔ وہ زبان سے چاہے نہ کہے لیکن حقیقت میں اپنی تدبیر ہی کو حقیقی مؤثر جانتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ جہاد اور ادائے فرض میں پیدا ہونے والے خطرے کو موت کا سبب سمجھتا ہے۔ اور اس سے گریز اور فرار کو زندگی کی ضمانت قرار دیتا ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا کہ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ اگر تمہیں پروردگار کوئی گزند پہنچانا چاہے تو کون ہے جو تمہیں اس کی پکڑ سے بچا سکے گا۔ اسی طرح دشمن تمہیں نقصان پہنچانا چاہے لیکن اللہ

Marfat.com

تعالیٰ تم پر اپنے رحمت نازل کرنا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ وہ اس کی رحمت کو روک سکے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نفع ونقصان، خیر وشر، رحمت وقسمت سب اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔ تو پھر جب اللہ تعالیٰ کسی خطرے کو انگیخت کرنے کا حکم دے تو اس سے جی چرانا اور بچ نکلنے کی کوشش کرنا خدا سے بھاگنے کی حماقت ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ آخر میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جب خدا کی گرفت آتی ہے تو اس گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار۔ کوئی اس کا ہاتھ روکنے پر قادر نہیں۔ اور کوئی سعی وسفارش سے اس کے ارادوں کو بدلنے والا نہیں۔

اس آیت میں کلام کا ایک اسلوب ایسا استعمال ہوا ہے جو عربی ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ پہلے یہ ارشاد فرمایا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے کون بچا سکتا ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ یا وہ تم پر رحمت کرنا چاہے لیکن یہاں اس کا ایک حصہ محذوف ہے۔ تو پوری عبارت اس طرح ہوگی اَوْ یُمْسِکُ رَحْمَتَهٗ اِنْ اَرَادَ بِکُمْ رَحْمَةً ''یعنی اس کی رحمت کو کون روک سکتا ہے اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے۔'' پہلے جملے نے واضح کر دیا کہ دوسرے جملے کا ایک حصہ محذوف ہے۔ حذف کے اس اسلوب کی مثالیں عربی میں بہت ہیں، لیکن اردو میں یہ اسلوب موجود نہیں۔

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِیْنَ مِنْکُمْ وَالْقَآئِلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا
وَلَا یَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۸﴾

(اللہ تم میں سے روکنے والوں کو بھی جانتا ہے اور اپنے بھائیوں سے کہنے والوں کو بھی کہ آؤ ہماری طرف، وہ جنگ میں بہت کم حصہ لیتے ہیں۔ ۱۸)

منافقین کا ایک اور سازشی گروہ

منافقین میں جو سازشی عنصر تھا انہیں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے محاصرے کے دوران اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے جس طرح نفاق کا ثبوت دیا اس کی مثالیں تو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہیں لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ صرف فرائض میں کوتاہی کرنے والے ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے حتی الامکان دوسرے لوگوں کو بھی جنگ سے روکنے کی کوشش کی۔ اور جن لوگوں کی ڈیوٹیاں دوسرے مورچوں پر تھیں انہیں اپنے مورچوں پر آنے کی دعوت دیتے رہے تاکہ وہاں بیٹھ کر کھل کھیلیں اور مخلص مسلمانوں کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ چونکہ دفاعی لائن بہت طویل تھی اس لیے منافقین کے گریز وفرار کی وارداتوں پر عموماً پردہ پڑا رہتا تھا اور یہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کا طریق واردات ایک تو یہ تھا کہ یہ دوستی اور تعلقات کے حوالے سے لوگوں کو روکتے تھے اور ایک یہ تھا کہ سادہ دل مسلمانوں کو حالات کے نشیب و فراز بتا کر بددل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بظاہر مورچوں پر پہرہ بھی دیتے تھے لیکن یہ پہرہ محض دکھاوے کا تھا۔ حقیقت میں وہ دفاع میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ باتوں میں وقت گزارتے یا ادھر ادھر گھومتے رہتے۔

Marfat.com

اَشِحَّۃً عَلَیۡکُمۡ ۚۛ فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ رَاَیۡتَہُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ تَدُوۡرُ اَعۡیُنُہُمۡ کَالَّذِیۡ
یُغۡشٰی عَلَیۡہِ مِنَ الۡمَوۡتِ ۚ فَاِذَا ذَہَبَ الۡخَوۡفُ سَلَقُوۡکُمۡ بِاَلۡسِنَۃٍ حِدَادٍ اَشِحَّۃً عَلَی
الۡخَیۡرِ ؕ اُولٰٓئِکَ لَمۡ یُؤۡمِنُوۡا فَاَحۡبَطَ اللّٰہُ اَعۡمَالَہُمۡ ؕ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا ﴿۱۹﴾

(سخت بخیل ہیں تم پر، جب کوئی خطرہ پیش آجائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کی طرف ایسے دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں گھومتی ہیں جیسے ان پر موت کی غشی طاری ہو، پھر جب خطرہ ٹل جائے تو مالِ غنیمت کی حرص میں تم سے تیزی اور طراری سے باتیں کریں گے، یہ لوگ ایمان نہیں لائے تھے، سو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ ۱۹)

گزشتہ آیت کے آخر میں فرمایا کہ وہ لڑائی یا دفاع میں بہت کم حصہ لیتے ہیں۔ اس آیت کے شروع میں اس کی وجہ بیان فرمائی کہ ان کے برائے نام حصہ لینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی قسم کی قربانی دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ قربانی مال کی ہو یا جان کی ہر طرح کی قربانی کے معاملے میں نہایت بخیل واقع ہوئے ہیں۔ ان کا دفاعی جنگ میں چلے آنا محض ایک دکھاوے کی کارروائی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس عمل میں دکھاوا پیشِ نظر ہو اس میں کسی قربانی کا حوصلہ کہاں سے آسکتا ہے۔

ان کے اخلاص اور حوصلے کا عالم یہ ہے کہ اگر واقعی انہیں خطرے کا سامنا کرنا پڑے اور وہ محسوس کریں کہ اب شاید انہیں جان پر کھیلنا پڑے تو تم انہیں دیکھو گے کہ ان کی آنکھیں اس طرح گردش کرنے لگتی ہیں گویا ان پر موت کی غشی طاری ہونے لگی ہے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا صرف اس آدمی کا شیوہ ہے جو شہادت کے عزم سے گھر سے نکلتا ہے اور جس نے حیاتِ دنیا کو حیاتِ آخرت کے بدلے میں بیچ دیا ہو۔ محض نمائش کے لیے نکلنے والے معمولی خطرے کا سامنا بھی نہیں کر سکتے۔ تو منافقین جنگ کے خطرات کا سامنا کیسے کر سکتے ہیں۔

اور جب خطرہ ٹل جاتا ہے یعنی جنگ رک گئی یا جنگ میں اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی تو اب ان کی زبانوں کی تیزی طراری دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ وہ طلاقتِ لسانی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس جنگ میں کامیابی صرف ہماری جانفروشی کا نتیجہ ہے۔ یہ ہم ہی تھے جن کی وجہ سے دشمن کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوسکی۔ اور پھر مالِ غنیمت کی طلب میں ان کی چرب زبانی جوہر دکھانے لگتی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مالِ غنیمت سے حصہ لے سکیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مال کے معاملے میں بہت حریص واقع ہوئے ہیں۔ اور ویسے بھی اسلامی جنگوں میں شرکت منافقین کے لیے صرف مالِ غنیمت کے حصول کے لیے تھی۔ وہ اسلام کے لیے مخلص نہیں تھے تو جہاد میں شہادت کے لیے کیونکر شریک ہو سکتے تھے۔

یاد رہے کہ اَشِحَّۃً، شحیح کی جمع ہے۔ اس کے معنی بخیل کے بھی ہیں اور حریص کے بھی۔ پہلی آیت میں بخیل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور دوسری آیت میں الخیر کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حریص کے معنی میں ہے۔ یعنی مسلمانوں کی ہمدردی اور راہِ خدا میں تو وہ انتہائی بخیل واقع ہوئے ہیں۔ نہ ایک دمڑی خرچ کر سکتے ہیں اور نہ ایک قطرہ خون بہانے کو تیار ہیں، لیکن مالِ غنیمت کی محبت میں انتہائی حریص واقع ہوئے ہیں۔ اپنی زبان کی ساری قوت مالِ غنیمت کے زیادہ سے زیادہ حصول پر صرف کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ محض ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، حقیقت میں ایمان ان کے دلوں میں نہیں اترا۔ ایمان ہی کی قوت سے اخلاص پیدا ہوتا ہے اور اسی سے ہر طرح کی قربانی دینے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ لیکن نمائشی ایمان اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی کام نہیں آتا۔ ایسے ایمان کے ساتھ اگر کوئی نیک کام بھی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے حبط کر دیتے ہیں۔ ان کا کوئی صلہ آخرت میں ملنے والا نہیں۔ عمل وہی معتبر ہے جو حقیقی ایمان کے ساتھ کیا جائے۔

Marfat.com

ایک غلط فہمی کا ازالہ

وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًا یہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے کے منافقین میں اور اس جدید دور کے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ کوئی اچھا عمل کسی ارادے سے بھی سرزد ہو جائے وہ یقیناً آخرت میں بہتر سے بہتر جزاء کا سزاوار ٹھہرے گا۔ کیونکہ ان کے نزدیک اصل حیثیت عمل کی ہے کہ وہ اچھا ہے یا برا، مفید ہے یا غیر مفید، اس کا کرنے والا مومن ہے یا کافر، مخلص ہے یا غیر مخلص، اس سے کوئی بحث نہیں۔ لیکن قرآن وسنت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً عمل کی بھی ایک حیثیت ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کی شکل وصورت نیکی کی ہے یا برائی کی، وہ لوگوں کی بھلائی کا سبب بنے گا یا تکلیف دہی کا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اتنی ہی اہمیت اس بات کی بھی ہے کہ عمل کو کس ارادے اور نیت سے کیا گیا ہے۔ اگر بہتر سے بہتر عمل محض دکھاوے یا حصولِ شہرت کے لیے کیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول تو کیا، منہ پردے مارا جائے گا۔ اور اگر عمل کرنے والا دل میں ایمان نہیں رکھتا تو اس کا عمل چاہے کتنا عظیم کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ صرف قابلِ قبول نہیں بلکہ اسے حبط کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان ہے۔ کیونکہ اس کی ذات اتنی عظیم ہے کہ وہ کسی بڑے سے بڑے عمل سے ماورا ہے۔ عمل کرنے والے کے اعمال اس کی اپنی ضرورت ہیں، اللہ تعالیٰ کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی کی رضا کی ضرورت نہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت رحیم وکریم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ غیور وغنی بھی ہے۔ اس کے لیے لوگوں کے ایسے اعمال کو پامال کر دینا ذرا بھی گراں نہیں، جس میں ایمان اور اخلاص نہ ہو۔ بلکہ پیشِ نظر آیات سے تو عجیب صورتحال سامنے آتی ہے وہ یہ کہ جن لوگوں کے ایمان سے یہاں انکار کیا گیا ہے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے۔ ہمیشہ آپ ؐ کی رسالت کا اعتراف کیا، آپ ؐ کے ساتھ نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، زکوتیں دیں اور جہاد تک میں شرکت کی لیکن ان کے یہ تمام اعمال چونکہ غیرتِ دینی سے محروم رہے اور اسلام پر جب کڑی آزمائش کا وقت آیا تو انہوں نے دوغلے پن کا ثبوت دیا اور دین کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دی۔ فکر اسلام کی نہ رہی بلکہ صرف اپنی ذات، اپنے مال اور اپنے عہدہ ومنصب کی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جتنے انہوں نے نیک اعمال کیے تھے سب کو مٹا ڈالا۔

امتِ مسلمہ کے لیے یہ آیت ایک لمحہ فکر یہ ہے کہ ہم آج جس صورتحال سے دوچار ہیں اس میں اسلام سے بڑھ کر کوئی مسکین اور لاوارث نہیں۔ ایک عظیم امت کی عظیم اکثریت بالخصوص ان کے حکمران صرف اپنے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسلامی مفادات پر قیامت گزر جائے، انہیں رتی بھر پرواہ نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اطمینان یہ ہے کہ ہم سے بہتر مسلمان اور مومن کون ہے۔ ہم یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں نجات کے مستحق ہیں۔ ہمیں اس آیت کو پڑھتے ہوئے سو دفعہ سوچنا چاہیے کہ کیا ہمارا یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دے رہا ہے یا ہم اپنی نجات کی فکر کر رہے ہیں۔

یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ یَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ؕ وَلَوْ كَانُوْا فِیْكُمْ مَّا قٰتَلُوْۤا اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۲۰﴾

Marfat.com

(یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں، اگر وہ گروہ پھر آ جائیں تو ان کی تمنا یہ ہوگی کہ کاش وہ جنگل میں دیہاتیوں کے پاس ہوتے اور وہاں سے تمہاری خبریں معلوم کرتے رہتے، اور اگر یہ تمہارے درمیان ہوتے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے۔ ۲۰)

منافقین کی بزدلی کے ذکر کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی بزدلی کا عالم تو یہ ہے کہ دشمنوں کے جو گروہ بہت بڑی تعداد میں مدینہ پر حملہ آور ہوئے وہ ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اپنے زخم چاٹتے ہوئے پسپا ہو گئے۔ اور اب تک وہ اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن، یہ لوگ ابھی تک سمجھ رہے ہیں کہ وہ لوگ گئے نہیں، یہیں کہیں قریب ہی چھپ کے بیٹھے ہیں اور کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اب ان کی آرزو یہ ہے کہ اگر وہ دوبارہ مدینہ پر حملہ آور ہوں تو ہم مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت نہیں کریں گے بلکہ مدینہ سے نکل بھاگیں گے اور صحرا میں بدوؤں کے درمیان جا بسیرا کریں گے۔ البتہ مسلمانوں کے بارے میں وہیں بیٹھ کر معلوم کرتے رہیں گے کہ وہ کس حال میں ہیں۔ اور یہ معلوم کرنا مسلمانوں کی ہمدردی میں نہیں ہوگا بلکہ اس خیال سے ہوگا کہ کب مدینے کی قوت کو زوال آتا ہے اور ہم دوبارہ مدینے میں اپنی پہلی زندگی گزارنے کا موقع پاتے ہیں۔

آخر میں مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ ایسا کر گزریں تو اس میں آپ لوگوں کا کوئی نقصان نہیں، بلکہ اچھا ہوگا کہ آپ کو ایسے لوگوں سے نجات مل جائے گی جو کسی وقت بھی مارِ آستین ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور ان کا چلا جانا آپ کے لیے کسی نقصان کا باعث اس لیے بھی نہیں ہوگا کیونکہ یہ لوگ ایثار پیشہ نہیں بلکہ اگر یہ لوگ آپ میں رہیں گے بھی تو دشمن سے لڑائی میں یہ بہت کم آپ کا ساتھ دیں گے۔ ان کی کوشش یہ ہوگی کہ اس سے بچے رہیں۔ صرف اپنی حیثیتِ عرفی کو بچانے کے لیے آپ کی صفوں میں کھڑے رہیں گے لیکن قربانی و ایثار ان کا شیوہ نہیں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ
كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا رَاَ
الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ
صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ
قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِّيَجْزِيَ

Marfat.com

اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ
اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴿۲۴﴾ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۚ﴿۲۵﴾ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ
الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا
تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ﴿۲۶﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَ
اَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾ ع

رکوع: ۳۔ (اور تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور یومِ آخرت کا امیدوار ہو، اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرے۔ ۲۱) اور جب اہلِ ایمان نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا اور اس چیز نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی میں اور اضافہ کر دیا۔ ۲۲) ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا، ان میں سے بعض تو اپنا عہد پورا کر چکے اور بعض ان میں سے منتظر ہیں اور انہوں نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ہے۔ ۲۳) تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزاء دے، اور منافقوں کو اگر چاہے تو سزا دے، اور اگر چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے، بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔ ۲۴) اللہ نے کافروں کو لوٹا دیا ان کے غصہ کے ساتھ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اور اللہ قوی اور غالب ہے۔ ۲۵) اور اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کافروں کی مدد کی تھی انہیں اللہ تعالیٰ ان کے قلعوں سے اتار لایا اور ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ تم ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر رہے ہو اور ایک گروہ کو قید کر رہے ہو۔ ۲۶) اور اللہ نے ان کی زمین، ان کے گھروں اور ان کے اموال کا تمہیں وارث بنا دیا، اور اس سرزمین کا بھی تمہیں وارث بنا دیا جس پر تمہارے پاؤں ابھی نہیں پہنچے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۷)

Marfat.com

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ
يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾

(اور تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور یومِ آخرت کا امیدوار ہو، اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرے۔ ۲۱)

عزیمت کے لیے نمونہ اور اس راستے پر چلنے والوں کی صفات

گزشتہ آیات میں پروردگار نے منافقین اور ایمان میں کمزور مسلمانوں پر تنقید کرتے ہوئے ان کے نفاق، ان کی مفاد پرستی، دین پر اپنی ذات، اپنے بچوں اور اپنے مفادات کو ترجیح دینے اور حق و باطل کے معرکے میں بزدلی اور کم ہمتی کا مظاہرہ کرنے کو نمایاں کیا ہے۔ اب انہیں مزید غیرت دلاتے ہوئے اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم جب مختلف حوالوں سے جنگِ احزاب کے موقع پر مفاد پرستی اور عافیت کوشی کا ثبوت دے رہے تھے اور تم سمجھتے تھے کہ اب اپنے بچاؤ کی فکر کے سوا بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ لیکن تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ جس رسول پر تم ایمان کے مدعی ہو وہ تمہارے اندر موجود ہے۔ تم اس کے اتباع کا دعویٰ بھی رکھتے ہو۔ لیکن تم نے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا کہ ایسے خطرناک موقع پر اس رسول کا رویہ کیا ہے جبکہ تم اپنے آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ جنگ کے ہولناک موقعوں پر ایک لمحہ کے لیے بھی محاذِ جنگ سے غائب نہیں ہوا۔ اس نے ہر مشقت اور مشکل میں تمہارا ساتھ دیا۔ بلکہ جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو اس نے دوسروں سے بڑھ کر اس میں حصہ لیا۔ اور کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جس کا مطالبہ آپ نے لوگوں سے کیا ہو اور خود اس میں شریک نہ رہے ہوں۔ آپ نے خندق کی کھدائی میں بنفسِ نفیس حصہ لیا۔ دوسروں نے پیٹ پر ایک پتھر باندھا تو آپ نے دو پتھر باندھے۔ دوسروں کے بچے جس خطرناک صورتحال سے دوچار رہے آپ کے اہل و عیال بھی اس کا حصہ بنے رہے۔ غرضیکہ قربانی و ایثار کا کوئی موقع ایسا نہ تھا جس میں وہ دوسروں سے آگے نہ رہے ہوں۔ تم اگر واقعی ان پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے اتباع کا حقیقی جذبہ تم میں موجود تھا تو تمہیں نمونہ انہیں بنانا چاہیے تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم سے جس کمزوری کا صدور ہوا ہے یہ کوئی وقتی کمزوری نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کے راستے اور معرکہ حق و باطل میں جان کا نذرانہ پیش کرنا اور ثابت قدمی دکھانا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور آخرت کے دن کی حاضری کی امید رکھتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے پیشِ نظر صرف وقتی مفاد اور دنیا ہی کی فلاح و بقاء ہو اور آخرت اور اس میں ملنے والے اجر و ثواب پر یقین نہ ہو ان کے لیے آنحضرت ﷺ کا اسوہ قابلِ تقلید نہیں ہوسکتا۔ منافقین نے اگر کمزوری دکھائی ہے تو اس کا سبب کوئی وقتی مصلحت نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں۔ اور نہ یہ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے والے لوگ ہیں۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ
وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

(اور جب اہلِ ایمان نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا اور اس چیز نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی میں اور اضافہ کر دیا۔ ۲۲)

Marfat.com

مخلص مومنوں کا رویہ

رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب اللہ تعالیٰ صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل کی طرف توجہ دلا رہا ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل ہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے رسول کے اسوہ کی صحیح تعبیر اور حقیقی ترجمانی ہے۔ اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جن دلوں میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی امید اور آخرت کا یقین ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت واتباع کا سچا جذبہ رکھتے ہیں ان کا طرزِ عمل وہ ہوتا ہے جس کا اظہار صحابہ کے طرزِ عمل سے ہو رہا ہے۔ اور جو صرف ایمان کو وقتی مصلحت کے تابع اور زبان کا جمع خرچ سمجھتے ہیں ان کا طرزِ عمل وہ ہوتا ہے جو اس سے پہلے آیت بارہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ منافقین نے جب دشمنوں کے لشکرِ جرار کو دیکھا اور ان کے محاصرے کی شدت دیکھی اور حالات کے تیور دیکھے تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول نے تو ہم سے وعدے فتح ونصرت اور غلبۂ اسلام کے کیے تھے اور ہمیں قیصر وکسریٰ پر حکومت کے خواب دکھائے تھے، جبکہ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑے ہیں اور ہم رفع حاجت کے لیے بھی باہر نہیں نکل سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وعدے ایک فریب تھے۔ لیکن صحابہ کرامؓ نے جب ان فوجوں کو دیکھا تو وہ دیکھتے ہی پکار اٹھے کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کی خبر ہمیں اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کے رسول نے دی تھی۔ اس میں اشارہ درحقیقت ان آیات کی طرف ہے جن میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں سے تم اس وقت بہرہ ور ہو سکو گے جب نہایت صبر آزما امتحانوں سے کامیابی سے گزر کر اپنا استحقاق ثابت کر دو گے۔ اس کا ذکر تو قرآن کریم نے متعدد مواقع پر کیا ہے لیکن ہم صرف ایک ہی حوالے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں اس طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہی نہیں جس طرح کے حالات سے ان لوگوں کو سابقہ پیش آیا جو تم سے پہلے گزرے، ان کو فقر و بیماری کے مصائب پہنچے۔ اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی! آگاہ، کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔ (البقرۃ۔۲۱۴)

منافقین نے آنحضرت ﷺ کی زبانِ مبارک سے جو غلبۂ اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و کامیابی کے وعدے سنے انہوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ ہمیں اب بنی اسرائیل کی طرح کچھ کرنا نہیں پڑے گا بلکہ جو کچھ بھی ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کے تحت معجزانہ طور پر ظہور پذیر ہوتا رہے گا۔ لیکن جب انہوں نے دشمنوں کا لشکرِ جرار دیکھا کہ اس نے مدینے کا محاصرہ کر لیا ہے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ اب تو اسلام اور مسلمانوں کی کشتی ڈوبے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور جو کچھ ہم سے وعدے کیے گئے تھے وہ سب فریب ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن مخلص مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو اس آئینے میں دیکھا جس کا ذکر ابھی سورۃ البقرۃ کی ایک آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے

Marfat.com

درحقیقت اس بات کے ساتھ مشروط ہیں کہ مسلمان انتہائی صبر آزما آزمائشوں سے کس صبر اور استقلال کے ساتھ گزرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر کس قدر بھروسہ کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب ان بیشمار دشمنوں کو دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آزمانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب ہماری کامیابیوں کا راستہ ان آزمائشوں سے کامیابی سے گزرنے پر منحصر ہے۔ ہماری تھوڑی سی کمزوری ہمارے مستقبل کو مخدوش بنا دے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر صبر و استقامت کامیابیوں کا راستہ کھول دے گی۔ چنانچہ ان لشکروں کو دیکھ کر پریشان ہونے کی بجائے ان کے ایمان اور تسلیم میں اور اضافہ ہوگیا۔ جس طرح سونا بھٹی میں چڑھ کر کندن بن جاتا ہے اسی طرح مسلمان کا ایمان بھی آزمائشوں کی بھٹی میں اور جلا پاتا اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾

(ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا، ان میں سے بعض تو اپنا عہد پورا کر چکے اور بعض ان میں سے منتظر ہیں اور انہوں نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ہے۔ ۲۳) تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزاء دے، اور منافقوں کو اگر چاہے تو سزا دے، اور اگر چاہے تو ان کی توبہ قبول کرلے، بےشک اللہ غفور و رحیم ہے۔ ۲۴)

نَحْب، عہد و پیمان اور نذر کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ امام بخاری کے نزدیک یہاں عہد کے معنی میں آیا ہے۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مردانِ خاص کا طرزِ عمل

گزشتہ آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ مسلمان راہِ حق میں پیش آنے والے بڑے سے بڑے واقعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش سمجھتے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ اس سے متاثر ہو کر کمزوری دکھائیں وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامیابی و کامرانی کا ذریعہ سمجھ کر اس کا زیادہ سے زیادہ حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ چیز ان کے ایمان و تسلیم میں اضافے کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ یہ کیفیت یوں تو تمام صاحب ایمان لوگوں کی ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانوں کا بہتر سے بہتر گروہ بھی بلند صفات میں یکساں نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان مسلمانوں میں بھی اپنی تمام تر اعلیٰ صفات کے باوجود کچھ نمونے کے لوگ ایسے ہیں جنہیں رجال کہہ کر ان کے بلند مرتبہ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مراد اس سے مردانِ خاص ہیں، کہ ان کی جرأت و بسالت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو سچا ثابت کر دکھایا۔ اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اس کی صداقت و حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر گئے اور اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا عہد سچا ثابت کر دیا۔ اور جن لوگوں کو ابھی تک جان کا نذرانہ پیش کرنے کا موقع نہیں ملا وہ اس کے منتظر ہیں کہ کب ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں سر کٹوا کر اپنے کندھوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ لیکن اس انتظار کی کیفیت میں ان کے ایفائے عہد کے جذبے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

Marfat.com

اگلی آیت میں فرمایا کہ لوگ نہ جانے احزاب کے اس حملے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے شاید اہلِ عرب کی دشمنی کا ایک بہت بڑا اظہار سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ طوفان اس لیے اٹھایا تا کہ راست بازوں اور منافقوں کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی بن جائے۔ جو لوگ راست بازی کا ثبوت دیتے ہوئے جان پر کھیل جائیں اور یا جان ہاتھ پر رکھے انتظار میں کھڑے ہوں انہیں ان کی راست بازی کا صلہ دیا جائے۔ اور منافق اگر اپنی غلطیوں کو محسوس کر کے توبہ کی طرف آ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ
وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۲۵

(اللہ نے کافروں کو لوٹا دیا ان کے غصہ کے ساتھ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اور اللہ قوی اور غالب ہے۔ ۲۵)

مسلمانوں کے ایمان واستقامت کا انعام

مسلمانوں کے مستحکم ایمان، اتباعِ رسول، راہِ حق میں جانثاری اور فداکاری اور توکل علی اللہ کا صلہ اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ دشمن کا لشکرِ عظیم جو مختلف احزاب پر مشتمل تھا اور جو نہایت ناپاک ارادوں کے ساتھ غیظ و غضب میں جلتا ہوا حملہ آور ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے بے نیل و مرام غصے کی ہی حالت میں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے مذموم ارادوں میں سے کسی ارادے کو بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ وہ لوگ جتنی بڑی تعداد میں آئے تھے اور اسلحہ کی جو قوت ان کے پاس تھی اس کے پیشِ نظر انہیں ایک فیصد بھی امید نہ تھی کہ وہ ناکام لوٹیں گے۔ اپنی کامیابی کے یقین میں نہ جانے مدینہ اور اہلِ مدینہ کے ساتھ وہ کس طرح کا سلوک کرنے کا عزم لے کر آئے تھے۔ اور کیسے کیسے انہوں نے منصوبے باندھے ہوں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا اور وہ اپنے زخم چاٹتے ہوئے ذلت کی تصویر بنے واپس جانے پر مجبور ہو گئے۔ اور مزید احسان اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ دشمنوں کے دفاع کے لیے مسلمانوں کو کوئی لڑائی نہیں لڑنی پڑی، بلکہ لڑائی میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے کافی ہو گیا۔ اس نے اپنی بادِ تند اور اپنے ملائکہ کی افواج قاہرہ کے ذریعہ سے دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیے۔ ملائکہ نے ان کے دلوں میں خوف اور رعب پیدا کیا۔ اور بادِ تند نے ان کے خیمے اکھاڑ دیے اور اس طرح ان کو جھنجھوڑا کہ ہر شخص نے اپنے سر پر عذاب کی بجلی کوندتی ہوئی محسوس کی اور وہ پاؤں سر پر رکھ کر بھاگا۔

آخر میں فرمایا کہ دشمن کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جس طرح سے مسلمانوں کی حفاظت کی گئی، یہ صرف اس لیے ہوا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نہایت قوت والا اور نہایت غالب ہے۔ اس کے لیے بڑی سے بڑی طاقت کو فنا کر دینا کوئی مشکل نہیں۔ چھوٹی جماعتوں اور کمزوروں کو غالب کر دینا اس کی قدرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اور اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جب اللہ والے اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور دین کے دشمنوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ وہ عناصرِ کائنات اور اپنے ملائکہ کو ان کے ہمرکاب کر دیتا ہے۔

Marfat.com

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ
وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿٢٦﴾

(اور اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کافروں کی مدد کی تھی انہیں اللہ تعالیٰ ان کے قلعوں سے اتار لایا اور ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ تم ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر رہے ہو اور ایک گروہ کو قید کر رہے ہو۔ ۲۶)

بنو قریظہ کی عہد شکنی اور اس کا انجام

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب سے مراد بنو قریظہ ہیں۔ ہم اس سے پہلے اس سورۃ کے تعارف میں واضح کر چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس قبیلے کا امن و صلاح کا معاہدہ تھا۔ اور اس میں یہ بات شامل تھی کہ اگر باہر سے کوئی حملہ آور مدینے پر حملہ کرے گا تو یہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ جب عرب کی متحدہ قوت نے مسلمانوں کو مٹانے کے لیے مدینہ پر حملہ کیا تو معاہدے کی وجہ سے بنو قریظہ پر یہ پابندی تھی کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں یا کم از کم دشمن کی مدد نہ کریں اور ان کے سابقہ رویہ کی وجہ سے مسلمانوں کو کسی حد تک اعتماد بھی تھا۔ لیکن جب بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب بنو قریظہ کے محلے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے ملا اور اسے حملہ آوروں کا ساتھ دینے کی ترغیب دی۔ شروع میں بنو قریظہ کے سردار نے معاہدہ کا حوالہ دے کر اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب اس نے اسے سمجھایا کہ تمہارے لیے یہ نادر موقع ہے اگر تم نے اسے کھو دیا تو ہمیشہ پچھتاؤ گے۔ میں سارے عرب کو اکٹھا کر کے مدینے پر چڑھا لایا ہوں۔ مختلف قبائل میں سے کسی قبیلے میں یہ طاقت نہیں کہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ کر سکے۔ یہ عرب بھر کی اجتماعی قوت روز روز جمع نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک فیصلہ کن قوت ہے جس کے سامنے مسلمانوں کا بس نہیں چلے گا۔ تم اگر آج عرب کی اجتماعی قوت کا ساتھ دو گے تو مسلمانوں کو جڑ پیڑ سے اکھاڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہودی ذہن نفع نقصان کے مقابلے میں اخلاق کو بھول گیا اور سیاسی مفادات اس پر غالب آئے تو اس نے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ توڑ ڈالا۔ اس خبر نے جہاں حملہ آوروں کو نہایت اطمینان کا موقع دیا وہیں مسلمانوں کے لیے پریشانی میں انتہاء درجے کا اضافہ کر دیا۔ کیونکہ ان کے قلعے اور گڑھیاں مدینے کے بالکل قریب تھے۔ اور لڑنے والے افراد کی بھی ان کے پاس کافی تعداد تھی۔ مسلمانوں کو پشت سے ان کا حملہ بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے یہ آزمائش بہت ہی صبر آزما بن گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی بروقت مدد فرمائی اور تائید غیبی نے جس طرح تمام حملہ آوروں کے پاؤں اکھاڑ دیے، اسی طرح بنو قریظہ کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ چنانچہ جس روز مسلمان خندق سے اتر کر گھروں میں داخل ہوئے، ظہر سے پہلے آنحضرت ﷺ حضرت ام سلمہؓ کے مکان میں غسل فرما رہے تھے کہ جب حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے دیکھا کہ ان کا چہرہ غبار سے اٹا ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ آپؐ نے جنگ کے ہتھیار اتار دیے ہیں لیکن ہم نے نہیں اتارے۔ میں اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر آیا ہوں کہ آپ مسلمانوں کو فوراً بنو قریظہ کا محاصرہ کرنے کا حکم دیں۔ یہ محاصرہ تقریباً پچیس دن تک جاری رہا۔ بالآخر انہوں نے مرعوب ہو کر حضرت سعد بن معاذ کو اپنا حکم مان لیا کہ وہ جو فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا۔ حضرت سعدؓ تشریف لائے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے تمام قابلِ جنگ افراد کو قتل کر دیا جائے اور ان کے بچوں اور عورتوں کو لونڈیاں اور غلام بنا لیا جائے، اور ان کی

Marfat.com

زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کردی جائیں۔ یہ فیصلہ عرب روایات کے بھی مطابق تھا اور تورات کی تعلیمات کے بھی۔ تورات کی کتاب استثناء میں آج بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ فوراً اس فیصلے پر عمل کیا گیا۔ ان میں سے ہر بالغ شخص کو قتل کر دیا گیا اور نابالغ لڑکوں کو غلام بنالیا گیا، اور عورتیں لونڈیاں بنالی گئیں۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ جو کل تک قلعوں اور گڑھیوں کے مالک تھے اور اپنے باغات اور کاروبار پر نازاں تھے اور اپنے مضبوط دفاعی حصارات کی وجہ سے کسی کو پلے نہیں باندھتے تھے، آج محض اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے انہیں اپنے قلعوں سے نکلنا پڑا اور اپنے آپ کو اہل وعیال سمیت مسلمانوں کے حوالے کرنا پڑا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب ان کے دلوں میں ڈالا کہ انہوں نے حضرت سعدؓ کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور ان کو چوں کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢٧﴾

(اور اللہ نے ان کی زمین، ان کے گھروں اور ان کے اموال کا تمہیں وارث بنا دیا، اور اس سرزمین کا بھی تمہیں وارث بنادیا جس پر تمہارے پاؤں ابھی نہیں پہنچے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۷)

بنوقریظہ کے نکلنے سے ان کا پورا علاقہ ان کے تمام قلعے اور گڑھیاں، ان کے مکانات اور حصارات، ان کے باغات اور ان کے ہر قسم کے اموال واثاثات اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے قبضے میں دے دیے۔

مسلمانوں کو شاندار مستقبل کی بشارت

وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ...... یہ مسلمانوں کے نہایت شاندار مستقبل کی بشارت ہے کہ بنوقریظہ اور اس سے پہلے بنونضیر اور بنوقینقاع کے علاقے جس طرح تمہارے قبضے میں آئے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی زمینوں پر بھی قبضہ عطا کرنے والا ہے جن زمینوں کو تم نے ابھی تک پامال نہیں کیا یعنی جہاں تمہارے قدم ابھی تک نہیں پہنچے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ علاقے تمہارے لیے مقدر کر دیے ہیں۔ اس وقت یہ بات مسلمانوں کے لیے تو ناقابلِ یقین نہ تھی لیکن عام ذہن اس کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ تین ہزار پر مشتمل ایک گروہ جو بے سروسامانی کی زندگی گزار رہا ہے وہ اتنا طاقتور کیسے ہو جائے گا کہ چند مہینوں کے بعد خیبر اس کے زیرنگیں ہوگا، پھر مکہ، پھر حنین کی وادیاں اور پھر چند ہی سالوں میں پورے عرب پر اس کا پرچم لہرا رہا ہوگا۔ اور بہت عرصہ نہیں گزرے گا اس کے نام لیوا قیصر وکسریٰ پر حکومت کریں گے لیکن اس بشارت میں یہ سب کچھ شامل تھا اور تاریخ نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿٢٨﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا

Marfat.com

عَظِيمًا ﴿٢٩﴾ يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ
يُضَٰعَفْ لَهَا ٱلْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرًا ﴿٣٠﴾
وَمَن يَقْنُتْ مِنكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتَعْمَلْ صَٰلِحًا نُّؤْتِهَآ
أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾ يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِيِّ لَسْتُنَّ
كَأَحَدٍ مِّنَ ٱلنِّسَآءِ ۚ إِنِ ٱتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِٱلْقَوْلِ فَيَطْمَعَ
ٱلَّذِى فِى قَلْبِهِۦ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٣٢﴾ وَقَرْنَ فِى
بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ ٱلْجَٰهِلِيَّةِ ٱلْأُولَىٰ ۖ وَأَقِمْنَ
ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتِينَ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَطِعْنَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ
ٱللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ ٱلرِّجْسَ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ
تَطْهِيرًا ﴿٣٣﴾ وَٱذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِى بُيُوتِكُنَّ مِنْ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ وَٱلْحِكْمَةِ ۚ
إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ﴿٣٤﴾

رکوع: ۴۔ (اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ ۲۸) اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو اللہ نے تم میں سے خوبی سے نباہ کرنے والیوں کے لیے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ ۲۹) اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کرے گی تو اسے دہرا عذاب دیا جائے گا، اور یہ بات اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ ۳۰) اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کریں گی اور نیک عمل کریں گی ہم ان کو دہرا اجر دیں گے اور ہم نے ان کے لیے رزقِ کریم مہیا کر رکھا ہے۔ ۳۱) اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو، اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو دبی زبان میں بات نہ کرو، کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ کسی طمعِ خام میں مبتلا ہو جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ ۳۲) اور

Marfat.com

اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سج دھج نہ دکھاتی پھرو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتی رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اے اہلِ بیتِ نبی تم سے آلودگی کو دور کردے اور تمہیں اچھی طرح پاک کردے۔ ۳۳) یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں، بے شک اللہ نہایت ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ ۳۴)

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْکُنَّ وَاُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾

(اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کردوں۔ ۲۸) اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو اللہ نے تم میں سے خوبی سے نباہ کرنے والیوں کے لیے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ ۲۹)

آیات کا پس منظر

انسان اپنے علم و فضل، حُسنِ اخلاق، پختگی کردار اور زہد و قناعت میں کتنا بھی بلند کیوں نہ ہو کبھی نہ کبھی دل میں یہ خیال آئے بغیر نہیں رہتا کہ اگر حلال طریقے سے اللہ تعالیٰ سہولت کے وسائل عطا کردے اور زندگی میں آسانی کے امکانات پیدا ہوں تو اس سے فائدہ اٹھانے میں کیا حرج ہے۔ دو وقت پیٹ بھر کے کھانا اور کھانے میں کسی حد تک لطف و لذت کو ملحوظ رکھنا اور پہننے اوڑھنے میں مناسب کپڑوں کی خواہش، یہ ایسے داعیات ہیں جو انسان کی فطرت کا تقاضا ہیں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے گھر میں جس طرح زندگی بسر ہو رہی تھی اس کا معمول احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو وقت کا کھانا پابندی کے ساتھ ازواجِ مطہرات کو نہیں ملتا تھا۔ ایک وقت اگر کھانے کو ملتا تو دوسرے وقت فاقہ ہوتا۔ سہولت اور آرام کی کوئی چیز میسر نہ تھی۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لحہ فرائضِ نبوت کی ادائیگی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اور نبوت کی ذمہ داری ایسی تھی کہ جس نے آپؐ کے اوقات اور آپؐ کے وسائل کو پوری طرح نچوڑ لیا تھا۔ اس حال میں نہایت زاہدانہ زندگی آپؐ بھی گزار رہے تھے اور یہی آپ کو مرغوب بھی تھی۔ اور آپ کی بیویاں بھی ایسے ہی حالات میں گزر بسر کر رہی تھیں۔ لیکن فطرت کے اپنے تقاضے ہیں جنہیں بلند عزائم کے تحت دبایا تو جاسکتا ہے لیکن ختم نہیں کیا جاسکتا۔

غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنی قریظہ کے ختم ہونے کے بعد جیسے ہی مسلمانوں کو بنونضیر کے بعد بنی قریظہ کی زمینیں، ان کے باغات اور ان کے مکانات سے حصہ ملا اور اس سے ان میں کسی حد تک آسودگی پیدا ہوئی تو آنحضرت ﷺ کے گھر میں بھی ایک احساس سا ابھرنے لگا۔ اس وقت آپؐ کی چار بیویاں تھیں۔ حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت سودہ اور حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھن۔ ان کی فطرت نے تقاضا کیا کہ اس آسودگی سے ہمیں بھی کچھ حصہ ملنا چاہیے۔ ممکن ہے ان چاروں نے باہمی مشورے سے آنحضرت ﷺ سے اپنی گزر بسر میں آسانی

Marfat.com

کے لیے درخواست کی ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے یہ روایت مروی ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ آپ کی ازواج آپؐ کے گرد بیٹھی ہیں اور آپ خاموش ہیں۔ آپ نے حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے فرمایا هُنَّ كَمَاتَرٰى يَسْئَلْنِى النَّفَقَةَ "یہ میری بیویاں مجھ سے خرچ کے لیے روپیہ مانگ رہی ہیں، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو" اس پر دونوں صاحبوں نے اپنی بیٹیوں کو ڈانٹا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کو کیوں تنگ کرتی ہو، اور آپ سے وہ چیز مانگتی ہو جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت نبی کریم ﷺ کیسی مالی مشکلات میں مبتلا تھے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے اس شانِ نزول کو قبول کرنے میں تردد کا اظہار کیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آسودگی کا زمانہ خیبر کی فتح سے شروع ہوتا ہے جبکہ ان آیات کا نزول ذیقعد یا ذی الحج پانچ ہجری میں ہوا ہے جبکہ حضرت زینبؓ سے ابھی نکاح نہیں ہوا تھا۔ اور خیبر اس وقت تک مسلمانوں کے زیرنگیں نہیں آیا تھا تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ دوسروں کی آسودگی کو دیکھ کر ازواجِ مطہرات کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا۔ لیکن ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ ان آیات کا نزول یقیناً پانچ ہجری میں ہوا ہے اور اس وقت خیبر ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔ لیکن غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ آسودگی کا زمانہ فتح خیبر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ حالانکہ بنوقریظہ کے قتل ہوجانے کے بعد ان کی تمام املاک کا مسلمانوں میں تقسیم ہوجانا کسی نہ کسی حد تک آسودگی اور خوشحالی کا سبب بنا تھا۔ اور اسی زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔

دوسرا خیال انہیں یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات کے بارے میں یہ بدگمانی کرنا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے دنیا کی زینت کے بارے میں سوال کریں گی، یہ ان کی شان کے لائق نہیں۔ بات یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات کا جو مقام و مرتبہ ہے اس میں کوئی شبہ نہیں، لیکن فطرت کے بنیادی تقاضوں سے انہیں بے بہرہ سمجھنا یہ بھی زیادتی کی بات ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور بندیوں کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کا مطالبہ کریں اور تن پوشی کے لیے مناسب لباس کا۔ جس بات پر گرفت ہوئی ہے وہ یہ مطالبہ نہیں بلکہ گرفت اس بات پر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی معیت و رفاقت کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ بنیادی ضرورتوں کا تقاضا یقیناً برحق ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے عظیم رسول ہونے کی وجہ سے جس بارِگراں کو اٹھائے ہوئے تھے، اور پھر جس طرح آپ کا ایک ایک لمحہ اسی کے لیے وقف ہو کے رہ گیا تھا اس میں فطری مطالبات کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اور اگر آج اس کی اجازت دے دی جاتی تو یہی فطری مطالبات تکلفات میں بھی داخل ہوسکتے تھے۔ پیغمبر کا گھر دنیا میں بعض حوالوں سے منفرد ہوتا ہے۔ اس کے تقاضے بھی احساس و خیال سے بہت بالا ہوتے ہیں۔ ازواجِ مطہرات کو ان احساسات کا خوگر بنانے کی ہدایت کی جارہی ہے۔ لیکن معاملہ چونکہ بہت نازک تھا اس لیے ترغیب و ہدایت کے تیور ذرا تیکھے ہیں۔ اس میں صرف ترغیب سے ہی کام نہیں لیا گیا بلکہ اسے فیصلہ کن حیثیت دے کر ایک سوال ازواجِ مطہرات کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ ایک طرف حیاتِ دنیا اور اس کی زینت ہے یعنی اس کی سہولتیں اور آرام و راحت۔ اور دوسری طرف آنحضرت ﷺ کی رفاقت، تم دونوں میں سے کسے اختیار کرتی ہو؟ اگر تمہیں دنیا کی راحتیں مطلوب ہیں تو میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دیتا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میں تمہیں طلاق دے دیتا ہوں۔ لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو ترجیح دیتی ہو تو

Marfat.com

ایسی نیکوکار، خوبکار اور نباہ کرنے والی خوش اطوار بیویوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ تم خود فیصلہ کرو کہ تم دونوں میں سے کیا چاہتی ہو۔ اصطلاح میں اسے تخییر کہا گیا ہے۔ یعنی شوہر بیوی کو اختیار دے دیتا ہے، ساتھ رہنے یا علیحدہ ہونے کا۔ اس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی۔ اور فرمایا! میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، جواب دینے میں جلدی نہ کرنا۔ اپنے والدین کی رائے لینے کے بعد جواب دینا۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھ کر انہیں سنائی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا کہ مجھے اس معاملے میں کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں۔ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ باقی ازواجِ مطہرات میں ایک ایک کے پاس گئے اور ہر ایک سے یہی بات فرمائی۔ اور سب نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔ ازواجِ مطہرات کے اس جواب نے یہ بات ثابت کر دی کہ انہیں دنیا طلبی سے کوئی غرض نہیں، وہ فطری داعیات کو بھی اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور آخرت کے اجر و ثواب پر قربان کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں اس کے لیے فاقے برداشت کرنا پڑیں یا زندگی کا ہر آرام قربان کرنا پڑے تو یہ کوئی بڑی قیمت نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی صحبت اور رفاقت ایک ایسی گراں قدر نعمت ہے کہ کوئی چیز اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ
لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾

(اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کرے گی تو اسے دہرا عذاب دیا جائے گا، اور یہ بات اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ ۳۰)

خطاب میں وسعت اور تبدیلی کا سبب

پہلی دونوں آیتوں میں جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے اس کے پہنچانے کی ذمہ داری آنحضرت ﷺ پر عائد کی گئی ہے۔ کیونکہ اسے حضورؐ ہی کی زبان سے ادا کرانا زیادہ مناسب تھا۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں براہِ راست پروردگار ازواجِ مطہرات سے مخاطب ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی دو آیتوں کے نزول کے وقت جو بیویاں موجود تھیں وہ باتیں انہیں سے فرمائی گئی ہیں۔ لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جو اصولی بات فرمائی جا رہی ہے اس کا تعلق ان بیویوں سے بھی ہے جو آگے چل کر حضورؐ کے نکاح میں آنے والی تھیں۔ سب کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ نکاح کی وجہ سے تمہارا مقام و مرتبہ دوسری عورتوں سے بہت بلند ہو گیا ہے۔ تمہاری ہر نیکی باقی عورتوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح خدانخواستہ تمہاری کوئی برائی بھی دوسروں پر اثر کیے بغیر نہیں رہے گی۔ اس لحاظ سے تمہارا ہر عمل دو حیثیتوں کا مالک ہے۔ اور اسی نسبت سے تمہیں قیامت کے دن اجر و ثواب ملے گا۔ تمہاری ہر نیکی دوسروں سے دہرا اجر پائے گی۔ اور تمہاری ہر برائی پر دوسروں سے دگنا عذاب دیا جائے گا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ آپ اپنے مقام و مرتبہ کو سمجھ کر اپنے ہر ہر عمل کا جائزہ لیں۔ اور اس کے مطابق زندگی کے اعمال بروئے کار لائیں۔ اور اپنے اخلاقی رویے کو پاکیزگی کے انتہائی مقام پر استوار رکھیں۔

Marfat.com

ایک وضاحت

یہ بات ذہن میں رہے کہ ازواجِ مطہرات کو جس طرح برائی پر دہرے عذاب کی تنبیہ کی جارہی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ العیاذ باللہ ازواجِ مطہرات سے کسی سنگین نوعیت کے جرم کا اندیشہ تھا۔ بلکہ اس کا مطلب ایسا ہی ہے جیسے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ ''اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کا سب کیا کرایا برباد ہوجائے گا'' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ آنحضرت ﷺ سے شرک کا کوئی اندیشہ تھا۔ بلکہ اس سے مقصود آپ کو اور آپ کے واسطہ سے عام انسانوں کو یہ احساس دلانا تھا کہ شرک کتنا خطرناک جرم ہے جس سے سخت احتراز لازم ہے۔

وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْکُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ
اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا کَرِیْمًا ﴿۳۱﴾

(اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کریں گی اور نیک عمل کریں گی ہم ان کو دہرا اجر دیں گے اور ہم نے ان کے لیے رزقِ کریم مہیا کر رکھا ہے۔ ۳۱)

جزا و سزا مقام و مرتبہ کے مطابق

یہ آیت گزشتہ آیت کے مضمون کی تکمیل ہے۔ یعنی جس طرح تمہارے کسی جرم کی سزا دگنی ہے اسی طرح تمہاری نیکیوں کی جزا بھی دگنی ہے۔ کیونکہ جو لوگ انسانی معاشرے میں ایسے بلند مرتبے پر فائز ہوجاتے ہیں کہ لوگ ان کے قول و فعل کی نقل کرتے اور اس کو اپنے لیے اسوہ بنا لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ہر عمل کا اثر ان کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں۔ ان کی برائی بہت سے لوگوں کے بگاڑ کا سبب بنتی ہے اور ان کی بھلائی بہت سے لوگوں کی فلاح کا باعث ٹھہرتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی صدقِ دل سے فرماں برداری اور عملِ صالح کرتی رہو تو اس کے اثرات چونکہ امت کی تمام عورتوں تک پہنچنے والے ہیں اس لیے اس کا اجر بھی دہرا ہوگا۔ مزید فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے رزقِ کریم تیار کر رکھا ہے۔ رزق دراصل اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی تعبیر ہے۔ اور جب اس کی صفت کریم آتی ہے تو پھر اس انعام کی وسعت، اس کی خوبصورتی اور اس کی قدر و قیمت بے پایاں ہوجاتی ہے۔

ازواجِ مطہرات چونکہ آنحضرت ﷺ کی رفاقت کی وجہ سے امت کی نگاہوں میں بہت عظیم مقام کی حامل ہیں۔ ان کا ہر عمل امت کی خواتین کے لیے حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ انہیں کے ذریعے سے امت کی عورتوں تک اللہ تعالیٰ کے دین کے احکام پہنچے ہیں۔ ان کے اس عظیم مقام کی طرف جزاء و سزا کے حوالے سے نہایت صراحت کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ
فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾

Marfat.com

(اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو، اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو دبی زبان میں بات نہ کرو، کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ کسی طمعِ خام میں مبتلا ہو جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ ۳۲)

پردے کے ابتدائی احکام اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیت سے آخر پیراگراف تک کی آیات وہ ہیں جن میں پردے کے ابتدائی احکام بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی اور تکمیل سورۃ النور میں کی گئی ہے۔ اس میں خطاب اگرچہ ازواجِ مطہرات کو کیا گیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ احکام ازواجِ مطہرات کے ساتھ خاص ہیں۔ کیونکہ اولاً تو دوسرے مواقع پر پردے کے احکام صاف صاف تمام مسلمان عورتوں کو دیے گئے ہیں۔ ان آیات کو دیکھتے ہوئے اس اشتباہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی جسے لوگوں نے عام طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن خود ان احکام کو بھی دیکھا جائے جن کا ان آیات میں ذکر فرمایا گیا ہے تو ان میں کوئی حکم ایسا نہیں جس کی مکلف باقی مسلمان عورتیں نہیں ہیں۔ مثلاً ان آیات میں حسب ذیل احکام دیے گئے ہیں۔

۱۔ بلا ضرورت گھر سے نہ نکلنا اور گھروں میں وقار کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہنا۔

۲۔ تبرجِ جاہلیت سے پرہیز کرنا۔

۳۔ غیر مردوں سے دبی زبان سے بات نہ کرنا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرتے رہنا۔

۵۔ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا۔

۶۔ ہر طرح کی آلودگی سے پاک رہنا۔

ان احکام میں سے کون سا حکم ایسا ہے جسے ازواجِ مطہرات کے لیے خاص کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر پہلے تین احکام کو ازواجِ مطہرات کی خصوصیت ٹھہرایا جائے اور باقی تین احکام کو عام رکھا جائے تو یہ ترجیح بلا مرجح ہے۔ یعنی مجموعی احکام میں سے بعض کو عام اور بعض کو خاص قرار دینے کی کوشش ہے جو کسی طرح بھی جائز نہیں۔ رہی یہ بات کہ اس میں ازواجِ مطہرات سے یہ کہا گیا ہے کہ تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو بلکہ تمہاری خصوصی حیثیت ہے تو اس میں تو صرف ان کے مرتبہ اور مقام کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ نسبت کی بنا پر ان کو دنیا کی تمام عورتوں کے مقابل میں حاصل تھا۔ اور اسی مقام و مرتبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں امہات المومنین کا بلند مرتبہ عطا فرمایا۔ البتہ اس کے ساتھ تقویٰ کی شرط عائد کر دی حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے نکاح میں ایسی کوئی خاتون رہ ہی نہیں سکتی جو تقویٰ کے انتہائی مقام پر فائز نہ ہو۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں سورۃ النور میں اَلطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبَاتِ کے اصول کے تحت اس حقیقت کو واضح فرما دیا ہے۔ دراصل تقویٰ کی شرط اللہ تعالیٰ کے ایک خاص اصول کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے یہاں کوئی مرتبہ و مقام بھی تقویٰ کی پابندی کے بغیر باقی نہیں رہتا۔ بلکہ جیسے پہلے گزر چکا اللہ تعالیٰ جن کو بلند مقام سے نوازتا ہے ان کے لیے جزاء و سزا کے حوالے سے تقویٰ کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

خضوع بالقول کا مفہوم

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ ، اس کا مصدر خضوع ہے۔ اس کا معنی ہوتا ہے تواضع، خاکساری یا دبی زبان میں بات کرنا۔ مردوں کے لیے یہی حُسنِ اخلاق کا تقاضا ہے۔ لیکن عورتوں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ قدرت نے عورت کی آواز میں بالعموم ملائمت رکھی ہے۔ اور اگر وہ اس میں نرم و نازک لہجے سے مزید اضافہ کر دے اور دبی زبان میں بات کرنے کی کوشش کرے تو بد چلن لوگوں کے لیے ایسی آواز میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ لہجے کی نرمی کو جو بعض دفعہ لوچ کی شکل اختیار کر لیتی ہے کسی اور معنی پر محمول کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ تمہیں جب کسی غیر مرد سے ضرورت کے تحت بات کرنی پڑے تو تمہاری آواز میں ایسی شیرینی گھلی ہوئی نہیں ہونی چاہیے اور باتوں میں ایسی لگاوٹ کا شبہ بھی نہیں ہونا چاہیے جس سے مرد کے جذبات میں انگیخت پیدا ہو سکے۔ بلکہ لہجے کو نسبتاً کھردرا بنا کر بات کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اسی بات کی وضاحت آخری حصے میں قولِ معروف سے کی گئی ہے۔ یعنی غیر مرد سے پسِ پردہ حسبِ ضرورت بات کرنے پر پابندی نہیں۔ البتہ بات ایسے صاف اور سادہ انداز میں کی جائے جس طرح ایک عام آدمی سے کی جاتی ہے۔ جس میں لگاوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ تاکہ کسی کمینہ صفت آدمی کو کوئی برا تصور قائم کرنے کی جرأت نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورت کی آواز کو بھی ہر طرح کا فتنہ بننے سے محفوظ رکھا ہے۔ بلا ضرورت غیر مردوں سے بات کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اسی لیے عورت کو اذان دینے سے روک دیا گیا۔ حتیٰ کہ اگر نماز با جماعت میں کوئی عورت موجود ہو اور امام غلطی کرے تو مرد کی طرح اسے سبحان اللہ کہنے کی اجازت نہیں، بلکہ اسے صرف ہاتھ کی پشت پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنی چاہیے تاکہ امام متنبہ ہو جائے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے محتاط رہنے کا حکم دیتا ہے اور بلا ضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے، کیا وہ کبھی اس کو پسند کر سکتا ہے کہ عورت سٹیج پر آ کر گائے، ناچے، تھرکے، بھاؤ بتائے اور ناز و نخرے دکھائے۔ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ عورت ریڈیو یا ٹی وی پر عاشقانہ گیت گائے یا ڈراموں میں کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی محبوبہ کا پارٹ ادا کرے یا ایئر ہوسٹس بن کر مسافروں کا دل لبھانے کی کوشش کرے یا کلبوں یا اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں رونقِ محفل بن کر بیٹھے۔ آخر ہم نے اپنا جو کلچر بنا لیا ہے اور ہم اسے اسلامی ثقافت قرار دیتے ہیں اس کا قرآنِ کریم کے متذکرہ بالا تصورات سے کیا تعلق ہے؟

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا ۝٣٣

(اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سج دھج نہ دکھاتی پھرو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتی رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اے اہلِ بیتِ نبی تم سے آلودگی کو دور کرے اور تمہیں اچھی طرح پاک کر دے۔ ٣٣)

Marfat.com

قَرْنَ، تبرج اور جاہلیت اولیٰ کی وضاحت

قَـرْنَ...... اہلِ لغت نے اسے قرار سے بھی ماخوذ بتایا ہے اور وقار سے بھی۔ اگر اسے قرار سے ماخوذ سمجھیں تو اس کے معنی ہوں گے کہ تم قرار پکڑو اور ٹک کر رہو۔ اور اگر وقار سے لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سکون سے رہو یا چین سے بیٹھو۔ دونوں صورتوں میں آیتِ کریمہ کا منشاء یہ ہے کہ عورت کا اصل دائرۂ عمل اس کا گھر ہے۔ اسے اسی دائرے میں رہ کر اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں۔ اور گھر سے باہر شدید ضرورت کے بغیر نہیں نکلنا چاہیے۔ احادیث سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ ہم صرف ایک حدیث نقل کرتے ہیں جو ترمذی نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے نقل کی ہے۔

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اِنَّ الْمَرْاَ ةَ عَوْرَةٌ فَاِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ وَاَقْرَبُ مَاتَكُوْنُ بِرَوْحَةِ رَبِّهَا وَهِيَ فِيْ قَعْرِ بَيْتِهَا ”عورت مستور رہنے کے قابل ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے اور اللہ کی رحمت سے قریب تر وہ اس وقت ہوتی ہے جبکہ وہ اپنے گھر میں ہو۔“

گھروں میں ٹک کر بیٹھنے اور سکون سے رہنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بے ضرورت گھر سے نہ نکلا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ازواجِ مطہرات سے بلاواسطہ اور امت کی عورتوں سے بالواسطہ یہ فرمایا جارہا ہے کہ آپ کا اصل مقام گھر ہے۔ شدید ضرورت کے بغیر گھر سے نکلنا شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع دینا ہے اور منافقین اور بدچلن لوگوں کو کھل کھیلنے کی ہمت دلانا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ لیکن اگر باہر جانے کی شدید ضرورت پیش آجائے تو پھر باہر نکلنے کے لیے جو اسلامی حدود وضع کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے جسے یہاں تبرجِ جاہلیت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

تبرج کے معنی عربی زبان میں نمایاں ہونے، ابھرنے اور کھل کر سامنے آنے کے ہیں۔ بُرج کو اس لیے بُرج کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ارتفاع کے باعث دور سے نظر آتا ہے۔ بادبانی کشتی کو بارجہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کے بادبان دور سے نمایاں ہوتے ہیں۔ عورت میں جب تبرج کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو اس کا اظہار عموماً تین صورتوں میں ہوتا ہے۔ (۱) وہ اپنے چہرے اور جسم کے کھلے حصوں کو دیدہ زیب بناتی اور ان کا اظہار کرتی ہے۔ (۲) بھڑکیلا لباس پہنتی اور اپنے زیور کی نمائش کرتی ہے۔ (۳) تنگ لباس پہن کر اور چال ڈھال میں طرح داری کی شان پیدا کرکے نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ چنانچہ اہلِ لغت اور قدیم مفسرین نے اس لفظ کے مفہوم میں انہیں تینوں کیفیتوں کی ترجمانی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ گھر سے نکلنے والی جو عفیفہ اپنے آپ کو متذکرہ بالا کیفیتوں سے محفوظ رکھے گی اس کا باہر نکلنا نہ اپنے لیے فتنہ ہوگا اور نہ دوسروں کے لیے۔ بلکہ پاکیزہ نگاہیں اسے دیکھ کر اندازہ کرسکیں گی کہ قانتات اور حافظات کیسی صاحبِ ایمان عورتوں کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی کا حکم امت کے نمونہ کے لیے ازواجِ مطہرات کو دیا گیا۔

تبرج کی جاہلیتِ اولیٰ کی طرف اضافت کی گئی ہے۔ اس سے تبرج کے مفہوم کے سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ یعنی جس تبرج سے روکا گیا ہے یہ وہ تبرج ہے جو جاہلیتِ اولیٰ میں عرب کی جاہل عورتوں کا طریقہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ جاہلیتِ اولیٰ کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے سورۃ آل عمران، سورۃ مائدہ اور سورۃ فتح میں جاہلیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ تین کام جاہلیت کے ہیں۔ دوسروں کے نسب پر طعن کرنا، ستاروں کی گردش سے فال لینا اور مردوں پر نوحہ

Marfat.com

کرنا۔ حضرت ابوالدردا کا کسی شخص سے جھگڑا ہوگیا اور آپ نے اسے گالی دے دی۔ آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ تم میں ابھی تک جاہلیت موجود ہے۔ قرآن اور حدیث کے ان استعمالات کو دیکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جاہلیت اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ طرزِ عمل ہے جو اسلامی تہذیب وثقافت اور اسلامی اخلاق وآداب اور اسلامی ذہنیت کے خلاف ہو۔ اور جاہلیتِ اولیٰ سے مراد وہ برائیاں ہیں جن میں اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اور دنیا بھر کے دوسرے لوگ مبتلا تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دورِ جاہلیت میں عورتیں جس طرح بن سنور کر جسم کی، زیور کی، چست اور عریاں لباسوں کی نمائش کرتی ہوئی نکلتی تھیں، مسلمان عورتوں کو جس شرم وحیاء کی تعلیم دی گئی اور جس طرح کی ثقافت سے انہیں آراستہ کیا گیا اس کا اس روش سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ازواجِ مطہرات کو خاص طور پر اس سے بچنے کی ترغیب دی گئی تاکہ مسلمان عورتیں یہ دیکھ کر کہ جب پیغمبر جیسے پاکیزہ گھر کی خواتین ان باتوں سے دور رکھی گئی ہیں تو ہمارے لیے ان باتوں کا کیا جواز ہوسکتا ہے۔

جاہلیتِ اولیٰ کی تعبیر سے شاید اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بن سنور کر اور سج دھج کے نکلنا یہ ثقافت دورِ جاہلیت کی ثقافت ہے جس کو اب قصہ ماضی سمجھنا چاہیے۔ اس کا دور اب ختم ہوچکا ہے۔ اگر مسلمان عورتوں میں کہیں بھی اس کا کوئی اثر باقی ہے تو اسلامی تہذیب کے اثر سے وہ بھی ختم ہوجائے گا۔ تو جس چیز کو اسلامی تعلیمات نے پامال کردیا ہے دلوں میں اس کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن کس قدر دکھ کی بات ہے کہ جس روش کو اسلام نے جاہلیت کی روش قرار دیا اور اسے قصہ ماضی ٹھہرایا، آہستہ آہستہ وہی روش جدید تہذیب اور ثقافت کے نام سے مسلمانوں میں بہت حد تک رائج کی جاچکی ہے اور مزید کوششیں جاری ہیں۔ اور مزید ستم کی بات یہ ہے کہ بعض نام نہاد اہلِ علم اسے قرآن وسنت سے کشید کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اور اسے اسلامی ثقافت کا نام دیا جارہا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

مزید حکم یہ دیا گیا کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تو ایک وسیع اصطلاح ہے جس سے مراد اسلام کے انفرادی اور اجتماعی نظام کی پابندی اور اسلامی آداب واخلاق سے اپنے آپ کو مزین کرنا ہے۔ اور جہاں تک نماز اور زکوٰۃ کا تعلق ہے یہ درحقیقت تعمیرِ سیرت کا ایک جامع عنوان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس سے وفاداری کی صحیح تربیت صحیح نماز سے ہوتی ہے۔ اس کی پابندی سے غیر اللہ سے ہر تعلق ختم ہو کے رہ جاتا ہے۔ کسی اور کی بندگی کا کوئی شائبہ بھی دل ودماغ میں باقی نہیں رہتا۔ آدمی کا سر ہر آستانے سے اٹھ جاتا ہے اور اس کا دل ہر خوف اور ہر تمنا سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی مال ودولت کے حوالے سے انسانی احساسات کو پاکیزہ کرتی ہے۔ نماز جس طرح غیر اللہ کی ہر طرح کی بندگی سے بے نیاز کرتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ حُبِ زر، حُبِ جاہ اور حُبِ ذات کی ہر آلودگی سے پاک کردیتی ہے۔

اہلِ بیت کے خطاب اور مصداق کی وضاحت

آیت کے آخر میں ازواجِ مطہرات کو اہلِ بیت کے دلنواز نام سے موسوم فرما کر نہایت شفقت ومحبت کے انداز میں تسلی دی گئی ہے کہ یہ ہدایات جو تمہیں دی گئی ہیں ان سے تمہیں پابندیوں میں جکڑنا مقصود نہیں اور نہ تمہاری فطری آزادیوں کو ختم کرنا ہے، بلکہ اس سے مقصود تمہاری سیرت وکردار کو انتہائی بلندیوں تک پہنچانا ہے، کیونکہ تم امت کی خواتین کے لیے روشنی کا سامان اور ہدایت کا ذریعہ ہو۔ اور سیم وزر اور

Marfat.com

آرائش وزیبائش کی ہوس چونکہ بلند سیرت وکردار کے راستے میں بعض دفعہ حائل ہوجاتی ہے اس لیے ایسی ہر خواہش کو ''رجس'' قرار دے کر جہاں اس کے خواہشمندوں پر تعریض کی گئی ہے وہیں ازواجِ مطہرات کو اس سے نفرت دلا کر اس سے پاکیزہ رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

ان آیات کو ایک دفعہ پھر غور سے پڑھئے۔ ان کا آغاز ازواجِ مطہرات کے ذکر سے ہوا اور پھر یا نساء النبی کہہ کر سیرت وکردار کی تعمیر کے لیے احکام دیے گئے۔ اور اسلامی تہذیب وثقافت کے بعض گوشوں کی بنیادیں استوار کی گئیں۔ اور آخر میں ازواجِ مطہرات کو خطاب فرما کر انہیں اہلِ بیت سے موسوم کیا گیا اور ان احکام کے مقصد کو واضح کیا گیا۔ اس پورے سیاق وسباق میں کسی اور شخصیت کا کوئی ذکر نہیں۔ تو اس لحاظ سے ازواجِ مطہرات کا اہلِ بیت ہونا نصِ قطعی سے ثابت ہے، جس میں کسی اور کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ دوسروں کی شمولیت اس میں تبعاً وضمناً تو ہوسکتی ہے، اصلاً نہیں۔ اور جہاں تک محاوراتی زبان کا تعلق ہے عربی میں اہلِ بیت کا لفظ ٹھیک انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم گھر والوں کا لفظ بولتے ہیں۔ اس میں آدمی کے بیوی اور بچے دونوں شامل ہوتے ہیں۔ بیوی کو مستثنیٰ کرکے اہلِ خانہ کا لفظ کوئی نہیں بولتا۔ اس لحاظ سے جو لوگ ازواجِ مطہرات کو اہلِ بیت میں شامل نہیں سمجھتے ان کی باتوں میں نہ کوئی معقولیت ہے اور نہ وہ قرآنِ کریم کے مفہوم کے مطابق ہے بلکہ اس سے نصِ قطعی کی مخالفت لازم آتی ہے جو بڑے خطرناک نتائج کی حامل ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اہلِ بیت سے مراد صرف ازواجِ مطہرات ہیں۔ حضرت علی، حضرت فاطمہ اور آپ کے دونوں صاحبزادے نہیں، ہم انہیں بھی اہلِ بیت میں شامل سمجھتے ہیں۔ لیکن اہلِ بیت میں ان کی شمولیت قرآنِ کریم کی نصِ صریح سے نہیں بلکہ ایک حدیث سے ہے۔ ابنِ ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے متعلق پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا کہ تم اس شخص کے متعلق مجھ سے پوچھتے ہو جو رسول اللہ ﷺ کے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا، اور جس کی بیوی آپؐ کی وہ بیٹی تھی جو آپؐ کو سب سے زیادہ محبوب تھی۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے واقعہ سنایا کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ اور فاطمہ اور حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بلایا اور ان پر ایک کپڑا ڈال دیا اور دعا فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے ''اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں، ان سے گندگی کو دور کردے اور انہیں پاک کردے۔'' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ میں بھی تو آپؐ کے اہلِ بیت میں سے ہوں، تو حضور نے فرمایا کہ تم تو خیر ہو ہی اس لیے تمہیں اس کپڑے کے اندر آنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے ملتے جلتے مضمون کی بکثرت احادیث حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ازواجِ مطہرات کے ساتھ ساتھ حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اہلِ بیتِ نبی میں شامل ہیں۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

(یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں، بے شک اللہ نہایت ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ ۳۴)

وَاذْكُرْنَ ...... یہ جمع مونث حاضر امر کا صیغہ ہے، جس کے دو معنی ہوسکتے ہیں (۱) یاد کرو یا یاد رکھو۔ (۲) بیان کرو۔

Marfat.com

ازواجِ مطہرات کا مقصدِ زندگی

ناچیز کی رائے میں دونوں ہی معنی مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے رسول، معلم، مربی اور مزکی بنا کے بھیجا تھا۔ آپؐ جس طرح مردوں کی رہنمائی کرتے تھے اسی طرح عورتوں کی بھی رہنمائی فرماتے تھے۔ آپ گھر سے باہر مردوں کو تعلیم دیتے تھے اور گھر کے اندر عورتوں کو تعلیم دیتے تھے۔ وحی باہر بھی آپ پر اترتی تھی اور گھر کے اندر بھی اترتی تھی۔ جس طرح آپ کا ہر قول لوگوں کے لیے تعلیم و ہدایت تھا، اسی طرح آپ کا ہر عمل بھی لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ تھا۔ آپ کی زندگی ایک اکائی تھی جس میں پرائیویٹ اور پبلک کی تقسیم نہ تھی۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ کا ہر لمحہ امت کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ جس طرح باہر کی زندگی میں آپ کی تعلیم، آپ کے ایک ایک عمل اور آپ کی ایک ایک ادا کو محفوظ رکھنے کا انتظام کیا گیا تھا یعنی صحابہ کرام شب و روز اسی دھن میں لگے رہتے تھے اور اصحابِ صفہ کو تو اس کام کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ اسی طرح آپ کے گھر کے اندر کی زندگی کو بھی محفوظ رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ آپ کو چار سے زیادہ شادیوں کا حکم دیا گیا اور ازواجِ مطہرات کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ آپ کی تعلیم و تربیت اور آپ کے قول و عمل اور ہر ادا کو یاد بھی کریں اور دوسروں تک پہنچانے کا انتظام بھی کریں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کا علم و عمل جتنا آپ کی ازواجِ مطہرات کے ذریعے سے محفوظ اور عام ہوا اس کی مقدار صحابہ کے ذریعے پھیلے ہوئے علم سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مردوں کی تعلیم و تربیت کے ضروری مسائل مردوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچے اور عورتوں کے مسائل اور ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے ضروری ہدایات ازواجِ مطہرات کے ذریعے امت تک پہنچیں۔ اور پھر اس تعلیم و تربیت میں صرف وہی وحی شامل نہیں جو قرآنِ کریم کی شکل میں نازل ہوئی بلکہ وہ وحیِ غیر متلو بھی شامل ہے جسے حدیث اور سنت اور حکمت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آیتِ کریمہ میں کتاب سے مراد قرآنِ کریم ہے اور حکمت سے مراد حدیث اور سنت اور آپ کا وہ طرزِ عمل ہے جس کی کیفیات کو ازواجِ مطہرات نے امت تک پہنچایا۔

بعض لوگوں نے مَا يُتْلٰى کے لفظ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حکمت سے مراد بھی قرآنِ کریم ہی ہے۔ کیونکہ تلاوت صرف قرآنِ کریم کی ہوتی ہے اور کسی چیز کی نہیں۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ تلاوت کا لفظ قرآنِ کریم کے لیے مخصوص کرنا بعد کی اصطلاح ہے جو علمی آسانی کے لیے پیدا کی گئی۔ ورنہ قرآنِ کریم نے اس کو دوسری چیزوں کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ میں ارشاد فرمایا گیا ہے وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ''انہوں نے پیروی کی اس چیز کی جس کی تلاوت کرتے تھے شیاطین سلیمان کی بادشاہی کی طرف منسوب کر کے۔'' اس آیتِ کریمہ میں تلاوت کے لفظ کو قرآنِ کریم کے لیے نہیں، جادو کے ان منتروں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو شیاطین حضرت سلیمان کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ لطیف اور خبیر ہے۔ یعنی ازواجِ مطہرات جو عظیم ذمہ داری اپنے گھروں میں بیٹھ کر انجام دیں گی وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہے گی، کیونکہ وہ بہت باریک بین اور بہت باخبر ہے۔ وہ ان کے ہر عمل اور ہر ضرورت سے اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ قرآنِ و حکمت کی حفاظت اور اشاعت میں وہ جس طرح ہمت سے بڑھ کر محنت کر رہی ہیں تاریخ میں اس کے نتائج کیا نکلیں گے اور امت کی تعلیم و تربیت میں اس کا کتنا بڑا حصہ ہوگا۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ اس کے بھروسے پر اپنا فرض انجام دیتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں انہیں بیش بہا اجر و ثواب دینے والا ہے۔

Marfat.com

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ
وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ
وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ
وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ
فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ
اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٣٥﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا
مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ
مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا
مُّبِيْنًا ؕ ﴿٣٦﴾ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ
اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ
مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى
زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ
فِيْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ
مَفْعُوْلًا ﴿٣٧﴾ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ
سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا
مَّقْدُوْرًا ۙ ﴿٣٨﴾ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ

Marfat.com

اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ ع

رکوع: ۵۔ (بے شک اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، اللہ کے آگے جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۳۵) کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کردیں تو ان کے لیے اس معاملہ میں کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گیا۔ ۳۶) اے پیغمبر، یاد کرو جب آپ اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو، اور آپ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا، آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں، اور جب زید نے اس سے اپنی ضرورت ختم کردی تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کردیا تا کہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں، اور اللہ کا حکم تو بہر حال ہونے والا تھا۔ ۳۷) نبی کے لیے ایسے کام میں کوئی تنگی نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے فرض کردیا ہے، یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے معاملے میں جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔ ۳۸) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ حساب کے لیے کافی ہے۔ ۳۹) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۴۰)

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ

Marfat.com

وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۳۵﴾

(بے شک اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، اللہ کے آگے جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۳۵)

معاشرے کے اجزائے ترکیبی اور مرد و عورت میں عنداللہ مساوات

ازواجِ مطہرات کو دی جانے والی ہدایات کے بعد متصلاً تمام امت کے لیے ان ہدایات کا ذکر شاید اس لیے فرمایا گیا ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ کیا جاسکے کہ گزشتہ ہدایات ازواجِ مطہرات کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ مسلم معاشرہ میں سے خواتین کی اصلاح کے لیے جن ہدایات کی ضرورت ہے ان میں سے ان ہدایات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ البتہ مسلم معاشرے کی بالعموم اصلاح کے لیے جو ہدایات مطلوب ہیں ان کو ایک جامع اسلوب کے تحت پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ پیراگراف میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں بعض کا انداز منفی ہے اور بعض کا مثبت۔ اگر ان کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد تقریباً اتنی ہے جتنی پیشِ نظر آیت میں متفرق صفات کی ہے۔

گزشتہ پیراگراف میں چونکہ خطاب ازواجِ مطہرات سے تھا جو تمام مسلمان عورتوں کی نمائندہ اور رہنما ہیں۔ پیشِ نظر آیت میں اسلامی معاشرہ کے اجزائے ترکیبی جو ذکر فرمائے گئے ہیں، قرآنِ کریم کے عمومی اسلوب کے مطابق ان کا خطاب مردوں سے ہونا چاہیے تھا لیکن گزشتہ پیراگراف کی رعایت سے عورتوں کا ذکر ضمناً نہیں بلکہ مردوں کے پہلو بہ پہلو مستقلاً فرمایا گیا ہے تاکہ یہ بات واضح ہوسکے کہ معاشرہ کے بناؤ سنوار میں عورتوں کا حصہ مردوں کے برابر ہے۔ اس لیے ان کی ذمہ داریاں مردوں سے کم نہیں البتہ دونوں کا دائرۂ عمل جدا جدا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں مسلمان معاشرہ کے افراد کی جن خصوصیات کا ذکر فرمایا گیا ہے ان کا ذکر فعل کی صورت میں نہیں بلکہ صفت کے صیغوں سے کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صیغۂ فعل وقوعِ فعل پر دلالت کرتا ہے چاہے وہ وقوع ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ صفت کا صیغہ عادت اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا وقوع ایک دفعہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت ایک خصلت کی ہوتی ہے جو اپنے فاعل سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ جس طرح سورج جب طلوع ہوتا ہے تو ضرور کرنیں بکھیرتا ہے، چاند نکلتا ہے تو روشنی بکھیرتا اور حلاوت لٹاتا ہے، دریا کبھی اپنے بہاؤ سے الگ نہیں رہ سکتا، چشمے سے ابلنے کے تصور کو الگ نہیں کیا جاسکتا اور آبشار کبھی مسلسل گرنے کی صفت سے محروم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ یہ تمام صفات ہیں جو اپنے موصوف سے کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ اسی طرح پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک کلمہ گو کبھی کبھی ان صفات سے بھی متصف ہوتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صفات کبھی اس سے منقطع نہیں

Marfat.com

ہوتیں۔جس طرح ایک مور جہاں پَر پھیلاتا ہے وہاں چمن کھل جاتا ہے۔اسی طرح ایک کلمہ گو جس ماحول میں بھی ہوتا ہے ان صفات کا اس سے مسلسل صدور ہوتا ہے اور ان صفات کا رنگ اس ماحول پر چھایا رہتا ہے۔

یہ صفات تعداد میں دس ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اسلام، (۲) ایمان، (۳) قنوت، (۴) صدق، (۵) صبر، (۶) خشوع، (۷) صدقہ، (۸) روزہ، (۹) عفت وحیاء، (۱۰) ذکر اللہ۔

اسلام:۔ اس کا معنی ہے مطیع ہو جانا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا اس اسلام سے متصف شخص کو مسلم کہتے ہیں۔یعنی ایسا شخص جس نے اپنی زندگی اسلامی ضابطۂ حیات کے سپرد کر دی ہے اور اس نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ اب اسی کی پیروی میں زندگی گزارے گا۔یعنی اس کا طریقہ فکر اور طرز زندگی اسلام کے دیے ہوئے تصورات اور احکام کے تابع ہے۔وہ کہیں بھی اس کی اطاعت اور اتباع میں کوتاہی نہیں کرتا۔

ایمان:۔ مان لینے اور دل سے تصدیق کرنے کو کہتے ہیں جس کا حاصل یقین اور ایقان ہے۔یعنی جو شخص مسلم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ صرف اسلامی ضابطۂ حیات ہی کی پابندی نہیں کرتا بلکہ وہ دل سے بھی اس کے صحیح اور سچا ہونے کا یقین رکھتا ہے اور وہ اسی میں دنیوی اور اخروی فلاح اور کامیابی سمجھتا ہے۔وہ تمام معیارات سے ہاتھ اٹھا کر صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ارشادات کو معیارِ حق سمجھتا ہے۔اسلام درحقیقت دین کا ظاہر ہے اور ایمان اس کا باطن ہے۔اور یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔

قنوت:۔ اس کا معنی تو اطاعت اور فرماں برداری ہے۔لیکن اس سے مراد وہ فرماں برداری ہے جو دل کی پوری یکسوئی، پوری نیازمندی اور اخلاص کے ساتھ زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہے۔دماغ اور دل کے کسی گوشے میں بھی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے بارے میں شک وشبہ لاحق نہ ہو۔نہ کسی حکم کی تعمیل بوجھ محسوس ہو اور نہ کسی نہی کی طبیعت میں طلب پیدا ہو۔اس کا آخری مقام یہ ہے کہ شریعت کے مقتضیات طبعی مقتضیات کی صورت اختیار کر لیں۔

صدق:۔ قول، فعل، ارادہ اور عقیدہ میں کامل ہم آہنگی، مطابقت اور استواری کا نام ہے۔اس کیفیت کے پیکر نہ تو کبھی جھوٹ بولتے ہیں اور نہ معاملات میں فریب دیتے ہیں۔نہ کبھی ان کی نیت میں فتور آتا ہے۔ان کی زبان اور ان کا ضمیر ہمیشہ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔وہ زندگی کے کسی معاملے میں چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی کبھی راستی اور صداقت کے خلاف نہیں چلتے۔ دیانت وامانت ان کا شیوہ ہوتا ہے۔بدعہدی کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک مومن اعمال کی مختلف خرابیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹا کبھی نہیں ہوتا۔

صبر:۔ اڑ جانے اور ڈٹ جانے کو کہتے ہیں۔استقامت، استقلال اور پامردی کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔علماء نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) صبر علی الطاعات۔یعنی وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل میں نہایت ثابت قدم اور اطاعت کی روش پر قائم رہنے والے ہیں۔وہ اشتعال یا کسی تحریص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے۔ (۲) صبر عن المعصیات، کہ وہ نافرمانی اور گناہوں سے صبر کرتے ہیں۔خواہشاتِ نفس کا کوئی تقاضا بھی ان کو نافرمانی کے راستے پر نہیں ڈال سکتا۔اللہ تعالیٰ اور رسول کی نافرمانی انہیں ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے دہکتے انگاروں میں ہاتھ ڈالنا۔ (۳) صبر علی المصائب، یعنی کیسی ہی مشکلات

Marfat.com

پیش آئیں، کوئی خوف اندر سے سر اٹھائے یا باہر سے، خوف جان کا ہو یا مال و دولت کے ضیاع کا، وہ ان مصیبتوں پر صبر کرنے والے ہیں۔ دین کے راستے میں وہ سر کٹوا سکتے ہیں لیکن جھکا نہیں سکتے۔ غیر اللہ کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان سے اپنی بات منوا نہیں سکتی۔ وہ ہر خطرے کا بڑی پامردی سے مقابلہ کرتے ہیں۔

خشوع:۔ کا معنی فروتنی اور انکساری ہے۔ لیکن یہ ایسی فروتنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور اس کی عظمت و جلال کے صحیح تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے ان کے اندر اطاعت کا صحیح جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی چیز انہیں اپنے رب کے آگے جھکاتی بھی ہے اور اس سے جوڑتی بھی ہے۔ عاجزی کا احساس تکبر اور استکبار سے بچاتا ہے۔ اور بندوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایسے لوگ حق کے مقابلے میں نہایت عاجز، لیکن باطل کے مقابلے میں نہایت سخت ہوتے ہیں۔ تخت و تاج پر فائز لوگ ان کی نگاہوں میں پتلیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا کوئی مسکین بھی ان کے یہاں عزت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ان خصوصیات کی ترتیب کو دیکھتے ہوئے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہاں خشوع سے مراد شاید نماز ہو۔ کیونکہ نماز کی اصل شناخت خشوع ہے۔ اور نماز کی فرضیت کا اصل مقصد بھی خشوع پیدا کرنا ہے۔ اور اس کے بعد چونکہ صدقے اور روزے کا ذکر آ رہا ہے اس سے بھی اس گمان کی تائید ہوتی ہے۔

صدقہ:۔ کا معنی خیرات اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ دینا ہے۔ اور تصدق کا معنی صدقہ کرنا ہے۔ مراد اس سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں انفاق کرنا ہے جسے قرآنِ کریم نے متقین کی خصوصی صفات میں ذکر فرمایا ہے۔ اس کا تعلق حقوق العباد سے بھی ہے اور تبرع اور احسان سے بھی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ادا کرنا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کی مالی مدد کرنا بھی۔ کوئی یتیم، کوئی بیمار، کوئی مصیبت زدہ، کوئی ضعیف و معذور، کوئی غریب و محتاج ان کی بستیوں میں دستگیری سے محروم نہیں رہتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے ہمیشہ ان کی تجوریوں کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ دین کی ضرورتیں بھی ان سے پوری ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کی ضروریات کے بھی وہی کفیل ہوتے ہیں اور وہ کسی حال میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے۔

روزہ:۔ صوم کا معنی ہے رکنا۔ اسی کو اردو زبان میں روزہ کہتے ہیں۔ یہ صبر کی تربیت کا خاص ذریعہ ہے۔ اس لیے حضورؐ نے رمضان کو شہر الصبر قرار دیا ہے۔ اس میں فرض اور نفل دونوں قسم کے روزے شامل ہیں۔ اس میں حلال اور طیب نعمتوں پر پابندی لگا کر ایک مومن کو اس بات کا خوگر بنایا جاتا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی اختیارِ کامل رکھتا ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے حرام کر دے اور جس چیز کو چاہے حلال کر دے۔ جس چیز کی چاہے اجازت دے دے اور جس چیز کو چاہیے ممنوع قرار دے دے۔ اختیار اسی کے پاس ہے، تم اس کے بے اختیار بندے ہو۔ تمہارا کام ہر صورت اس کے احکام کی کامل اطاعت اور اس کی ذات کی کامل بندگی ہے۔ روزہ اسی بندگی کی تربیت دیتا ہے۔

عفت و حیاء:۔ معاشرے میں خرابی پیدا کرنے اور قوتِ ارادی کو کمزور کرنے اور انسان کو شرفِ انسانیت سے محروم کر کے جنسی حیوان بنا دینے کا سب سے بڑا ذریعہ عفت اور حیاء کے احساس کو کم کرنا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو انسان کو بے پناہ قوت دیتا اور اسے بلند اخلاق سے وابستہ رکھتا ہے۔ جیسے ہی یہ پردہ کمزور ہوتا اور حفاظت کا جذبہ ماند پڑتا ہے تو پھر شیطانی قوتیں پراپیگنڈے کے زور سے سفلی جذبات کو انسانی زندگی کی معراج اور تسکین کا سب سے اہم ذریعہ قرار دینے لگتی ہیں۔ اور بالآخر انسان اپنے بلند منصب سے گر کر بلیوں اور کتوں کی سطح پر آ گرتا ہے۔

Marfat.com

ذکر اللہ:۔ اس سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی تکرار نہیں بلکہ زبان کا وظیفہ بننے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد کا دل میں اتر جانا ہے۔ یہ صفت مذکورہ بالا تمام صفت کا منبع اوران کی محافظ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی یاد انسان کے شعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک پہنچ جاتی ہے تو تب اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ہر کام کرنے سے پہلے اور ہر بات بولنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے۔ ہر کام سے فارغ ہو کر اس کی تعریف کرتا اور اس کا شکر بجالاتا ہے۔ وہ سونے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور نیند کھلنے پر بھی اللہ تعالیٰ ہی کا نام لیتا ہے۔ بول چال میں بار بار اس کی زبان سے بسم اللہ، الحمدللہ، ان شاء اللہ، ماشاء اللہ اور اس طرح کے دوسرے الفاظ نکلتے رہتے ہیں۔ محتاج ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا ہے۔ مصیبت آنے پر اللہ تعالیٰ سے رحمت طلب کرتا ہے۔ ہر برائی کے وقت اسی سے ڈرتا ہے، ہر قصور سرزد ہونے پر اسی سے معافی مانگتا ہے۔ غرضیکہ اٹھتے بیٹھتے اور دنیا بھر کے کام کاج کرتے ہوئے اس کا وظیفہ اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن اگر اس نے شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ اختیار کیا ہے تو وہ کبھی اس کی یاد سے غافل نہیں رہ سکتا۔ تمام عبادات اسی کی یاد دلاتی ہیں۔ اور تمام دینی کاموں میں اسی سے قوت پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے بڑی سے بڑی نیکی کی اساس بھی ذکر اللہ کو ٹھہرایا۔ معاذ بن انس الجھنی رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، یارسول اللہ جہاد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر اجر پانے والا کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا جو ان میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ اس نے عرض کیا روزہ رکھنے والوں میں سے سب سے زیادہ اجر کون پائے گا؟ آپؐ نے فرمایا جو ان میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والا ہے۔ پھر اس شخص نے اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ ادا کرنے والوں کے متعلق پوچھا۔ تو حضورؐ نے ہر ایک کا یہی جواب دیا کہ جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یاد کرنے والا ہو۔ (مسند احمد)

ممکن ہے اس میں بھی نماز کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ نماز اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی کا دوسرا نام ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۭ ﴿۳۶﴾

(کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس معاملہ میں کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گیا۔ ۳۶)

آیت کا پس منظر

اس آیت کا ایک خاص پس منظر ہے اور وہی اس کا شانِ نزول بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ جو انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی تعلقات کی تہذیب کے لیے کوشاں تھے اور اس راستے میں جو غلط تصورات اور بری رسوم حائل تھیں انہیں موقع کی مناسبت سے ایک ایک کر کے توڑتے جا رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ اس وقت کی دنیا چاہے وہ عرب ہو یا عجم ایک بہت بڑی خرابی میں مبتلا ہے کہ انسان ایک آدم کی اولاد ہونے کے باوجود اور ایک طرح کے ذہنی وقلبی اور جسمانی اور روحانی مقتضیات کے باوصف طبقات کا شکار ہے۔ ان میں سب سے بڑا تفاوت یہ ہے کہ

Marfat.com

غلام کبھی آزاد کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اور وہ آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی آزاد آدمی کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی اسلامی دعوت نے جس طرح بندوں کا اپنے رب سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا، اسی طرح غلامی کے تصور کی بیخ کنی کی اور کل کے غلاموں کو آج کے معزز انسانوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ کسی ہندو شاعر نے ٹھیک کہا:

جس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولیٰ کردیا

نبی کریم ﷺ نے اس تصور کو پختہ کرنے کے لیے اپنے گھر سے اس کا آغاز فرمایا۔ حضرت زید بن حارثہؓ جو آپؐ کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپؐ کو بے حد عزیز تھے ان کی عزت افزائی کے لیے حضرت زینب بنت جحشؓ جو آپؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں کو پیغام نکاح دیا۔ ان کا تعلق خاندان بنی اسد سے تھا جو قبائل میں ایک نہایت معزز قبیلہ تھا۔ ان کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب تھیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ جب حضورؐ نے یہ پیغام دیا تو حضرت زینب نے کہا انا خیر منه نسبا ''میں اس سے نسب میں بہتر ہوں۔'' ابنِ سعد کا بیان ہے کہ انہوں نے جواب میں یہ کہا تھا۔ لا ارضاه لنفسی وانا ایم قریش ''میں اسے اپنے لیے پسند نہیں کرتی، میں قریش کی شریف زادی ہوں۔'' ان کے بھائی عبداللہ ابنِ جحش اور ان کے دیگر عزیزوں نے بھی اس رشتہ پر اعتراض کیا کہ حضرت زید ایک آزاد کردہ غلام اور غیر کفو ہیں، اس لیے ان میں نکاح کیسے ہوسکتا ہے۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔ اور اسے سنتے ہی حضرت زینب اور ان کے سب خاندان والوں نے بلاتامل سرِ اطاعت خم کردیا۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان کا نکاح پڑھایا۔ خود حضرت زید کی طرف سے دس دینار اور ساٹھ درہم مہر ادا کیا، چڑھاوے کے کپڑے دیے اور کچھ سامانِ خوراک گھر کے خرچ کے لیے بھی بھجوادیا۔

یہاں دو باتوں کا اظہار بہت ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ایک شخص جب ایمان لاتا ہے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہوجاتا ہے تو اس پر یہ حقیقت واضح کردی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کی مخالفت ایمان کے بعد کسی صورت بھی جائز نہیں۔ کیونکہ ایمان کے ساتھ سمع واطاعت کا رشتہ ایسا بندھا ہوا ہے جسے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت زینب اور ان کے خاندان نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے حضرت زید کے لیے پیغامِ نکاح کو ناپسند کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے احکام کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک نوعیت یہ ہے کہ آپ کے ارشاد کے متعلق یہ بات بالکل واضح ہوجائے کہ نبی کریم ﷺ نے جو بات فرمائی ہے وہ آپؐ کا قطعی فیصلہ ہے یا اس کے بارے میں وحی نازل ہوچکی ہے۔ تو پھر کسی مومن کے لیے یہ اختیار نہیں رہتا کہ وہ اس کے قبول کرنے میں تامل کرے۔ لیکن دوسری نوعیت یہ ہے کہ یہ معلوم ہوجائے کہ آپؐ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ وحی نہیں ہے بلکہ حضورؐ کی رائے یا تجویز ہے جس پر اپنی رائے پیش کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر صحابہؓ نے ہمیشہ اپنی آراء پیش کیں اور مشورے دیے۔ جنگِ بدر میں لشکر کے پڑاؤ ڈالنے کے موقع پر اور پھر قیدیوں سے فدیہ لینے کے معاملے میں اور بھی بعض مواقع پر صحابہ نے آپ کی رائے کے خلاف اپنی آراء دیں اور بعض دفعہ آنحضرت ﷺ نے کسی کی رائے کو قبول بھی فرمالیا۔ اس معاملے کی نوعیت بھی ایسی تھی۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ اس بارے میں وحی آچکی ہے یا آنحضرت ﷺ کا یہ قطعی فیصلہ ہے تو حضرت زینب اور آپؐ کے خاندان کے لوگ اسے ماننے میں کبھی تامل نہ کرتے، جیسا کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد انہوں نے فوراً اسے قبول کرلیا۔

Marfat.com

آیت کے حکم میں عموم

دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت اگرچہ حضرت زینب کے نکاح کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس میں جو حکم بیان فرمایا گیا ہے وہ اس واقعہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اسلامی آئین کا اصل الاصول ہے اور اس کا اطلاق پورے نظامِ زندگی پر ہوتا ہے۔ کوئی مسلمان انفرادی طور پر، یا مسلمان قوم اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے فیصلے سے اختلاف کا حق نہیں رکھتے۔ کسی ادارے، عدالت، پارلیمنٹ یا ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جس معاملے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی حکم ثابت ہو اس میں وہ خود اپنی آزادیٔ رائے کا استعمال کرے۔ مومن اور مسلمان ہونے کا مطلب ہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے آگے اپنے آزادانہ اختیار سے دستبرداری اختیار کرنا ہے۔ جو شخص ایمان کا دعویٰ بھی رکھتا ہے اور جو قوم اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتی ہے اور پھر وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کے مقابلے میں اپنے اختیار کا دعویٰ بھی کرتی ہے، یہ دراصل ایک متضاد چیز کا دعویٰ ہے جس کا کبھی تحقق نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کے فیصلے کے بعد کسی کا یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اس کی تعمیل میں سخن سازی سے کام لے یا تعمیل سے پہلوتہی کرے۔ اور جو شخص بھی ایسا کرے گا وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔ اب اس کا اسلامی ہدایت سے کوئی رشتہ نہیں۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ ۚ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ؕ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَھَا لِکَیْ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِھِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا ؕ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾

(اے پیغمبر، یاد کرو جب آپ اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو، اور آپ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا، آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس میں زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں، اور جب زید نے اس سے اپنی ضرورت ختم کردی تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کردیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں، اور اللہ کا حکم تو بہرحال ہونے والا تھا۔ ۳۷)

حضرت زینبؓ سے نکاح پر اعتراضوں کا جواب

یہاں سے آیت ۴۸ تک کا مضمون اس وقت نازل ہوا جب حضرت زینبؓ سے نبی کریم ﷺ نکاح کرچکے تھے اور چونکہ اہلِ عرب میں منہ بولے بیٹے کی مطلقہ کو حقیقی بیٹے کی مطلقہ سمجھا جاتا تھا جس سے کوئی باپ کبھی نکاح کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا تو اس لیے منافقین اور مشرکین نے مخالفت کا ایک طوفانِ عظیم برپا کردیا کہ زید بن حارثہ تو محمد (ﷺ) کے منہ بولے بیٹے تھے تو آپؐ نے ان کی مطلقہ سے کیسے نکاح کرلیا جبکہ وہ آپؐ کی بہو رہ چکی تھیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیات میں مخالفین کے طعن و تشنیع کا جواب دینا مقصود نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد ایک غلط مفروضے پر ہے۔ اور سورۃ

Marfat.com

الاحزاب کے آغاز میں اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ یعنی ان کا مفروضہ یہ تھا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کی طرح ہوتا ہے۔ تو قرآنِ کریم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ منہ بولا بیٹا ہونا کوئی رشتہ نہیں۔ بیٹے وہی ہیں جو صلب سے پیدا ہوتے ہیں۔ کسی کو بیٹا کہہ دینے سے وہ بیٹا نہیں بن جاتا اس لیے انہیں ہمیشہ ان کے باپوں کے حوالے سے پکارو، اپنا بیٹا مت کہو۔ چنانچہ اس مفروضے کے غلط ہو جانے کے بعد اعتراض کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ حکم تو اس کے لیے مؤثر ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکا ہو۔ کافروں کے لیے اس حکم کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان آیات میں بھی مسلمانوں کو پروپیگنڈے کے اثرات سے بچانا مقصود ہے۔ اس لیے جو صحیح صورتحال ہے اس کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

لوگوں نے پروپیگنڈے کو اس بنیاد پر بھی اٹھایا کہ نبی کریم ﷺ پہلے سے حضرت زینبؓ سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔ زید سے نکاح محض ایک بہانہ تھا۔ زید نے جب یہ دیکھا کہ آنحضرت ﷺ خود حضرت زینب میں دلچسپی رکھتے ہیں تو انہوں نے طلاق دے دی اور آپؐ نے ان سے نکاح کر لیا۔ چنانچہ اس جھوٹ کا پول کھولنے کے لیے قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو صحیح صورتحال سے آگاہ کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو سب سے پہلی بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپؐ اس وقت کو یاد کریں جب آپؐ اس شخص سے جس پر آپ نے بھی انعام کیا تھا اور اللہ نے بھی انعام کیا تھا یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روک کے رکھو، یعنی اُسے طلاق نہ دو اور اللہ سے ڈرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے حضرت زید کو جب انہوں نے آپ سے مشورہ کیا کہ میں حضرت زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپ نے انہیں بار بار اس سے روکا۔ یہ بار بار میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہاں فعل مضارع استعمال ہوا ہے جو تکرار پر دلالت کرتا ہے۔ اگر بات ایک دفعہ کی ہوتی تو پھر یہاں فعل ماضی ہوتا۔ اور دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ بلاوجہ طلاق دینا یہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی بات ہے۔ اور حضرت زید کے پاس ایسی کوئی معقول وجہ نہ تھی جس کی وجہ سے وہ زینب کو طلاق دینے پر مجبور ہوئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے طلاق دینے کا ذکر کیا تو آپؐ نے ان سے سوال فرمایا کہ کیا زینب کی طرف سے کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آئی ہے جو شک پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہو۔ تو انہوں نے صاف کہا کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں۔ ان کو اگر کوئی شکایت تھی تو خود ان کے الفاظ میں بس یہ تھی کہ **تتعظم علی شرفها** ''وہ میرے مقابل میں اپنے شرفِ خاندانی کے باعث تفوق کا احساس رکھتی ہیں۔'' ظاہر ہے کہ مجرد یہ بات بیوی کو طلاق دینے کے لیے کافی نہیں۔ اب اگر اس اعتراض میں کوئی بھی وزن ہوتا کہ حضورؐ خود نکاح کرنا چاہتے تھے تو اولاً تو آپ کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ آپ پیغامِ نکاح دیتے، نکاح ہو جاتا۔ حضرت زید سے نکاح کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور ثانیاً یہ کہ اگر آپ خود نکاح کے متمنی ہوتے تو آپ حضرت زید کو بار بار طلاق دینے سے نہ روکتے اور اللہ سے نہ ڈراتے۔

انعم اللہ علیه و انعمت علیه کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں حضرت زید کا نام تو بعد میں آیا ہے لیکن اس آیت کے شروع میں ان کے نام کی بجائے ان کا ذکر **انعم اللہ علیه و انعمت علیه** سے کیا گیا ہے اس کا کیا مفہوم ہے؟ اس سے مراد حضرت زید ہیں۔ لیکن وہ احسان کیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ نے ان پر کیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً ان کے حالات بیان کر دیے جائیں۔ ''حضرت زید دراصل قبیلہ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شراحیل کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سعدیٰ بنت ثعلبہ قبیلہ طے کی شاخ بنی معن سے تھیں۔ جب یہ آٹھ سال کے بچے تھے اس وقت ان کی ماں انہیں اپنے میکے لے کر گئیں۔ وہاں بنی قین بن جسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ لے

Marfat.com

گئے ان میں حضرت زید بھی تھے۔ پھر انہوں نے طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انہوں نے مکہ لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں نذر کر دیا۔ نبی کریم ﷺ سے حضرت خدیجہؓ کا جب نکاح ہوا تو حضورؐ نے ان کے ہاں زید کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپؐ کو اس قدر پسند آئے کہ آپ نے انہیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہنچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نبی بنانے والا تھا۔ اس وقت حضرت زید کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ مدت بعد ان کے باپ اور چچا کو پتہ چلا کہ ہمارا بچہ مکہ میں ہے۔ وہ انہیں تلاش کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں آپ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہو اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔ انہوں نے کہا یہ تو آپ نے انصاف سے بھی بڑھ کر درست بات فرمائی ہے۔ آپ بچے کو بلا کو پوچھ لیجیے۔ حضورؐ نے حضرت زید کو بلایا اور ان سے کہا ان دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا۔ آپ نے فرمایا، اچھا تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمہیں پوری آزادی ہے کہ چاہو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو میرے ساتھ رہو۔ انہوں نے جواب دیا میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ ان کے باپ اور چچا نے کہا زید کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اس شخص کے جو اوصاف دیکھے میں ان کا تجربہ کر لینے کے بعد میں اب دنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ زید کا یہ جواب سن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضورؐ نے اسی وقت زید کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ آپ سب لوگ گواہ رہیں آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زید بن محمد کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں پھر جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت پر سرفراز ہوئے تو چار ہستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ایک لمحہ شک و تردد کے بغیر آپ سے نبوت کا دعویٰ سنتے ہی اسے تسلیم کر لیا۔ ایک حضرت خدیجہؓ، دوسرے حضرت زیدؓ، تیسرے حضرت علیؓ اور چوتھے حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۳۰ سال تھی اور ان کو حضورؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے ۱۵ سال گزر چکے تھے۔ ہجرت کے بعد ۴ھ میں نبی کریم ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے ان کا نکاح کر دیا۔ اپنی طرف سے ان کا مہر ادا کیا اور گھر بسانے کے لیے ان کو ضروری سامان عنایت فرمایا۔

آنحضرت ﷺ کے حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے روکنے کے اسباب

حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت زینبؓ کی طبعی ناموافقت آخر رنگ لائی، اختلافات بڑھنے لگے تو حضرت زیدؓ نے بار بار آ کر نبی کریم ﷺ سے ارادۂ طلاق کا اظہار کیا۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ کیا زینب کی طرف سے کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آئی ہے جو شک پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہے؟ تو انہوں نے اعتراف کیا کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں۔ شکایت صرف یہ ہے کہ تَتَعَظَّمُ عَلَیَّ لِشَرَفِهَا ''وہ میرے مقابل میں شرفِ خاندانی کے باعث تفوق کا احساس رکھتی ہیں۔'' چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اسے طلاق کے لیے کافی عذر نہ سمجھتے ہوئے حضرت زیدؓ کے شدتِ احساس کو اس ناگواری کا سبب سمجھا اور آپؐ کو مشورہ دیا کہ اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں روکے رکھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو،

Marfat.com

کیونکہ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں جس کی وجہ سے تم علیحدگی اختیار کرلو۔ بہت ممکن ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سازگاری پیدا ہو جائے۔ لیکن جب دونوں میں اختلاف مزید شدت اختیار کر گیا اور حضرت زیدؓ کے ارادے میں پختگی آنے لگی تو آپ اس کی وجہ سے بہت پریشان ہو گئے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ محسوس فرما رہے تھے کہ میں نے زور دے کر حضرت زینب اور ان کے خاندان کو اس نکاح پر آمادہ کیا تھا جبکہ وہ اس پر راضی نہ تھے۔ اب اگر یہ طلاق ہو جاتی ہے تو اس کا الزام مجھ پر آئے گا۔ ان کا خاندان یہ کہے گا کہ ہم تو اس رشتے کو پہلے ہی بے جوڑ سمجھتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ اور آپ کے حکم کی وجہ سے ہم نے اس کو قبول کر لیا۔ لیکن اب اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اور دوسری آپ کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ آپ یہ سوچنے لگے کہ اب تک تو خاندان کی بعض عورتیں اور بعض منافقات حضرت زینب کو ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی ہونے کا طعنہ دیتی تھیں۔ اب اگر طلاق ہو جاتی ہے تو طعنوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا کہ پہلے تو زینب صرف ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی تھیں اب وہ اس کی مطلقہ ہو جائیں گی اور اس سے ان کی حیثیتِ عرفی کو بہت نقصان پہنچے گا۔ لیکن سب سے زیادہ پریشانی کا سبب ایک اور تھا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اشارہ کر چکا تھا کہ زید جب اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو ان کی مطلقہ خاتون سے آپ کو نکاح کرنا ہوگا۔ حکیم ترمذی اور ابنِ ابی حاتم وغیرہ محدثین نے حضرت علی بن حسین زین العابدین سے روایت نقل کی ہے جن کے الفاظ یہ ہیں **اَوْحَی اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَیْہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ زَیْنَبَ سَیُطَلِّقُھَا زَیْدٌ وَیَتَزَوَّجُھَا بَعْدَہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ** ”یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اشارۃً کہہ دیا تھا کہ حضرت زینب کو زید طلاق دینے والے ہیں اور اس کے بعد وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔“

اور ابنِ کثیر نے ابنِ ابی حاتم کے حوالہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں **ان اللہ اعلم نبیہ انھا ستکون من ازواجہ قبل ان یتزوجھا فلما اتاہ زید لیشکوھا الیہ قال اتق اللہ وامسک علیک زوجک فقال اخبرتک انی سَاُزَوِّجُکَھَا وتخفی فی نفسک مااللہ مبدیہ** ”یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بتلا دیا تھا کہ حضرت زینب بھی ازواجِ مطہرات میں داخل ہو جائیں گی، پھر جب حضرت زید ان کی شکایت لے کر آپ کی خدمت میں آئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تو آپ کو بتلا دیا تھا کہ میں ان سے آپ کا نکاح کرا دوں گا، اور آپ اپنے دل میں اس چیز کو چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔“

نبی کریم ﷺ جانتے تھے کہ عرب کی اس سوسائٹی میں منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور وہ بھی عین اس حالت میں جبکہ مٹھی بھر مسلمانوں کے سوا باقی سارا عرب آپ کے خلاف پہلے ہی خار کھائے بیٹھا تھا۔ اس لیے آپ اس شدید آزمائش میں پڑنے سے ہچکچا رہے اور اس سے بچنا چاہتے تھے۔ اس لیے بار بار آپ حضرت زید کو طلاق سے روکنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ آپ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اہلِ عرب کی مخالفت صرف میری ذات کو نقصان نہیں پہنچائے گی بلکہ اسلام بھی ان کی مخالفت کا ہدف ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ تبنیت کی رسم کو ختم ہونا چاہیے، لیکن کیا اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی نہیں کہ تم جنہیں اپنا لے پالک بنا چکے ہو انہیں اپنی نسبت سے نہیں بلکہ ان کے اصل باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ حکم جیسے جیسے عام ہوگا ویسے ویسے یہ رسم ختم ہوتی جائے گی۔ لیکن پروردگار نے آپ کے اس احساس اور خیال کو آپ کے بلند و بالا مرتبے سے فروتر جانا۔ اس لیے اس ترکِ اولیٰ پر عتاب فرمایا کہ جب ہم آپ کو بتا چکے تھے کہ آپ کو اس رسم کو ختم کرنے کے لیے حضرت زینب سے نکاح کرنا ہے تو پھر آپ کو زید کو بیوی کو طلاق دینے سے روکنا نہیں چاہیے تھا بلکہ انہیں ان کے منشاء پر چھوڑ دیتے اور یا اس پر خاموشی اختیار کرتے۔

Marfat.com

مزید فرمایا کہ آپ لوگوں کے پروپیگنڈا اور طعن و تشنیع سے ڈرتے تھے اور آپ کو یہ خوف تھا کہ اس سے اسلامی مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ کیونکہ اقامتِ دین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمیشہ لوگوں کا خوف یا مصالح کا لحاظ رہا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کبھی کسی احساس کو قدموں کی زنجیر نہیں بننے دیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں اس راہ کے ہر پتھر کو توڑا اور اس مقصد کی خاطر بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کیا۔ آپ اسی سلسلۃ الذھب کی آخری کڑی ہیں اس لیے آپ کو کسی طرح بھی ان باتوں کو ذہن میں آنے نہیں دینا چاہیے تھا۔

ہماری اس وضاحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ آپ اپنے دل میں ایک ایسی بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا، وہ یہ بات نہ تھی کہ آپ حضرت زینب سے نکاح کی خواہش رکھتے تھے بلکہ اصل میں یہ بات تھی کہ اس نکاح کے نتیجے میں آپ کی ذات اور اسلامی کاز کو جس نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اس سے بچنے کے لیے نکاح سے گریز کر رہے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی اطلاع دے چکا تھا۔ اور اس گریز کا امکان صرف ایک ہی صورت میں تھا کہ زید اپنی بیوی کو طلاق نہ دیں تا کہ اس ابتلا میں آپ کو مبتلا نہ ہونا پڑے، اس لیے آپ ان کو طلاق سے روک رہے تھے۔ چنانچہ اسی کی تائید اگلی آیت سے بھی ہو رہی ہے کہ جب حضرت زید نے اپنی بیوی سے تعلق ختم کر دیا یعنی طلاق دے دی اور پھر عدت بھی گزر گئی، یاد رہے کہ وطر کا معنی اگرچہ حاجت اور ضرورت ہے لیکن ضرورت کا تصور وابستگی کے معنی کو بھی متضمن ہے جسے ہم تعلق سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس لیے اگرچہ اس جملے کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ جب زید نے اپنی ضرورت پوری کر لی اور یہ صحیح بھی ہے، لیکن چونکہ یہ کسی حد تک ذوق کو کھٹکتا ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس کا ترجمہ یوں کیا جائے کہ جب زید نے اپنی ضرورت یا اپنا تعلق اپنی بیوی سے ختم کر دیا یا انتہا کو پہنچا دیا۔ یعنی طلاق دے دی اور پھر عدت بھی گزر گئی کیونکہ طلاق کے بعد عدت کے اختتام سے پہلے چونکہ رجوع کا حق رہتا ہے اس لیے عدت گزر جانے سے پہلے تعلق ختم نہیں ہوتا بلکہ کسی وقت بھی از سر نو استوار ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی تعلق ہی کی ایک صورت ہے کہ عدت گزرنے تک شوہر کو اس بات کا اطمینان نہیں ہوتا کہ اس کی بیوی اس کی امانت کی امین تو نہیں۔ یہ بھی ایک تعلق ہے جو عدت ختم ہونے کے بعد ختم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب زید اپنی بیوی سے تعلق ختم کر چکے تو تب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کا نکاح زید کی مطلقہ سے کر دیا۔ یہ لفظ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نکاح سے بچنا چاہتے تھے نہ کہ شوق پورا کرنے کے لیے راستے تلاش کر رہے تھے۔ اور آپ اس کے نتائج کی فکر سے پریشان تھے تو اللہ تعالیٰ نے خود آپ کا نکاح کر دیا تا کہ اس رسمِ بد کو ختم کر دیا جائے اور آئندہ مسلمانوں پر اپنے لے پالکوں کے بارے میں کوئی تنگی باقی نہ رہے اور وہ ان کی مطلقات یا بیوگان سے نکاح کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کریں جبکہ وہ عدت گزار چکیں۔ اور اس رسمِ بد کا ختم ہونا چونکہ بہت ضروری تھا اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بہر حال ہو کے رہنا تھا۔ صرف مناسب وقت کا انتظار تھا۔ جب وقت آ گیا تو تمام موانع اور مشکلات کے باوجود اس رسمِ جاہلی کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔

یہ جو فرمایا گیا کہ ہم نے آپ کا نکاح حضرت زینب سے کر دیا۔ بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو یہ امتیاز بخشا کہ خود ہی نکاح کر دیا اور عام شرائطِ نکاح سے اس کو مستثنیٰ قرار دے دیا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس نکاح کا حکم دیا کہ اب آپ شرعی شرائط و قواعد کے مطابق زینب سے نکاح کر لیں۔ یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عدت گزرنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت زید ہی کے واسطہ سے حضرت زینبؓ کو پیغامِ نکاح دیا۔ انہوں نے استخارہ کے بعد اس کو منظور کیا اور حضرت زینب کے بھائی ابو احمد بن جحش نے حضورؐ کے ساتھ ان کا نکاح پڑھایا۔ اور آپ نے چار سو درہم مہر مقرر فرمایا۔ اور نہایت اہتمام کے ساتھ ولیمہ کیا۔ ابنِ ہشام نے اس تمام تفصیل کو بیان کیا ہے۔

Marfat.com

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۙ ﴿۳۸﴾ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾

(نبی کے لیے ایسے کام میں کوئی تنگی نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے فرض کر دیا ہے، یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے معاملے میں جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔ ۳۸) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ حساب کے لیے کافی ہے۔ ۳۹)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

ان دونوں آیات میں دو حوالوں سے نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ایک تو یہ کہ تبنیت کی رسمِ جاہلی کو ختم کرنے کے لیے جو آپ پر عظیم ذمہ داری ڈالی گئی یہ آپ کو کسی تنگی میں ڈالنے کے لیے نہیں تھی۔ یہ آپ کی تربیت اور اللہ تعالیٰ کے دین کی برومندی اور اس کے اثر و نفوذ کے لیے ایک لازمی سنت ہے جس سے ہمیشہ انبیائے کرام کو گزارا جاتا ہے۔ایسے مراحل سے گزرنے کے بعد آپ کی ذات اور آپ کی عملی زندگی امت کے لیے مینارۂ نور بنے گی۔اور ہمیشہ ایسے مواقع پر آپ ہی کی ذات سے حجت پکڑی جائے گی۔اور جیسے جیسے آپ ان مراحل سے گزریں گے ویسے ویسے آپ کے اندر وہ تصلب اور استقامت آئے گی جو آئندہ آنے والے مراحل کے لیے رہنما بنے گی۔

اور تسلی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایسے مراحل سے گزرنا آپ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سابق انبیاء کو بھی اسی طرح کے مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ کیونکہ بگڑے ہوئے لوگ اور طاغوت کے پرستار کبھی بھی صحیح بات کو قبول کرنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ چونکہ حق کی پیروی ان کے مفادات کی قاتل ہوتی ہے اس لیے جب وہ اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس کرتے ہیں تو اہلِ حق کے لیے مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔اور یہ روایت ہر پیغمبر اور رسول کے دور میں دہرائی جاتی رہی ہے۔اور ایسی ہی صورتحال میں اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں۔ان امتحانوں سے گزرنے کی وجہ سے ان کے اندر کے اوصاف اجاگر ہوتے ہیں اور ان کی پیروی کرنے والوں میں مخلصین اور منافقین کی الگ الگ شناخت قائم ہو جاتی ہے۔

حضرات انبیاء کے لیے اللہ تعالیٰ کی سنت

ان آیات سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر پر کوئی چیز فرض کر دیتا ہے تو پیغمبر کے لیے اس کا ادا کرنا حالات کے تابع نہیں رہتا بلکہ وہ انتہائی ناموافق حالات میں بھی بہر صورت اپنی ذمہ داری ادا کرتا ہے۔ وہ اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ایک قطعی فیصلہ ہوتا ہے۔اسے ہر حال میں بروئے کار لانا ہوتا ہے۔

دوسری آیتِ کریمہ الذین خلوا من قبل کی صفت ہے کہ پہلے انبیاء جو گزرے ہیں آپ ان کی تاریخ پڑھ کر دیکھیں ان میں دو صفات قدم قدم پر نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام نازل ہوتا ہے وہ ہر صورت میں اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔

Marfat.com

اور دوسری یہ بات کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے۔ انہیں نہ کسی مخالفت کی پرواہ ہوتی ہے نہ وہ کسی ملامت کو خاطر میں لاتے ہیں۔ آپ تو سید الانبیاء ہیں آپ میں یہ صفت ان سے بھی زیادہ نمایاں ہونے کی ضرورت ہے۔ رسمِ جاہلی کی پامالی میں جس صورتحال سے آپ کو دوچار ہونا پڑا ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ آپ کو بہر حال اپنے پیشروؤں کی طرح اپنا فرض انجام دینا ہے۔

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
یہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

آخری جملے میں حَسِيْبًا کی تفسیر ابنِ کثیر اور کشاف نے ناصر اور معین کی ہے۔ یعنی آپ کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ ہر طرح کے خطرات میں اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت کرنے والا اور مددگار ہے۔ لیکن عام طور پر حسیب کا معنی حساب کرنے والا کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ جملہ تنبیہ کے مفہوم میں ہوگا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے پیغام کی تبلیغ میں دوسروں کے خوف یا ملامت کی وجہ سے کوئی کوتاہی رہ گئی تو اللہ تعالیٰ محاسبہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

(محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۴۰)

مخالفین کے اعتراضات کا جواب اور آنحضرت ﷺ کے منصبی تقاضے

نبی کریم ﷺ کے حضرت زینب سے نکاح کے سلسلے میں جن لوگوں نے مخالفت کا طوفان اٹھایا اس کی سب سے بڑی بنیاد یہ تھی کہ زید نبی کریم ﷺ کے منہ بولا بیٹا ہونے کی وجہ سے حقیقی بیٹے کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی بیوی حضورؐ کی بہو ہے تو طلاق کی صورت میں وہ ان سے نکاح کیسے کر سکتے تھے؟ اسے بنیاد بنا کر انہوں نے عجیب وغریب الزامات لگائے اور کہانیاں تراشیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اسی بنیادی بات کا جواب دیا کہ محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ حضرت زید کے باپ نہیں بلکہ وہ کسی مرد کے باپ نہیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں، آپ کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو چار بیٹے دیے اور چاروں ہی بچپن ہی میں فوت ہوگئے۔ اس آیت کے نزول کے وقت تین بیٹے فوت ہو چکے تھے اور چوتھے حضرت ابراہیم بعد میں پیدا ہوئے ہیں اور وہ بھی بچپن ہی میں فوت ہوگئے۔ اور رجال رجل کی جمع ہے، بالغ مردوں کو کہتے ہیں۔ اس طرح سے کلام میں زیادہ زور پیدا کرکے اس الزام کی تردید کی گئی کہ جب آپؐ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں تو کسی مطلقہ بہو سے شادی کرنے کا کیا سوال ہے۔ رہی یہ بات کہ چلیے یہ مان بھی لیا جائے کہ زید آپ کے بیٹے نہیں ہیں لیکن اہلِ عرب چونکہ منہ بولے بیٹے کو بیٹا ہی سمجھتے ہیں تو کیا ضروری تھا کہ آپؐ ان کی مطلقہ سے نکاح کرتے اور بلاوجہ مخالفین کی مخالفت کو دعوت دیتے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ رسول دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہر قدم اٹھاتا اور ہر فیصلہ کرتا ہے۔ وہ ہر بگڑی ہوئی چیز کو درست کرتا اور ہر صحیح چیز کو تقویت دیتا ہے۔ چونکہ یہ رسمِ جاہلی بہت

Marfat.com

سے مفاسد کا باعث تھی اس لیے رسول ہونے کی حیثیت سے آپ کی یہ ذمہ داری تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس رسم کا استیصال کرتے۔قطع نظر اس سے کہ آپ کو اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑتی۔تو اس پر کہنے والوں نے کہا کہ رسول تو پہلے بھی آئے ہیں اور آئندہ بھی آئیں گے، کیا ضروری تھا کہ آپ ہی اس رسم کے خاتمے کا ذریعہ بنیں۔کوئی آنے والا رسول اس ذمہ داری کو ادا کر سکتا تھا جبکہ آپ کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں حالات بہت حد تک سازگار ہو چکے ہوتے۔اس کے جواب میں فرمایا کہ آپ صرف رسول ہی نہیں ہیں بلکہ خاتم النبیین بھی ہیں۔یعنی آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔آپ کے ہاتھوں اس سلسلۃ الذہب کی تکمیل ہوگئی ہے۔اس لیے بہت ضروری ہے کہ ہر ایسی رسم جس سے اسلامی تہذیب کو نقصان پہنچتا ہو اسے آپ کے ہاتھوں ختم کرایا جائے۔

یادرہے کہ بعض لوگوں نے یہ بات بھی کہی ہے کہ آپ خاتم النبیین تو ہیں لیکن خاتم الرسل نہیں ہیں۔اس لیے یہ بات جان لینا بہت ضروری ہے کہ نبی اور رسول کے درمیان عام اور خاص کی نسبت ہے۔یعنی ہر رسول یقیناً نبی ہوتا ہے۔لیکن ہر نبی کا رسول ہونا لازمی نہیں۔تو جب آنحضرت ﷺ خاتم الانبیاء ہیں تو خاتم الرسل ہونا تو اور بھی ضروری ہے۔یہ بھی یادرہے کہ خاتَم اور خاتِم دونوں لفظ اہلِ لغت کے نزدیک بالکل ہم معنی ہیں۔جن لوگوں نے اس میں ابہام پیدا کیا ہے انہوں نے لغوی خیانت سے کام لیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس وقت نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں اس رسمِ جاہلی کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا قباحت تھی۔رہا مخالفین کا شوروغوغا اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت سے بھی باخبر ہے۔وہ زید کو بھی جانتا ہے اور زینب کو بھی جانتا ہے۔اپنے پیغمبر سے بھی واقف ہے۔اور زید و زینب کے ساتھ ان کے رشتہ کی نوعیت سے بھی باخبر ہے۔اس لیے اصلاح کا جو عمل بروئے کار آیا ہے اور جس طرح اس رسم کو ختم کیا گیا ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوا ہے۔جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ کا محیطِ کل علم ہی ہر چیز کی باریکیوں اور حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے دوسرے اس کی ساری حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

ہمارے ملک میں ختم نبوت کے خلاف ایک بہت بڑا فتنہ اٹھایا گیا۔پارلیمنٹ نے اگرچہ اسے اقلیت قرار دے دیا لیکن ابھی تک وہ فتنہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کے لیے اپنی مساعی میں لگا ہوا ہے۔اور ہماری حکومت اسے کھلی چھٹی دے چکی ہے۔علماء نے اس پر نہایت وقیع کام کیا ہے اور اس کے کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا۔سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے ان کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کے تاروپود کو تفہیم القرآن میں پوری طرح بکھیر کر رکھ دیا ہے اور آخر میں اسے ایک ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا ہے۔اسی طرح مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے بھی اس پر قابلِ قدر کام کیا ہے اور ختم نبوت پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔معارف القرآن میں اسی کتاب سے چند عنوانات کے تحت چند احادیث جمع کی ہیں، ہم ان کی اہمیت کے پیشِ نظر انہیں یہاں نقل کر رہے ہیں۔

آپ ؐ کا خاتم النبیین ہونا آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ ؑ کے نزول کے منافی نہیں

چونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ قیامت سے پہلے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر دنیا میں تشریف لائیں گے اور دجالِ اعظم کو قتل کریں گے اور اس وقت ہر گمراہی کو ختم کریں گے جس کی تفصیل احقر کے رسالہ ''التصریح بما تواتر فی نزولِ المسیح'' میں مذکور ہے۔

Marfat.com

مرزا قادیانی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان میں اٹھایا جانا اور پھر آخر زمانے میں تشریف لانا جو قرآن و سنت کی بے شمار نصوص سے ثابت ہے ان کا انکار کر کے خود مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور استدلال میں یہ پیش کیا کہ اگر حضرت عیسیٰ بن مریم نبی بنی اسرائیل کا پھر دنیا میں آنا تسلیم کیا جائے تو یہ آنحضرت ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے منافی ہوگا۔

جواب بالکل واضح ہے کہ خاتم النبیین اور آخر النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص عہدۂ نبوت پر فائز نہ ہوگا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سے پہلے جس کو نبوت عطا ہو چکی ہے ان کی نبوت سلب ہو جائے گی یا ان میں سے کوئی اس عالم میں پھر نہیں آسکتا۔ البتہ آنحضرت ﷺ کے بعد جو بھی آپ کی امت میں اصلاح و تبلیغ کے لیے آئے گا وہ اپنے منصب نبوت پر قائم ہوتے ہوئے اس امت میں اصلاح کی خدمت آنحضرت ﷺ کی تعلیمات ہی کے تابع انجام دے گا جیسا کہ احادیث صحیحہ میں تصریح ہے۔

والمراد بكونه عليه السلام خاتمهم انقطاع حدوث وصف النبوة فى احدمّن الثقلين بعد تخليته عليه السلام بهافى هذا النشأة ولايقدح فى ذلك ماجمعت عليه الامة واشتهرت فيه الاخبار ولعلها بلغت مبلغ التواتر المعنوى و نطق به الكتٰب علىٰ قول و وجب الايمان به واكفر منكره كالفلاسفة من نزول عيسىٰ عليه السلام اٰخرالزمان لانّه كان نبيًّا قبل ان يحلى نبينا صلى الله عليه وسلم بالنبوة فى هذه النشاءة

''یعنی رسول اللہ ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے سے یہ مراد ہے کہ وصفِ نبوت آپؐ کے بعد منقطع ہو گیا، اب کسی کو یہ وصف اور منصب نہیں ملے گا، اس سے اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا جس پر امت کا اجماع ہے اور قرآن اس پر ناطق ہے اور احادیث رسول جو تقریباً درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اس پر شاہد ہیں وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں نازل ہوں گے کیونکہ ان کو نبوت اس دنیا میں ہمارے نبی ﷺ سے پہلے مل چکی تھی۔''

نبوت کے مفہوم کی تحریف ظلّی اور بروزی نبوت کی ایجاد

اس مدعی نبوت نے دعویٰ نبوت کا راستہ ہموار کرنے کے لیے ایک نئی چال یہ چلی کہ نبوت کی ایک نئی قسم ایجاد کی جس کا قرآن و سنت میں کوئی وجود و ثبوت نہیں اور پھر کہا کہ یہ قسم نبوت کی حکم قرآنی ختم نبوت کے منافی نہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس نے نبوت کے مفہوم میں وہ راستہ اختیار کیا جو ہندوؤں اور دوسری قوموں میں معروف ہے کہ ایک شخص دوسرے جنم میں کسی دوسرے کے روپ میں آسکتا ہے اور پھر یہ کہا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے مکمل اتباع کی وجہ سے آپ کا ہم رنگ ہو گیا ہو اس کا آنا گویا خود آپؐ ہی کا آنا ہے وہ در حقیقت آپ ہی کا ظل اور بروز ہوتا ہے اس لیے اس کے دعوے سے عقیدۂ ختم نبوت متاثر نہیں ہوتا۔

Marfat.com

مگراول تو خود یہ نوایجاد نبوت اسلام میں کہاں سے آئی، اس کے علاوہ مسئلہ ختم نبوت چونکہ عقائد اسلامیہ کا ایک بنیادی عقیدہ ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کو مختلف عنوانات سے مختلف اوقات میں ایسا واضح کر دیا ہے کہ کسی تحریف کرنے والے کی تحریف چل نہیں سکتی، اس جواب کی پوری تفصیل تو احقر کی کتاب ختم نبوت ہی میں دیکھی جاسکتی ہے یہاں چند چیزیں بقدر ضرورت پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں تمام کتب حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت اسناد صحیح کے ساتھ آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتاً فاحسنه واجمل الاموضع لبنة من زوایة فجعل الناس یطوفون به ویعجبون له ویقولون هلاّ وضعت هذه اللبنة وانا خاتم النبیین، رواه احمد والنسائی والترمذی وفی بعض الفاظه فکنت انا سددت موضع اللبنة و ختم بی البنیان،

"میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک مکان بنایا ہو اور اس کو خوب مضبوط اور مزین کیا ہو مگر اس کے ایک گوشہ میں دیوار کی ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہو تو لوگ اس کو دیکھنے کے لیے اس میں چلیں پھریں اور تعمیر کو پسند کریں مگر سب یہ کہیں کہ اس مکان بنانے والے نے یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی جس سے تعمیر بالکل مکمل ہو جاتی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (قصر نبوت کی) وہ آخری اینٹ میں ہوں اور بعض الفاظ حدیث میں ہے کہ میں نے اس خالی جگہ کو پر کر کے قصر نبوت کو مکمل کر دیا۔"

اس تمثیل بلیغ کا حاصل یہ ہے کہ نبوت ایک عالی شان محل کی طرح ہے جس کے ارکان انبیاء علیہم السلام ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے یہ محل بالکل تیار ہو چکا تھا اور اس میں صرف ایک اینٹ کے سوا کسی اور قسم کی گنجائش تعمیر میں باقی نہیں تھی۔ آنحضرت ﷺ نے اس جگہ کو پر کر کے قصر نبوت کی تکمیل فرما دی اب اس میں نہ کسی نبوت کی گنجائش ہے نہ رسالت کی۔ اگر نبوت یا رسالت کی کچھ اقسام مان لی جائیں تو اب ان میں سے کسی قسم کی گنجائش قصرِ نبوت میں نہیں ہے۔

صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک دوسری حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

کانت بنواسرائیل تسوسهم الانبیاء کلما هلک نبی خلفه نبی و انه لانبی بعدی و سیکون خلفاء فیکثرون الحدیث.

"بنی اسرائیل کی سیاست اور انتظام خود انبیاء کے ہاتھ میں تھا جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا نبی اس کے قائم مقام ہو جاتا تھا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ میرے خلیفہ ہوں گے جو بہت ہوں گے۔"

اس حدیث نے یہ بھی واضح کر دیا کہ آنحضرت ﷺ چونکہ خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا تو امت کی ہدایت کا انتظام کیسے ہوگا؟ اس کے متعلق فرمایا کہ آپ کے بعد امت کی تعلیم و ہدایت کا انتظام آپ کے خلفاء کے ذریعہ سے ہوگا جو رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مقاصد نبوت کو پورا کریں گے اگر ظلی بروزی کوئی

Marfat.com

نبوت کی قسم ہوتی یا غیر تشریعی نبوت باقی ہوتی تو ضرور تھا کہ یہاں اس کا ذکر کیا جاتا کہ اگرچہ عام نبوت ختم ہو چکی مگر فلاں قسم کی نبوت باقی ہے۔ جس سے اس عالم کا انتظام ہوگا۔ اس حدیث میں صاف واضح الفاظ میں بتلا دیا کہ نبوت کی کوئی قسم آپ کے بعد باقی نہیں اور ہدایت خلق کا کام جو پچھلی امتوں میں انبیاء بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا وہ اس امت میں آپ کے خلفاء سے لیا جائے گا۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثِ مرفوع ہے۔

لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ.

''یعنی نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا بجز مبشرات کے۔''

مسند احمد وغیرہ میں حضرت صدیقہ عائشہؓ اور ام کرز کعبیہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

لايبقى بعدى من النبوة شيء الا المبشرات قالوا يارسول الله وما المبشرات قال الرؤيا الصّالحة يراها المسلم اوترى له (طبرانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے کذا فی الکنز)

''میرے بعد نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا بجز مبشرات کے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مشرات کیا چیز ہے؟ فرمایا سچے خواب جو مسلمان خود دیکھے یا اس کے متعلق کوئی دوسرا دیکھے۔''

اس حدیث نے کسی قدر وضاحت سے بتلا دیا کہ نبوت کی کوئی قسم تشریعی یا غیر تشریعی اور بقول مرزا قادیانی ظلی یا بروزی آنحضرت ﷺ کے بعد باقی نہیں، صرف مبشرات یعنی سچے خواب لوگوں کو آئیں گے جن سے کچھ معلومات ہو جائیں گی۔

اور مسند احمد اور ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان الرسالة والنبوة قدانقطعت فلارسول بعدى ولا نبى، رواه الترمذى و وقال هذا حديث صحيح.

''بے شک رسالت اور نبوت میرے بعد منقطع ہو چکی ہے، میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ نبی۔''

اس حدیث نے واضح کر دیا کہ غیر تشریعی نبوت بھی آپ کے بعد باقی نہیں اور ظلی بروزی تو نبوت کی کوئی قسم ہی نہیں نہ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز معروف ہے۔

اس جگہ مسئلہ ختم نبوت کی احادیث جمع کرنا مقصود نہیں وہ تو دو سو سے زیادہ رسالہ ختم نبوت میں جمع کر دی گئی ہیں صرف چند احادیث سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ مرزائی قادیانی نے جو بقاءِ نبوت کے لیے ظلی اور بروزی کا عنوان ایجاد کیا ہے اول تو اسلام میں اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں اور بالفرض ہوتی بھی تو ان احادیث مذکورہ نے واضح طور پر یہ بتلا دیا کہ آپ کے بعد نبوت کی کوئی قسم کسی طرح کی باقی نہیں ہے۔

اسی لیے صحابہ کرام سے لے کر آج تک امتِ مسلمہ کے سب طبقات کا اجماع اس عقیدہ پر رہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی کسی قسم کا نبی یا رسول نہیں ہو سکتا جو دعویٰ کرے کہ وہ کاذب منکرِ قرآن اور کافر ہے اور صحابہ کرام کا سب سے

Marfat.com

پہلا اجماع اسی مسئلہ پر ہوا جس کی رو سے مسیلمہ کذاب مدعی نبوت سے خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں جہاد کر کے اس کو اور اس کے ماننے والوں کو قتل کیا گیا۔

ائمہ سلف اور علماء امت کے اقوال وتصریحات بھی اس معاملہ میں رسالہ ''ختم نبوت'' کے تیسرے حصہ میں بڑی تفصیل سے لکھ دیے گئے ہیں اس جگہ چند کلمات نقل کیے جاتے ہیں۔

ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے،

اخبر اللہ تعالیٰ فی کتابہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السنۃ المتواترۃ عنہ انہ لانبی بعدہ لیعلموا ان کل من ادعی ھذا المقام بعدہ فھو کذاب افاک دجال ضال مضل ولو حرّق وشعبذواتی بانواع السحر والطلاسم والنیر نجیات فکلھا محال وضلال عند اولی الالباب کما اجری اللہ سبحانہ علی ید الاسود العنسی بالیمن ومسیلمۃ الکذاب بالیمامۃ من الاحوال الفاسدۃ والاقوال الباردۃ ماعلم کل ذی لب و فھم وحجی انھما کاذبان ضالان لعنھما اللہ تعالیٰ وکذلک کلّ مُدع لذٰلک الی یوم القیمۃ حتی یختموا بالمسیح الدجال، (ابنِ کثیر)

''اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ ﷺ نے احادیث متواترہ میں خبر دی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں تا کہ لوگ سمجھ لیں کہ آپ کے بعد جو شخص اس مقامِ نبوت کا دعویٰ کرے وہ کذاب، مفتری، دجال، گمراہ، گمراہ کرنے والا ہے۔ اگر چہ وہ کتنی ہی شعبدہ بازی کرے اور قسم قسم کے جادو اور طلسم اور نیرنگیاں دکھلائے کہ سب کے سب محال اور گمراہی ہیں عقل والوں کے نزدیک جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسود عنسی (مدعی نبوت) کے ہاتھ پر یمن میں اور مسیلمۂ کذاب (مدعی نبوت) کے ہاتھ پر یمامہ میں اس طرح کے حالاتِ فاسدہ اور بے ہودہ اقوال ظاہر کرائے جن کو دیکھ کر سنکر ہر عقل وفہم والے نے سمجھ لیا کہ یہ دونوں کاذب اور گمراہ ہیں اللہ ان پر لعنت فرمائے۔ اسی طرح جو شخص بھی قیامت تک نبوت کا دعویٰ کرے وہ کاذب وکافر ہے یہاں تک کہ مدعیانِ نبوت کا یہ سلسلہ مسیح دجال پر ختم ہوگا۔''

امام غزالیؒ نے اپنی کتاب ''الاقتصاد فی الاعتقاد'' میں آیتِ مذکورہ کی تفسیر اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں۔

ولیس فیہ تاویل ولا تخصیص ومن اَوَّلَہٗ بتخصیص فکلامہ من الھذیان لایمنع الحکم بتکفیرہ لانّہ مکذّبٌ لھذا النص الذی اجمعت الامۃ علیٰ انہ غیر ماوّل ولا مخصوص

''اس آیت میں کسی تاویل یا تخصیص کی گنجائش نہیں اور جو شخص تاویل کر کے اس میں کوئی تخصیص نکالے اس کا کلام ہذیان کی قسم ہے اور یہ تاویل اس کو کافر کہنے سے نہیں روک سکتی کیونکہ وہ اس آیت کی تکذیب کر رہا ہے جس کے متعلق امت کا اجماع ہے کہ وہ ماول یا مخصوص بالکل نہیں۔''

Marfat.com

اور قاضی عیاض ؒ نے اپنی کتاب شفا میں نبی کریم ﷺ کے بعد دعویٰ نبوت کرنے والے کو کافر اور کذاب اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرنے والا اور آیتِ مذکورہ کا منکر کہہ کر یہ الفاظ لکھے ہیں۔

واجمعت الامة علی حمل هذا الکلام علیٰ ظاهره وان مفهومه المراد به دون تاویل ولا تخصیص فلاشک فی کفر هؤلاء الطوائف کلها قطعاً اجماعاً وّسمعاً

"امت نے اجماع کیا ہے کہ اس کلام کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے اور اس پر کہ اس آیت کا نفس مفہوم ہی مراد ہے بغیر کسی تاویل یا تخصیص کے اس لیے ان تمام فرقوں کے کفر میں کوئی شک نہیں، (جو کسی مدعیِ نبوت کی پیروی کریں) بلکہ ان کا کفر قطعی طور پر اجماعِ امت اور نقل یعنی کتاب وسنت سے ثابت ہے۔"

رسالہ ختم نبوت کے تیسرے حصے میں ائمہ دین اور ہر طبقے کے اکابر علماء کے بہت سے اقوال جمع کر دیے گئے ہیں اور جو یہاں نقل کیے گئے ہیں ایک مسلمان کے لیے وہ بھی کافی ہیں۔ واللہ اعلم۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾ وَّ
سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٤٢﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ
لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿٤٣﴾
تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿٤٤﴾ يٰاَيُّهَا
النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٤٥﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى
اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ
اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿٤٧﴾ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ
اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٤٨﴾ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ
تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ
وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿٤٩﴾ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ

Marfat.com

الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ
وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ
الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ
اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۤ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ
قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ
لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٥٠ تُرْجِيْ
مَنْ تَشَاۗءُ مِنْهُنَّ وَتُـــْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ
مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ
وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۝٥١ لَا يَحِلُّ لَكَ
النِّسَاۗءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ
اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي
كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۝٥٢ ع

رکوع: ۶۔ (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔ ۴۱) اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہے۔ ۴۲) وہی ہے جو تم پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تا کہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے، اور وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔ ۴۳) ان کا خیر مقدم جس دن وہ اس سے ملیں گے سلام سے ہوگا، اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے باعزت صلہ تیار کر رکھا ہے۔ ۴۴) اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا

Marfat.com

ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ ۴۵) اور اللہ کی طرف اس کے اذن سے دعوت دینے والا بنا کر، اور ایک روشن چراغ بنا کر۔ ۴۶) اور ایمان لانے والوں کو بشارت دیجیے ان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا فضل ہے۔ ۴۷) اور کافروں اور منافقوں کی پرواہ نہ کیجیے اور ان کی اذیت رسانیوں کو نظر انداز کیجیے، اور اللہ پر بھروسہ رکھئے، اور اللہ کارساز کے طور پر کافی ہے۔ ۴۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کا تمہیں لحاظ کرنا ہو، پس ان کو کچھ دے دلا دو اور خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دو۔ ۴۹) اے نبی ہم نے حلال کی ہیں آپ کے لیے آپ کی وہ بیویاں جنہیں آپ نے ان کے مہر ادا کیے اور وہ عورتیں جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے آپ کی ملکیت میں آئیں، اور آپ کی چچا کی بیٹیوں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیوں اور آپ کے ماموں کی بیٹیوں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیوں میں سے بھی ان کو حلال ٹھہرایا جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے اور اس مومن عورت کو بھی جو اپنی ذات نبی کو ہبہ کر دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں یہ رعایت خالصتاً آپ کے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے نہیں، ہمیں خوب معلوم ہے ہم نے جو کچھ ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں فرض کیا ہے تاکہ آپ پر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ ۵۰) آپ ان بیویوں میں سے جس کو چاہیں اپنے سے الگ رکھیں اور جس کو چاہیں اپنے ساتھ رکھیں، اگر آپ ان میں سے کسی کے طالب بنیں جن کو آپ نے دور کر دیا تھا اس میں بھی کوئی حرج نہیں، یہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں، اور وہ اس پر راضی رہیں جو کچھ بھی آپ ان سب کو دیں، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اور اللہ علم رکھنے والا اور بردبار ہے۔ ۵۱) اس کے بعد آپ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ اس کی اجازت ہے کہ آپ ان کی جگہ دوسری بیویاں لے آئیں چاہے ان کا حسن آپ کو کتنا ہی اچھا لگے، سوائے لونڈیوں کے، اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔ ۵۲)

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱذْكُرُوا ٱللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٤١﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٤٢﴾

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔ ۴۱) اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔ ۴۲)

مسلمانوں کو الزامات کے مقابلے میں ثابت قدمی کی تاکید

یہ آیاتِ کریمہ اس وقت نازل ہوئی ہیں جب حضرت زینبؓ سے نکاح کے باعث مشرکین اور منافقین نے آنحضرت ﷺ کے خلاف محاذ آرائی شروع کر رکھی تھی اور ہر طرح کی شرافت سے تہی دامن ہو کر آپؐ پر الزامات کی بوچھاڑ کی جا رہی تھی۔ وہ وقت مسلمانوں کے لیے جذبات کے شدید امتحان کا وقت تھا۔ مخلص مسلمان ان بے ہودگیوں اور یاوہ گوئیوں کو دیکھ کر کچھ کر گزرنا چاہتے تھے۔ ان کے دلوں میں مقابلے کا ایک طوفان برپا تھا۔ لیکن کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو مخالفین کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات سے اثر قبول کر رہے تھے۔ چنانچہ

Marfat.com

دونوں طرح کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اس طوفانِ بدتمیزی پر نہ تو مشتعل ہونے کی ضرورت ہے اور نہ کمزور طبیعت والوں کے لیے ان اشتہابات سے اثر قبول کرنے کا کوئی موقع ہے اور نہ مخالفین کو ان کی زبان میں جواب دینے کی ضرورت ہے بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ ان اشرار کے غوغا سے بے پرواہ ہو کر اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کریں اور صبح وشام اس کی تسبیح کریں۔ کیونکہ مومن کی اصل صفت اللہ تعالیٰ کی یاد ہے۔ یہ ایک ایسی پناہ اور سپر ہے جو انسان کی ہر طرح کے حالات میں حفاظت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یاد کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے۔ اور قرآنِ کریم نے انتہائی ناموافق حالات میں جہاں صبر کا حکم دیا ہے وہیں نماز سے مدد لینے کی ہدایت بھی فرمائی ہے۔

ذکر کا مفہوم زبان سے اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا ہے اور صبح وشام تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات کا استحضار اور اس کی بلند و بالا ذات اور اس کی عظمت میں اپنے آپ کو گم کر دینا ہے۔ اور زندگی کے معاملات کو انجام دیتے ہوئے قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کے احکام کو دل و دماغ میں متحضر کر کے ان پر عمل کرنا ہے۔ اور جن مواقع پر تسبیحات یا دعاؤں کی ہدایت کی گئی ہے ان تسبیحات اور دعاؤں کو وردِ زبان بنانا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝

(وہی ہے جو تم پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تا کہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے، اور وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔ ۴۳)

صلوٰۃ کا مفہوم

يُصَلِّيْ ...... صلوٰۃ سے ہے۔ یہ ایسا لفظ ہے جس کی نسبت بدل جانے سے معنی بدل جاتا ہے۔ یہ لفظ جب عَلٰی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے۔ اگر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے رحمت نازل کرنا، اور مہربانی اور شفقت فرمانا۔ اور جب اس کی نسبت ملائکہ کی طرف ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے دعائے رحمت و مغفرت کا۔ اور جب اس کی نسبت انسانوں کی طرف ہو، تو اس کا معنی ہوتا ہے درود بھیجنا۔ قرآنِ کریم نے تینوں معنوں میں اس لفظ کو استعمال کیا۔ پہلے دونوں معنوں کی مثال تو پیشِ نظر آیت میں موجود ہے۔ اور تیسرا معنی کی مثال اس مشہور آیت میں ہے جسے عام طور پر پڑھا جاتا ہے۔ یعنی اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ”بے شک اللہ اپنے نبی پر رحمت بھیجتا ہے، اور اس کے فرشتے بھی اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں، تو اے اہلِ ایمان تم بھی اس پر درود و سلام بھیجو۔“ قرآنِ کریم میں اس طرح کی مثالیں اور بھی موجود ہیں۔

ذکرِ الٰہی سے رحمت نازل ہوگی

مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور نبی کریم ﷺ کی بے مثال تربیت نے تمہارے اندر سیرت و کردار کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اور جو اسلام کی صداقت وحقانیت کی ایک نمایاں مثال بھی ہے، معاندین اسی سے چڑتے ہیں۔ بجائے اپنے چہرے کی چھائیاں دھونے کے دوسروں کے اجلے چہروں کو داغدار کرنا چاہتے ہیں۔ اور بجائے مسلمانوں کی عظمت کا اعتراف کرنے کے آنحضرت ﷺ پر طعن وتشنیع اور اتہامات کی بوچھاڑ سے اپنے اندر سلگتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں اور آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے

Marfat.com

ہوئے اور توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ تم بجائے اس کے کہ ان کے زبان میں ان کو جواب دو، تم زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو اور اس کی یاد کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرمائے گا اور فرشتے تمہارے لیے رحمت اور مغفرت کی دعائیں مانگیں گے۔ جہاں پروردگار کی رحمت متوجہ ہو اور فرشتے اپنی دعاؤں سے اس میں اضافہ کر رہے ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عقائد و اعمال کی کوئی تاریکی باقی رہ جائے۔ یقیناً اس رحمت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں فکری اور عملی تاریکیوں کو یکسر ختم کر کے انہیں ہدایت اور شریعت کی روشنی سے بہرہ ور فرمائے گا۔ نہ کوئی فکری الجھن باقی رہے گی، نہ معاملات میں کوئی اڑچن پیش آئے گی اور نہ اعمال کا قبلہ ٹیڑھا ہو سکے گا۔ بلکہ مسلمان دیکھتے ہی دیکھتے اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بہار بن کر چھا جائیں گے۔ اور آیت کے آخری جملے میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہمیشہ اہلِ ایمان پر مہربان رہتی ہے۔ کیونکہ کفر کے مقابلے میں ایمان اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا ایسا عنوان ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کی ضمانت بھی ہے۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ﴿۴۴﴾

(ان کا خیر مقدم جس دن وہ اس سے ملیں گے سلام سے ہوگا، اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے باعزت صلہ تیار کر رکھا ہے۔ ۴۴)

آخرت میں اہلِ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کا سلام و پیغام

دنیا میں تو اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے اور فرشتے ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کے اہلِ ایمان بندے جب وہاں پہنچیں گے تو ان کا خیر مقدم اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے سلام سے ہوگا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں سلام پہنچے گا۔ اور یہ ایک ایسا اعزاز ہوگا جس کے لطف و لذت کا آج تصور نہیں کیا جا سکتا۔ سورۃ فرقان میں ہے وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا "اور اس میں ان کا استقبال تحیت اور سلام کے ساتھ ہوگا۔" اور سورۃ یٰسین میں ہے سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ "اور ان کے لیے سلام ہوگا جو ربِ رحیم کی طرف سے ان کو کہلایا جائے گا۔"

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ ان کو سلام کریں گے۔ جیسے سورۃ نحل میں ہے کہ جن لوگوں کی روحیں ملائکہ اس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ پاکیزہ لوگ تھے، ان سے وہ کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں اپنے ان اعمال کی بدولت جو تم دنیا میں کرتے تھے۔

تیسرا معنی یہ ہے کہ وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو سلام کہیں گے۔ جیسے سورۃ یونس میں فرمایا گیا "وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ خدایا پاک ہے تیری ذات، ان کا تحیہ ہوگا سلام، اور ان کی آخری دعا یہ ہوگی کہ ساری تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔"

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾
وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

(اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ ۴۵)
اور اللہ کی طرف اس کے اذن سے دعوت دینے والا بنا کر، اور ایک روشن چراغ بنا کر۔ ۴۶)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کے منصبی فرائض

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ سے خطاب فرما کر آپ ؐ کو ان عظیم ذمہ داریوں سے باخبر کیا جارہا ہے جن سے آپ ؐ نے اپنی زندگی میں عہدہ براہونا ہے۔ اور یہ ذمہ داریاں ایسی ہیں جن کی ادائیگی کے سلسلے میں قدم قدم پر آپ ؐ کو شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ کی نظر ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر رہنی چاہیے، مخالفین کیا کہتے اور کرتے ہیں آپ اس کی بالکل پرواہ نہ کریں اور نتائج ہمارے حوالے کردیں۔ اسی طرح بالواسطہ مخالفین کو متنبہ کیا جارہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارا واسطہ جس عظیم شخصیت سے ہے اسے اللہ تعالیٰ نے جن کٹھن فرائض کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے ان کی حیثیت عظیم مناصب کی بھی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نہایت قدر ومنزلت کے حامل ہیں۔ ایسی قدر ومنزلت کی حامل شخصیت کو اللہ تعالیٰ نہ کبھی ضائع ہونے دیتا ہے اور نہ اسے تنہا چھوڑتا ہے۔ وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں اس لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اپنے فرائض کی بجاآوری میں ناکام ثابت ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ سے اس عظیم کام کو تکمیل تک پہنچائے گا جس کے لیے انہیں مبعوث کیا گیا ہے چاہے مخالفین اس راستے میں کیسے ہی مخالفتوں کے پہاڑ کھڑے کردیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس آیتِ کریمہ میں جو مناصب بیان فرمائے ہیں اور جن ذمہ داریوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں پہلا منصب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شاہد بنایا ہے۔ شاہد کا معنی ہے گواہ۔ یعنی آپ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے گواہ بن کر آئے ہیں۔ یہ لفظ اپنے اندر بڑی معنوی وسعت رکھتا ہے۔ اس میں تین قسم کی گواہیاں اور شہادتیں شامل ہیں۔

۱۔ قولی شہادت:۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو دین نازل فرمایا ہے اس میں کچھ تو بنیادی حقائق اور اصول ہیں جنہیں ضروریاتِ دین اور ایمانیات کہا جاتا ہے۔ اس میں شریعت بھی ہے جو ان احکام کا مجموعہ ہے جن پر عمل کرنا امتِ مسلمہ کے لیے ضروری ہے۔ ان میں اوامر بھی ہیں اور نواہی بھی۔ اسی طرح ان میں اخلاق کی تعلیم بھی ہے اور فضائلِ اخلاق کی بھی۔ اسی طرح رذائلِ اخلاق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ اس دین کی ایک تہذیب اور تمدن بھی ہے۔ اس کے اصول وضوابط بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ان تمام ضروریاتِ دین، احکامِ شریعت، نظامِ اخلاق، اسلامی تہذیب وتمدن کی ہر بات کی صداقت کی گواہی دینا اور اسے دلائل سے ثابت کرنا اور مخالفین کی تمام مخالفتوں کو اس راستے میں بالکل اہمیت نہ دینا اور نہایت انشراحِ صدر کے ساتھ ان میں سے ایک ایک قدر کو بیان کرنا، یہ وہ قولی شہادت ہے جس پر نبی کریم ﷺ فائز کیے گئے ہیں۔

۲۔ عملی شہادت:۔ آپ نے عقیدہ وعمل، نظامِ اخلاق اور تہذیب وتمدن کے حوالے سے جن اصول وضوابط کو بیان فرمایا، جن نیکیوں کی ترغیب دی اور جن برائیوں سے روکا ان میں سے ایک ایک چیز پر عمل کرکے بھی دکھایا۔ آپ کی ذات نیکیوں کا حوالہ بن گئی۔ جن کو گناہ قرار دیا سب سے زیادہ اس سے مجتنب رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اجتماعی زندگی کے لیے جسے قانون قرار دیا، اسے نافذ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس طرح سے زندگی کے ہر شعبے میں اللہ تعالیٰ کے دین کے نفاذ اور خود اس پر عمل کرکے ایک ایسی عملی گواہی دی جس کے بعد اچھائی اور برائی کی تمیز واضح ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کا دین محسوس حالت میں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہ وہ عملی شہادت ہے جس پر آنحضرت ﷺ کو فائز کیا گیا ہے۔

Marfat.com

۳۔ اخروی شہادت:۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہو اس وقت آنحضرت ﷺ اس امر کی شہادت دیں کہ جو پیغام ان کے سپرد کیا گیا تھا اسے آپ نے بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا۔ اپنے قول و عمل سے اسے پوری طرح واضح کر دیا۔ چنانچہ اسی کی پیشگی تائید کے لیے آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر لوگوں سے پوچھا تھا کہ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا دین تم تک پہنچا دیا ہے اور کیا میں نے امانت کا حق ادا کر دیا ہے۔ اور کیا میں نے خیر خواہی کرنے میں کوئی کمی تو نہیں چھوڑی۔ لوگ چیخ چیخ کے کہہ رہے تھے کہ آپ نے ہمت سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا دین ہم تک پہنچایا۔ یہ وہ اخروی شہادت ہے جس کے بعد جزاء وسزا کا فیصلہ ہوگا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کیسے عظیم اور نازک منصب پر فائز کیے گئے تھے۔ اور اسی سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ امت کی فلاح و بقاء اور آخرت میں نجات کا دارومدار آنحضرت ﷺ کی ادائے شہادت پر ہے۔ اور یہی منصب مجموعی طور پر امت کے سپرد کیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح آنحضرت ﷺ نے قولی اور عملی طور پر اللہ تعالیٰ کے دین کی گواہی دی، اسی طرح امتِ مسلمہ کی ہر نسل دوسری نسل کے سامنے گواہی دینے کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی ہے۔ اور جن لوگوں تک اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت نہیں پہنچی ہر دور کے مسلمان قیامت کے دن اس کے حوالے سے مسؤل ہوں گے۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مُبَشِّـرًا وَّنَـذِيـْرًا ...... یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبشر اور نذیر بنا کے بھیجا ہے کہ جو لوگ آپ کے پیغام کو قبول کر لیں ان کو آپ ابدی فوز و فلاح کی خوشخبری دیں اور جو لوگ اس سے اعراض یا اس کی تکذیب کریں ان کو اس کے نتائج سے آگاہ کر دیں۔ اور آپ کی جانب سے اس تبشیر و انذار کی حیثیت یہ ہے کہ اب نوعِ انسانی کی بھلائی آپ کی دعوت کو قبول کرنے میں ہے اور نوعِ انسانی کی تباہی آپ کی تکذیب میں ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ آپ کا کام صرف تبشیر اور انذار ہے، لوگوں سے اپنی بات منوانا نہیں۔ رد و قبول کے حوالے سے ذمہ داری سراسر ان لوگوں پر ہے جن کی طرف پیغمبر مبعوث ہوتا ہے۔

دَاعِيًـا اِلَـى اللّٰهِ ...... آپ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے والے ہیں۔ لیکن آپ کے بلانے یا دوسروں کے بلانے میں فرق یہ ہے کہ آپ کا بلانا اللہ تعالیٰ کے اذن اور حکم سے ہے۔ گویا ایک ضمانت ہے کہ آپ کی دعوت دراصل اللہ تعالیٰ کی دعوت ہے۔ اس لیے جو شخص اسے قبول کرے گا اسے اطمینان ہونا چاہیے کہ اس دعوت میں کوئی کمی نہیں۔ اور جو شخص اس سے انکار کرے گا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ انکار حضور کی دعوت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی دعوت سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جب وہ کسی اہم کام پر اپنے نبی کو مامور فرماتا ہے تو وہ اس کو تنہا نہیں چھوڑتا، بلکہ ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اذن سے اٹھے ہیں تو مخالفین کو سوچ لینا چاہیے کہ آپ کی مخالفت کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔

سِـرَاجًـا مُّنِيْرًا ...... روشن چراغ۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک روشن چراغ بنا کے بھیجا ہے جو خود بھی علم و حکمت کے نور سے منور ہے اور لوگوں کو بھی تاریکیوں سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی صراطِ مستقیم کی طرف لانے کے لیے رہنمائی کر رہا ہے۔ اگر لوگ اس سراجِ منیر کی قدر نہیں کریں گے تو خود ہی اپنی تباہی کا سامان کریں گے اور آخرت میں تباہی ان کا مقدر ہو کے رہ جائے گی۔

Marfat.com

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾

(اور ایمان لانے والوں کو بشارت دیجیے ان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا فضل ہے۔ ۴۷)

اہلِ ایمان کو بشارت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی جن منصبی ذمہ داریوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپؐ کو مبشر بنا کر بھیجا گیا ہے کہ آپؐ ان لوگوں کو جو آپؐ پر ایمان لاتے اور اس کا حق ادا کرتے ہیں اور ہر طرح کی مخالفتوں اور اذیتوں کے مقابلے میں استقامت کا ثبوت دیتے ہیں بشارت دیجیے کہ وہ مخالفوں کی مخالفت اور حالات کی نامساعدت سے پریشان نہ ہوں۔ عنقریب ان پر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے دروازے کھولنے والا ہے۔ بظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت کے راستے میں مخالفت کے پہاڑ حائل ہو گئے ہیں اور مسلمانوں کو کسی طرف سے روشن مستقبل کی روشنی پھوٹتی نظر نہیں آتی۔ لیکن ان کا تعلق اور یقین جس پروردگار پر ہے وہ گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھی روشنی کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے۔ اس لیے آئندہ کی کامرانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آپؐ ان صاحبِ ایمان لوگوں کو خوشخبری سنا دیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہونے والا ہے۔ اس کی صورت کیا ہوگی وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اطمینان رکھنا چاہیے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

(اور کافروں اور منافقوں کی پرواہ نہ کیجیے اور ان کی اذیت رسانیوں کو نظر انداز کیجیے، اور اللہ پر بھروسہ رکھیے، اور اللہ کارساز کے طور پر کافی ہے۔ ۴۸)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

آپؐ کی منصبی ذمہ داریوں میں انذار بھی شامل ہے۔ اس لیے آپؐ کو نذیر کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ آپؐ کی اسی ذمہ داری کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ کافر اور منافق جس طرح آپ کی ہر ممکن مخالفت پر تلے ہوئے ہیں آپ ان کی مخالفتوں کو بالکل وزن نہ دیں۔ یہ غوغائے رقیباں ہے جو خود اپنی موت مر جائے گا۔ اسی طرح منافقین آپ کو اذیت پہنچانے کے لیے جو فتنے اٹھا رہے ہیں آپ ان کا کوئی اثر قبول نہ کریں۔ مقابلے میں عاجز لوگ ایسی حرکتیں کیا ہی کرتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ وسائل کے سرچشموں پر ان کا قبضہ ہے اور اسباب کی دنیا کے وہ بادشاہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں وہ سب سے بڑا قدرت والا اور سب سے بڑا سہارا ہے۔ جس کا وہ پشت پناہ ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

یاد رہے کہ لفظ اطاعت جس طرح حکم ماننے کے معنی میں مستعمل ہے اسی طرح اس کا استعمال کسی بات کو اہمیت دینے، اس کی طرف دھیان کرنے اور اس کی پرواہ کرنے کے مفہوم میں بھی شائع وذائع ہے۔ اور پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دوسرے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کا تمہیں لحاظ کرنا ہو، پس ان کو کچھ دے دلا دو اور خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دو۔ ۴۹)

ایک ضمنی سوال کا جواب

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں سورۃ الاحزاب نازل ہو رہی تھی اس زمانے میں اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آیا کہ کسی شخص نے اپنی بیوی کو اس حال میں طلاق دے دی کہ اس نے اس سے کوئی رشتۂ ازدواج قائم نہیں کیا تھا اور نہ خلوتِ صحیحہ ہوئی تھی۔ تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایسی صورت میں بیوی کے لیے عدت گزارنا ضروری نہیں۔ البتہ ان کو حسبِ استطاعت کچھ دے دلا کر باعزت طریقہ سے رخصت کر دیا جائے۔ اس لحاظ سے یہ ایک منفرد آیت ہے جس کا تعلق نہ تو پچھلے سلسلۂ بیان سے ہے اور نہ بعد کے سلسلۂ بیان سے۔

بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ سورۃ النساء میں مسلمانوں کو تحدیدِ ازواج کا جو حکم دیا گیا تھا آیت پچاس سے باون تک جو آیات ہیں وہ سورۃ النساء کی اسی آیت پر استدراک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ استدراک کی آیات سے پہلے یہ آیت بطور تمہید ہے جن میں متذکرہ بالا ایک ضمنی سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ فقہاء نے اس سے چند قانونی احکام مستنبط کیے ہیں۔ صاحب تفہیم القرآن نے نہایت خوبصورتی سے اس کا خلاصہ بیان کیا ہے، ہم یہاں اسے نقل کر رہے ہیں۔

چند قانونی احکام کا خلاصہ

۱۔ آیت میں اگرچہ ''مومن عورتوں'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے بظاہر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ کتابی عورتوں کے معاملہ میں قانون وہ نہیں ہے جو یہاں بیان ہوا ہے لیکن تمام علماءِ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ معنًی یہ حکم کتابیات کے بارے میں بھی ہے۔ یعنی کتابی عورت سے بھی کسی مسلمان نے نکاح کیا ہو تو اس کی طلاق، اس کے مہر، اس کی عدت اور اس کو متعہ طلاق دینے کے جملہ احکام وہی ہیں جو مومن عورت سے نکاح کی صورت میں ہیں۔ علماء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مخصوص طور پر صرف مومن عورتوں کا ذکر جو کیا ہے اس سے مقصود دراصل اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ مسلمانوں کے لیے مومن عورتیں ہی موزوں ہیں۔ یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ضرور ہے مگر مناسب اور پسندیدہ نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے اس اندازِ بیان سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہلِ ایمان سے متوقع یہی ہے کہ وہ مومن عورتوں سے نکاح کریں گے۔

۲۔ ''ہاتھ لگانے'' یا ''مس'' کرنے سے مراد لغت کے اعتبار سے تو محض چھونا ہے لیکن یہاں یہ لفظ کنایۃً مباشرت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر شوہر نے مباشرت نہ کی ہو تو خواہ وہ عورت کے پاس

Marfat.com

تنہائی میں رہا ہو بلکہ اسے ہاتھ بھی لگا چکا ہو تب بھی طلاق دینے کی صورت میں عدت لازم نہ آئے، لیکن فقہائے نے برسبیلِ احتیاط یہ حکم لگایا ہے کہ اگر خلوت صحیحہ ہو جائے (یعنی جس میں مباشرت ممکن ہو) تو اس کے بعد طلاق دینے کی صورت میں عدت لازم آئے گی اور سقوطِ عدت صرف اس حالت میں ہوگا جبکہ خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو۔

۳۔ طلاق قبلِ خلوت کی صورت میں عدت ساقط ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس صورت میں مرد کا حقِ رجوع باقی نہیں رہتا اور عورت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ طلاق کے فوراً بعد جس سے چاہے نکاح کر لے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حکم صرف طلاق قبلِ خلوت کا ہے۔ اگر خلوت سے پہلے عورت کا شوہر مر جائے تو اس صورت میں عدتِ وفات ساقط نہیں ہوتی بلکہ عورت کو وہی چار مہینے دس دن کی عدت گزارنی ہوتی ہے جو منکوحۂ مدخولہ کے لیے واجب ہے۔ (عدت سے مراد وہ مدت ہے جس کے گزرنے سے پہلے عورت کے لیے دوسرا نکاح جائز نہ ہو)۔

۴۔ مَالَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ (تمہارے لیے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے) کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ عدت عورت پر مرد کا حق ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ صرف مرد ہی کا حق ہے۔ دراصل اس میں دو حق اور بھی شامل ہیں۔ ایک حقِ اولاد، دوسرے حق اللہ یا حق الشرع۔ مرد کا حق وہ اس بنا پر ہے کہ اس دوران میں اس کو رجوع کر لینے کا حق ہے نیز اس بنا پر کہ اس کی اولاد کے نسب کا ثبوت اس بات پر منحصر ہے کہ عدت کے زمانہ میں عورت کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہو جائے۔ اولاد کا حق اس میں شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے باپ سے بچے کے نسب کا ثابت ہونا اس کے قانونی حقوق قائم ہونے کے لیے ضروری ہے اور اس کے اخلاقی مرتبے کا انحصار بھی اس امر پر ہے کہ اس کا نسب مشتبہ نہ ہو۔ پھر اس میں حق اللہ (یا حق الشرع) اس لیے شامل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کی پرواہ نہ بھی ہو تو خدا کی شریعت ان حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو یہ پروانہ بھی لکھ کر دے دے کہ میرے مرنے کے بعد یا مجھ سے طلاق لے لینے کے بعد تیرے اوپر میری طرف سے کوئی عدت واجب نہ ہوگی تو تب بھی شریعت کسی حال میں اس کو ساقط نہ کرے گی۔

۵۔ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (ان کو کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو) اس حکم کا منشا دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر پورا کرنا ہوگا۔ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر کیا گیا تھا اور پھر خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اس صورت میں نصف مہر دینا واجب ہوگا جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۷ میں ارشاد ہوا ہے۔ اس واجب سے زائد کچھ دینا لازم نہیں ہے مگر مستحب ہے۔ مثلاً یہ بات پسندیدہ ہے کہ نصف مہر دینے کے ساتھ مرد وہ جوڑا بھی عورت کے پاس ہی رہنے دے جو دلہن بننے کے لیے اسے بھیجا گیا تھا یا اور کچھ سامان اگر شادی کے موقع پر اسے دیا گیا تھا تو وہ واپس نہ لے لیکن اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرنا واجب ہے اور یہ "کچھ نہ کچھ" آدمی کی حیثیت اور مقدرت کے مطابق ہونا چاہیے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں فرمایا گیا ہے۔ علماء کا ایک گروہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ متعہ طلاق اس مال کو کہتے ہیں جو طلاق دے کر رخصت کرتے وقت عورت کو دیا جاتا ہے)۔

Marfat.com

۶۔ بھلے طریقے سے رخصت کرنے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے بلکہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی ٹھکا فضیحتی کے بغیر شریفانہ طریقے سے علیحدگی اختیار کرلی جائے۔ ایک آدمی کو اگر عورت پسند نہیں آئی ہے یا کوئی اور وجہ شکایت پیدا ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ اس عورت کو نہیں رکھنا چاہتا تو بھلے آدمیوں کی طرح اسے طلاق دے اور رخصت کردے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کے عیوب لوگوں کے سامنے بیان کرے اور اپنی شکایتوں کے دفتر کھولے تاکہ کوئی دوسرا بھی اس عورت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ قرآن کے اس ارشاد سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ معلق کرنا خدائی تشریع کی حکمت و مصلحت کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس صورت میں ''بھلے طریقے سے رخصت کرنے'' کا کوئی امکان نہیں رہتا بلکہ مرد نہ بھی چاہے تو ٹھکا فضیحتی اور بدنامی ورسوائی ہوکر رہتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں اس امر کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کہ مرد کا اختیارِ طلاق کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط ہو۔ آیت بالکل صراحت کے ساتھ ناکح کو طلاق کا اختیار دے رہی ہے اور اسی پر یہ ذمہ داری ڈال رہی ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگانے سے پہلے عورت کو چھوڑنا چاہے تو لازماً نصف مہر دے کر یا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مال دے کر چھوڑے۔ اس سے آیت کا مقصد صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کو کھیل بننے سے روکنے کے لیے مرد پر مالی ذمہ داری کا ایک بوجھ ڈال دیا جائے تاکہ وہ خود ہی اپنے اختیارِ طلاق کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے اور دو خاندانوں کے اندرونی معاملے میں کسی بیرونی مداخلت کی نوبت نہ آنے پائے بلکہ شوہر سرے سے کسی کو یہ بتانے پر مجبور ہی نہ ہو کہ وہ بیوی کو کیوں چھوڑ رہا ہے۔

۷۔ ابن عباس، سعید بن المسیب، حسن بصری، علی بن الحسین (زین العابدین)، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے آیت کے الفاظ ''جب تم نکاح کرو پھر طلاق دے دو'' سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق اسی صورت میں واقع ہوتی ہے جبکہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا ہو۔ نکاح سے پہلے طلاق بے اثر ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص یوں کہے کہ ''اگر میں فلاں عورت سے، یا فلاں قبیلے یا قوم کی عورت سے یا کسی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے'' تو یہ قول لغو بے معنی ہے، اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوسکتی۔ اس خیال کی تائید میں یہ احادیث پیش کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا لاطلاق لا بن ادم فی مالایملک ''ابن آدم جس چیز کا مالک نہیں ہے اس کے بارے میں طلاق کا اختیار استعمال کرنے کا بھی وہ حق نہیں رکھتا۔'' (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ) اور لا طلاق قبل النکاح ''نکاح سے پہلے کوئی طلاق نہیں۔'' (ابن ماجہ)۔ مگر فقہاء کی ایک بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ اس آیت اور ان احادیث کا اطلاق صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک غیر عورت کو جو اس کے نکاح میں نہ ہو یوں کہے کہ ''تجھ پر طلاق ہے'' یا ''میں نے تجھے طلاق دی۔'' یہ قول بلاشبہ لغو ہے جس پر کوئی قانونی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا لیکن اگر وہ یوں کہے کہ ''اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھ پر طلاق ہے'' تو یہ نکاح سے پہلے طلاق دینا نہیں ہے بلکہ دراصل وہ شخص اس امر کا فیصلہ اور اعلان کرتا ہے کہ جب وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی تو اس پر طلاق وارد ہوگی۔ یہ قول لغو بے اثر نہیں ہوسکتا بلکہ جب بھی وہ

Marfat.com

عورت اس کے نکاح میں آئے گی اسی وقت اس پر طلاق پڑ جائے گی۔ یہ مسلک جن فقہاء کا ہے ان کے درمیان پھر اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس نوعیت کے ایقاع طلاق کی وسعت کس حد تک ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام محمد اور امام زفر کہتے ہیں کہ خواہ کوئی شخص عورت یا قوم یا قبیلے کی تخصیص کرے یا مثال کے طور پر عام بات اس طرح کہے کہ "جس عورت سے بھی میں نکاح کروں اس پر طلاق ہے" دونوں صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ ابوبکر جصاص نے یہی رائے حضرت عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ ابراہیم النخعی، مجاہد اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ سے بھی نقل کی ہے۔

سفیان ثوری اور عثمان البتی کہتے ہیں کہ طلاق صرف اسی صورت میں پڑے گی جب کہنے والا یوں کہے کہ "اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق۔"

حسن بن صالح، لیث بن سعد اور عامر الشعبی کہتے ہیں کہ اس طرح کی طلاق عمومیت کے ساتھ بھی پڑ سکتی ہے بشرطیکہ اس میں کسی نوعیت کی تخصیص ہو۔ مثلاً آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں فلاں خاندان یا فلاں قبیلے یا فلاں شہر یا ملک یا قوم کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے۔"

ابن ابی لیلیٰ اور امام مالک اوپر کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مزید شرط لگاتے ہیں کہ اس میں مدت کا بھی تعین ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں اس سال یا آئندہ دس سال کے اندر فلاح عورت یا فلاں گروہ کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے" تب یہ طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں۔ بلکہ امام مالک اس پر اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ اگر یہ مدت اتنی طویل ہو جس میں اس شخص کا زندہ رہنا متوقع نہ ہو تو اس کا قول بے اثر رہے گا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٥٠

(اے نبی ہم نے حلال کی ہیں آپ کے لیے آپ کی وہ بیویاں جنہیں آپ نے ان کے مہر ادا کیے اور وہ عورتیں جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے آپ کی ملکیت میں آئیں، اور آپ کی چچا کی بیٹیوں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیوں اور آپ کے ماموں کی بیٹیوں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیوں میں سے بھی ان کو حلال ٹھہرایا جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے اور اس مومن عورت کو بھی جو اپنی ذات نبی کو ہبہ کر دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں یہ رعایت خالصتاً آپ کے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے نہیں، ہمیں خوب معلوم ہے ہم نے جو کچھ ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں فرض کیا ہے تاکہ آپ پر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ ۵۰)

Marfat.com

منافقین کے آنحضرت ﷺ پر اعتراضات کا جواب اور آپ ؐ کے بعض امتیازات

پروردگار نے سورۃ النساء میں جب مسلمانوں کو تحدیدِ ازواج کا حکم دیا کہ ایک مسلمان چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا اس وقت آنحضرت ﷺ کے نکاح میں بھی چار ہی بیویاں تھیں۔ حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھن۔ لیکن جب پانچ ہجری میں آنحضرت ﷺ نے حضرت زینب بنتِ جحش ؓ سے نکاح فرمایا تو منافقین نے مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا کہ مسلمانوں کے لیے چار بیویوں سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں تو آپ ؐ نے پانچویں بیوی کیسے کر لی؟ کیا مسلمانوں کے لیے شریعت اور ہے اور آپ ؐ کے لیے اور۔ اور دوسری یہ بات کہ آپ ؐ نے اپنے متبنیٰ کی منکوحہ سے کیسے نکاح کر لیا جبکہ اہلِ عرب کی روایات اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ اس دوسرے اعتراض کا جواب تو پہلے گزر چکا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نکاح آنحضرت ﷺ نے اپنی خواہش سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے۔ لیکن دوسرے اعتراض کا جواب پوری تفصیل کے ساتھ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دیا گیا ہے۔ اور اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ نبی کریم ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اس لیے آپ ؐ کا کوئی کام اپنی خواہش اور اپنی مرضی سے نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ آپ ؐ اہلِ عرب کی روایات کے پابند نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور منشاء کے پابند ہیں۔ اور دوسری بات یہ فرمائی کہ حلال و حرام کی اصل اتھارٹی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کے سوا کسی اور کو تحلیل و تحریم کا حق نہیں پہنچتا۔ مسلمانوں پر چار کی قید لگانے والا اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ اسی کو یہ حق زیب دیتا ہے۔ اسی نے اپنے پیغمبر کے لیے بعض خصوصی احکام دیے ہیں جن میں پیغمبر پر بعض ایسی پابندیاں لگائی ہیں جو عام مسلمانوں پر نہیں۔ اور بعض ایسے احکام سے انہیں مستثنیٰ قرار دیا ہے جو عام مسلمانوں پر لازم ہیں۔ اور ایسا کرنا اس کا حق ہے کیونکہ وہی مطاعِ مطلق، وہی کبریائی کا مالک اور وہی جن وانس کو مطلقاً آئین و قانون دینے کا حق رکھتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں پر اس نے اگر چار بیویوں کی قید لگائی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ اور اسی نے اگر اپنے نبی کو چار سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت دی ہے تو یہ بھی اس کا حق ہے۔ کوئی شخص اگر اس کے پہلے حق کو تسلیم کرتا ہے اور دوسرے حق کو تسلیم نہیں کرتا تو اسے اپنی عقل پر ماتم کرنا چاہیے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں اس بنیادی بات پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جن بیویوں کے آپ ؐ نے حق مہر ادا کیے ہیں اور وہ اس وقت پانچ تھیں وہ ہم نے حلال کی ہیں، کسی کو اگر اعتراض ہے تو اسے ہمارے اختیار پر ہونا چاہیے، آپ ؐ تو اس کے اختیار کا اتباع کرنے والے ہیں اور اس کے حکم کی تعمیل کرنے والے ہیں آپ پر اعتراض کا کیا جواز ہے۔

اس میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ آپ کے لیے وہ بیویاں ہم نے جائز کر دی ہیں جنہیں آپ نے حق مہر ادا کر دیے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کے بعد ان مملوکات کا ذکر آ رہا ہے جو غنیمت کے طور پر آپ کو ملنے والی تھیں، جنہیں لونڈیاں کہا جاتا ہے، ان کا چونکہ حق مہر نہیں ہوتا۔ تو پہلی بیویوں کو ان سے ممتاز کرنے کے لیے مہر کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اس آیتِ کریمہ میں ان عورتوں کو بھی جائز کیا ہے جو عورتیں جہاد میں قید ہو کر آئیں۔ عام لونڈیاں مراد نہیں جنہیں خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ جنگی اسیروں میں مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی۔ مردوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا اور عورتوں کو لونڈیاں۔ اسلام کا منشاء یہ ہے کہ اگر دشمن اپنے قیدیوں کا تبادلہ کرنے پر راضی ہو تو اپنے قیدیوں کے بدلے میں ان کے قیدی چھوڑ دیے جائیں۔ اس طرح غلامی تک نوبت نہیں پہنچتی۔ اور اگر دشمن فدیہ دے کر چھڑانا چاہے تو اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے۔ اور اگر مسلمان دشمن قیدیوں کو بے ضرر

Marfat.com

سمجھ کریا دشمن پر احسان کرتے ہوئے چھوڑنا چاہیں تو اسلام اس کی بھی اجازت دیتا ہے۔لیکن اگر ایسی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو پھر اس زمانہ کے جنگی رواج کے مطابق قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا۔اور اس میں کوشش یہ ہوتی تھی کہ غلاموں کو گھروں میں رکھ کر مسلمانوں کے معاملات کو دیکھنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ اسلام کی طرف راغب ہوں اور اسلام کی آغوش میں آ جائیں۔چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بیشتر قیدی غلام بننے کے بعد مسلمان ہو گئے۔اور مسلمانوں نے انہیں اسلامی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بڑے بڑے مفسر اور محدث پیدا ہوئے۔جہاں تک اسیر عورتوں کا تعلق ہے ان کا معاملہ زیادہ احتیاط کا تقاضا کرتا تھا۔دشمن بالعموم اپنی ان عورتوں کو واپس نہیں لیتا جو قید میں پکڑی جاتی ہیں۔اب اگر مسلمان انہیں یونہی چھوڑ دیتے تو جنگِ عظیم کے قیدیوں کی طرح بداخلاقی کا ایک طوفان اٹھتا جس سے نسب تباہ ہو کر رہ جاتے۔اور اگر انہیں لونڈیاں بنا کر گھروں میں رکھا جاتا لیکن مالک کو تمتع کی اجازت نہ دی جاتی تو یہ ایک ایسی غیر انسانی حرکت ہوتی جس کا نتیجہ حرام کاری کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔اور اگر مسلمانوں کو پابند کر دیا جاتا کہ وہ ان سے ضرور نکاح کریں تو اس سے دو مسئلے پیدا ہو جاتے۔ایک تو یہ کہ ہر گھر میں پہلی بیویاں اپنے حقوق کا مطالبہ لے کر کھڑی ہو جاتیں۔اور دوسرا یہ کہ آئے دن کی جنگوں میں غلاموں اور لونڈیوں کی تعداد تو مقرر نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے چار بیویوں کا قانون متاثر ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا۔اس لیے اسلام نے آنحضرت ﷺ کو بھی اور دوسرے مسلمانوں کو بھی یہ اجازت دی کہ آپ اسیر عورتوں کو جو ایک ضابطے کے تحت آپ کے حصے میں آئیں انہیں لونڈیاں بھی بنا سکتے ہو اور ان سے نکاح بھی کر سکتے ہو۔اور آنحضرت ﷺ کا معاملہ تو اور زیادہ اہم تھا۔کیونکہ جنگ و جہاد میں بسا اوقات شریف خاندانوں اور سرداروں کی بہوئیں اور بیٹیاں بھی اسیر بن کر آتی تھیں۔قبائلی نقطہ نگاہ سے اور حکمتِ دین کے حوالے سے ضروری تھا کہ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے۔اس لیے آنحضرت ﷺ نے ایسی خاندانی عورتوں کے ساتھ عموماً نکاح فرمایا۔حضرت جویریہؓ غزوہ بنی المصطلق میں اور حضرت صفیہؓ غزوہ خیبر کے موقع پر گرفتار ہوئیں اور دونوں سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔تو آپ نے ان کی خاندانی وجاہت کا لحاظ فرماتے ہوئے انہیں لونڈیوں کی حیثیت سے رکھنے کی بجائے اپنے حرم میں شامل فرما لیا۔اور اگر آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کی اجازت نہ دی ہوتی تو پھر آپ انہیں لونڈیاں بنا کر رکھنے کے پابند ہوتے اور ان سے نکاح نہ کر سکتے۔کیونکہ اس صورت میں ازواج کی تعداد اسلام کے عام ضابطہ سے متجاوز ہو جاتی۔اور اس طرح سے مسلمان ان فوائد کو حاصل نہ کر پاتے جو ان سیدات کو عزت دینے سے حاصل کیے جا سکتے تھے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک اور قسم کی عورتوں کو بھی اپنے نکاح میں لانے کی آپ کو اجازت دی۔یہ وہ عورتیں ہیں جو آپ کی نہایت قریبی رشتہ دار ہیں۔یعنی آپ کے چچا، پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کی بیٹیوں میں سے اگر کسی نے دین کی خاطر اپنے خویش و اقارب اور خاندان و قبیلہ کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کی ہے تو ان کی دلجوئی، دلدہی، قدردانی اور حوصلہ افزائی کے لیے آپ کو اجازت دی گئی کہ آپ ان میں سے کسی کو اپنے عقدِ نکاح میں لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔چنانچہ اسی اجازت کے تحت آپ نے حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح فرمایا۔حضرت ام حبیبہؓ ابوسفیان کی صاحبزادی تھیں جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔انہوں نے حبشہ کی طرف اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کی۔ان کا شوہر وہاں پہنچ کر عیسائی ہو گیا اور پھر مر گیا۔آپ نے حالتِ غربت اور تنہائی میں جس بے کسی اور بے بسی کے ساتھ اپنے ایمان کی حفاظت کی اور وقت گزارا، یہ ایک ایسی خدمت تھی جس کی قدردانی بہت ضروری تھی۔چنانچہ آپ نے حضرت نجاشی کے واسطے سے انہیں پیغامِ نکاح بھیجا اور انہیں کو اپنا وکیل بنا کر حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کیا۔ننھیالی رشتوں میں اگرچہ حضورؐ کا کوئی نکاح ثابت نہیں، لیکن ان میں بھی اگر کوئی ضرورت پیش آتی تو اس آیت کے تحت آپ ان سے بھی نکاح کر سکتے تھے۔

Marfat.com

اس آیت میں مزید آپ کو یہ اجازت دی گئی کہ اگر کوئی مومن عورت آپ کو اپنی ذات ہبہ کردے، یعنی وہ بلا مہر اپنے آپ کو حضورؐ کے نکاح میں دینے کی پیشکش کرے اور اپنے حقوق میں سے بھی کسی حق پر اصرار نہ کرے، یعنی اپنے ہر حق سے دستبردار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنے کی خواہش رکھتی ہو تو آپ کو اس کی اجازت دی گئی کہ اگر آپ اس کو پسند فرمائیں تو ایسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی اجازت کے تحت آپ نے شوال ۷ ہجری میں حضرت میمونہؓ کو اپنی زوجیت میں لیا۔ لیکن آپ نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ مہر کے بغیر ان کے ہبہ سے فائدہ اٹھائیں۔ اس لیے آپ نے ان کی خواہش اور مطالبہ کے بغیر ان کو مہر عطا فرمایا۔ اور ان کے علاوہ کوئی اور موہوبہ بیوی آپ کے نکاح میں نہ تھیں حالانکہ صحابیات میں نہ جانے کتنی خواتین ایسی ہوں گی جو محض شرفِ نسبت حاصل کرنے کے لیے اس کی خواہش رکھتی ہوں، جبکہ انہیں بھی معلوم تھا کہ آپ کی گھریلو زندگی فقر و فاقہ کی زندگی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت اور ایسی عورت سے بلا مہر نکاح جو اپنے آپ کو اس کے لیے ہبہ کردے یہ صرف آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے، دوسرے کسی کے لیے اس کی اجازت نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام میں نبی کریم ﷺ کی کچھ خصوصیات بھی ہیں۔ یعنی ان میں آپ امت کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ بعض احکام میں آپ کو استثناء دیا گیا ہے اور بعض میں آپ پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ مثلاً آنحضرت ﷺ پر نمازِ تہجد فرض کی گئی۔ آپ کے لیے اور آپ کے خاندان والوں کے لیے صدقہ لینا حرام قرار دیا گیا، آپ کی میراث تقسیم نہیں ہوتی کیونکہ آپ نے اپنے پیچھے کوئی میراث نہیں چھوڑی۔ آپ کے لیے چار سے زائد بیویاں حلال کی گئیں، بیویوں کے درمیان عدل آپ پر واجب نہیں کیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ سے بڑھ کر بیویوں کے درمیان کسی نے عدل نہیں کیا۔ اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلا مہر آپ کو نکاح کرنے کی اجازت دی گئی اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی تمام بیویاں امت پر حرام کر دی گئیں۔ کیونکہ وہ ساری امت کی مائیں قرار دی گئیں۔ آپ کے لیے کتابیہ عورت سے نکاح کرنے پر پابندی عائد کی گئی جبکہ باقی امت کے لیے اسے حلال ٹھہرایا گیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم کو خوب معلوم ہے جو کچھ ہم نے مسلمانوں کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں فرض کیا ہے۔ اس میں دراصل سورۃ النساء کی آیت ۳ کی طرف اشارہ ہے جس میں مسلمانوں پر چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی پابندی لگائی گئی ہے۔ یعنی ہم مسلمانوں کو تحدیدِ ازواج اور لونڈیوں کے بارے میں جو احکام دے چکے ہیں وہ ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ لیکن ہم نے اس آیتِ کریمہ میں جس طرح آپ کو چار سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت دی ہے جبکہ آپ مہر انہیں ادا کر دیں۔ اسی طرح اپنے قریبی رشتہ کی ایسی خاتون سے جس نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو، اور ایسی خاتون سے جو جہاد کے نتیجہ میں بطورِ غنیمت حاصل ہو اور ایسی کسی خاتون سے جو اپنی ذات کو آپؐ کو ہبہ کردے اور آپؐ اس سے نکاح کرنا پسند فرمائیں۔ آپ کو یہ سہولتیں اس لیے دی گئی ہیں تاکہ اس باب میں آپ پر کوئی تنگی نہ رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس تنگی نہ رہنے کا مفہوم کیا ہے۔ جو لوگ آنحضرت ﷺ کے بلند مقام سے آگاہ نہیں یا انہوں نے آپ کے سیرت و کردار کا مطالعہ نہیں کیا وہ بعض دفعہ اس سے غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے یہ مطلب نکالتے ہیں کہ آپ کو شاید خواہشاتِ نفسانی پورا کرنے کی کھلی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن جن لوگوں نے آپ کے سیرت و کردار کا کچھ بھی مطالعہ کیا وہ کبھی بھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اب وہ جانتے ہیں کہ آپ جوانی میں ایسی حسین و جمیل شکل و صورت کے مالک تھے کہ کسی نگاہ نے آپ جیسا کوئی دوسرا جوان

Marfat.com

نہ دیکھا تھا اور مکے بھر میں آپ سے زیادہ کوئی نیک نام نہ تھا۔ خاندانی شرافت کے اعتبار سے آپ کسی سے کم نہ تھے۔ اور پچیس سال کی عمر میں آپ ایک کامیاب تاجر کی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ان تمام صفات کی موجودگی میں آپ کے لیے کسی نوجوان دوشیزہ سے شادی کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بایں ہمہ آپ نے ایک ایسی خاتون سے شادی کی جو آپ سے پندرہ سال عمر میں بڑی تھیں۔ لیکن اپنی عفت مآبی اور حسنِ کردار میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں۔ اور ان کی وفات تک جبکہ آپ کی عمر باون سال ہو چکی تھی نہایت خوشدلی سے ان کے ساتھ زندگی گزاری۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت سودہؓ سے شادی فرمائی جو ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ کے گھر میں اس وقت آئیں جب آپ کی عمر تقریباً پچپن سال کی ہو چکی تھی اور ستاون سال کی عمر تک آپ کے گھر میں چار بیویاں تھیں۔ اس تفصیل کو دیکھتے ہوئے کیا کوئی شخص اس وہم میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ پروردگار آپ کی جس تنگی کو دور کرنے کا ذکر فرما رہا ہے اس کا تعلق نفسانیت سے تھا۔

آپ کے لیے حرج اور تنگی کو دور کرنے کے دو حوالے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ایک ایسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جس سے زیادہ ناتراشیدہ قوم کوئی نہ تھی۔ ایسی قوم کو من حیث المجموع بدل دینا آپ کے پیشِ نظر تھا۔ آپ نے ان کی معاشرت کو بدلا، معیشت کو سنوارا، اخلاق و عادات درست کیے، ان کی زندگی کی ترجیحات بدلیں، قبائلی تعصب سے نکال کر امت کا شعور ان میں پیدا کیا، نفسانی عوارض کو ملی اور نظریاتی عواطف و میلانات میں بدلا۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ مردوں ہی میں پیدا نہیں کیا، عورتوں میں بھی پیدا فرمایا۔ کیونکہ جس طرح مردوں کی تعلیم و تربیت آپ کی ذمہ داری تھی، اسی طرح عورتوں کی تعلیم و تربیت بھی آپ کے فرائض میں شامل تھی۔ اب مشکل یہ تھی کہ آپ نے مردوں میں انفرادی اور اجتماعی اصلاح و تربیت کے لیے تو اپنے اصحاب کو اپنی معاونت کے لیے ہمراہ رکھا۔ لیکن عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے آپ کا کوئی معاون نہ تھا۔ اور آپ خود بھی آزادانہ ان کے اندر آ جا نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ اگر آپ اس قاعدے کو توڑتے تو بعد کے آنے والے امت کے رہنما اور پیشوا اس سے نہ جانے کیسے فائدہ اٹھاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ انتظام فرمایا۔ اور اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن بھی نہ تھی کہ مختلف عمروں اور ذہنی صلاحیتوں کی متعدد خواتین سے آپ کا نکاح فرمایا۔ اور آپ نے انہیں براہِ راست تعلیم و تربیت دے کر اپنی مدد کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ آپ کی ازواجِ مطہرات نے اللہ تعالیٰ کا دین پہنچانے، سکھانے اور اس کے مطابق تربیت دینے کے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ اگر جلیل القدر صحابہ سے بڑھ کر نہیں تو ان سے کسی طرح کم بھی نہیں۔

آنحضرت ﷺ کے سپرد ایک اور خدمت بھی کی گئی تھی کہ آپ نے صرف اللہ تعالیٰ کے دین کو بندوں تک پہنچانا ہی نہیں تھا بلکہ پرانے جاہلی نظامِ زندگی کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظامِ زندگی کو عملاً قائم کرنا تھا۔ اور اسلامی قوتوں کے لیے ایک ایسا بیس اور مرکز فراہم کرنا تھا جو انقلاب کا سرچشمہ بنے اور وہاں سے دنیا کے ان علاقوں میں اللہ تعالیٰ کا دین پھیلانے کے لیے جماعتیں نکلتی رہیں جہاں اللہ تعالیٰ کا دین نہیں پہنچا تھا۔ اس خدمت کی انجام دہی میں جاہلی نظام کے علمبرداروں سے جنگ ناگزیر تھی۔ اور یہ کشمکش ایک ایسے ملک میں پیش آ رہی تھی جہاں قبائلی روایات پوری طرح زندہ تھیں اور ہر قبیلہ اپنے اعتقادات کی حفاظت میں دوسرے قبیلوں کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ چنانچہ ان تمام قوتوں کو توڑنے اور ان کے مقابلے میں حزب اللہ کو قائم اور مضبوط کرنے کے لیے ضروری تھا کہ آپ مختلف خاندانوں میں نکاح کر کے بہت سی دوستیوں کو پختہ اور بہت سے عداوتوں کو ختم یا کمزور کر دیں۔ چنانچہ اگر گہری نظر سے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ جن خواتین سے آپ نے شادیاں فرمائیں ان کے

Marfat.com

ذاتی اوصاف کے علاوہ ان کے انتخاب میں یہ مصلحت بھی کم وبیش شامل تھی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے ساتھ نکاح کر کے آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ اپنے تعلقات کو اور زیادہ گہرا اور مستحکم کر دیا۔ حضرت ام سلمہؓ اس خاندان کی بیٹی تھیں جس سے ابوجہل اور حضرت خالد بن ولیدؓ جیسے لوگوں کا تعلق تھا۔ اور حضرت ام حبیبہؓ حضرت ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ ان شادیوں نے بڑی حد تک ان خاندانوں کی دشمنی کے اشتعال کو مدھم کر دیا۔ حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کے بعد ابوسفیان پھر کبھی حضورؐ کے مقابلے میں نہ آئے۔ حضرت صفیہ، جویریہ اور ریحانہ یہودی خاندانوں سے تھیں۔ ان سے نکاح کے نتیجے میں یہودیوں کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ کیونکہ اس زمانے کی عربی روایات کے مطابق داماد سے لڑنا بڑے عار کی بات سمجھی جاتی تھی۔ غور فرمایئے کہ اگر پروردگار آپ کو چار سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت نہ دیتا اور آپ کے لیے مزید کچھ آسانیاں پیدا نہ فرماتا، تو جو عظیم کام آپ کے سپرد کیا گیا تھا اس کی بجا آوری میں کس قدر دشواریاں پیش آتیں۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکَ ؕ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَآ اٰتَیْتَهُنَّ کُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ﴿۵۱﴾

(آپ ان بیویوں میں سے جس کو چاہیں اپنے سے الگ رکھیں اور جس کو چاہیں اپنے ساتھ رکھیں، اگر آپ ان میں سے کسی کے طالب بنیں جن کو آپ نے دور کر دیا تھا اس میں بھی کوئی حرج نہیں، یہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں، اور وہ اس پر راضی رہیں جو کچھ بھی آپ ان سب کو دیں، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اور اللہ علم رکھنے والا اور بردبار ہے۔ ۵۱)

خانگی زندگی کے سکون کے لیے بعض حقوق میں آپؐ کو رعایت

نبی کریم ﷺ کو جس کارِ عظیم کے لیے مبعوث کیا گیا اس کی اہمیت اور وسعت کے پیشِ نظر جہاں یہ ضروری ٹھہرا کہ بیویوں کے معاملے میں آپ پر وہ پابندیاں نہ لگائی جائیں جو عام مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں، وہیں یہ بات بھی ضروری ٹھہری کہ آپ کو خانگی زندگی کا سکون مہیا کیا جائے۔ اگر عورتوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کے لیے گھر میں بیویوں کی تعداد ۹ تک پہنچے گی اور مملوکات اس کے علاوہ ہوں گی تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے آپس کے تعلقات میں روزانہ کیسی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ اور نبی کریم ﷺ پر ان کے جو حقوق ہیں ان کی ادائیگی میں جو آپ کی مصروفیت کے باعث کبھی کمی بیشی ہوگی تو انہیں کیسی شکایات پیدا ہوں گی۔ اور مزید یہ بات بھی کہ ازواجِ مطہرات چونکہ اپنے دلوں میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ بے پناہ عقیدت و محبت رکھتی تھیں، اس حوالے سے یقیناً ہر ایک آپ کے قرب کی خواہش کریں گی تو اس طرح سے ان کے اندر رقابت کے جذبات پیدا ہونا ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ اس طرح کی کئی الجھنیں اور اڑچنیں تھیں جو آنحضرت ﷺ کی خانگی زندگی میں پیدا ہو سکتی تھیں اور جس کے نتیجے میں وہ عظیم کام متاثر ہو سکتا تھا جس پر انسانیت کی فلاح و بقاء کا دارومدار تھا۔ چنانچہ پروردگار نے ایسی تمام الجھنوں اور اڑچنوں کو دور کرنے کے لیے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ہدایات جاری فرمائیں۔

Marfat.com

سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ آپ جن عورتوں کو اپنے عقدِ ازدواج میں لائیں ان کا بنیادی حق بطور بیوی کے آپ کی قربت ہے۔ اوراس میں ہر بیوی دوسری کے ساتھ برابر کا حق رکھتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دے دیا کہ آپ حقوقِ زوجیت میں کسی کے پابند نہیں، جس بیوی کو چاہیں اپنی قربت کا موقع دیں اور جسے چاہیں اس سے محروم رکھیں۔ ان بیویوں کے ساتھ عقدِ نکاح کا بنیادی مقصد دینی مصلحت ہے۔ آپ انہیں تعلیم وتربیت کے ذریعے خواتینِ اسلام کی تعلیم وتربیت کے کام میں لگانا چاہتے ہیں، اس لیے آپ کی بیویوں کا اصل ہدف آپ سے دین سیکھنا اور دوسروں کو سکھانا ہونا چاہیے۔ رہی آپ سے ازدواجی نسبت یہ ان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ حق زوجیت کی ادائیگی یہ ان کا حق نہیں آپ کا اختیار ہے جسے چاہیں قرب بخشیں اور جسے چاہیں دور رکھیں۔

اور دوسری بات یہ فرمائی کہ جس بیوی کو آپ نے حقِ زوجیت سے معزول کر دیا ہو آپ اگر دوبارہ اسے اپنے پاس بلانا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں آپ کو اس کا بھی پورا اختیار ہے۔ اس طرح سے آپ بیویوں کے درمیان نہ باریاں مقرر کرنے کے پابند ہیں اور نہ تعلقات میں عدل ومساوات آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے نکاح میں آنے والی خواتین جب اس حقیقت کو سمجھ لیں گی تو آپ کی ایک جھلک ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ آپ جو کچھ انہیں دیں گے اور جن حقوق سے گراں بار کریں گے وہ ان پر راضی ہوں گی۔ چنانچہ آنحضرت کو اس اختیار کے مل جانے کے بعد بیویوں میں مسابقت اور رقابت کے امکانات ختم ہو گئے اور ان کے حقوق کا بار آپ کے سر سے اتر گیا۔ بایں ہما احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس اختیار کو کبھی استعمال نہ فرمایا۔ آپ نے اپنی ازواج کے درمیان ہمیشہ عدل کیا، کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی، باقاعدہ باری مقرر کر کے آپ سب کے یہاں تشریف لے جاتے رہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول بخاری، مسلم، نسائی اور ابوداؤد وغیرہم نے نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضورؐ کا طریقہ یہی رہا کہ آپ ہم میں سے کسی بیوی کی باری کے دن دوسری بیوی کے یہاں جاتے تو اس سے اجازت لے کر جاتے تھے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ باریوں کی تقسیم میں کسی پر کسی کو ترجیح نہ دیتے تھے۔ اگرچہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ آپ کسی روز اپنی سب بیویوں کے پاس نہ جاتے ہوں، مگر جس بیوی کی باری کا دن ہوتا تھا اس کے سوا کسی دوسری بیوی کو چھوتے تک نہ تھے۔ اور یہ روایت بھی حضرت عائشہؓ ہی سے ہے کہ جب حضورؐ اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہوئے اور نقل وحرکت آپ کے لیے مشکل ہو گئی تو آپ نے سب بیویوں سے اجازت طلب کی کہ مجھے عائشہ کے یہاں رہنے دو۔ اور جب سب نے اجازت دے دی تب آپ نے آخری زمانہ حضرت عائشہؓ کے یہاں گزارا۔

آیت کے آخر میں ایک تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے اور حلیم بھی۔ کہ اگر ازواجِ مطہرات میں سے کوئی زوجۂ محترمہ اس حکم کے آجانے کے بعد دل میں کبیدہ خاطر ہوں گی اور کسی حق کے نہ ملنے پر شاکی ہوں گی تو گرفت سے نہ بچ سکیں گی اور عام لوگوں کے لیے بھی اس میں تنبیہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ازدواجی زندگی کے متعلق کسی طرح کی بدگمانی بھی اپنے دل کے کسی گوشہ میں رکھی تو اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپی نہیں رہے گی کیونکہ وہ علیم ہے۔ اس لیے وہ اپنے علم کے مطابق اس پر گرفت فرمائے گا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی شان میں کسی طرح کی گستاخی بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں سخت سزا کی مستحق ہے۔ لیکن وہ علیم ہونے کے ساتھ ساتھ چونکہ حلیم بھی ہے اس لیے پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کا امکان بھی کھلا رکھتا ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی اصلاح کرنا چاہے اور وہ ایسے ہر طرح کے وسوسوں سے اپنے دل ودماغ کو فارغ کر دے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے۔

Marfat.com

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَامَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾

(اس کے بعد آپ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ اس کی اجازت ہے کہ آپ ان کی جگہ دوسری بیویاں لے آئیں چاہے ان کا حُسن آپ کو کتنا ہی اچھا لگے، سوائے لونڈیوں کے، اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔ ۵۲)

نکاح کے معاملے میں آنحضرت ﷺ پر بعض پابندیاں

آیت پچاس میں خواتین کی جن اصناف کا ذکر فرمایا گیا ہے ان کے علاوہ تمام عورتیں نبی کریم ﷺ کے لیے حرام کردی گئیں۔ ہمارے اکثر آئمہ تفسیر کے ساتھ ساتھ علامہ ابن کثیر نے بھی یہی رائے نقل کی ہے کہ وَمَاسِوٰی ذٰلِکَ مِنْ اَصْنَافِ النِّسَاءِ فَلَا یَحِلُّ لَکَ "یعنی ان کے سوا دوسری اقسام کی جو خواتین ہیں وہ تمہارے لیے جائز نہیں جبکہ دوسرے مسلمانوں کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ چار کی حد کو ملحوظ رکھتے ہوئے محرمات کے دائرے سے باہر جس عورت سے چاہیں نکاح کریں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کو اس بات کا بھی پابند کیا گیا کہ آپ اپنی ازواج میں سے کسی کو الگ کر کے دوسری بیوی نہیں لا سکتے، اگرچہ وہ آپ کی نظروں میں کتنی ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو، جبکہ دوسرے مسلمانوں کو اس کی اجازت تھی کہ وہ اپنی منکوحات میں سے جس کو چاہیں طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی دوسری بیوی اپنی پسند کی بیاہ لائیں۔ البتہ آپ کو دیگر مسلمانوں کی طرح ملکِ یمین کی اجازت دی گئی، یعنی آپ ان لونڈیوں سے تمتع کر سکتے تھے جو آپ کو جنگ و جہاد میں مالِ غنیمت کے نتیجے میں ہاتھ آئیں۔ ان میں بھی جو عورتیں بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں ان کو آپ نے آزاد کر کے مہر دے کر ان سے نکاح کر لیا۔ صرف ایک حضرت ماریہؓ ہیں جنہیں مقوقسِ مصر نے آپ کی خدمت میں تحفۃً بھیجا تھا، وہ آپ کے قبضہ میں آئیں اور ان سے آپ نے تمتع کیا اور ان کے بطن سے آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے۔

یہ یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں پر غلاموں اور لونڈیوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئے دن کی جنگوں میں جو قیدی پکڑے جاتے انہیں غلام بنا لیا جاتا اور جو عورتیں پکڑی جاتیں ان کو لونڈیاں بنا لیا جاتا۔ تو نہ جنگوں کی تعداد مقرر کی جا سکتی تھی اور نہ جنگی اسیروں کی۔ تو غلاموں اور لونڈیوں کی تعداد کیسے مقرر کی جاتی۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح مالدار لوگوں کے لیے عیاشی کا ایک ذریعہ نکالا گیا ہے جس سے نفس پرست لوگوں نے بیجا فائدہ اٹھایا۔ ممکن ہے کسی زمانے میں ایسا ہوا ہو لیکن سوال یہ ہے کہ قانون تو لوگوں کی سہولت کے لیے بنایا جاتا ہے اور اس میں انسانی ضروریات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس سے غلط فائدہ اٹھائے، تو اس میں قانون کا کیا قصور ہے۔ مثلاً شریعت ایک مرد کو چار تک بیویاں کرنے کی اجازت دیتی ہے اور اسے یہ حق بھی دیتی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لے آئے۔ اور یہ حق اسے انسانی ضروریات کے تحت دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص محض عیاشی کی خاطر بیویوں کو بدلتا رہے تو یہ قانون کی گنجائشوں سے ناروا فائدہ اٹھانا ہے جس کی ذمہ داری خود اس شخص پر ہے، قانون پر نہیں۔ اور نبی کریم ﷺ نے ایسی رعایتوں سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور آپ نے جتنے نکاح بھی کیے حظِ نفس کے لیے نہیں، تالیفِ قلب، دلداری اور مصالحِ ملت کی خاطر کیے۔ آپ پر اصلاحِ خلق کا جو عظیم بار ڈالا گیا تھا ازواجِ مطہرات نے آپ کے ساتھ شریک ہو کر اس بار میں اپنا حصہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ جب کوئی شخص اس پہلو سے آنحضرت ﷺ کی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور ازواجِ مطہرات کے عمل کو دیکھے گا تو اسے آپ کا گھرانہ غیر معمولی ہی نہیں فرشتوں کا گھر معلوم ہوگا۔

Marfat.com

آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت تذکیر و تنبیہ کے لیے ہے اور اس کے مخاطب آنحضرت ﷺ بھی ہیں اور ازواج مطہرات بھی۔ اور درجہ بدرجہ باقی لوگ بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر شخص مسؤل ٹھہرایا گیا ہے اور جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی زیادہ مسؤل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی چونکہ ہر معاملے میں امت کے لیے نمونہ ہیں وہ باوجود اس کے کہ معصوم بھی ہیں اور محفوظ بھی۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مسؤلیت کے حوالے سے ہمیشہ اپنا محاسبہ کرتے رہے ہیں۔ اور ان کا یہ محاسبہ بھی امت کے لیے ایک نمونہ بن گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ
النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ
اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ
لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ
لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ
وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمْ
اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ
اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ۝٥٣ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝٥٤ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ
وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ
اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝٥٥ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ
يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا

Marfat.com

تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ
يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا
بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۸﴾ ع

رکوع: ۷۔ (اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں داخل نہ ہو، مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے، نہ کہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کی تیاری کی، لیکن جب تم کو بلایا جائے تو ضرور آؤ، پھر جب تم کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو، تمہاری یہ حرکتیں نبی کریم (ﷺ) کو تکلیف دیتی تھیں لیکن وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا، اور جب تم کو نبی کی بیویوں سے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو، یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے، تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے اس کے بعد نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ ۵۳) تم کسی چیز کو ظاہر کرو خواہ چھپاؤ، اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۵۴) (ازواجِ نبی پر کوئی گناہ نہیں ان کے باپوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بیٹوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بھائیوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بھتیجوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بھانجوں کے بارے میں، اور نہ ان کے میل جول کی عورتوں کے بارے میں، اور نہ ان کے مملوکوں کے بارے میں، اور اللہ سے ڈرتی رہو، بے شک اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔ ۵۵) (بے شک اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر رحمت بھیجتے ہیں، اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔ ۵۶) (بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے اس نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۵۷) (اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان چیزوں کے بارے میں ایذا دیتے ہیں جن کا انہوں نے ارتکاب نہیں کیا، انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔ ۵۸)

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ
وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ
كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا
فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا
رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴿۵۳﴾

(اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں داخل نہ ہو، مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے، نہ کہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کی تیاری کی، لیکن جب تم کو بلایا جائے تو ضرور آ ؤ، پھر جب تم کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو، تمہاری یہ حرکتیں نبی کریم (ﷺ) کو تکلیف دیتی تھیں لیکن وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا، اور جب تم کو نبی کی بیویوں سے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو، یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے، تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے اس کے بعد نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ ۵۳)

اسلامی معاشرت کے چند آداب

پیش نظر آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کے ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے اور اسلامی معاشرت سے متعلق چند آداب و احکام بیان کیے گئے ہیں۔ سببِ نزول کے اعتبار سے چونکہ اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور آپ ؐ کی ازواجِ مطہرات سے ہے اس لیے بیوت النبی کا ذکر فرمایا گیا ہے لیکن ان احکام میں عموم پایا جاتا ہے۔ کیونکہ شریعت کا یہ مسلمہ اصول ہے **العبرۃ لعموم اللفظ لالخصوص السبب** ”یعنی اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے سبب کے اختصاص کا نہیں۔“

آداب کی تعلیم میں چار احکام دیے گئے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ چار ادب سکھائے گئے ہیں۔ پہلا ادب یہ ہے کہ جب تک تمہیں گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے یعنی تمہیں کھانے کی دعوت نہ دی جائے اس وقت تک نبی کریم ﷺ کے گھروں میں تمہیں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اس میں دو ادب سکھائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ گھروں میں داخل ہونے کے لیے اجازت طلبی ضروری ہے اور اگر اجازت نہ دی جائے تو واپس پلٹ جاؤ۔ اور دوسری یہ بات کہ کسی دعوت میں بن بلائے مت جاؤ۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں جگہ کھانے کی تقریب ہے تو وہ بن بلائے پہنچ جاتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں اس سے روکا گیا۔ اور بعد میں نبی کریم ﷺ نے مختلف مواقع پر اپنے عمل سے اس کی وضاحت فرمائی۔

تیسرا ادب یہ سکھایا گیا ہے کہ اگر کسی دعوت میں بلایا جائے تو اسے بہانہ بنا کر کھانے کی تیاری کے انتظار میں وہیں دھونی رما کر مت بیٹھ رہو۔ جس دین نے اپنے ماننے والوں کو قناعت اور کفایت کی تعلیم دی ہے اور فقیری اور ناداری کی حالت میں بھی خودداری کا

Marfat.com

ادب سکھایا ہے ان کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ کسی طماعی اور سفلہ پن کا اظہار کریں۔ اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں لوگوں کا رہن سہن نہایت سادہ تھا، زنانہ مکانوں کے ساتھ مردانہ بیٹھکیں نہیں تھیں۔ ایسے میں قبل از وقت لوگوں کا جمع ہوجانا اہلِ خانہ کے لیے اذیت کا باعث ہوتا تھا۔ اس لیے اس بات سے روکا گیا کہ کھانے کے پکنے کے انتظار میں مت بیٹھو۔ آیت میں ناظرین، منتظرین کے معنی میں ہے اور اِنٰهُ میں اِنَا کھانا پکنے کو کہتے ہیں۔

اس کے بعد گھروں اور تقریبات میں آنے کے لیے صحیح طریقہ ارشاد فرمایا گیا۔ وہ یہ ہے کہ جب تمہیں بلایا جائے تو کھانے کے وقت پہنچو تاکہ میزبان کو کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اور جب کھانا کھا چکو تو وہاں سے منتشر ہوجاؤ، طویل باتیں چھیڑ کر وہاں نہ بیٹھے رہو۔ کیونکہ بعض دفعہ مہمانوں کا کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے رہنا میزبان کے لیے باعث کلفت ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ میزبان کے لیے اس کے بعد کچھ اور ضروری مصروفیات ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جگہ کی تنگی کے باعث مہمانوں کو باری باری کھلایا جارہا ہو۔ ظاہر ہے کہ پہلے مہمانوں کے جانے کے بعد دوسرے مہمانوں کو کھانے پر بلایا جاسکے گا۔ اور اگر پہلے مہمانوں میں سے کچھ لوگ باتوں میں لگے بیٹھے رہیں تو میزبان کو بھی تکلیف ہوگی اور مہمان بھی اذیت محسوس کریں گے۔ ہاں اگر یہ اندازہ ہوسکے کہ میزبان کی خواہش ہے کہ مہمان دیر تک تشریف رکھیں تاکہ اس کی تقریب کے لیے رونق کا سامان بنیں اور جگہ کی کشادگی کے باعث کسی تنگی کا بھی اندیشہ نہ ہو۔ تو پھر دیر تک بیٹھنے اور باتوں میں لگے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔

اس کے بعد نبی کریم ﷺ کی کریم النفسی اور مروت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بہت بلند و بالا خصلتوں اور عادتوں کا پیکر بنایا ہے۔ اس لیے تمہارا وقت سے پہلے آبیٹھنا اور پھر دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہنا اور اجازت لیے بغیر اندر چلے آنا اس سے انہیں جگہ کی تنگی اور مردانہ اور زنانہ حصہ ایک ہونے کی وجہ سے جو اذیت پہنچتی تھی وہ اپنی کریم النفسی کے باعث اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ تکلیف برداشت کرلیتے تھے لیکن مہمانوں سے کچھ کہنا لحاظ اور مروت کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں فرماتا۔ یہ باتیں اسلامی معاشرت کے نقطہ نگاہ سے بہت نقصان دہ ہیں اور ان ہی سے بہت سے مفاسد بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ تمہیں ان باتوں سے آگاہ فرمارہا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ انسانی خصائلِ حمیدہ کا صحیح ترجمان ثابت ہو۔

صحابہ کرام ؓ کا معاشرہ جو ہمہ جہت تربیت کے بعد تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک نمونے کا معاشرہ بنا۔ یہ صرف آنحضرت ﷺ کی تربیت کا اعجاز اور اسلامی اخلاق کا اثر تھا ورنہ اہلِ عرب اپنے عادات واطوار میں اُس وقت کی دنیا میں سب سے زیادہ اجڈ اور غیر شائستہ تھے۔ وہ معاشرے کے بنیادی آداب سے بھی تہی دامن تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی تربیت میں جس طرح نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار کیا اسی طرح اپنے مزاج کے خلاف ان کی بہت سی ناشائستہ باتوں کو بھی برداشت کیا۔ اور جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں آپ اپنی کریم النفسی کے باعث لوگوں کی غلط باتوں پر ٹوکنا اور خاص طور پر گھر آئے ہوئے مہمانوں کو کسی بات پر تنبیہ کرنا خلافِ مروت سمجھتے تھے اس لیے آپ اذیت برداشت کرتے تھے لیکن کہنا پسند نہ تھا۔ آپ کے خادمِ خاص حضرت انس ابنِ مالک ؓ کی روایت ہے کہ حضرت زینب ؓ کے ولیمے میں سب لوگ تو کھانے سے فارغ ہوکر رخصت ہوگئے مگر دو تین حضرات بیٹھ کر باتیں کرنے میں لگ گئے۔ تنگ آکر حضور ؐ اٹھے اور ازواجِ مطہرات کے یہاں ایک چکر لگایا۔ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ پھر پلٹ گئے اور حضرت عائشہ ؓ کے حجرے میں جا بیٹھے۔ اچھی خاصی رات گزر جانے کے بعد جب آپ کو معلوم ہوا کہ وہ چلے گئے ہیں تب آپ حضرت زینب ؓ کے مکان میں تشریف لائے۔ اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں اور اصلاحِ معاشرت کے ساتھ ساتھ پردے کے بھی چند احکام دیے گئے۔ اور سورۃ النور میں ان احکام کی تکمیل کی گئی۔

Marfat.com

پردے کے بارے میں چند احکام

سب سے پہلے جیسا کہ آیت کے آغاز میں گزرا گھروں میں بلا اجازت داخلے پر پابندی لگائی گئی۔ لیکن سبب نزول چونکہ حضرت زینبؓ کا واقعہ ہوا اس لیے نبی کریم ﷺ کے گھروں کا ذکر فرمایا گیا۔ اور مزید یہ بات کہ آپ کا گھر چونکہ تمام امت کے لیے ایک نمونہ تھا اس لیے ہر مسلمان یہ بات سمجھتا تھا کہ جو پابندی آنحضرت ﷺ کے گھرانے پر لگے گی وہی سارے مسلمانوں کی روش بن جائے گی۔ چنانچہ اس حکم کے بعد جیسے ہی ازواج مطہرات کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکائے گئے تو اس کی تقلید میں تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔

پردے کے سلسلے میں دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ جب غیر مردوں کو عورتوں سے کوئی چیز مانگنے کی ضرورت پڑے تو وہ دندناتے ہوئے ان کے سامنے نہ چلے جائیں بلکہ پردے کی اوٹ سے مانگیں۔ بظاہر یہ بات بہت پابندی کی معلوم ہوتی ہے کہ معمولی معمولی بات کے لیے بھی پردے کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن یہ کوئی تکلف نہیں بلکہ دل کو آفات سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک نہایت ضروری تدبیر ہے۔ آج کے لوگ انسانی احساسات کے حوالے سے کیسے ہی مفروضوں پر بات کریں لیکن جس نے دلوں کو پیدا کیا ہے وہ ان کی حقیقت کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک بات تو یہ ارشاد فرمائی الا ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت الجسد کله الا و هی القلب ''خبردار انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ تندرست ہے تو سارا جسم تندرست ہے، اور جب اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے، خبردار وہ دل ہے۔'' یہی احساسات کا مرکز اور یہی انفعالات کا مورد ہے۔ یہیں سے جذبات ابھرتے اور یہیں جذبات بسیرا کرتے ہیں۔ اس لیے اسلام نے دل کی صحت پر بہت زور دیا ہے۔ اور اسی پر تمام اخلاقی صحت کو منحصر ٹھہرایا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ ہمارے آج کے تہذیب خوردہ لوگ اپنے کپڑوں کی صفائی کا تو بڑا اہتمام رکھتے ہیں۔ کہیں ایک شکن یا دھبہ بھی پڑ جائے تو برداشت نہیں ہوتا۔ لیکن ان کے دل بداخلاقی اور سفلی جذبات کی گندگی میں اٹے رہیں تو انہیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ لیکن اسلام چونکہ کردار کی تعمیر اور اخلاق کی تطہیر کے لیے دل کی اصلاح کو بنیاد بناتا ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کن کن راستوں سے دل میں برائی داخل ہوتی ہے اور وہ کون سی برائیاں ہیں جن کا اثر دل قبول کرتا ہے۔ اس لیے اس نے ضروری سمجھا کہ مرد اور عورت کے درمیان پردہ کرایا جائے۔ بے حجاب عورت اور بے باک نگاہیں دل کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ مرد وزن کا اختلاط قلبی زندگی کی تمام دیواروں کو گرا دیتا ہے۔ دل انسانی جسم میں جس طرح جسمانی حیات کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح اخلاقی طہارت کے لیے بھی سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والا اور سب سے زیادہ حساس ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مردوں کے لیے گھروں میں آنے پر پابندی لگائی اور پھر مرد و عورت کے درمیان ایک اوٹ کھڑی کر دی کہ اگر ضروری بات بھی کہنے کا موقع آئے تو اوٹ کے پیچھے کھڑے ہو کر کی جائے۔ اور کوئی چیز مانگنی ہو تو حجاب کے پیچھے سے مانگی جائے۔

پردے کے سلسلہ میں تیسرا حکم یہ دیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ بات زیبا نہیں کہ جن باتوں سے روکا گیا ہے ان میں سے کسی کے ارتکاب سے آنحضرت ﷺ کو اذیت پہنچائے اور نہ آپؐ کے بارے میں اور آپ کی ازواج مطہرات کے بارے میں کوئی ایسی بات دل میں لائے اور یا کوئی ایسی بات دلچسپی سے سنے جس سے آنحضرت ﷺ کی عزت و حرمت میں فرق آتا ہو۔ اور جسے منافقین اور دشمنانِ دین آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کا اخلاقی تفوق ختم کرنے کے لیے خود گھڑتے اور اِدھر اُدھر پھیلاتے تھے۔ اس سے منافقین کو متنبہ فرمایا گیا اور مسلمانوں کو بھی اور زیادہ محتاط رہنے کی ترغیب دی گئی۔

Marfat.com

اس عبارت میں نہایت اہم نکتہ قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ اس آیتِ کریمہ میں اس سے پہلے دو دفعہ آنحضرت ﷺ کے لیے نبی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لیکن جب ایذائے رسول سے رکنے کا حکم دیا تو رسول کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے شاید یہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ رسول اپنی قوم کے لیے خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ اس کی تشریف آوری اتمامِ حجت اور نیکوں اور بدوں میں فیصلہ کردینے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے منافقین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو کسی طرح کی ایذا پہنچانا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ ان کا حدود سے تجاوز ان کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

چوتھا حکم یہ دیا گیا کہ ازواجِ مطہرات کا آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد کسی سے نکاح جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج کی حیثیت امت کی ماؤں کی ہے۔ اور ان کے ساتھ تعلق کی یہی نوعیت فطری بھی ہے اور عقلی بھی۔ فطری اس وجہ سے کہ حضورؐ کی ازواج کے لیے ہر امتی کے دل کے اندر احترام وعقیدت کا جذبہ اپنی حقیقی ماں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی گیا گزرا شخص بھی اپنی ماں کے ساتھ نکاح کا تصور نہیں کرسکتا، چہ جائیکہ ازواجِ رسول ﷺ کے ساتھ کوئی سوچنے کی زحمت بھی کرے۔

ازواجِ مطہرات کے ساتھ تعلق کی دوسری نوعیت عقلی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ امت کی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ امت کے سب ذکور واناث کی معلمات بھی ہیں۔ اور اس منصب پر انہیں خود اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا ہے۔ اس منصب کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ انہیں ماؤں ہی کے درجہ میں رکھا جائے۔ اور اسی درجے میں وہ اپنے فریضۂ منصبی کو صحیح طور پر ادا کرسکتی ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ جن باتوں سے ان آیات میں روکا گیا ہے ان میں سے ہر بات آنحضرت ﷺ کے حوالے سے نہایت اہمیت کی حامل ہے اور ان میں سے کسی ایک بات کا ارتکاب بھی نہایت خطرناک نتائج کا سبب ہوسکتا ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۵۴﴾

(تم کسی چیز کو ظاہر کرو خواہ چھپاؤ، اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۵۴)

یعنی اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے خلاف دل میں کوئی برا خیال رکھے گا یا آپؐ کی ازواجِ مطہرات کے متعلق کسی کی نیت میں کوئی برائی چھپی ہوگی تو اللہ تعالیٰ سے وہ چھپی نہ رہے گی کیونکہ وہ دلوں کے بھید سے واقف ہے۔ اس وجہ سے کوئی بات اس سے چھپائی نہیں جاسکتی۔ دنیا میں غلط سے غلط بات کے بھی اچھے سے اچھے عذر تراشے جاسکتے ہیں لیکن یہ عذرات اللہ تعالیٰ کے یہاں کام نہیں آئیں گے۔ وہ دلوں کے مخفی کھوٹ بھی سب کے سامنے کھول کر رکھ دے گا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ
اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ
وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۵۵﴾

Marfat.com

(ازواجِ نبی پر کوئی گناہ نہیں ان کے باپوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بیٹوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بھائیوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بھتیجوں کے بارے میں، اور نہ ان کے بھانجوں کے بارے میں، اور نہ ان کے میل جول کی عورتوں کے بارے میں، اور نہ ان کے مملوکوں کے بارے میں، اور اللہ سے ڈرتی رہو، بے شک اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔ ۵۵)

ان رشتوں کا ذکر جو ان احکام سے مستثنیٰ ہیں

گزشتہ سے پیوستہ آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے گھروں میں اصلاً اور مسلمانوں کے گھروں میں طبعاً داخل ہونے کے آداب بیان کیے گئے ہیں اور ان آداب میں سب سے پہلا ادب استیذان ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان رشتوں کو بیان کیا گیا ہے جو اس استیذان اور پردے کے دوسرے احکام کے پابند نہیں۔ سورۃ النور کی آیت ۳۱ میں ان رشتوں کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اُس آیت کو اس آیت کی وضاحت سمجھنا چاہیے۔ اس آیتِ کریمہ میں خاص اہم رشتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ جو رشتہ داران کے حکم میں داخل ہیں وہ سب اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے اوپر صرف وہی پابندیاں ہوں گی جو سورۃ النور میں مذکور ہوئی ہیں۔ علامہ آلوسی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے ٹھیک فرمایا کہ بھائیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کے حکم میں وہ سب رشتہ دار آجاتے ہیں جو ایک عورت کے لیے حرام ہیں۔ خواہ وہ نسبی رشتہ دار ہوں یا رضاعی۔ اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لیے بمنزلۂ والدین ہیں۔ یا پھر ان کے ذکر کو اس لیے ساقط کر دیا گیا کہ بھانجوں اور بھتیجوں کا ذکر آجانے کے بعد ان کے ذکر کی حاجت نہیں۔ کیونکہ بھانجے اور بھتیجے سے پردہ نہ ہونے کی جو وجہ ہے، وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ ہونے کی وجہ بھی ہے۔ (روح المعانی)

وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝۵۵ اس کی تشریح کی ایک صورت یہ ہے کہ خطاب ازواجِ مطہرات سے ہو، اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ ازواجِ نبی آنحضرت ﷺ کی نسبت کے باعث بہت عظیم مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔ لیکن اپنے اعمال کے بارے میں جواب دہی کے حوالے سے وہ بالکل دوسروں کی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ مسئولیت میں کسی کے لیے اختصاص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی نسبت سے ان کا معاملہ زیادہ نازک ہے۔ کیونکہ ہر بیوی اپنے شوہر کی اطاعت کی پابند ہے۔ لیکن اس سے اختلافِ رائے کا بھی حق رکھتی ہے۔ اور اسے بھی اپنے شوہر کی طرح بعض حقوق حاصل ہیں جن کے بارے میں شوہر سے پوچھا جائے گا۔ لیکن آنحضرت ﷺ ایسی تمام پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں۔ اور آپؐ سے محبت و اطاعت عام مسلمانوں کی طرح ازواج کے بھی ایمان کا حصہ ہے۔ اس لیے اگر وہ اجر و ثواب میں دوسروں سے بلند مقام رکھتی ہیں تو جواب دہی میں بھی نازک مقام پر کھڑی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتی رہو۔ جو احکام و ہدایات دیے گئے ہیں ان کی تعمیل پوری خدا ترسی اور تقویٰ کے ساتھ کی جانی چاہیے۔ اور یہ بات دھیان میں رہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات مخفی نہیں، وہ ہر بات کو دیکھنے اور جاننے والا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ خطاب عام خواتینِ اسلام سے ہو۔ اس صورت میں ازواجِ مطہرات کے ذکر کے ضمن میں تمام مسلمان عورتوں کو بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ عورتوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیے ہیں وہ ان کی پوری طرح پابندی کریں اور یہ ذہن میں رکھیں کہ ان احکام کے حوالے سے جواب طلبی ہونے والی ہے۔

Marfat.com

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾

(بے شک اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر رحمت بھیجتے ہیں، اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود وسلام بھیجو۔ ۵۶)

آیت کا شانِ ورود

سورۃ الاحزاب غزوۂ احزاب کے بعد نازل ہوئی۔ اور ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ غزوۂ احزاب درحقیقت جزیرۂ عرب کی متحدہ طاقتوں کا ایک فیصلہ کن غزوہ تھا جس میں وہ مسلمانوں کے مکمل استیصال کا عزمِ صمیم کر کے آئے تھے۔ چنانچہ ایک عظیم افرادی قوت اور تمام دشمنوں کے مسلمانوں کے استیصال پر مکمل اتحاد نے مدینہ منورہ کے اندر رہنے والے منافقین کو کھل کھیلنے کا موقع مہیا کر دیا تھا۔ حالات پر نظر رکھنے والی ہر نگاہ دیکھ رہی تھی کہ مسلمانوں کی قسمت ترازو میں ہے۔ پلڑا کسی وقت بھی جھک سکتا ہے۔ مسلمان اپنی بقاء کی فیصلہ کن کشمکش میں مصروف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت اور وعدے کے مطابق مسلمانوں کو اس عظیم ابتلاء میں سرخرو فرمایا۔ اور دشمن اپنا زخم چاٹتا ہوا میدان سے بھاگ نکلا۔ اب مارِ آستین قسم کے دشمنوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ مدینے کے اندر بیٹھ کر الزامات واتہامات کے ذریعے مسلمانوں کے شیرازے کو بکھیرنے کی کوشش کریں اور نبی کریم ﷺ شخصیت کو مجروح کر کے دلوں میں بدگمانیوں کی فصل اگانے کی کوشش کریں، تاکہ جس مرکز کے گرد مسلمان پروانوں کی طرح فدا ہو رہے ہیں اس مرکز کو کمزور کر دیا جائے۔ چنانچہ ان فتنوں کے سدِ باب کے لیے ایک طرف مسلمانوں کی شیرازہ بندی کو مستحکم کرنے کے لیے اسلامی معاشرت کے وہ آداب سکھائے گئے جن کا گزشتہ آیات میں ذکر کیا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ آنحضرت ﷺ کی شخصیت سے والہانہ تعلق اور گہری وابستگی پیدا کرنے کے لیے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں آپؐ کے مقام ومرتبہ کو واضح فرمایا گیا اور مسلمانوں کو ایک ایسی چیز کی تعلیم دی گئی جس سے دلوں میں نبی کریم ﷺ کی محبت کو بیش از بیش راسخ ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا کہ یہ لوگ نبی کریم ﷺ کے مقام ومرتبہ کو کم کرنے کے لیے اور لوگوں کے دلوں میں بدگمانیاں پیدا کرنے کے لیے ان کی ذاتِ گرامی اور ان کے اہلِ خانہ کے بارے میں عجیب وغریب بدگمانیاں پیدا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ذات اس قدر دلآویز اور اس قدر عظیم ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی خود اس پر درود وسلام بھیجتے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ جس ذات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت برستی ہو اور فرشتے جو کائنات کا نظم ونسق چلاتے ہیں ہمیشہ اس کے لیے دعا گو رہتے ہوں، کوئی ہزار کوشش کرے کبھی اس کی عزت وحرمت کو گہنانے اور کم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

مسلمانوں کے دلوں میں اس تعلق کو مستحکم کرنے اور آنحضرت ﷺ کی ذات کے ساتھ والہانہ تعلق کو پیدا کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو مسلسل اللہ تعالیٰ کے رسول پر درود وسلام بھیجتے رہو۔ کیونکہ انہیں کی ذات سے تمہیں ہدایت کا فیض پہنچا ہے۔ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان تاریکیوں سے نکالا۔ تم بداخلاقی کی دلدل میں دھنسے جا رہے تھے کہ اس نے تمہیں اٹھایا اور مکارمِ اخلاق کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اہلِ عرب کو کوئی شخص عزت کی نگاہ سے دیکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن آپ کی تعلیم وتربیت نے انہیں نہ صرف حکومت وریاست میں برتری عطا فرمائی بلکہ علم وحکمت، انسانی اقدار، اخلاقِ عالیہ اور انسانی تہذیب وتمدن میں دنیا کا امام بنا دیا۔ جس عظیم شخصیت کے تم پر اس قدر احسانات ہیں دنیا اگر اس پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر رہی ہے تو تمہاری

Marfat.com

احسان شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنی محبت وعقیدت اور وفاداری ووفا شعاری سے دنیا پر آپ کی عظمت کا سکہ بٹھا دو۔ اور درود وسلام کے ذریعے ان کی عزت وعظمت کو اس طرح اجا لو کہ جتنے بدخواہ اور دشمن ہیں ان کو اندازہ ہو جائے کہ آنحضرت ﷺ کے چاہنے والے کتنی بڑی تعداد میں ہیں جن کی موجودگی میں آپؐ کی عزت کو بٹہ نہیں لگایا جاسکتا۔

اس آیت میں مسلمانوں کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک صلوٰۃ کا اور دوسرا سلام کا۔

صلوٰۃ کا مفہوم

صلوٰۃ......عربی زبان میں چند معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ رحمت، دعا اور مدح وثناء۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد رحمت نازل کرنا ہوتا ہے۔ اور جب فرشتوں کی طرف ہو تو اس کا معنی آپ کے لیے دعا کرنا ہے۔ اور جب عام مومنین کی طرف ہو تو پھر صلوٰۃ کا مفہوم دعا اور مدح وثناء کا مجموعہ ہے۔ عام مفسرین نے یہی معنی لکھے ہیں۔ لیکن امام بخاری نے ابوالعالیہ سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ سے مراد آپ کی تعظیم اور فرشتوں کے سامنے مدح وثناء ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی تعظیم دنیا میں تو یہ ہے کہ آپ کو بلند مرتبہ عطا فرمایا کہ اذان واقامت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ آپ کا ذکر شامل کرلیا گیا۔ اور مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کو دنیا بھر میں پھیلایا اور غالب کیا۔ اور آپ کی شریعت پر عمل قیامت تک جاری رکھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ آپ کی شریعت کو محفوظ رکھنے کا ذمہ خود پروردگار نے لے لیا۔ اور آخرت میں آپ کی تعظیم یہ ہے کہ آپ کا مقام تمام خلائق سے بلند وبالا کیا۔ اور آپ کو شفاعتِ کبریٰ کا مقام عطا فرمایا اور اسی کو مقامِ محمود بھی کہا جاتا ہے۔

صلوٰۃ وسلام کا طریقہ

صحیح بخاری ومسلم وغیرہ سب کتبِ حدیث میں یہ حدیث آئی ہے کہ حضرت کعب بن عجرہؓ نے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اس آیت میں ہمیں دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے صلوٰۃ اور سلام۔ صلوٰۃ کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا۔ جیسے نماز میں **السلام علیک ایھا النبی ورحمة الله وبرکاته** مگر آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کا طریقہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ الفاظ کہا کرو۔ **اللهم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ابرٰهیم وعلی ال ابرٰهیم انک حمیدمجید اللهم بارک علی محمد و علی ال محمد کما بارکت علی ابرٰهیم وعلی ال ابرٰهیم انک حمید مجید۔**

اسی طرح اور بھی متعدد صحابہ کرامؓ نے آنحضرت ﷺ سے بہت خفیف فرق کے ساتھ یہی درود روایت کیا ہے۔ ان تمام روایات میں الفاظ کے خفیف فرق کے باوجود معنی میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں جو اہم نکات ذکر فرمائے گئے ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(۱) آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو جو درود پڑھنے کا طریقہ سکھایا ہے ان میں بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ پر براہِ راست درود پڑھنے کی بجائے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ وہ نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کیسے بھی اخلاص کے ساتھ آنحضرت ﷺ پر درود بھیجے وہ کبھی بھی اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ درود بھیجنے کا مطلب آپ کے مراتب کو بلند کرنا ہے۔ آپ نے جو نوعِ انسانی پر احسانات کیے ہیں ان کا اجر دینا، آپ کے ذکر کو بلند کرنا اور آپ کے دین کو فروغ دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم ان میں سے کوئی کام بھی نہیں

Marfat.com

کرسکتے۔اوراگرتھوڑا بہت کربھی سکیں تو اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق چاہیے۔اسی طرح یہ بات بھی اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرنے کی ہے کہ حضورؐ کی محبت وعقیدت ہمارے دل میں پیدا فرمادے اور درود پڑھنے سے یہ بھی مقصود ہے۔

(۲) آنحضرت ﷺ نے امت کو جو درود سکھایا ہے اس میں صرف اپنی ذات کو مخصوص نہیں فرمایا بلکہ اپنے ساتھ اپنی آل، ازواج اور ذرّیت کو بھی شامل فرمایا۔آل سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو اخلاص کے ساتھ آپ کی پیروی کرتے ہیں اور آپ کے طریقے پر چلتے ہیں۔وہ چاہے آپ کی اولاد میں سے ہوں اور چاہے رنگ ونسل اور خاندان کے اعتبار سے آپ سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ابوجہل اور ابولہب اور کفارِ قریش آپ کی آل نہیں، حالانکہ وہ آپ کے رشتہ دار ہیں۔لیکن حضرت بلالؓ، حضرت صہیبؓ اور حضرت حسنؓ جو آپ سے رنگ ونسل کا رشتہ بھی نہیں رکھتے وہ اتباع کی وجہ سے آپ کی آل ہیں۔

صلوٰۃ وسلام سے چند احتیاطی ہدایات

صلوٰۃ وسلام سے متعلق چند باتیں ذہن نشین رکھنا بہت ضروری ہیں۔مثلاً جمہور فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب کوئی آنحضرت ﷺ کا ذکر کرے یا سنے تو اس پر درود شریف واجب ہوجاتا ہے۔کیونکہ حدیث میں آپ کے ذکرِ مبارک کے وقت درود شریف نہ پڑھنے پر وعید آئی ہے۔جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **رغم انف رجل ذُکرتُ عنده فلم یصل عليَّ** ''ذلیل ہو وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔اسی طرح اگر ایک مجلس میں آپ کا ذکرِ مبارک بار بار آئے تو صرف ایک مرتبہ درود پڑھنے سے واجب ادا ہوجاتا ہے، لیکن مستحب یہ ہے کہ جتنی بار ذکرِ مبارک خود کرے یا کسی سے سنے ہر دفعہ درود شریف پڑھے۔جس طرح زبان سے ذکرِ مبارک کے وقت زبانی صلوٰۃ وسلام واجب ہے، اسی طرح قلم سے لکھنے کے وقت صلوٰۃ وسلام کا قلم سے لکھنا بھی واجب ہے۔اور اس میں جو لوگ حروف کا اختصار کرکے ''صلعم'' لکھ دیتے ہیں یہ کافی نہیں، پورا صلوٰۃ وسلام لکھنا چاہیے۔

یہ بھی یاد رہے کہ لفظِ صلوٰۃ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کے لیے استعمال کرنا جمہور علماء کے نزدیک جائز نہیں۔امام بیہقی نے اپنے سنن میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے **لایصلی علی احد الا علی النبی ﷺ لکن یدعی للمسلمین والمسلمات بالاستغفار**۔

امام شافعی کے نزدیک غیر نبی کے لیے لفظ صلوٰۃ کا استعمال مستقلاً مکروہ ہے۔امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے۔البتہ تبعاً جائز ہے۔یعنی آنحضرت ﷺ پر صلوٰۃ وسلام کے ساتھ آل واصحاب یا تمام مومنین کو شریک کریں اس میں مضائقہ نہیں۔اور امام جوینی نے فرمایا کہ جو حکم لفظِ صلوٰۃ کا ہے وہی لفظِ سلام کا ہے۔یعنی غیر نبی کے لیے اس کا استعمال بھی درست نہیں۔بجز اس کے کہ کسی کو خطاب کرنے کے وقت بطور تحیہ کے السلام علیکم کہے، یہ جائز ومسنون ہے مگر کسی غائب کے نام کے ساتھ علیہ السلام کہنا اور لکھنا غیر نبی کے لیے درست نہیں۔ (خصائص کبریٰ سیوطی۔ص ۲۶۳، ج ۴)

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۝۵۷

(بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے اس نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۵۷)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانے کا مفہوم

اس آیت میں ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچاتے یا اس کا سبب بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس بات سے بہت بلند ہے کہ اسے ایذا پہنچائی جائے۔ کوئی شخص اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کوئی تکلیف پہنچا سکے۔ اور خود اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی ہر تأثر و انفعال سے بالاتر ہے۔ اس لیے کسی کی ہرزہ سرائی یا نافرمانی سے اس کا اس طرح اثر قبول کرنا کہ اسے اس سے ایذا محسوس ہو، یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایذا پہنچانے سے مراد وہ افعال و اقوال ہیں جو عادتاً ایذا کا سبب بنا کرتے ہیں۔ بعض آئمہ تفسیر نے ان افعال و اقوال کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے جنہیں نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ایذا کا سبب قرار دیا ہے۔ مثلاً حوادث و مصائب کے وقت زمانہ کو برا کہنا حالانکہ فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، تو جب لوگ زمانہ کو فاعل سمجھ کر گالیاں دیتے ہیں تو درحقیقت وہ فاعلِ حقیقی تک پہنچتی ہیں۔ اور بعض روایات میں ہیں کہ جاندار چیزوں کی تصویریں بنانا بھی اللہ تعالیٰ کی ایذا کا سبب ہے۔

بعض آئمہ تفسیر کا خیال ہے کہ یہاں ایذائے رسول کو اللہ تعالیٰ کی ایذا سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ کے رسول کو تکلیف پہنچتی ہے اسی سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتا اور اس سے اس کو ایذا پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کا کوئی ٹانکہ ٹوٹتا ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی مخالفت ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ کی سنت توڑی جاتی ہے، دین کی نشر و اشاعت اور اس کی تنفیذ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں، شعائرِ اسلام کی توہین کی جاتی ہے اور یا آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق صحابہ کرامؓ سے بغض رکھا جاتا ہے اور ان پر ناروا تنقید کی جاتی ہے تو اس سے آنحضرت ﷺ کو ایذا پہنچتی ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتے ہیں۔ اس کی سزا اللہ تعالیٰ نے یہ مقرر فرمائی ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار ہے۔

آج جس طرح اس ملکِ خداداد میں کلمہ گو مسلمانوں کا خون پانی سے ارزاں کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو انسانی غلامی میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی شریعت کے پرزے اڑا دیے گئے ہیں، اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کا دین لاوارث ہو کر رہ گیا ہے۔ ان میں سے ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے غضب کو دعوت دینے والی ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا ہی میں کوئی عذاب نہ ٹوٹ پڑے۔ اگرچہ عذاب کی مختلف صورتیں پہلے ہی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ملک میں شدید بدامنی اور خانہ جنگی کی کیفیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ یہ وہ عذاب ہے جس کی قرآنِ کریم بار بار دھمکی دیتا ہے۔ یہ مملکتِ خداداد بری طرح اس کا شکار ہو رہی ہے۔ (والی اللہ المشتکی وھو المستعان)

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۸﴾

(اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان چیزوں کے بارے میں ایذا دیتے ہیں جن کا انہوں نے ارتکاب نہیں کیا، انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔ ۵۸)

مدینہ میں منافقین اور چھپے دشمن جس طرح آنحضرت ﷺ اور آپ کے اہلِ خانہ کو مختلف اذیتیں پہنچاتے تھے تاکہ آپ مسلمانوں کی مناسب تعلیم و تربیت کا اہتمام نہ کر سکیں اور یکسو ہو کر اسلامی مقاصد کو آگے نہ بڑھا سکیں۔ اسی طرح وہ مسلمان معاشرے میں ابتری پیدا

Marfat.com

کرنے کے لیے مسلمانوں کی نہایت پاکیزہ شخصیات پر الزامات لگا کر مسائل پیدا کرنے کی کوششیں بھی کرتے تھے۔انہیں اس بات کا خوب ادراک تھا کہ مسلمانوں کی اصل طاقت غیر معمولی اخلاقی برتری ہے اس کا مقابلہ نہ افرادی قوت سے کیا جاسکتا ہے اور نہ کثرتِ اسلحہ سے۔اس کا توڑ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بے سروپا الزامات اور نازیبا بدگمانیوں کی ایسی فصل تیار کی جائے جس سے مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ مجروح ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے وہ قسم قسم کے الزامات تراشتے رہتے تھے۔ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں کو جھوٹے الزامات میں ملوث کر رہے ہیں وہ صریح بہتان اور کھلے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔اور وہ وقت دور نہیں جب قانون انہیں اپنی گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھے گا۔ چنانچہ ایک ہی سال بعد سورۃ النور نازل ہوئی اور ایسے ہی لوگوں کے لیے حدِ قذف عائد کی گئی۔

ضمناً اس آیت میں بہتان کی تعریف بھی متعین کر دی گئی ہے۔یعنی جو عیب آدمی میں نہ ہو اور یا جو قصور آدمی نے نہ کیا ہو وہ اس کی طرف منسوب کرنا بہتان ہے۔ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اس کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ابوداؤد اور ترمذی کی روایت ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا کہ غیبت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، ذکرک اخاک بما یکرہ ۔تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو۔عرض کیا گیا، اور اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو، فرمایا، ان کان فیه ماتقول فقد اغتبته و ان لم یکن فیه ماتقول فقد بهتّه ”اگر اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو، تو نے اس کی غیبت کی، اور اگر اس میں نہیں ہے تو، تو نے اس پر بہتان لگایا۔“

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ
وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ
اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾
لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ
فِى الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا
قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۛ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾
سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ
تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾ يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ
اللّٰهِ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ

Marfat.com

لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿٦٤﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ
لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٦٥﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي
النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿٦٦﴾ وَقَالُوْا
رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿٦٧﴾ رَبَّنَآ
اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿٦٨﴾ ع

رکوع: ۸۔ (اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگٹ لٹکا لیا کریں، یہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں، پس ان کو کوئی ایذا نہ پہنچائی جائے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ ۵۹) اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور جو مدینہ میں افواہیں پھیلانے والے ہیں باز نہ آئے تو ہم تمہیں ان پر اکسا دیں گے، پھر وہ اس شہر میں تمہارے ساتھ رہنے کا بہت ہی کم موقع پائیں گے۔ ۶۰) ان پر لعنت کی جائے گی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بے دریغ قتل کیے جائیں گے۔ ۶۱) یہ اللہ کی سنت ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے ہو گزرے ہیں، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ ۶۲) لوگ آپ سے قیامت کے وقت کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے، اور آپ کیا جانیں شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو۔ ۶۳) بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کر دی ہے اور ان کے لیے اس نے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۶۴) جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہ اس میں کوئی کارساز اور مددگار نہیں پائیں گے۔ ۶۵) جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹے پلٹے جائیں گے وہ کہیں گے اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ ۶۶) اور وہ کہیں گے اے ہمارے رب، ہم نے اطاعت کی اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی تو انہوں نے ہمیں راستے سے گمراہ کر دیا۔ ۶۷) اور اے ہمارے رب، انہیں دونا عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت فرما۔ ۶۸)

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾

(اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگٹ لٹکا لیا کریں، یہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں، پس ان کو کوئی ایذا نہ پہنچائی جائے اور اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔ ۵۹)

خواتین کے لیے گھروں سے باہر جانے کے احکام

اس سے پہلے کی چند آیات میں مسلمانوں کو معاشرت کے چند آداب سکھائے گئے تھے۔ اور جن کا آغاز گھروں میں آنے جانے کے آداب سے کیا گیا۔ اور سورۃ النور میں گھروں میں داخلے کے آداب ہی کے حوالے سے یہ ادب سکھایا گیا کہ جب صاحب خانہ کے اعزہ و اقرباء اور اعتماد کے لوگ گھروں میں آئیں تو گھروں کی خواتین کو ہدایت کی گئی کہ وہ نہایت احتیاط سے سمٹ سمٹا کر گھروں میں رہیں اور اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔ اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کی بکل مار لیا کریں۔ یعنی سر پر دوپٹہ اس طرح لیں کہ سر ڈھک جائے اور سینہ دوپٹہ میں چھپ جائے۔ لیکن ان تمام ہدایات کا تعلق گھروں کی زندگی سے تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر گھروں کی بیبیوں کو کسی ضرورت کے تحت باہر جانا پڑے تو باہر نکلنے کے آداب کیا ہیں؟ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں باہر نکلنے کا ادب سکھایا گیا ہے، کہ گھروں میں پردے کے لیے عورتوں کا سمٹ کر رہنا اور آزادانہ مہمانوں کے سامنے نہ آنا اور دوپٹے کی بکل مار لینا، یہی کافی ہے۔ لیکن جب باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو پھر بڑی چادریں اوڑھ کر اس کے ایک حصے سے گھونگٹ نکال لیا جائے۔ اور یہ چادر وہ ہے جو اہلِ لغت کے نزدیک خمار یعنی دوپٹے کے اوپر اوڑھی جاتی ہے۔ اہلِ لغت کے الفاظ یہ ہیں: هو الرداء فوق الخمار یہ وہ چادر ہے جو شرفاءِ عرب کی خواتین گھروں سے باہر نکلنے کے وقت اپنے جسم پر لیتی تھیں اور اسے دوپٹے کے اوپر اوڑھا جاتا تھا۔ اور شعراءِ جاہلیت کے کلام میں جابجا اس کا ذکر ملتا ہے۔ اسلام نے اس میں اضافہ یہ کیا ہے کہ وہ صرف چادر اوڑھتی تھیں۔ اسلام نے گھونگٹ نکالنے کا حکم دیا۔ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ کا یہی مفہوم ہے۔

جلبات کی تحقیق

جلباب، جو جلابیب کا واحد ہے، بڑی چادر کو کہتے ہیں جو دوپٹے کے اوپر اوڑھی جاتی ہے۔ اِدْنَاء جو يُدْنِيْنَ کا مصدر ہے۔ اس کا اصل معنی قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے ہیں۔ مگر جب اس کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آئے تو اس میں ارخاء یعنی اوپر سے لٹکانے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ میں مِنْ کے استعمال نے جو تبعیض کے لیے ہے اس معنی کو اور واضح کر دیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور حضرت ابنِ عباسؓ نے اسے مزید واضح کرتے ہوئے فرمایا امر الله نساء المومنين اذا خرجن من بيوتهن فى حاجة ان يغطين وجوههن من فوق رؤسهن بالجلابيب ويبدين عينا واحدة (ابنِ کثیر) "اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے نکلیں تو اپنے سروں کے اوپر سے یہ چادر لٹکا کر چہروں کو چھپا لیں، اور صرف ایک آنکھ راستہ دیکھنے کے لیے کھلی رکھیں۔"

Marfat.com

اسی طرح ابنِ جریر اور ابن المنذر جو عہدِ رسالت کے قریب ترین زمانے کے اکابر مفسرین میں سے ہیں وہ روایت کرتے ہیں کہ محمد بن سیرینؒ نے حضرت عبیدۃ السلمانی سے اس آیت کا مطلب اور جلباب کی کیفیت دریافت کی۔ انہوں نے سر کے اوپر سے چادر چہرے پر لٹکا کر چہرہ چھپالیا اور صرف بائیں آنکھ کھلی رکھی۔ اور اس طرح اپنے عمل سے اِدناء جلباب کا مفہوم واضح کیا ہے۔

عہدِ صحابہ اور تابعین کے بعد جتنے بڑے بڑے مفسرین تاریخ اسلام میں گزرے ہیں انہوں نے بالاتفاق اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ ابنِ جریر طبری سے لے کر امامِ رازی تک اور بعد کے بھی بڑے بڑے مفسرین میں سے کسی نے اس مفہوم سے اختلاف نہیں کیا۔

تین عناصر

سورۃ الاحزاب اور سورۃ النور میں جب پردے کے احکام بیان کیے گئے اور اسلامی معاشرت کی حدود واضح کی گئیں، اس وقت مسلمان معاشرے میں تین طرح کے عناصر موجود تھے۔ اور یہ وہ عناصر ہیں جو آج بھی پوری دنیا میں موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت اس قانون کی پشت پر ایک نوزائیدہ ریاست تھی جو تمام تر مشکلات کے باوجود کسی ذہنی تحفظ کا شکار نہ تھی۔ اور وہ قرآنِ کریم کے ایک ایک لفظ پر اور نبی کریم ﷺ کی ایک ایک ہدایت پر تنفیذ وعمل کے اعتبار سے بالکل یکسو تھی۔ ان میں سے پہلا عنصر مخلص مسلمانوں کا تھا جو تعلیم و تربیت میں تو یقیناً یکساں نہیں تھے لیکن کسی کے اخلاص میں کمی نہ تھی۔ اور دوسرا عنصر غیر مسلموں کا تھا جو کسی نہ کسی صورت میں ابھی تک مسلمانوں کی آبادی میں موجود تھا۔ اور تیسرا عنصر منافقین کا تھا جن میں بعض بیرونی قوتوں کے لیے کام کر رہے تھے لیکن انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور ان کے دلوں میں اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت سے متعلق شدید بغض پایا جاتا تھا۔ اور کچھ وہ تھے جو ایمان ویقین اور ایثار و قربانی کے حوالے سے اسلام کے بارے میں شک وتردد میں مبتلا تھے۔ ایسی صورتحال میں یہ بہت ضروری تھا جس طرح اجتماعی عبادات اور مسلمانوں کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کی ایک شناخت پیدا کردی تھی۔ اسی طرح خواتینِ اسلام کی بھی ایسی علامات ہونی چاہیے تھیں کہ جب وہ گھروں سے نکلیں تو اپنے لباس اور اپنے طور اطوار سے دور ہی سے پہچانی جاتیں کہ یہ مسلمان شریف زادیاں ہیں جنہیں بے باک نگاہوں سے دیکھنا بھی اپنے لیے خطرے کو دعوت دینا ہے، چہ جائیکہ ان کے بارے میں کسی بری نیت کا اظہار کیا جائے۔ چنانچہ اس علامتِ امتیاز کو قائم کرنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا گیا کہ غیر مسلم اور بدچلن عورتیں تو یقیناً کھلے منہ، برہنہ سر اور بناؤ سنگھار کر کے نکلیں گی۔ لیکن مسلمان عورتوں کو ایک سادہ چادر میں اپنی ساری آرائش وزیبائش کو چھپا کر اور چہرے پر گھونگٹ ڈال کر نکلنا ہوگا تاکہ ہر دیکھنے والی نگاہ کو اندازہ ہوسکے کہ یہ عفت مآب مسلمان خواتین ہیں جو اپنی شرم وحیاء اور پاکدامنی میں دوسروں سے بالکل ممتاز ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی بہانے سے بھی انہیں میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اور دل میں کوئی گندہ خیال لانے کا تصور بھی نہیں کر سکے گا۔ جس طرح گھروں میں خیالات کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی نے مسلمان عورتوں کو دوسری عورتوں سے ممتاز کردیا، اسی طرح گھروں سے باہر ان کی لمبی چادروں اور لٹکے ہوئے گھونگٹوں نے ان کی پہچان واضح کردی۔ اور یہی وہ علامت اور شناخت ہے جس نے ہمیشہ مسلمان خواتین کو محفوظ رکھا اور بدکردار لوگ ہمیشہ ان کا احترام کرنے پر مجبور ہوئے۔ کل بھی یہی علامت تھی اور آج بھی یہی علامت ہے۔ اور اسی نے آج برقعے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ جدید دور میں مصروفیات بدل گئی ہیں تو جہاں لباس میں اور تبدیلیاں آئی ہیں اس میں اگر برقعے کو بھی قبول کرلیا گیا ہے تو یہ کوئی قابلِ

Marfat.com

اعتراض بات نہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی سادگی کو باقی رکھا جائے اور اسے عفت مآبی کی ضمانت بنادیا جائے۔رہے وہ لوگ جو اسے رجعت پسندی قرار دیتے ہیں اور بے حجاب اور بے نقاب ہونے کو ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، یہ درحقیقت سفلی جذبات کے مریض، نفسانیت کے اسیر اور غیروں کی تہذیب سے مرعوب لوگ ہیں، انہیں معذور سمجھنا چاہیے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي
الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٦٠﴾
مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿٦١﴾

(اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور جو مدینہ میں افواہیں پھیلانے والے ہیں باز نہ آئے تو ہم تمہیں ان پر اکسا دیں گے، پھر وہ اس شہر میں تمہارے ساتھ رہنے کا بہت ہی کم موقع پائیں گے۔ ۶۰) ان پر لعنت کی جائے گی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بے دریغ قتل کیے جائیں گے۔ ۶۱)

منافقین کو تنبیہ

خواتینِ اسلام کو پردے سے متعلق مناسب ہدایات دینے کے بعد منافقین کو دھمکی دی گئی ہے اور ان لوگوں کو بھی جن کے دلوں میں اسلام کے خلاف بغض وعناد پل رہا ہے وہ مسلمانوں کے سامنے آنے کی جرأت تو نہیں رکھتے، لیکن مسلمانوں کے اندر گھس کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتے ہیں۔اور ان لوگوں کو بھی دھمکی دی گئی ہے جو مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے سنسنی خیز افواہیں پھیلاتے رہتے تھے۔اور کبھی مختلف قسم کے اتہامات اِدھر اُدھر پھیلا کر بدگمانیوں کی فضاء پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ منافقین بھی اور یہ پانچویں کالم کے لوگ بھی اپنی حرکتوں سے باز آجائیں، تو ان کے لیے بہتر ہے۔ہم نے آج تک ان کے بارے میں اپنے پیغمبر کو عفو ودرگزر کی تلقین کی اور انہوں نے ہمیشہ کریم النفسی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی بہت سے حرکتوں سے چشم پوشی کی۔لیکن اب معاملہ بہت آگے بڑھ چکا ہے، اگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم اپنے پیغمبر کو ان کے خلاف بھڑکا دیں گے۔یعنی انہیں حکم دیں گے کے اب وہ عفو ودرگزر کی بجائے ان پر گرفت کریں اور ان کی حرکتوں پر مناسب سزادیں۔لیکن یہ چونکہ اپنی حرکتوں سے باز آنے والے نہیں، اس لیے جب داروگیر شروع ہوگی تو پھر مدینے کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہوجائے گی۔بہت تھوڑے دنوں یہ آپ کے ساتھ رہ سکیں گے۔اور جب تک رہیں گے اپنے کرتوتوں کے باعث لعنت وملامت کا شکار ہوں گے، ہر طرف سے پھٹکار ان پر پڑے گی۔اور پھر جہاں پکڑے جائیں گے بری طرح قتل کردیے جائیں گے۔

کیونکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے عفت وپاکدامنی کی حفاظت اسلام کی ترجیحات میں سے ہے۔وہ مسلمانوں میں وسائل کی کمی کو بڑا مسئلہ نہیں سمجھتا، لیکن بداخلاقی، آوارگی اور عفت وحرمت کی شکست وریخت کو بالکل برداشت نہیں کرتا۔جو لوگ اس قماش کے ہوتے ہیں انہیں وہ سنبھلنے اور اپنی اصلاح کا موقع دیتا ہے، لیکن اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تو پھر ایسے طاعون کے چوہوں کو وہ دیر تک برداشت نہیں کرتا۔

Marfat.com

سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ﴿۶۲﴾

(یہ اللہ کی سنت ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے ہو گزرے ہیں، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ ۶۲)

سنت اللہ

اشارہ شاید دو باتوں کی طرف ہے، ایک تو یہ کہ جو لوگ اسلامی ریاست میں اسلام کے نظامِ اخلاق کو نقصان پہنچاتے ہیں تو اسلامی ریاست کبھی انہیں کھل کھیلنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور انہیں بدترین سزائیں دیتی ہے۔ اور دوسرا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نبی کریم ﷺ کی دعوت و تبلیغ کو نقصان پہنچاتے ہیں اور آپؐ جس نظامِ زندگی کو نافذ کرنے کے لیے اور انسانی اصلاح کے لیے جس نسخۂ کیمیا کو آزمانے کی کوشش کر رہے ہیں یا اسے ناکام کرنے کی فکر میں ہیں۔ ایسے لوگ پہلے بھی گزرے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو کبھی بھی اپنے ارادوں کو بروئے کار لانے کی اجازت نہیں دی۔ اور آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں اس لیے آپ کی ناکامی تو پوری نوعِ انسانی کی ہلاکت کا باعث ہوگی۔ اس لیے ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کبھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ان کا یقیناً استیصال کیا جائے گا۔ یہ وہ سنت ہے جو ہر دور میں رائج رہی ہے اور آج بھی آپ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

یَسْئَلُکَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ
وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَکُوْنُ قَرِیْبًا ﴿۶۳﴾

(لوگ آپ سے قیامت کے وقت کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے، اور آپ کیا جانیں شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو۔ ۶۳)

وقت کے معلوم نہ ہونے سے قیامت کے حقیقت ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا

آنحضرت ﷺ کی دعوت کو بے اثر کرنے کے لیے بعض دفعہ کفار اور منافقین سوالات کی صورت میں بنیادی عقائد کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے انداز سے یہ بات سمجھ چکے تھے کہ اسلامی زندگی کی استواری کا بیشتر انحصار عقیدۂ آخرت پر ہے۔ اگر اس کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر دی جائیں تو اسلامی دعوت کے بے اثر ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ مسلمانوں میں جس تیزی سے بلند سیرت و کردار کی تعمیر ہو رہی ہے اس کی بنیاد آخرت کی جوابدہی پر ہے۔ اگر اسے استہزاء کا نشانہ بنا دیا جائے تو اس تعمیر میں بھی دراڑیں ڈالی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ بار بار آپ سے یہ بات پوچھتے کہ آپ جو ہمیں قیامت سے ڈراتے رہتے ہیں اور آخرت میں جوابدہی کا خوف دلا کر ہمیں اپنی زندگی کے طور اطوار بدلنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں، آخر وہ قیامت آج تک آ کیوں نہیں گئی۔ ہم نے آپ کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ آپ کی دعوت کو بے اثر کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ہم نے آپ کا راستہ روکنے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ اگر قیامت کو آنا ہوتا تو یقیناً آج تک آ چکی ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دھونس ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن اگر آپ کو اصرار

Marfat.com

ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل صحیح ہے تو پھر آپ ہمیں بتائیے کہ اس کے آنے کا وقت کیا ہے، وہ کس تاریخ کو آئے گی اور دن کیا ہوگا؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ جہاں تک اس کے آنے کے وقت کا تعلق ہے اس کا علم تو بس اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس کے سوا اس بھید کو کوئی نہیں جانتا۔ حدیث جبرائیل میں جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ قیامت کب آئے گی تو آپ نے فرمایا تھا کہ مسئول سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ یعنی اس کے آنے کا وقت نہ میں جانتا ہوں اور نہ آپ جانتے ہیں۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا آنا اس قدر یقینی ہے کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی یقینی بات نہیں ہوسکتی۔ اگر میں اس کا وقت نہیں بتا سکتا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دنیا میں کتنی چیزیں ہیں جن کے وقوع اور ظہور کا یقینی وقت انسان کے علم میں نہیں ہوتا، لیکن وہ اس کے وجود سے انکار نہیں کرتا۔ گھٹا اٹھتی ہے تو سب کو معلوم ہوتا ہے کہ بارش ہوگی، لیکن وہ کس وقت ہوگی، کہاں کہاں ہوگی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ حاملہ جانور کے بچہ جننے کے یقین کے باوجود یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بچہ کس وقت جنے گا۔ ہر شخص کو اپنی موت کا یقین ہے لیکن اسے موت کب آئے گی اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا۔ اس لیے اس سے زیادہ احمقانہ بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ آدمی ایک چیز کے وجود کو جانتا ہو لیکن صرف اس لیے اس کا انکار کردے کہ اس کے وقوع کے بارے میں وہ خبر نہ رکھتا ہو۔ اس طرح تو ہمیں زندگی کے بہت سے حقائق سے انکار کرنا پڑے گا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آفاق وانفس اور عقل وفطرت کے اندر قیامت کی شہادت موجود ہے۔ اور اخلاقیات میں اس کے بہت سے دلائل موجود ہیں۔ بایں ہمہ اس کا انکار اور اس کا استہزاء صرف اس لیے کہ اس کے وقت کا تعین ناممکن ہے، محض ابلہی اور خود فریبی ہے۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا اس فقرے میں آنحضرت ﷺ کے لیے تسلی بھی ہے اور اسلوبِ کلام سے قیامت کی عظمت، اہمیت اور اس کی ہولناکی کو ظاہر کرنا بھی مقصود ہے۔ یعنی یہ مشرکین ومنافقین جس قیامت کا مذاق اڑا رہے ہیں انہیں اندازہ ہی نہیں کہ یہ کتنی بڑی حقیقت کا منہ چڑا رہے ہیں۔ اور نہ انہیں اس بات کا خیال ہے کہ اس انکار کا نتیجہ قیامت کے دن کیا ہوگا۔ اور ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ اب اس کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں، کیونکہ آپؐ کے بعد کوئی نبی یا رسول قیامت سے ڈرانے کے لیے نہیں آئے گا۔ آپ کی بعثت دنیا کا آخری فیصلہ کن مرحلہ ہے جس کے بعد قیامت کو بہرحال آنا ہے۔ اسی لیے شاید آنحضرت ﷺ نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا تھا اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ ”یعنی میں اور قیامت ان دو کی طرح ہیں۔“ یہ ارشاد فرماتے ہوئے آپ نے انگشتِ شہادت اور ساتھ والی بڑی انگلی سے اشارہ فرمایا، یعنی جیسے ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں، ایسے ہی میرے اور قیامت کے درمیان کوئی اور بڑا مرحلہ نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بڑی انگلی کی طرح میں تھوڑا سا آگے نکل آیا ہوں اور اس کے بعد قیامت آرہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۙ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۚ﴿۶۵﴾

(بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کردی ہے اور ان کے لیے اس نے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۶۴) جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہ اس میں کوئی کارساز اور مددگار نہیں پائیں گے۔ ۶۵)

Marfat.com

کافروں کو تنبیہ

کفار اور منافقین کو مزید تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں پر لعنت فرمادی ہے۔ اور یہ اسی لعنت کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رحمت سے دور کردیا ہے اور وہ نصیحت کی ہر بات کو سننے اور سمجھنے سے محروم ہوگئے ہیں۔ کیونکہ لعنت رحمت سے دوری اور ہر اچھی بات سے محرومی کا نام ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں ان کو ہمیشہ رہنا ہے۔ انہیں غلط فہمی یہ رہی ہے کہ جن قوتوں کو ہم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے وہ قیامت کے دن ہماری کارسازی اور نصرت کریں گے جبکہ قیامت کے دن کوئی کسی کا نہ کارساز ہوگا اور نہ مددگار۔ وہاں ہر ایک اپنی مغفرت کی فکر میں پریشان ہوگا۔ اور بڑے سے بڑا اللہ تعالیٰ کا مقرب بھی نفسی نفسی کہہ رہا ہوگا۔ اور نہ کسی کا مال و دولت معاوضہ بن سکے گا اور وہاں نہ کسی کی جماعت و جمعیت ان کے کسی کام آسکے گی۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿٦٦﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿٦٧﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿٦٨﴾

(جس دن ان کے چہرے آگ میں الٹے پلٹے جائیں گے وہ کہیں گے اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ ٦٦) اور وہ کہیں گے اے ہمارے رب، ہم نے اطاعت کی اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی تو انہوں نے ہمیں راستے سے گمراہ کردیا۔ ٦٧) اور اے ہمارے رب، انہیں دونا عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت فرما۔ ٦٨)

کفار کا اظہارِ حسرت

ایسے لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کے بنیادی حقائق کو مذاق اور استہزاء بنا رکھا ہے جس کے نتیجے میں یہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مورد بنتے ہیں قیامت کے دن انہیں جس عذاب سے دوچار ہونا ہے اس کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان کے چہرے آگ پر الٹے پلٹے جائیں گے۔ یعنی جس طرح گوشت کو آگ پر بھونتے ہیں تو اسے کبھی ایک جانب سے بھونتے ہیں کبھی دوسری جانب سے۔ یہی گت ان کی بھی بننے والی ہے۔ یہ دوزخ میں چہروں کے بل پھینکے جائیں گے اور انہیں گھسیٹتے ہوئے کبھی ایک پہلو پر آگ میں ڈالا جائے گا اور کبھی دوسرے پہلو پر۔ جس سے عذاب کی شدت بھی نمایاں ہوگی اور جس میں تذلیل کا سامان بھی ہوگا۔ لیکن چہروں کے ذکر سے یہ مقصود نہیں کہ صرف ان کے چہرے داغے جائیں گے بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ چہرہ عذاب کی گرفت میں سب سے پہلے اس لیے آئے گا کہ جب کوئی شخص حق سے اعراض کرتا ہوا رعونت کا اظہار کرتا ہے تو اس کا اثر سب سے زیادہ چہرے ہی سے نمایاں ہوتا ہے۔ تو سزا چونکہ حق سے اعراض ہی کی ملے گی اس لیے جسم کا وہ حصہ سب سے پہلے ماخوذ ہوگا جس میں اعراض کی زیادہ علامات موجود ہوں گی۔ اور مزید یہ بات بھی کہ چہرہ انسانی اعضاء میں سب سے زیادہ شرف کا حامل ہے۔ اور بعض دفعہ اس سے پوری شخصیت مراد ہوتی ہے۔ تو جب چہرے سے قیامت کے دن یہ سلوک ہوگا تو باقی اعضاء ظاہر ہے کہ اس عذاب سے کیونکر بچ سکیں گے۔ گویا کہ ہر مجرم کی پوری شخصیت آگ میں اس طرح الٹی پلٹی جائے گی جیسے تکے کباب بھونے جاتے ہیں۔

Marfat.com

اس سخت ترین عذاب کا سامنا کرتے ہوئے وہ نہایت حسرت سے پکاریں گے کہ اے کاش ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ اور زندگی کو ان کے احکام کے مطابق گزارا ہوتا تو آج ہمیں اس ہولناک انجام سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔

اور مزید وہ اس بات کی دہائی دیں گے کہ پروردگار ہم اپنی گمراہی کے خود تنہا ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہماری گمراہی کا اصل سبب ہمارے وہ سردار ہیں جنہیں ہم نے اپنا رہنما بنایا تھا اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی ہر بات کو اپنے لیے واجب العمل سمجھا۔ اسی طرح ہمارے وہ بڑے لوگ ہیں جو ہماری برادریوں کے سردار اور ہمارے مذہبی پیشوا کہے جاتے تھے۔ ہم نے اپنی برادریوں کے سرداروں کو اپنا ہمدرد و غمگسار سمجھ کر ان کی ہر بات کو آویزۂ گوش بنایا اور اپنے مذہبی پیشواؤں کو آخرت میں اپنا شفیع سمجھتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور انہوں نے آخرت کی کامیابی کے لیے جو نصیحتیں کیں ہم نے انہیں پلے باندھ لیا۔ لیکن یہ آج پتہ چلا کہ انہوں نے ہمیں راستے سے بھٹکایا اور گمراہ کیا۔ الٰہی! تو ان ظالموں کو ہم سے دونا عذاب دے۔ کیونکہ وہ اپنی گمراہی کے ساتھ ساتھ ہماری گمراہی کے بھی ذمہ دار ہیں۔ اور ان پر بہت بڑی لعنت کا کوڑا برسا۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ہم لعنت کے سزاوار ٹھہرے۔ پروردگار نے ان کے جواب میں اس آیت کریمہ میں کچھ نہیں فرمایا۔ لیکن سورۃ الاعراف آیت ۳۸ میں ارشاد فرمایا ہے کہ تابع اور متبوع، خادم اور مخدوم، رہنما اور پیچھے چلنے والے سب کو دونا عذاب دیا جائے گا۔ کیونکہ حق و باطل میں امتیاز کے لیے ہم نے عقل دونوں کو عطا کی تھی۔ اور خیر و شر کا شعور دونوں کو دیا گیا تھا۔ اگر گمراہ کرنے والوں نے اپنی عقل کو غلط مقصد کے لیے استعمال کیا تو پیچھے چلنے والوں نے بھی اپنے عقل و شعور کو بالائے طاق رکھ کر ان کی پیروی کی۔ تو جو شخص بھی آنکھیں بند کر کے اپنی باگ ڈور دوسروں کے ہاتھ میں پکڑا دے گا اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو گمراہ کرنے والوں کا ہوگا۔

يٰۤاَيُّهَا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا

قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا

اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ

اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ

ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ

Marfat.com

وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾

رکوع: ۹۔ (اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو ایذا پہنچائی، تو اللہ نے انہیں ان باتوں سے بری کر دیا جو وہ لوگ کہتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک باوقار تھا۔ ۶۹) اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ ۷۰) اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ ۷۱) اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے۔ ۷۲) تاکہ اللہ منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کو سزا دے، اور مومنین و مومنات کو اپنی رحمت سے نوازے، اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۷۳)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾

(اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو ایذا پہنچائی، تو اللہ نے انہیں ان باتوں سے بری کر دیا جو وہ لوگ کہتے تھے اور وہ اللہ کے نزدیک باوقار تھا۔ ۶۹)

مسلمانوں کی تین قسمیں

مسلمان کہلانے والوں میں تین طرح کے لوگ شامل تھے۔ (۱) نہایت مخلص مسلمان، (۲) ضعیف الایمان لوگ (۳) منافقین۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے ہر طرح کے مسلمانوں کو خطاب کیا جاتا ہے۔ البتہ سیاق و سباق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں مسلمانوں کی کون سی قسم مراد ہے۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ ان تینوں قسم کے مسلمانوں کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال کیوں نہیں کیے گئے جس سے آسانی سے اندازہ ہو جاتا کہ یہاں فلاں قسم کے مسلمان مراد ہیں۔ لیکن جو شخص بھی تدبر کرے گا اسے یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ تربیت کے نقطۂ نگاہ سے کمزوریوں کی طرف اشارے کرنا تو مفید ہوتا ہے لیکن کمزوریوں کو نمایاں کرنا یا کمزوریوں کے حامل لوگوں کو متعارف کرانا ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ ایک ہی جیسے الفاظ سے سب کو خطاب سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مخلص مسلمان دوسروں کی کمزوریوں پر توجہ دینے لگتے ہیں۔ اور ضعیف الایمان لوگوں کو اپنی کمزوری کو دور کرنے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اور منافقین یہ جان کر محتاط ہو جاتے ہیں کہ ہم سے چشم پوشی کی جا رہی ہے لیکن معاملہ کسی وقت بھی دگرگوں ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

پیشِ نظر آیت کریمہ میں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو توجہ دلانا مقصود ہے کہ جن کے اندر نفاق کے جراثیم تو نہیں لیکن ابھی تک ایمان میں وہ پختگی نہیں آئی جس سے نفاق اور کفر مایوس ہوجاتا ہے۔ اور ابھی تک وہ منافقین کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں اور بعض دفعہ ان کا اثر بھی قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ ان سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں جس طرح اللہ تعالیٰ سے ایسی وابستگی ضروری ہے جو شرک کی ہر آلائش سے پاک ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے رسول سے ایسی محبت اور عقیدت لازم ہے جس پر بدگمانیوں کا سایہ نہ پڑ سکے۔ کیونکہ قافلۂ حق کے آگے بڑھنے کے لیے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول ان کے لیے اسوہ بھی ہو اور اس کی حیثیت قلب و دماغ کی ہر پرواز سے بلند بھی ہو، ورنہ اس کی مرجعیت اور محبت و عقیدت کو ہمیشہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ چنانچہ ہر دور کے منافقین اور دشمنانِ دین نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے معاملے میں ایمان لانے والوں کی یکسوئی کو پراگندہ کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہود نے ایسی ہی حرکتوں سے ہمیشہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پریشان کرنے کی کوشش کی۔ اور جو لوگ تعلیم و تربیت کے لیے آپ کے زیادہ قریب ہوتے تھے انہیں یکسو ہونے سے روکنے کے لیے عجیب و غریب بدگمانیوں اور اتہامات سے کام لیا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری بنی اسرائیل کی قسمت بدلنے کا باعث ہوئی ہے اور یہ بھی آپ کے احسانات کی برکت تھی کہ وہ ایک نئی قومی زندگی سے آشنا ہوئے۔ ورنہ ان کا انجام بھی مصر میں وہی ہوتا جو ہندوستان میں شودروں کا انجام ہوا۔ بایں ہمہ ان کے اندر ہمیشہ مفسدوں کا ایک گروہ موجود رہا جس نے ہمیشہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کے لیے مسائل پیدا کیے۔ مسلمانوں کو ان کی مثال دے کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ تمہیں بنی اسرائیل سے کہیں زیادہ ذمہ داریوں سے گراں بار کیا گیا ہے۔ تمہارے اندر ابھی تک منافقین کا ایک گروہ موجود ہے جو وقتاً فوقتاً کمزور مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لیے مختلف قسم کی باتیں اڑاتا رہتا ہے۔ تمہیں بہرصورت بنی اسرائیل کے طرزِ عمل سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور آنحضرت ﷺ کے معاملے میں اس طرزِ عمل کو کبھی قریب نہ آنے دینا چاہیے جس نے بنی اسرائیل کو اجتماعی طور پر نقصان پہنچایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہنچائی جانے والی بعض اذیتوں کا تذکرہ

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اذیتیں پہنچائی ہیں، قرآنِ کریم نے ایک سے زیادہ دفعہ ان کا ذکر فرمایا ہے۔ اور تورات نے بعض ایسے واقعات کا ذکر بھی کیا ہے جس سے بنی اسرائیل کے اس مجموعی طرزِ عمل کا اندازہ ہوتا ہے جو وہ مختلف وقتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختیار کرتے رہے۔

کسی بھی غلام قوم کو غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے جس قدر محنت کرنا پڑتی اور قربانیاں دینا پڑتی ہیں تاریخ کے مختلف ادوار اس پر شاہد ہیں۔ بالخصوص ایسی قوم جو آزادی کی خواہش اور اولوالعزمی کی امنگ سے محروم ہو چکی ہو اس میں ازسرِ نو آزادی کی خو بو پیدا کرنا صورِ اسرافیل پھونکنے سے کم نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ اقتدار پہ قابض ہوتے ہیں وہ کبھی کسی ایسے رہنما کو پنپنے نہیں دیتے جس کے اندر انہیں ایک آزادی پسند رہنما کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب انہیں قومی شعور سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی اور دشمن نے اسے سونگھتے ہوئے ان راستوں پر پہرہ بٹھایا جو راستے عرفانِ ذات اور حفظِ خودی کی طرف لے جاتے ہیں تو بنی اسرائیل نے بجائے کسی جذبے کے اظہار کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوسنا شروع کر دیا کہ اس شخص کی بدولت ہم اس کی پیدائش سے پہلے بھی مصیبتوں میں مبتلا رہے اور اس کی پیدائش

Marfat.com

کے بعد بھی ہدفِ مصائب بنے ہوئے ہیں۔اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کو ملکِ مصر سے لے کر نکلے اور مصریوں نے ان کا تعاقب کیا تو قوم نے بڑبڑانا شروع کردیا کہ دیکھو اس شخص نے کہاں لا کر ہمیں مروانے کا سامان کیا ہے۔حتیٰ کہ بحرِ قلزم کے کنارے پہنچ کر جب سامنے سمندر کی اٹھتی ہوئی موجیں دکھائی دیں اور خبر ملی کہ فرعون کی فوجیں چڑھی چلی آرہی ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور قومی توانائی کا ثبوت دیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ اسلام کا ساتھ دیتے، انہوں نے چیخنا شروع کردیا کہ ہم تو پکڑ لیے گئے۔اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الزام دیا کہ تم ہمیں چوہوں کی طرح مروانے کے لیے یہاں لے آئے ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام صحرائے سینا میں کوہِ طور پر تورات لینے کے لیے گئے، تو ان کے سرداروں نے کہنا شروع کردیا کہ یہ شخص ہمیں چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے، وہ اب آنے والا نہیں۔چنانچہ انہوں نے سامری سے ایک بچھڑا بنوایا اور اس کی پرستش شروع کردی۔

قارون نے باقاعدہ آپ کے خلاف محاذ قائم کرلیا۔ایک پیشہ ور فاحشہ کو آپ پر الزام لگانے کے لیے خریدا اور اجتماعِ عام میں لے آیا۔اور ایک ہنگامہ کھڑا کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اسے سزا دی اور زندہ حالت میں زمین میں دھنسا دیا۔

مختصر یہ کہ بنی اسرائیل نے ہر ایسے موقع پر جہاں ان سے کسی قربانی کا مطالبہ کیا گیا ہمیشہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مطعون کیا۔چاہے وہ غذائی قلت کا معاملہ ہو یا پانی کی کمیابی کا، کسی شہر پر حملہ کرنے کا حکم ہو یا راہِ حق میں سرفروشی کا، انہوں نے ہر موقع پر نہایت کمزوری دکھائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی کمزوریوں کا ذمہ دار ٹھہرایا۔چنانچہ مسلمانوں کو اس قوم کی تاریخ سے سبق سیکھنے کا حکم دیا جارہا ہے کیونکہ اس وقت بنی اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھے جو صدیوں تک حاملِ دعوت امت کی حیثیت سے نشیب وفراز کے مختلف مراحل سے گزرتی رہی ہے۔لیکن انہوں نے چونکہ اپنی کمزوریوں پر قابو نہ پایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول پر وہ اعتماد پیدا نہ کرسکے جو کسی بھی حاملِ دعوت امت کو اپنا فرض انجام دینے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

بلاشبہ قربانی وایثار اور آنحضرت ﷺ سے محبت وعقیدت کے حوالے سے مسلمانوں کی تاریخ نہایت قابلِ فخر ہے لیکن ان کو جس عظیم ذمہ داری سے گراں بار کیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر کوئی معمولی کوتاہی بھی امت کو ایک بڑے صدمے سے دوچار کرسکتی تھی۔اس لیے جب بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یاد فرمایا، اور ان کے حوالے سے امت کو متنبہ کیا کہ یہ کمزوریاں ہمیشہ قوموں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔چنانچہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ مسلمانوں میں کچھ مال تقسیم فرمارہے تھے۔اس مجلس سے جب لوگ باہر نکلے تو ایک شخص نے کہا محمد (ﷺ) نے اس تقسیم میں خدا اور آخرت کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا۔یہ بات حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ نے سن لی، اور جاکر آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ آج اس طرح کی باتیں کہی گئی ہیں۔آپؐ نے جواب میں فرمایا رحمة الله علی موسیٰ فانه اوذی باکثر من هذا فصبر "اللہ کی رحمت ہو موسیٰ پر انہیں اس سے زیادہ اذیتیں دی گئیں، انہوں نے صبر کیا۔" (مسند، احمد، ترمذی، ابوداؤد)

فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا "پس اللہ نے موسیٰ کو ان باتوں سے بری کردیا جو لوگ ان کے بارے میں کہتے تھے، وہ اللہ کے نزدیک بڑا باوقار تھا۔" یعنی تبلیغ ودعوت اور تعلیم وتربیت کے دوران منافقین اور دشمنانِ دین مسلمانوں کی ذہنی یکسوئی کو ختم کرنے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی مرکزیت کو نقصان پہنچانے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔اور ایسی ہی کوششیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی ہوتی رہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو ہمیشہ بے گناہ ثابت کرتا ہے اور ہر

Marfat.com

تہمت کے مقابلے میں ان کی سچائی، نیک نیتی اور راست بازی کو آشکار کر دیتا ہے۔ اور دشمن ہمیشہ ان کے مقابلے میں ذلیل اور رسوا ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی طرح ہر الزام سے پاک ثابت کیا۔ اور یاوہ گوئی کرنے والی زبانیں آخر کار بند ہوگئیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جس طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک باوقار اور عزت دار تھے، اسی طرح اپنی قوم میں سرخرو ٹھہرے اور تاریخ انہیں نہایت احترام سے یاد کرتی ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے بارے میں بھی اگر کچھ بدباطن ایسی ویسی باتیں اڑا کر منزل کھوٹی کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو آخر وہ بھی ناکام ہوں گے اور اللہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور آپؐ کے پیغامِ حق کو باوقار ٹھہرائے گا اور سرفراز فرمائے گا۔ چنانچہ اب صدیوں سے تاریخ اس حقیقت کی گواہی دے رہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ ۷۰) اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ ۷۱)

قومِ موسیٰ کے طرزِ عمل سے بچنے کے لیے دو ہدایات

یہود کی یہ روش کہ وہ اپنے جلیل القدر پیغمبر کو کبھی اپنی باتوں سے ایذا پہنچاتے اور کبھی آپ کے احکام کی نافرمانی سے آپ کو دکھ دیتے۔ مسلمانوں کو اس طرزِ عمل سے بچنے کا حکم دیا گیا۔ اور پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں وہ طریقہ بھی بتا دیا گیا جس پر عمل کرنے سے اس مکروہ اور تباہ کن طرزِ عمل سے بچا جا سکتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے دل پر احتساب کا پہرہ بٹھائیں۔ آپ کے دل میں ایمان کا نور کبھی مدھم نہ ہونے پائے۔ نیکی کی طرف میلان اور برائی سے نفرت روز بروز بڑھتی جائے۔ ہر کام کرنے سے پہلے نفع وضرر کے حوالے سے کم، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے حوالے سے زیادہ غور وفکر کریں۔ اور دوسرا کام یہ کریں کہ اپنی زبان کو غلط استعمال سے بچائیں۔ جب بھی کسی بات کے کہنے کا موقع آئے تو اس پر صحیح، مناسب اور سچی بات کہیں۔ کوئی لالچ اور کوئی دباؤ آپ کی زبان میں ٹیڑھ پیدا نہ کر سکے۔ معاملہ اپنے سے ہو یا بیگانے سے، حوالہ محبت کا ہو یا نفرت کا، زبان کی پاکیزگی پر خراش نہ آنے پائے۔ ان دو باتوں پر التزام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری زندگی کے اعمال کو درست کر دے گا۔ تمہارا کوئی عمل شریعت کے خلاف اور حکمت سے متصادم نہیں ہوگا۔ اور اگر کبھی کسی کمزوری کے باعث کوئی کمی بیشی ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔ کیونکہ سہو ونسیان پر وہ کبھی نہیں پکڑتا۔ اور انسانی کمزوری کے تحت کیے ہوئے عمل پر بھی عموماً گرفت نہیں کرتا۔ مزید براں اس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ بھی نکلے گا کہ تمہاری تقویٰ کی روش اور زبان کا صدق اللہ اور رسول کی اطاعت میں ڈھل جائے گا۔ اب تمہاری زندگی کا طرزِ عمل سمعنا وعصینا نہیں بلکہ سمعنا و اطعنا بن کر رہ جائے گا۔ اور یہ وہ طرزِ عمل ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فوز وفلاح کی ضمانت دی ہے جس کے نتیجے میں دنیا میں بھی کامیابی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی سرخروئی ملتی ہے۔

Marfat.com

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ﴿۷۲﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾

(اورہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہوجانے والا ہے۔ ۷۲) تاکہ اللہ منافقین ومنافقات اور مشرکین ومشرکات کو سزا دے، اور مومنین ومومنات کو اپنی رحمت سے نوازے، اور اللہ غفوررحیم ہے۔ ۷۳)

اس آیتِ کریمہ کے مفاہیم کو صاحبِ تدبرِ قرآن نے نہایت خوبصورتی سے بیان کیا اور سلجھایا ہے۔ اور شکریے کے ساتھ ان کی تحریر یہاں نقل کرتے ہیں:

انسان کا اصل شرف

اب یہ انسان کا اصل شرف واضح فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہدِ اطاعت کا امین ہے۔ یہ عہد، اختیار وارادہ کی آزادی پر مبنی ہے اس وجہ سے وہی اس کا سزاوار ٹھہرا۔ اس لیے کہ عہد کا اہل وہی ہوتا ہے جس کو اختیار وارادہ کی آزادی حاصل ہو۔ جو مخلوقات مجبور ومقہور ہیں ان سے کسی عہد ومیثاق کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے تمام ذُرّیتِ آدم سے لیا ہے اور یہی عہد اس خلافت کی بنیاد ہے جو اس زمین میں آدم اور ذُرّیتِ آدم کو حاصل ہوئی اور اسی خلافت کے مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے اپنی ہدایت اور کتاب و شریعت نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرمائی کہ جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ جنت کے وارث ٹھہریں گے اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے وہ سب جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی وعدے کو پورا کرنے کے لیے اپنے نبی ورسول بھیجے جنہوں نے اپنی اپنی امتوں سے اس عہدِ اطاعت و بندگی کی تجدید کرائی اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔

اس عہد کی بنیاد چونکہ انسان کے ارادہ کی آزادی پر ہے اس وجہ سے اس کی حیثیت شمشیر دودم کی ہے۔ اگر انسان اپنے ارادہ کی آزادی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی کے عہد کو پورا کرے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے کوئی اونچا نہیں، اور اگر وہ اس عہد کو پورا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خدا کی بخشی ہوئی سب سے بڑی عزت کو اپنے لیے سب سے بڑی ذلت بنا لیا۔

Marfat.com

ہر عہد ایک امانت ہے اور ہر امانت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کی بابت امانت رکھنے والا ایک دن پرسش کرے کہ اس کی امانت کا حق ادا کیا گیا ہے یا اس میں خیانت کی گئی ہے۔ یہ چیز ایک روز جزاء وسزا کو مستلزم ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو اکٹھا کرے گا اور ان کے اعمال کے ریکارڈ ان کے سامنے رکھ کر فیصلہ فرمائے گا کہ کون کافر ومنافق ہیں جو دوزخ کے سزاوار ہیں اور کون مومن ومخلص ہیں جو جنت کے حقدار ہیں۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت بالاختیار کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے بھی پیش کی تھی لیکن وہ اس عظیم ذمہ داری کے اٹھانے سے ڈرے اور اپنی معذرت پیش کردی کہ ان کو اس بارِگراں سے معاف رکھا جائے۔ آسمانوں وزمین اور پہاڑوں کی یہ معذرت زبانِ حال سے بھی ہوسکتی ہے اور زبانِ قال سے بھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی زبانِ حال وقال دونوں سمجھتا ہے۔ قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے لیکن ان کی تسبیح کو صرف اللہ تعالیٰ ہی سمجھتا ہے، دوسرے اس کو نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ہر ذمہ داری کے تحمل کے لیے ایک خاص صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اگر وہ صلاحیت موجود نہ ہو تو اس کا تحمل ممکن نہیں ہے۔ آپ ہر زمین میں ہر چیز کی کاشت نہیں کرسکتے۔ زمین کا ایک معمولی ٹکڑا آپ کے ایک تخم کا امین بن جاتا ہے اور وہ آپ کی امانت کو نہ صرف محفوظ رکھتا ہے بلکہ اس کو نشوونما اور فروغ دیتا ہے۔ لیکن وہی تخم اگر آپ ایک وسیع سمندر، ایک عظیم پہاڑ یا ایک لق ودق صحرا میں ڈال دیں تو وہ اس کو نشوونما نہیں دے سکتے بلکہ وہ تخم ضائع جائے گا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی چیز کے اندر ایک چیز کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ اس سے لازماً اِباء کرے گی۔ مثلاً ہماری آنکھ ایک خاص درجے کی روشنی کا تحمل کرسکتی ہے، اگر روشنی کی مقدار اس سے بڑھ جائے تو نگاہ خیرہ ہوجائے گی۔ اسی طرح ہمارا جسم ایک خاص درجے کی حرارت یا برودت برداشت کرسکتا ہے، اگر حرارت یا برودت اس سے زیادہ ہوجائے تو ہمارا جسم اس کو قبول کرنے سے اِباء بھی کرے گا اور اس سے ڈرے گا بھی۔ ہمارے معدے میں خاص طرح کی چیزوں کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے، اگر ہم ان کے سوا کوئی دوسری چیز اس میں ڈالنے کی کوشش کریں تو، خواہ بجائے خود وہ کتنی ہی قیمتی چیز ہو، معدہ اس کا متحمل نہیں ہوسکے گا۔ یہی حال آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کا، اس امانت کے معاملے میں ہوا۔ ان کے اندر اس کے اٹھانے کا ظرف نہیں تھا اس وجہ سے انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔

وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۔ یہ انسان کا شرف بیان ہوا ہے کہ جس بارِ امانت کو آسمان وزمین، دریا اور پہاڑ نہ اٹھا سکے اس کو انسان نے اٹھالیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اگرچہ اپنے وجود مادی کے اعتبار سے اس کائنات کی ایک نہایت حقیر ہستی ہے لیکن اپنی معنوی صلاحیتوں کے اعتبار سے آسمانوں سے اونچا، زمین سے وسیع اور پہاڑوں سے زیادہ مضبوط وسربلند ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی لیکن وہ کسی کے لیے بھی مسخر نہیں کیا گیا بلکہ رب کائنات کے سوا کسی کے آگے اس کا جھکنا اس کے لیے باعث ننگ قرار پایا۔

Marfat.com

اِنَّـــهٗ كَـانَ ظَـلُـوْمًا جَهُوْلًا۔ یہ انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جس کی بنا پر وہ اس امانت کا اہل قرار پایا۔ وہ یہ ہے کہ یہ امانت مقتضی تھی کہ انسان کے اندر متضاد داعیے موجود ہوں تا کہ اس کی آزمائش ہو سکے کہ وہ اس متضاد داعیوں کی کشاکش کے اندر اپنے رب کی اطاعت بالاختیار کے عہد کو کس طرح نباہتا اور اس کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ظلوم وجہول بنایا گیا۔ ظلم، عدل وحق کا ضد ہے اور جہل، علم اور حلم کا ضد ہے۔ ظلوم، اس کو کہیں گے جو عدل وحق کا شعور رکھتے ہوئے ظلم کا مرتکب ہونے والا ہو۔ اسی طرح جہول، اس کو کہیں گے جو علم وحلم کی صلاحیت کے باوصف جہل اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہو۔ یہی کشاکش انسان کی آزمائش ہے اور یہی اس کے تمام شرف کی بنیاد ہے۔ اگر وہ ظلم کی راہ اختیار کرنے کی آزادی رکھنے کے باوجود محض اپنے رب کی رضا کی خاطر عدل کی راہ پر استوار رہتا ہے اور اپنے سفلی جذبات کے اتباع کی آزادی کے باوجود، محض اپنے رب کے خوف سے، اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے تو لاریب اس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی اونچا ہوا۔ اس لیے کہ ان کو خدا کی بندگی کی راہ میں کسی کشمکش سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ ان کا راستہ بالکل ہموار اور ان کا مزاج ظلم وجہل کے دواعی سے بالکل ناآشنا ہے لیکن انسان اگر بندگی کرتا ہے تو ہر قدم پر وہ اپنے نفس واشیطان سے لڑ کر کرتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی بندگی فرشتوں کی بندگی سے اونچی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انسان اپنے اس اختیار کے سبب سے جس طرح سب سے زیادہ اونچا ہے اسی طرح وہ سب سے زیادہ نیچا بھی ہو جائے گا اگر وہ اپنے اس اختیار کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکے۔ یہی حقیقت سورۂ تین میں اس طرح واضح فرمائی گئی ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۠ ثُمَّ رَدَدْنٰـهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴-۶)

(اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اس کو اسفل سافلین میں گرا دیا، البتہ وہ لوگ اس سے محفوظ رہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے)۔

حاملِ امانت ہونے کا لازمی نتیجہ

لِیُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِیْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَیَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۔ یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس امانت کا کہ اس کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں انسان اس امانت سے متعلق مسئول ہو کہ اس نے اس کا حق ادا کیا یا نہیں۔ تا کہ وہ لوگ جنہوں نے اس کے معاملے میں منافقت کی روش اختیار کی ہو یا شرک کے مرتکب ہوئے ہوں وہ اپنی اس خیانت و بدعہدی کی سزا بھگتیں، خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور وہ لوگ جنہوں نے رسوخِ ایمان کے ساتھ اس کا حق ادا کیا ہو وہ اپنے رب کی رحمت کے سزاوار ٹھہریں، عام اس سے کہ وہ مردوں میں سے ہوں یا عورتوں میں سے۔

Marfat.com

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ "توبہ" کا صلہ جب "علیٰ" کے ساتھ آتا ہے تو "رحم" کے مفہوم پر بھی متضمن ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ اہلِ ایمان کے لیئے بشارت ہے کہ ہر چند یہ ذمہ داری ہے تو بہت بھاری لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اس نے اپنے باایمان بندوں اور بندیوں کے لیے توبہ کی راہ بھی کھلی رکھی ہے۔ اگر وہ اپنی کسی کمزوری کے سبب سے کسی ظلم یا جہل کے مرتکب ہوں گے اور پھر توبہ کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر کے ان پر رحم فرمائے گا۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ سَبَاٍ

(۳۴)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ سَبَاٍ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نام:۔ اس سورة کا نام سبا ہے۔ یہ سورة کی پندرہویں آیت لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول:۔ اس کے زمانۂ نزول کا تعین مشکل ہے۔ کیونکہ کسی معتبر روایت سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اس کے مضامین پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورة مکہ معظمہ کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جبکہ ابھی قریش کی طرف سے اذیت رسانی کا عمل تیز نہیں ہوا تھا۔

سورة کے مطالب کا تجزیہ

اس سورة کا مرکزی مضمون اثبات توحید و قیامت ہے۔ اس کے مخاطب زیادہ تر مترفینِ قریش ہیں۔ اس لیے زیادہ زور شکر اور اس کے مقتضیات پر دیا گیا ہے۔

ابتدائی ۹ آیات میں اللہ تعالیٰ کے سزاوارِ شکر ہونے کی دعوت ہے۔ اور دلیل کے طور پر آسمان و زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکیت اور آخرت میں اس کے تمام اختیار و اقتدار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ چونکہ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس وجہ سے کسی شخص کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ سے مخفی نہ رہے گا۔ آخرت ایک حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا لازمی تقاضا ہے۔ جو لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں وہ سب گمراہی میں مبتلا ہیں۔ آخرت سے انکار صرف بے علم، بے فکرے اور لاابالی لوگ ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کا اصل مرض یہ ہے کہ وہ نہایت غیر سنجیدگی سے ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے اندر عبرت پذیری اور انابت کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ اگر وہ کھلی آنکھوں سے اس کائنات کو دیکھتے تو انہیں اندازہ ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے انہیں اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔ دعوت کے ضمن میں کفار کے اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ کہیں اعتراض کو نقل کیا گیا ہے، اور کہیں نقل کیے بغیر جواب دیا گیا ہے۔ لیکن تقریر سے خود یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کس اعتراض کا جواب ہے۔ جوابات اکثر و بیشتر تفہیم و تذکیر اور استدلال کے انداز میں ہیں۔ لیکن کہیں کہیں کفار کو تنبیہ بھی کی گئی ہے اور ان کے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔

آیت ۱۰ سے ۱۴ تک مترفینِ قریش کی تنبیہ کے لیے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی مثال پیش کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو بڑی طاقتیں بخشیں اور شوکت و حشمت عطا کی۔ لیکن وہ یہ سب کچھ پا کر بھی کبر و غرور میں مبتلا نہ ہوئے بلکہ اپنے رب کے شکر گزار اور فرماں بردار رہے۔ انہوں نے حکومت و دولت کے نشے میں مبتلا ہو کر شیاطین کی پیروی نہیں کی، بلکہ شیاطین سے بھی اپنی پیروی کرائی۔ جو اپنے رب کی فرماں برداری کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ شیاطین کو بھی ان کی غلامی میں دے دیتا ہے۔ اور جو اپنے رب کی ناشکری کرتے ہیں، شیاطین ان پر مسلط ہو جاتے ہیں اور ان کو شیاطین کی غلامی کرنا پڑتی ہے۔

Marfat.com

آیت ۱۵ سے ۲۱ تک ملکِ سبا کی مثال دی گئی ہے۔ اہلِ سبا کو بھی اللہ تعالیٰ نے بیشمار نعمتیں عطا فرمائیں، لیکن وہ شکرگزار بننے کی بجائے طغیان وفساد میں مبتلا ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ناشکری کی پاداش میں پکڑ لیا۔ کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ وہ ناشکرگزاروں کو عبرت انگیز سزا دیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی گرفت ہی کے نتیجے میں وہ قوم پارہ پارہ ہوگئی اور دنیا میں صرف اس کے افسانے باقی رہ گئے۔

آیت ۲۲ سے ۲۷ تک شرک اور شفاعتِ باطل کے عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اگر یہ مشرکین محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیجیے۔ آپ کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کا دین پہنچانا ہے، وہ آپ نے ادا کر دیا ہے۔ اب ان کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہوگا، وہ ہر چیز سے باخبر ہے اور ہر معاملے میں دوٹوک فیصلہ کرنے والا ہے۔

آیت ۲۸ سے ۳۳ تک مخالفین کی یہ جسارت کہ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمیں وہ عذاب نہ دکھایا جائے جس کی ہم کو دھمکی دی جارہی ہے، اس کا جواب دیا گیا ہے۔

آیت ۳۴ سے ۳۹ تک مخالفین کے کفر کا اصل سبب واشگاف کیا گیا ہے کہ ان کے اعتراضات دفع الوقتی سے زیادہ نہیں۔ اصل سبب مال وجاہ سے محبت ہے جو انہیں حاصل ہے۔ وہ اس مال وجاہ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں تقرب کی ضمانت سمجھتے ہیں اور اسی کو آخرت میں کامیابی کی دلیل گردانتے ہیں۔ حالانکہ پروردگار جسے دنیا کی نعمتیں عطا فرماتا ہے اس کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ بنتا ہے یا ناشکرا۔ رہی آخرت تو وہاں ہر شخص کا معاملہ اس کے اعمال کے مطابق ہوگا۔

آیت ۴۰ سے ۴۳ تک کفار پر حقیقتِ حال واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے نام نہاد معبودوں کی حمایت میں مرنے مارنے کے لیے تیار رہتے ہو، حالانکہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ ان سے سوال کرے گا تو وہ فوراً اپنے نام لیواؤں سے اظہارِ براءت کردیں گے۔ اور اس میں بطورِ خاص ملائکہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ قریش ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے اور اپنا شفیع گردانتے تھے۔

آیت ۴۴ سے ۵۴ تک خاتمہ سورۃ کی آیات ہیں۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس نے کتاب نازل فرما کر ان انسانوں پر کیا ہے جو اس سے پہلے قرآن وکتاب سے بالکل ناآشنا تھے۔ اور پھر نصیحت کے انداز میں انہیں اپنے معاملے پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ تنبیہ بھی کی ہے کہ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر تم ہمیشہ کے لیے پچھتاؤ گے۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ٦	سُوْرَةُ سَبَاٍ مَّكِّيَّةٌ (٣٤)	اٰيَاتُهَا ٥٤

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ
الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿١﴾ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی
الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ
فِیْهَا ؕ وَهُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ ﴿٢﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَیْبِ ۚ
لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَ
لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿٣﴾ ۙ لِّیَجْزِیَ
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ
كَرِیْمٌ ﴿٤﴾ وَالَّذِیْنَ سَعَوْ فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ
مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ﴿٥﴾ وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ
اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَیَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ﴿٦﴾
وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُكُمْ اِذَا

Marfat.com

مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ ⑦ اَفْتَرٰى عَلَى
اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي
الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ⑧ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ
الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ⑨ ع

رکوع: ا۔ (حمد صرف اس اللہ کے لیے ہے جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے، وہ دانا اور باخبر ہے۔ ۱) وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین میں داخل ہوتی ہے، اور ہر اس چیز کو جو اس سے نکلتی ہے، اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے، اور وہ رحم فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔

۲) اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی، کہہ دیجیے، ہاں قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر ضرور آکے رہے گی، اس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، نہ اس ذرے سے کوئی چھوٹی چیز اور نہ کوئی بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔ ۳) تاکہ وہ ان لوگوں کو صلہ دے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے، وہی لوگ ہیں جن کے لیے مغفرت ہے اور رزقِ کریم۔ ۴) اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کی کوشش کی یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب کا خاص حصہ ہوگا۔

۵) اور جانتے ہیں وہ لوگ جن کو علم دیا گیا، وہ چیز جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کی طرف اتاری گئی ہے وہ حق ہے، اور خدائے عزیز وحمید کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ۶) اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی دکھائیں جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ جب تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کیے جاؤ گے۔ ۷) کیا اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے یا اسے کسی قسم کا جنون لاحق ہے۔ بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، عذاب میں اور دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۸) کیا انہوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا، اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں، بے شک اس میں ایک بہت بڑی نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ ۹)

Marfat.com

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۱﴾

(حمد صرف اس اللہ کے لیے ہے جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے، وہ دانا اور باخبر ہے۔ ۱)

حمد کا مفہوم

حمد کا لفظ عربی زبان میں تعریف اور شکر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور مآل کار حمد کے مفہوم میں دونوں معنی جمع ہو جاتے ہیں۔ قدرت نے انسانی فطرت کے جو مقتضیات مقرر فرمائے ہیں ان میں یہ بات شامل ہے کہ انسان جب کسی کی عنایات سے متمتع ہوتا ہے اور ہر طرح کے حالات میں جس کے احسانات سے فیض یاب ہوتا ہے تو اسی کی تعریف اس کے لبوں سے ادا ہوتی ہے اور دل میں اسی کے شکر کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور یہ دونوں جذبے جب جمع ہو جاتے ہیں تو اسے حمد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایسا لزوم ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے جب ہم انسان کے معاملات پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ زمین کی سطح پر اور آسمان کی چھت کے نیچے رہتے ہوئے انسان بے شمار نعمتوں سے متمتع ہوتا ہے، تو اگر وہ بالکل بلید واقع نہیں ہوا تو اس کی فطرت یہ سوال ضرور اٹھاتی ہے کہ ان نعمتوں کو پیدا کرنے والا اور عطا کرنے والا کون ہے۔ سورج کی روشنی، چاند کی حلاوت، ابر سے برسنے والی بارش، جسم کو راحت دینے والی ہوا، نگاہوں سے آنکھ مچولی کھیلنے والے ستارے اور غذا بہم پہنچانے والی لہلہاتی فصلیں، پیاس کو بجھانے اور آبیاری کی ضرورت پوری کرنے والے پانی کے ذخیرے آخر یہ کس کی ملکیت ہیں، کس نے انہیں پیدا کیا ہے اور کس کی اجازت سے ہمیں فیض پہنچا رہے ہیں؟ کسی کافر سے بھی پوچھا جائے تو وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کے جسم و جان کا خالق، انسانی صلاحیت کا عطا کرنے والا اور انسانی ضروریات کو پورا کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں۔ اسی نے تمام نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ کسی کو وہ بلاواسطہ عطا فرما رہا ہے اور کہیں بالواسطہ۔ لیکن منعمِ حقیقی اور محسنِ حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فصلیں زمین سے اگتی ہیں، بارش بادلوں سے اترتی ہے، بخارات سمندر سے اٹھتے ہیں، آگ سے چولہے جلتے ہیں، سورج سے کرنیں برستی ہیں۔ ایسے ہی اور بے شمار واسطے ہیں جن سے انسان کو نوازا جا رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان واسطوں کا پیدا کرنے والا کون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے وجود سے لے کر اپنی بقا تک اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے حصار میں ہے۔ اس کی ربوبیت اگر اپنا رخ بدل لے تو یہ ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ جو شخص بھی دیانت داری سے اس پوری صورتحال پر غور کرے گا اس کے سامنے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو محسنِ حقیقی سمجھے اور بے ساختہ اس کے لبوں پر اس کی تعریف، مدح و ثنا کے ترانے گونجنے لگیں اور اس کا دل اس کے لیے جذبۂ شکر سے معمور ہو جائے جس نے اسے یہ سب کچھ عطا کیا ہے۔ اور پھر اس کی رحمتوں اور برکتوں اور فیض رسانیوں کا اختتام موت کی دیواروں پر نہیں ہو جاتا، نہ دنیا کے خاتمے پر ہوگا، بلکہ آخرت میں بھی انسان کو جو کچھ ملنے والا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کی دین ہے۔ اس لیے آخرت میں بھی تعریف اور شکر کا سزاوار اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔

Marfat.com

حکیم وخبیر سے مراد کیا ہے؟

آخر میں حکیم اور خبیر دو صفات کا ذکر فرما کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ وہ حکیم ہے کہ اس کا ہر کام کمال درجہ حکمت و دانائی پر مبنی ہے۔اس کی حکمت کا یہ ادنیٰ تقاضا ہے کہ وہ کوئی کام عبث نہیں کرتا۔اس کے ہر کام کے آگے اور پیچھے کوئی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسانوں کو اپنے بے شمار اور بے پناہ احسانات سے گراں بار کیا ہو لیکن اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ رکھا ہو۔اور اس سے بھی زیادہ ناقابلِ قبول بات یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو اس بات کی اجازت دی ہو کہ وہ شتر بے مہار بن کر زندگی گزاریں اور خودرو پودوں کی طرح بے مقصد زندگی گزار کر ختم ہو جائیں۔اس کی حکمت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے مقصد کے حوالے سے ایک ایسا دن لائے جس میں وہ انسان سے باز پرس کرے کہ تم نے مقصد کے مطابق زندگی گزاری یا مقصد کے خلاف، پھر اپنے وفادار بندوں کو انعامات سے نوازے اور نافرمانوں کو سزا دے۔فرمانبرداروں، وفا شعاروں اور قربانیاں دینے والوں کو صلہ دینا اور ایسے انعامات سے نوازنا اور ایسی ابدی زندگی سے ہمکنار کرنا جس کا کبھی انسان تصور بھی نہ کر سکے، یہ بجائے خود ایسا احسان ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ کی حمد لازم ہے۔اس لیے فرمایا کہ وہ خبیر بھی ہے۔یعنی کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ وہ اگر جزا و سزا کا دن لائے گا تو اسے کیا خبر کہ انسانوں نے کیسی زندگی گزاری اور مرنے کے بعد انسانی جسم کہاں ہے۔تمام انسانوں کو زندہ کر کے محشر میں جمع کرنا اور ان کے تمام اعمال کے بارے میں پرسش کرنا، یہ اس دن کا لازمی تقاضا ہے اور یہ وہی کر سکتا ہے جو کامل آگاہی سے متصف ہو اور جو ایک ایک ذرہ اور ایک ایک حرکت سے باخبر ہو۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِى الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ۝ (۲)

(وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین میں داخل ہوتی ہے، اور ہر اس چیز کو جو اس سے نکلتی ہے، اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے، اور وہ رحم فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔ ۲)

صفتِ خبیر کی وضاحت

گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت خبیر بیان فرمائی ہے۔پیشِ نظر آیت میں اسی کی مزید وضاحت ہے۔اور اس وضاحت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی وسعتوں اور اس کے محیطِ کلی ہونے کو بیان فرمایا ہے۔کیونکہ جہاں تک علم کا تعلق ہے مخلوقات میں بھی انسانوں کو باقی تمام مخلوقات کی نسبت متنوع علوم سے بہرہ ور فرمایا گیا ہے، لیکن انسان کا علم اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود محدود اور نارسا ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کا علم صرف وسیع ہی نہیں بلکہ کائنات کے ایک ایک ذرے اور ایک ایک حرکت و سکون کو محیط ہے۔یوں تو اللہ تعالیٰ کی کائنات کے اور چھور کا اندازہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔اور آسمانی کتابوں کا اسلوب یہ ہے کہ وہ اس زبان میں نازل ہوئی ہیں جو انسان کے فہم و ادراک میں آ سکتی ہے۔اور ان میں بیشتر چیزیں انسانی دسترس اور فہم و ادراک سے ماورا نہیں۔بنابریں ارض و سماء انسانی معلومات کی حدود ہیں۔اور اس سے باہر

Marfat.com

جو کچھ ہے وہ انسان کے لیے غیب ہے۔ بلکہ ان دونوں کے اندر بھی بہت سے ایسے حقائق اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ لیکن ارض و سماء کو فی الجملہ انسان اپنے علم کا حوالہ سمجھتا ہے اس لیے تقریبِ فہم کے لیے فرمایا کہ جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے یعنی جو دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے وہ اس سے بھی باخبر ہے اور جو پودا اس سے برآمد ہوتا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے۔ اسی طرح آسمان سے ہر اترنے والی چیز سے وہ آگاہ ہے۔ اور جو چیزیں اس کی طرف صعود کرتی ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں۔ غرضیکہ وہ کائنات کے تمام کلیات و جزئیات سے باخبر اور ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ جو پتہ زمین پر گرتا ہے وہ اس کے علم میں ہے۔ ہر رطب و یابس اس کی نگاہوں میں ہے۔ کائنات میں کوئی واقعہ اس کے اِذن کے بغیر نہیں ہوتا۔ اور کسی قسم کی نقل و حرکت یا دراندازی اس کے علم سے باہر نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ جس ذاتِ عظیم کا علم ایسا غیر محدود اور بے پناہ ہے اس کے بارے میں مشرکین کا یہ خیال کہ وہ کائنات کے گوشے گوشے اور انسان کے ہر قول و عمل سے کیسے باخبر ہوسکتا ہے۔ وہ انسانی ضروریات سے کیسے واقف ہوسکتا ہے۔ انسانی دکھوں اور محرومیوں کا اندازہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ انسان اپنی ضروریات، اپنی احتیاجات اور اپنے دکھوں کے حوالے سے اسے پکارنا چاہتا ہے۔ اسی غلط تصور سے ان کے یہاں دیویوں اور دیوتاؤں کے تصورات پیدا ہوئے۔ غلط عقیدۂ شفاعت نے اپنی راہ بنائی۔ بندے اور خدا کے درمیان وسائط ایجاد کیے گئے۔ جنوں اور فرشتوں کے بارے میں اہلِ عرب نے اپنے عقیدے گھڑے اور ان پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے تمام توہمات اور مزعومات پر ضرب لگاتے ہوئے اپنے بے پناہ اور غیر محدود علم کو واضح فرمایا۔ اور یہ بات انسانی عقل پر چھوڑ دی کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ لامحدود علم کی حامل ذات کی موجودگی میں محدود علم رکھنے والی مخلوقات کو وسیلہ اور واسطہ بنایا جاسکتا ہے اور یا اس کی کہیں ضرورت محسوس ہوتی ہے؟

ایک غلط فہمی کا ازالہ

آیت کے آخر میں پروردگار نے اپنی دو صفات کا ذکر فرمایا۔ اس سے بھی انسان کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس طرح انسان نے اللہ تعالیٰ کے علم و معرفت کے بارے میں غلط تصور قائم کرکے غلط عقیدے پیدا کیے اور شرک کی دلدل میں جا اترا۔ اسی طرح اس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور قائم کرلیا کہ وہ نہایت قہر و غضب رکھنے والی ذات ہے۔ جب اس کا غضب بھڑکتا ہے تو آندھیاں آتیں، زلزلے آتے اور وبائیں پھوٹتی ہیں۔ تو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لوگوں نے قربانی کے عجیب و غریب تصورات پیدا کیے۔ اور بعض لوگوں نے اس سے آگے قدم بڑھاتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ ایسی غیظ و غضب رکھنے والی ذات اگر ہمہ مقتدر ہوتی اور کائنات کا ہر گوشہ اس کی دسترس میں ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ اس کے باغی و طاغی اس کے غضب سے محفوظ رہتے، اور کبھی ان کی گرفت نہ ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا اندھیر نگری اور اللہ تعالیٰ اس کا چوپٹ راجہ ہے۔ ان دونوں باتوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ رحیم ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے اس کا پہلا تعارف ہی سورۃ الفاتحہ میں اس کی صفتِ ربوبیت کے بعد رحمٰن اور رحیم سے کروایا ہے۔ انسان اس کے غیظ و غضب کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اپنی بداعمالیوں کے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ اور مزید یہ کہ وہ غفور بھی ہے۔ ہر گناہ اور ہر خطا پر پکڑنا اس کا کام نہیں، بلکہ وہ مہلت پر مہلت دے کر سنبھلنے کا موقع دیتا ہے۔ اور جب اس کی راہ پر کوئی آجائے تو عفو و درگزر سے کام لیتا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہونے کے باوجود نافرمانیوں پر بھی کسی کی روزی بند نہیں کرتا۔ البتہ وہ عادل ہے۔ یہاں بھی عدل کرتا ہے اور آخرت میں بھی کرے گا۔

Marfat.com

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ ﴿۳﴾ لِّيَجْزِىَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۴﴾

(اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی، کہہ دیجیے، ہاں قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر ضرور آ کے رہے گی، اس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، نہ اس ذرے سے کوئی چھوٹی چیز اور نہ کوئی بڑی، مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔ ۳) تاکہ وہ ان لوگوں کو صلہ دے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے، وہی لوگ ہیں جن کے لیے مغفرت ہے اور رزقِ کریم۔ ۴)

قیامت صفاتِ خداوندی کا لازمی تقاضا ہے

گزشتہ آیات میں یہ بات واضح ہو چکی کہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے۔ اور اس کا علم غیر محدود، ہمارے حدِ ادراک سے ماورا اور ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ انسانوں کے ایک ایک عمل سے واقف ہے۔ اور ان کے جسم کے ایک ایک جزو اور ان کی آرام گاہوں تک کو جانتا ہے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قیامت ضرور آئے گی۔ اور جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے بیکراں علم کا مراقبہ کرے اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ اس کا اعتراف کرے۔ بایں ہمہ ان برخود غلط لوگوں اور قریش کے متکبروں کا حال یہ ہے کہ وہ نہایت سرکشی اور تمرد سے یہ کہتے ہیں کہ قیامت ہم پر کبھی نہیں آئے گی۔ کیونکہ ہم پیغمبر کی تکذیب کر چکے، ایذا رسانی میں ہم نے کوئی کمی نہیں چھوڑی، پیغمبر کی ہر بات کا تمسخر اڑایا۔ لیکن قیامت کو نہ آنا تھا اور نہ آئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں نہایت وقار اور زور کے ساتھ آنحضرت ﷺ سے بقید قسم جواب دلوایا گیا کہ ان ظالموں کو انہی کی زبان میں جواب دو کہ میرے رب کی قسم جو غیب کا جاننے والا ہے اور جو بے پناہ قدرتوں کا مالک ہے اور جس کے علم سے زمین و آسمان کا کوئی ذرہ مخفی نہیں اور جس کی کتابِ مبین میں ہر چیز مرقوم ہے کہ قیامت ضرور آئے گی۔ تمہیں یہ خیال ہے کہ مر کر فنا ہو جانے والے لوگ ازسرِنو کیسے زندہ ہوں گے۔ ان کے اعمال کا ذخیرہ کہاں سے دستیاب ہوگا۔ لیکن تمہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کے سامنے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر کام کے کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس لیے نہ قیامت کا وقوع اس کے لیے مشکل ہے اور نہ تمہارے اعمال کی جواب طلبی کوئی لاینحل سوال ہے۔

قیامت کی ضرورت

دوسری آیتِ کریمہ میں قیامت کی ضرورت واضح فرمائی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں عقل و شعور، قوتِ ارادی اور وحیِ الٰہی کی روشنی کی وجہ سے دو طرح کے انسان پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارتے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے اور ہمیشہ اس کی بندگی کو طرزِ عمل بناتے ہیں۔ اور دوسری قسم ان انسانوں کی ہے کہ جو نفسانیت کے پرستار، خواہشِ نفس کے اسیر اور سفلی جذبات پر جان دینے والے ہیں۔ یہ خیر و شر کے امتیاز سے ماورا اور اخلاقِ حسنہ اور اخلاقِ سیئہ کے تصور سے بے نیاز اور بندگی کے تصور

Marfat.com

سے نابلد زندگی گزارتے ہیں۔ اب اگر کوئی ایسا دن نہ آئے جس میں اچھے لوگوں کو صلہ دیا جائے اور برے لوگوں کو سزا ملے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نیک و بد دونوں یکساں ہیں۔ حالانکہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ بات ازبس ضروری ہے کہ ایک روزِ جزا آئے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا ظہور ہو اور انسانوں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جس کے وہ مستحق ہوں۔

اہلِ ایمان کو دو چیزوں کی بشارت

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ ایمان کو دو چیزوں کی بشارت دی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کی مغفرت کر دی جائے گی اور دوسرا یہ کہ انہیں رزقِ کریم عطا کیا جائے گا۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صاحبِ ایمان و عمل اپنے مقام اور معیار کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کے مقام و مرتبے کے مطابق ان سے سلوک کرے گا۔ جو لوگ نے ایمان اور عملِ صالح کی زندگی بسر کرتے ہوئے کبھی کوتاہیوں اور غلطیوں سے بھی دوچار ہوئے، انہیں اللہ تعالیٰ مغفرت سے نوازے گا اور غلطیوں سے درگزر فرمائے گا۔ لیکن جن لوگوں نے اپنے آپ کو ان غلطیوں سے محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے بڑھ چڑھ کر خدمات انجام دیں، انہیں اللہ تعالیٰ رزقِ کریم سے نوازے گا۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝

(اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کی کوشش کی یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب کا خاص حصہ ہوگا۔ ۵)

مُعٰجِزِيْنَ، مُعَاجَزَةٌ اس کا مصدر ہے۔ اس کا معنی ہے ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے باہم مسابقت کرنا۔
رِجْزٌ، عذاب کو بھی کہتے ہیں اور دردناک عذاب کو بھی۔

بدترین مخالفین کا انجام

جس طرح ایمان و عمل کے ساتھ ساتھ غلبۂ دین کا کام کرنے والوں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں تکلیفیں اٹھانے والوں کو مغفرت کے ساتھ ساتھ رزقِ کریم سے بھی نوازا جائے گا، اسی طرح جن لوگوں نے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے کفر ہی نہیں کیا بلکہ ان کی تگ و دو، شب و روز اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی باتوں کو شکست دینے کے لیے وقف رہی ہے، انہیں اللہ تعالیٰ عذاب ہی نہیں بلکہ دردناک عذاب دے گا۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ
وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝

(اور جانتے ہیں وہ لوگ جن کو علم دیا گیا، وہ چیز جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کی طرف اتاری گئی ہے وہ حق ہے، اور خدائے عزیز و حمید کے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ٦)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ معاندین اور متمردین آپ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں وہ یقیناً آپ کے لیے پریشان کن ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کبھی آپ کی مساعیِ جمیلہ کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخالفین کا غوغا اپنی جگہ، لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے علمِ حقیقی کی روشنی عطا فرمائی ہے وہ ان اہلِ کتاب میں سے ہوں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ترمیم وتحریف سے نہ صرف گریز کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ یا ایسے لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے فطرتِ سلیمہ سے بڑا حصہ پایا تھا۔ ایسے تمام لوگ نہ صرف آپ کی دعوت کو سچ اور حق سمجھتے ہیں بلکہ جس راستے کی طرف آپ بلاتے ہیں اسے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رسائی کا حقیقی راستہ سمجھتے ہیں جبکہ دوسرے تمام لوگ کہیں غلط عقیدۂ شفاعت میں مبتلا ہو کر اور کہیں عقل وخرد کے پیمانوں میں الجھ کر شرک اور باطل کی مختلف صورتوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اور ان کے اسی رویّے اور طرزِ عمل نے ان کو فطرتِ سلیمہ اور ذوقِ سلیم سے محروم کر دیا ہے جو انسان کے اندر خیر وشر کے امتیاز کو باقی رکھتا ہے۔ ایسے برخود غلط قسم کے لوگ اگر آپ کی مخالفت کر رہے ہیں تو آپ کو ان کی ہرگز پروا نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کے اطمینان کے لیے بس یہ بات کافی ہے کہ ہر سلیم الفطرت اور ذوقِ سلیم رکھنے والا شخص آپ کی دعوت اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کو برحق سمجھتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ ﴿۷﴾ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ﴿۸﴾

(اور کہتے ہیں وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ہے کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی دکھائیں جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ جب تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کیے جاؤ گے۔ ۷) کیا اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے یا اسے کسی قسم کا جنون لاحق ہے بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، عذاب میں اور دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۸)

آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں کفار کا غیر شریفانہ رویہ

مخالفین ہدایت اور علم سے تو محروم ہی ہیں، شرافت سے بھی کورے ہیں۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ پر افترائے باطل کا الزام لگایا، تو کسی نے سن کر نہ دیا۔ کذب بیانی کی بات کی، تو لوگوں نے اظہارِ تعجب کیا کہ جس شخص کو تم خود الصادق اور الامین کہہ کر پکارتے رہے ہو، اور جس نے کبھی کسی بات میں جھوٹ نہ بولا، کیا اب وہ جھوٹا ہو گیا۔ تو شرافت سے سر جھکانے کی بجائے انہوں نے ایک اور راستہ نکالا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر جنون کا اثر ہے یا کسی آسیب نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ لیکن لوگوں نے اس الزام کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ محمد (ﷺ) اپنی معاملہ فہمی، تدبر اور عقل وخرد کے اعتبار سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اب وہ آخر کیسے فاترالعقل ہو سکتے ہیں۔ اس پر مخالفین نے پینترہ بدلتے ہوئے کہا کہ یقیناً یہ باتیں محمد (ﷺ) میں دعویٰ نبوت سے پہلے نہ تھیں۔ لیکن اب اس کا حال یہ

Marfat.com

ہے کہ وہ عجیب طرح کے دعوے کرتا ہے۔ وہ علیٰ رؤس الاشہاد یہ بات کہتا ہے کہ لوگ جب مر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو وہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ تم ہی بتاؤ کہ کیا یہ بات قابلِ تسلیم ہے۔ لیکن وہ چونکہ تسلسل کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہے، تو یہ دو حال سے خالی نہیں کہ یا تو وہ جھوٹ بولتا ہے اور ایک غلط بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر رہا ہے۔ اور یا پھر اسے کسی قسم کا جنون لاحق ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مفتری بھی ہے مجنون بھی۔ پروردگار نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ خرابی درحقیقت نہ داعی میں ہے اور نہ اس کی دعوت میں، بلکہ خرابی ان لوگوں میں ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سزا اور عذاب میں پکڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک ایسی بات کو قبول کرنے سے محروم ہو گئے ہیں جس پر دلائلِ آفاق، دلائلِ انفس اور اخلاقی مقتضیات صاف صاف دلالت کر رہے ہیں۔ اور کوئی سلیم الفطرت شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ایسی دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں جس سے پلٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ یعنی بعض گمراہیاں ایسی ہوتی ہیں جس میں پلٹ کر آنے اور اصلاح کا امکان باقی رہتا ہے۔ لیکن جو شخص آخرت کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کی واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ سرپٹ جہنم کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۹

(کیا انہوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا، اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں، بے شک اس میں ایک بہت بڑی نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ ۹)

مخالفین کی مخالفت کا اصل سبب

اسلام کے مخالفین اور معاندین کی تمام تر مخالفت اور عناد کے اصل سبب کو اس آیتِ کریمہ میں منکشف فرمایا گیا ہے۔ وہ سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت اور اس کے علمِ محیط پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے، کوئی چھوٹا بڑا کام اس کے لیے ناممکن نہیں تو یہ کبھی قیامت کے برپا ہونے اور انسانوں کے از سرِ نو زندہ ہونے کو بعید از عقل نہ سمجھتے۔ اسی طرح اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز، ہر عمل اور ہر حرکت کا علم رکھتا ہے۔ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق اور ہر رطب و یابس اس کے علم میں ہے، تو انہیں کبھی یہ بات بعید از عقل معلوم نہ ہوتی کہ نہ جانے کتنی بڑی تعداد میں انسان مر کھپ چکے اور ان کے جسم فنا ہو کر معدوم ہو چکے ہیں۔ یہ کیسے جانا جا سکتا ہے کہ جن کی مٹی کو بھی ہوا اڑا کے لے گئی ان کے جسم کے ذرات کہاں ہیں۔ اسی طرح ان کے بے شمار اعمال کو کون جان سکتا ہے جن کے محاسبے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہیں دونوں باتوں کے اثبات کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کیا یہ لوگ اس آسمان کو نہیں دیکھتے جو ان کے سروں پر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے اور اس زمین پر غور نہیں کرتے جو ان کے قدموں کے نیچے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ کیا انہوں نے کبھی غور کیا ہے کہ زمین و آسمان کو کس نے تھام رکھا ہے۔ اور زمین کو قوتِ روئیدگی اور بے شمار خزانوں سے کس نے مالا مال کر رکھا ہے۔ اور انسان جو ان کی بے شمار نعمتوں اور فوائد و برکات سے متمتع ہو رہا ہے یہ آخر کس کی عطا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی بھلائی پیشِ نظر نہ ہوتی یا زمین پر ان کا قرار منظور نہ ہوتا تو وہ کسی وقت بھی زمین کی مخلوقات کو زمین سمیت دھنسا سکتا تھا اور آسمان سے ابرِ رحمت برسانے کی بجائے ان پر پتھر برسا سکتا

Marfat.com

تھا۔لیکن اس کے برعکس اس کے حکم سے زمین و آسمان انسان کی نفع رسانی اور خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔کیا اس سے اللہ تعالیٰ کی بے کراں قدرت اور اللہ تعالیٰ کے بے پایاں علم کا اندازہ نہیں ہوتا۔یہ حقیقت اس بات کو لازم کرتی ہے کہ انسان اپنے رب کی شکر گزاری کرے اور اس کی نعمتوں کی ناشکری اور اس کے احکام کی نافرمانی کی بجائے اس کی خوشنودی اور فرماں برداری میں شب و روز لگا رہے۔

اگر یہ مخالفین ارض و سماء کے اس پہلو پر غور کرتے تو وہ یقیناً اس حقیقت کو پا لیتے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان کے اندر حقیقت کی طلب، عبرت پذیری کی صلاحیت اور متوجہ ہونے والا دل موجود ہو۔اسی لیے اقبال نے کہا:

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ط
يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ج وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿١٠﴾ اَنِ اعْمَلْ
سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ﴿١١﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ج
وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ط وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ
بِاِذْنِ رَبِّهٖ ط وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ
السَّعِيْرِ ﴿١٢﴾ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ
كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ط اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ط وَقَلِيْلٌ مِّنْ
عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿١٣﴾ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى
مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ج فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ
الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ

Marfat.com

الْمُهِيْنِ ﴿١٤﴾ لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ
يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ
طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿١٥﴾ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ
وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ
مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿١٦﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ
اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿١٧﴾ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا
قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا
اٰمِنِيْنَ ﴿١٨﴾ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿١٩﴾ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ
فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ
مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا
فِيْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٢١﴾ ع

رکوع: ۲۔ (ہم نے داؤد کو اپنے ہاں سے بڑا فضل عطا کیا تھا، (ہم نے حکم دیا کہ) اے پہاڑو تم بھی اس کے ساتھ تسبیح میں شرکت کرو، اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو بھی دیا، اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔ ۱۰) اس ہدایت کے ساتھ کہ ڈھیلی ڈھالی زرہیں بناؤ اور ان کے حلقے ٹھیک اندازے پر رکھو، اور (اے آلِ داؤد!) نیک عمل کرو، بے شک تم جو

Marfat.com

کچھ کرتے ہو میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ ۱۱) اور سلیمان کے لیے ہم نے ہَوا کو مسخر کر دیا، صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک، اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک، اور ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا، اور جنات میں سے بھی اس کے لیے مسخر کر دیے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے، ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا، اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے۔ ۱۲) اور وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا، اونچی عمارتیں، تصویریں، حوضوں کے مانند لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی دیگیں۔ اے آلِ داوٗد! عمل کرو شکر کے طریقے پر اور میرے بندوں میں شکرگزار تھوڑے ہی ہیں۔ ۱۳) پس جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت پر آگاہ نہیں کیا، مگر زمین کے کیڑے نے، جو سلیمان کے عصا کو کھاتا تھا، پس جب وہ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔ ۱۴) اہلِ سبا کے لیے ان کے اپنے ہی مسکن میں ایک بہت بڑی نشانی موجود تھی، دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر بجالاؤ، ملک عمدہ اور شاداب اور پروردگار بخشنے والا۔ ۱۵) پس انہوں نے اعراض کیا اور سرتابی کی، تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے باغوں کو دو ایسے باغوں سے بدل دیا جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت اور بیری کی کچھ جھاڑیاں رہ گئیں۔ ۱۶) یہ ہم نے ان کو ان کی ناشکری کا بدلہ دیا، اور ناشکرے انسان کے سوا ہم ایسا بدلہ کسی اور کو نہیں دیتے۔ ۱۷) اور ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان جن کو ہم نے برکت دی تھی نمایاں بستیاں آباد کی تھیں اور ان بستیوں کے درمیان سفر کی منزلیں ٹھہرا دی تھیں، چلو پھرو ان بستیوں میں رات دن بے خوف وخطر۔ ۱۸) مگر انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمارے سفروں میں دوری پیدا کر دے، اور انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، تو ہم نے ان کو افسانہ بنا دیا، اور انہیں بالکل تتر بتر کر ڈالا، یقیناً اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے، شکر کرنے والے کے لیے۔ ۱۹) اور ابلیس نے ان کے اوپر اپنا گمان سچ کر دکھایا، پس انہوں نے اس کی پیروی کی، بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھا۔ ۲۰) اور ابلیس کو ان پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر یہ کہ ہم ممیز کر دیں ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ان لوگوں سے جو اس کی بابت شک میں ہیں، اور آپ کا رب ہر چیز پر نگران ہے۔ ۲۱)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝۱۰ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱

(ہم نے داوٗد کو اپنے ہاں سے بڑا فضل عطا کیا تھا، (ہم نے حکم دیا کہ) اے پہاڑو! تم بھی اس کے ساتھ تسبیح میں شرکت کرو، اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو بھی دیا، اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔ ۱۰) اس ہدایت کے ساتھ کہ ڈھیلی ڈھالی زرہیں بناؤ اور ان کے حلقے ٹھیک اندازے پر رکھو، اور (اے آلِ داوٗد!) نیک عمل کرو، بے شک تم جو کچھ کرتے ہو میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ ۱۱)

Marfat.com

مشکل الفاظ کی تشریح:۔ تاویب کے اصل معنی ترجیع کے ہیں۔ یعنی کسی کے سُر میں اپنا سُر ملانا، اس کی آواز کو دہرانا، اس کی ہم آہنگی اور ہمنوائی کرنا۔

سابغات: ڈھیلے ڈھالے لباس کو بھی کہتے ہیں اور کشادہ کو بھی۔

سَرد حلقے کو بھی کہتے ہیں اور بناوٹ کو بھی۔

تقدیر، اندازہ اور بناوٹ میں تناسب کو ملحوظ رکھنا۔

اشرافِ قریش کے سامنے حضرت داؤد علیہ السلام کی مثال

یہاں سے قریش کے مترفین ومتکبرین کے سامنے دو مثالیں پیش کی جارہی ہیں جن میں پہلی مثال حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہا السلام کی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے خصوصی عنایات سے نوازا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام بیت اللحم میں قبیلہ یہوداہ کے ایک معمولی نوجوان تھے۔ حضرت طالوت اور جالوت کے درمیان جنگ میں شریک اپنے بھائی کو کھانا پہنچانے کے لیے آئے تو دیکھا کہ جالوت مسلمانوں کو مقابلے کے لیے پکار رہا ہے لیکن اس کے ڈیل ڈول اور بہادری کی شہرت کی وجہ سے کوئی اس کے مقابلے میں جانے کے لیے آمادہ نہیں۔ انہیں یہ منظر دیکھ کر بڑا طیش آیا اور حضرت طالوت سے کہنے لگے کہ میں فلستیوں کے اس جرنیل کے مقابلے میں نکلنے کے لیے تیار ہوں۔ طالوت نے پہلے انہیں صرف ایک نوجوان گڈریے کی صورت میں دیکھ کر اجازت دینے میں تامل کیا۔ لیکن ان کے اصرار پر اجازت دے دی۔ تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے گوپیے سے اس پر ایسا پتھر پھینکا کہ جو اس کی پیشانی پر لگا اور وہ ڈھیر ہو گیا اور آپ نے آگے بڑھ کر اس کا سر قلم کر دیا۔ اس غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے وہ بنی اسرائیل کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ اسی واقعہ سے ان کا عروج شروع ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت طالوت نے ان کو اپنی دامادی میں لے لیا اور ان کی وفات کے بعد پہلے وہ حبرون (موجودہ الخلیل) میں یہودیہ کے فرماں روا بنائے گئے۔ پھر چند سال بعد تمام قبائل بنی اسرائیل نے مل کر ان کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ اور انہوں نے یروشلم کو فتح کر کے اسے دولتِ اسرائیل کا پایۂ تخت بنایا۔ یہ انہی کی قیادت تھی جس کی بدولت تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی خدا پرست سلطنت وجود میں آئی جس کی حدود خلیج عقبہ سے دریائے فرات کے مغربی کناروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم بادشاہی کے ساتھ ساتھ عظیم علم وحکمت، نبوت ورسالت اور آسمان وزمین کی بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ لیکن وہ ان نعمتوں کو پا کر طغیان وفساد میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے شکر گزار اور فرماں بردار رہے۔ اسی شکر گزاری اور فرماں برداری کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں بے پایاں اضافہ ہوتا رہا۔ انہیں میں سے ایک نعمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ سوز وگداز عطا فرمایا کہ جب وہ پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر اپنے خاص لاہوتی لحن میں اپنے رب کی حمد کا ترانہ چھیڑتے اور اپنی منظوم مناجاتیں پڑھتے تو شجر وحجر اور چرند پرند سب جھوم اٹھتے اور ان کی ہمنوائی کرتے۔

جبال وطیور کی ہم نوائی کا مفہوم

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام چونکہ نہایت خوش الحان تھے۔ آپ کی نہایت سریلی اور بلند آواز میں بلا کی تاثیر تھی۔ اس لیے جیسے ہی آپ زبور کی تلاوت کرتے جو منظوم تھی تو پہاڑ آپ کے ساتھ گونجنے لگتے۔ اور پرندے بھی مسحور ہو کر آپ کے گرد اترنے لگتے۔ پیشِ نظر آیت میں پرندوں اور پہاڑوں کو آپ کی ہم آہنگی اور تسبیح میں شرکت کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سورۃ انبیاء میں

Marfat.com

پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کرنے کی جو بات کہی گئی ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔ اس مفہوم کے مراد لینے میں حرج تو کوئی نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات اور آپ کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے بطورِ خاص جس عمل کو تسخیر کا نام دیا ہے اور پھر مزید مؤکد اور مبرہن کرنے کے لیے اس کا انتساب اپنی طرف فرمایا ہے۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جو تاثر اور کیفیت کسی دوسرے خوش آواز آدمی سے پیدا ہو سکتی ہے اور جو صرف اس کی خوبصورت آواز کی تاثیر کا نتیجہ ہوتی ہے وہی تاثیر لحن داؤدی کی تھی۔ ہرگز! نہیں یہ یقیناً اس سے زائد منفرد اور ممتاز چیز تھی ورنہ پروردگار اس اہتمام سے اس کا ذکر نہ فرماتے۔

اور دوسری بات یہ کہ اگر تسبیح سے مراد صرف پہاڑوں کا گونجنا اور پرندوں کا اتر آنا ہے تو یہ بھی آپ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اس لیے کہ قرآنِ پاک ہی میں فرمایا گیا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ ”ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس تسبیح سے وہی ناقابلِ فہم تسبیح مراد لی جائے جو اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق کرتی ہے تو پھر اس آیتِ کریمہ میں جس تسبیح کا ذکر کیا گیا ہے اس کی کیا خصوصیت باقی رہے گی۔ ان تمام باتوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مصروف ہوتے تو بالکل اسی آواز میں پہاڑ اور پرندے بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے تھے جن الفاظ میں حضرت داؤد علیہ السلام کرتے تھے اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ انبیائے کرام کے معجزات اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی جامعیت

حضرت داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے انتہائی عبادت گزار ہونے کے باوجود کسی خانقاہ میں بیٹھنے والے تجرد پسند صوفی نہ تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ریاست و حکومت کی ذمہ داریوں سے بھی گراں بار کیا تھا۔ جس طرح آپ عبادت گزاری میں بے مثال تھے اسی طرح آپ ملکی معاملات کو انجام دینے اور ملک کے دفاع کے لیے بھی ہمہ وقت چوکس رہتے تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ پر مزید یہ احسان کیا تھا کہ آپ کے لیے لوہے کو نرم کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ آپ اس لوہے سے قمیض کی طرح ڈھیلی ڈھالی زرہ بنائیں۔ لیکن اس کی بناوٹ ایسی خوبصورت ہو کہ اس کی ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ ایسی پیوست ہو اور ہر کڑی کا سائز دوسری کے ساتھ ایسا ہم آہنگ، ہم رنگ اور ہم وزن ہو کہ کہیں بھی تناسب شکست نہ ہونے پائے۔

لوہے سے ایسی زرہ بنا لینا جو دیکھنے کو ایسی لگے جیسے کپڑے کی بنی ہوئی قمیض ہے اور اس کی کڑیوں میں بھی حیرت انگیز تناسب پایا جائے۔ یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر لوہے کے پگھلانے کی کسی اعلیٰ سائنس کا انکشاف فرمادیا ہو۔ اور اس بات کی تائید تاریخ کی اس شہادت سے بھی ہوتی ہے کہ ایسی زرہوں کی ایجاد جس نے دفاعی اسلحے میں بیش قیمت اضافہ کیا وہ حضرت داؤد علیہ السلام کا کارنامہ ہے۔ چنانچہ اس ایجاد نے حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کی دفاعی قوت میں بیش قیمت اضافہ کر دیا۔ اور ان کے حریفوں کے مقابلے میں ان کی قوت بہت بڑھ گئی۔

Marfat.com

قوت کا اخلاقی تقاضا

لوہے کو پگھلانے کی سائنس پر قابو پانے کے بعد چونکہ آپ کی فوجی قوت میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا اور آپ اپنے دور کے حوالے سے ناقابلِ تسخیر قوت بن گئے۔ قوت اور طاقت فطری طور پر اپنا اظہار چاہتی ہیں جس کے نتیجے میں عُجب، خود پسندی، تمرد اور ظلم پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن حضرت داؤد علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے ان کی بعثت ان برائیوں کو ختم کرنے کے لیے تھی نہ کہ ان میں اضافہ کرنے کے لیے۔ اور ان کی قوت خیر اور بھلائی کی قوت تھی، ظلم کا ذریعہ نہ تھی۔ اس لیے آلِ داؤد اور آپ کے ہموطنوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ طاقت پا کر بہک نہ جانا اور اس کو زمین میں فساد کا ذریعہ نہ بنانا۔ بلکہ تمہیں خیر اور بھلائی کی قوت بن کے اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا سامان کرنا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے از بس ضروری ہے کہ اس بات کو ذہنوں سے کبھی نہ نکلنے دو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ محکم عقیدہ ہے جس سے دولت اور قوت کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی زمین امن کا گہوارا بنتی ہے۔ اور زمین پر بسنے والوں کو امن و آشتی کا سایہ نصیب ہوتا ہے۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿١٢﴾

(اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا، صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک، اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک، اور ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا، اور جنات میں سے بھی اس کے لیے مسخر کر دیے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے، ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا، اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے۔ ۱۲)

361

حضرت سلیمان علیہ السلام پر انعامات میں سے پہلا انعام

حضرت داؤد علیہ السلام پر انعامات کے ذکر کے بعد ان انعامات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر کیے گئے۔ ان پر پہلا انعام یہ ہوا کہ ہوا کو آپ کے تابع فرمان کر دیا گیا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا، صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک۔ اور سورۃ صٓ میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے بسہولت تھی، جدھر وہ جانا چاہتا تھا۔ اور سورۃ انبیاء میں ارشاد فرمایا گیا اور ہم نے سلیمان کے لیے تند و تیز ہوا کو مسخر کر دیا، جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف تھی جسے ہم نے برکت دی تھی۔ ان تینوں آیات کو گہری نظر سے پڑھنے سے جو تأثر ابھرتا ہے اس میں اگر ذہنی تحفظات کو دخل اندازی کا موقع نہ دیا جائے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے قابو میں دے دیا تھا۔ اور وہ آپ کے حکم کے مطابق اور خدمت بجا لاتی تھی۔ آپ کا ایک عظیم الشان تخت تھا۔ آپ اپنے وزراء اور امراء کو ساتھ لے کر تخت پر سوار ہو جاتے اور ہوا کو چلنے کا حکم دیتے۔ چنانچہ تند و تیز ہوا اس بھاری بھرکم تخت کو زمین سے

Marfat.com

اٹھاتی اور اوپر جا کر ہَوا کی رفتار نرم ہو جاتی۔ جس کی رفتار کا اندازہ یہ تھا کہ آپ جہاں اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے جانا چاہتے ہَوا اس تخت کو لے کر چلتی۔ صبح کو آپ کا سفر ایک مہینے کی مسافت کا تھا اور شام کا سفر بھی اسی مسافت کا ہوتا یعنی آپ سینکڑوں میل تک تخت پر سوار رہتے اور اندازاً یہ سفر اتنا ہوتا جتنا اونٹوں پر ایک مہینے میں طے ہوتا تھا۔ اور شام کو پھر اسی رفتار سے واپس اپنے مستقر پر تشریف لے آتے۔ رہی یہ بات کہ یہ ہَوا آپ کے تجارتی بیڑوں کو آپ کے حکم سے کھینچے لیے پھرتی تھی، جس کے نتیجہ میں آپ کی بحری تجارت بہت دور تک پھیل گئی تھی کہ ایک طرف عصیون جابر سے ان کے تجارتی جہاز بحراحمر میں یمن اور دوسرے جنوبی اور مشرقی ممالک کی طرف جاتے تھے۔ اور دوسری طرف بحر روم کی بندرگاہوں سے ان کا بیڑہ مغربی ممالک کی طرف جایا کرتا تھا۔ اور آپ کے حکم سے جہازوں کے بادبان ہر طرح کی ہَواؤں میں کھلے رہتے۔ چونکہ ہَوا آپ کے حکم کی پابند تھی اس لیے وہ ہمیشہ بادِ موافق بن کر اپنا فرض انجام دیتی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعام کے مظاہر ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزے کو بادِ موافق کی کارکردگی تک محدود کر دیا جائے بلکہ جس طرح ہَواؤں کا وہ فیضان جو آپ کے تجارتی اسفار میں معاون ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ کا انعام تھا۔ اسی طرح ہَوا کا آپ کے تخت کو لے کر آپ کے حکم سے اڑنا وہ بھی اللہ تعالیٰ کا انعام اور کرم تھا۔ ان دونوں میں کہیں بھی تضاد نہیں۔

دوسرا انعام

حضرت سلیمان علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے دوسرا انعام یہ کیا کہ آپ کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ رواں کر دیا۔ ''قطر'' تانبے یا پگھلے ہوئے تانبے کو کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ زمین سے ایک چشمہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے پھوٹ نکلا تھا جس میں سے پانی کی بجائے پگھلا ہوا تانبا بہتا تھا۔ لیکن بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس آیت کی دوسری تعبیر بھی ممکن ہے۔ وہ یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں تانبے کو پگھلانے اور اس سے طرح طرح کی چیزیں بنانے کا کام اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا، گویا وہاں تانبے کے چشمے بہہ رہے تھے۔ جدید تحقیق اور کھدائیوں کے نتیجے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد کی جو تاریخ سامنے آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں تانبے کی بڑی مقدار برآمد ہوئی۔ اور اس کو انہوں نے اپنی تمدنی اور تعمیری ترقیوں میں نہایت خوبی کے ساتھ استعمال کیا۔ اگلی آیت میں بڑی بڑی دیگوں اور لگنوں کا ذکر آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں اسی کی بنتی تھیں۔ ہیکل کی تعمیر میں بھی جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس دھات کا بہت استعمال کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو غیر معمولی طور پر نوازا گیا تھا۔

تیسرا انعام

تیسرا انعام حضرت سلیمان علیہ السلام پر جو اللہ تعالیٰ نے کیا، وہ یہ تھا کہ جنات آپ کے لیے مسخر کر دیے گئے تھے۔ قرآنِ کریم کی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات آگ کے بنے ہوئے وہ اجسامِ لطیفہ ہیں جو عقل و شعور رکھتے ہیں اور انسان کی طرح احکامِ شریعت کے مکلف ہیں۔ اس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان کر دیا تھا۔ لیکن ان میں سے جو جنات آپ پر ایمان نہیں لائے انہیں قرآنِ کریم شیاطین کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یعنی جنات کا لفظ تو مومن اور کافر دونوں پر بولا جاتا ہے لیکن غیر مومن اور غیر مسلم جنات کو

Marfat.com

شیاطین کہا گیا ہے۔ جو جنات مومن تھے وہ تو ایمان کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت کو فرض سمجھتے تھے۔ اس لیے انہیں مسخر کرنے کی بات نہیں کی گئی۔ لیکن جو جنات آپ پر ایمان نہیں لائے انہیں بطورِ خاص آپ کی تسخیر میں دیا گیا۔ اور وہ اپنے تمام تر کفر اور سرکشی کے باوجود حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان بنائے گئے تھے۔ وہ ایمان نہ رکھتے ہوئے بھی آپ کی اطاعت کرنے کے پابند تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ان کی طاقت کے اعتبار سے ان سے ایسے کام لیتے تھے جنہیں انسان تنہا انجام نہیں دے سکتے تھے۔ وہ سمندروں میں غوطے لگاتے اور سمندری دولت مونگے اور موتی وغیرہ آپ کے لیے فراہم کرتے تھے۔ اور اگلی آیت میں محرابیں اور شاندار مکانات اور تصویریں اور پتھر کے بڑے بڑے پیالے جو حوض کی مانند ہوتے تیار کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی ان سے نہ جانے اور کیا کیا کام لیے جاتے تھے۔ لیکن وہ اپنی ہر طرح کی سرکشی کے باوجود آپ کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں جکڑے ہوئے تھے۔

بعض لوگ جو مغرب زدگی کی وجہ سے قرآنِ کریم کی ہر اس بات کی تاویل کی کوشش کرتے ہیں جنہیں مغرب اپنی عقل پرستی کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں سمجھتا۔ چنانچہ ان باتوں میں جنات کا مسئلہ بھی ہے۔ قرآنِ کریم میں جہاں بھی جن کا ذکر آیا ہے وہ اس سے دیوہیکل اور طاقتور آدمی مراد لیتے ہیں بلکہ ہر دیہاتی اور کوہستانی شخص ان کے نزدیک جن ہے۔ لیکن جو شخص بھی قرآنِ کریم کو دوسروں کی نگاہوں کی بجائے اپنی نگاہوں سے پڑھنے کی کوشش کرے گا وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ جنات انسانوں کی طرح ایک الگ مخلوق ہیں جو اجسامِ کثیفہ نہیں رکھتے، اس لیے نظر نہیں آتے، لیکن انسانوں ہی کی طرح عقل و شعور رکھتے ہیں۔ سورۃ النمل میں صاف تصریح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں پر مشتمل تھا۔ اگر جن سے مراد انسان ہی ہوتے تو یہاں جنوں کا الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾

(اور وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا، اونچی عمارتیں، تصویریں، حوضوں کے مانند لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی دیگیں، اے آلِ داؤد عمل کرو شکر کے طریقے پر اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔ ۱۳)

جنات کی خدمات

جنات کے مسخر کرنے سے عام طور پر جو تأثر ابھرتا ہے وہ پیشہ ور عاملوں یا کاہنوں کا ہے۔ اور ان خرافات کی طرف ذہن جاتا ہے جنہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے جو کام لیے وہ سب تعمیری اور تمدنی کام تھے۔ ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فاسد اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا۔ چنانچہ جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے محرابیں بناتے تھے۔ محراب سے مراد بڑی عمارت بھی ہوسکتی ہے اور عمارت کا سب سے نمایاں حصہ جسے عام طور پر محراب سے یاد کیا جاتا ہے وہ بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ آپ نے جنات سے تعمیری آرٹ کا کام بھی لیا۔ اور اس کا اظہار محراب پر ہی ہوسکتا ہے۔ اور آپ نے ہیکل کی طرح بڑی بڑی ایسی عمارتیں بھی بنوائیں جن کی تعمیر بظاہر انسانوں سے بہت مشکل تھی۔ اس لیے میرا ناقص گمان یہ ہے کہ محاریب سے محرابیں بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور بڑی بڑی عمارتیں بھی۔ جبکہ لغوی اعتبار سے اس لفظ کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔

Marfat.com

تماثیل کے مفہوم کی وضاحت

آپ نے جنات سے تماثیل بھی بنوائیں، یہ تمثال کی جمع ہے۔ تمثال کسی چیز کی مصور یا کندہ کی ہوئی چیز کی شبیہہ یا اس کے پیکر یا مجسمہ کو کہتے ہیں۔ یہ صورت بے جان چیزوں کی بھی ہو سکتی ہے اور جاندار چیزوں کی بھی۔ تورات کی کتاب سلاطین سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان دونوں ہی قسموں کی تماثیل بنوائیں۔ لیکن یہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے اس گروہ کا اتہام ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام سے عداوت رکھتا تھا۔ اس لیے ان کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی یہود نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بالکل دنیا دار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سیرت ہر پہلو سے انہوں نے داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو شخص بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو بطور ایک پیغمبر کے دیکھے گا اس کے لیے یہ بات باور کرنا ناممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کوئی ایسا کام کر سکتے تھے جسے تورات نے حرام قرار دیا ہو جبکہ آپ تورات ہی کے پیروکار تھے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء بھی آئے ہیں، وہ سب تورات ہی کے پیرو تھے۔ اور تورات میں صراحت کے ساتھ ہمیں یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے قطعاً حرام ہیں۔ (خروج ۲۰: ۲۔ ۵ میں ہے)۔

”خداوند تیرا خدا جو تجھے زمینِ مصر سے، غلامی کے گھر سے، نکال لایا، میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے، تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت یا اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں، زمین کے نیچے سے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر، کیونکہ میں تیرا خدا غیور خدا ہوں۔“

خروج باب ۲ آیت ۴ میں ہے ”تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔“

دیکھ لیجیے، اس میں نہایت واضح الفاظ میں صورت یا مورت بنانے کی ممانعت ہے۔ اس وجہ سے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پچھلی شریعتوں میں یہ چیزیں جائز تھیں، صرف اسلام میں حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ چیزیں پہلے بھی ناجائز تھیں۔ جن مفسرین نے بنی اسرائیل کی روایات پر اعتماد کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تصویر بنانے کی ممانعت ہماری شریعت میں وارد ہوئی ہے، سابقہ شریعتوں میں اس کی اجازت تھی، انہوں نے تورات سے بے خبری کا ثبوت دیا ہے۔ اور دشمنوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر جو الزام لگایا تھا اور جسے تورات کا حصہ بنا دیا گیا ہے، بے خبری میں اس کی تصدیق کی گئی ہے جبکہ تورات نے ہر صورت اور مورت بنانے کی ممانعت کی تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام ظاہر ہے کہ تورات کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن حیرت ان جدید اور نام نہاد اہلِ علم پر ہے جو اہلِ مغرب کی تقلید میں مصوری اور بت تراشی کو حلال کرنا چاہتے ہیں، وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے طرزِ عمل سے بھی دلیل پکڑتے ہیں اور قرآنِ کریم کی اس آیت کے لفظ تماثیل کو اپنے لیے دلیل بناتے ہیں۔ جبکہ تماثیل کا لفظ انسانی اور حیوانی تصاویر کے معنی میں صریح نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق غیر جاندار اشیاء کی تصویروں پر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے محض اس لفظ کے سہارے اس حکم کو توڑا نہیں جا سکتا جس کا ثبوت نہایت کثیر التعداد، قوی الاسناد اور متواتر المعنی احادیث میں ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ذی روح اشیاء کی تصویریں بنانے اور رکھنے کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ ہم ان بیسیوں روایات میں سے چند ایک کا ذکر کرنا چاہتے ہیں تاکہ صحیح بات کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

Marfat.com

عن ابی جحیفة ان رسول الله ﷺ لعن المصور (بخاری، کتاب البیوع، کتاب الطلاق وکتاب اللباس)
''ابو جحیفہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصور پر لعنت فرمائی ہے۔''

عن عبداللہ بن مسعودؓ قال سمعت النبی ﷺ یقول ان اشدالناس عذاباً عندالله یوم القیامة المصورون (بخاری، کتاب اللباس، مسلم، کتاب اللباس، نسائی، کتاب الزینة، مسند احمد) ''عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت ترین سزا پانے والے مصور ہوں گے۔''

عن عائشةؓ قالت دخل علی رسول الله ﷺ وانا متسترة بقرام فيه صورة فتلوّن وجهه ثم تناول الستر فهتكه ثم قال ان من اشدالناس عذابا یوم القیامة الذین یشبهون بخلق الله (مسلم، کتاب اللباس، بخاری، کتاب اللباس، نسائی، کتاب الزینة) ''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویر تھی، آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، پھر آپؐ نے اس پردے کو لے کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا قیامت کے روز سخت ترین عذاب جن لوگوں کو دیا جائے گا ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مانند تخلیق کی کوشش کرتے ہیں۔''

عن جابر قال نهیٰ رسول الله ﷺ عن الصورة فی البیت ونهیٰ ان یصنع ذلک (ترمذی ابواب اللباس) ''حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ گھر میں تصویر رکھی جائے اور اس سے بھی منع فرمایا کہ کوئی شخص تصویر بنائے۔''

چنانچہ ان ہی احادیث کی وجہ سے ہمارے فقہاء نے اسے قانونِ اسلامی کی ایک دفعہ قرار دیا ہے۔ علامہ بدرالدین عینی توضیح کے حوالہ سے لکھتے ہیں (ہمارے اصحاب یعنی فقہاء احناف اور دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ کسی جاندار چیز کی تصویر بنانا حرام ہی نہیں، سخت حرام اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے خواہ بنانے والے نے اسے کسی ایسے استعمال کے لیے بنایا ہو جس میں اس کی تذلیل ہو یا کسی دوسری غرض کے لیے، ہر حالت میں تصویر کشی حرام ہے کیونکہ اس میں اللہ کی تخلیق سے مشابہت ہے۔ اسی طرح تصویر خواہ کپڑے میں ہو یا فرش میں یا دینار یا درہم یا پیسے میں یا کسی برتن میں یا دیوار میں، بہر حال اس کا بنانا حرام ہے۔ البتہ جاندار کے سوا کسی چیز مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے۔ ان تمام امور میں تصویر کے سایہ دار ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔)

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی کریم ﷺ کے صریح ارشادات، صحابہ کرام کے عمل اور فقہاء اسلام کے متفقہ فتاویٰ کی رو سے ایک مسلم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متاثر لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔

اس سلسلے میں چند اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں جن کی حیثیت غلط فہمیوں سے زیادہ نہیں۔ صاحب تفہیم القرآن اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعتراضات کا جواب

بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقے کو۔ فوٹو اور دستی تصویر میں تصویر ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے درمیان جو کچھ بھی فرق ہے وہ طریق تصویر سازی کے لحاظ سے ہے اور اس لحاظ سے شریعت نے احکام میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

Marfat.com

بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر کی حرمت کا حکم محض شرک و بت پرستی کو روکنے کی خاطر دیا گیا تھا، اور اب اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے لہٰذا یہ حکم باقی نہ رہنا چاہیے لیکن یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اول تو احادیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تصاویر صرف شرک و بت پرستی کے خطرے سے بچانے کے لیے حرام کی گئی ہیں۔ دوسرے، یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ اب دنیا میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آج خود برِ عظیم ہندو پاکستان میں کروڑوں بت پرست مشرکین موجود ہیں، دنیا کے مختلف خطوں میں طرح طرح سے شرک ہو رہا ہے، عیسائی اہلِ کتاب بھی حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم اور اپنے متعدد اولیاء کی تصاویر اور مجسموں کو پوج رہے ہیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مخلوق پرستی کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہئیں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں، یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسمے جن کو معبود بنا لیا گیا ہو، باقی دوسری تصویروں اور مجسموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام وارشادات سے قانون اخذ کرنے کی بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک و بت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر ان بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصویر کو دنیا میں شہوانیت پھیلانے کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور آج یہ فتنہ ہر زمانے سے زیادہ عروج پر ہے۔ تصاویر قوموں میں نفرت اور عداوت کے بیج بونے، فساد ڈلوانے اور عام لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کے لیے بھی بکثرت استعمال کی جاتی رہی ہیں اور آج سب سے زیادہ استعمال کی جارہی ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے استیصال کی خاطر دیا ہے، اصلاً غلط ہے۔ شارع نے مطلقاً جاندار اشیاء کی تصویر کو روکا ہے۔ ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے متبع ہیں تو ہمیں علی الاطلاق اس سے رک جانا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی علتِ حکم خود تجویز کر کے اس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں۔

بعض لوگ چند بظاہر بالکل "بے ضرر" قسم کی تصاویر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ آخر ان میں کیا خطرہ ہے، یہ تو شرک اور شہوانیت اور فساد انگیزی اور سیاسی پروپیگنڈے اور ایسے ہی دوسرے مفسدات سے قطعی پاک ہیں، پھر ان کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس معاملہ میں لوگ پھر وہی غلطی کرتے ہیں کہ پہلے علتِ حکم خود تجویز کر لیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ جب فلاں چیز میں یہ علت نہیں پائی جاتی تو وہ کیوں ناجائز ہے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ اسلامی شریعت کے اس قاعدے کو بھی نہیں سمجھتے کہ وہ حلال اور حرام کے درمیان ایسی دھندلی اور مبہم حد بندیاں قائم نہیں

Marfat.com

کرتی جن سے آدمی یہ فیصلہ نہ کرسکتا ہو کہ وہ کہاں تک جواز کی حد میں ہے اور کہاں اس حد کو پار کر گیا ہے بلکہ ایسا واضح خطِ امتیاز کھینچتی ہے جسے ہر شخص روزِ روشن کی طرح دیکھ سکتا ہو۔ تصاویر کے درمیان یہ حد بندی قطعی واضح ہے کہ جانداروں کی تصویریں حرام اور بے جان اشیاء کی تصویریں حلال ہیں۔ اس خطِ امتیاز میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے جسے احکام کی پیروی کرنی ہو وہ صاف صاف جان سکتا ہے کہ اس کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔ لیکن اگر جانداروں کی تصاویر میں سے بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھہرایا جاتا تو دونوں قسم کی تصاویر کی کوئی بڑی سے بڑی فہرست بیان کر دینے کے بعد بھی جواز و عدم جواز کی سرحد کبھی واضح نہ ہو سکتی اور بے شمار تصویروں کے بارے میں یہ اشتباہ باقی رہ جاتا کہ انہیں حد جواز کے اندر سمجھا جائے یا باہر۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے شراب کے بارے میں اسلام کا یہ حکم کہ اس سے قطعی اجتناب کیا جائے ایک صرف حد قائم کر دیتا ہے لیکن اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی اتنی مقدار استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے جس سے نشہ پیدا ہو تو حلال اور حرام کے درمیان کسی جگہ بھی حدِ فاصل قائم نہ کی جا سکتی اور کوئی شخص بھی فیصلہ نہ کر سکتا کہ کس حد تک وہ شراب پی سکتا ہے اور کہاں جا کر اسے رک جانا چاہیے۔

جِفَانٍ وَقُدُوْرٍ کا مفہوم

وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ...... جِفَان، جَفْنَة کی جمع ہے، جس کے معنی لگن کے ہیں۔ اور جواب، جابية کی جمع ہے، اس کے معنی حوض کے ہیں۔ قدور، قِدر کی جمع ہے، بڑی دیگوں کو کہتے ہیں۔ اور ہنڈیوں پر بھی بول دیتے ہیں۔ رٰسِيٰتٍ ویسے تو یہ لفظ پہاڑوں کی صفت کے لیے آتا ہے اور یہاں یہ بڑی بڑی دیگوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اتنی بھاری بھرکم ہوتیں کہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جا سکتی تھیں، ایک ہی جگہ چولہوں پر نصب رہتیں، اور بیک وقت منوں کے حساب سے ان میں کھانا پکتا۔

محاریب اور تماثیل سے تو یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہونے کے ساتھ ساتھ شان و شکوہ اور ہیبت و جبروت کے حامل بادشاہ بھی تھے۔ انہوں نے تمدن کو بلند و بالا عمارتوں اور فنِ تعمیر سے آراستہ کیا تھا۔ لیکن ان میں سے ہر چیز کسی نہ کسی مقصد کو واضح کرنے والی تھی۔ بالخصوص اس بات کو کہ جس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہوتا اور سر اس کے سامنے جھکتے ہیں وہ صرف جھونپڑوں کی بستی نہیں ہوتی بلکہ اس میں ہیبت کے اظہار کا سامان بھی ہوتا ہے۔

اور پھر بڑے بڑے لگن اور دیگوں کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں اس مملکت میں ہیبت و فرمانروائی کی کارفرمائی دکھائی دیتی تھی وہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کا جود و کرم اور داد و دہش بھی نمایاں نظر آتا تھا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کا خوانِ کرم اس قدر وسیع تھا کہ کوئی غریب بھوکا نہیں رہ سکتا اور کسی مہمان کو یہ خیال نہیں ستا سکتا کہ مجھے کھانا کہاں سے ملے گا۔ یہ آپ کی فیاضی اور سخاوت کی ایسی تعبیر تھی جس کی اس دور کی تاریخ قدم قدم پر گواہی دیتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے دور کو صرف سائنس، آرٹ اور دیگر علوم ہی نہیں دیے تھے بلکہ ملک میں ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس میں غرباء پروری کا نہایت وسیع اور فیاضانہ اہتمام بھی تھا۔

Marfat.com

نعمتوں پر شکر لازم ہے

سائنس کی حکمرانی، دولت کی فراوانی اور آرٹ کا ذوق جہاں بے حد تعریف و تحسین کے مستحق ہیں وہیں اس کی حیثیت دودھاری تلوار کی بھی ہے۔ اگر اس کے استعمال میں احتیاط نہ کی جائے اور اسے غلط ہاتھوں میں پہنچنے دیا جائے تو یہی چیزیں تمدنِ صالح کی دشمن ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ اے آلِ داؤد شکر کے انداز میں زندگی گزارو اور عمل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے جو بیشمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں کہیں بہک نہ جانا بلکہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے ہر نعمت کو صحیح محل میں برتنا اور ہر قدم صحیح سمت میں اٹھانا۔ اور آلِ داؤد کے لفظ سے حضرت سلیمان علیہ السلام، ان کی آل اولاد اور ان کے اتباع کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اس طرح کرنا جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کیا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام انہیں کے نقشِ قدم پر چلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ ہیبت اور عزت عطا فرمائی کہ جو ایک مثال بن گئی۔ آئندہ بھی اگر تم اس عظمت وحشمت کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی طرح اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری میں کوتاہی نہ کرنا۔ اور آیت کے آخری جملے میں تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ شکر کی راہ کوئی آسان راہ نہیں۔ اس لیے اس راہ کو آسان نہ لینا بلکہ نہایت فکرمندی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اس کے اثرات کو راسخ کرنے کی کوشش کرنا۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا
خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ؕ ﴿١٤﴾

(پس جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت پر آگاہ نہیں کیا، مگر زمین کے کیڑے نے، جو سلیمان کے عصا کو کھاتا تھا، پس جب وہ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔ ۱۴)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت سے غلط عقائد کی تردید

مشرکینِ مکہ میں عقیدے کی جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ وہ جنات کو غیب دان سمجھتے تھے اور اسی حوالے سے ان سے استمداد کرتے تھے۔ اسی طرح انبیاء و اولیاء کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور جب ان کو مدد کے لیے پکارا جاتا ہے تو وہ مدد کو پہنچتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان دونوں باتوں کی تردید فرمائی ہے۔ اور اس کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے اللہ تعالیٰ کے نبی اور صاحبِ جبروت شخصیت کی موت سے استشہاد کیا ہے۔ ایک طرف ان کا یہ مرتبہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہوائیں ان کے قبضے میں دے رکھی تھیں اور جنات کو ان کا چاکر بنا دیا تھا۔ وہ جیسے چاہتے ہوا سے کام لیتے اور جیسے چاہتے جنوں سے خدمت لیتے تھے۔ اور ایسے جنات جنہیں شیاطین کہنا چاہیے اور جو آپ پر ایمان بھی نہیں رکھتے تھے وہ بھی نہایت ذلت کے ساتھ آپ کے ہر فرمان کی اطاعت پر مجبور تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتنے قریبی تعلق اور غیر معمولی وجاہت و عظمت کے باوجود آپ کو موت کا مزہ چکھنا پڑا۔ اور موت بھی آپ کو اس طرح آئی کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوسکی۔ امیر مینائی نے ٹھیک کہا:

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدؐ مرسل نہ رہے، کون رہے گا

Marfat.com

اور رہا اہلِ عرب کا دوسرا عقیدہ کہ جنات غیب کے جاننے والے ہوتے ہیں، اس کے لیے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت ہی سے استدلال کیا گیا ہے۔ رموت کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے کسی اہم عمارت کی تعمیر پر شیاطین کو لگا رکھا تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام خود اس کی نگرانی فرما رہے تھے۔ کیونکہ جنات کو اور وہ بھی شیاطین کو کسی دوسرے کی نگرانی میں چھوڑنا شاید مسائل کا باعث بنتا ہو۔ اور جنات چونکہ آپ کے لیے مسخر کر دیے گئے تھے اس لیے وہ آپ کی موجودگی میں کسی طرح کی نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ نگرانی کے دوران آنجناب نے عصا پر ٹیک لگا رکھی تھی اور اس کے سہارے کھڑے تھے۔ اسی اثناء میں موت کا وقت آ گیا اور اللہ تعالیٰ کے بلاوے پر آپ نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ لیکن وہ جس طرح عصا کے سہارے کھڑے تھے، اسی طرح بدستور کھڑے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کھڑے ہونے کا انداز اور عصا کی ساخت میں ایسا تناسب تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا۔ جنات نے جب آپ کو کھڑے دیکھا تو وہ بدستور اپنے کام میں لگے رہے۔ حتیٰ کہ ایک عرصہ بیت گیا۔ لیکن یہ کتنا عرصہ ہوگا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس دوران زمین کا کیڑا یعنی دیمک عصا کو کھانے میں لگا رہا۔ واضح رہے کہ جس زمین میں دیمک زیادہ ہوتی ہے وہاں کی کوئی چیز بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہیں رہتی اور وہ بہت جلد اسے مٹی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ چنانچہ دیمک نے تیزی سے عصا کو نیچے سے کھا لیا۔ عصا کے ٹوٹنے سے آپ کا جسدِ مبارک زمین پر آ گرا۔ تب جنات کو اندازہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دنیا میں نہیں رہے۔ اور تمام جاننے والے جنوں کو یقین ہو گیا کہ جنات عالم الغیب نہیں ہوتے۔ ممکن ہے اس سے پہلے وہ اپنے اندر کے بعض جنات کو عالم الغیب سمجھتے ہوں۔ جس طرح انسان بعض انسانوں کو ایسی غیر معمولی صفات سے متصف سمجھتے ہیں۔ اس محیر العقول واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اب انہیں عقیدے کی غلطی کا اچھی طرح احساس ہو گیا۔

جو شخص بھی اس واقعہ کو تدبر کی نگاہ سے دیکھے گا، اسے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ جنات کے بارے میں یہ تصور پایا جاتا تھا کہ وہ غیب جانتے ہیں۔ اور یہ غلط فہمی انسانوں کو بھی جنات کے بارے میں تھی اور خود جنات میں بھی بعض جنات کے حوالے سے ایسا ہی تصور پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کی تردید کے لیے اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ بعض لوگ جنوں سے وہ سرحدی قبائل مراد لیتے ہیں جنہیں طاقت کے زور سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنا مطیع بنا رکھا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا مشرکین ان قبائل کو عالم الغیب سمجھتے تھے یا خود ان قبائل میں سے کسی نے غیب دان ہونے کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ جب ایسی کوئی بات نہ تھی تو پھر قرآنِ کریم کے الفاظ سے اپنے مطلب کی بات نکالنے کے سوا اور اس کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ ۚ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿15﴾

(اہلِ سبا کے لیے ان کے اپنے ہی مسکن میں ایک بہت بڑی نشانی موجود تھی، دو باغ دائیں اور بائیں، کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر بجا لاؤ، ملک عمدہ اور شاداب اور پروردگار بخشنے والا۔ ۱۵)

Marfat.com

کفرانِ نعمت کا انجام تاریخ سبا کے حوالے سے

اس سورۃ میں اصل زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ شکر وہ صفت ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف لے جاتی ہے اور وہ اپنے مقصدِ زندگی سے منحرف نہیں ہوتا۔ اور کفر دل و دماغ کا وہ فساد ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی بندگی سے دور اور مقصدِ انسانیت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور آخرت سے انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ شکر کے حوالے سے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی تاریخ سے استدلال کیا گیا ہے۔ اور ناشکری اور کفرانِ نعمت کے حوالے سے قومِ سبا کی تاریخ بیان کی جا رہی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم کفرانِ نعمت کا رویہ اپنا لیتی ہے تو اس کے عقیدہ و عمل میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو آخر کار اسے تباہی تک پہنچا دیتی ہیں۔ قوم سبا کی مثال اسی حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ سبا ایک شہر کا نام بھی ہے اور اس میں بسنے والی قوم بھی اسی نام سے معروف تھی۔ یہ قوم جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی جس کا دارالحکومت مآرب موجودہ یمن کے دارالسلطنت صنعا سے پچپن میل بجانب شمال واقع تھا۔ ایک ہزار سال تک یہ قوم عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ عرب میں یمن اور حضرموت اور افریقہ میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔ یونانی مؤرخین اسے دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم کہتے ہیں۔ تجارت کے علاوہ ان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظام آبپاشی قائم کر رکھا تھا۔ اس کی اصل شاہراہ کے دونوں جانب نہایت شاداب باغوں کا سلسلہ تھا جو پورے علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ اسی کو اس آیتِ کریمہ میں دائیں بائیں دو باغوں سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی شاہراہ کے دائیں بائیں باغوں کے سلسلے تھے۔

علامہ قزوینی نے آثار البلاد میں سبا کو ایک شہر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ شہر سبا بن یشحب بن قحطان نے آباد کیا تھا۔ یہ شہر دفاعی لحاظ سے بہت مستحکم اور گنجان آباد تھا۔ اس کی ہوا بڑی پاکیزہ اور پانی بڑا میٹھا تھا۔ اردگرد پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ بارش ہوتی تو پانی بہہ کر ریگستان میں ضائع ہو جاتا۔ ملکہ بلقیس کے عہدِ حکومت میں دو پہاڑوں کے درمیان ایک زبردست بند تعمیر کیا گیا اور پانی کے اس طرح کے ذخائر اس ملک کی زرعی ترقی کا بہت بڑا سبب تھے۔ اس کی سرسبزی و شادابی اور خوشحالی اور فارغ البالی وہ چیز ہے جسے یہاں آیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان تھا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کا حق جس طرح ادا ہونا چاہیے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنے رب کا رزق کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم خوانِ کرم جو تمہارے لیے بچھایا گیا ہے اور جس سے تم بہرہ مند ہوتے ہو، وہ تقاضا کرتا ہے کہ ہمیشہ اس خوانِ کریم کے بچھانے والے کے شکر گزار رہو۔ مزید فرمایا کہ اس خوانِ کرم کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے نہایت سرسبز و شاداب ملک عطا فرمایا ہے۔ تم اس کی سرسبزی و شادابی اور خوشحالی سے خوب متمتع ہو رہے ہو۔ یقیناً اس میں قدم قدم پر کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ کتنا ستار اور غفار ہے کہ بغیر کسی استحقاق کے وہ تم پر مسلسل انعامات کی بارش کرتا چلا جا رہا ہے۔ ایک طرف اس کی عطا و بخشش اور دوسری طرف اس کا فضل و احسان اور ستاری و غفاری نہایت ہوشمندی اور فکرمندی کے ساتھ ادائے شکر کا تقاضا کر رہی ہیں۔

Marfat.com

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ
اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿١٦﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا
وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿١٧﴾

(پس انہوں نے اعراض کیا اور سرتابی کی، تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے باغوں کو دو ایسے باغوں سے بدل دیا جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت اور بیری کی کچھ جھاڑیاں رہ گئیں۔ ۱۶) یہ ہم نے ان کو ان کی ناشکری کا بدلہ دیا، اور ناشکرے انسان کے سوا ہم ایسا بدلہ کسی اور کو نہیں دیتے۔ ۱۷)

مشکل الفاظ کی تشریح:۔

عَرِم کے معنی اہلِ لغت نے زوردار بارش کے بھی لکھے ہیں اور تہ بہ تہ اکٹھے کیے ہوئے پتھروں کے بھی۔ لیکن بند کے معنی میں اس کا استعمال عام ہے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ جنوبی عرب کی زبان کے لفظ عرمن سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بند کے ہیں۔ یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے ایک کتبہ سدِ مآرب کی مرمت کرانے کے بعد نصب کرایا، اس میں وہ اس لفظ کو بار بار بند کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ اس لحاظ سے سیل العرم سے مراد وہ سیلاب ہے جو کسی بند کے ٹوٹنے سے آئے۔

خَمْطٍ بدمزہ اور کڑوے کسیلے پھلوں کو کہتے ہیں۔

اَثْلٍ جھاؤ۔ سِدْرٍ جھاڑیوں کو کہتے ہیں۔

ناشکری کا انجام

اہلِ سبا اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کی قدر کرنے کی بجائے جب کفرانِ نعمت کرنے لگے اور طغیان و فساد میں بھی مبتلا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب بھیج دیا۔ ایسا عظیم سیلاب آیا کہ اس نے سدِ مآرب کو توڑ دیا۔ بند سے جو نہریں نکالی گئی تھیں، بند کے ٹوٹنے سے وہ سب ختم ہو گئیں اور آبپاشی کا پورا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ اور اس کے نتیجے میں وہی ملک جو کبھی جنت نظیر بنا ہوا تھا تاراج ہو کر رہ گیا۔ باغات تباہ ہو گئے اور سارا علاقہ خودرو جنگلی درختوں سے بھر گیا۔ شاداب باغوں کی جگہ کڑوے کسیلے پھلوں کے کچھ درخت اور کچھ جھاؤ اور بیری کی جھاڑیاں رہ گئیں۔ ایسا لگتا ہے کہ سیلاب نے پورے علاقے کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ زرخیز مٹی تباہ ہو گئی اور اس پر ایسی مٹی یا ریت کی تہ جم گئی جس نے بچے کھچے درختوں کے مزاج بھی بدل دیے۔ اور آخر میں فرمایا کہ یہ سب کچھ ہم نے ان کے ساتھ اس لیے کیا کہ یہ ان کے کفرانِ نعمت اور ناشکری کا بدلہ تھا۔ ایسی تباہ کن سزا ہم صرف ناشکروں ہی کو دیا کرتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ
سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿١٨﴾

Marfat.com

(اور ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان جن کو ہم نے برکت دی تھی نمایاں بستیاں آباد کی تھیں اور ان بستیوں کے درمیان سفر کی منزلیں ٹھہرادی تھیں، چلو پھرو ان بستیوں میں رات دن بے خوف وخطر۔ ۱۸)

اہلِ سبا پر انعاماتِ الٰہی کی مزید تفصیل

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ملکِ سبا کو اندرونی طور پر زرخیز اور شاداب بنایا تھا اور جس کی وجہ سے اہلِ ملک دولت وثروت میں کھیلتے تھے اور ان کی شاہراہِ عام کے دونوں طرف باغات کا ایسا سلسلہ تھا کہ کہیں ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اسی طرح ان کے پڑوسی ممالک کے ساتھ ایسے قریبی تعلقات تھے کہ باہمی اتصال اور پیوستگی کی وجہ سے کہیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اور ان کے پڑوسی ملک شام وفلسطین وغیرہ تھے جو ان ہی کی طرح نہایت زرخیز ملک تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص ان کو زرخیزی اور شادابی کی برکتوں سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اور قرآنِ کریم انہیں عموماً ''برکت والی بستیوں'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔

جو شاہراہ سبا سے ملکِ شام اور فلسطین کی طرف جاتی تھی اس شاہراہ پر موزوں فاصلوں پر بڑی بڑی بستیاں آباد تھیں اور ان کے درمیان فاصلہ اتنی موزوں مسافت کے ساتھ تھا کہ جیسے ناپ کر ٹھہرنے کے لیے پڑاؤ بنائے گئے ہوں۔ اور یہی بستیاں مسافروں کے لیے منزلوں کا کام دیتی تھیں۔ ایک بستی کے آثار ختم ہونے کے بعد دوسری بستی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔ چونکہ یہ بستیاں شاہراہِ عام پر تھیں اس لیے انہیں نمایاں بستیاں کہا گیا ہے۔ اور یا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی وسعت اور آنے جانے والوں کی ہر طرح کی ضروریات پوری کرنے کی وجہ سے ایسی شہرت رکھتی تھیں کہ ہر گزرنے والا ان بستیوں سے آگاہ تھا۔ اور مزید یہ کہ بستیوں کے باہم ایک دوسرے سے پیوست ہونے کی وجہ سے اور یا ان کی رفاہیت وثروت کی وجہ سے راستے پر امن تھے۔ آنے جانے والوں کو راستے میں لٹ جانے یا کسی اور نقصان سے دوچار ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ اور لوگ بے خوف وخطر ان بستیوں کے درمیان سفر کرتے تھے۔ اس صورتحال کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جس نے انہیں زرخیز وشاداب ملک دیے، دولت وثروت سے نوازا، امن وآشتی کی دولت عطا فرمائی اور ان ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم ہوئے جنہیں قدرت نے بہت برکتیں دے رکھی تھیں۔ لیکن انہوں نے ناشکری کا راستہ اختیار کیا، کفرانِ نعمت کو اپنا طرزِ عمل بنالیا، انہیں آسائشیں اور رفاہتیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی تھیں۔ لیکن انہوں نے اسے اپنے دست وبازو اور ذہنی کاوشوں کا نتیجہ سمجھا۔ اور ایسی سرکشی اور تمرد کا شکار ہوئے کہ ان کا ایک ایک کام اور ایک ایک حرکت زبانِ حال سے بولنے لگی کہ وہ ان نعمتوں کے فی الواقع سزاوار نہیں۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

(مگر انہوں نے کہا، اے ہمارے رب! ہمارے سفروں میں دوری پیدا کردے، اور انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، تو ہم نے ان کو افسانہ بنادیا، اور انہیں بالکل تتر بتر کرڈالا۔ یقیناً اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے، شکر کرنے والے کے لیے۔ ۱۹)

Marfat.com

اہلِ سبا کا اپنے آپ پر ظلم اور اس کا انجام

ان کے طور اطوار سے ظاہر ہونے لگا کہ جیسے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے ہیں کہ وہ ان نعمتوں کے سزاوار نہیں ہیں، بلکہ وہ تو اس قابل ہیں کہ ان کی بستیاں ویران ہو جائیں، ان کی منزلیں کٹھن ہو جائیں اور ان کی یہ ساری رفاہیتیں چھین لی جائیں۔ انہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، دولت و ثروت اور آسائش و رفاہیت کا عام طور پر یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ جامۂ انسانیت کو تار تار کر دیتے ہیں، حیوانوں کی طرح ہر بندھن سے آزاد اور اخلاق کی ہر قدر کو پامال کرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں اور یہی وہ طرزِ عمل ہے جس کو قرآنِ کریم اپنے اوپر ظلم قرار دیتا ہے۔ اہلِ سبا نے بھی اپنے اوپر ایسا ہی ظلم کیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ان پر عذاب آیا اور وہ قوم جو صدیوں سے دولت و ثروت اور عزت و افتخار کے حوالے سے جانی جاتی تھی، قصۂ پارینہ بن کے رہ گئی۔ ان کے کارنامے کہانیوں میں تبدیل ہو گئے، ان کے حقائق افسانوں میں بدل گئے۔ سدِ مآرب کے ٹوٹنے سے ان کی زرخیزی ویرانی میں تبدیل ہوئی اور ان کی دولت و ثروت فقر و فاقہ میں ڈھل گئی۔ اس طرح سے زندگی کے امکانات کم ہونے کی وجہ سے لوگ اپنے شہروں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ اور جہاں کسی کا سینگ سمایا وہاں چلا گیا۔ مختلف قبیلے عرب کے مختلف علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ غسانیوں نے اردن اور شام کا رخ کیا۔ اوس و خزرج کے قبیلے یثرب میں جا بسے۔ خزاعہ نے جدہ کے تہامہ کے علاقے میں سکونت اختیار کی۔ حتیٰ کہ سبا نام کی کوئی قوم دنیا میں باقی نہ رہی، صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اس طرح انہیں تتر بتر کر ڈالا اور وہ بالکل پراگندہ ہو کر رہ گئے۔

آخر میں فرمایا کہ اس سرگزشت میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لیے۔ صبار، صابر سے اسمِ مبالغہ ہے، بہت صبر کرنے والا۔ اور شکور اسمِ صفت ہے، مسلسل شکر ادا کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کا شکر وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اپنے اوپر بہت قابو رکھنے والا اور خواہشاتِ نفسانی کے مقابلے میں انتہا درجے کا ثابت قدم ہو۔ اور یہ کیفیت اس شخص میں پیدا ہوتی ہے جسے شدت سے اس بات کا احساس ہو کہ میرے پاس جو کچھ ہے یہ میرا اپنا نہیں، اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ یہ مال و دولت، جسمانی توانائیاں اور دل و دماغ کی رعنائیاں سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، وہی ان کا مالک ہے، میرے پاس اس کی امانت ہے۔ جو اس تصور کو کبھی گدلا نہ ہونے دے اور کبھی اس کی پاکیزگی میں تکدر پیدا نہ ہونے دے اور بڑی سے بڑی خواہش اور دباؤ کبھی اس میں شکست و ریخت کا سبب نہ بن سکیں، وہی حقیقت میں صبر کی قوت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر اور شکر دونوں توأم ہیں۔ یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔ جس کے اندر صبر نہ ہو وہ شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اور جس کے اندر شکر نہ ہو وہ صبر نہیں کر سکتا۔ زندگی میں قدم قدم پر بندے کا انہی دونوں صفات کے حوالے سے امتحان جاری رہتا ہے اور اس امتحان میں سرخروئی کے نتیجے میں دنیوی آسودگی ملتی ہے اور آخرت میں کامیابی کی دولت عطا ہوتی ہے۔ تو جو شخص صبر اور شکر کی دولت سے اپنے آپ کو ہمکنار کرنا چاہتا ہے اس کے نزدیک اہلِ سبا کی داستان میں بہت سی نشانیاں ہیں جن سے وہ سبق سیکھ سکتا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾

(اور ابلیس نے ان کے اوپر اپنا گمان سچ کر دکھایا، پس انہوں نے اس کی پیروی کی، بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھا۔ ۲۰)

Marfat.com

ناشکری شیطان کی امیدوں کو پورا کرنا ہے

یہ دنیا انسان کے لیے دارالامتحان ہے۔ کبھی وہ خوشحالیاں دے کر آزماتا ہے کہ انسان شکر کرتا ہے یا نہیں۔ اور کبھی مصیبتوں میں مبتلا کر کے امتحان لیتا ہے کہ وہ صبر کرتا ہے یا بے صبر ہو جاتا ہے۔ ابلیس نے اس امتحان کے شروع ہونے سے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ یہی وہ راستہ ہے جس میں انسانوں کو راہِ راست سے ہٹانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے مہلت لینے کے بعد اس نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور یہ کہنے کی جرأت کی تھی کہ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ "پھر میں اولادِ آدم کے سامنے سے آؤں گا اور ان کے پیچھے سے آؤں گا اور ان کے دائیں سے آؤں گا اور ان کے بائیں سے آؤں گا اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر ادا کرنے والا نہیں پائے گا۔" ابلیس نے اپنی وسوسہ اندازی کے نتیجے میں جس کامیابی کی امید باندھی تھی اہلِ سبا نے اس کی امید کو پورا کر دیا۔ اس لیے اس کے بہکاوے کے نتیجے میں وہ بجائے شکر کے کفرانِ نعمت کے راستے پر چل نکلے اور صبر و شکر کا سہارا ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ جب شیطان نے پروردگار سے یہ بات کہی تھی تو پروردگار نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ جو تیری پیروی کریں گے خواہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے، میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا۔ جہنم سے بچنے والے صرف وہ ہوں گے جو ابلیس کے بہکاووں کے باوجود صبر و شکر کی تصویر بنے رہیں گے اور جو اس کی پیروی کریں گے وہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوں گے اور آخرت میں بھی۔ چنانچہ اہلِ سبا کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اجتماعی زندگی کو دنیا ہی میں انتشار کی سزا دی۔ اور اپنی ایک ایک نعمت ان سے چھین لی۔ اور آخرت میں ان میں سے ایک ایک فرد جہنم میں ڈالا جائے گا۔ البتہ ان میں صرف ایک مختصر سا گروہ دنیا کے عذاب سے بھی بچا رہا اور آخرت میں بھی سرخرو ہوگا۔ یہ وہ گروہ ہے جو ایمان کی دولت سے بہرہ ور رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اہلِ سبا کی طرف بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رسول بھیجا تھا، اس آیت میں اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اکثریت نے اس رسول کی تکذیب کی۔ البتہ ایک مختصر تعداد اس رسول پر ایمان لائی اور وہی اپنی قوم پر آنے والے عذاب سے محفوظ رہی۔

وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَیْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا
فِیْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ۠ (۲۱)

(اور ابلیس کو ان پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر یہ کہ ہم ممیز کر دیں ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ان لوگوں سے جو اس کی بابت شک میں ہیں، اور آپ کا رب ہر چیز پر نگران ہے۔ ۲۱)

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیتِ کریمہ میں برسرِ موقع ایک شبہ کا ازالہ فرمایا گیا ہے۔ شبہ یہ ہو سکتا تھا کہ شیطان نے جس اعتماد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کی بات کی اور کامیابی کی امید کا اظہار بھی کیا، اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ شاید اسے اس بات کا اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جب چاہے انسانوں کو گمراہ کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر گمراہ ہونے والے کو سزا کیوں ملتی ہے؟ اس کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے شیطان کو ایسا اختیار یا اقتدار ہرگز نہیں دیا کہ وہ کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف زبردستی کسی غلط راستے پر ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ نے

Marfat.com

صرف اسے وسوسہ اندازی کرنے اور بہکانے کی مہلت دی ہے۔ اور یہ مہلت اس کو اس لیے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا امتحان کرنا چاہتا ہے کہ کون شخص ہے جو آخرت پر ایسا مضبوط ایمان رکھتا ہے کہ شیطان کی تمام ترغیبات اور تزویرات کے باوجود اس کے عقیدۂ آخرت میں اضمحلال پیدا نہیں ہوتا اور وہ کبھی جادۂ حق سے منحرف نہیں ہوتا۔ اور وہ کون شخص ہے جو اس کے بہکانے سے اس کی راہ پر لگ جاتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ بلاشبہ انسان عرصۂ امتحان میں ہے اور ابلیسی قوتیں ہر قدم پر انسان کو بہکانے میں لگی ہوئی ہیں اور اس امتحان میں کامیابی پر دنیوی اور اخروی کامیابی کا انحصار ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور شیطان کو اس رزم گاہ میں اتار کر انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا ہے اور خود الگ ہو کر بیٹھ گیا ہے بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ پروردگار مسلسل دونوں کی نگرانی کر رہا ہے۔ شیطان ہر کوشش کو بروئے کار لانا چاہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت اسے حدود سے متجاوز نہیں ہونے دیتی۔ اور انسان جب بھی اس کی تزویراتی کوششوں کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے آپہنچتی ہے۔ وہ اخلاص سے اس راستے میں جو بھی قدم اٹھاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے۔ اور آخرت میں اس کی انہیں مساعی کا بھرپور صلہ عطا فرمائے گا۔ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے مہلت ضرور دی ہے لیکن اسے اس قدر طاقت عطا نہیں فرمائی کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ ہر چیز کا جائزہ لیتی ہے اور اس کی بنائی ہوئی دنیا میں رحمت و عدل ہمیشہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنے عمل سے اپنی طرف متوجہ کرلیں تو سایۂ عدل خود بخود ان کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ
زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ
وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ
مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى
اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ
الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ
اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ
لَّا تُسْــَٔــلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْــَٔــلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ

Marfat.com

بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾ قُلْ
اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً
وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾

رکوع: ۳۔ (اے پیغمبر آپ کہیے تم ان کو پکارو جن کو تم اللہ کے سوا اپنے معبود گمان کرتے ہو، وہ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں، اور نہ ان دونوں میں ان کا کوئی ساجھا ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ ۲۲) اور اس کے ہاں شفاعت کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ اجازت دے دے یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جائے گی تو وہ پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا حکم فرمایا، وہ جواب دیں گے کہ بالکل حق ارشاد ہوا اور وہ بزرگ و برتر ہے۔ ۲۳) اے نبی ان سے پوچھئے تم کو آسمانوں اور زمین میں کون رزق دیتا ہے، کہیے، اللہ! اور ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے، یا کھلی گمراہی میں۔ ۲۴) کہہ دیجیے، جو جرم ہم نے کیے ہیں تم سے ان کی بابت نہیں پوچھا جائے گا، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی بابت ہم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ ۲۵) کہہ دیجیے، ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا، اور وہی فیصلہ فرمانے والا اور علم والا ہے۔ ۲۶) کہیے، ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی ان ہستیوں کو جنہیں تم نے شریک بنا کر اس کے ساتھ جوڑ رکھا ہے، ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ۲۷) اور اے پیغمبر! ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ۲۸) اور یہ لوگ کہتے ہیں وہ وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو۔ ۲۹) اے پیغمبر کہہ دیجیے کہ تمہارے لیے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس سے نہ تم ایک گھڑی پیچھے ہٹو گے اور نہ آگے بڑھو گے۔ ۳۰)

Marfat.com

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾

(اے پیغمبر آپ کہیے تم ان کو پکارو جن کو تم اللہ کے سوا اپنے معبود گمان کرتے ہو، وہ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں، اور نہ ان دونوں میں ان کا کوئی ساجھا ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ ۲۲)

شرک پر کاری ضرب

گزشتہ آیات میں آخرت سے متعلق مشرکین کے غلط تصورات پر تنقید کی گئی ہے۔ آخرت کے انکار کا دارومدار جن تصورات پر تھا ان میں سے بنیادی تصور یہ تھا کہ اولاً تو قیامت کے آنے کا کوئی امکان نہیں، اور اگر وہ آ ہی گئی تو ہم نے جن قوتوں کو اس کا شریک بنا رکھا ہے اور جن کی ہم بندگی اور پرستش بجالاتے ہیں وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھڑالیں گی۔ چنانچہ اس تصور کے ابطال کے لیے آنحضرت ﷺ سے کہا گیا کہ آپ ان سے کہیے کہ تم نے جنہیں اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتنی صفات تم نے ان کی طرف منسوب کر رکھی ہیں، ذرا انہیں بلاؤ ہم بھی ان کی صورت دیکھیں اور ان کی حیثیت کو جانیں۔ کیونکہ تم نے گزشتہ رکوعوں میں پڑھا ہے کہ ایک خدا تو وہ ہے جو اقوام اور حکمرانوں کی قسمتیں بناتا اور بگاڑتا ہے۔ جیسا کہ تم نے دیکھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام غربت اور گمنامی سے نکلے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسا عروج بخشا۔ اور ان کے صاحبزادے کو وہ حکومت اور طاقت عطا فرمائی جو کسی اور کو نہ مل سکی۔ لیکن تم اس خدا کے مقابلے میں جنہیں اپنا معبود سمجھتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں تم اسے شریک کرتے ہو، ذرا ہم بھی تو دیکھیں کہ ان کی طاقت اور عظمت کا حال کیا ہے۔ کیونکہ تم یہ جانتے ہو کہ اس کائنات میں ایک ذرہ برابر جگہ بھی ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی ملکیت ہو، جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور نے خلق کیا ہو اور جس کا ثبات وقرار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔ اسی طرح تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس کائنات کی تخلیق میں کسی کا کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی تنہا اس کا خالق و مالک ہے اور یہ بات بھی تم سے مخفی نہیں کہ زمین و آسمان کے انتظام و انصرام میں اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی کو اپنا معین و مددگار نہیں بنایا۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ ان تمام اعترافات کے باوجود تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو معبود بناتے ہو۔ تمہارا یہ وہم کہ زمین چونکہ اللہ تعالیٰ کی مملکت کا ایک دور دراز گوشہ ہے اس وجہ سے اس کا انتظام اس نے اپنے شریکوں کے سپرد کر رکھا ہے، اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ کیونکہ زمین پر جو بھی تبدیلی آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آتی ہے۔ زندگی اور موت اس کے قبضے میں ہے، ہر مخلوق کا روزی رساں اس کے سوا کوئی نہیں۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾

(اور اس کے ہاں شفاعت کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ اجازت دے دے یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جائے گی تو وہ پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا حکم فرمایا، وہ جواب دیں گے کہ بالکل حق ارشاد ہوا اور وہ بزرگ و برتر ہے۔ ۲۳)

Marfat.com

غلط تصورِ شفاعت کی نفی

سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ کائنات میں کسی چیز کا مالک ہونا اور کسی اختیار میں شریک ہونا اور کائنات کے انتظام و انصرام میں معین اور مددگار رہونا یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو اتنا سا اختیار بھی رکھتی ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے۔ تم جن مزعومہ معبودوں کے بل بوتے پر نچنت بیٹھے ہو کہ ان کی شفاعت تمہیں ہر صورت میں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچالے گی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو اتنی عظیم ہے کہ کوئی اس کی اجازت کے بغیر سفارش کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ کوئی یہ تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں سے کچھ بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ اگر کسی بات پر اڑ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی بات کو سمجھانے کے لیے یہاں قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے کہ جب لوگ گھبرا کر انبیائے کرام اور دیگر مقربینِ بارگاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کریں گے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری سفارش کریں تو وہ نہایت ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اذنِ شفاعت طلب کریں گے۔ اور جواب آنے تک نہایت لرزاں اور ترساں حالت میں جواب کے منتظر کھڑے رہیں گے۔ دھڑکا اس بات کا ہوگا کہ کہیں اس اذن طلبی پر عتاب نازل نہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ اوپر سے جب اذنِ شفاعت ملے گا تو ان کے چہروں پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ جائے گی۔ مشفوع شافع کے چہرے کے اطمینان کو دیکھ کر پوچھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا جواب ملا۔ تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ٹھیک بات ارشاد فرمائی ہے۔ یعنی ادھر سے جو بھی جواب ملتا ہے وہ ٹھیک ہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے شفاعت کی اجازت دے دی ہے۔ اور وہ ذات اتنی عظیم اور بزرگ و برتر ہے کہ نہ اس کے حضور زبان کھولی جا سکتی ہے اور نہ کوئی ایسی بات کہی جا سکتی ہے جو امر واقعہ کے خلاف یا خلافِ حق ہو۔ لیکن مشرکین عجیب خیالِ خام میں مبتلاء ہیں کہ نہ انہیں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اندازہ ہے نہ اس کے دربار کی عظمت کا احساس ہے۔ وہ غلط عقیدۂ شفاعت پر بھروسہ کر کے اپنی آخرت کو تباہ کر رہے ہیں۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

(اے نبی ان سے پوچھیے تم کو آسمانوں اور زمین میں کون رزق دیتا ہے، کہیے، اللہ! اور ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے، یا کھلی گمراہی میں۔ ۲۴)

قول و عمل کے تضاد سے استدلال

ہم اس سے پہلے قرآنِ کریم میں متعدد مواقع پر اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ مشرکین اپنی تمام تر گمراہیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کو کائنات کا خالق مانتے تھے۔ اور رزق چونکہ صفتِ خلق ہی کا ایک ظہور ہے اس لیے وہ رازق بھی اللہ تعالیٰ ہی کو تسلیم کرتے تھے۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ رزق میں اضافے اور برکت کے لیے غیر اللہ سے استمداد کرتے تھے۔ کاروبار میں بہتری کے لیے بتوں پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ ان کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے قرآنِ کریم میں جابجا ایک تو رازق کے بارے میں سوال کے ذریعے ان کے مافی الضمیر

Marfat.com

کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور جس عقیدے کا وہ زبان سے اظہار کرتے ہیں اس عقیدے کو ان کا عمل بنانے کی ترغیب دی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تصور دیا ہے کہ تمہارا رزق زمین سے اگتا ہے۔ زمین کی آبیاری جس پانی سے ہوتی ہے وہ آسمان سے اترتا ہے۔ بادل جس بھاپ سے بنتے ہیں وہ بھاپ سورج کی کرنوں سے فضا تک پہنچتی ہے۔ تمہارا غلہ جس گرمی سے پکتا ہے وہ سورج مہیا کرتا ہے۔ تمہارے غلے میں گداز اور پھلوں میں مٹھاس چاند کی حلاوت سے پیدا ہوتی ہے اور یہ تمام اسباب وذرائع اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیے ہیں اور اسی نے ان میں تخالف کے باوجود توافق اور سازگاری پیدا فرمائی ہے۔ یہ پورا نظام اور اس کی کارفرمائی جس طرح اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے پر دلیل ہے اسی طرح اس کے رزاق ہونے پر بھی حجت ہے۔ اس پس منظر میں ان سے سوال کیا گیا کہ بتاؤ تمہارا رازق کون ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رازق قرار دیتے ہیں تو یہ بات ان کے اپنے عقیدے اور اپنے اظہار کے خلاف ہے۔ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے رزاق ہونے کا اقرار کرتے ہیں تو پھر ان کا اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ربوبیت کے بارے میں جو طرزِ عمل ہے وہ ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس صورتحال کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے خاموشی کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ آپ کہیں کہ اللہ ہی ہمیں رزق دینے والا ہے۔

اصل حقیقت کا اظہار اور مشرکین کی طرف سے کامل خاموشی نے جانبین کے طرزِ عمل کا تعین کر دیا۔ یعنی آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا خالق بھی ہے اور رزاق بھی تو اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ اس کی بندگی اور پرستش اور اسی کی غیر مشروط اطاعت کی جائے۔ کیونکہ یہ بات کسی طرح بھی قرینِ صواب نہیں کہ خالق و رازق تو اللہ تعالیٰ ہو، اور پوجے دوسرے جائیں اور اطاعت دوسروں کی، کی جائے۔ اور مشرکین کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق و رازق بھی مانتے ہیں لیکن اس کی پرستش اور اطاعت میں دوسروں کو شریک بھی کرتے ہیں۔ جن میں نہ صفتِ تخلیق پائی جاتی ہے اور نہ وہ رزق رسانی پر قادر ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں انہیں کسی طرح کی بھی حیثیت حاصل نہیں۔ یہ دو طرزِ عمل ہیں جن میں سے یقیناً ایک صحیح ہے اور ایک غلط ہے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ متضاد طرزِ عمل دونوں ہی صحیح ہوں۔ جن میں سے ایک کی بنیاد توحید پر ہے اور دوسرے کی شرک پر۔ اس لیے اس آیتِ مبارکہ میں بجائے اس کے کہ مشرکین کو غلط اور گمراہ کہہ کر اپنی بات کا اثبات کیا جائے اور اس طرح سے ان کے اندر ایک ضد پیدا کر دی جائے اور وہ حقیقتِ اسلام سے اور دور چلے جائیں۔ اس کی بجائے دونوں طرح کے طرزِ عمل سامنے رکھ کر فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ تم خود فیصلہ کرو کہ ان میں سے صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ اور جب غیر جانبدار ہو کے سوچو گے تو تم خود اس نتیجے پر پہنچو گے کہ جو ذات خالق بھی ہے اور رازق بھی، بندگی اور پرستش، محبت اور غیر مشروط اطاعت اسی کو زیب دیتی ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

(کہہ دیجیے، جو جرم ہم نے کیے ہیں تم سے ان کی بابت نہیں پوچھا جائے گا، اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی بابت ہم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ ۲۵)

Marfat.com

احساسِ فکرمندی کی انگیخت

گزشتہ آیت میں فکرمندی کے جس پہلو کو ابھارا گیا تھا کہ اپنے طرزِ عمل کے اعتبار سے ہم اور تم دو گروہ ہیں جن میں سے ایک ہی حق پر ہے۔ اسی احساس کو مزید اجاگر کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ ہم دونوں گروہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے لیے پیش کیے جائیں گے۔ اور ہم میں سے ہر ایک کو جواب اپنے طرزِ عمل کا دینا ہوگا۔ اس لیے بجائے اس کے کہ ہم دوسروں پر تنقید میں وقت ضائع کریں۔ اپنے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ کیونکہ آخرت میں ہم سے آپ کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا کہ آپ نے دنیا میں کیا کیا۔ اور نہ آپ سے ہمارے بارے میں پوچھا جائے گا کہ ہم دنیا میں کیا کرتے رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک سے سوال اس کے اپنے اعمال کے حوالے سے ہوگا۔ اس لیے فکرمندی کے احساس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے افکار و کردار کی تطہیر اور اس کی جواب دہی کی فکر کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسروں پر تنقید اور اپنے اعمال سے تغافل آخرت میں نقصان کا باعث بنے۔ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کی بعثت کے باعث ہم پر حق کو پہنچانے کی جو ذمہ داری تھی وہ ہم نے ادا کر دی ہے۔ اس کے بعد بحث و جدال ایک فضول مشق ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ اپنی راہ چلتے رہیں، ہم اپنی راہ چلیں گے۔ قیامت کے دن فیصلہ ہو جائے گا کہ حق پر کون ہے۔ یہ ایک طرح سے اظہارِ بیزاری ہے، اظہارِ رواداری نہیں۔ اس طرح سے مخاطب پر اتمامِ حجت ہو جاتا ہے۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿٢٦﴾

(کہہ دیجیے، ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان ٹھیک فیصلہ کر دے گا، اور وہی فیصلہ فرمانے والا اور علم والا ہے۔ ۲۶)

بات کو منطقی انجام تک پہنچاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر تم ہماری بات ماننے کو تیار نہیں ہو تو نہ مانو، لیکن یہ بات کبھی نہ بھولو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان حق و باطل کا اختلاف ہے، کوئی معمولی اختلاف نہیں۔ اور یہ بات طے ہے کہ ہم میں سے ایک حق پر ہے اور دوسرا باطل پر۔ آج اگر اس کا فیصلہ ہوتا نظر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن لائے گا جس میں وہ ہم سب کو حاضر کرے گا۔ اس دن وہ فیصلہ کرے گا کہ ہم میں سے کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ اور ہمارے رب کی شان یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھنے والا ہے، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ وہ ہمارے طرزِ عمل کا فیصلہ بھی کرے گا اور ہماری نیتوں کے پیچ بھی کھولے گا۔

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٧﴾

(کہیے، ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی ان ہستیوں کو جنہیں تم نے شریک بنا کر اس کے ساتھ جوڑ رکھا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ۲۷)

Marfat.com

سابقہ سوال نئے اسلوب میں

اس رکوع کے آغاز میں جو بات فرمائی گئی تھی اسی کا دوسرے اسلوب میں اعادہ کیا گیا ہے۔ البتہ اس کا انداز طنز وتحقیر اور تہدید ووعید کا ہے۔ یعنی تم نے گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی شانیں دیکھی ہیں، اس کی کبریائی اور عظمتوں کے حوالے پڑھے ہیں اور اس کے بے شمار احسانات کا تذکرہ سنا ہے۔ ایسی باتوں کے بعد اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ لیکن تم ہو کہ تم نے بعض قوتوں کو شریک کے طور پر اس کے ساتھ چپکا رکھا ہے۔ ہمیں دکھاؤ تو سہی کہ ایسی کون سی عظیم ہستیاں ہیں جنہیں دیکھ کر اور محسوس کر کے ان پر خدا ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

ہرگز نہیں! اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی دوسرے کا تصور بھی ناممکن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کا صحیح ادراک نصیب نہیں ہوسکا۔ اور کچھ نہیں تو ان دو صفات پر مراقبہ کرو کہ وہ عزیز ہے اور حکیم ہے۔ وہ سب کی رسائی سے بالاتر اور ہر چیز پر غالب ومقتدر ہے۔ اسی طرح اس کا ہر فعل اپنے اندر غایت وحکمت کا خزانہ رکھتا ہے۔ اور کائنات کا گوشہ گوشہ اس کی ان صفات پر گواہ ہے، اس کی ہر مخلوق اس کی صفتِ تخلیق کی بے پناہی پر دلالت کرتی ہے۔ کائنات میں ہونے والے تغیرات اس کے بے لاگ عدل اور بے پناہ قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کائنات کے حُسن وقبح اور بقاء وفنا کے فیصلے اس کی حکمت کی گہرائیوں کی گواہی دیتے ہیں۔ اگر انہیں ان دو صفات کی حقیقتوں کا بھی ادراک ہوتا تو یہ کبھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنانے کی حماقت نہ کرتے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

(اور اے پیغمبر! ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ۲۸)

اس آیتِ کریمہ میں متعدد حقائق کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔

چند حقائق کی طرف توجہ

۱۔ آنحضرت ﷺ کو صرف اہلِ مکہ کی ہدایت کے لیے مبعوث نہیں فرمایا گیا بلکہ آپ کی بعثت ورسالت تمام نوعِ انسانی کی طرف ہے۔ اس لحاظ سے اہلِ مکہ کو آپ کی ذات اور آپ کے پیغام کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے سو دفعہ سوچنا چاہیے کہ ان کا واسطہ کس عظیم شخصیت سے ہے۔ اگر انہوں نے آپ کی رسالت کا ہراول دستہ بننے کی عزت سے اپنے آپ کو محروم رکھا تو یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ان کی ناقدری کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کا مشن نامکمل رہ جائے۔ کیونکہ:

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کیونکر دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

اللہ تعالیٰ اس عظیم منصب کے تحمل کے لیے کسی اور گروہ اور قوم کو توفیق دے دے گا اور وہ حق کی اس مشعل کو لے کر وہاں تک پہنچیں گے جہاں اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا۔ اس لیے قریش کو سو دفعہ سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے رویے سے اپنے آپ کو اس افتخار سے محروم نہ رکھیں۔

Marfat.com

۲۔ قرآنِ کریم میں یہ بات ایک سے زیادہ مرتبہ دہرائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول دنیا میں حق کی حجت بن کر آتا ہے۔اس کی تکذیب اور پھر اس کے پیغام اور اس کی ذات کو روکنے اور ختم کرنے کی سازشیں اور کوششیں دیر تک جاری نہیں رہ سکتیں۔آخر پروردگار اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد یا تو اپنے رسول کے مشن کو کامیاب کر دیتا ہے اور یا تکذیب کرنے والی قوم عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔آنحضرت ﷺ تو صرف رسول ہی نہیں، آخری رسول ہیں۔آپ انسانوں کی ہدایت وفلاح کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔اس کام کی تکمیل کے لیے کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔اللہ تعالیٰ اپنے اس کام کو مکمل فرمائے گا۔قریش نے اگر اس میں تعاون نہ کیا تو وہ تحلیل کر دیے جائیں گے۔اور اس کام کی تکمیل میں دوسرے لوگوں کو عزت وافتخار ملے گا۔

۳۔ اہلِ کتاب اپنے اس حسد کی آگ میں جل رہے ہیں کہ آخری رسول بنی اسرائیل میں آنے کی بجائے بنی اسماعیل میں کیوں آیا۔انہیں تنبیہ کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آخری رسول کسی ایک نسل یا کسی ایک قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوا بلکہ وہ ایسا منارۂ نور ہے جس کی روشنی چاردانگ عالم میں پھیلے گی اور نوعِ انسانی مقدور بھر اس سے فائدہ اٹھائے گی۔اہلِ کتاب نے اگر صحیح فیصلہ نہ کیا تو وہ ہمیشہ کے لیے محرومی کی ذلت میں دفن کر دیے جائیں گے۔چنانچہ تاریخ نے مذکورہ بالا تینوں باتوں کی حرف بہ حرف تصدیق کی۔

اس آیتِ کریمہ میں کَآفَّةً کا لفظ استعمال ہوا ہے۔علامہ قرطبی اس کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کَآفَّةً کا معنی ہے عَامَّة یعنی ہم نے آپ کو لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کے بھیجا ہے۔زجاج نے کہا الکافة کا معنی ہے الجامع یعنی ہم نے آپ کو انذار وتبشیر میں تمام لوگوں کو جمع کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے منع کرنے والا۔یعنی ہم نے آپ کو اس لیے بھیجا ہے کہ آپ تمام لوگوں کو کفر سے منع کریں اور اسلام کی دعوت دیں۔اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قیامت تک نوعِ بشری کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا اور قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر بھی فرمایا۔مثلاً:

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام، ۱۹)

(اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تم کو متنبہ کروں اور ہر اس شخص کو جسے یہ پہنچے)۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (الاعراف، ۱۵۸)

(اے نبی کہہ دو کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں)

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء، ۱۰۷)

(اور اے نبی، ہم نے نہیں بھیجا تم کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت کے طور پر)

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (الفرقان، ۱)

(بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے متنبہ کرنے والا ہو)

یہی مضمون نبی کریم ﷺ نے خود بھی بہت سی احادیث میں مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔مثلاً:

Marfat.com

بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ (مسند احمد، مرویات ابوموسیٰ اشعری ؓ)

(میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں)

امّا انا فارسلتُ الی الناس کلھم عامة و کان من قبل انما یُرْسَلُ الٰی قومہٖ

(مسنداحمد، مرویات عبدالله بن عمروبن عاص)

(میں عمومیت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ حالانکہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی گزرا ہے وہ اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا)

وکان النبی یبعث الیٰ قومه خاصة وبعثت الی الناس عامة (بخاری و مسلم، من حدیث جابر بن عبدالله)

(پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں)

بعثت انا والساعة کهاتین یعنی اصبعین (بخاری و مسلم)

(میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں، یہ فرماتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں)

حضرت جابر بن عبداللہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے نبیوں میں کسی کو نہیں دی گئیں۔ (۱) ایک ماہ کی مسافت سے میرا رعب طاری کر دیا گیا ہے، (۲) میرے لیے تمام روئے زمین کو مسجد اور آلۂ تیمم بنا دیا گیا ہے۔ میری امت میں سے جس شخص پر جہاں بھی نماز کا وقت آ جائے، وہ وہیں نماز پڑھ لے، (۳) میرے لیے مالِ غنیمت کو حلال کر دیا گیا ہے، (۴) پہلے ہر نبی کو ایک مخصوص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں، (۵) مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

(اور یہ لوگ کہتے ہیں وہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ ۲۹)

7 مخالفین کی ضد اور استہزاء

تعجب ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے آنحضرت ﷺ کو پوری نوعِ انسانی کی طرف بشیر اور نذیر بنا کے بھیجا ہے تو وہ بجائے اس کے کہ آپ کے انذار سے متنبہ ہو کر اپنے آپ کو بچانے کی فکر کریں آنحضرت ؐ پر طعن توڑتے اور استہزاء کرتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ تم بار بار ہمیں قیامت کے آنے سے ڈراتے رہتے ہو اور یہ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور اسی رکوع میں پیچھے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک دن ضرور جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرے گا تو آخر وہ وقت کب آئے گا۔ ہم تو تمہیں بار بار جھٹلا چکے ہیں اور ہم نے تمہاری مخالفت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ تو اگر تم واقعی اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر یہ فیصلے کا وقت کیوں نہیں آ جاتا۔

Marfat.com

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٠﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجیے کہ تمہارے لیے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس سے نہ تم ایک گھڑی پیچھے ہٹو گے اور نہ آگے بڑھو گے۔ ۳۰)

قیامت کی آمد تمہاری خواہشات کے تابع نہیں

اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کا آنا تو یقینی ہے اس کے لیے ایک دن یعنی ایک وقت بھی مقرر کر دیا گیا ہے لیکن اس کا آنا تمہاری خواہشات کے تابع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کی مشیت اور اس کی حکمت کے تابع ہے۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق اپنے امور سرانجام دیتا ہے۔ اس نے انسانوں کو قیامت کی تیاری کے لیے مہلت دے رکھی ہے۔ یہ مہلت کب ختم ہوگی اور اس میں کتنے اشخاص اور کتنی قومیں آزمائی جائیں گی اور وہ وقت کب آئے گا جب اس دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی، اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہ ہر قوم کو اتنی مہلت ضرور دیتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ قیامت میں عذر پیش نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا کام لوگوں کو قیامت سے ڈرانا اور آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ اس کی تیاری کر لیں۔ ان کا کام اس کا وقت بتانا نہیں۔ جس طرح وہ ہر شخص کو موت سے ڈراتے ہیں تاکہ آخرت کی تیاری کرے لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ اسے موت کب آئے گی۔ موت کے وقت کا علم نہ ہونے کے باوجود انسان اس کا یقین رکھتا ہے۔ اسی طرح پیغمبر جو معصوم ہوتے ہیں اور جن کی کسی بات پر کذب کا دھوکہ نہیں ہوتا اور وہ ہر طرح کی غلط بیانی سے مبرا ہوتے ہیں، قیامت کے بارے میں ان کی دی ہوئی خبر پر بھی یقین افراد اور اقوام کی نجات اور فلاح کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو وقت مقرر کر رکھا ہے اس میں پس و پیش کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں نہ تقدیم ہوگی نہ تاخیر۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ
وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ
عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِۨ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ
اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ
الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ
الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَاۗءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ
اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ

Marfat.com

اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا
الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ یُجْزَوْنَ
اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۳۳ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا
قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۳۴ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ
اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝۳۵ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۳۶

رکوع: ۴۔ (ان لوگوں نے کہا جنہوں نے کفر کیا کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہیں مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب پر ایمان لائیں گے، کاش آپ دیکھتے ان کا حال اس وقت جبکہ یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے، جو لوگ دبا کر رکھے گئے وہ ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے تکبر کیا، اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لانے والوں میں سے ہوتے۔ ۳۱) وہ لوگ جو بڑے بنے رہے ان لوگوں کو جو دبا کے رکھے گئے، جواب دیں گے کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جبکہ وہ تمہارے پاس آ چکی تھی، بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔ ۳۲) اور دبے ہوئے لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے تکبر کیا بلکہ تمہاری رات دن کی مکاری تھی (جو مقبولِ حق میں مانع ہوئی) جبکہ تم ہمیں سمجھاتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں اور دلوں میں نادم ہوں گے جب عذاب کو دیکھیں گے، ہم ان کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے، وہ بدلہ نہیں دیے جائیں گے مگر جو وہ کرتے تھے۔ ۳۳) ہم نے کسی بستی میں کوئی خبردار کرنے والا نہیں بھیجا، مگر اس بستی کے اغنیاء نے یہی کہا کہ ہم تو اس پیغام کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ ۳۴) اور انہوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں۔ ۳۵) اے پیغمبر کہہ دیجیے! بے شک میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے، اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ ۳۶)

Marfat.com

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ
مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا
لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

(ان لوگوں نے کہا جنہوں نے کفر کیا کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہیں مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب پر ایمان لائیں گے، کاش آپ دیکھتے ان کا حال اس وقت جبکہ یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے، جو لوگ دبا کر رکھے گئے وہ ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے تکبر کیا، اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لانے والوں میں سے ہوتے۔ ۳۱)

مخالفین کا عناد اور قیامت کے روز ان کا حال

آنحضرت ﷺ کو دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں مخالفین اور معاندین کی طرف سے جو صورتحال پیش آتی تھی اس کے ہزار رنگ تھے۔ طبیعتوں اور مزاجوں کے اختلاف نے کہیں اسے اعتراضات کی شکل دے رکھی تھی اور کہیں تمسخر اور استہزاء کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اور کبھی برہنہ انکار کی شکل میں ان کا بغض اپنی نمود دکھاتا تھا۔ چنانچہ اسی کا عکس دکھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان کی معاندت اور مخالفت اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ صاف صاف یہ کہنے لگے ہیں کہ قرآنِ کریم کو اپنی فصاحت و بلاغت، معنوی ربط و ارتباط اور انسانی زندگی کے مسائل کے حل کے لیے ایک مکمل نظام کے باوجود ہم نہ ماننے کے لیے تیار ہیں اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کرتے ہیں۔ آپ دلائل کی قوت سے ہزار کام لیجیے اور آپ کا حُسنِ سلوک چاہے کتنا بھی مؤثر ہو اور اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں آچکی ہیں وہ اپنے اندر صداقت کے کیسے بھی پہلو رکھتی ہوں یہ ہمارا اٹل فیصلہ ہے کہ ہم کسی کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اور بعض لوگوں نے اسے عذاب اور قیامت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نہ ہم قرآنِ کریم کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ اس عذاب اور قیامت ہی کو مانتے ہیں جن کی آپ بھی اور قرآن بھی بار بار خبر دیتے ہیں۔ جب تک آپ ہمارے مطالبات کے مطابق معجزات نہ دکھائیں جو ہمارے انکار اور تمرد کے ہر پہلو کو توڑ کر رکھ دیں۔ قرآنِ کریم اظہارِ افسوس کرتے ہوئے ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ آج تو یہ لوگ بڑھ چڑھ کر نہایت سرکشی کے ساتھ آپ کی دعوت کا مذاق اڑاتے ہیں اور انکار بھی کرتے ہیں۔ لیکن قیامت کے روز جس کی آمد پر انہیں یقین نہیں، جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے کیے جائیں گے تو اس وقت ان کی ساری ہیکڑی نکل جائے گی۔ کسی بات کا جواب دینے کی بجائے جب اپنی آنکھوں سے اصل حقیقت کو دیکھ لیں گے تو آج جن لوگوں کے پیچھے آنکھیں بند کر کے بھاگے چلے جارہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی بات سننے کے لیے تیار نہیں اس وقت انہیں رہنماؤں پر پلٹ پڑیں گے اور چیخ چیخ کر کہیں گے کہ کم بختو تم نے ہمیں گمراہ کیا۔ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم آج اپنے اس ہولناک انجام سے دوچار نہ ہوتے۔ ہم تمہارے دست نگر اور جاہل لوگ تھے، تم نے اپنے علم اور آگہی کے بل بوتے پر اور اپنے مال و دولت کے اثرات سے اس بری طرح ہمیں بہکایا کہ ہم تمہارے چنگل سے کبھی نہ نکل سکے۔ اگر تمہارے فریب کا یہ جال اتنا مضبوط نہ ہوتا تو ہم یقیناً ایمان لانے والے ہوتے۔

Marfat.com

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى
بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۲

(وہ لوگ جو بڑے بنے رہے ان لوگوں کو جو دبا کے رکھے گئے، جواب دیں گے کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جبکہ وہ تمہارے پاس آ چکی تھی، بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔ ۳۲)

گزشتہ بات کی وضاحت

ہر معاشرے میں کچھ لوگ رہنمائی کرتے اور قیادت وسیادت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں۔ رہنمائی کرنے والے بالعموم طبقۂ امراء کے لوگ، سیاستدان، قبیلوں اور برادریوں کے سردار، علماء و پیشوا ہوتے ہیں۔ اور پیچھے چلنے والے غریب لوگ، امراء کے دستِ نگر، برادریوں میں پسے ہوئے علماء اور پیشواؤں کے متوسلین اور مسترشدین ہوتے ہیں۔ یہ رہنمائی کرنے والے تمام طبقوں کے لوگ اپنے پیچھے چلنے والوں کو جواب دیں گے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کی معرفت ہدایت تمہارے پاس آ چکی تھی اور اس سے زندگی کا ہر گوشہ منور ہو رہا تھا اللہ تعالیٰ کے رسول نے دلائل اور اپنے بلند کردار سے اپنی دعوت کو دماغوں کے لیے قابلِ قبول بنا دیا تھا، تو تم نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ ہم نے تمہیں روکا تھا بلکہ اس لیے کہ تمہاری اپنی خواہشاتِ نفس زندگی کے اس تصور میں اپنے لیے کھل کھیلنے کا موقع نہیں پاتی تھیں جو اللہ تعالیٰ کے رسول لے کے آئے تھے۔ افرادی قوت تمہارے پاس تھی۔ ہر سیادت وقیادت کی سرگرمی اور قوت کا سرچشمہ تم لوگ تھے۔ تمہاری تائید ونصرت سے اقتدار کے تیور بدلتے اور اقتدار کے دروازے کھلتے تھے۔ تمہاری فتوحات اور تمہارے نذرانے علماء اور پیشواء کی اصل طاقت تھے۔ اگر تم ان میں سے ہر چیز کو صحیح محمل میں خرچ کرتے اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی بجائے زندگی کی صحیح ڈگر پر چلنے کی کوشش کرتے اور تمہارے پیشِ نظر صرف حق کی پیروی اور صحیح نظام کو بروئے کار لانا ہوتا تو تم حق سے کبھی اِبا نہ کرتے۔ تم نے اپنی آخرت کا سودا نام نہاد پیروں کی دامن گرفتگی سے کیا۔ تمہیں خواہشاتِ نفس کی تسکین دنیا دار لیڈروں کی پیروی میں نظر آئی تو تم نے ان کے ہاتھ مضبوط کیے۔ ہمارے پیشِ نظر اگر اپنی ذات، اپنا مفاد اور اپنا اقتدار تھا، تو تمہارے سامنے بھی اپنی ذات اور اپنے مفاد کے سوا کچھ نہ تھا۔ حقیقت میں ہم نے صرف دنیا طلبی کے لیے ایک دوسرے سے سودا کیا۔ نہ ہم نے تمہیں بہکایا اور نہ تم ہمارے بہکاوے میں آئے۔ تمہارے سامنے اپنی زندگی کا مفاد رہا اور ہمارے سامنے اپنا۔ اس لیے آج ہم جس انجام کو ہم پہنچ رہے ہیں ہم نے خود اس کا بیج بویا تھا اور اس کے اسباب پیدا کیے تھے اس لیے بہتر ہے اس کی ذمہ داری کو قبول کریں، ایک دوسرے کو الزام دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ
نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ
فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۳۳

Marfat.com

(اور دبے ہوئے لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے تکبر کیا بلکہ تمہاری رات دن کی مکاری تھی (جو قبولِ حق میں مانع ہوئی) جبکہ تم ہمیں سمجھاتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں اور دلوں میں نادم ہوں گے جب عذاب کو دیکھیں گے، ہم ان کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے، وہ بدلہ نہیں دیے جائیں گے مگر جو وہ کرتے تھے۔ ۳۳)

پیروکاروں کا اپنے لیڈروں کو جواب

اس آیتِ کریمہ میں کمزور، دبے ہوئے اور پیچھے چلنے والوں کا جواب نقل کیا گیا ہے جو وہ اپنے لیڈروں کو دیں گے۔ جب لیڈر ان کا الزام رد کر دیں گے کہ تم نے ہمیں گمراہ کیا ہے تو پیچھے چلنے والے کہیں گے کہ تم نے جس طرح ہمیں ہمارے طرزِ عمل کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور ہمیں ہمارے مفادات کا اسیر قرار دیا ہے جن کے حصول کے لیے ہم نے تمہاری پیروی کی، معاملہ اتنا سادہ نہیں۔ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ تم نے عوام کو اپنے چنگل میں پھنسائے رکھنے کے لیے پراپیگنڈے کا ایک جال بچھا رکھا تھا۔ اپنی شخصیات کا طلسم طاری رکھنے کے لیے تم نے عجیب و غریب طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ تم نے مختلف ذرائع اور وسائل سے اپنے غیر معمولی ہونے کا ایسا سحر طاری کر رکھا تھا جس سے نکلنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ ہماری روزی کے تم مالک بن گئے تھے۔ آخرت میں نجات کے لیے مذہبی شعبدہ بازوں کو ہماری قسمتوں کا مالک بنا دیا تھا اور دلائل کے زور سے ہمارے دلوں میں یہ بات اتار دی تھی کہ جب تک ہم ان کے دامن گرفتہ نہیں ہوں گے ہماری آخرت نہیں بنے گی۔ ہر ادارے میں اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے تمہاری سفارشیں ہمارے لیے ناگزیر ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ وہ مکر اور فریب کا کاروبار تھا جس نے ہمیں تمہارا اسیر بنا رکھا تھا۔ اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعلق ہے اس کے بارے میں صحیح تصورات اور صحیح اعتقادات اس کا خوف، اس کے علم کی بے پناہی، اس پر مضبوط توکل جیسے حقائق کو تمہارے اثرات نے ہمارے لیے رجعت پسندی قرار دے دیا تھا۔ ہم بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے گن گاتے اور اسی سے استمداد کرتے ہمیں تم نے اس سے کفر اور انکار کے راستے پر ڈال کر اپنا مستقل دستِ نگر بنا لیا تھا۔

آخرت میں جب اصل حقیقت سامنے آئے گی اور انہیں احساس ہوگا کہ ہمیں محض مکر و فریب سے ایک ایسے راستے پر ڈالا گیا جو ہمارے ضمیر کے تقاضوں کے خلاف تھا، تو وہ دل ہی دل میں سخت نادم ہوں گے۔ اور جب وہ دیکھیں گے کہ ان لیڈروں کے خلاف ہمارے عذر مسموع نہیں ہوئے بلکہ عذاب ہمارے سامنے انتظار میں کھڑا ہے تو وہ اپنی بدبختی پر نہایت پشیمان ہو کر چیخنا چاہیں گے لیکن چیخیں بھی سینوں میں گھٹ کر رہ جائیں گی۔ سامنے عذاب کی ہولناکی اور سینے کے اندر سے ضمیر کا احتجاج ان کی پشیمانی میں بیش از بیش اضافہ کر دے گا۔

اس کے بعد فرمایا گیا کہ ہم ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے تاکہ عمل اور جزاء میں مطابقت ہو جائے۔ کیونکہ جو لوگ اپنے ضمیر، اپنی عقل اور اپنے شعور کے خلاف اپنی باگ دوسروں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں تو ان کی سزا یہی ہونی چاہیے کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے جائیں تاکہ جہنم کے داروغے ان طوقوں سے پکڑ کر انہیں دوزخ میں گھسیٹتے پھریں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

(ہم نے کسی بستی میں کوئی خبردار کرنے والا نہیں بھیجا، مگر اس بستی کے اغنیاء نے یہی کہا کہ ہم تو اس پیغام کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ ۳۴)

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس رکوع کے آغاز ہی میں کفار کی اس سرکشی کا ذکر فرمایا گیا تھا کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہیں مانیں گے اور نہ کسی اور آسمانی کتاب کو تسلیم کریں گے۔اسی سلسلۂ بیان کو سمیٹتے ہوئے آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ کی دعوت کے معاندین اور مخالفین کا یہ کہنا کوئی نئی بات نہیں۔ہم نے جب بھی کسی رسول کو بھیجا ہے تو اس کے مخاطب طبقۂ امراء کے لوگوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ تم جو پیغام دے کر بھیجے گئے ہو، ہم اس کے منکر ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دولت کا نشہ انسانی عقل کو بھی برباد کرتا ہے اور انسانی اخلاق کو بھی۔یہ بات مسلم ہے کہ ہر دور کا رسول اپنی قوم میں سیرت و کردار اور شخصی وجاہت کے اعتبار سے منفرد شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔لوگ اس کے بلند اخلاق کی وجہ سے اس کے احترام پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کی شخصیت کی دلآویزی جارحیت کے لیے رکاوٹ بن جاتی ہے۔بایں ہمہ جب کسی قوم کے مالدار لوگ اس زبان میں اللہ تعالیٰ کے رسول سے بات کرنے لگتے ہیں کہ نہ ہم تمہارے پیغام کو مانتے ہیں اور نہ تمہاری شخصیت کو قبول کرتے ہیں۔تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ مخالفت میں بالکل اندھے ہو چکے ہیں اور انسانیت کا جامہ ان پر تنگ ہو گیا ہے۔آنحضرت ﷺ کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ آپ کے دور کے مالدار لوگ اگر ایسی حرکتیں کرتے ہیں تو ایک تو یہ ان کی گراوٹ کی دلیل ہے اور دوسری یہ بات کہ اس میں نئی کوئی بات نہیں۔

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾

(اور انہوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں۔ ۳۵)

دولت مند لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب پر دلیل یہ دیتے تھے کہ تم ہمیں گمراہ سمجھ کر عذاب کے قابل سمجھتے ہو۔اور اس لیے ہمیں اصلاح کی دعوت بھی دیتے ہو اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انذار بھی کرتے ہو۔حالانکہ نہایت سادہ سی بات ہے کہ اگر ہمارا عقیدہ و عمل باطل ہوتا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوتا تو وہ یقیناً ہمیں مال سے بھی محروم کر دیتا اور اولاد سے بھی۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اور تم پر ایمان لانے والے سب ناداروں کا گروہ ہے۔کوئی نانِ شبینہ کا محتاج ہے اور کسی کو گھر کی چھت میسر نہیں۔چیتھڑوں میں ملبوس اور معاشرے کے دھتکارے ہوئے لوگ اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھتے ہیں اور ہمیں عذاب سے ڈراتے ہیں۔اگر پروردگار مسلمانوں سے راضی ہوتا تو یہ ہم سے بڑھ کر دولت مند ہوتے اور اولاد کے دست و بازو ان کی قوت کا سامان ہوتے۔لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔بنابریں سوچنا تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کا طرزِ عمل کہیں غلط نہ ہو۔چہ جائیکہ وہ ہمیں سمجھانے کے لیے اٹھیں۔ہم یہاں اگر نعمتوں سے نوازے جا رہے ہیں تو یقیناً اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی نعمتوں سے ہم ہی نوازے جائیں گے۔اگر ہم عذاب کے سزاوار ہوتے تو ہماری حالت یہاں بھی بری ہوتی اور آخرت میں بھی بری ہوتی۔

Marfat.com

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿٣٦﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجیے! بے شک میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے، اور جس کے لیے
چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ ٣٦)

غلط فہمی کا ازالہ

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کہ رزق کی کشادگی اور تنگی اللہ تعالیٰ کی رضا اور ناراضگی کی دلیل ہے۔ آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ انہیں سمجھائیں کہ رزق کا کشادہ ہونا اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونے کی دلیل نہیں۔ اور رزق کا تنگ ہونا اللہ تعالیٰ کے غضب کی علامت نہیں۔ دنیا میں آنکھیں کھول کر دیکھو کتنے بدقماش اور بدترین لوگ ہیں جو خوشحالی کے مزے لوٹ رہے ہیں اور کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے علم اور کردار کا حوالہ دیا جاتا ہے اور جو اپنی شخصی خوبیوں کے باعث نہایت نیک نام ہیں۔ لیکن وہ نہایت تنگدستی سے زندگی گزار رہے ہیں۔ رزق کا تعلق انسان کے اچھا یا برا ہونے سے نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا فیصلہ ہے۔ جب وہ کسی کو رزق دیتا ہے تو وہ اس کے شکر کا امتحان کرتا ہے۔ اور جب کسی کا رزق تنگ کرتا ہے تو اس کے صبر کو جانچتا ہے۔ تو اصل کامیابی کا انحصار اس امتحان کے نتیجہ پر ہے جو دنیا میں نہیں آخرت میں سامنے آئے گا۔ لیکن اکثر لوگ چونکہ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں تو وہ اس حماقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس میں قریش مبتلا ہیں اور جس میں ہر امت کے مالدار لوگ مبتلا ہوتے رہے ہیں۔

وَمَآ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ
اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ
هُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ
اُولٰٓئِکَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ
فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿٣٩﴾ وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ
یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاکُمْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿٤٠﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ

Marfat.com

أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ أَكْثَرُهُمْ
بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا
ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا
تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ إِلَّا
رَجُلٌ يُّرِيْدُ أَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ
إِلَّآ إِفْكٌ مُّفْتَرًى ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ إِنْ
هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾ وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ
أَرْسَلْنَآ إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ﴿۴۴﴾ وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ
وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾

رکوع: ۵۔ (اورتمہارے مال اورتمہاری اولادوہ چیز نہیں ہے جوتمہیں ہم سے قریب کردے، مگر جوایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، پس یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا اور وہ بالاخانوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ ۳۷) اور جولوگ ہماری آیات کے ابطال میں سرگرم رہتے ہیں وہ عذاب میں داخل کیے جائیں گے۔ ۳۸) کہہ دیجیے کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کردیتا ہے، اور جس کے لیے چاہتا ہے رزق تنگ کردیتا ہے اور جو چیز بھی تم خرچ کروگے تو وہ اس کا بدلہ دے گا، وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ ۳۹) اور اس دن کو یاد کرو جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔ ۴۰) وہ جواب دیں گے تو پاک ہے، تو ہمارا کارساز ہے ان کے مقابلے میں، بلکہ وہ جنوں کی پرستش کرتے تھے، ان میں سے اکثر انہیں پر ایمان رکھنے والے تھے۔ ۴۱) پس آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، اور ہم ان ظالموں سے کہیں گے کہ اب چکھو اس جہنم کا عذاب جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ۴۲) جب

Marfat.com

انہیں ہماری روشن آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ تو محض ایک آدمی ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں سے روک دے جن کو تمہارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں۔ اور وہ (یہ بھی) کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) محض ایک من گھڑت جھوٹ ہے، ان کافروں نے حق کے بارے میں کہا جب وہ ان کے پاس آ گیا کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ ۴۳) اور ہم نے ان کو کتابیں نہیں دی تھیں کہ یہ اسے پڑھتے، اور نہ آپ سے پہلے ان کے پاس کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تھا۔ ۴۴) اور جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے اور یہ تو اس کے عشر عشیر کو بھی نہ پہنچے جو ہم نے ان کو دیا تھا، تو انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا، تو دیکھو کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار۔ ۴۵)

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِى الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

(اور تمہارے مال اور تمہاری اولاد وہ چیز نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کر دے، مگر جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، پس یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا اور وہ بالا خانوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ ۳۷)

زُلْفٰى مصدر ہے جس سے مقصود فعل کی تاکید ہے۔ یعنی تُقَرِّبُكُمْ قُرْبَةً۔

ایک غلط تصور کی تردید

گزشتہ سے پیوستہ آیت میں ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ قریش اموال اور اولاد کو خوشحالی اور فارغ البالی کا ذریعہ سمجھتے تھے اور انہیں یہ بھی خیال تھا کہ ایسی فارغ البالی اس شخص کو ملتی ہے جسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ آدمی ہو۔ گویا یہ ایک معیار ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کی پہچان ہوتی ہے۔ اور جس شخص کو یہ دولت نصیب نہیں وہ ہزار اللہ تعالیٰ کے تقرب کا دعویٰ کرے حقیقت میں اس کے اندر کوئی سچائی نہیں۔ ان کے اس غلط تصور کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب یقیناً ایک انسان کا اصل ہدف ہونا چاہیے۔ لیکن یہ قرب کثرتِ مال و دولت سے نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ مال و دولت قرب کا ذریعہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کا امتحان ہے کہ وہ یہ نعمتیں پا کر شکر کرتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ اور شکر کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان لائے اور ان کی ہدایت کے مطابق اعمالِ صالحہ کرے۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے رسول پر اس لیے ایمان نہیں لاتا کہ وہ ان کے مطلوب معیار پر پورا نہیں اترتا یعنی اس کے یہاں دنیوی مال و دولت کا فقدان ہے، وہ ایک درویش کی زندگی گزارتا ہے، خوشحال دنیادار کی نہیں۔ تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے مال و دولت سے اسے اللہ تعالیٰ کا قرب میسر نہیں آئے گا بلکہ ایسا مال و دولت اللہ تعالیٰ سے دوری کا ذریعہ بنے گا۔ اور جس امتحان کے لیے یہ مال و دولت دیا گیا ہے اس میں وہ ناکام ہو جائے گا۔ نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ دنیا بھی غارت ہوئی اور آخرت بھی تباہ ہو گئی۔ لیکن اس کے برعکس جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارا اور زندگی کا ہر فیصلہ کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری سمجھا کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کیا کہتی ہے۔ جن کا ہر قدم اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور خشیت سے گراں بار رہا، یہ وہ لوگ

Marfat.com

ہیں جن کے ہر عمل کا بدلہ اصل جزاء سے کہیں بڑھ چڑھ کر ملے گا۔ کیونکہ ضعف عربی زبان میں کسی شے کی مثل کے لیے بھی آتا ہے اور اس کے امثال کے لیے بھی۔ خواہ وہ امثال کتنے ہی غیر محدود ہوں۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو لوگ ایمان اور عملِ صالح کا طریقہ اختیار کریں گے اور ہزار مشکلات کے باوجود نہ ان کا ایمان کمزور ہوگا اور نہ عمل میں کسی طرح کے تحفظات کا دخل ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا صلہ دگنا یا چوگنا نہیں دے گا بلکہ ہمارے پیمانے اس کے سامنے نگوں ہو کر رہ جائیں گے۔

آخر میں فرمایا کہ دنیا میں اموال اور اولاد یقیناً کروفر کا ذریعہ ہیں لیکن ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی خوف وخطر سے ماورا نہیں۔ مال کے چھن جانے کا خوف اور اولاد کے بگڑ جانے یا ان کے کسی بھی حادثے کی نذر ہو جانے کا خوف ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نادار آدمی رات کو بے خوف ہو کر سوتا ہے اور مالدار آدمی کو وسوسے اور حوادث چین نہیں لینے دیتے۔ اولاد سے محروم شخص صرف محرومی کا غم رکھتا ہے لیکن صاحبِ اولاد نہ جانے کس قدر رواہموں اور کیسے کیسے غیر متوقع حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ مال واولاد کو آخرت میں فلاح کا ذریعہ بناتے ہیں انہیں آخرت میں ایسا اجر اور صلہ ملے گا جس میں نہ کبھی کوئی واہمہ سر اٹھائے گا نہ کوئی غیر متوقع صورتحال پیدا ہوگی اور نہ کسی چیز کے چھن جانے کا اندیشہ ہوگا۔ ایک ایسا ابدی سکون میسر آئے گا جس کا دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

(اور جو لوگ ہماری آیات کے ابطال میں سرگرم رہتے ہیں وہ عذاب میں داخل کیے جائیں گے۔ ۳۸)

اس آیت کے تیور دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ گزشتہ آیت میں جن خوش نصیب ایمان لانے والوں اور عملِ صالح کرنے والوں کا ذکر ہے اس میں اسلام کی بنیادی صداقتوں پر یقین اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہی شامل نہیں بلکہ اس کشمکش میں بڑھ چڑھ کر ایثار و استقامت بھی مراد ہے جو اس راستے کا لازمی حصہ ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس کے برعکس کردار کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ حق و باطل کی کشمکش میں حق کو نیچا دکھانے کے لیے شب و روز سرگرمِ عمل ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ اسلامی دعوت کو آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ جس طرح اس راستے میں اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے نمایاں خدمات انجام دینے والے غیر معمولی طور پر نوازے جائیں گے، اسی طرح مخالفت میں کام کرنے والے بدترین سزا سے دوچار ہوں گے۔ مُحْضَرُوْنَ کے لفظ میں ان کی ذلت اور بے بسی کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں اس طرح پکڑے ہوئے آئیں گے کہ ان کی ذلت اور رسوائی دیکھنے کی چیز ہوگی اور ان کی سزا سے سب پناہ مانگیں گے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَیَقْدِرُ لَہٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَھُوَ یُخْلِفُہٗ ۚ وَھُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۳۹﴾

(کہہ دیجیے کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، اور جس کے لیے چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے تو وہ اس کا بدلہ دے گا، وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ ۳۹)

Marfat.com

رزق وفضل کا صحیح مصرف

اس سے پہلے آیت ۳۶ کے پہلے حصے میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو اس آیت کے پہلے حصے میں کہی گئی ہے۔ البتہ آیت کے دوسرے حصے میں جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوبارہ ایک ہی مضمون کو لانے کا مقصد کیا ہے۔ رزق کی تنگی اور کشادگی چونکہ انسانوں میں ہمیشہ غلط فہمیوں اور فسادِ عقائد کا ذریعہ رہی ہے۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اصرار اور تکرار کے ساتھ اس کا ازالہ کیا جائے۔ اس لیے مکرر ارشاد فرمایا کہ رزق کی کشادگی اور تنگی تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ کبھی وسعت دے کر آزماتا ہے کہ رزق کی وسعت کیا شکر کا باعث بنتی ہے یا اتراہٹ اور ناشکری کا۔ اور کبھی تنگی دے کر آزماتا ہے کہ رزق کی تنگی کیا بے صبری پیدا کرتی ہے یا اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ وہ امتحان ہے جس پر انسانیت کے پھلنے پھولنے کا دارومدار ہے۔ البتہ یہ بات کہ وسعت کب آتی ہے اور تنگی کب، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہے۔ جو شخص اس حکمت پر یقین نہیں رکھتا وہ ہمیشہ گمراہی کا شکار ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ ارشاد فرمائی ہے کہ مالداروں کو یہ یقین ہونا چاہیے اور اسی سے شکر کی توفیق بھی ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ ضائع نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ اسے ضرور واپس کرتا ہے۔ یعنی اس کی وجہ سے رزق میں برکت بھی ہوتی ہے اور آخرت میں اس کا بیش از بیش صلہ بھی ملے گا۔

وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ وہ بہترین رزق دینے والا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں بھی اس کی رزق رسانی کے ذرائع اس قدر رنگا رنگ اور لامحدود ہیں جن کا استقصاء ممکن نہیں، لیکن اس صفت کا اصل اظہار آخرت میں ہوگا کہ دنیا میں خرچ کیے ہوئے خزف ریزوں کے عوض میں وہ جو کچھ عطا کرے گا، آج اس کا اندازہ بھی ممکن نہیں۔ اس لیے یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ یہاں "خیر" ترجیح و تفضیل کے مفہوم میں نہیں بلکہ مطلق بیانِ صفت کے لیے ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝۴۰

(اور اس دن کو یاد کرو جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔ ۴۰)

قیامت کے دن فرشتوں کی گواہی

انسانی عقائد کی جو تاریخ دستیاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور کے مشرکین فرشتوں کو دیوی اور دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش کرتے رہے ہیں۔ کسی کو وہ بارش کا دیوتا سمجھتے تھے اور کسی کو ہوا کا، کوئی ان کے یہاں دولت کی دیوی تھی اور کوئی علم اور موت و ہلاکت کی، ہر رسول نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، لیکن یہ شرک کبھی انسانوں میں ختم نہ ہو سکا۔ اہلِ عرب میں بھی یہ بیماری بہت حد تک موجود تھی۔ اس لیے قریش اور دیگر اہلِ عرب کو سمجھانے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ یاد کرو وہ دن کیسا ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ کافر اور مومن سب کو جمع کرے گا اور ان پر اتمامِ حجت کے لیے فرشتوں اور دیگر ان قوتوں کو بھی جمع کرے گا جن کی عبادت دنیا میں ہوتی رہی ہے۔ ان کے سامنے ان سب سے پوچھے گا

Marfat.com

کہ ان اہلِ عرب کا دعویٰ ہے کہ ہم فرشتوں کی عبادت کرتے رہے ہیں۔ تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔ اس سے اہلِ عرب کو یہ بتانا مقصود ہوگا کہ جنہیں تم شریک و شفیع سمجھ کر پوجتے رہے ہو انہیں تو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ تم ان کی پوجا کرتے رہے ہو۔ اور نہ وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں کہ کوئی پروردگارِ عالم کی طرح ان کی عبادت کرے۔ اگلی آیت میں ان کا جواب نقل کیا گیا ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَکَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَکْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾

(وہ جواب دیں گے تو پاک ہے، تو ہمارا کارساز ہے ان کے مقابلے میں، بلکہ وہ جنوں کی پرستش کرتے تھے، ان میں سے اکثر انہیں پر ایمان رکھنے والے تھے۔ ۴۱)

فرشتوں کا جواب

اللہ تعالیٰ جب فرشتوں سے مشرکین کے حوالے سے یہ سوال کرے گا کہ کیا یہ مشرک لوگ تمہاری عبادت کرتے رہے ہیں، یعنی تم نے انہیں عبادت کا حکم دیا تھا یا تم ان کی عبادت پر راضی تھے۔ تو فرشتے فوراً کہیں گے، سُبْحٰنَکَ ، یہ کلمۂ تنزیہہ ہے، کہ تو اس سے پاک ہے کہ کوئی تیرا شریک و سہیم ہو۔ یعنی یہ بات فطرت، عقل اور ہدایت تینوں کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہو۔ یہ تو ایسا مکروہ الزام ہے جس کا سننا بھی ہمیں گوارا نہیں۔ رہا مشرکین کا اتہام، ہم تو اس سے بالکل بری الذمہ ہیں۔ ایسی کسی بات پر خوشی کا اظہار یا ایسی کسی بات کا حکم دینا اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہمارا ولی تو ہے، یہ لوگ نہیں۔ ہمارا تعلق تجھ سے ہے، ان سے نہیں۔ اور اب جبکہ انہوں نے ایسی تہمت لگا ہی دی ہے تو ہم ان کے مقابلے میں تجھ ہی سے فریاد کرتے ہیں۔ اور تو ہی ان کے مقابلے میں ہمارا کارساز ہے۔ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ مذکورہ دونوں مفہوموں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ ولی دوست کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور کارساز کے معنی میں بھی۔ اور دُوْنَ کا لفظ مقابل اور خلاف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے پرستار نہیں بلکہ شیاطینِ جن کے پرستار ہیں۔ یہ بظاہر شیاطین پر لعنت بھیجتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ جس راہ پر انہیں چلاتے ہیں اسی پر چلتے ہیں۔ جہاں انہیں جھکاتے ہیں، یہ جھکتے ہیں اور جن کے احکام کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ انہوں نے بظاہر اپنے تخیلات کے مطابق ہمارے مجسمے بنائے، ہمارے بت گھڑے، ہماری صورتیں تراشیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ہماری نہیں بلکہ شیاطین کی ہدایت کے مطابق ان کی بندگی کرتے رہے۔ یہ شرک اور بت پرستی کا راستہ شیاطین نے ہی انہیں دکھایا تھا اور انہیں کی ہدایت پر یہ اس راستے پر چلتے رہے ہیں۔

فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِکُ بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ کُنْتُمْ بِهَا تُکَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾

(پس آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، اور ہم ان ظالموں سے کہیں گے کہ اب چکھو اس جہنم کا عذاب جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ۴۲)

Marfat.com

فرشتوں کی گواہی کے بعد پروردگار کا حکم

مشرکین کی بات سے فرشتوں کی براءت کے بعد پروردگار مشرکین سے فرمائے گا کہ تم زندگی میں جو کچھ کرتے رہے ہو، نجات کے لیے تمہارا سارا اعتماد فرشتوں پر تھا کہ وہ تمہاری شفاعت کریں گے۔ اب جبکہ تم نے ان کا جواب سن لیا اور انہوں نے تمہارے اعمال سے براءت کا اظہار کر دیا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آج کے دن کوئی بھی ایک دوسرے کے کام آنے والا نہیں۔ نہ تمہاری امیدیں کسی طرف سے پوری ہوں گی اور نہ کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی تمہیں نفع یا ضرر پہنچا سکتی ہے۔ ہدایت کے اعتبار سے تو دنیا ہی میں تم پر اتمامِ حجت ہو گیا تھا اور شفاعت کے اعتبار سے آج اتمامِ حجت ہو گیا۔ تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے کی بجائے جس طرح دوسروں کو اس کے شریک ٹھہرا کر اپنے اوپر ظلم ڈھاتے رہے ہو، اور جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول کی رسالت کو تسلیم کرنے کی بجائے اس کی تکذیب کر کے ظلم کا راستہ اختیار کرتے رہے ہو، اب اس کی سزا یہ ہے کہ اس دوزخ کی آگ کا مزہ چکھو جسے تم دنیا میں جھٹلاتے رہے ہو۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًی ؕ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۴۳﴾ وَمَآ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ یَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِیْرٍ ؕ ﴿۴۴﴾

(جب انہیں ہماری روشن آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ تو محض ایک آدمی ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں سے روک دے جن کو تمہارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں۔ اور وہ (یہ بھی) کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) محض ایک من گھڑت جھوٹ ہے، ان کافروں نے حق کے بارے میں کہا جب وہ ان کے پاس آ گیا کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ ۴۳) اور ہم نے ان کو کتابیں نہیں دی تھیں کہ یہ اسے پڑھتے، اور نہ آپ سے پہلے ان کے پاس کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تھا۔ ۴۴)

مخالفین کی ہٹ دھرمی

قیامت کے دن ان کے ساتھ جو ہوگا، سو ہوگا، لیکن اب ان کی ہٹ دھرمی کا حال یہ ہے کہ جب ان پر ہماری نہایت روشن، محکم، عقل کو منور کرنے والی اور دل کو نور بخشنے والی آیات انہیں پڑھ کے سنائی جاتی ہیں تو بجائے اس کا اثر قبول کرنے کے انہیں گروہی عصبیت کو بچانے کی فکر لگ جاتی ہے۔ وہ لوگوں کو یہ باور کرانے میں لگ جاتے ہیں کہ یہ آدمی جو تمہیں ایسی محکم آیات پڑھ کر سناتا ہے اور اس کے بارے میں تمہارے دلوں میں خواہی نخواہی ایک عظمت کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے، یہ تمہاری سادگی ہے۔ حقیقت میں وہ محض ایک عام قسم کا آدمی ہے جس نے اپنی حیثیت بنانے کے لیے پیغمبر کا روپ دھار رکھا ہے اور بار بار دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول بنا کے بھیجا ہے۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ وہ اپنی ذاتی حیثیت کی خاطر تمہارے اندر ایک بہت بڑا فتنہ اٹھا رہا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری تاریخ سے کاٹ کر تمہارے

Marfat.com

اسلاف سے توڑ کر تمہیں منقطع الارث کر دے۔ وہ تمہیں تمہارے ان معبودوں سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے جنہیں تمہارے اسلاف اور آباؤ اجداد پوجتے آئے ہیں۔ اور اس طرح سے وہ عوام کو مشتعل کرنے کے لیے ایک ایسا حربہ اختیار کر رہے تھے جس نے ہمیشہ عوام میں آگ لگانے کا کام کیا ہے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حق کے مقابلے میں باطل کے پاس جب کہنے کو کوئی بات باقی نہیں رہتی تو وہ ہمیشہ اسلاف دشمنی کا فتنہ اٹھاتا رہا ہے اور اس طرح سے اکابر پرستی کی بیماری جو ہمیشہ قوموں میں عصبیت کی حد تک پہنچی ہوتی ہے اسے اٹھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور پھر لوگ حق کی طرف توجہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے مخالفین نے بھی یہی حربہ استعمال کیا کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو رسول کہتا ہے یہ درحقیقت تمہیں دینِ آبائی سے منحرف کرنا چاہتا ہے۔

مزید وہ یہ کہتے تھے کہ وہ جن باتوں کو وحیِ الٰہی کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کرتا ہے ان کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اس کی اپنی گھڑی ہوئی باتیں ہیں، صرف تمہیں مرعوب کرنے کے لیے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔

کفار کا تمرد اور ان کی سرکشی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اب جبکہ حق ان کے سامنے کھل کر آ چکا ہے اور قرآنِ کریم اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ شب و روز ان کے سامنے پڑھا جا رہا ہے اس کی فصاحت و بلاغت نے ان کی طلاقتِ لسانی کو گنگ کر کے رکھ دیا ہے اور اس کی تاثیر و تسخیر نے ان کے بڑے بڑے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اور اس کی تعلیمات نے اس طرح کی روشنی بکھیر دی ہے جیسے سورج نکلنے کے بعد ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے تو بجائے اس ہدایت کو قبول کرنے کے یہ عوام کو اس کے اثرات سے بچانے کے لیے اس طرح کی بے تکی باتیں کرتے ہیں کہ یہ تو ایک کھلا جادو ہے جو لوگوں پر تاثیر و تسخیر کی شکل میں اپنا کام دکھاتا ہے۔ غرضیکہ ان کی گمراہی اور حق سے اعراض ان کی محرومی و بدبختی تک پہنچ چکا ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ یہ دیکھ کر مزید ان کی بدبختی اور محرومی پر افسوس ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول پر نازل ہونے والی تعلیمات سے انکار کر رہے ہیں حالانکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی کتاب نہیں اتاری جس کی تعلیمات ان میں زندہ ہوتیں اور یہ اپنے لیے اسے کافی سمجھتے اور مزید کسی کتاب کی طرف توجہ دینے سے انکار کر دیتے۔ اور نہ اس سے پہلے ان کی طرف کوئی انذار کرنے والا آیا جو انہیں ان کی بدانجامی اور ان کی زندگی میں پہنچنے والے خطرات سے باخبر کرتا۔ ان کی صحیح الدماغی کا تقاضا تو یہ تھا کہ بیتابانہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی طرف بڑھتے، اللہ تعالیٰ کی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اس سے اپنی دنیا و آخرت سنوارتے۔ لیکن انہیں اندازہ ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے اور اپنے آخری رسول اور اپنی آخری کتاب کی شکل میں کیسی عظیم نعمتوں سے انہیں نوازا ہے۔ اور انہیں اس بات کا بھی احساس نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت کی ناقدری کیسے سنگین نتائج پیدا کر سکتی ہے اور اس سے پہلے جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے وہ کیسے اندوہناک نتائج سے دوچار ہو چکے ہیں۔

وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٤٥﴾

(اور جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے اور یہ تو اس کے عشر عشیر کو بھی نہ پہنچے جو ہم نے ان کو دیا تھا، تو انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا، تو دیکھو کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار۔ ۴۵)

Marfat.com

امیوں کی ناشکری اور اللہ تعالیٰ کا احسان

قریش اور دیگر اہلِ مکہ چونکہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے اولین مخاطب تھے اس لیے بار بار خطاب ان سے فرمایا جارہا ہے یا ان کے حوالے سے باتیں کہی جارہی ہیں۔ لیکن مقصود پوری نوعِ انسانی کو سمجھانا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ قریش کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب پہلا واقعہ نہیں، تاریخ میں بارہا ایسا ہوا کہ جب بھی کسی قوم کی طرف کوئی رسول مبعوث کیے گئے تو قوم کا جواب کبھی بھی مناسب نہیں رہا۔ انہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی تعلیمات کو اپنی خواہشات کے برعکس پا کر نہ صرف ماننے سے انکار کیا بلکہ ہر ممکن طریقے سے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کو ختم کرنے کی کوشش کی تو پھر ان کا یہ رویہ ان کی تباہی کا باعث بن گیا۔ ان میں ایسی قومیں بھی تھیں جنہیں زمین پر بہت عروج حاصل رہا۔ بڑی بڑی حکومتوں کی مالک رہیں، زمین کے بیشتر وسائل ان کے قبضے میں رہے لیکن جب ان کی سرکشی اور تمرد کے باعث اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا ان پر برسا تو نہ ان کی دولت وثروت کام آئی اور نہ ان کی حکومت انہیں بچاسکی۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قریش سے کہا جارہا ہے کہ انہیں جیسا کچھ دولت واقتدار حاصل تھا تم تو اس کے عشرِ عشیر کو بھی نہیں پہنچے ہو۔ لیکن ان کا تمام تر کروفر ان کے کسی کام نہ آیا۔ تم نہ جانے کس برتے پر اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب کرتے ہو بلکہ اس کے قتل کے منصوبے باندھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تم اس طرح سے اللہ تعالیٰ کے دین کے چراغ کو بجھانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یاد رکھو پہلے لوگ بھی اپنی کوششوں میں ناکام رہے، تم بھی ناکام رہو گے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ
تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ
يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾ قُلْ
اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا
يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ
عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ
قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ
قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ

Marfat.com

بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ
مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ
بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾

رکوع: ۶۔ (اے پیغمبر کہہ دیجیے میں تمہیں بس ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ تم اللہ کی خاطر دو دو اور ایک ایک کر کے اٹھو، پھر غور کرو، تمہارے صاحب کو کوئی جنون نہیں ہے وہ تو ایک شدید عذاب سے پہلے متنبہ کرنے والا ہے۔ ۴۶) کہہ دیجیے میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمہارے ہی لیے مانگا ہے، میرا اجر تو بس اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ ۴۷) کہہ دیجیے بے شک میرا رب حق کو (باطل پر) پھینک رہا ہے، وہ تمام پوشیدہ باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔ ۴۸) کہہ دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل نہ ابتداء کرتا ہے اور نہ پھیر کر لاتا ہے۔ ۴۹) کہہ دیجیے اگر میں گمراہ ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے، اور اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو یہ اس سبب سے ہے کہ میرا رب مجھ پر وحی بھیجتا ہے، بے شک وہ سب کچھ سنتا ہے، نزدیک ہے۔ ۵۰) کاش آپ دیکھتے جب یہ گھبرائے پھر رہے ہوں گے، پس وہ کہیں بھاگ نہ سکیں گے اور قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔ ۵۱) اور وہ کہیں گے ہم اس پر ایمان لے آئے حالانکہ اب کہاں ان کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے بعید جگہ سے۔ ۵۲) اور اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور دور سے انکل کے تیر تکے چلاتے رہے۔ ۵۳) اور ان کے اور ان کی چاہتوں کے درمیان دیوار حائل کر دی جائے گی، جس طرح اس سے پہلے ان کے ہم مشربوں کے ساتھ کیا گیا، بے شک وہ بھی گمراہ کن شک میں پڑے رہے۔ ۵۴)

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجیے میں تمہیں بس ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ تم اللہ کی خاطر دو دو اور ایک ایک کر کے اٹھو، پھر غور کرو، تمہارے صاحب کو کوئی جنون نہیں ہے وہ تو ایک شدید عذاب سے پہلے متنبہ کرنے والا ہے۔ ۴۶)

ایک نصیحت بھی اور تنبیہ بھی

اس کے بعد کی آیات خاتمۂ سورۃ کی آیات ہیں جن میں مخالفین کو نہایت دردمندی کے ساتھ نصیحت بھی کی گئی ہے اور تنبیہ بھی۔ مخالفین کے گزشتہ رویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم نے اب تک ہمارے پیغمبر کی دعوت کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ وہ تمہیں ایسے حقائق کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کی اصلاح پر تمہاری دنیوی اور اخری فوز و فلاح کا دارومدار ہے۔ لیکن تم نے ہمیشہ

Marfat.com

استہزاء سے کام لیا یا اندھی عداوت سے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں حقیقت کو قبول کرنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اب نہایت ہمدردی اور غمگساری سے آنحضرت ﷺ کے واسطے سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم تمہاری گزشتہ حرکتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتے ہیں کہ تم دو دو یا ایک ایک کر کے اٹھو، یعنی تم حقیقت تک پہنچنے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کا عزمِ صمیم کرو اور ایک ایک دو دو سے مراد یہ ہے کہ کسی کام کا فیصلہ اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کبھی انفرادی ہوتی ہے اور کبھی اجتماعی۔ انفرادی کوشش میں آدمی اپنی ذات ہی سے مشورہ کرتا ہے اور اجتماعی کوشش کا آغاز دو سے ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ خود فیصلہ کرو یا دوسروں سے مشورہ کرنے کے بعد نتیجے تک پہنچنے کا تہیہ کرو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے سے جمے ہوئے خیالات کو دل و دماغ سے نکال دو، مفادات کی زنجیریں توڑ دو، تعصبات کو حوالۂ نسیاں کرو، لِلّٰہِ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ تمہارا یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے۔ ان شرائط و آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے رسولِ مکرم کی دعوت پر غور کرو، اس کی باتوں کو غور سے سنو، اشتباہات کا جواب مانگو، ہمارے رسول کی حیثیتِ عرفی کا ادراک پیدا کرو، اور پھر یہ بھی دیکھو کہ ہمارا رسول ایک اکیلا آدمی ہے جس کے ساتھ نہ کوئی طاقتور جتھہ ہے اور نہ کوئی جماعت۔ نہ مال و دولت کی بہتات اور نہ کسی بڑی قوت کی پشت پناہی۔ اس کے باوجود وہ ایک ایسی دعوت پیش کر رہا ہے جو ابنائے زمانہ کے مزاج کے خلاف۔ اور ایسے عقائد کے بالکل برعکس ہے جو صدیوں سے لوگوں میں راسخ ہو چکے ہیں۔ ایسا اعلان صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کہنے والا نفع وضرر کے اندازوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ دماغی اختلال کی وجہ سے جو جی میں آئے کہہ گزرے۔ اور اس طرح سے پوری قوم کو اپنا دشمن بنا لے۔ اور دوسری صورت یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث پیغمبر ہو۔ اس کے سامنے نفع ونقصان کے اندیشوں کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ لیکن جس سچائی کے اعلان کے لیے اسے پروردگار نے بھیجا ہے اس سے سرِمو انحراف نہ کرے۔

تم جب خالی الذہن ہو کر سنجیدگی کے ساتھ اس معاملے پر غور وفکر کرو گے تو تم پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے گی کہ تمہارے صاحب کو کوئی جنون نہیں۔ کیونکہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس بات پر گواہ ہے کہ مکہ اور اس کے گرد و پیش میں کوئی اس سے بڑھ کر عقل و دانش اور متانت کا پیکر نہیں۔ اس کی زندگی کا ایک ایک ورق تمہارے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اس نے شب و روز تمہارے سامنے گزارے ہیں، کسی پہلو سے وہ تمہارے لیے اجنبی نہیں۔ تم نے ہر آزمائش میں اس کو صادق اور امین پایا ہے اور قوم نے ہمیشہ اس کی عقل و بصیرت پر اعتماد کیا ہے۔ اب اگر تم اس کی دعوت پر غور کرنے کی بجائے اسے مجنون ٹھہراتے ہو تو یہ تو خود تمہاری اپنی دیوانگی کی دلیل ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہمارے پیغمبر میں دیوانگی اور جنون کا کوئی اثر نہیں تو پھر اس حقیقت کو ماننے میں تأمل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نذیر بن کر آیا ہے اور جس خطرے کو وہ اپنی نبوت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے ہمدردی کے تقاضے سے تمہیں اس سے بچانے کے لیے بار بار تمہیں اس سے باخبر کر رہا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے پیغام کی عظمت چھائی ہوئی ہے اور دوسری طرف وہ کسی طرح تمہاری تباہی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے تمہاری تمام تر ناقدریوں، دلآزاریوں اور ستم رانیوں کے باوجود تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے تاکہ تم دنیوی اور اخروی فوز و فلاح کے مستحق بن سکو۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿٤٧﴾

(کہہ دیجیے میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمہارے ہی لیے مانگا ہے، میرا اجر تو بس اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ ۴۷)

Marfat.com

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ..... نبی کریم ﷺ کی بے لوثی

انسان کی کج اندیشیوں کے بہت سے حوالے ہیں۔ان میں سے ایک حوالہ یہ بھی ہے کہ جب کسی کے بارے میں اسے بدگمانی ہوجاتی ہے یااس سے دشمنی اس کے دل میں اتر جاتی ہے تو پھراس کی ہر سیدھی بات بھی اسے الٹی دکھائی دیتی ہے۔ نبی کریم ﷺ جب بھی انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے، آخرت سے ڈراتے، نیکی کی تلقین کرتے، حقوق العباد کی اہمیت واضح کرتے، یتیموں مسکینوں اور غلاموں کا خیال رکھنے کی تلقین فرماتے تو مخالفین یہ کہنا شروع کردیتے کہ دراصل محمد (ﷺ) اپنا ایک گروہ تیار کررہے ہیں تاکہ اس کی مدد سے لوگوں پر اپنی برتری قائم کریں اور آہستہ آہستہ ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔انہیں درحقیقت اپنی ذات کو بالا بلند کرنے کے لیے کوئی سہارا چاہیے اور وہ دین کے نام سے اپنے لیے سہارا تعمیر کرنے کی فکر میں ہیں۔وہ دعوت وتبلیغ کے راستے میں جو صعوبتیں برداشت کررہے اور مشقتیں جھیل رہے ہیں اس سے ان کے پیشِ نظر اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لیے اقتدار حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔اور یہ جلبِ منفعت کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس پر دین وایمان اور وحیِ الٰہی کا غلاف چڑھایا گیا ہے۔اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اس آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ میں جس دین کی دعوت لے کر تمہارے پاس آیا ہوں اور جس کے ذریعے تمہارے اندر شیرازہ بندی اور مرکزیت پیدا کرنا چاہتا ہوں اور تمہارا اللہ تعالیٰ سے ٹوٹا ہوا رشتہ پھر جوڑنا چاہتا ہوں اور یتیموں اور غلاموں کے حقوق پر زور دیتا ہوں، اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں، بلکہ ان کا فائدہ انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں سے تمہیں کو حاصل ہوگا۔ تمہاری زندگیوں میں تبدیلی تمہارے بہتر مستقبل کی ضمانت دے گی۔تم میں باہمی اخوت ومحبت تمہارے ہمیشہ کے اختلافات کو ختم کردے گی۔آج جبکہ تمہیں قوموں میں کوئی مقام حاصل نہیں، ایک وقت آئے گا کہ تمہاری عظمت کو تسلیم کیا جائے گا۔تمہارے انہی فوائد کے لیے میں شب وروز کوشش کررہا ہوں۔لیکن یہ ضمنی فوائد ہیں، اصل فائدہ یہ ہے کہ تم آسمانی بادشاہت میں داخل کردیے جاؤ گے۔رہا میرا اجر وہ میرے اللہ کے ذمہ ہے۔وہ ہر چیز کو جانتا اور دیکھتا ہے، میری کوئی حقیر سے حقیر خدمت بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔تم جس طرح میرے ساتھ اور میری دعوت کے ساتھ سلوک کررہے ہو وہ بھی اس کی نگاہوں میں ہے اور میں جو کچھ اللہ تعالیٰ کے دین کو پہنچانے کے لیے محنت کررہا ہوں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔مجھے یقین ہے کہ وہ میری خدمات کا مجھے بھرپور صلہ دے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۴۸﴾

(کہہ دیجیے بے شک میرا رب حق کو (باطل پر) پھینک رہا ہے، وہ تمام پوشیدہ باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔ ۴۸)

قذف کا معنی پھینکنا بھی ہوتا ہے اور مارنا بھی۔پھینکنے میں چونکہ مارنے کا مفہوم بھی مضمر ہوتا ہے اس لیے ہم نے ترجمے میں یہی لفظ اختیار کیا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ اور ایک تنبیہ

ایک آیت دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے۔چنانچہ سورۃ الانبیاء آیت اٹھارہ میں ارشاد ہے بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ "ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں، پس وہ اس کا بھیجہ نکال دیتا ہے۔"

Marfat.com

قریش آنحضرت ﷺ کی تبلیغ ودعوت میں شب وروز کی محنت اور اس راستے میں پیش آنے والے مصائب کو دیکھتے تو ایک گونہ تسکین محسوس کرتے کہ یہ صاحب جس چکی میں پس رہے ہیں خود بخود ختم ہوجائیں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ جب وہ دیکھتے کہ آپ کی نرینہ اولاد کوئی نہیں تو آپس میں خوشی کا اظہار کرتے کہ اس شخص کا نام لینے والا بھی دنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔ ان کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان کوتاہ اندیشوں کو اس کا اندازہ نہیں کہ حق کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مدت کے بعد غالب آجانا لکھا ہے۔ اہلِ حق جب اپنی سرفروشیوں اور استقامت سے حق کی قیمت ادا کر دیتے ہیں تو پھر حق غالب آئے بغیر نہیں رہتا۔ باطل یا تو پسپا ہوجاتا ہے اور یا ناکام ونامراد ہوجاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی قریش کے ساتھ حق وباطل کی معرکہ آرائی میں ایسا ہی ہوا کہ جنگ بدر میں قریش کی پہلی صف تہہ تیغ ہوگئی اور دوسری صف قیدی بنالی گئی۔ اور سات سال بعد مکہ سرنگوں ہوگیا۔ اور ایک سال بعد اعلان کردیا گیا کہ کوئی باطل کا پرستار جزیرۂ عرب میں باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ تو باطل کا وہ انجام ہے جو دنیا میں دیکھا گیا اور جہاں تک آخرت کا تعلق ہے وہاں تو سب کے سامنے حق کو باطل پر مارا جائے گا اور باطل پاش پاش ہو کے رہ جائے گا۔

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اہلِ باطل کو شاید اندازہ نہیں کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں۔ آپ کی پشت پناہی اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے۔ کیونکہ آپ جس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے شب وروز کوشاں ہیں اس کے لیے آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔ اور اس پروردگارِ عالم کا حال یہ ہے کہ وہ تمام پوشیدہ باتوں کو جاننے والا ہے، کوئی بات اس سے مخفی نہیں۔ قریش جو کچھ حق کا راستہ روکنے کے لیے کر رہے ہیں ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ وہ یہاں بھی اپنے علم کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرے گا اور آخرت میں بھی اسے کسی چیز کا فیصلہ کرنے میں زحمت پیش نہیں آئے گی۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾

(کہہ دیجیے کہ حق آگیا اور باطل نہ ابتداء کرتا ہے اور نہ پھیر کر لاتا ہے۔ ۴۹)

باطل کی بے ثباتی

سورۃ بنی اسرائیل کی ایک آیت میں جَآءَ الْحَقُّ کے بعد زهق الباطل ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معنوی طور پر یہاں بھی زهق الباطل کے الفاظ حذف ہیں۔ اور بعد کا جملہ اس کی تائید بھی کر رہا ہے۔ یعنی جس طرح حق وباطل کی جب کشمکش ہوتی ہے تو حق باطل کی سرکوبی کرتا ہے۔ اسی طرح جب حق آجاتا ہے تو حق وباطل کی کشمکش کے نتیجے میں باطل پسپا ہوجاتا ہے۔ قریش سے دراصل یہ کہا جارہا ہے کہ اب جبکہ حق آگیا ہے یعنی قرآن نازل ہوگیا اور نبی کریم ﷺ حجت بن کر دنیا میں تشریف لے آئے تو اب باطل اس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا۔ تو جو لوگ آج باطل کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں وہ درحقیقت ایک گرتے ہوئے گھر کی پاسبانی کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کے جملے میں باطل کی بے ثباتی کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ اور وہ دلیل یہ ہے کہ مشرکین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کا آغاز اس کے خالق نے حق کے ساتھ فرمایا۔ یعنی اس کی تخلیق میں کسی اور قوت کا کوئی دخل نہیں۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب اس کائنات کے ابداء وآغاز میں کسی باطل اور کسی اہلِ باطل کا کوئی دخل نہیں۔ تو جب اس کائنات کا اعادہ ہوگا یعنی قیامت برپا ہوگی اور ازسرنو جن وانس کو اٹھایا جائے گا تو اس وقت کسی باطل کی آمیزش کیسے ہوسکتی ہے۔ سورۃ یونس میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

Marfat.com

اِلَيۡهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ لِيَجۡزِىَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالۡقِسۡطِ ۞ ''اسی کی طرف تم سب کی واپسی ہونی ہے، یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، بے شک وہی خلق کا آغاز فرماتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ فرمائے گا تاکہ وہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے۔''

قُلۡ اِنۡ ضَلَلۡتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰى نَفۡسِىۡ ۚ وَاِنِ اهۡتَدَيۡتُ فَبِمَا يُوۡحِىۡۤ اِلَىَّ رَبِّىۡ ؕ اِنَّهٗ سَمِيۡعٌ قَرِيۡبٌ ﴿۵۰﴾

(کہہ دیجیے اگر میں گمراہ ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے، اور اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو یہ اس سبب سے ہے کہ میرا رب مجھ پر وحی بھیجتا ہے، بے شک وہ سب کچھ سنتا ہے، نزدیک ہے۔ ۵۰)

وحیِ الٰہی کی تکذیب کا انجام

آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ یہ لوگ جو نہایت جارحانہ انداز میں آپ کی مخالفت کر رہے ہیں تو انہیں کہئے کہ اگر میں تمہاری نگاہ میں ایک گمراہ آدمی ہوں تو پھر تم میری مخالفت کیوں کر رہے ہو۔ کیونکہ میری گمراہی کا وبال بہر حال مجھ ہی پر پڑے گا۔ لیکن اگر میں ہدایت پر ہوں تو پھر سوچ لو کہ تمہاری مخالفت کیا نتائج پیدا کرے گی۔ کیونکہ میرا ہدایت پر ہونا میرے ذاتی خیالات کا نتیجہ نہیں بلکہ اس وحی کا نتیجہ ہے جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر اترتی ہے۔ تم جب میری مخالفت کرتے ہو تو درحقیقت میری مخالفت نہیں کرتے ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی، اس کی ہدایت اور اس کے احکام کو جھٹلاتے ہو۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ تاریخ میں جن قوموں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کی اور ان پر نازل ہونے والے دین کی مخالفت کی، ان کا انجام کیا ہوا۔ آج وہ عبرت کے طور پر تاریخ میں یاد کیے جاتے ہیں۔ تو تم بھی اگر اسی وحی اور اسی ہدایت کی مخالفت کر رہے ہو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی انجام سے دوچار کیے جاؤ جس سے سابقہ امتیں ہو چکی ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ میں نے ازراہِ ہمدردی تمہیں اس انجام سے باخبر کیا ہے جس کی طرف تم اپنے کرتوتوں کے باعث تیزی سے بڑھ رہے ہو۔ لیکن اگر تم اس پر بھی اپنے رویے پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر تم سے کچھ کہنا بے سود ہے، میں تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں۔ اور اسی کے سامنے اپنی معروضات پیش کروں گا۔ کیونکہ وہ سننے والا بھی ہے اور قریب بھی ہے۔ اس بات کا اندیشہ نہیں کہ میری فریاد اس تک نہیں پہنچے گی۔ اور اس بات کا بھی ڈر نہیں کہ وہ شاید سن نہیں سکے گا۔ کیونکہ وہ ہر وقت سنتا ہے اور شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

وَلَوۡ تَرٰٓى اِذۡ فَزِعُوۡا فَلَا فَوۡتَ وَاُخِذُوۡا مِنۡ مَّكَانٍ قَرِيۡبٍ ﴿۵۱﴾ وَّقَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنۡ مَّكَانٍۢ بَعِيۡدٍ ﴿۵۲﴾

(کاش آپ دیکھتے جب یہ گھبرائے پھر رہے ہوں گے، پس وہ کہیں بھاگ نہ سکیں گے اور قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔ ۵۱) اور وہ کہیں گے ہم اس پر ایمان لے آئے حالانکہ اب کہاں ان کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے بعید جگہ سے۔ ۵۲)

Marfat.com

قیامت کے روز متکبرین کی بے بسی

آج جبکہ مخالفین اور معاندین آپ کی بات سننے کے روادار نہیں اور ان کے استکبار کا عالم یہ ہے کہ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے رہے لیکن وقتِ نزع یا قیامت کے دن کاش آپ ان کا حال دیکھتے۔ پھر جوابِ شرط کو محذوف فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ دنیا میں اس کی منظر کشی کسی اور منظر کے حوالے سے یا کسی تشبیہ کے ذریعے ممکن نہیں۔ آج جبکہ ان کا استکبار دیکھنے کے لائق ہے لیکن قیامت کے دن ان کی بے بسی اور ان کی ذلت اور رسوائی دیکھنے کے قابل نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو سامنے دیکھ کر گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کریں گے کہ کسی طرح اس عذاب سے بچ جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہ اس سے پہلے کوئی بچا ہے اور نہ یہ بچ سکیں گے۔ جیسے ہی بھاگنا چاہیں گے قریب ہی سے ہاتھ آگے بڑھے گا اور ان کو اپنی تحویل میں لے لے گا۔ ایسا معلوم ہوگا کہ پکڑنے والا ہاتھ پہلے ہی سے ان کو اپنے حصار میں لے چکا تھا۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ہمارے بچ نکلنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں اور قدرت کا ہاتھ ہمیں اپنی گرفت میں لے چکا ہے تو ان کی بے بسی ان کی اصل حقیقت اور پیغمبر کی دعوت کی صداقت کو ان پر منکشف کر دے گی۔ اور وہ فرعون کی طرح کہ جب قلزم کی موجوں نے اسے پکڑا تو وہ پکار اٹھا کہ وہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے رب پر ایمان لایا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو یہ جواب ملا اٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ مِنْ قَبْلُ ''اب ایمان لائے، حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی۔'' یہ بھی پکار اٹھیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ ضمیر کا مرجع قرآنِ کریم بھی ہوسکتا ہے اور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی بھی۔ اور وہ تمام تعلیمات بھی ہوسکتی ہیں جن کی دعوت نبی کریم ﷺ دے رہے تھے۔ اور ان کے ایمان کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا جائے گا کہ ایمان کی جگہ تو دنیا ہے کیونکہ وہی دار العمل ہے۔ آخرت تو دار الجزاء ہے۔ اور وہ دار العمل تم اپنے پیچھے بہت دور چھوڑ آئے ہو۔ اب ان کے لیے اس چیز کا پالینا کسی طرح ممکن نہیں جسے وہ بہت دور چھوڑ آئے ہیں۔

تَـنَـاوُش کا معنی ہاتھ بڑھا کر کسی چیز کو اٹھا لینے یا پکڑ لینے کے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ہاتھ بڑھا کر وہی چیز اٹھائی جاسکتی ہے جو بہت دور نہ ہو، ہاتھ وہاں تک پہنچ سکے۔

وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾

(اور اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور دور سے اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے۔ ۵۳)

قذف کے معنی کوئی چیز پھینک کر مارنے کے آتے ہیں۔ قَـذَفَ بِـالْـحِـجَـارَةِ کے معنی ہیں اس نے پتھر پھینکا۔ قذف بالقول بے سوچے سمجھے بات پھینک ماری۔ یہ عرب کا محاورہ ہے کہ جو شخص بلا دلیل محض اپنے خیال سے باتیں کرتا ہے اس کو رجم بالغیب اور قذف بالغیب کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب دیکھنے کے بعد وہ ایمان کا اقرار کریں گے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اس کا انکار کر چکے اور دور سے بے سروپا باتیں کہتے رہے اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے۔ طرح طرح کے اعتراض کرتے، الزامات لگاتے، آوازے کستے اور فقرے چست کرتے تھے، کبھی اللہ تعالیٰ کی کتاب کو من گھڑت قرار دیتے، کبھی اللہ تعالیٰ کے رسول کو مجنون اور کبھی ساحر کہتے۔ آخرت کے حوالے سے عجیب و غریب باتیں چھانٹتے۔ اور اب جبکہ عذاب سامنے آگیا ہے تو انہیں ایمان کا دعویٰ سوجھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اقرار بعد از وقت اور محض دفع الوقتی ہے۔

Marfat.com

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَايَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾

(اوران کے اوران کی چاہتوں کے درمیان دیوار حائل کردی جائے گی ،جس طرح اس سے پہلے ان کے ہم مشربوں کے ساتھ کیا گیا، بے شک وہ بھی گمراہ کن شک میں پڑے رہے۔ ۵۴)

امیدوں کا اختتام

گزشتہ آیت کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ لوگ عذاب کو سامنے دیکھ کر ایمان لانے کا اعلان کریں گے، لیکن اس کو بری طرح رد کردیا جائے گا۔ وہ مہلت کی درخواست کریں گے کہ ہمیں ایک دفعہ پھر دنیا میں جانے کی اجازت دی جائے وہاں ہم وہی زندگی اختیار کریں گے جس کی دعوت اللہ تعالیٰ کے رسول دیتے رہے ہیں اور ہم کسی مرحلے پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ لیکن ان کی اس درخواست کو بھی شرف قبول نہیں بخشا جائے گا۔ دنیا میں جن قوتوں کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا تھا اور جن کی شفاعت کے بھروسے پر انہوں نے زندگی گزاری تھی، وہ آرزو کریں گے کہ شاید وہ ان کے کام آئیں۔ لیکن کہیں بھی کوئی فریاد رسی نہیں ہوگی۔ اس طرح سے ان کے اوران کی تمام چاہتوں کے درمیان دیوار حائل کردی جائے گی۔ اور امید کے تمام دروازے ان پر بند کردیے جائیں گے۔ ایک ایسی مایوسی کا بادل ان پر چھا جائے گا جس سے کبھی نکلنا نہیں ہوگا۔ اور یہ اسی صورتحال سے دوچار ہوں گے جس طرح کی صورتحال سے ان سے پہلے کی معذب قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔ اَشْیَاع شیعہ کی جمع ہے۔ کسی شخص کے تابع اور ہم خیال کو اس کا شیعہ کہا جاتا ہے۔ اس سے اشارہ ان قوموں کی طرف ہے جو اس سے پہلے اپنے رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کی دعوت کے مقابلے میں نہایت سرکشی اور تکبر کا اظہار کیا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے آ پکڑا تو ساری ہیکڑی بھول گئی اور لگے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگنے اور اپنی نیکی کا یقین دلانے۔ لیکن ان میں سے کسی کی درخواست کی شنوائی نہ ہو سکی۔ آخر وہ عذاب کی نذر کردیے گئے۔ قرآنِ کریم کے مخاطب اگر انہیں کی طرح اپنی حالت پر غور نہیں کرتے اور اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے تو یقیناً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس انجام سے وہ قومیں دوچار ہوئیں۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ فَاطِرٍ

(۳۵)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ فَاطِرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام فَاطِر ہے۔ یہ اس کی پہلی ہی آیت سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول:۔ تمام مفسرین کے نزدیک یہ سورۃ مکی ہے۔ اس سورۃ میں بیان کردہ مضامین بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اندازِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے نزول کا زمانہ مکہ معظمہ کا دورِ متوسط ہے جبکہ حق و باطل کی کشمکش میں تیزی پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

پہلی تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے جامع الصفات تصور کو دلوں میں اتارنے اور اس سے والہانہ تعلق پیدا کرنے کے لیے حمد سے سورۃ کا آغاز کیا گیا ہے جس میں تعریف اور شکر دونوں شامل ہیں۔ اور اس کی دلیل کے لیے اللہ تعالیٰ کو زمین و آسمان کے خالق کے طور پر پیش فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ انسان کو جس قدر بھی نعمتیں میسر ہیں وہ روحانی ہوں یا جسمانی ان کا تعلق زمین یا آسمان سے ہے۔ پھر ساتھ ہی فرشتوں کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ اہلِ عرب کے تصورِ الوہیت و عبادت میں انہیں سب سے زیادہ دخیل مانا جاتا تھا۔ اور جن قوتوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا گیا تھا ان میں ملائکہ کی سب سے زیادہ اہمیت تھی۔ اس لیے سب سے پہلے ملائکہ کی اصل حیثیت کو واضح کیا گیا۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ ان کی تمام تر قوتیں اللہ تعالیٰ ہی اطاعت اور فرماں برداری میں صرف ہوتی ہیں۔ انہیں بذاتِ خود اختیار و اقتدار حاصل نہیں۔ انسانوں کے تمام معاملات اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔ وہ کسی کو کچھ بخشنا چاہے تو کوئی اس کی بخشش کو روک نہیں سکتا۔ اور روکنا چاہے تو کوئی اس سے باصرار دلوا نہیں سکتا۔ وہی بے پایاں قدرتوں کا مالک، سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جو ذات خالق بھی ہے اور رزق و فضل کی مالک بھی، اسے نظر انداز کر کے کسی اور کو اِلٰہ مانا جائے یا اس کی الوہیت میں شریک کیا جائے۔

اس کے بعد آٹھویں آیت تک آنحضرت ﷺ کو یہ کہہ کر تسلی دی گئی ہے کہ اگر آپ کی قوم آپ کی تکذیب کر رہی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں، اس سے پہلی قوموں نے بھی اپنی طرف مبعوث ہونے والے پیغمبروں کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔ اور ساتھ ہی مخالفت کرنے والوں کو دھمکی دی گئی ہے کہ انہیں سابقہ امتوں کے انجاموں پر بھی غور کرنا چاہیے۔ انہیں اگر ان کے نقوشِ قدم پر چلنا ہے تو پھر اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں۔ کیونکہ معاملات ان کے تابع نہیں، ہر معاملے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ قیامت کا آنا ایک طے شدہ عمل ہے جس میں تخلف نہیں ہو سکتا۔ انہیں اپنی دنیوی کامیابیوں سے کسی دھوکے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے اور نہ شیطان کے پھندوں میں پھنسنا چاہیے، وہ انسانوں کا کھلا دشمن ہے، اس سے بڑا نادان اور کون ہوگا جو اپنے مسلمہ دشمن کو اپنا دوست بنا لے۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کو مزید تسلی دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کے اعمال ان کی نگاہوں میں مزین کر دیے گئے ہیں، اس کے نتیجے میں یہ حُسن و قبح کے معیار سے محروم ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے قانون کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ان کے انجام کو دیکھتے ہوئے آپ کو دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کریں۔

اس کے بعد دو آیتوں میں جھلستی ہوئی زمین میں بارش کی تاثیر سے ہونے والی تبدیلی سے استدلال فرماتے ہوئے قیامت کے وقوع پر توجہ دلائی گئی ہے۔ اور یہ تنبیہ بھی فرمائی گئی ہے کہ حشر کے دن جو شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں تقرب چاہتا ہے اسے جھوٹے سہاروں سے زندگی وابستہ نہیں کرنی چاہیے۔ قیامت کے دن فرضی دیویوں اور دیوتاؤں کے بل پر کسی کو تقرب حاصل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کام آنے والی چیز کلمۂ طیبہ ہے۔ اور اس کلمۂ طیبہ کو رفعت اور سر بلندی عملِ صالح سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ہٹ کر ہر راہ فریبِ نفس کی راہ ہے اور اس کا انجام تباہی ہے۔

گیارہ سے اٹھارہ تک آیتوں میں اپنی غیر معمولی نعمتوں کا ذکر فرما کر جن کا تعلق انسانی غذا سے بھی ہے اور انسانی زندگی کی بقا کے اسباب سے بھی، جذبۂ شکر کو ابھارا گیا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے اس کی حاکمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ان قوتوں کی بے بسی اور ناطاقتی جنھیں انسانوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک کر رکھا ہے، کی طرف اشارہ فرما کر شرک کے نامعقول ہونے اور قیامت کے دن کی رسوائی کو مستحضر فرمایا گیا ہے۔ اور انسانوں کو تنبیہ کرتے ہوئے اس حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر تم نے اپنے خالق اور رب اور محسن کی قدر نہ کی تو اپنا ہی کچھ بگاڑو گے، اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ تمہارا احتاج نہیں، تم سب اس کے محتاج ہو۔ اور ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ آپ کی دعوت صرف ان لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہے جن کے اندر زندگی کی کچھ رمق باقی ہے۔ جو بالکل مردہ ہیں انھیں ان کے انجام کے سپرد کر دیجیے، وہ تمہاری دعوت کو قبول کرنے کے اہل نہیں ہیں۔

آیت انیس سے اٹھائیس تک ایمان لانے والوں اور کفر کرنے والوں میں تقابل کر کے دکھایا گیا ہے، ایک اندھا ہے اور دوسرا دیکھنے والا، ایک طرف ظلمتیں ہیں اور دوسری طرف روشنی، ایک طرف سایہ ہے اور دوسری طرف گرمی، ایک طرف زندگی ہے اور دوسری طرف موت، کیا ان دونوں کو برابر قرار دیا جاسکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت زندگی کی ضمانت بن کر آئی ہے۔ وہ بشیر بھی ہیں اور نذیر بھی۔ آپ سے پہلے بھی رسول آچکے۔ جب ان قوموں نے ان کی تکذیب کی تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسا عذاب آیا۔ آنحضرت ﷺ کے مخالفین کو ان حقائق اور تاریخی واقعات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

آیت انتیس سے اڑتیس تک ان علمائے اہلِ کتاب کی تحسین و حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے جو تمام بگاڑ اور فساد کے باوجود اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قائم ہیں۔ ان کے بارے میں امید کی جاتی ہے کہ وہ قرآن پر ایمان لانے کی سعادت حاصل کریں گے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم کی حقیقت اور عظمت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اور اس کے قبول کرنے والوں کو اُمّی ہونے کے باوجود اس قرآن کے ذریعے سے دنیا کی امامت بخشی ہے۔ ان میں بھی ناقدرے، ناشکرے اور اعتدال پسند ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اور نیکی کی راہوں میں سبقت کرنے والے بھی ہیں۔ ناقدری کی صورت میں یہ لوگ بھی سابقہ امتوں کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ اور قدر دانی اور شکر کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے مستحق ٹھہریں گے۔ دنیا بھی ان کے لیے ہوگی اور آخرت میں بھی ہمیشہ کے باغات ان کا مستقر بنیں گے اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ان کے شاملِ حال ہوگا۔ اور جو لوگ اس عظیم نعمت کی ناشکری کریں گے ان کے لیے جہنم کی آگ ہے اور وہ بدترین عذاب کا شکار ہوں گے۔

Marfat.com

آیت انتالیس سے اکتالیس تک قریش کو براہِ راست وعید کرتے ہوئے فرمایا کہ جیسے تم سے پہلے بہت سی قومیں اس زمین پر زندگی گزار چکی ہیں، اسی طرح تمہیں ان کا جانشین بنایا۔ تمہارے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے گا جو تم سے پہلی امتوں کے ساتھ کیا گیا۔ تمہارے اعمال بھی اسی میزان میں تلیں گے جس میں پہلوں کے اعمال تلتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اگر تمہیں ڈھیل دے رکھی ہے تو اس کو اپنی کامیابی نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے خسارے میں اضافہ ہے۔ جب وہ پکڑے گا تو تمہارے مزعومہ شرکاء تمہیں چھڑا نہیں سکیں گے۔ تم نے فرضی معبودوں کے لیے جن قدرتوں کا تصور باندھ رکھا ہے ان کا پول قیامت کے دن کھل جائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔ لیکن اس کی تاخیر بھی بے انتہا نہیں، اس کی ایک اَجل ہے۔ جب وہ اَجل آ جائے گی تو پھر تقدیم و تاخیر نہیں ہوگی۔

آیت بیالیس سے پینتالیس تک قریش کو یاد دلایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے تم ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر تمہارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو تم دنیا کی سب سے زیادہ فرماں بردار قوم بنو گے۔ لیکن جب وہ آ گیا تو تم اپنے دعووں کے برعکس اس کے خلاف ہر طرح کی سازشوں میں سرگرم ہو گئے۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب کیسے ہولناک نتائج پیدا کرتی ہے۔ حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ پہلی امتیں اسی باعث کس صورتحال سے دوچار ہو چکی ہیں۔

Marfat.com

رُکُوْعَاتُهَا ۵	سُوْرَةُ فَاطِرٍ مَّكِّيَّةٌ (۳۵)	اٰيَاتُهَا ۴۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا
اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱﴾ مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ
فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا یُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ؕ وَ
هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲﴾ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ؕ
هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳﴾ وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ
رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴﴾ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ
وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ٝ وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ
الْغَرُوْرُ ﴿۵﴾ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا یَدْعُوْا
حِزْبَهٗ لِیَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ﴿۶﴾ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ
شَدِیْدٌ ؕ۬ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ
كَبِیْرٌ ﴿۷﴾ ع

Marfat.com

رکوع: ۱۔ (ہر طرح کی خوبصورت تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار پروں والے پیغام رساں بنانے والا ہے، وہ مخلوق میں جو چاہے اضافہ کر دیتا ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱) اللہ جس رحمت کا دروازہ لوگوں کے لیے کھول دے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں اور جسے وہ روک دے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں اور وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔ ۲) اے لوگو! تم پر جو اللہ کے احسانات ہیں ان کو یاد رکھو، کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق بہم پہنچاتا ہو، کوئی معبود نہیں اس کے سوا، تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔ ۳) اے پیغمبر! اور اگر یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں (تو کوئی تعجب کی بات نہیں) آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے گئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملے لوٹائے جاتے ہیں۔ ۴) اے لوگو! بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے، پس تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے بارے میں وہ بڑا دھوکہ باز تمہیں فریب میں رکھے۔ ۵) بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے، پس تم بھی اس کو اپنا دشمن ہی سمجھو، وہ تو اپنی جماعت کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ اہلِ جہنم میں شامل ہو جائیں۔ ۶) جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے، اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔ ۷)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱

(ہر طرح کی خوبصورت تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار پروں والے پیغام رساں بنانے والا ہے، وہ مخلوق میں جو چاہے اضافہ کر دیتا ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱)

اعمال کی اصلاح کا انحصار عقائد کی اصلاح پر ہے

مکی سورتوں میں بنیادی طور پر زور اصلاحِ عقائد و اخلاق پر ہے۔ اور عقائد کی بنیاد چونکہ تصورِ توحید پر ہے اس لیے بیشتر گفتگو اسی عقیدے پر ہوتی ہے۔ کیونکہ رسالت اسی عقیدے کا ایک جزو ہے۔ اور آخرت اسی عقیدے کا نتیجہ ہے۔ اگر عقیدۂ توحید میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو رسالت اور آخرت کے عقیدے میں بیش از بیش خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور مزید یہ کہ انسانی اعمال کی اصلاح کا دارومدار انسانی خیالات و تصورات کی اصلاح پر ہے۔ اگر دل و دماغ میں غلط خیالات اور موہوم تصورات جگہ بنا لیتے ہیں تو انسانی اعمال کی خیر و خوبی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جس انسان کے دل میں سیم و زر کی محبت اور درہم و دینار کی قوت جگہ بنا چکی ہے اس شخص سے سخاوت اور فیاضی کا ظہور خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ اور جس شخص میں زندگی سے پیار اور موت کا خوف اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے اس سے اولوالعزمی، ایثار و قربانی اور کسی مقصد کے لیے جان پر کھیل جانے کی امید حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ جو شخص دوسروں کے حقوق پر دست درازی مباح سمجھتا ہے اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ

Marfat.com

چوری، غبن اور خیانت کا ارتکاب نہیں کرے گا سوءِ فہم کے سوا کچھ نہیں۔ اگر پیشِ نظر یہ ہو کہ اعمال کی ان خرابیوں کو دور کیا جائے تو لازم ہے کہ جن خیالات کے نتیجے میں یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان خیالات کی اصلاح کی جائے۔ اور خیالات اور تصورات کی اساس چونکہ تصورِ توحید ہے اس لیے انسانی اصلاح کے لیے سب سے زیادہ زور توحید ہی پر دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ جب دلوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کا بے پایاں علم، اس کا شہود، اس کی بے پایاں قدرت کا استحضار پختہ ہو جائے گا تو انسان ہر عمل سے پہلے سو دفعہ سوچنے پر مجبور ہوگا۔ مکی زندگی میں چونکہ انسانی اصلاح کا آغاز ہوا اور اس جماعت کے افراد کی تیاری کا کام شروع ہوا جس نے آگے چل کر اس دھرتی کی قسمت سنوارنا تھی تو ان کے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لیے ان کے خیالات پاکیزہ بنائے گئے اور ان کے دلوں میں اس طرح تصورِ توحید کو اتارا گیا کہ یہ عقیدہ غیب و حضور میں کبھی ان سے منفک نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت اپنے سامنے اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھتے تھے۔ اس راستے میں انہوں نے اذیتیں برداشت کیں، زندگی کا ہر دکھ جھیلا لیکن ہراساں ہونے کی بجائے اعمال و اخلاق کے اعتبار سے بیش از بیش پاکیزہ اور پختہ ہوتے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ چل کر جب ان پر بڑی سے بڑی ذمہ داریاں ڈالی گئیں تو ان کے ارادہ و عمل اور امانت و دیانت میں کہیں جھول پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کے سیرت و کردار کی بنیاد نہایت صالح خیالات اور افکار پر اٹھائی گئی تھی۔ اکبر نے اسی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ٹھیک کہا:

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

عقیدۂ توحید اور حمد میں ربط

یہ وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے تمام مکی سورتوں کا آغاز بالعموم عقیدۂ توحید یا دوسرے عقائد سے ہوتا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں عقیدۂ توحید ہی سے بات کا آغاز ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی ابتدا حمد سے کی جا رہی ہے۔ حمد تعریف کو بھی کہتے ہیں اور شکر کو بھی۔ ان کا منشا ایک ہے اور نتیجہ بھی ایک ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت کسی کے دل میں گھر کر جاتی ہے اور اس کے بے شمار احسانات کا احساس دل میں اتر جاتا ہے اور اس کی بندگی اور پرستش دل میں مچلنے لگتی ہے تو بے اختیار اس کی زبان سے حمد کے ترانے پھوٹتے اور شکر کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ اس آیت کا آغاز بھی ایسے ہی احساسات سے ہو رہا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم چونکہ کتابِ دعوت بھی ہے اس لیے اس نے الحمد للہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس پر دلیل بھی پیش کی۔ یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اس کی تعریف و تحسین اور اس کے تشکر و امتنان کا اظہار کیوں نہ کریں جبکہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ جس زمین پر انسان چلتا ہے اور جس سے اس کی بے شمار نعمتیں متعلق ہیں اور جس آسمان کی چھت کے نیچے رہتا ہے اور وہاں سے ہر وقت اس پر نعمتیں برستی ہیں اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت کا احساس ہوتا ہے کیونکہ وہ صرف پیدا کرنے والا ہی نہیں بلکہ وہ فاطر ہے یعنی اس نے پہلی دفعہ بغیر سامنے کسی نمونے اور بغیر اسباب کے صرف اپنے طور پر ایک کائنات کو خلق کیا اور انسان اس کائنات کا ایک حصہ ہے جس کے اور چھور کا اسے کوئی اندازہ نہیں۔ تو خود بخود اس کی زبان سے اس کی تعریف اور تشکر کے کلمات پھوٹنے لگتے ہیں۔

Marfat.com

عقیدۂ توحید پر دلیل اور شرک کا رد

اس کے ساتھ ہی پروردگار نے اس دلیل کو آگے بھی بڑھایا ہے اور دفع دخلِ مقدر کی علمی ضرورت کو پورا بھی فرمایا ہے۔ دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا پروردگار اتنا عظیم ہے کہ اس نے فرشتوں جیسی پاکیزہ اور طاقتور مخلوق کو بھی اس طرح پیدا فرمایا ہے کہ وہ اس کے عاجز غلاموں کی طرح اس کے قاصد بن کر جا بجا اس کے پیغام اور احکام پہنچاتے ہیں۔ جہاں تہاں بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول مبعوث کیا گیا ہے یہ وہاں اللہ تعالیٰ کے پیغامات لے کر پہنچتے ہیں۔ اور کائنات کے ایک ایک گوشے میں مخلوقات کی ضروریات کو بہم پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے قاصد کا فرض انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ رسول جس کی جمع رُسل ہے۔ جس طرح پیغام بری کرنے والے کو کہتے ہیں اسی طرح ضروریات پوری کرنے والے اور احکام پہنچانے والے کو بھی کہتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سب فرشتے ایک جیسے نہیں۔ ان میں سے کسی کے دو پَر ہیں، کسی کے تین اور کسی کے چار۔ اَجْنِحَةٍ جناح کی جمع ہے۔ بازو کو بھی کہتے ہیں اور پَر کو بھی۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ لیکن جس بے تکلفی سے اس لفظ کو استعمال کیا گیا اس سے اس بات کا امکان معلوم ہوتا ہے کہ یہ پَر ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہو۔ رہی یہ بات کہ ان کے پَر یکساں نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پَروں والی مخلوق ہیں اور قوتِ پرواز رکھتے ہیں۔ لیکن اپنے فرائض کے اعتبار سے یکساں قوتِ پرواز کے مالک نہیں بلکہ ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جسے جتنی زیادہ تیز رفتاری بخشی گئی ہے اسے اتنے ہی پَر دیے گئے ہیں۔ یہاں اگرچہ چار تک کے پَروں کا ذکر ہے لیکن چار پَروں پر حصر نہیں۔ آیت کا اگلہ جملہ اشارہ دیتا ہے کہ اس سے زیادہ پَروں والے فرشتے بھی پیدا کیے گئے ہیں اور وہ اپنی قوتِ پرواز میں دوسروں پر بدرجہا فائق ہیں۔ اس کی تائید حضرت عبداللہ ابنِ مسعود کی روایت سے ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو اس شکل میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پَر تھے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ ؓ نے بیان فرمایا ہے کہ حضورؐ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دو مرتبہ ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے، ان کے چھ سو بازو تھے اور وہ پورے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا پروردگار کیسی بے پایاں قدرتوں کا مالک ہے۔ اس کی بے شمار مخلوقات میں سے فرشتے بھی اس کی ایک مخلوق ہیں اور اس نے ان کو کتنی قدرتیں اور کیسا وسیع جسم دے کر پیدا کیا ہے۔ لیکن اپنی تمام جسامت اور وجاہت کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار قاصد ہیں جو نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ مشرکین ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ اگر یہ خوش ہیں تو پروردگار بھی خوش ہے۔ اور اگر یہ ناراض ہو جائیں تو پروردگار کے عذاب سے ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ اس لحاظ سے انہوں نے ان کو دیویوں اور دیوتاؤں کا درجہ دے کر ان کی بندگی اپنے اوپر فرض کر رکھی تھی۔ انہیں سے استمداد کرتے، انہیں کے مجسمے تراشتے اور انہیں کی پوجا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو ماننے کے باوجود عضوِ معطل بنا رکھا تھا۔ چنانچہ اسی تصور کے ازالے کے لیے یہاں خاص طور پر فرشتوں کا ذکر کیا گیا کہ ان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار قاصدوں کی ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں کوئی حصہ نہیں، وہ اس کے پیغام رساں ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے والے ہیں۔ یہ کس قدر حماقت ہے کہ مشرکین نے ان قاصدوں کو مقصود بنا رکھا ہے اور ان نامہ بروں کو محبوب کا درجہ دے رکھا ہے۔ اس طرح سے وہ عامل جو توحید کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تھا اس کی تردید فرما کر تصورِ توحید کو اجاگر فرمایا گیا ہے۔

Marfat.com

یَـزِیۡـدُ فِی الۡخَلۡقِ مَایَشَآءُ ...... اللہ تعالیٰ کو سب اختیار ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کی تخلیق میں جتنی چاہے اور جس قسم کی چاہے زیادتی کرے۔ اس نے فرشتوں کو اگر اپنی پیغام بری کے لیے پیدا کیا تو یہ بھی اس کی قدرت وحکمت کا کرشمہ ہے۔ اور اگر ان کے درجات میں تفاوت رکھا تو یہ بھی اسی کی قدرت کی ایک شان ہے۔ اور اگر وہ ان کی صلاحیتوں اور قوتوں میں اضافہ کرنا چاہے تو اس پر بھی وہ قادر ہے۔ یعنی ان کے پَر دو چار میں محصور نہیں، وہ اگر چاہے تو ان میں بے پناہ اضافہ کرسکتا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ اس زیادتِ خلق سے عام معنی مراد ہیں۔ ان میں فرشتوں کے پَروں کی زیادتی بھی شامل ہے اور دیگر مخلوقات اور بالخصوص انسانوں کی خاص خاص صفات کی زیادتی بھی مراد لی جاسکتی ہے جس میں حُسنِ صورت، حُسنِ سیرت، حُسنِ صوت اور کمالِ علم وعقل سب داخل ہیں۔ لیکن ان سب میں اصل حُسن اسی ذاتِ والا صفات کا جھلکتا ہے اور وہی مراد بھی ہے جسے ہم پروردگارِ عالم کہتے ہیں۔ وہی ہر طرح کی تعریف کے لائق اور ہر طرح کے شکر کا مستحق ہے۔

مَـا یَـفۡتَـحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنۡ رَّحۡمَةٍ فَلَا مُمۡسِکَ لَهَا ۚ وَمَا یُمۡسِکۡ ۙ فَلَا مُرۡسِلَ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۲﴾

(اللہ جس رحمت کا دروازہ لوگوں کے لیے کھول دے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں اور جسے وہ روک دے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ ۲)

توحید پر ایک اور دلیل

مشرکین جس طرح فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور اس کی قدرت میں دخیل سمجھتے تھے، اسی طرح جنات اور بعض دوسری قوتوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے شریک کے طور پر پکارتے اور ان کی بندگی بجالاتے تھے۔ اور انہیں گمان یہ تھا کہ ان قوتوں کے خوش رہنے سے انہیں زندگی کی ہر چیز اور ہر راحت میسر آسکتی ہے۔ اور اگر قیامت آئی تو یہی قوتیں ان کے لیے شفیع ثابت ہوں گی۔ چنانچہ عقیدۂ توحید کے ضمن میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ان سے فرمایا گیا ہے کہ عطاوبخشش اور دادودہش اور محرومی اور نامرادی میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں۔ وہ جس پر رحمت کا دروازہ کھولتا ہے، کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کو بند کرسکے۔ اور جس کے لیے رحمت کا دروازہ بند کردیتا ہے، کوئی ایسی ذات نہیں جو اسے کھول سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زبردست، سب پر غالب اور کامل اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ زبردست ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی ہے۔ یہ کھولنا اور باندھنا تمام تر اس کی حکمت کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے۔ وہ جو فیصلہ بھی کرتا ہے سراسر حکمت کی بناء پر کرتا ہے۔ جب وہ کسی کو دیتا ہے تو حکمت اس کی مقتضی ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی سے روکتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اسے دینا حکمت کے خلاف ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ آیتِ کریمہ میں رحمت کا جو لفظ آیا ہے وہ عام ہے، اس میں دینی واخروی سب نعمتیں شامل ہیں۔ مثلاً ایمان، علم، عملِ صالح اور نبوت وولایت جیسی نعمتیں بھی اس سے مراد ہیں۔ اور دنیوی نعمتیں بھی جیسے رزق، اسبابِ رزق، آرام وراحت، صحت وتندرستی اور رفاہیت وعزت وغیرہ پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ایک حدیث سے اس مفہوم کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے حضرت معاویہؓ کو ایک حدیث لکھ کے بھیجی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو جب آپ نماز سے فارغ ہوئے یہ کلمات پڑھتے ہوئے سنا: اَللّٰهُمَّ لَا مَـانِعَ لِمَا اَعۡطَیۡتَ وَلَا مُعۡطِیَ لِمَا مَنَعۡتَ وَلَا یَنۡفَعُ ذَاالۡجَدِّ مِنۡکَ الۡجَدُّ "یا اللہ! جو چیز آپ کسی کو عطا فرمادیں اس کو کوئی روکنے والا

Marfat.com

نہیں، اور جس کو آپ روک دیں اس کو کوئی دینے والا نہیں، آپ کے ارادے کے خلاف کسی کوشش کرنے والے کی کوشش نہیں چلتی‘‘ مقصود اس طرح کی آیات سے چونکہ دلوں میں عقیدۂ توحید کو پختہ کرنا اور اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد کو راسخ کرنا ہے تو ہم صحابہؓ کو دیکھتے ہیں کہ وہ ان آیات سے یہی سبق سیکھتے تھے اور اسی سے ان کی زندگیاں عبارت تھیں۔ حضرت عامر بن قیسؒ فرماتے ہیں کہ میں صبح کو اگر یہ چار آیتیں تلاوت کرلوں تو پھر مجھے یہ فکر نہیں رہتی کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہ آیتیں یہ ہیں: مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ دوسری آیت اسی کے ہم معنی یہ ہے: اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ، وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ، تیسری آیت: سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ، چوتھی: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (اخرجه ابن المنذر، روح المعانی)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳﴾

(اے لوگو! تم پر جو اللہ کے احسانات ہیں ان کو یاد رکھو، کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق بہم پہنچاتا ہو، کوئی معبود نہیں اس کے سوا، تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔ ۳)

الوہیت پر دلیل

نعمت کا لفظ یہاں اسمِ جنس کے طور پر استعمال ہوا ہے اس لیے اس سے مراد کوئی ایک نعمت بھی لی جاسکتی ہے اور بے شمار نعمتیں بھی۔ کہنا یہ ہے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں اور احسانات ہیں جنہیں تم کبھی اپنے دست وبازو کی محنت اور دماغ کی قوت کا نتیجہ سمجھتے ہو اور کبھی انہیں غیر اللہ کی طرف منسوب کرنے لگتے ہو۔ حالانکہ تمہیں خوب معلوم ہے کہ یہ نعمتیں تمہیں کس نے دی ہیں۔ سب سے بڑی نعمت تمہارا اپنا وجود ہے جو جسم اور جان سے مرکب ہے۔ اسے نہ تم نے خود خلق کیا ہے اور نہ اس کے خلق میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ ہے۔ اسی طرح تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس جسم وجان کے رشتے کو باقی رکھنے اور اس کی ضروریات کو فراہم کرنے میں کس کی بخششیں کارفرما ہیں۔ اس کی غذا زمین سے نکلتی ہے۔ جس میں بیک وقت زمین کی قوتِ روئیدگی، ہواؤں کی بخشش، پانی کی سیرابی اور آسمان سے سورج کی گرمی اور چاند کی حلاوت اپنا فرض انجام دیتی ہے۔ اور یہ نعمتوں کی فراہمی جسے رزق رسانی کا عمل کہنا چاہیے آپ سے آپ وجود میں نہیں آتی بلکہ کسی ایک ذات کا حکم ہے جو متضاد اور متخالف عناصر کو باہمی توافق اور انسان کی خدمت پر مجبور کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں تمہیں رزق میسر آتا ہے۔ اس لیے اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ لوگو، یہ بتاؤ کہ تم جن بے شمار نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہو اور جس جسم وجان سے تمہاری شخصیت تعمیر ہوئی ہے کیا اس کا خالق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی ہے۔ تو تم اس کو جواب دو یا نہ دو، لیکن تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ ہمارا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے اور ہماری ضروریات کا فراہم کرنے والا اور بے شمار انعامات سے نوازنے والا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ دنیا میں معمولی عقل والا آدمی بھی یہ بات سمجھتا ہے کہ جو ذات کسی چیز کو خلق کرتی ہے وہ چیز اسی کے حکم کے تابع اور اسی کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اور اسی طرح جو شخص کسی پر احسانات کرتا اور انعامات سے نوازتا ہے ممنونِ احسان شخص اسی کے احکام کو بجالاتا اور اسی کی تعریف میں رطب اللسان رہتا ہے۔ اور اس کے اعضاء وجوارح اس کی

Marfat.com

اطاعت کے لیے آمادۂ عمل رہتے ہیں۔ اگر تمہارے اعتراف کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی تمہارا خالق ہے اور وہی تمہیں نوازنے والا ہے تو پھر بتاؤ تمہارا اِلٰہ کون ہے؟ کس کی بندگی تم پر لازم ہے، کس کی پرستش تمہیں زیب دیتی ہے؟ تم اس کا جواب دو یا نہ دو، لیکن کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا اِلٰہ اور معبود ہے جس نے تمہیں خلق کیا ہے اور جس نے تمہاری رزق رسانی کا سامان مہیا کیا ہے۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوالات کو زبان دی تھی۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب
دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ فَقَدۡ كُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ‌ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ④

(اے پیغمبر! اور اگر یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں (تو کوئی تعجب کی بات نہیں) آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے گئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملے لوٹائے جاتے ہیں۔ ۴)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر قریش اور دوسرے لوگ آپ کی تکذیب کر رہے ہیں اور آپ کی نبوت کو ماننے سے انکاری ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ نہ آپ پہلے رسول ہیں، نہ آپ کی مخالفت پہلا تجربہ ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول آچکے اور بہت سے رسولوں کی امتوں نے ان کی تکذیب کی۔ ان کے حُسنِ سیرت کے اعتراف کے باوجود ان کی نبوت کو ماننے سے انکار کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قومیں بگاڑ کا شکار ہو جاتی ہیں تو وہ اس طرح اپنے غلط مقاصد، نفسانی اغراض اور غلط طرزِ عمل کی گرفت میں آجاتی ہیں کہ انہیں کے اندر کا بہترین فرد جسے وہ سب سے بہتر خیال کرتے ہیں جب وہ ان کی اصلاح کے لیے نبوت و رسالت کا داعی بن کر اٹھتا ہے تو ان کے سارے اعترافات دھرے رہ جاتے ہیں اور وہ محض اس لیے پیغمبر کی بات سننا گوارا نہیں کرتے کہ انہیں اپنے طرزِ عمل کو بدلنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ یہ ایک ایسی تاریخی صداقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ آپ کے مخاطب بھی اگر اسی راستے پر چل نکلے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس میں آپ کی کسی کوتاہی کا دخل ہے، بلکہ یہ اسی مخصوص ذہنیت کا اظہار ہے جو ہر رسول کے دور میں اس کی امت کی جانب سے ہوتا رہا ہے۔ اس کے بعد تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ نفسانی اغراض کے مارے ہوئے لوگوں کی جانب سے کسی کی تکذیب کوئی معنی نہیں رکھتی، کیونکہ یہ تو اپنے

Marfat.com

غلط جذبات کی گرفت میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ اصل فیصلہ تو وہاں سے ہوگا جہاں تمام معاملات کے فیصلے لکھے جاتے ہیں۔ وہ جگہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ ہے جہاں تمام معاملات لوٹائے جاتے ہیں۔ اس کی بارگاہ سے کبھی خلافِ عدل فیصلہ نہیں ہوتا۔ آپ اسی کے بھروسے پر اپنا کام جاری رکھئے اور اپنے معاملے کو اس کے سپرد کر دیجیے۔ وہ وقت دور نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا فیصلہ آئے گا جس سے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ سچا کون تھا اور جھوٹا کون؟ اور جھوٹے آخر اپنے انجام کو پہنچیں گے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۥ وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۵﴾

(اے لوگو! بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے، پس تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے بارے میں وہ بڑا دھوکے باز تمہیں فریب میں رکھے۔ ۵)

ایک تنبیہ اور دھمکی

گزشتہ آیت کے آخر میں مخالفین کو جو دھمکی دی گئی تھی اسی کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ جو دنیا کے معاملات کو ہمیشہ دنیا کے حوالے سے دیکھتے ہو اور دنیا کے فیصلوں کو حرفِ آخر سمجھتے ہو، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دنیا آخرت کی تیاری کی جگہ ہے۔ ایک مہلت دی گئی ہے جس میں ہر انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی تیاری میں لگا ہوا ہے۔ جو لوگ اس آنے والے دن کو حقیقت سمجھ کر اس دنیا کو اس کے لیے تیاری کا موقع سمجھ لیتے ہیں وہ آخرت میں سرخرو ہوں گے۔ اور جو لوگ اسے محض ایک ڈراوا سمجھتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ انہیں یقین ہونا چاہیے کہ اس دن کا آنا برحق ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ عدل کے کامل ظہور کے لیے اس دن کو ضرور لایا جائے گا تاکہ کسی محروم کو محرومی کی شکایت نہ رہے اور کسی نیک عمل کرنے والے وفاشعار اور راہِ حق میں تکلیف اٹھانے والے جاںنثار کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ لیکن دنیوی زندگی جس میں برے انسانوں کو عیش و عشرت اور دولت و رفاہیت کے مواقع میسر ہیں وہ ان کے لیے گمراہی اور دھوکے کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس دنیا کی عیش و عشرت اور اس کی سہولتیں گویا اس بات کی دلیل ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے منظورِ نظر ہیں اور اس کے پسندیدہ بندے ہیں وہ اگر ہم سے ناخوش ہوتا تو ہمیں ان دنیوی نعمتوں سے بہرہ ور نہ فرماتا۔ اور جو لوگ یہاں محرومی کی زندگی گزار رہے ہیں انہیں نہ دنیوی عیش سے کوئی حصہ ملا ہے اور نہ انہیں حکومت و سطوت میسر ہے۔ وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ لوگ ہیں، وہ یہاں بھی ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور آخرت میں بھی انہیں تلخیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ دنیوی زندگی کا یہ فریب تمہیں کہیں گمراہ کرنے میں کامیاب نہ ہوجائے۔ بہت سے لوگوں کو یہ فریب لے بیٹھا ہے اور تم آج اس کی زد میں ہو۔ مزید فرمایا کہ جس طرح دنیوی عیش و نشاط انسان کی گمراہی کا سبب بنتا ہے اسی طرح ایک سب سے بڑا دھوکے باز اور فریب کار شیطان بھی ہے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں بہکاتا ہے اور کبھی اس راستے پر ڈالتا ہے کہ خدا کی ذات موجود تو ہے لیکن وہ دنیوی معاملات میں دخیل نہیں۔ وہ دنیا کو ایک دفعہ حرکت دے کر الگ جا بیٹھا ہے اور کبھی لوگوں کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ یقیناً پروردگار اپنی کائنات کا نظام تو چلا رہا ہے لیکن اس نے انسانوں کو رہنمائی کے لیے حواس، عقل اور تجربے کی دولت دے رکھی ہے جو اس کے لیے کافی ہے۔ اس نے ان کی رہنمائی کے لیے خود کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی، یہ وحی و رسالت محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ اسی طرح کے اس کے اور

Marfat.com

بہلاوے ہیں جن سے وہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہمیشہ الجھائے رکھتا ہے، دیکھنا! اس کے فریب میں نہ آنا۔ جو شخص بھی اس کے فریب میں آیا، وہ مارا گیا۔ وہ ایسا فریب کار ہے جو ہمیشہ گھات میں رہتا ہے۔ جیسے ہی وہ انسان کی کسی کمزوری کو دیکھتا ہے وہ کمزوری فکری ہو یا عملی، وہ اسی کمزوری کو واسطہ بنا کر اس کی تباہی کا سامان کرتا ہے۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۶

(بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے، پس تم بھی اس کو اپنا دشمن ہی سمجھو، وہ تو اپنی جماعت کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ اہلِ جہنم میں شامل ہو جائیں۔ ۶)

شیطان کا انسان سے تعلق

گزشتہ آیت میں شیطان کے فریب سے بچنے کی ہدایت فرمائی تھی اب اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ شیطان تمہارا حقیقی دشمن ہے۔ اس نے تمہارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جھکنے سے انکار کر کے پہلے ہی دن اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا تھا۔ اور پھر پروردگار سے مہلت مانگتے ہوئے بھی صاف صاف کہا کہ میں ہر طرف سے اولادِ آدم پر حملہ آور ہوں گا تاکہ میں انہیں گمراہ کر سکوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اولادِ آدم میں بہت کم لوگ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوں گے۔ چنانچہ اس آیت میں اس کی دشمنی کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ تم اگر اس کے شر سے بچنا چاہتے ہو تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو دشمن سمجھو۔ یہ کوئی دانش مندی نہیں کہ اپنے دشمن کو دشمن خیال بھی کرو لیکن زندگی کے معاملات کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دو۔ شریعت کے احکام کو نظر انداز کر کے اس کے بہکاووں پر عمل کرو۔ وہ انسان کو کبھی نفسانی اغراض کی راہ سے، کبھی نفع و ضرر کے حوالے سے، کبھی قومی عصبیتوں کو توانا کر کے اور کبھی گروہی مفادات کو اکسا کر بظاہر بہت ہمدردی اور اپنائیت کا اظہار کرتا ہے، لیکن مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ انہیں اپنے گروہ میں شامل کر کے انہیں جہنم کی گھاٹ پر لے جا اتارے اور ہمیشہ کے لیے ان کی ہلاکت کا سامان کر دے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ مختلف حربوں سے انسان سے انتقام لینا کبھی نہیں بھولتا۔ لیکن انسان اس کو برا بھلا کہنے کے باوجود ہمیشہ اس کے فریب کے پھندوں کا شکار ہو کر اپنی عاقبت تباہ کر لیتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ڛ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷

(جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے، اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔ ۷)

ایک غلط تصور کی تردید

گزشتہ دو آیتوں میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اسے سمیٹتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ شیطان کے سارے بہکاووں اور دھوکوں کا حاصل یہ ہے کہ کسی طرح انسان اس معاملے میں یکسو ہو جائے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کسی خاص مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے نہیں بھیجا بلکہ اسے حواس، شعور اور عقل دے کر اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی آزادی دی گئی ہے۔ اور کوئی ایسا دن آنے والا نہیں جب انسانوں کو دوبارہ

Marfat.com

زندہ کر کے حساب کتاب کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا پڑے۔ جو شخص اس تصور کو قبول کر لیتا ہے اس کے لیے آخرت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اس تصور کی بیخ کنی کے لیے فرمایا کہ دنیا میں سچائی اور برائی، خیر اور شر اور کفر اور ایمان جیسے دو متضاد رویے ہمیشہ موجود رہے ہیں اور موجود رہیں گے، اگر یہ تصور قبول کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شتر بے مہار کی طرح زندگی گزارنے کی آزادی دے رکھی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے یہاں خیر و شر اور سچائی اور برائی میں کوئی امتیاز نہیں۔ اس کی زمین، اس کی اطاعت کے پھولوں سے مہکنے کی بجائے اس کی نافرمانی اور شیطنت کے کانٹوں سے بھر جائے، اسے اس کی کوئی پروا نہیں۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کیے بغیر ممکن نہیں۔ اور جسے انسانیت بھی کبھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔ اس لیے واضح طور پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کفر اور ایمان یکساں نہیں۔ جن لوگوں نے دنیا میں کفر کیا وہ آخرت میں عذابِ شدید سے دوچار ہوں گے۔ اور جنہوں نے ایمان اور عملِ صالح کا راستہ اختیار کیا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بہت بڑے اجر سے نوازے جائیں گے۔ کیونکہ کفر اللہ تعالیٰ کو نہ پسند ہے اور نہ منظور۔ اور ایمان اور عملِ صالح اللہ تعالیٰ کی رضا کے مظہر اور جنت کی نعمتوں کے استحقاق کی ضمانت ہیں۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ
مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ
حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۞ ٨ وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ
الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۞ ٩ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ
فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ
يَرْفَعُهٗ ؕ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَ
مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ۞ ١٠ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ
ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ
وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ

Marfat.com

ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿١١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ
سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا
وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ
لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٢﴾ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ
وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ
لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴿١٣﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا
دُعَاۗءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ
بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿١٤﴾

رکوع: ۲۔ (کیا وہ شخص کہ مزین کر دیا گیا ہے اس کے لیے اس کا برا عمل، پس وہ اسے اچھا سمجھنے لگا ہے (ایمان لانے والا بن سکتا ہے؟) پس اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے، پس (اے پیغمبر) ان پر غم وافسوس میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ باخبر ہے ان کاموں سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۸) اور اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پس وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں، پھر ہم ان کو ہانکتے ہیں کسی مردہ زمین کی طرف، پس ہم اس سے اس زمین کو زندگی بخشتے ہیں اس کے مردہ ہو جانے کے بعد، مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہوگا۔ ۹) جو عزت چاہتا ہو تو یاد رکھے کہ عزت ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے، اس کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلمہ، اور عملِ صالح اس کو اٹھاتا ہے اور وہ لوگ جو بری چالیں چل رہے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کی چال ہلاک ہو کر رہے گی۔ ۱۰) اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر تمہارے جوڑے بنا دیے اور کوئی عورت

Marfat.com

نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے، مگر اس کے علم سے۔ کسی عمر والے کی عمر نہ زیادہ کی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے، مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے، یہ سب اللہ کے لیے آسان ہے۔ ۱۱) اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں، ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا، پینے میں خوشگوار، اور دوسرا کھاری اور کڑوا، اور تم دونوں سے تازہ گوشت حاصل کرتے ہو، اور تم زینت کی چیز نکالتے ہو تاکہ اسے پہنو، اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو اس میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۱۲) وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں، اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں، سورج اور چاند کو اس نے مسخر کر رکھا ہے، ہر ایک گردش کرتا ہے ایک معین وقت کے لیے، وہی اللہ تمہارا رب ہے، اسی کی بادشاہی ہے، اسے چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو وہ تو ذرہ برابر بھی کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ ۱۳) اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے، اور اگر سنیں گے تو تمہاری فریاد رسی نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کردیں گے، اور تمہیں یہاں کوئی آگاہ نہیں کرسکتا، ایک باخبر کی طرح۔ ۱۴)

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ۭ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ڮ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۸

(کیا وہ شخص کہ مزین کردیا گیا ہے اس کے لیے اس کا برا عمل، پس وہ اسے اچھا سمجھنے لگا ہے (ایمان لانے والا بن سکتا ہے؟) پس اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے، پس (اے پیغمبر!) ان پر غم و افسوس میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ باخبر ہے ان کاموں سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۸)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیتِ کریمہ میں مخالفین کے ایمان قبول نہ کرنے اور مخالفت میں مزید تیزی پیدا کردینے کے حوالے سے آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ کیونکہ آپ لوگوں کے ایمان قبول نہ کرنے پر دو وجہ سے انتہائی دل گرفتہ ہوجاتے تھے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ آپ یہ سمجھتے کہ ان کے ایمان قبول نہ کرنے کا سبب شاید میری تبلیغ و دعوت کی مساعی میں کوئی کمی اور کوتاہی ہے۔ ورنہ جس قدر میں پیار اور محبت اور غمگساری سے انہیں ایمان کی دعوت دیتا ہوں اور پھر جس طرح خونِ جگر پی پی کر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں اس سے زیادہ کا امکان دکھائی نہیں دیتا۔ یہ انسانی استطاعت کی آخری حد ہے۔ اس کے باوجود ان کا ایمان قبول نہ کرنا بجز اس کے اور کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ شاید میرے اخلاص یا میری جدوجہد میں کوئی تقصیر پائی جاتی ہے۔

اور دوسری وجہ یہ تھی کہ قرآنِ کریم کا کلام اللہ ہونا اور پھر اس کلام کا معجز ہونا اور دشمنوں کے یہاں بھی اس کی تاثیر کا اعتراف کیا جانا اور اس کے داعی کی شخصیت کا بے عیب سیرت و کردار کا مالک ہونا بجائے خود یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایسی دعوت کو فوراً قبول کیا جائے اور سننے والے اس پر ایمان لانے میں تاخیر نہ کریں۔ لیکن مخالفین کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ دلگرفتہ بھی ہوتے اور سوچ میں بھی مبتلا ہوجاتے۔

Marfat.com

کہ آخر ان کے ایمان نہ لانے کا سبب کیا ہے۔ چنانچہ آپ کو تسلی دیتے ہوئے ان دونوں باتوں کا جواب دیا گیا ہے۔ پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ کسی بھی صداقت اور حقیقت سے کسی انسان کی دوری کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اسے حقیقت اور صداقت کا علم نہیں ہوتا، یا اس کی عادتیں اور خصلتیں اس حد تک بگڑ چکی ہیں کہ اس کے برعکس کسی بات کو تسلیم کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ چنانچہ مسلسل تبلیغ و دعوت اور فہمائش سے اس بات کی امید ہوتی ہے کہ عادتوں اور خصلتوں میں تبدیلی آئے گی۔ اور یہ شخص جسے برائی کے برائی ہونے سے انکار نہیں اور اچھائی کے اچھائی ہونے کا اعتراف بھی ہے۔ افہام و تفہیم بالآخر اس کی جمی ہوئی برف کو توڑے گا اور اس کا ضمیر کبھی نہ کبھی اسے ملامت کرے گا اور آخر وہ اس ہدایت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ایسے ہی لوگوں کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں اور ایسے ہی لوگ ان کی ہدایت کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن اگر صورتحال یہ ہو جائے کہ جن لوگوں کے سامنے وہ صداقت پیش کی جا رہی ہے وہ اس صداقت کے مخالف طرزِ عمل کو سب سے بڑی صداقت سمجھنے لگیں۔ ان کا ذہنی سانچہ اس حد تک بگڑ جائے کہ اس میں گناہ اور برائی کے داخل ہونے کے تو سو راستے ہوں لیکن نیکی کے داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ اسے گناہ سے تو گہری دلچسپی ہو، برائی اس کے لیے تسکین کا باعث بن جائے۔ بدی عین تہذیب و ثقافت قرار پائے، فسق و فجور اس کی نگاہوں میں ترقی پسندی کی علامت بن جائے۔ ایسے شخص سے امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی بھی صداقت، نیکی اور بھلائی کی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ جن بڑے بڑے لوگوں سے آپ کو واسطہ پڑا ہے اور اشراف قریش جو آپ کی مخالفت میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ اسی فتنے میں گرفتار ہیں۔ انہیں اپنی برائیاں بھلائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے طرزِ عمل میں خود پسند ہو چکے ہیں۔ یہ اپنی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں اس لحاظ سے یہ لوگ قانونِ الٰہی کی زد میں آچکے ہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جب کوئی شخص بگاڑ کی اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کی زد میں آجاتا ہے جسے قرآنِ کریم میں ختمِ قلوب یا رَین سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایسے لوگوں پر کوئی تذکیر و تنبیہ اثر نہیں کرتی۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ہدایت و ضلالت کے قانون کی طرف اشارہ ہے۔ پھر تسلی کے اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے قانون کی زد میں آچکے اور انہیں سماعِ قبول سے محروم کر دیا گیا ہے۔ وہ اگر آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تو آپ ان کی خاطر اپنے دل کو روگ کیوں لگاتے ہیں اور آپ ان کی خاطر غم و افسوس میں گھلتے کیوں جا رہے ہیں۔ آپ کا کام تبشیر و انذار اور ابلاغ ہے، سو یہ آپ کر چکے۔ اس لیے جتنی محنت ہونا چاہیے تھی آپ نے اس سے بڑھ کر کی ہے۔ آپ نے امانت کا حق بھی ادا کیا اور ہمدردی و غمگساری کا بھی۔ ہدایت کے اعتبار سے ایک ایک آدمی کے ساتھ آپ کی ہمدردی و غمگساری اپنی جگہ، یہ یقیناً مخلوقِ خدا اور اپنی منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ غایت درجہ تعلق کی دلیل ہے۔ لیکن اس کی بھی حدود ہیں۔ اسے اس قیمت پر ادا کرنا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کو ہلکا سمجھنے لگیں اور انہیں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ شاید اللہ تعالیٰ کا دین ہمارا محتاج ہے اور مزید یہ کہ اس کی وجہ سے آپ کی صحت گرنے لگے، یہ پروردگار کو گوارا نہیں۔ اس لیے کئی مواقع پر آپ کو اس بات سے روکا گیا کہ آپ کا کام تبشیر و انذار ہے ان کی ہدایت کے لیے اپنے آپ کو روگ لگا لینا نہیں۔ سورۃ الکہف میں ارشاد فرمایا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ''شاید آپ اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے ان لوگوں کے پیچھے افسوس کے باعث اگر وہ لوگ ایمان نہ لائے۔'' یہاں بھی آپ کو تسلی دیتے ہوئے اس صورتحال پر توجہ دلائی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی مخالفین کو تنبیہ کرتے ہوئے اور آنحضرت ﷺ کو اطمینان دلاتے

Marfat.com

ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ آپ کی مخالفت میں جو کچھ کر رہے ہیں چاہے وہ آپ کے خلاف کی جانے والی سازشیں ہوں یا منصوبہ بندیاں، اللہ تعالیٰ ان سب باتوں کو جاننے والا ہے۔ اور ان باتوں کی سزا بھی دے گا۔ کیونکہ جب کوئی بڑا حکمران کسی مفسد آدمی سے یہ کہتا ہے کہ میں تمہاری ہر بات سے باخبر ہوں۔ تو اس کا مطلب صرف اپنے باخبر ہونے کی اطلاع دینا نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت ایک تنبیہ ہوتی ہے کہ تم اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو اس کے بعد تم سے بدترین سلوک ہوگا اور تمہارے کرتوتوں کی تمہیں سزا ملے گی۔ یہاں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے۔

وَاللّٰہُ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰہُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا ؕ کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ ﴿۹﴾

(اور اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پس وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں، پھر ہم ان کو ہانکتے ہیں کسی مردہ زمین کی طرف، پس ہم اس سے اس زمین کو زندگی بخشتے ہیں اس کے مردہ ہو جانے کے بعد، مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہوگا۔ ۹)

قیامت کے وقوع پر ایک واقعاتی دلیل

گزشتہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔ اپنے اسی علم وخبر کے مطابق مختلف شہادات کے ساتھ قیامت کے دن ان سے بازپرس کرے گا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس قیامت پر عقلی اور واقعاتی دلیل پیش کی گئی ہے۔ کیونکہ مشرکین وقوعِ قیامت کو بعید از امکان سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ اپنی زندگی اپنی نفسانی خواہشوں اور اپنے مفادات کے تابع گزارنے پر مصر تھے کیونکہ انہیں کسی ایسے دن کے آنے کا کوئی خطرہ نہ تھا جہاں انہیں اپنے اعمال کا جواب دینا پڑے۔ چنانچہ ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم بچشمِ سر دیکھتے ہو کہ بعض دفعہ مہینوں یا برسوں تک بارش نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آباد زمینیں بھی ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ہر طرف دھول اڑتی دکھائی دیتی ہے، سبزہ اور روئیدگی کا کہیں نام و نشان نہیں ہوتا، پانی کے جوہڑ خشک ہو جاتے ہیں، کسی طرف سے کسی مینڈک کے ٹرانے کی آواز نہیں آتی، ہر طرف موت کا سماں طاری ہو جاتا ہے۔ اچانک ہوائیں اڑتی ہیں وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے بادلوں کو ابھارتی اور جمع کرتی ہیں۔ پھر پروردگار ان بادلوں کو اس مردہ زمین کی طرف ہانک کر لے جاتا ہے اور بارش برسنے لگتی ہے۔ بارش برستے ہی ہر چیز میں تبدیلی آنے لگتی ہے، جوہڑ پانی سے بھر جاتے ہیں، حیرت انگیز طور پر نہ جانے کہاں سے مینڈک نکل آتے ہیں اور ہر طرف سے ٹرانے کی آوازیں آنے لگتی ہیں، زمین سبزے کا مخملی لباس پہن لیتی ہے، درختوں پر نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، درختوں کی جڑوں میں زندگی عود کر آتی ہے، چند دنوں پہلے جہاں مردنی چھائی ہوئی تھی وہاں ہر گوشے میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ وہ منظر ہے جس کو دیکھنے والے ہمیشہ دیکھتے ہیں۔ اور ہر جگہ موت کے دامن سے زندگی کا پھوٹ نکلنا ان کا آنکھوں دیکھا معاملہ ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مردہ زمین بارش کے چند چھینٹوں سے زندہ ہو سکتی ہے اور ہر طرف زندگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں تو آخر اس میں کیا استبعاد ہے کہ انسانوں کو ازسرِنو زندہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے کا حکم دیا جائے اور ہر شخص اپنی زندگی بھر کے اعمال کا حساب دے۔ اگر دیدۂ بینا میسر ہو اور آدمی بصیرت سے محروم نہ ہو تو اس کے لیے آخرت اور قیامت کا وقوع اور انسانوں کا ازسرِنو زندہ ہونا ایسی بات نہیں جو عقل میں نہ آسکے۔

Marfat.com

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ جَمِیۡعًا ؕ اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ
وَ الَّذِیۡنَ یَمۡکُرُوۡنَ السَّیِّاٰتِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَ مَکۡرُ اُولٰٓئِکَ ہُوَ یَبُوۡرُ ﴿۱۰﴾

(جو عزت چاہتا ہو تو یاد رکھے کہ عزت ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے، اس کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلمہ، اور عملِ صالح اس کو اٹھاتا ہے اور وہ لوگ جو بری چالیں چل رہے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کی چال ہلاک ہو کر رہے گی۔ ۱۰)

ایمان کے راستے کی رکاوٹ

قریش اور دیگر مشرکین کو جن اسباب نے قبولیتِ اسلام سے دور رکھا ان میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آج ہمیں دنیا میں جو عزت و وجاہت حاصل ہے یہ اسلام قبول کرنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ ہم چونکہ بیت اللہ کے متولی اور مجاور ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اس لیے ہمیں باقی لوگوں پر ایک تفوق حاصل ہے۔ اسی تفوق کے احساس کے تحت قریش کسی دوسرے قبیلے کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے۔ اور پورے عرب کی سیادت کو وہ برتری کے احساس کی وجہ سے اپنا حق خیال کرتے تھے۔ اور بیت اللہ کے متولی ہونے کی وجہ سے انہوں نے بعض دینی معاملات میں اپنے لیے کچھ خصوصیات بنا رکھی تھیں حتیٰ کہ حج میں وہ مزدلفہ سے واپس آ جاتے تھے۔ عرفات جانا اس لیے گوارا نہیں کرتے تھے کہ اس طرح ہمارا دوسروں کے برابر ہونا لازم آئے گا۔ اور قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات میں جس طرح انسانوں میں ہر طرح کے تفاوت کو ختم کر دیا ہے اور کسی کو کسی دوسرے پر برتری کے تمام دعاوی کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے، یہ بات قریش کو کسی طرح بھی قبول نہ تھی۔ تو جو دین اس دعوت کو لے کر اٹھا تھا اسے قبول کرنا اس وجہ سے ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ پروردگار نے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کی اس گمراہی کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے عزت کے جو اسباب اپنے تئیں بنا رکھے ہیں وہ انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ ہیں، اسلام انہیں مٹانے کے لیے آیا ہے۔ اسی طرح آخرت میں عزت حاصل کرنے کے لیے جن قوتوں کو تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے اور ان کی شفاعت پر بھروسا کر کے بیٹھے ہو ان کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ دنیا و آخرت میں عزت کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جسے اس کی بارگاہ اور اس کے دین سے عزت ملتی ہے وہی عزت ابدی اور حقیقی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں غریب اور امیر، قریشی اور غیر قریشی، عربی اور عجمی، اور کالے اور گورے میں کوئی امتیاز نہیں۔ وہ بلال کو عزت دیتا ہے اور ابولہب کو راندۂ درگاہ قرار دیتا ہے۔ اس کے یہاں عزت کا ایک ہی پیمانہ ہے کہ اس سے تعلق پیدا کیا جائے۔ تم نے جو پیمانے بنا رکھے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ نہ وہ دنیا میں کام آئیں گے اور نہ آخرت میں۔

اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ایمان اور عمل ہے

اس کے بعد عزت حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے کہ انسان میں تبدیلی اس کے بنیادی خیالات اور تصورات کی اصلاح سے ہوتی ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں اعمال کی اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ قلب و نگاہ اور خیالات کی تبدیلی کا نقطۂ آغاز اور حقیقی اساس کلمۂ طیبہ ہے جس سے مراد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک ایمان ہے۔ یعنی ہر طرح کے آستانوں سے اٹھ کر ہر طرح کی بڑائیوں کا انکار کر کے، ہر

Marfat.com

طرح کے تخت وتاج کو الٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اظہار، اسی کی عظمت کا اعتراف، اسی کے خوف اور محبت کا دل میں بسیرا۔ اور جو کچھ نبی کریم ﷺ لے کر آئے ہیں ان تمام چیزوں کا اخلاص کے ساتھ اتباع کا جذبہ۔ یہ وہ ایمان ہے جو دنیا میں مومن کو کافر سے الگ کر دیتا ہے۔ کافر کو وہ ''شر البریہ'' قرار دیتا ہے اور مومن کو کائنات کا گلِ سرسبد ٹھہراتا ہے۔ لیکن ایسا ایمان جو عمل کی صورت میں برگ وبار پیدا نہ کرے، جس سے عبادات نہ پھوٹیں، جس سے مکارمِ اخلاق ظہور میں نہ آئیں، جس سے معاملات کی اصلاح نہ ہو۔ وہ ایمان ایک ایسا پودا ہے جو پھل سے خالی اور شادابی سے بیگانہ ہے۔ اس کی مثال انگور کی ایک ایسی بیل کی مانند ہے جس کی شادابی اور ثمر آوری میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن اس کے پھلنے پھولنے کے لیے لکڑیوں کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ سہارا میسر نہ آئے تو اس کے مرجھانے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہ بیل موجود رہے گی، لیکن صحیح پھل نہ دے سکے گی۔ یہی حال اس ایمان کا ہے جو عملِ صالح سے خالی ہے۔ عملِ صالح ایمان کی بیل کو اپنے سر پر اٹھاتا ہے، اس کے لیے سہارے کا کام کرتا ہے۔ اس پر یہ بیل پھیلتی اور ثمر آور ہوتی ہے۔ ایمان اور عمل صالح دونوں مل کر دنیا میں بھی سرفرازی کا باعث بنتے ہیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سرخروئی کا باعث بنیں گے۔ عمل سے خالی ایمان یا عمل سے بیگانہ ایمان ایک طویل سزا کے بعد جنت میں جانے کا سبب تو بن سکتا ہے لیکن طویل سزا سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ اسی طرح وہ عمل جس کی بنیاد میں ایمان شامل نہیں اور کوئی خالص نظریہ اس کی پشت پر نہیں۔ نہ دنیا میں اس کا اعتبار ہے اور نہ آخرت میں عذاب سے بچاؤ کا ذریعہ ہوگا۔ ایمان لانے کے بعد آدمی شہادت گاہ میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور اس کے اعمال شہادت کا کام دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

آخر میں فرمایا جو لوگ اس کلمۂ حق کو نیچا دکھانے کے لیے بری سے بری کاوشیں روبہ عمل لا رہے ہیں اور ہر ممکن طریق سے کلمۂ حق کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں، قیامت میں ان کے لیے عذابِ شدید ہے اور دنیا میں ایسی تمام کاوشیں اور تدبیریں خود اپنی موت مر جائیں گی۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾

(اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر تمہارے جوڑے بنا دیے اور کوئی عورت نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے، مگر اس کے علم سے، کسی عمر والے کی عمر نہ زیادہ کی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے، مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے، یہ سب اللہ کے لیے آسان ہے۔ ۱۱)

Marfat.com

شرک کے ایک اور عامل کی تردید

مشرکینِ عرب میں جن عوامل نے شرک پیدا کیا اور پھر شرک میں توسیع کی اور شاخ در شاخ اس کو پھیلنے کا موقع ملا۔ ان عوامل میں سے ایک عامل اولاد کا بھی رہا ہے۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ اولاد کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اور اولاد میں سے بھی نرینہ اولاد انسان کی زیادہ مطلوب رہی ہے۔ جب کبھی اولاد کے پیدا ہونے میں تاخیر ہوتی ہے یا نرینہ اولاد کی بجائے بیٹیاں پیدا ہونے لگتی ہیں تو میاں بیوی میں پریشانی سر اٹھاتی ہے اور دبی دبی زبان میں ایک دوسرے سے اپنے غم کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ یہی موقع ہوتا ہے جب شیطان ان کو شرک کے راستے پر ڈالتا ہے اور ان کے ذہن میں یہ خیال پیوست کر دیتا ہے کہ جب تک تم فلاں جن کو نہیں پکارو گے یا فرشتوں سے استمداد نہیں کرو گے یا فلاں مزار یا استھان پر چڑھاوا نہیں چڑھاؤ گے اور کوئی منت مان کر اولاد کی درخواست نہیں کرو گے، اس وقت تک اولاد نہیں ہوگی یا بیٹا پیدا نہیں ہوگا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ایسے ہی مشرکانہ افعال و اعمال کی تردید کی جا رہی ہے۔ لیکن ان کی تمہید کے طور پر ایسی باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھیں تسلیم کرنے سے مشرکینِ عرب کو انکار نہیں تھا۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم مانتے ہو کہ تمہارے جدِ امجد کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا فرمایا۔ پھر ان کی اولاد میں توالد و تناسل کے سلسلے کے لیے پانی کی بوند یعنی نطفے کو ذریعہ بنایا۔ اور اس مادۂ منویہ کو توالد کی بنیاد کے لیے مرد اور عورت کے جوڑے پیدا کیے۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دنیا کے ہر طبقے میں جہاں جہاں بھی نوعِ انسانی آباد ہے کہیں ایسا نہیں ہوا کہ مرد و عورت کی تخلیق میں تناسب قائم نہ رکھا گیا ہو۔ ایسا کہیں نہیں ہوا کہ کسی علاقے میں صرف مرد پیدا ہوں اور کسی دوسرے علاقے میں صرف عورتوں کی تخلیق کی گئی ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ مردوں اور عورتوں کی تعداد میں تھوڑا بہت فرق رکھا گیا ہو۔ لیکن یہ کہیں نہیں ہوا کہ یہ فرق اس حد تک پہنچ جائے کہ دونوں کو ایک دوسرے کا رفیقِ حیات میسر نہ آئے۔ دونوں کی تعداد میں خفیف سا فرق وہ بجائے خود انسانوں کی اپنی ضرورت ہے اور اس کی اپنی حکمتیں ہیں جس کا اس وقت ذکر کرنا ضروری نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ جس پروردگار کے دستِ قدرت نے انسانوں کے جدِ امجد کو مٹی سے بنایا، پھر مرد و عورت کے جوڑے پیدا کیے اور پھر ان کے اتصال سے توالد و تناسل کا سلسلہ قائم کیا۔ کیا اس پروردگار نے یہ سب کچھ اپنے وسیع علم اور بے کراں قدرت کے بغیر پیدا کیا۔ اگر ایسا نہیں تو پھر تم اپنی اولاد کے لیے دوسرے دروازے پر دستک کیوں دیتے ہو۔ دوسروں سے استمداد کیوں کرتے ہو۔ اور پھر بعض آستانوں پر منت مان کر اولاد کو اس کا ذریعہ کیوں سمجھتے ہو۔ جس پروردگار کے وسیع علم اور بے کراں قدرت کا اپنے گردوپیش میں تم ظہور دیکھتے ہو وہ یقیناً جانتا ہے کہ کب کوئی عورت حاملہ ہوتی ہے اور کب کوئی عورت بچہ جنتی ہے۔ اس کے حمل کی کیفیات کیا ہوتی ہیں اور پیدا ہونے والا بچہ کن خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ رحمِ مادر میں ابھی نطفے کو خون میں تبدیل ہونے کا موقع نہیں ملتا کہ پروردگار اس وقت بھی جانتا ہے کہ اس عمل میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں گی، وہ کس شکل و صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔ اور جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے بارے میں وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کی عمر کیا ہوگی۔ اس کی عمر میں اس کے اعمالِ خیر کے باعث کتنا اضافہ ہوگا۔ یا اس کے بعض شرور کے باعث کتنی کمی ہوگی۔ یہ بات بھی اس کے علم میں ہے کہ یہ شخص سعید ہوگا یا شقی ہوگا۔ اس کی قسمت میں مسرتیں اور شادمانیاں ہوں گی یا محرومیاں اور تلخیاں ہوں گی۔ کیونکہ جب بچہ پیٹ میں ہوتا ہے تو اسی وقت اس کی قسمت بھی لکھ دی جاتی ہے اور اس کی سعادت و شقاوت کا فیصلہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن آگے چل کر اس کے اعمال کے باعث اس میں

Marfat.com

تبدیلیوں کا امکان بھی رکھا جاتا ہے۔ اس لیے انسان کی تمام تر توجہ اس بات پر رہنی چاہیے کہ بچہ اگر پیدا ہونے سے پہلے اور اس کے بعد بھی ہمیشہ اس کا دامن اپنے رب کے سامنے پھیلا رہے۔ بجائے کسی اور آستانے پر جانے کے اللہ تعالیٰ کے ہی حضور دستِ دعا دراز ہونا چاہیے۔ اور پیدا ہونے والا بچہ جب بلوغ کی عمر میں پہنچے تو اس کی توجہ ایمان و عمل، مکارمِ اخلاق اور زندگی کے فرائض و آداب پر ہونی چاہیے نہ یہ کہ وہ یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کی تدبیر انسانی تدبیر پر غالب رہتی ہے لیکن انسان اپنے اعمال کے رہینِ منت ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ اس کی تقدیر کیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے۔ اس سے تو ایمان و عمل کا تقاضا کیا جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی تقدیر بنتی اور بدلتی رہتی ہے۔ اکبر نے بالکل ٹھیک کہا:

جب میں کہتا ہوں کہ یااللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

اور اقبال نے اپنے فلسفیانہ انداز میں اس مضمون کو اور کھول دیا ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

ایک واہمہ کی تردید

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بات بہت آسان ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے ایک ایک فرد اور دیگر مخلوقات میں سے ایک ایک مخلوق کی ضروریات اور ان کے حالات پر نظر رکھے۔ اور اپنی مشیت اور حکمت کے مطابق ان کے بارے میں فیصلے فرمائے۔ یہ بات اس لیے فرمائی گئی ہے کہ مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کو خالق بھی مانتے تھے اور اپنا رازق بھی سمجھتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اس وہم میں مبتلا بھی تھے کہ پروردگار تنِ تنہا تمام جزئیاتِ امور کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے۔ اسے اپنی وسیع و عریض کائنات میں ایک ایک شخص کی ضروریات اور اس کی محرومیوں کی خبر کیسے ہو سکتی ہے۔ اس وہم کے تحت انہوں نے پروردگار کی مدد کے لیے شرکاء و اعوان ایجاد کیے اور پھر ان کی بندگی اور پرستش میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک وجودِ معطل کی حیثیت دے دی۔ چنانچہ اسی کی تردید کے لیے فرمایا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنے بادشاہوں اور وڈیروں پر قیاس مت کرو۔ اس کا وسیع علم اور قدرت ہر چیز کو محیط ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا بھی ہے اور سب کچھ کرنے پر قادر بھی ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ؕ ﴿۱۳﴾

Marfat.com

(اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں، ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا، پینے میں خوشگوار، اور دوسرا کھاری اور کڑوا، اور تم دونوں سے تازہ گوشت حاصل کرتے ہو، اور تم زینت کی چیز نکالتے ہوتا کہ اسے پہنو، اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو اس میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تا کہ تم اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکر گزار بنو۔ ۱۲) وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں، اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں، سورج اور چاند کو اس نے مسخر کر رکھا ہے، ہر ایک گردش کرتا ہے ایک معین وقت کے لیے، وہی اللہ تمہارا رب ہے، اسی کی بادشاہی ہے، اسے چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو وہ تو ذرہ برابر بھی کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ ۱۳)

صاحب تدبرِ قرآن نے بڑی خوبصورتی سے اس آیت کی توضیح فرمائی ہے، ہم اسے یہاں نقل کر رہے ہیں۔

شرک اور شرکاء کی تردید اضداد میں سازگاری کے پہلو سے

یہ ایک دوسرے پہلو سے شرک اور شرکاء کی تردید فرمائی گئی ہے۔ اس کائنات میں اضداد کا جو تصادم ہے یہ بھی شرک کے نہایت اہم عوامل میں سے ہے۔ قرآن نے مختلف پہلوؤں سے اس کی تردید فرمائی ہے اور ہم اس کی وضاحت کرتے آرہے ہیں۔ یہاں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں اضداد کا وجود اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں اس لیے کہ اس کے اضداد میں ظاہری تضاد کے ساتھ ساتھ نہایت گہری سازگاری بھی پائی جاتی ہے جس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ کوئی بالاتر اور ہمہ گیر و ہمہ جہت قوتِ قاہرہ ان تمام اضداد پر حاوی ہے جو ان کو اپنی حکمت کے تحت اس کائنات کی مجموعی بہبود کے لیے استعمال کر رہی ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ الاٰیۃ، یعنی دیکھو، دو سمندر ہیں اور دونوں اپنی ظاہری خصوصیات وصفات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک کا پانی شیریں، پیاس بجھانے والا اور خوشگوار ہے۔ دوسرے کا کھاری، کڑوا ہے۔ یہ دونوں آپس میں ٹکراتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ کھاری سمندر میٹھے سمندر پر غالب ہو کر اس کو کھاری بنادے یا شیریں سمندر کھاری کے مزاج کو بدل دے بلکہ ایک بالاتر قوت نے ان دونوں کو ٹکرانے کے باوجود ان کے حدود کا پابند کر رکھا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (الرحمٰن: ۱۹-۲۰) (اس نے چھوڑے دو دریا، دونوں باہم دگر ٹکراتے ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہوتی ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے)۔

پھر یہ دیکھو کہ کس طرح یہ اپنے تضاد و اختلاف کے باوجود اپنے سے بالاتر مقصد کی خدمت بجالاتے ہیں کہ تم دونوں ہی سے اپنے لمبے لمبے بری سفروں میں جہاں تازہ گوشت حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے، ان سے تازہ گوشت حاصل کر لیتے ہو اور غذا کے ساتھ اپنی زینت کے لیے ان سے قیمتی موتی بھی نکالتے ہو۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہارے لیے اس طرح مسخر ہیں کہ تمہارے جہازات ان کے سینے پر سے موجوں کو پھاڑتے ہوئے چلتے ہیں تا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کر کے تم اللہ تعالیٰ کے رزق و فضل کے طالب بنو اور اس کے شکر گزار رہو...... مطلب یہ ہے کہ اس کائنات

Marfat.com

کے ظاہری تضاد میں گم ہو کے نہ رہ جاؤ بلکہ ان اضداد کے باہمی توافق پر بھی نگاہ ڈالو تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ایک ہی خدائے قادر وقیوم نے اس دنیا کو وجود بخشا ہے اور اسی نے اپنی قدرت وحکمت سے اس کے تمام اجزائے مختلفہ کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے تا کہ انسان اپنے پروردگار کا شکر گزار رہے۔

یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ الایۃ۔ یہ اسی حقیقت کی طرف ایک دوسری مثال سے توجہ دلائی ہے کہ یہی حال تمہارے سامنے روز آنے والی رات اور روز ظاہر ہونے والے دن کا بھی ہے۔ وہ بھی بظاہر ضدین کی نسبت رکھتے ہیں لیکن ان کے درمیان بالکل زوجین کا توافق پایا جاتا ہے۔ دونوں ہی اس دنیا کی بقاء اور تمہاری راحت و معیشت کے لیے ضروری ہیں۔ یہی حال سورج اور چاند کا بھی ہے۔ نادانوں نے ان کو معبود بنا کر پوجا حالانکہ وہ اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ خدا نے ان کو اپنی خلق کی خدمت کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ چنانچہ دونوں اپنے معین نظامِ اوقات کے ساتھ برابر تمہاری خدمت میں سرگرم رہتے ہیں۔

ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَهُ الْمُلْکُ ۔ یہ خلاصہ ہے اوپر کی ساری بحث کا کہ یہی اللہ جس کی یہ شانیں، قدرتیں اور حکمتیں دیکھتے ہو، تمہارا رب ہے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ۔ قِطْمِیْر، اس باریک غلاف کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتا ہے۔

یہ وہی بات منفی اسلوب سے فرمائی کہ رہے وہ جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے اور پوجتے ہو تو وہ اس دنیا کے خلق وتدبیر میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں رکھتے۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَکُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَکُمْ ؕ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَکْفُرُوْنَ بِشِرْکِکُمْ ؕ وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثْلُ خَبِیْرٍ ﴿۱۴﴾

(اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے، اور اگر سنیں گے تو تمہاری فریاد رسی نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے، اور تمہیں یہاں کوئی آگاہ نہیں کر سکتا، ایک باخبر کی طرح۔ ۱۴)

فرضی معبودوں کی بے کسی دنیا اور آخرت دونوں میں

مشرکینِ عرب نے جن قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا تھا اور جنہیں وہ دیوتاؤں کی طرح پکارتے اور پوجتے تھے ان کی بے بسی اور بے حقیقتی کو واضح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم انہیں عالمِ اسباب سے بالا کسی مشکل میں پکارو گے تو وہ تمہاری پکار اور فریاد کو سن بھی نہیں سکیں گے۔ کیونکہ اولاً تو مشرکینِ عرب نے اللہ تعالیٰ کے جو شریک بنا رکھے تھے ان کا سرے سے کوئی مسمّیٰ ہی موجود نہ تھا۔ محض مفروضوں پر شرک کا کاروبار چل رہا تھا۔ اور یا وہ بت تھے جنہیں وہ اپنے معاملات میں مؤثر خیال کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے معبودان کی فریاد کو سننے پر بھی

Marfat.com

قادر نہیں تھے۔البتہ انہوں نے انبیاء اور اولیاء کو بھی اپنی پرستش کا مستحق سمجھ رکھا تھا۔ان کا یقیناً ایک وجود تو ہے لیکن اسباب سے بالا کسی مشکل میں یہ بھی کام آنے کی قدرت نہیں رکھتے۔اس لیے اگر وہ ان کی فریاد کو سن بھی لیں تو ان کے کسی کام آنے والے نہیں۔اور آخرت میں یہ ان کی عبادت اور پرستش سے براءت کا اظہار کریں گے۔ملائکہ بھی اظہارِ براءت کرتے ہوئے ان پر لعنت بھیجیں گے۔اور جن جنات کی یہ پوجا کرتے رہے ہیں وہ بھی قیامت کے دن صاف صاف ان سے کہیں گے کہ یہ تمہاری بدبختی تھی کہ تم نے ہماری پوجا پاٹ کی،اب اس کا انجام بھگتو۔آخر میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ آخرت میں جو کچھ ہونے والا ہے آج کوئی انسان اس سے واقف نہیں۔اور نہ جنات اور ملائکہ اس سے آگاہ ہیں۔صرف ایک جاننے والا ہے جو ان سب کا پروردگار ہے۔وہ تمہیں تنبیہ کر رہا ہے کہ اس کے خبر دینے سے فائدہ اٹھاؤ اور اگر تم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو یہ تمہاری ایسی بدنصیبی ہوگی جسے تم قیامت کے دن یاد کر کے ماتم کرو گے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ

اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ
جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ ۚ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ
اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ
كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا
الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾
وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَ
لَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ ۚ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾ اِنْ اَنْتَ
اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ؕ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ
اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ

Marfat.com

قَبۡلِهِمۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالۡكِتٰبِ الۡمُنِيۡرِ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ ﴿٢٦﴾

رکوع: ۳۔ (اے لوگو! تم ہی اللہ کے محتاج ہو، اللہ تو غنی اور ستودہ صفات ہے۔ ۱۵) اگر وہ چاہے تو تمہیں ہلاک کردے اور ایک نئی مخلوق تمہاری جگہ لے آئے۔ ۱۶) اور یہ اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔ ۱۷) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا، اور اگر کوئی بوجھل نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے کسی کو پکارے گا تو اس کے بوجھ کا ادنیٰ حصہ بھی کوئی اٹھانے کے لیے نہیں آئے گا اگرچہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔ اے پیغمبر! تم صرف انہیں لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو شخص پاکیزگی اختیار کرتا ہے وہ اپنے لیے حاصل کرتا ہے، اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۱۸) اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں۔ ۱۹) اور نہ تاریکیاں اور روشنی۔ ۲۰) اور نہ سایہ اور دھوپ (یکساں ہیں)۔ ۲۱) اور نہ زندے اور مردے برابر ہیں، اللہ ہی جن کو چاہتا ہے سناتا ہے، اور آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں کے اندر ہیں۔ ۲۲) آپ تو بس ایک خبردار کرنے والے ہیں۔ ۲۳) ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی باخبر کرنے والا نہ آیا ہو۔ ۲۴) اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے جو لوگ ہوئے ہیں انہوں نے بھی جھٹلایا، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔ ۲۵) پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جنہوں نے ماننے سے انکار کیا تھا، تو دیکھو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ ۲۶)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ﴿١٥﴾ اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ وَيَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ﴿١٦﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيۡزٍ ﴿١٧﴾

(اے لوگو! تم ہی اللہ کے محتاج ہو، اللہ تو غنی اور ستودہ صفات ہے۔ ۱۵) اگر وہ چاہے تو تمہیں ہلاک کردے اور ایک نئی مخلوق تمہاری جگہ لے آئے۔ ۱۶) اور یہ اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔ ۱۷)

اللہ تعالیٰ غنی اور حمید ہے

گزشتہ آیات میں مختلف حوالوں سے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت اور جن قوتوں کو اس کا شریک ٹھہرایا گیا ہے ان کی بے بسی کو بیان فرمایا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ انسانوں کی غیر معمولی ضروریات اور احتیاجات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں اور اس کے خزانوں کا انسانوں کو حد درجہ محتاج دکھا کر انسان کی بے بصیرتی پر تعریض کی گئی ہے کہ ایک طرف اس کی بے بسی اور قدم قدم پر ضرورت اور

Marfat.com

احتیاج، اور دوسری طرف اس کا تمرد اور استکبار اور فیضانِ ربوبیت اور عطاء وبخشش کے مالک سے بے نیازی کو نمایاں کرتے ہوئے ان کی اصل حیثیت سے پیشِ نظر آیت میں خطاب فرمایا گیا ہے کہ اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج اور فقیر ہو۔ اور اے لوگو! کے لفظ میں ایک طرح سے تنبیہ اور تہدید بھی ہے کہ تم جس طرح زندگی گزار رہے ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے جسم وجان کے خود خالق ہو۔ اور تم جن نعمتوں سے جس طرح متمتع ہو رہے ہو، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ ان نعمتوں کے حوالے سے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہو۔ اور پھر جس طرح اللہ تعالیٰ کا رسول تمہیں تمہارے انجام کے حوالے سے انذار کر رہا ہے اور تمہاری تمام بدتمیزیوں کے باوجود اپنی ہمدردی اور خیرخواہی میں کسی طرح کی تخفیف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس سے شاید تمہیں یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ تم شاید اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی ضرورت بن گئے ہو جس کی وجہ سے بار بار تمہیں تعلیم اور تذکیر سے کام لیا جارہا ہے۔ کہ اگر تم نے ایمان قبول نہ کیا تو شاید اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور کبریائی میں کسی خرابی کے در آنے کا اندیشہ ہے۔ اور اگر تم نے اس کی بندگی اور عبادت کا رویہ اختیار نہ کیا تو شاید اس کی خدائی نہ چل سکے گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم سب اللہ تعالیٰ کے فقیر ہو۔ تم اپنے وجود اور اس کی بقاء کے لیے قدم قدم پر اس کے محتاج ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات میں غنی اور حمید ہے۔ اس کا کوئی کام لوگوں کے ایمان پر اٹکا ہوا نہیں، اور نہ وہ اپنی کائنات کے انتظام وانصرام میں کسی کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول لوگوں کے جگانے اور جھنجوڑنے کے لیے اپنے رات اور دن جو ایک کیے ہوئے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی احتیاج مضمر نہیں بلکہ وہ تمہاری ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں غنی ہے، وہ ہر ایک سے مستغنی اور بے نیاز ہے، کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ لیکن مخلوقات ہر مرحلے پر اس کی توجہ اور عنایت کی محتاج ہیں۔ وہ اگر اپنے خزانوں کے دروازے بند کردے تو انسان بے بسی کی موت مر جائے۔ اسی طرح وہ حمید بھی ہے، یعنی آپ سے آپ محمود ہے۔ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے مگر ہر مخلوق جو اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہے جو اس کے دیے ہوئے رزق سے پیٹ پالتی ہے۔ جو اس کی عطا وبخشش سے سانس لیتی ہے جس کی بقا کی تمام چابیاں جس کے ہاتھ میں ہیں اسے ان نعمتوں کا ادراک یہ شعور عطا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر طرح کی حمد، تعریف اور شکر کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی اپنی ذات میں اس کا استحقاق نہیں رکھتا۔

مزید فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ زمین پر جس طرح اکڑ اکڑ کے چلتے ہو اور اس کی قوتِ روئیدگی کے بے پایاں خزانوں سے ہر مرحلے پر سیراب ہوتے ہو، اگر وہ پروردگار چاہے تو اس کی قدرت سے یہ بعید نہیں کہ وہ ایک لمحے میں تمہیں ہلاک کردے اور اس زمین پر کسی اور کو لاکر بسا دے۔ معذب قوموں کی تاریخ پڑھ کر دیکھو کہ انہوں نے اپنے ملکوں کو جس طرح اپنی خواہشات کی بازی گاہ بنا رکھا تھا اور انہیں گمان یہ تھا کہ ہمیں یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو ان کا بیج مار ڈالا گیا۔ اور پھر ایسا بھی نہیں کہ وہ سرزمین آبادی سے خالی ہوگئی ہو، وہ جس طرح ان کے زمانے میں آباد تھی، آج شاید اس سے بڑھ کر آباد ہو۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے کسی سرزمین سے کسی قوم کو فنا کردیتا ہے اور کسی دوسری قوم کو لاکر وہاں آباد کردیتا ہے۔ قریش کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ تم نے سرزمینِ حجاز کو جس طرح اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اللہ تعالیٰ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ سابقہ امتوں کی طرح تمہیں محروم کر کے کسی دوسری قوم کو یہاں لا بسائے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ تبدیلی کوئی مشکل نہیں۔

Marfat.com

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَیْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

(اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا، اور اگر کوئی بوجھل نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے کسی کو پکارے گا تو اس کے بوجھ کا ادنیٰ حصہ بھی کوئی اٹھانے کے لیے نہیں آئے گا اگرچہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔ اے پیغمبر! تم صرف انہیں لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو شخص پاکیزگی اختیار کرتا ہے وہ اپنے لیے حاصل کرتا ہے، اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ۱۸)

ہر شخص خود اپنا مسؤل ہے

مشرکین کے عقائد میں جو خرابیاں پیدا ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب کوئی شخص اسلام قبول کرنے کی جسارت کرتا تو قبیلے کے سربرآوردہ لوگ اسے گھیر لیتے اور مختلف طریقوں سے اسے بہکانے کی کوشش کرتے۔ جب وہ ان کے بہکاووں میں نہ آتا تو آخر اس سے یہ کہتے کہ ہر قبیلے کے بزرگ ہمیشہ علم و دانش اور خیر خواہی کا سرچشمہ رہے ہیں اس لحاظ سے ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ اسلام میں کوئی بھلائی نہیں، تم محض جوانی کے جوش میں بہک گئے ہو۔ ہم نشیب و فراز سے گزرے ہیں، ہمیں ہر چیز کی حقیقت تم سے زیادہ معلوم ہے۔ ہم تمہیں اطمینان دلاتے ہیں کہ اگر واقعی قیامت کا کوئی وجود ہوا اور وہاں تم سے اسلام سے برگشتگی سے متعلق سوال کیا گیا تو اس کی ذمہ داری ہم قبول کریں گے، اور جوابدہی کے لیے ہم اپنے آپ کو پیش کر دیں گے۔ اور اسی خرابی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جن قوتوں کو ہم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے اور ہم ہمیشہ ان کے نام پر چڑھاوے چڑھاتے اور قربانیاں دیتے ہیں وہ یقیناً آخرت میں ہمارا بوجھ اٹھائیں گی۔ اور جو افتاد بھی ہم پر پڑے گی وہ اس کے لیے سہارا بنیں گی۔ ان مزعومہ تصورات کی تردید کے لیے فرمایا گیا ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ جس طرح دنیا میں کوئی کسی کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتا ہے اور نہ کوئی کسی کی جگہ ماخوذ ہوتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی کوئی کسی کی ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کا خود جوابدہ ہوگا۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے دن اگر کوئی شخص اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ محسوس کرتے ہوئے کسی دوسرے کو اپنی مدد کے لیے پکارے گا کہ تم کسی طرح اس گراں باری میں میری مدد کرو تو کوئی کسی کی بات نہیں سنے گا۔ قریبی رشتہ دار بھی جو دنیا میں حق قرابت پر جان دیتے تھے بات سننے کے روادار نہیں ہوں گے، ہر شخص کو اپنی پڑی ہوگی۔ تمام رشتے جواب دے جائیں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال کے حوالے سے مسؤلیت کا بوجھ تنہا اٹھائے گا۔ تو آج جو لوگ کسی حوالے سے بھی دوسروں کے بوجھ اٹھانے کا وعدہ کر رہے ہیں وہ ایک ایسا جھوٹا بھروسا دلا رہے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

Marfat.com

آپؐ کی دعوت خشیتِ الٰہی کے حامل اور نماز پر عامل قبول کریں گے

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ اپنے مخالفین کو ان حقائق سے آگاہ کر دیں جن سے انہیں قیامت کے دن دوچار ہونا پڑے گا۔ اور جو اس آیت میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ لیکن اگر وہ انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تو آپ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل کسی کی خواہش پر قربان نہیں ہوتا، بلکہ عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے خواہشات قربان کی جاتی ہیں۔ یہ لوگ خواہشوں کے اسیر ہو کے رہ گئے ہیں۔ اس لیے یہ آپ کی دعوت کو قبول کر کے نہیں دیں گے۔ آپ ان لوگوں کو اپنی تبلیغ و دعوت کا ہدف بنائیے اور وہی لوگ آپ کی دعوت قبول کرنے کے اہل بھی ہیں جو بے دیکھے اپنے اللہ سے ڈرتے ہیں، جنہیں کائنات میں پھیلی ہوئی بے شمار نشانیوں کا ادراک ہے، جو اپنی سمع و بصر اور عقل و قلب کی صلاحیتوں کو محسوسات اور معقولات کی آلودگیوں میں زنگ آلود کرنے کی بجائے وحیِ الٰہی کے نور سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر چکے ہیں۔ وہ ہر آستانے کی حقیقت سے بہرہ ور ہونے کے بعد محض اللہ ہی کی محبت کو دل میں اتار چکے ہیں۔ مخلوق کے ہر طرح کے خوف سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ سے ڈرتے اور اسی کے سامنے جھکتے ہیں۔

نماز چونکہ ایمان کا اولین ثمرہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی خشیت کی علامت ہے۔ کیونکہ جو شخص ایمان لاتا ہے نماز کا فرض ہی سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور حقیقی ایمان جس کا مستقر دل ہے وہ یقیناً سب سے پہلے اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے جھکنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے لیکن نماز سے بے پرواہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ایمان کا دعویٰ محض فریب ہے۔ حقیقی ایمان نماز سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اور حقیقی خشیت اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ جس شخص کو بھی یہ دو نعمتیں میسر آ جائیں گی وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کی دعوت کو قبول کرے گا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو آپ کی دعوت کا ہدف بننے کے لائق ہیں، اور یہی لوگ آپ کی دعوت کو قبول کریں گے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اقامتِ صلوٰۃ ایسے دو زریں اصول ہیں جن کا فائدہ یہ ہے کہ جو شخص انہیں اختیار کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کر لیتا ہے۔ اس کی شخصی زندگی ان تمام آلودگیوں سے محفوظ ہو جاتی ہے جو غیر اسلامی زندگی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اور وہ اس تصور سے بھی دور نہیں رہ سکتا کہ میری شخصی پاکیزگی میری اپنی بھلائی کے لیے ہے۔ یہ کسی پر احسان نہیں بلکہ میری اپنی ضرورت ہے کیونکہ مجھے ایک نہ ایک روز اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنا ہے۔ وہاں مجھے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ یہ پاکیزگی اور طہارت جو گناہوں سے بچنے کے نتیجے میں نصیب ہوئی ہیں۔ یہی میری سرخروئی کا سبب بنیں گی اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا استحقاق پیدا کریں گی۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿٢١﴾

(اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں۔ ۱۹) اور نہ تاریکیاں اور روشنی۔ ۲۰) اور نہ سایہ اور دھوپ (یکساں ہیں)۔ ۲۱)

اَعْمٰی سے مراد عقل اور دل کے اندھے ہیں اور بصیر سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی عقل کی صلاحیتیں زندہ ہیں اور دل کا نور روشن ہے۔ اور وہ اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام لینے کا طریقہ جانتے ہیں اور اس کی فکر بھی رکھتے ہیں۔

Marfat.com

اضداد سے استدلال اور آنحضرت ﷺ کو تسلی

ظُلُمٰتُ سے مراد وہ تاریکیاں ہیں جو انسان اپنے جاہلانہ اوہام اور قیاسات و مفروضات سے خود اپنے گرد پیدا کر لیتا ہے۔ اور نور سے مراد وہ روشنی ہے جو وحیِ الٰہی سے انسانیت کو نصیب ہوتی ہے۔ اور اس کا سرچشمہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی ہے۔ اس لیے نور کو ہمیشہ واحد لایا جاتا ہے حالانکہ عربی زبان میں اس کی جمع فصیح بھی ہے اور متداول بھی۔ ظِلٌّ سے مراد سایہ اور ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ اور یہ جنت کے ماحول سے استعارہ ہے۔ اور حَرُوْرُ سے مراد دھوپ کی تپش ہے۔ اور اس سے جہنم کی طرف اشارہ ہے۔

گزشتہ آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ اگر آپ کے مخالفین آپ کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تو آپ اس پر پریشان نہ ہوں۔ ان کا دعوت کو قبول نہ کرنا آپ کی تبلیغ و دعوت میں کسی کوتاہی کا نتیجہ نہیں، بلکہ وہ اس ذہنی اور قلبی استعداد سے محروم ہو چکے ہیں جو آپ کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے ضروری ہے۔ جب تک ان کے اندر خشیتِ الٰہی پیدا نہ ہو اور وہ اپنی حقیقی منزل کی طرف جانے کا یقین پیدا نہ کریں اور ان کے اندر ہدایت کی طلب پیدا نہ ہو اور وہ اس ہدایت کو دنیا و عقبیٰ کے لیے اپنی ضرورت نہ سمجھیں اس وقت تک آپ کی تبلیغی کاوشیں بارآور نہیں ہو سکتیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی بات کو تمثیلات کے انداز میں آگے بڑھایا گیا ہے۔ چنانچہ مثال دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ایک شخص ہے جس کے اندر منزل پر پہنچنے کی کوئی بے تابی نہیں بلکہ وہ سرے سے منزل کا علم ہی نہیں رکھتا۔ جبکہ سفر اور کسی چیز کو جاننے کے لیے بنیادی چیز اس کی آگاہی ہے۔ لیکن آگاہی کی ابتدائی ضرورت آنکھوں سے دیکھنا ہے، اور وہ آنکھیں کھولنے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ آنکھوں کو بند رکھنے کی وجہ سے وہ حقائق سے بے خبر ہی نہیں بلکہ دیکھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو چکا ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ:

جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سو نمونے
مگر تجھ کو اندھا کیا رنگ و بو نے

اور دوسرا وہ شخص ہے جو آنکھوں کی بینائی رکھتا ہے۔ وہ بینائی سے کام بھی لیتا ہے اور گرد و پیش میں پھیلے ہوئے حقائق کو دیکھ کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں شخص اپنے شخصیات کی تعمیر، اپنا مستقبل بنانے کی فکر اور نفع و ضرر کے فہم اور زندگی کی حقیقت کے ادراک اور پھر آخرت میں جواب دہی کی فکر میں یکساں نہیں ہو سکتے۔

جو شخص زندگی کے سفر میں اوہام و خیالاتِ فاسدہ کی پیدا کردہ تاریکیوں میں گم ہونے کی وجہ سے ضمیر کی روشنی سے محروم ہو کر وحیِ الٰہی کے نور سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت سے انکار کر دیتا ہے اور وہ زندگی کے بارے میں فیصلے کرتا ہوا اپنی شخصیت کے گنبد سے کبھی باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا اور تاریکیوں میں ڈوبنے کی وجہ سے کہیں اسے روشنی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جو اپنے ضمیر کی روشنی سے بھی کام لیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے جو وحیِ الٰہی کی شمع جلائی ہے وہ اس کی روشنی میں چلتا ہے۔ اور اسی کو فلاح کی راہ سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے یہ دونوں شخص انجام کے اعتبار سے یکساں نہیں ہو سکتے۔ ایک کے سامنے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ ہے جو اسے صراطِ مستقیم پر چلنے میں مدد دیتا ہے۔ اور آخرکار جنت کے سائے میں پہنچا دیتا ہے۔ اور دوسرا شخص اپنی اور ماحول کی پیدا کردہ تاریکیوں میں ڈوب کر اپنے انجام کو بگاڑ لیتا ہے اور آخرکار جہنم کی تپش کا شکار ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

ان تشبیہات سے ایک مومن اور کافر میں فرق کیا گیا ہے۔ مومن اپنی صلاحیتوں اور دل کی تابندگی سے کام لے کر زندگی کے اس راز کو پالیتا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے پیغمبر دعوت دیتے ہیں اور کافر اوہام وخرافات کی تاریکیوں میں ڈوب کر اللہ تعالیٰ کے نبی کی تبلیغ ودعوت سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مومن اور کافر دونوں اپنی شخصیات اور انجام کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوسکتے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾

(اور نہ زندے اور مردے برابر ہیں، اللہ ہی جن کو چاہتا ہے سناتا ہے، اور آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں کے اندر ہیں۔ ۲۲)

ہدایت قبول نہ کرنے والے خود اپنی ضلالت کے ذمہ دار ہیں

جن لوگوں نے اپنی صلاحیتوں کو غلط استعمال کی وجہ سے ناکارہ کردیا، اور ضمیر کے نور سے محروم ہوگئے، یہ لوگ درحقیقت زندہ نہیں مردہ ہیں۔ کیونکہ:

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ظاہر ہے کہ زندہ اور مردہ کسی لحاظ سے برابر نہیں ہوسکتے۔ ایک دھرتی پر بوجھ ہے، اور دوسرا دھرتی کا زیور اور معمار ہے۔ کافر لوگ چونکہ اپنے دلوں کی روشنی بجھا چکے ہیں، اپنی عقلوں کو بگاڑ چکے ہیں، حقیقی احساس اور شعور سے محروم ہوگئے ہیں اور برے بھلے کی تمیز کھو بیٹھے ہیں۔ اب اگر وہ آپ کی دعوت کو قبول نہیں کررہے تو اس میں آپ کو دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ان میں حقیقی زندگی ہوتی تو آپ کی حقائق بخش تعلیم ودعوت یقیناً ان کی اپنی ضرورت بن جاتی۔ لیکن زندگی سے محروم ہوجانے کے بعد ان سے اس قسم کی توقع کرنا اور توقع کے پورا ہونے پر غم لگالینا کسی طرح مناسب نہیں۔ مردے نہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں، ان کو سنانا صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ معجزانہ طور پر انہیں بھی کسی پیغمبر کی بات سنادے یا پتھروں میں بھی سننے کی صلاحیت پیدا کردے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت سے بعید نہیں۔ لیکن اس نے دنیا کے لیے جو قانون بنا رکھا ہے اس لحاظ سے مردے پیغمبر کی بات کو بھی نہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ تو یہ آپ کے مخالف جو ہدایت کے اعتبار سے مردہ ہوچکے ہیں اگر آپ کی بات کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾

(آپ تو بس ایک خبردار کرنے والے ہیں۔ ۲۳) ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی باخبر کرنے والا نہ آیا ہو۔ ۲۴)

Marfat.com

آپؐ کی اصل حیثیت اور اس کی حد

نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے تبلیغ و دعوت کے حوالے سے آپ کی ذمہ داری کی حد بھی واضح کر دی ہے۔ یعنی آپ کا کام لوگوں کو دعوت دینا اور انہیں آنے والے خطرے سے آگاہ کر دینا ہے۔ کیونکہ ہم نے آپ کو نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور نذیر کا کام آگاہ کر دینا ہوتا ہے منوانا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ بات لوگوں پر واضح کر دینے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ یعنی آپ جن باتوں کی خبر دے رہے ہیں ان میں سے ہر بات شک و شبہ سے بالاتر ہے اور لوگوں پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ان کی آخرت کا دارومدار آپ کی باتوں کو ماننے یا انکار کر دینے پر ہے۔ جو لوگ آپ کی دعوت کو قبول کر لیں ان کے لیے ہم نے آپ کو بشیر بنا کر بھیجا ہے یعنی انہیں آپ ان کے مبارک انجام کی خوشخبری سنا دیں۔ اور جو لوگ آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیں انہیں ان کے انجامِ بد سے آگاہ کر دیں۔ اس سے زیادہ آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ آپ کو جو غایت درجہ لوگوں کی ہدایت سے تعلق ہے اس وجہ سے آپ کا دل گرفتہ ہونا سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن یہ آپ کے فریضۂ دعوت کا حصہ نہیں۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا کہ آپ دنیا میں پہلے نذیر نہیں بلکہ آپ آخری ہیں۔ گزشتہ قوموں میں بہت سے نبی اور رسول گزر چکے ہیں۔ ان میں سے ہر رسول نذیر بن کر آیا اور انہوں نے اپنی امت کے سامنے انذار کا حق ادا کیا۔ اس لیے آپ کو ان کی سرگزشتوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انذار کے نتائج کیا ہوتے ہیں اور قومیں کس طرح کا ردِ عمل ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح آپ کی قوم کو بھی اس سے درسِ عبرت مل سکتا ہے تاکہ وہ ان کے انجام کو دیکھ کر اپنے انجام کی فکر کر سکیں۔

یہ جو فرمایا گیا کہ ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی نذیر بھیجا ہے۔ اس کا ذکر قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر کیا ہے۔ سورۃ رعد آیت سات میں فرمایا: لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ اور سورۃ نحل میں ارشاد فرمایا گیا: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر امت کی ہدایت کے لیے کوئی نہ کوئی ہادی اور رسول آتا رہا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر بستی اور ہر شہر میں ایک رسول آتا رہا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نبی کی تبلیغ و دعوت کا اثر جہاں تک پہنچ گیا ہے یا پہنچ سکتا ہے وہاں کے لیے وہی نبی اور رسول کافی ہے۔ اور جب تک پہلے نبی کی ہدایت و دعوت کے آثار اور اس کے رہنمائی کے نقوش لوگوں میں زندہ رہتے ہیں اس وقت تک کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿٢٥﴾

(اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے جو لوگ ہوئے ہیں انہوں نے بھی جھٹلایا، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔ ۲۵)

Marfat.com

مکذبین کی تکذیب پر تاریخ سے استدلال

گزشتہ آیت کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں ان کے پاس جب اللہ تعالیٰ کے رسول ہدایت لے کر آئے تو انہوں نے بھی اسی طرح اپنے رب کے رسولوں کی تکذیب کی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس راستے کی لازمی سنت اور ایک ایسی مستحکم روایت ہے جس سے کبھی انحراف نہیں ہوا۔ اگر آپ کی قوم کا رویہ یا سلوک آپ کے ساتھ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہوتا تو آپ اسے اپنی کوتاہی پر محمول کر سکتے تھے۔ لیکن جب ہر قوم نے اپنی طرف آنے والے رسول کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہدایت وضلالت کی یہی تاریخ ہے جو ہمیشہ جاری رہی ہے۔ ممکن ہے ذہن میں یہ خیال آئے کہ آنے والے رسول شاید اپنے ساتھ دلائل و معجزات کا ایسا سرمایہ لے کر نہ آئے ہوں جس سے قومیں مطمئن ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ گزشتہ قوموں کی طرف سے جو رسول آئے وہ بھی اپنے ساتھ دلائل و معجزات کا ایک خزانہ لے کر آئے۔ جنہوں نے ہمیشہ اپنی قوموں کے دانشوروں اور اہلِ علم کو دلائل کے میدان میں شکست دی اور اپنے معجزات سے مخالفت میں کھلنے والی زبانوں کو گنگ کر دیا۔ اور ان کے زندگی کے مسائل کے حل کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر صحیفے نازل فرمائے اور روشن کتابیں اتاریں۔ لیکن جن کے دلوں کی قندیلیں بجھ چکی تھیں پیغمبر کی معجزانہ دعوت اور حیرت انگیز معجزات بھی ان کے دلوں کے روشنی کا سامان نہ بن سکے۔ حتی کہ وہ قومیں اپنے انجام کو پہنچ گئیں۔

ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٢٦﴾

(پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا جنہوں نے ماننے سے انکار کیا تھا، تو دیکھو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ ۲۶)

جب لوگوں نے تکذیب کی روش جاری رکھی اور کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کے نبی کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پھر میں نے ان کو پکڑ لیا۔ تو پھر دیکھو کہ ہماری پکڑ کتنی شدید تھی اور ہماری سزا کیسی عبرت انگیز تھی۔ کتنی معذب قوموں کے کھنڈرات سے تمہارے تجارتی قافلے گزرتے ہیں۔ ان کی تاریخ سینہ بہ سینہ تم تک پہنچ چکی ہے۔ تم خوب جانتے ہو کہ ان کا انجام کیسا ہولناک تھا۔ مقصود اس ساری داستان سرائی سے صرف یہ ہے کہ قریش اور دیگر اہلِ مکہ اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے انجام کی فکر کریں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۭ وَمِنَ

الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿٢٧﴾

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَاۗبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۭ

Marfat.com

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾
إِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْفَقُوْا مِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ
أُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۗ إِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾ وَالَّذِيْٓ
أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ
إِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ
اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ
وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۲﴾
جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ
لُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ أَذْهَبَ
عَنَّا الْحَزَنَ ۗ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْٓ أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ
مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ
لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۗ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿۳۶﴾ ۚ وَهُمْ
يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا
نَعْمَلُ ۗ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ۗ

Marfat.com

فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ ﴿۳۷﴾

رکوع: ۴۔ (کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دیے اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ مختلف رنگوں کی دھاریاں ہیں اور گہری سیاہ بھی۔ ۲۷) اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں، بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔ ۲۸) بے شک جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی خسارے کا شکار نہیں ہوگی۔ ۲۹) تاکہ اللہ ان کے اجر پورے کے پورے ان کو دے اور ان کے لیے اپنے فضل میں سے زیادہ بھی کرے، بے شک وہ بخشنے والا اور قدردان ہے۔ ۳۰) اور جو کتاب ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے وہی حق ہے، تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے آئی تھیں، بے شک اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۳۱) پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا، پس ان میں سے کوئی تو اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی ان میں سے بیچ کی راس ہے اور کوئی ان میں سے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے، یہی بہت بڑا فضل ہے۔ ۳۲) ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی کے پہنائے جائیں گے، اور اس جنت میں ان کا لباس ریشم ہوگا۔ ۳۳) اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا، یقیناً ہمارا رب بخشنے والا اور قدر فرمانے والا ہے۔ ۳۴) جس نے ہمیں اپنے فضل سے اس اقامت کے گھر میں اتارا جس میں نہ ہمیں کوئی مشقت پیش آئے گی اور نہ اس میں ہمیں کوئی تکان لاحق ہوگی۔ ۳۵) (اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ان کی قضا ہی آئے گی جو مر جائیں اور نہ ان کے لیے جہنم کے عذاب میں کمی کی جائے گی، اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو کفر کرنے والا ہے۔ ۳۶) اور وہ اس میں واویلا کریں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں یہاں سے نکال دے، اب ہم نیک عمل کریں گے، ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے، کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا، اور تمہارے پاس ایک ڈرانے والا بھی آیا، پس اب مزہ چکھو، اور ظالموں کا کوئی مددکرنے والا نہیں۔ ۳۷)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾

Marfat.com

(کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دیے اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ مختلف رنگوں کی دھاریاں ہیں اور گہری سیاہ بھی۔ ۲۷)

گزشتہ مضمون کا تسلسل پیرایۂ بیان کے اختلاف کے ساتھ

گزشتہ مضمون ہی کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم نے تنوع، لطف و لذت میں اختلاف اور رنگا رنگی صرف جمادات و نباتات ہی میں نہیں رکھی اور فاصلے زندگی اور موت ہی میں قائم نہیں کیے بلکہ یہ تنوع اور اختلاف ہم نے دیگر مختلف اشیاء میں بھی رکھا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا جس طرح تنہا خالق ہے، اسی طرح وہ بے مثل مصور بھی ہے۔ اس کی صناعی میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے متضاد عناصر کو جوڑ کر اور متخالف طبائع کو ہم آہنگ بنا کر مثبت اور کارآمد اشیاء کی تخلیق اور حکمتِ تخلیق کے مطابق ایک ذرے سے لے کر بڑی سے بڑی مخلوق کو رواں دواں رکھنا یہ اسی صورت ممکن ہے کہ جب یہ کائنات مختلف دیوتاؤں کی رزم گاہ ہونے کی بجائے ایک خالق و مالک کی حاکمیت کے اشارے پر چلتی ہو۔ چنانچہ اسی کی تسہیل کے لیے ارشاد فرمایا کہ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا جو ایک طرف انسانوں کی پیاس بجھاتا ہے تو ساتھ ہی زمینوں کو سیراب بھی کرتا ہے۔ پھر اس سیرابی کے نتیجے میں مختلف چیزوں کو پیدا بھی فرماتا ہے۔ ایک زمین، ایک ہی طرح کا پانی، ایک جیسا موسم اور ایک جیسی ہَوا کے زیرِ اثر اگنے والی نباتات، ایک قسم، ایک رنگ اور ایک مزے کی حامل ہونے کی بجائے مختلف الالوان، مختلف النوع اور مختلف الاثرات لیے ہوئے اگتی ہیں۔ کہیں خوشنما، خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھلوں والی چیزیں اگتی ہیں۔ اور کہیں سنہرے خوشوں والی، سبز پتوں والی، مسکراتے پھولوں والی، اور کہیں اودے اودے، نیلے نیلے اور پیلے پیلے پیراہنوں والی فصلیں لہلہاتی ہیں، جس سے یہ یقین کیے بغیر چارہ نہیں کہ اس کائنات کا خالق جہاں بے پناہ قدرتوں کا مالک ہے وہیں وہ بے مثل صناع، محیر العقول حکمتوں کا مالک اور انسانی فہم و ادراک سے بالا مصور بھی ہے۔ اور اس کا اظہار بارش برسنے کے بعد زمین کے مختلف علاقوں میں فراوانی سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پہاڑ جو اپنی صلابت، قد و قامت اور نہایت مضبوط ایستادگی میں ایک مثال ہے، ان میں بھی ہمیں انواع و الوان کا اختلاف نظر آتا ہے، ان کی اقسام کا کوئی شمار نہیں۔ اور پھر ہر پہاڑ کے اندر درجہ بدرجہ یہ اختلاف اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کا مظہر بھی ہے اور اس کی صناعی کا منہ بولتا ثبوت بھی۔ ایک عظیم پہاڑ جو اپنی جسامت میں دیکھنے والوں کو حیران کر دیتا ہے، لیکن اس کے اندر مختلف رنگوں کی مختلف سلیں باہم اس طرح پیوست دکھائی دیتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی صناع اور مصور نے نہایت محنت سے انہیں جوڑ کر ایک خاص صورت عطا کی ہے۔

بعض الفاظ کی تشریح

جُدَدٌ، جُدَّۃٌ کی جمع ہے۔ یہ لفظ چھوٹے راستے پر بھی بولا جاتا ہے جسے جادہ کہتے ہیں اور اس کا اطلاق ہرنوں اور خچروں کی پیٹھوں پر مختلف رنگوں کی جو دھاریاں ہوتی ہیں ان پر بھی ہوتا ہے۔ پھر اسی سے ترقی کر کے مختلف الالوان سلوں اور چٹانوں پر بھی ہونے لگا جن کی دھاریاں یا قطاریں پہاڑوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

Marfat.com

غَرَابِيبُ ، غِرْبِيب کی جمع ہے۔اس کا معنی ہے گہرا، تاریک اور کالا بھجنگ۔ یہاں یہ لفظ بدل کے مفہوم میں وضاحت کے طور پر آیا ہے۔اور بدل جب وضاحت کے لیے آتا ہے تو وہ درحقیقت تاکید ہی کے لیے آتا ہے۔ یہاں اس وضاحت اور تاکید سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جس طرح پہاڑوں میں سیاہ پتھر ہوتے ہیں اور وہ پہاڑ کے اندر کسی نہ کسی حکمت کی تکمیل کے لیے پیوست کیے جاتے ہیں۔اسی طرح لوگوں کے اندر سیاہ قلب افراد بھی ہوتے ہیں۔اور جس طرح سفید اور سرخ اور سیاہ پتھروں کا الگ الگ مصرف ہے،اسی طرح سیاہ قلب افراد کا بھی ایک محل اور مصرف ہے جن کو قدرت نے اس دنیا میں مہلت دے دی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۗ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

(اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں، بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔ ۲۸)

گزشتہ آیت میں ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا کے اندر مُخْتَلِفًا کے لفظ کو منصوب ذکر فرمایا گیا ہے کیونکہ وہ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے۔لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں انسانوں اور چوپایوں وغیرہ میں یہ اختلاف بصورتِ صفت بیان فرمایا گیا ہے۔اس لیے مُخْتَلِفٌ مرفوع لایا گیا۔بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ ممکن ہے اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہو کہ ثمرات کا اختلافِ الوان تو ایک حال پر نہیں رہتا، وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بدلتا رہتا ہے، بخلاف پہاڑوں اور انسان اور جانوروں کے کہ ان کے جو رنگ ہیں وہ عموماً قائم رہنے والے ہیں، بدلتے نہیں۔

انواع واقسام سے استدلال ایک دوسرے پہلو سے

اس آیت کا مضمون گزشتہ آیت کے مضمون سے گہرا اتصال رکھتا ہے۔اشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح نباتات و جمادات میں انواع و اقسام کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر دلیل ہے اسی طرح انسانوں، جانداروں اور چوپایوں میں بھی یہی گونا گونی اور بوقلمونی نمایاں ہے۔جانوروں اور مویشیوں کو دیکھ لو، ان کے قد و قامت، ان کے عادات و اطوار، ان کے میلانات، ان کی خدمات اور انہیں انجام دینے کی صلاحیتوں میں نہایت دور رس اختلاف پایا جاتا ہے۔کوئی جانور دودھ دیتا ہے، کوئی بار برداری کا فرض انجام دیتا ہے، کوئی ہل اور رہٹ کھینچتا ہے۔ ہر ایک کو جیسی صلاحیت دی گئی ہے ویسا اس کی خدمات کا آہنگ بنا دیا گیا ہے۔اور جیسے فرائض سونپے گئے ہیں ویسا ہی قد و قامت اور مزاج دیا گیا ہے۔اور انسانوں میں دیکھو تو ہر شخص صورت، سیرت، صفات، مزاج، خصوصیات اور عادات و اطوار کے اعتبار سے دوسرے سے مختلف ہے۔یعنی جس طرح ہر جانور دودھ نہیں دے سکتا، اسی طرح ہر شخص بھی انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا حامل نہیں ہوتا۔یہ حیرت انگیز اختلاف جو بے شمار الوان و اقسام پر مشتمل ہے، کیا اس بات کو سمجھانے کے لیے کافی نہیں کہ اس کائنات کو چلانے والا اس کائنات کا خالق و مالک جس طرح تنہا اور واحد ہے اور جس کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں، اسی طرح اس کی صناعی اور مصوری بھی بے مثال ہے۔اور مزید یہ کہ اس نے انسانوں کو بالخصوص جس طرح عادات و اطوار، صلاحیتوں اور طبائع اور اذہان میں ایک دوسرے سے

Marfat.com

مختلف پیدا فرمایا ہے۔ اگر کہیں ان میں اختلاف کی بجائے یکسانی اور ہم آہنگی ہوتی اور یہ اپنی افتادِ طبع، اپنی خواہشات، جذبات، میلانات اور طرزِ فکر کے لحاظ سے ایک جیسے ہوتے تو شاید دنیا میں انسان کی قسم کی ایک مخلوق پیدا کرنا سرے سے لاحاصل ہو جاتی۔ کیونکہ جن بنیادوں پر انسانوں کا امتحان لیا جا رہا ہے اور جن خصوصیات کی وجہ سے انسان برائی کی طرف راغب ہونے لگتا ہے اور جن میلانات کے باعث انسانی مفادات ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتے ہیں، اسی سے اس کی آزمائش اور امتحان کا تار و پود بنتا اور اس کے مطابق احکام وجود میں آتے اور انہیں سے پیدا ہونے والے نتائج کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ کیوں چلایا اور کیوں وحیِ الٰہی کے ذریعے نور کا وہ چراغ روشن کیا جس سے انسانیت کو صحیح راستہ دیکھنا ممکن ہوا۔ اسی لیے یہاں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے صرف وہ لوگ ڈرتے ہیں جو علم و معرفت کی دولت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ معرفتِ خداوندی نصیب ہوتی ہے نہ بہت سی حکمتوں کا سربستہ راز کھلتا ہے، نہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا عرفان پیدا ہوتا ہے اور نہ اس سے صحیح تعلق کی بنیاد پڑتی ہے۔ ایک سائنسدان جب کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے یا خود آگاہ ہوتا ہے تو اگر اس کے اندر معرفتِ خداوندی اور صفاتِ خداوندی کا شعور نہیں تو وہ علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ مادہ پرستی یا ذات کے پندار میں مبتلا ہوتا جاتا ہے۔ اور جس مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اس سے اور دور ہٹ جاتا ہے۔ وہ پھول کی پتی کو دیکھ کر اس کے رنگ و بو میں کھو جاتا ہے جس سے اس کے حقیقی شعور کی آنکھ اور ماند پڑ جاتی ہے۔ لیکن جسے اللہ تعالیٰ نے حقیقی علم عطا فرمایا ہے اور وہ علم کی معراج سے کسی حد تک آگاہ ہو گیا ہے وہ پھول کی پتی کو دیکھ کر اس کے رنگ و بو میں الجھنے کی بجائے اس کے خالق کے بارے میں سوچنے لگتا ہے کہ جس نے ایک پتی کو ایسی خوبصورتی دی ہے وہ خود کتنا خوبصورت ہوگا۔ سوچ کی یہی لہر اسے اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کر دیتی ہے۔ اسی لیے شریعت کی زبان میں علم سے مراد فلسفہ اور سائنس اور تاریخ و ریاضی وغیرہ درسی علوم نہیں ہیں، بلکہ وہ علم ہے جس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی خشیت سے جڑا ہوا ہے۔ اور یہ علم ضروری نہیں کہ کتابوں سے حاصل ہو، بعض دفعہ اللہ والوں کی صحبت سے بغیر لکھے پڑھے بھی اس علم سے وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا لَيْسَ الْعِلْمُ عَنْ كَثْرَةِ الْحَدِيْثِ وَلٰكِنَّ الْعِلْمَ كَثْرَةُ الْخَشْيَةِ ”علم کثرتِ حدیث کی بنا پر نہیں ہے بلکہ خوفِ خدا کی کثرت کے لحاظ سے ہے۔“ حضرت ربیع بن انسؓ نے فرمایا: مَنْ لَّمْ يَخْشَ فَلَيْسَ بِعَالِمٍ ”جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ عالم نہیں ہے۔“ حضرت علیؓ نے فقیہ کی تعریف اس طرح فرمائی: اِنَّ الْفَقِيْهَ حَقَّ الْفَقِيْهِ مَنْ لَّمْ يَقْنَطْ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ وَلَمْ يُرَخِّصْ لَهُمْ فِيْ مَعَاصِي اللّٰهِ تَعَالٰى وَلَمْ يُؤْمِنْهُمْ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَلَمْ يَدَعِ الْقُرْاٰنَ رَغْبَةً عَنْهُ اِلٰى غَيْرِهٖ اَنَّهٗ لَا خَيْرَ فِيْ عِبَادَةٍ لَا عِلْمَ فِيْهَا وَلَا عِلْمٍ لَا فِقْهَ فِيْهِ وَلَا قِرَاءَةٍ لَا تَدَبُّرَ فِيْهِ (قرطبی) ”فقیہ کامل فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس بھی نہ کرے اور ان کو گناہوں کی رخصت بھی نہ دے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مامون بھی نہ کرے اور قرآن کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی طرف راغب نہ کرے (اور فرمایا) اس عبادت میں کوئی خیر نہیں جو علم کے بغیر ہو اور اس علم میں کوئی خیر نہیں جو بے فقہ یعنی بے سمجھ بوجھ کے ہو اور اس قراءت میں کوئی خیر نہیں جو بغیر تدبر کے ہو۔“

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے علم کا شعور دے کر اپنی اور اپنی صفات کی معرفت آسان کر دی ہے۔ اور اسی سے اپنا دین سہل کر دیا ہے۔ البتہ جو شخص تمرد اور سرکشی کی وجہ سے اس طرف نہیں آتا اللہ عزیز ہے وہ ایسے نافرمانوں کو جب چاہے پکڑ سکتا ہے اور کوئی اس کی پکڑ سے نکلنے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ غفور بھی ہے، عفو و درگزر اس کی شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں کوتاہی ہوتی ہے تو وہ درگزر سے کام لیتا ہے۔ مزید بہتری کے لیے مہلت دیتا ہے اور سنبھلنے کے لیے بھی موقع عطا فرماتا ہے۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ یَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾

(بے شک جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی خسارے کا شکار نہیں ہوگی۔ ۲۹) تاکہ اللہ ان کے اجر پورے کے پورے ان کو دے اور ان کے لیے اپنے فضل میں سے زیادہ بھی کرے، بے شک وہ بخشنے والا اور قدردان ہے۔ ۳۰)

علماء کی تین صفات

گزشتہ دو آیتوں میں خصوصاً اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ کائنات کی مختلف مخلوقات میں یک رنگی اور یکسانی کی بجائے تنوع اور تفاوت پایا جاتا ہے اور اس تنوع کی وجہ سے مختلف مخلوقات سے مختلف اعمال کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک ہی زمین سے نکلنے والی پیداوار اور ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والی زمین سے نکلنے والے پودے اپنے اندر لطف ولذت اور رنگ وروپ میں گہرا اختلاف رکھتے ہیں۔ یہی حال انسانوں اور دوسرے جانوروں کا بھی ہے۔ ان میں بھی صورت وسیرت، ہمت واستقامت، خوبی ورعنائی اور حُسن وقبح میں گہرا اختلاف پایا جاتا ہے۔ جس طرح ہر مخلوق سے ایک طرح کے ردِعمل کی توقع نہیں کی جاسکتی، اسی طرح انسانوں سے بھی ایک ہی طرح کے تأثرات، تحفظات، انفعالات اور اعمال کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا جتنا زیادہ گہرا ادراک بخشا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہے۔ اور زندگی کے بارے میں اس کا رویہ اتنا ہی زیادہ حقیقت کے قریب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم الاشیاء اور صفاتِ الٰہیہ کا علم، یہ دو بنیادیں ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت کا راستہ کھلتا ہے۔ اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے خوف سے آشنا ہوجاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کو خشیتِ الٰہی کہا گیا ہے اور ان دونوں علوم کے جاننے والے علماء کہلاتے ہیں جو اس خشیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان ہی علماء کی مزید تین صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

تلاوتِ کتاب اللہ، اقامتِ صلٰوۃ اور انفاق فی سبیل اللہ۔ کیونکہ جس دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت پیدا ہوجاتی ہے وہ بجائے اپنی خواہشات کا اتباع کرنے اور دنیا کے وضعی علوم کی تقلیدِ جامد کی بجائے سب سے پہلے یہ بات جاننے کے لیے بے قرار ہوجاتا ہے کہ جس پروردگار نے مجھے زندگی عطا فرمائی ہے اور پھر اس کی بقا کا سامان کیا ہے، یقیناً اس نے زندگی گزارنے کے لیے رہنمائی کا سامان بھی کیا ہوگا۔ چنانچہ جیسے ہی اسے اس بات کی خبر ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی بھلائی کے لیے اپنا ایک رسول مبعوث کیا ہے اور اس پر اپنی کتاب اتاری ہے تو وہ دیوانہ وار اس کتاب کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں اسے اپنا محبوب دکھائی دیتا اور اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ چنانچہ وہ زندگی کا ایک ایک شعبہ اور ایک ایک معاملہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی روشنی میں طے کرتا اور حل کرتا ہے۔ وہ نہایت محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت بھی کرتا ہے اور اس کی رہنمائی میں زندگی کا سفر بھی کرتا ہے۔ اور فرائض میں چونکہ سب سے جامع فریضہ جو بار بار انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اسلام کی حقیقی روح کو اس کے رگ وپے میں اتار دیتا ہے، وہ نماز ہے۔ تو وہ نہایت

Marfat.com

اہتمام اور پورے آداب کے ساتھ اسے اس طرح بجالاتا ہے کہ نماز اس کے دل کی ٹھنڈک اور اللہ تعالیٰ کی یاد کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ قرآنِ کریم یہ بات بار بار واضح کرتا ہے کہ یہود پہ جب زوال آیا تو انہوں نے سب سے پہلے فریضہ صلوٰۃ ہی سے تعلق توڑا، رفتہ رفتہ اس کا ذکر ہی اپنی کتابوں سے محو کردیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ یہ کہا جانے لگا کہ اگر کوئی شخص سال بھر میں ایک دفعہ بھی نماز کی نیت سے کسی کھمبے پر بھی پیشانی رکھ دے تو نماز کا فرض ادا ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم صراحت سے کہہ رہا ہے کہ ایسی صورتحال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دل خشیتِ الٰہی سے خالی ہوجاتے ہیں۔ لیکن جنہیں اللہ تعالیٰ نے خشیت سے نوازا ہے اقامتِ صلوٰۃ تو ان کے لیے غذا بن جاتی ہے۔ تیسری چیز جو ان میں پیدا ہوتی ہے وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ کیونکہ جب کوئی قوم زوال کا شکار ہوتی ہے تو اس میں جو بڑے بڑے عیوب پیدا ہوتے ہیں ان میں بخالت اور زر پرستی کی بیماری پیش پیش ہوتی ہے۔ یہود بھی اپنے دورِ زوال میں اسی کا شکار ہوئے۔ اور پھر یہ بیماری ان کی قومی علامت بن کر رہ گئی۔ لیکن خشیتِ الٰہی سے بہرہ ور علماء اور ان کے راستے پر چلنے والے لوگ تلاوتِ کتاب، اہتمامِ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ اپنے مال و دولت کو کھلے اور چھپے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ وہ دولت کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر استعمال کرتے ہیں اور اس کے حوالے سے عائد ہونے والے حقوق کو ادا کرتے ہیں۔ وہ دولت کو ایک ضرورت سمجھتے ہیں اور دین کو مقصدِ زندگی گردانتے ہیں۔ اس لیے اس مقصد کو ضرورت پر قربان کرنے کی بجائے وہ ہمیشہ ضرورت کو مقصد کے فروغ کا ذریعہ بناتے ہیں۔ وہ اسے ایک ایسی تجارت سمجھتے ہیں جس کے نتیجے میں اجر و ثواب، لوگوں کی بھلائی اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ انہیں اس بات کا گہرا شعور ہے کہ زندگی کی ضروریات کی فراہمی کے لیے لوگ تجارت کرتے ہیں لیکن وہ تجارت اگرچہ فائدے کی نیت سے کی جاتی ہے لیکن کبھی کبھی اس میں نقصان بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن جو تجارت ہم کرتے ہیں اس میں کبھی خسارہ نہیں ہوتا۔ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ انفاق کو برکت دیتا ہے اور آخرت میں انہیں اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف اس تجارت کا زیادہ سے زیادہ اجر عطا فرمائے گا بلکہ اپنے فضل و کرم سے اس میں اضافہ بھی فرمائے گا۔ اس اضافے کا اس آیتِ کریمہ میں جس طرح ذکر فرمایا گیا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ ایک وعدہ بھی ہے جسے وہ اپنے معمول کے مطابق پورا کرے گا۔ بشرطیکہ خرچ کرنے والا ریا اور نمائش کے لیے خرچ نہ کرے۔ نہ کسی پر احسان جتلائے نہ معاوضہ چاہے۔ پیشِ نظر صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول رہے۔ چنانچہ خرچ کرنے والے قیامت کے دن دیکھیں گے کہ ان کا خرچ کیا ہوا ایک ایک دانہ کوہِ احد کے برابر ہوچکا ہے۔ اور ان کی عزت افزائی کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں قیامت کے دن کی ہولناکی میں اس وقت عرشِ الٰہی کے سائے میں جگہ دے گا جب اس کے سوا اور کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

دو صفاتِ الٰہیہ

آیتِ کریمہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفات کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ غفور بھی ہے اور شکور بھی۔ ان سے شاید اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ان مخلص بندوں سے قیامت میں جو سلوک کرے گا وہ کسی تنگدل آقا جیسا نہیں ہوگا کہ جو بات بات پر پکڑتا ہے اور ذرا سی خطا پر اپنے ملازم کی ساری خدمتوں اور وفاداریوں پر پانی پھیر دیتا ہے، بلکہ وہ ایسا آقا ہے جو اپنے مخلص بندوں کی نیکیاں قبول کرنے کے معاملے میں بڑی چشم پوشی سے کام لے گا اور ان کے چھوٹے چھوٹے عمل کو بھی قدر و منزلت عطا فرمائے گا اور بیش از بیش صلہ سے نوازے گا۔

Marfat.com

کہا جاتا ہے کہ نواب عبدالرحیم خانِ خاناں اپنے مصاحبوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور ضرورت مندوں کو بھی باریابی کی اجازت دی گئی تھی۔ ایک شخص نے بغل سے توپ کا گولا نکال کر نواب کی طرف لڑھکایا اور وہ آ کر نواب کی ٹانگ کو لگا۔ مصاحب اس گستاخ کو پکڑنے کے لیے اٹھے، نواب نے روک دیا اور حکم دیا کہ اس توپ کے گولے کے برابر اس شخص کو سونا دے دیا جائے۔ لوگ حیران ہوئے کہ گستاخی پر سرزنش کی بجائے اتنا بڑا انعام آپ ہی دے سکتے ہیں۔ نواب نے کہا کہ لوگ اپنے امراء کو پارس سمجھتے ہیں اور پارس وہ پتھر ہوتا ہے جس سے چھو جانے والا لوہا سونا بن جاتا ہے۔ اس شخص نے لوہے کا گولا میری طرف پھینک کر یہ دیکھنا چاہا کہ میں پارس ہوں کہ نہیں۔ تو میں نے اسے سونا اس لیے دیا ہے تاکہ اسے میرے پارس ہونے کا یقین ہو جائے۔ اگر ایک نواب اپنی ذات کی معرفت کے لیے اتنا بڑا انعام دے سکتا ہے تو پروردگار اپنے فضل و کرم کے اظہار کے لیے اپنے مخلص بندوں کو کیسے کیسے انعامات سے نوازے گا، اسے وہی جانتا ہے۔

وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ هُوَالْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا
بَیْنَ یَدَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۳۱﴾

(اور جو کتاب ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے وہی حق ہے، تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے آئی تھیں، بے شک اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۳۱)

اب حق کی نمائندہ یہ آخری کتاب ہے

کتاب اللہ کی تلاوت اور اس پر عمل کا جو صلہ ملنے والا ہے اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی کتابیں بھی نازل ہوئی ہیں ہر کتاب اپنے نزول کے وقت سے لے کر محفوظ رہنے تک یقیناً اسی اجر و ثواب کی حامل رہی ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا۔ اور لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بھی اپنے دور میں اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لیکن جب اہلِ کتاب نے ان کتابوں میں تحریف کی ترمیم سے انہیں بگاڑا اور مختلف خیانتوں کا ارتکاب کیا تو وہ کتابیں حق کی نمائندہ نہ رہیں، کیونکہ ان میں کتمان سے بھی کام لیا گیا اور تجاوز سے بھی۔ اور ان کے بگاڑ کے لیے تمام ذرائع عمل میں لائے گئے۔ اور ان میں اتنا کھوٹ شامل کر دیا گیا کہ اب اس میں خالص حق کا پہچاننا ناممکن ہو گیا۔ اس لیے اس وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ انسانوں کو اپنی ہدایت کے لیے یکسو ہونے کا موقع ملے کہ وہ پہلے سے منزل کتابوں میں سے ہر ایک کو حق کی کسوٹی نہ سمجھیں بلکہ اب جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول محمد ﷺ پر کتاب نازل کی ہے یہ حق کی علامت ہے۔ اس میں از اول تا آخر کسی چیز کی ملاوٹ شامل نہیں۔ اسی لیے جو شخص بھی اپنی ہدایت کے لیے حق کا متلاشی ہو اسے نہایت اطمینان سے اس کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہی حق ہے اور یہی حق کا سرچشمہ ہے، اور یہی قولِ فیصل ہے اور یہی کسوٹی ہے جس پر تمام افکار کو جانچا جا سکتا ہے۔ اور مزید یہ کہ یہ کسی نرالی بات کی دعوے دار ہو کر نہیں آئی۔ پچھلے انبیاء نے جو کچھ تعلیمات اپنی امتوں کے سامنے پیش کیں یہ انہی تعلیمات کی جامع اور نمائندہ ہے۔ یہ ان تمام کتابوں کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کتابوں میں نبی کریم ﷺ اور قرآنِ کریم کی جو صفات بیان کی گئی ہیں یہ کتاب ان سب کی مصداق ہے۔ اور اس کا نازل ہونا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات سے بے خبر نہیں۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ پہلی کتابیں ہدایت دینے کے قابل نہیں رہیں۔ زمانے کی ضروریات بہت کچھ بدل گئیں اور بہت سی

Marfat.com

نئی پیدا ہوگئیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسانوں کی جسمانی ضروریات کی فراہمی اپنے ذمہ لے رکھی ہے اسی طرح زندگی کی رہنمائی بھی اس نے محض اپنے فضل وکرم سے اپنی ذمہ داری ٹھہرا رکھی ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى اللہ کا وعدہ ہے اس نے جب انسانوں کو نئی ضرورت کے حوالے سے ہدایت کا محتاج پایا اور ان کے بڑھتے ہوئے بگاڑ کو دیکھا تو اس نے آنحضرت ﷺ پر اس کتاب کو نازل فرمایا۔ اور اب یہ کتاب ہر طرح کی ترمیم وتحریف سے پاک اور ہر طرح کی نارسائی سے مبرّا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۲﴾

(پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا، پس ان میں سے کوئی تو اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی ان میں سے بیچ کی راس ہے اور کوئی ان میں سے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے، یہی بہت بڑا فضل ہے۔ ۳۲)

کتاب اللہ کے منتخب وارث

ثُمَّ حرفِ عطف ہے اور ترتیب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حرف سے پہلے اور بعد کی دونوں چیزیں اصل وصف میں مشترک ہونے کے باوجود تقدیم وتاخیر رکھتی ہیں۔ اور یہ تقدیم وتاخیر زمانی بھی ہوسکتی ہے اور رتبہ ودرجہ کے اعتبار سے بھی۔ سوال یہ ہے کہ اس آیت میں ثُمَّ کس تقدیم وتاخیر کی طرف اشارہ کررہا ہے؟

اس سے پہلے ہم پڑھ چکے ہیں کہ تمام سابقہ آسمانی کتابوں کے محرّف اور مبدّل ہوجانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب نازل فرمائی، جس کے بارے میں فرمایا کہ یہ وہ حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اس میں غیر حق کی کوئی آمیزش نہیں۔ اس کا ہر حکم قطعی اور اس کی ہر پیش گوئی پتھر پر لکیر ہے۔ اسی سے قوموں کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ اس پر عمل کرنے والی قومیں سرفراز ہوں گی اور اس کو چھوڑ کر مسلمان دنیا میں ذلیل اور آخرت میں ناکام ہوں گے۔ اسی کتاب کا دیا ہوا نظامِ زندگی افراد اور اقوام اور اسلامی ریاستوں کا دستور العمل ہوگا۔ چنانچہ لوگوں تک اسے پہنچانے، اس پر عمل کرکے دکھانے اور اس کی بنیاد پر ایک ریاست کو وجود دینے اور پھر ریاست کے ہر شعبے کو اس نظام کا نمائندہ بنانے اور ریاست کے ہر ادارے میں اس کے احکام کو جاری وساری کرنے کی ذمہ داری آنحضرت ﷺ کے سپرد کی گئی۔ چنانچہ آپ نے ۲۳ سال کے عرصہ میں ان تمام ذمہ داریوں کو باحسن طریق پورا فرمایا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اعوان و انصار اور اپنے جانشینوں کی ایک مضبوط جماعت تیار فرمائی جنہیں اس کام کی تکمیل کی ذمہ داری سونپی اور دنیا سے جاتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کے جارہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری سنت ہے۔“ یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ دین جسے اس نے ادیانِ باطلہ پر غالب کرنے کی ذمہ داری آنحضرت ﷺ کے سپرد فرمائی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے وہی ذمہ داری اپنے بعد اس مضبوط جماعت کے سپرد فرمائی جس کے لیے جزیرۂ عرب کو بنیاد بنایا گیا تھا اور ہدایت کی گئی تھی کہ باقی نوعِ انسانی کو اس آبِ حیات سے جس سے تمہیں زندگی ملی ہے

Marfat.com

سیراب اور زندہ کرنا ہے۔ چنانچہ اسی بات کو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے کہ اصل ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب اور جاری وساری کرنے کی جو نبی کریم ﷺ پر عائد کی گئی تھی آپؐ نے اپنے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے اپنی امت کے یہ کہہ کر سپرد فرمائی:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

جن لوگوں کے یہ کام سپرد کیا گیا اللہ تعالیٰ نے ان کی حیثیت کو بیان فرماتے ہوئے اِصْطَفَیْنَا کا لفظ استعمال فرمایا جس کا معنی ہے کہ ہم نے چن لیا، ہم نے انتخاب کرلیا۔ یعنی دنیا میں قوموں اور امتوں کی کمی نہیں۔ اس سے پہلے بنی اسرائیل جس کام کے لیے چنے گئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہ نااہل ثابت ہوئے۔ ان کے علاوہ ایشیا کے مختلف ملکوں اور یورپ میں کسی کو بھی چنا جاسکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ عزت اور سعادت براہِ راست بنی اسماعیل اور اہلِ عرب کو عطا کی۔ کیونکہ بہت سی خصوصیات کے باعث وہی اس قابل تھے کہ اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں۔ ملوکیت کے زیرِ اثر مفلوج قومیں طبقات کے زخموں سے نڈھال بکھری ہوئی اولادِ آدم، شہری اور تمدنی زندگی میں اصلی سادگی کھودینے والی بیمار اکثریت اور فطری زندگی سے کوسوں دور نام نہاد تہذیب کے زخم خوردہ انسانی گروہ اس قابل نہ تھے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کے دین کی بالادستی کا بوجھ ڈالا جاتا۔ جزیرۂ عرب میں رہنے والے اپنے اندر ایسی خصوصیات رکھتے تھے کہ اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو وہ اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری کے لیے ان کو منتخب فرمایا۔ چونکہ اس عظیم کام کے لیے انتخاب اللہ تعالیٰ کے نبیوں کا ہوتا رہا ہے، اس امت کے انتخاب کے لیے بھی وہی لفظ استعمال کیا گیا جو ان کے انتخاب کے لیے کیا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ایک ایسی عزت سے نوازا جو انہیں انبیائے کرامؑ کے برابر تو نہیں لیکن ان کے قریب کرنے والی تھی۔

منتخب حاملین کے تین طبقات

جو امت بھی اس عظیم منصب پر فائز کی جائے گی فطری طور پر اس کے تین ہی طبقات ہوں گے۔ لیکن یہاں ان تین طبقات کے تعین کی ایک صورت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کی صورت میں جو جماعت اپنے پیچھے چھوڑی تھی اس میں یہ تینوں طرح کے لوگ تھے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تیار کردہ لوگ تو ایک ہی طرح کے تھے جنہیں سَابِقٌ بِالْخَیْرٰتِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن تابعین کے دور میں پہنچ کر ان کے معیار میں کمی آئی اور ان میں وہ طبقہ پیدا ہوگیا جنہیں یہاں مُقْتَصِدٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تبع تابعین کے زمانے میں پہنچ کر وہ تیسرا طبقہ پیدا ہوا جسے ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ کہا گیا ہے۔ اس ناچیز کے نزدیک یہ دوسرا امکان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر پہلی بات کو بھی قبول کرلیا جائے تو جب بھی اس کی سطح یقیناً اس سطح سے مختلف ہوگی جو ان الفاظ کے مصداق کے حوالے سے بعد میں ہمیں امت میں دکھائی دیتی ہے۔ جس طرح قرآنِ کریم انبیائے کرام کی لغزشوں کو بھی گناہ قرار دے دیتا ہے حالانکہ شریعت کی نظر میں وہ گناہ نہیں ہوتا کیونکہ بعض دفعہ ابرار کی نیکیاں بھی مقرب لوگوں کے گناہ شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کی سطح میں بے حد تفاوت پایا جاتا ہے۔ اسی طرح صحابہ میں جس کو ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ کہا گیا ہے اس کی سطح یقیناً وہ نہیں ہوگی جو امت کے عام گناہ گاروں کی ہے۔ لیکن ہم اپنی رائے پر اصرار کی بجائے امام ابنِ کثیر کی رائے کو ان الفاظ کی تفسیر میں پیش کررہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ظالم سے مراد وہ آدمی ہے جو بعض واجبات میں کوتاہی

Marfat.com

کرتا ہے۔ اور بعض محرمات کا بھی ارتکاب کرلیتا ہے اور مقتصد یعنی درمیانی چال چلنے والا وہ شخص ہے جو تمام واجبات شرعیہ کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات سے بچتا ہے۔ مگر بعض اوقات بعض مستحبات کو چھوڑ بھی دیتا ہے اور بعض مکروہات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور سَابِقٌ بِالْخَیْرٰتِ وہ شخص ہے جو تمام واجبات اور مستحبات کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات اور مکروہات سے بچتا ہے۔ اور بعض مباحات کو اشتغالِ عبادت یا شبہ حرمت کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔ جمہور مفسرین بھی اس بات میں امام ابنِ کثیر کے ہم خیال ہیں۔

لیکن ایک بات واضح رہے کہ یہ تینوں گروہ اعمال کے اعتبار سے تو ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ لیکن ان میں کوئی بھی دانستہ معصیت کرنے والا نہیں۔ اور اگر معصیت ہو جائے تو توبہ کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے دین کے فروغ اور نفاذ کی ذمہ داریوں کا تعلق ہے اس میں پہلے طبقے کے لوگوں میں ممکن ہے کوئی تساہل پایا جاتا ہو۔ لیکن لاپروائی یا بے نیازی ان میں سے کسی میں بھی نہیں پائی جاتی۔ درجات میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن دین سے وابستگی اور دین کے حوالے سے ذمہ داریوں کے احساس کے حوالے سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ اور یہی وہ دولت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فضلِ کبیر قرار دیا ہے۔ اور اسی کی قدر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پہلے گروہ کو بھی اسی طرح جنت کا استحقاق بخشے گا جیسے دوسرے دونوں گروہوں کو۔ البتہ جنت میں تینوں گروہوں کے درجات یقیناً ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ چنانچہ اس کی تائید نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جسے حضرت ابوالدرداء ؓ نے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد، ابنِ جریر، ابنِ ابی حاتم، طبرانی، بیہقی اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے۔ اس میں حضور ؐ فرماتے ہیں: **فاما الذین سبقوا فاولئک الذین یدخلون الجنۃ بغیر حساب ، واما الذین اقتصدوا فاولئک الذین یحاسبون حسابا یسیرا، واما الذین ظلموا انفسھم فاولئک یحبسون طول المحشر ثم ھم الذین تتلقا ھم اللہ برحمتہ فھم الذین یقولون الحمدللہ الذی اذھب عنا الحزن ۔** ''جو لوگ نیکیوں میں سبقت لے گئے ہیں وہ جنت میں کسی حساب کے بغیر داخل ہوں گے، اور جو بیچ کی راس رہے ہیں ان سے محاسبہ ہوگا مگر ہلکا محاسبہ، رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے تو وہ محشر کے طویل عرصے میں روک رکھے جائیں گے۔ پھر انہیں اللہ اپنی رحمت میں لے لے گا اور یہ لوگ ہیں جو کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیے۔''

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی پوری تفسیر بیان کر دی اور اہل ایمان کے تینوں طبقوں کا انجام الگ الگ بیان فرما دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے انہیں مطلق سزا نہیں ہو سکتی۔ قرآن اور حدیث میں متعدد ایسے جرائم ذکر کیے گئے ہیں جن کے مرتکب کو ایمان بھی جہنم میں جانے سے نہیں بچا سکتا۔ مثلاً مومن کا قتلِ عمد، قانونِ میراث کی پامالی، اور ایسے ہی بعض دیگر قواعد کا ارتکاب جیسے سود خوری، جہنم میں جانے کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن اس کی سزا بھگتنے کے بعد یقیناً وہ لوگ اپنے ایمان کی وجہ سے جنت میں جائیں گے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ ﴿۳۳﴾

(ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی کے پہنائے جائیں گے، اور اس جنت میں ان کا لباس ریشم ہوگا۔ ۳۳)

Marfat.com

ان منتخب لوگوں کا انجام

اللہ تعالیٰ کے دین کی سر بلندی اور فروغ کے راستے میں سب کچھ قربان کردینے والوں اور اسی کو زندگی کی سب سے بڑی ترجیح قرار دینے والوں سے آخرت میں جو سلوک کیا جائے گا اور وہ جن انعامات سے نوازے جائیں گے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان کی اقامت کے لیے ایسے باغات ہوں گے جن پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ جس کی سرسبزی اور شادابی اور مسرت وشادمانی کو کبھی فنا نہیں ہوگی۔ وہاں کی ہر چیز دوام آشنا ہوگی اور ان میں جب یہ لوگ داخل ہوں گے تو کبھی وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ ان باغات میں داخل ہونا محض وقتی سیر و تفریح کے لیے نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ وہاں انہیں لباس ریشم کا پہنایا جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ زیب و زینت اور آرام و راحت کے اعتبار سے سب سے بہتر لباس انہیں دیا جائے گا۔ چونکہ نزولِ قرآن کے وقت ریشم ہی سب سے قیمتی لباس تھا اس لیے تقریبِ فہم کے لیے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے جو موتیوں سے آراستہ ہوں گے۔ اصل حقیقت ان کی کیا ہوگی وہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن یہاں بتانا صرف یہ ہے کہ انہیں وہ نعمتیں عطا کی جائیں گی جو دنیا میں انسانوں کی سب سے بڑی متاع سمجھی جاتی ہیں اور انسان کبھی فرطِ مسرت میں ان کا خواب دیکھتا ہے۔ یہ سونا چاندی اور ریشم کا ذکر شاید اس لیے بھی کیا گیا ہے کہ پہلے زمانے میں بڑے بڑے شہنشاہ سونے کے کنگن اور موتی پہنا کرتے تھے۔ اور ان کا لباس ریشم کا ہوتا تھا۔ تو یہ گویا دنیا میں جسم کی آسودگی کی معراج تھی، اس لیے اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ﴿۳۴﴾ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾

(اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا، یقیناً ہمارا رب بخشنے والا اور قدر فرمانے والا ہے۔ ۳۴) جس نے ہمیں اپنے فضل سے اس اقامت کے گھر میں اتارا جس میں نہ ہمیں کوئی مشقت پیش آئے گی اور نہ اس میں ہمیں کوئی تکان لاحق ہوگی۔ ۳۵)

اہلِ جنت کا کلمۂ تشکر

جب یہ لوگ جنت کے باغوں میں داخل ہوں گے اور وہاں وہ ان نعمتوں سے بڑھ کر نعمتیں پائیں گے جن کا دنیا میں ان سے وعدہ کیا گیا تھا، تو بے اختیار ان کی زبان پر کلمۂ شکر اور اظہارِ تشکر کے الفاظ جاری ہو جائیں گے کہ تعریف ہے اس اللہ کی جس نے ہم سے ہر قسم کا غم اور اندیشہ دور کر دیا۔ اب نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا باقی رہا اور نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ہم اس سے پہلے دنیا کے جس فانی گھر میں مقیم تھے وہاں کا ہر لحہ اندیشوں سے گراں بار تھا۔ صحت تھی، تو بیماری اس کے تعاقب میں تھی۔ بیماری تھی، تو موت انتظار میں رہتی تھی۔ کوئی خوشی ایسی نہیں تھی جس کے مبدل بہ غم ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ کوئی کاروبار نہ تھا جس میں نقصان کا ڈر نہ ہو، کوئی تعلق نہ تھا جس میں بے وفائی کے کانٹے نہ بچھے ہوں۔ اور سب سے مستزاد آخرت میں ناکامی اور عذاب کا غم۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ایسے ہر غم سے ہمیں

Marfat.com

نجات دی۔ یقیناً ہمارا رب غفور و شکور ہے، اس نے ہماری کوتاہیوں سے بھی درگزر فرمایا اور ایک ایک نیکی کو شرفِ قبول بخشا۔ ہمارے پاس ایسے اعمال کہاں تھے کہ جو اس کی بارگاہ میں پیش کرنے کے قابل ہوتے۔ یہ محض اس کی عنایت ہے کہ اس نے ہمارے اعمال کو قبول فرمایا۔ اور ہمیں ایک ایسے گھر میں اتارا جسے کبھی زوال نہیں۔ ہم سرائے فانی سے نکلے اور ہمیں ابدی جنت عطا کردی گئی، جس میں ہمارے لیے نہ کوئی محنت و مشقت ہے اور نہ کوئی تکان اور افسردگی۔ دنیا میں کسی ایسی زندگی یا ایسی اقامت گاہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جس میں آدمی اکتاہٹ اور تکان محسوس نہ کرے۔ بے کاری سے بڑھ کر تھکا دینے والی چیز اور کیا ہے۔ اور بہتر سے بہتر خواہش بھی ایک دن جدت چاہتی ہے۔ حالات کی یکسانی تنوع اور تجدد کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم کے کیا کہنے کہ ہمیں ایسی جنت دی ہے کہ جس کی رہائش اور قیام میں ایسا عیش اور ایسی متنوع زندگی ہوگی جس میں کسی اکتاہٹ اور کسی پریشانی کا دخل نہیں ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿٣٦﴾ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿٣٧﴾

(اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ان کی قضا ہی آئے گی جو مر جائیں اور نہ ان کے لیے جہنم کے عذاب میں کمی کی جائے گی، اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو کفر کرنے والا ہے۔ ۳۶) اور وہ اس میں واویلا کریں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں یہاں سے نکال دے، اب ہم نیک عمل کریں گے، ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے، کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا، اور تمہارے پاس ایک ڈرانے والا بھی آیا، پس اب مزہ چکھو، اور ظالموں کا کوئی مدد کرنے والا نہیں۔ ۳۷)

کفار کا انجام

اصحابِ ایمان بالخصوص اللہ تعالیٰ کے دین کے حاملین کا قابلِ فخر انجام بیان کرنے کے بعد کفار کا انجام بیان کیا جارہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے راہِ راست اختیار کرنے کے تمام امکانات عطا فرمائے۔ غور و فکر اور صحیح فیصلہ کرنے کے اسباب فراہم کیے۔ بایں ہمہ انہوں نے حقیقت کا اتباع کرنے کی بجائے ہوائے نفس اور شیطان کا اتباع کیا۔ اور وہ حقائق جن پر دلائلِ آفاق اور دلائلِ انفس اور خود انسان کی فطرت گواہی دے رہی ہے انہیں تسلیم کرنے کی بجائے انکار کی روش اختیار کی۔ اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے صحیح سبق حاصل کرنے کی بجائے کفر اور ناشکری کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی پاداش میں جہنم کی آگ کی سزا دے گا۔ اور یہ سزا بھی چندروزہ نہیں بلکہ تا ابد ہوگی جس سے نہ نکلنے کی کوئی صورت ہوگی اور نہ عذاب کی شدت میں تخفیف کی جائے گی۔ عذاب سے نکلنے کی ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمادے، لیکن قرآنِ کریم میں اس کا صاف اعلان ہے کہ وہ کافر اور مشرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا، کیونکہ انہوں نے زندگی بھر اللہ

Marfat.com

تعالیٰ کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا۔ کبھی اس کو ماننے سے انکار کیا اور کبھی اس کی صفات میں دوسروں کو شریک کیا۔ یہ دونوں جرم ایسے ہیں جو نا قابلِ معافی ہیں۔ البتہ عذاب سے نکلنے کی ایک اور صورت جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ عذاب میں مبتلا شخص کو موت آجائے۔ لیکن جہنم میں گرفتار بدنصیب اس سے بھی محروم رہیں گے۔ وہ چیخ چیخ کر موت مانگیں گے لیکن انہیں موت نہیں دی جائے گی، ان کی کھالیں جل کر جھڑ جائیں گی تو انہیں نئی کھالیں پہنا دی جائیں گی۔ آگ کی جلن انتہائی ہولناک ہونے کے باوجود موت تو دور کی بات ہے بے ہوشی کا سبب بھی نہیں بن سکے گی۔ آدمی جب کسی انتہائی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ موت کی تمنا کرتا ہے جبکہ زندگی انسان کے لیے سب سے قیمتی انعام ہے۔ جو شخص اس سے جان چھڑانے کے درپے ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عذاب موت سے بھی بڑھ کر تکلیف دہ ہے۔ اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس عذاب کی شدت کیا ہوگی۔ ٹھیک کہا غالب نے:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

اللہ تعالیٰ کے عدل میں مساوات

آیت کے آخر میں فرمایا کہ یہ ہولناک سزا کافروں کے کسی مخصوص گروہ کے لیے نہیں، اور نہ صرف ان کا حصہ ہے جو تو میں عذاب کا شکار ہو چکی ہیں بلکہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کو ماننے سے انکار کرتا اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے وہ اسی سزا کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عدل سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا۔ قریش اس کو گزشتہ لوگوں کی کہانی یا کوئی قصہ پارینہ نہ سمجھیں بلکہ انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ اگر انہوں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو انہیں بھی ایسے ہی عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

جہنم میں کفار کی درخواست

دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار جہنم کے عذاب سے بے بس ہو کر چیخیں گے اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ ہم سے بہت بڑی خطا ہوئی، ہم دنیا میں صحیح فیصلہ نہ کر پائے۔ ہمیں ایک اور موقع عطا فرمایا جائے۔ دوبارہ دنیا میں بھیج کر مہلتِ عمل دی جائے۔ ہم اس نئی زندگی میں پہلی زندگی سے بالکل مختلف اعمال کریں گے۔ پہلے ہم نے ہوائے نفس کا اتباع کیا اور شیطان کے پیچھے چلے۔ اب ہم وہی زندگی اختیار کریں گے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول بلاتے رہے۔ ہم زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور رسول کی اطاعت میں گزاریں گے۔ ان کی اس فریاد کے جواب میں پروردگار جھڑک کر فرمائے گا کہ کیا ہم نے تمہیں اس سے پہلے ایسی طویل زندگی نہیں دی تھی جس میں اگر تم چاہتے تو صحیح زندگی گزار سکتے تھے۔ تمہیں اتنا طویل موقع سوچنے سمجھنے کے لیے دیا جس میں ایک صحیح فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ ایک خبردار کرنے والا رسول بھی بھیجا جس نے زندگی کا ہر دکھ اٹھا کر تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کیا اور قدم قدم پر تمہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ لیکن تم نے نہ مہلتِ عمر سے فائدہ اٹھایا اور نہ رسول کے انذار سے کوئی سبق سیکھا۔ ہم نے تمہیں مہلتِ عمل دے کر بندگی کا موقع بھی دیا اور رسول بھیج کر اتمام حجت بھی کیا۔ اس کے بعد تو کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ تم ہر امکان کو مسترد کر چکے ہو۔ اب اس کی سزا یہی ہے کہ تم اس عذاب کا مزہ چکھو۔

Marfat.com

اس آیت سے اشارتاً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ شعور یا پختگی کی عمر کو پہنچنے سے پہلے موت کا شکار ہو گئے ان کے ساتھ معاملہ یقیناً نرمی کا کیا جائے گا۔ لیکن جنھوں نے شعور کی عمر پائی جسے بلوغ کی عمر کہا جا سکتا ہے ان کے ساتھ معاملہ انصاف کے مطابق ہوگا۔ اور جس شخص نے طویل عمر گزاری اور اسے راہِ راست پر آنے کے لیے متعدد مواقع ملے اس کی باز پرس یقیناً دوسروں سے شدید تر ہوگی۔ اسی لیے احادیث میں بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی جو شخص فسق و فجور کا ارتکاب کرتا ہے اس کے لیے سخت وعید آئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

إِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ
خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ
كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا
خَسَارًا ﴿۳۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ
اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ
اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ
بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ۬
وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا
غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ
لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ
اِلَّا نُفُوْرَا ﴿۴۲﴾ اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ

Marfat.com

السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ
لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا
فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا
اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ
وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿٤٤﴾ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ
بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰي ظَهْرِهَا مِنْ دَاۗبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿٤٥﴾ ع

رکوع: ۵۔ (بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز کو جاننے والا ہے، بے شک وہ سینوں کے بھیدوں کو بھی جاننے والا ہے۔ ۳۸) وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، تو جو کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر پڑے گا اور کافروں کے لیے ان کا کفران کے رب کے نزدیک زیادہ نہیں کرتا، مگر اس کی ناراضگی میں، اور کافروں کے لیے ان کا کفران کے خسارے ہی میں اضافہ کرے گا۔ ۳۹) اے پیغمبر کہہ دیجیے، کیا تم نے دیکھا ہے اپنے ان شریکوں کو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ، انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے یا ان کی آسمانوں میں کوئی حصہ داری ہے یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی کسی واضح دلیل پر ہیں بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دے رہے ہیں۔ ۴۰) بے شک اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی انہیں تھامنے والا نہیں، بے شک وہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے۔ ۴۱) اور انہوں نے اللہ کی کڑی کڑی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی خبردار کرنے والا آیا تو وہ ہر امت سے زیادہ ہدایت اختیار کرنے والے بنیں گے، پس جب ان کے پاس خبردار کرنے والا آ گیا تو اس کی آمد سے ان میں کوئی اضافہ نہ ہوا، مگر بےزاری میں۔ ۴۲) زمین میں تکبر میں اور بری چال چلنے میں، حالانکہ بری چال اسی کو گھیرتی ہے جو بری چال چلتا ہے، پس یہ انتظار نہیں کر رہے مگر پچھلی قوموں کے ساتھ سنتِ الٰہی کا، پس سنتِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے، اور نہ تم سنتِ الٰہی کو ٹلتے ہوئے پاؤ گے۔ ۴۳) کیا انہوں نے زمین میں سفر نہیں کیا کہ وہ دیکھتے کہ کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ حالانکہ وہ قوت میں ان سے بہت زیادہ تھے اور آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کو عاجز

Marfat.com

کر سکے۔ بے شک وہ علم والا اور قدرت والا ہے۔ ۴۴) اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے کیے کرتوتوں پر فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا، مگر وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک کے لیے مہلت دے رہا ہے اور جب ان کا وقت آ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے۔ ۴۵)

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾

(بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز کو جاننے والا ہے، بے شک وہ سینوں کے بھیدوں کو بھی جاننے والا ہے۔ ۳۸)

ایک تنبیہ

قیامت کے دن کافروں کا جو انجام ہوگا اس کی تفصیل بیان کرنے کے بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے غیب کو بھی جاننے والا ہے یعنی یہ مت سمجھنا کہ تم سے قیامت سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اور تمہارے انجام کے بارے میں جو خبر دی گئی ہے وہ محض خیال آرائی ہے اور یہ گمان نہ کرنا کہ ایک ایسی بات جو انسان کے علم کی بساط سے باہر ہے اور جس کی نہ تردید کی جا سکتی ہے اور نہ تائید میں کچھ کہا جا سکتا ہے، یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ اس کے بارے میں جو کچھ قرآنِ کریم کہہ رہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ اسی خیال کو رد کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ غیب اور حضور اور ماضی و مستقبل یہ تقسیم انسانوں کے لیے ہے، اللہ تعالیٰ کا علم ان سب پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح لحہ موجود کو جانتا ہے اسی طرح غیب کا تمام علم اس کے سامنے ہے۔ تو جو کچھ تمہیں قیامت کے بارے میں بتایا گیا ہے اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ اپنے کفر اور طغیان کے باعث بات سننے کے روادار نہیں وہ قیامت کے دن چیخ چیخ کر مہلتِ عمل کی درخواست کریں گے لیکن ان کی درخواست کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے کماحقہٗ آگاہ ہے کہ مہلتِ عمل مانگنے والے مہلت مل جانے کے بعد بھی وہی کریں گے جو کچھ دنیا میں اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اس سے یہ بات مخفی نہیں کہ یہ لوگ محض جان چھڑانے کے لیے جھوٹ کو ذریعہ بنا رہے ہیں اس لیے وہ حقارت سے ان کی درخواست کو رد کر دے گا۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۭ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

(وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، تو جو کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر پڑے گا اور کافروں کے لیے ان کا کفران کے رب کے نزدیک زیادہ نہیں کرتا، مگر اس کی ناراضگی میں، اور کافروں کے لیے ان کا کفران کے خسارے ہی میں اضافہ کرے گا۔ ۳۹)

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا عدل بے لاگ ہے

اس آیت کے پہلے جملے میں ''خلائف'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو خلیفہ کی جمع ہے۔ اس کا معنی جانشین بھی ہو سکتا ہے اور اصطلاحی خلافت کا حامل بھی۔ اگر اس کا معنی جانشین کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ اے قریش اور دیگر اہلِ مکہ! تم اس سرزمین پر آباد ہونے والے پہلے لوگ نہیں ہو بلکہ اس سے پہلے دیگر قومیں یہاں آباد رہ چکی ہیں، لیکن آج ان کا نشان باقی نہیں ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کی پاداش میں دنیا سے مٹا دی گئیں اور تم ان کے جانشین کے طور پر یہاں آباد کیے گئے ہو۔ یہاں تمہارا اقتدار، تمہارا پہلا اقتدار نہیں اور نہ تمہارا پیدا کردہ ہے بلکہ تم سے پہلے بھی لوگ ایسے ہی کروفر اور ٹھاٹھ باٹ کے حامل رہ چکے ہیں۔ وہ اگر اپنے کفر و استکبار کے باعث ہلاکت کی نذر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل تو ایسا بے لاگ ہے کہ کسی سے امتیازی سلوک نہیں کرتا۔ یقیناً تم بھی اسی انجام سے ہمکنار کیے جاؤ گے جس انجام سے وہ دوچار ہوئے تھے۔

اور اگر اس کا ترجمہ اصطلاحی خلافت کا حامل کیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنا کر کچھ اختیارات سے نوازا تھا اور تمہارے سپرد یہ فرض کیا گیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی حاکمیت کو نافذ کرو گے۔ لیکن تم نے اپنے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تجاوز کیا اور اپنی اپنی جگہ خود مختار بن کر بیٹھ گئے۔ بجائے اللہ تعالیٰ کی بندگی کرانے کے تم نے غیر اللہ کی بندگی اختیار کی۔ اور یا اپنے نفس کے تابع ہو کر اللہ تعالیٰ سے بغاوت کر دی۔ یہ وہ کفر ہے جس کا نتیجہ پہلے کفر کرنے والے دیکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تم بھی اسی سے دوچار کیے جاؤ گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا انصاف بے لاگ ہے۔ وہ کسی قوم سے امتیازی سلوک نہیں کرتا۔ جب تم پہلی گزری ہوئی قوموں کے نقوشِ قدم پر چلو گے تو تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو ان کے ساتھ ہو چکا ہے۔ کیونکہ جو شخص بھی کفر کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو دعوت دیتا ہے اور جیسے جیسے وہ کفر میں بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ کفر کرنے والے کے لیے تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجیے، کیا تم نے دیکھا ہے اپنے ان شریکوں کو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ، انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے یا ان کی آسمانوں میں کوئی حصہ داری ہے یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی کسی واضح دلیل پر ہیں بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دے رہے ہیں۔ ۴۰)

Marfat.com

مشرکین کا معقولیت کے خلاف رویہ

اہلِ عرب اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے بلکہ ان کے کفر کی بنیاد دراصل شرک تھی۔مختلف قوتوں کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا تھا۔اور اللہ تعالیٰ کی بہت ساری صفات ان کی طرف منسوب کر رکھی تھیں۔اور مختلف قوتوں کو مختلف طاقتیں سونپ دینے کی وجہ سے ان کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جاتا تھا۔چنانچہ ان کے اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ تم نے جن قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا ہے وہ فرشتے ہوں یا جنات یا انسانوں میں نیک لوگوں کے بنائے ہوئے مجسمے اور بت، کیا ان میں سے کسی نے مخلوقات میں سے کسی کی تخلیق کی ہو؟ یا کسی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ رہا ہو؟ تو مجھے بتاؤ تا کہ میں بھی ان کی قدرتوں اور عظمتوں کا اندازہ کر سکوں۔اور اگر ایسا نہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ تم نے آخر انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کیسے شریک بنا رکھا ہے۔

مزید فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں کوئی شریک نہیں تو کیا ہم نے انہیں کوئی لکھا ہوا پروانہ جاری کیا ہے یا ان پر کوئی کتاب اتاری ہے جس میں ہم نے یہ تحریر کیا ہو کہ فلاں فلاں اشخاص کو ہم نے فلاں فلاں طاقتیں دے رکھی ہیں یا فلاں فلاں اختیارات ان کو تفویض کر دیے ہیں۔آئندہ جب بھی تمہیں کوئی حاجت لاحق ہو تو بجائے ہماری طرف رجوع کرنے کے ان کی طرف رجوع کرو۔دستِ دعا ہماری طرف پھیلانے کی بجائے ان کی طرف پھیلاؤ۔اب نذر و نیاز ان کے حضور چڑھائی جائے کیونکہ قسمتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا اختیار اب ہم نے ان کے حوالے کر دیا ہے۔اگر ایسی کوئی کتاب یا تحریر تمہارے پاس ہے تو ثبوت پیش کرو۔اور اگر ایسا نہیں تو پھر کس سند کی بنیاد پر تم نے انہیں ہمارا شریک بنا رکھا ہے!

آخر آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ان کے پاس نہ تو کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی کتاب، اور نہ کوئی سند۔تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے لوگ بس یونہی بے دلیل و بے سند ایک دوسرے کو سبز باغ دکھا رہے ہیں۔اور مختلف قوتوں کی طرف بغیر کسی دلیل کے اختیارات منسوب کر رہے ہیں۔اور ان کے اختیارات اور ان کی عبادات اور ان کی برکات کے افسانے محض فریب دینے کے لیے سنائے جاتے ہیں، سوچ لیجیے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ
اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿٤١﴾

(بے شک اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں
تو اللہ کے بعد کوئی انہیں تھامنے والا نہیں، بے شک وہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے۔ ۴۱)

گزشتہ مضمون کا تسلسل

مشرکین نے جن قوتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رکھا تھا ان کی بے حقیقتی اور بے بسی کو واضح کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ تمہاری قسمتیں تو کیا بنائیں گے اور تمہارے کام کیا سنواریں گے، ان کا حال تو یہ ہے کہ اگر زمین و آسمان کا کوئی حصہ یا سارے کے سارے اپنے محور و مدار سے نکل جائیں تو کوئی انہیں اللہ تعالیٰ کے سوا تھامنے والا نہیں۔آسمانوں کی سقفِ نیلگوں بے ستون کھڑی ہے۔اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس کا

Marfat.com

سہارا نہیں۔ بے شمار سیارے فضا میں محوِ پرواز ہیں، کوئی انہیں پَر پرواز دینے والا، ان کی جہتیں مقرر کرنے والا، ان کو مدار میں تھامنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا نہیں۔ یہ اپنے جن مزعومہ دیویوں اور دیوتاؤں کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں ہر مصیبت سے بچاتے ہیں، وہ ان کو تو کیا بچائیں گے وہ تو اپنے وجود کو سنبھالنے پر قادر نہیں۔ ہر ایک اپنی پیدائش اور اپنی بقاء کے لیے پروردگارِ عالم کا محتاج ہے۔ یہ تو اس کی بے پناہ قدرت ہے جس نے آسمان وزمین اور کائنات کے ہر گوشے کو تھام رکھا ہے، اگر وہ ذرا ان کی باگ ڈھیلی چھوڑ دے تو کوئی طاقت انہیں تھامنے والی نہیں۔ اور چشمِ زدن میں سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات کو بیان کر کے توجہ دلائی گئی ہے کہ لوگوں کی سرکشی اور استکبار کے باوجود اللہ تعالیٰ انہیں جو ڈھیل دیتا چلا جا رہا ہے تو وہ محض اس لیے ہے کہ وہ حلیم وغفور ہے۔ وہ پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔ وہ تا حدِ آخر ہر مخلوق کو مہلت دیتا جاتا ہے۔ وہ بردبار بھی ہے اور درگزر کرنے والا بھی۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ ﴿۴۲﴾ اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۭ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾

(اور انہوں نے اللہ کی کڑی کڑی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی خبردار کرنے والا آیا تو وہ ہر امت سے زیادہ ہدایت اختیار کرنے والے بنیں گے، پس جب ان کے پاس خبردار کرنے والا آ گیا تو اس کی آمد سے ان میں کوئی اضافہ نہ ہوا، مگر بے زاری میں۔ ۴۲) زمین میں تکبر میں اور بری چال چلنے میں، حالانکہ بری چال اسی کو گھیرتی ہے جو بری چال چلتا ہے، پس یہ انتظار نہیں کر رہے، مگر پچھلی قوموں کے ساتھ سنتِ الٰہی کا، پس سنتِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے، اور نہ تم سنتِ الٰہی کو ٹلتے ہوئے پاؤ گے۔ ۴۳)

قریش کا اپنی روایت سے انحراف اور اس کا سبب

قریش اور دیگر مخالفین جس طرح آنحضرت ﷺ کی مخالفت اور اذیت رسانی میں اندھے ہوتے جا رہے تھے اور ان تمام اقدار کو بھی پامال کرتے جا رہے تھے جو اہلِ مکہ میں عام طور پر مروج تھیں اور سخت مخالفت میں بھی جن کا عموماً لحاظ رکھا جاتا تھا۔ تو قرآنِ کریم نے انہیں ان کے رویے پر توجہ دلاتے ہوئے ان کی سرگزشت کا ایک ورق الٹ کر انہیں دکھایا ہے کہ بہت دور کی بات نہیں تم جب یہود کو دیکھتے تھے کہ وہ تمہارے بارے میں نہایت توہین آمیز رویہ رکھتے ہیں۔ اور تمہارے ساتھ ہر زیادتی کو وہ اپنے تئیں حلال کر چکے ہیں۔ تو تم آپس میں ہمیشہ بڑی بلند آہنگی سے یہ بات کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے اندر کوئی خبردار کرنے والا یعنی کوئی رسول مبعوث ہو گیا تو ہم ان یہود کی طرح بودے اور بے ہمت ثابت نہیں ہوں گے بلکہ ہم آگے بڑھ کر اس کے دامن سے اس طرح وابستہ ہو جائیں گے کہ دنیا دیکھے گی کہ ہم دوسری قوموں سے بڑھ کر ہدایت یافتہ ہیں۔ لیکن کس قدر شرم کی بات ہے کہ اہلِ عرب تو ہمیشہ قول کے پکے سمجھے جاتے

Marfat.com

تھے لیکن تم نے تو اپنی تاریخی روایات کو مٹی میں ملا دیا۔ اللہ تعالیٰ کا عظیم رسول نذیر بن کر تمہارے اندر آ گیا ہے لیکن بجائے اس کے کہ تم اپنے دعوؤں کے مطابق اس پر ایمان لاتے اور سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ثابت ہوتے۔ تم اس کے آنے کے بعد اس کا راستہ روکنے اور اس کے دین کو مٹانے کے درپے ہو گئے ہو۔ تمہارے اندر اس کے دین سے بےزاری اور اس کی دعوت سے گریز اس حد تک بڑھا کہ تم نے بری سے بری چال بھی اس کے خلاف چلنے سے گریز نہیں کیا۔ اور شب و روز تمہیں اس کے سوا کوئی کام نہ رہا کہ آنحضرت ﷺ، آپ کے صحابہ اور آپ کے دین کو مٹانے کے لیے جو تم سے بن پڑے اس سے دریغ نہ کیا جائے۔

دوسری آیت میں قریش نے اپنے دعوے کے خلاف جو رویہ آنحضرت ﷺ اور آپ کی دعوت کے متعلق اختیار کیا ہے اس کا حقیقی سبب بیان فرمایا گیا ہے کہ قریش اور دیگر مخالفین اتنے گئے گزرے نہیں کہ وہ آنحضرت ﷺ کے بلند سیرت و کردار کے اعتراف اور قرآنِ کریم کی معجزانہ شان کے سامنے سپر انداز ہونے کے باوجود آپ کی دعوت کی صداقت کو نہ جانچ سکیں۔ وہ دلوں ہی میں نہیں اپنی نجی مجلسوں میں بھی اقرار کرتے تھے کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ غلط نہیں۔ کیونکہ انہوں نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور پھر جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کی صداقت اور افادیت میں شبہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ ہمیں مکہ معظمہ اور عرب بھر میں بیت اللہ کے متولی ہونے اور قریشی ہونے کی حیثیت سے جو حقوق و مراعات حاصل ہیں اور جس حیثیتِ عرفی کے ہم مالک بن چکے ہیں اس دین کو قبول کر لینے سے یہ سب کچھ چھوڑنا لازم ہو جائے گا۔ ہم امت مسلمہ کے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے برابر تصور کیے جائیں گے۔ ہمارے حسب و نسب کی عظمتیں خاک میں مل جائیں گی صرف ہمارے کردار کی عظمت دیکھی جائے گی۔ ہمارے خاندانی حوالے ختم ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمات کا حوالہ معتبر سمجھا جائے گا۔ اور اسی سے ہماری حیثیت کا تعین ہو گا اور یہ چیز ہمارے لیے کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔ ہم اپنی وجاہت و عظمت اور سیادت و ریاست کو اپنے ہاتھوں کیسے آگ لگا دیں۔ یہ وہ استکبار تھا جس نے انہیں اسلام سے دور رکھا۔ اور اپنی اس نام نہاد حیثیتِ عرفی اور عظمت کو بچانے کے لیے انہوں نے صرف چالیں ہی نہیں چلیں بلکہ بدترین تدبیروں سے کام لیا۔ جس میں وہ عربی روایات کو بھی ملحوظِ خاطر نہ رکھ سکے۔ "مکر" چونکہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ سَیِّئ کے لفظ کا اضافہ کر کے "مکر" کی نوعیت کو واضح فرما دیا ہے۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دشمنی کی بھی کچھ حدود ہیں لیکن ان لوگوں نے اسلام کی دشمنی میں کسی حد کو ملحوظ نہیں رکھا۔ لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں کہ یہاں معاملہ افراد کی یا قبیلوں کی دشمنی کا نہیں بلکہ حق و باطل کی کشمکش کا ہے جسے انہوں نے دشمنی کا رنگ دے دیا ہے اور حق کے خلاف جب بھی کبھی کسی نے سازش کی ہے تو وہ خود ہمیشہ اس کا نشانہ بنا ہے۔ کیونکہ جیسے جیسے وہ دشمنی میں آگے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ حق سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بنے ہوئے جال میں کوئی دوسرا پھنسے یا نہ پھنسے، لیکن وہ اپنی ہلاکت کا سامان یقیناً کر لیتا ہے۔

لیکن بعض لوگوں نے قلتِ فکر کی بنیاد پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ دنیا میں بہت دفعہ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ بعض دفعہ بری تدبیر کرنے والے کی تدبیر چل جاتی ہے۔ اور جس کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے اس کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ تو قرآنِ کریم کا یہ کہنا کہ تدبیر ہمیشہ صاحب تدبیر پر الٹتی اور اس کو نشانہ بناتی ہے، یہ تو مشاہدے کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ عام دشمنیوں کے حوالے سے یہ بات کسی حد تک قابلِ لحاظ ہو سکتی ہے لیکن حق و باطل کی کشمکش میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ جو حق کے لیے نقصان اٹھاتے ہیں اور کبھی اس پر قربان ہو جاتے ہیں وہ بھی نقصان میں نہیں رہتے بلکہ کامیابی ان کے قدم چومتی ہے اور تاریخ انہیں ہمیشہ سلام کرتی ہے۔ اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بےگناہ کے خلاف تدبیر کرنے اور اس پر ظلم کرنے کا وبال ظالم پر اکثر دنیا میں بھی پڑ جاتا ہے۔ محمد بن کعب قرظی کا قول ہے کہ تین کام ایسے ہیں جن کا کرنے

Marfat.com

والا دنیا میں بھی وبال وعذاب سے نہیں بچتا۔ایک کسی بے گناہ کے حق میں بری تدبیر کر کے اسے ایذا پہنچانا، دوسرے عام ظلم، تیسرے عہد شکنی۔ (ابنِ کثیر) خصوصاً کسی ایسے شخص پر اگر ظلم کیا جائے جو بے کس اور بے بس ہو، انتقام پر قدرت نہ رکھتا ہو یا باوجود قدرتِ انتقام کے صبر کرے اس پر ظلم کے وبال سے دنیا میں بھی کسی کو بچتے نہیں دیکھا۔

قریش برے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ قریش اور دیگر اہلِ مکہ نے اپنی غیر شریفانہ مخالفت کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اب شاید وہ سنت الاولین کا انتظار کر رہے ہیں۔یعنی جس طرح پہلی عذاب کا شکار ہونے والی قومیں اللہ تعالیٰ کے خوف سے بے نیاز ہو کر اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کو نظر انداز کر کے اللہ تعالیٰ کے نبی کے قتل کے منصوبے باندھنے لگی تھیں اور ان پر ایمان لانے والے ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے تھے تو پھر اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آیا جو ہر ایسی امت کے بارے میں اپنا کام کرتا رہا ہے۔یہاں سنت الاولین سے مراد درحقیقت سنت اللہ فی الاولین ہے۔اور وہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ ایسی قومیں تباہ کر دی جاتی ہیں۔یہ لوگ بھی شاید یہی چاہتے ہیں کہ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں۔کاش انہیں اس بات کی خبر ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل بے لاگ ہے۔اس میں نہ کبھی تبدیلی آتی ہے اور نہ کبھی اس کے ظہور میں تاخیر ہوتی ہے۔ اگر انہوں نے اپنی روش نہ بدلی تو اے پیغمبر آپ پریشان نہ ہوں آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ سنت بروئے کار آئے گی۔اس نے جس طرح قومِ عاد اور قومِ ثمود کے ساتھ معاملہ کیا وہی معاملہ ان کے ساتھ بھی کیا جائے گا۔کیونکہ اس سنت کو بدلنے والا کوئی نہیں۔اسی طرح جب اس کے ظہور کا وقت آئے گا تو وہ لازماً ظہور میں آکر رہے گی۔کیونکہ اس کو ٹالنا کسی کے بس میں نہیں۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾

(کیا انہوں نے زمین میں سفر نہیں کیا کہ وہ دیکھتے کہ کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔حالانکہ وہ قوت میں ان سے بہت زیادہ تھے اور آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکے۔بے شک وہ علم والا اور قدرت والا ہے۔ ۴۴)

معذب قوموں کے آثار سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت

سابقہ آیتِ کریمہ میں چونکہ پہلی قوموں کا حوالہ دیا ہے اس لیے اسی بات کو مزید نمایاں کرنے کے لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ جو قومیں تکذیبِ رسل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئیں ان کی تباہ شدہ بستیاں ان راستوں میں ہیں جہاں سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے ہیں اور یہ ایک دفعہ نہیں متعدد دفعہ وہاں سے گزرے ہوں گے لیکن اس آیتِ کریمہ میں انہیں توجہ دلائی جا رہی ہے کہ وہ اس ارادے سے ان بستیوں پر سے گزریں کہ آخر یہ بستیاں تباہ کیوں کی گئیں۔وہ ان کی تباہی کے اسباب تلاش کریں، ان کی تاریخ میں غور و فکر کریں۔اور

Marfat.com

پھر یہ بھی دیکھیں کہ وہ قومیں حالات کی ستم رسیدہ نہ تھیں۔ وہ ہر لحاظ سے قریش کی نسبت نہایت طاقتور اور بہت زیادہ ترقی یافتہ تھیں۔ ان کی آبادیوں کا نظم ونسق ان سے کہیں بہتر تھا۔ وہ ان سے کہیں زیادہ خوشحال تھے۔ باایں ہمہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں آ پکڑا۔ وہ اپنی تمام تر قوت وشوکت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہ بچ سکے۔ نہ ان کی قوت کام آئی اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کو عذاب دینے سے عاجز کر سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے اور کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ اور ساتھ ہی وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ کوئی کام اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ جب اس کا علم بھی کامل ہے اور اس کی قدرت بھی بے پناہ ہے تو کوئی اس سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿٤٥﴾

(اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے کیے کرتوتوں پر فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا، مگر وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک کے لیے مہلت دے رہا ہے اور جب ان کا وقت آجائے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے۔ ۴۵)

ایک شبے کا ازالہ

عذاب کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی سنت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کو یہ اشتباہ ہونے لگتا ہے کہ قومیں اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے مقابلے میں بعض دفعہ حدود سے تجاوز بھی کر جاتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت پھر بھی جوش میں نہیں آتی۔ وہ انہیں برابر مہلت پر مہلت دیتا چلا جاتا ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ عذاب دینے پر قادر نہیں یا عذاب کا فلسفہ محض ایک مفروضہ ہے؟ چنانچہ اس اشتباہ کو دور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور اس کے قانون کی کارفرمائی کو ایک خاص پہلو سے نمایاں کیا گیا۔ اور وہ پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو کوئی روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور نہ کوئی بڑی سے بڑی طاقت اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکتی ہے۔ اس کے عذاب میں تاخیر کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہر چھوٹی بڑی غلطی پر پکڑنے لگتا تو کون ہے جو غلطیوں سے مبرا ہے اور جس سے کبھی نہ کبھی کسی گناہ کا صدور نہیں ہوتا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نظر نہ آتا۔ اس کے یہاں ہر چیز کے نتیجہ خیز ہونے کی ایک اجل مقرر ہے۔ پانی اس وقت تک نہیں ابلتا جب تک اس کو مطلوب حرارت نہیں پہنچتی۔ اور کلی اس وقت تک نہیں چٹکتی جب تک وہ چٹکنے کی عمر کو نہیں پہنچ جاتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی بداعمالیوں پر گرفت کے لیے ایک اجل مقرر کر رکھی ہے۔ جب تک وہ اجل آ نہیں جاتی اور وہ معین وقت ظاہر نہیں ہو جاتا اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی گرفت نہیں آتی اور اس کا عذاب زمین پر نہیں اترتا۔ یہ بھی اس کی رحمت کا ظہور ہے جس کا تعلق اس کے قانونِ عذاب سے ہے کہ وہ سزا سے پہلے مہلت پہ مہلت دیتا ہے تاکہ کوئی سنبھلنا چاہے تو سنبھل جائے۔ اور جو اپنی ضد ہی پر مرنا چاہتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جائے۔ چنانچہ جب وہ مدتِ مہلت پوری ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت تب بھی اپنا کام کرتی ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ یہ لوگ کس پاداش اور کس سزا کے مستحق ہیں۔ اور پھر اس کے مطابق انہیں سزا دی جاتی ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیاایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ یٰسٓ

(۳۶)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ یٰسٓ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام یٰسٓ ہے اور اسی لفظ سے سورۃ کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ سورۃ پانچ رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس کی آیات کی تعداد تراسی ہے۔ حضرت معقل بن یسارؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یٰسٓ قَلْبُ الْقُرْاٰنِ یعنی یہ سورۃ قرآن کا دل ہے۔ اسے قرآن کا دل کہنے سے شاید مراد یہ ہے کہ اس کا اندازِ بیان اس قدر زوردار اور دلائل اس قدر مؤثر ہیں کہ اسے پڑھنے اور سننے والے کا دل دھڑکنے لگتا اور روح میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے قرآن کا دل کہا گیا ہے۔ اسی حدیث میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اس سورۃ کو خالص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے لیے پڑھتا ہے اس کی مغفرت ہو جاتی اور مزید یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اپنے مرنے والوں پر سورۃ یٰسٓ پڑھا کرو تا کہ مرنے والے کے دل میں نہ صرف یہ کہ تمام اسلامی عقائد تازہ ہو جائیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ اس کے سامنے عالمِ آخرت کا پورا نقشہ بھی آ جائے۔ اس سے ممکن ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی توفیق ملے اور کلمہ اس کی زبان پر جاری ہو جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ یٰسٓ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی پڑھ کر سنایا جائے کیونکہ عربی الفاظ سے سننے والے کو برکت تو ملے گی لیکن مفہوم منتقل نہیں ہو سکے گا۔ اور ترجمے سے جب حقیقتِ حال کی وضاحت ہو گی تو اس کے لیے مزید افادے کا باعث ہو گا۔

زمانۂ نزول:۔ اندازِ بیان کو دیکھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ اس سورۃ کا زمانۂ نزول مکی زندگی کا دورِ متوسط ہے جس میں اذیت رسانی کا عمل زوروں پر تھا۔ مخالفین کو اس پر توجہ دلانے کے لیے زوردار انذار سے کام لیا گیا ہے۔

سورۃ کے مطالب کا تجزیہ

سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اثبات قرآنِ کریم جیسی پُرحکمت کتاب کی شہادت سے کیا گیا ہے۔ اور اس کی مزید عملی تائید اس نظامِ حیات سے کی گئی ہے جو صراطِ مستقیم پر کامیابی سے چلنے کی ضمانت ہے۔ اور اس طرح سے آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ قرآنِ کریم کی اصل حیثیت کو واضح کرتے ہوئے اسے خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے نازل کردہ کتاب کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کا نزول اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔ وہ لوگ بدقسمت ہیں جو محض استکبار کی وجہ سے آپ کو اور قرآنِ کریم کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ نہ اپنے ماضی سے سبق لیتے ہیں اور نہ مستقبل کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ آپ ایسے بے فکروں کے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں، جو نہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور نہ نصیحت کی بات سنیں۔ اور ایمان لانے والوں کو اجرِ عظیم کی بشارت دیجیے۔

Marfat.com

قریش کو عبرت دلانے کے لیے ایک بستی کی مثال دی گئی ہے کہ جس بستی کے رہنے والوں کے انذار کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو رسول بھیجے۔ جب بستی والوں نے ان کی بات سننے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید کے لیے ایک تیسرے رسول کو بھیجا۔ انہوں نے اس کی بھی پروانہیں کی، بلکہ ان کی آزمائش کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نشانیاں اتریں ان بدبختوں نے انہیں ان رسولوں کی نحوست قرار دیا۔ اور پھر سرکشی اور تمرد میں یہاں تک بڑھے کہ رسولوں کو سنگسار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ آخر اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں آ پکڑا۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر کائنات کے شواہد سے استدلال کیا گیا ہے۔ اور جا بجا اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، پروردگاری اور رحمت کی جو نشانیاں ہیں ان سے انسان پر جو شکر لازم آتا ہے اس کے لازمی تقاضے کو توحید کی تائید میں پیش کیا گیا ہے۔

مخالفین کو جب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اپنی قدرت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اسے عذاب لانے کے لیے کوئی تیاری نہیں کرنا پڑے گی بلکہ اس کے ایک اشارے سے ہر چیز تہ و بالا ہو جائے گی۔

اس کے بعد قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ایمان لانے والے جن نعمتوں سے نوازے جائیں گے ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور جھٹلانے والے جس صورتحال سے دوچار ہوں گے اس کی بھی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مخالفین کو ترغیب دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں ان سے فائدہ اٹھاؤ اور حق کو قبول کرو۔ اور پھر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر تم نے ان صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا تو اللہ تعالیٰ انہیں مسخ بھی کر سکتا ہے اور سلب بھی کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی بات مشکل نہیں۔

خاتمۂ سورۃ کی آیات میں سورۃ کے ابتدائی مضمون کو ایک نئے اسلوب سے بیان کیا گیا ہے اور مخالفین کی مخالفت اور ان کے ایمان نہ لانے پر آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ کا کام تبلیغ و دعوت ہے کسی کو زبردستی ایمان کی دولت دینا نہیں۔ جو لوگ اخلاقی طور پر مردہ ہو چکے ہیں آپ کی دعوت ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ آپ کا کام زندوں کو جگانا ہے مُردوں کو نہیں، اور نہ اس لحاظ سے آپ پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۸۳	سُوْرَةُ يٰسٓ مَكِّيَّةٌ (۳۶)	رُكُوْعَاتُهَا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰسٓ ۚ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳﴾ عَلٰى
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴﴾ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۵﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ
عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۷﴾ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ
اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿۸﴾ وَجَعَلْنَا مِنْ
بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ
فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۹﴾ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ
تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ
الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۱﴾ اِنَّا نَحْنُ
نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۗ وَكُلَّ شَيْءٍ
اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۲﴾

رکوع: ا۔ (یٰسٓ۔ ا) قسم ہے قرآنِ حکیم کی۔ ۲) کہ آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں۔ ۳) آپ سیدھے راستے پر ہیں۔ ۴) اس قرآن کو) نہایت اہتمام سے اتارا ہے زبردست رحم والے نے۔ ۵) تا کہ آپ خبردار کریں ایک ایسی قوم کو جن کے باپ دادا کو خبردار نہیں کیا گیا، پس وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ۶) البتہ

Marfat.com

ثابت ہو چکی ہے ان میں سے اکثر پر ہماری بات، سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۷) ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں پس ان کے سر اٹھے ہوئے ہیں۔ ۸) ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی اور ایک دیوار ان کے پیچھے، اس طرح ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے، پس ان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ ۹) اور ان کے لیے یکساں ہے آپ انہیں خبردار کریں یا نہ کریں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۱۰) آپ تو اس شخص کو خبردار کر سکتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے، سو ایسے لوگوں کو مغفرت اور باعزت صلہ کی بشارت دیجیے۔ ۱۱) بے شک ہم مردوں کو زندہ کریں گے، اور ہم لکھ رہے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے، اور ہم نے ہر چیز ایک واضح کتاب میں محفوظ کر لی ہے۔ ۱۲)

یٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ﴿۲﴾ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳﴾ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۴﴾

(یٰسٓ۔ ۱) قسم ہے قرآنِ حکیم کی۔ ۲) کہ آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں۔ ۳) آپ سیدھے راستے پر ہیں۔ ۴)

یٰسٓ، حروفِ مقطعات میں سے ہے۔ ان پر بحث ہم سورۃ بقرۃ کے آغاز میں کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کے معنی اور مفہوم کو جانتا ہے۔ امام مالک اسے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام قرار دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت اسی کی تائید میں ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں، اے انسان۔ اور مراد اس سے نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ بعض مفسرین نے اسے "یاسید" کا مخفف بھی قرار دیا ہے۔ اس تاویل کی رو سے ان الفاظ کے مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت پر قرآنِ حکیم سے استدلال

دوسری آیت میں قرآنِ حکیم کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں۔ ہم اس سے پہلے ایک سے زیادہ مرتبہ اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس لفظ پر واوِ قسمیہ داخل ہوتی ہے، اسے قسم کہتے ہیں اور اس کے بعد کا آنے والا جملہ جوابِ قسم یا دعویٰ کہلاتا ہے۔ اور یہ قسم اپنے جوابِ قسم یا دعویٰ کے لیے دلیل ہوتی ہے۔ یہاں قرآنِ کریم کو نبی کریم ﷺ کے رسول ہونے پر دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ صرف قرآن کو دلیل یا گواہ کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ قرآنِ حکیم کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے رسول ہونے پر ایک محکم دلیل یہ ہے کہ آپ اُمّی محض ہیں۔ آپ کا خاندان، آپ کی قوم اور آپ کا گردوپیش از اول تا آخر اُمّی ہے۔ یعنی نہ آپ نے کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم پائی اور نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ اور نہ آپ کی قوم میں تعلیم و تعلّم کا رواج رہا، اور نہ آپ کے ماحول میں سیکھنے سکھانے کا چلن رہا، جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا کہ آپ جو علم و دانش اور حکمت کی باتیں قرآنِ کریم کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے اور نظامِ زندگی پیش کر رہے ہیں اس کا ایک فلسفہ ہے، اس میں نظم وضبط ہے، اس میں انفرادی ضرورتوں کا حل بھی ہے اور اجتماعی ضرورتوں کا بھی۔ اس میں زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں مکمل ہدایات موجود ہیں۔ اور کوئی شعبہ دوسرے شعبے سے متصادم نہیں۔ اور پھر اس نظام میں آئین اور قانون بھی ہے، مکارمِ اخلاق بھی ہیں، معاشرت کے اصول بھی

Marfat.com

ہیں، معیشت کی بنیادیں بھی ہیں، سیاست کے آداب بھی ہیں، بین الاقوامی روابط بھی ہیں، عدالت کا باقاعدہ ایک ضابطہ ہے۔ غرضیکہ زندگی رواں دواں شکل میں کسی تصادم کے بغیر ہر ضرورت کو پورا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایسی حکیمانہ تعلیم کے لیے جس طرح کے الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے، جیسے اس کی ترکیب آرائی کی گئی ہے، اس میں جو فصاحت و بلاغت کارفرما دکھائی دیتی ہے اور پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے آپ صراطِ مستقیم پر ہیں۔ یہ اِنَّ کی دوسری خبر ہے اور اس کا بغیر حرفِ عطف کے آنا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآنِ کریم جس طرح آپ کے رسول ہونے کی دلیل ہے اسی طرح آپ کے صراطِ مستقیم پر ہونے کی بھی گواہی دے رہا ہے۔ کیونکہ اس راہ پر عقل و فطرت کا سایہ ہے۔ اس میں کہیں ایچ پیچ نہیں۔ اس کا ہر سنگِ میل واضح اور اس کی منزل متعین ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب جس کی حکمت و دانش اور جس کی فصاحت و بلاغت کا یہ عالم ہے اور وہ ایک اُمّی شخص کی زبان سے ادا ہو رہی ہے تو ایسے اُمّی شخص کو اگر اللہ تعالیٰ کا رسول تسلیم نہ کیا جائے تو اس سے بڑھ کر عقل اور فطرت کا کوڑھ اور کیا ہوگا۔ اور کج فکری اور کج روی کی اور دلیل کیا ہوگی۔

یہ بات یاد رہے کہ یہاں نہایت مؤکد انداز میں جس طرح آپ کے رسول ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کو خود اپنی رسالت سے متعلق کوئی شک تھا۔ بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مکی زندگی میں قدم قدم پر مخالفین آپ کی نبوت اور رسالت کو چیلنج کرتے تھے۔ اور بار بار آپ کو ان کے اعتراضات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایسی صورتحال میں لازمی بات تھی کہ سورۃ یٰسٓ جیسی اہم سورۃ کے نزول کے وقت جس میں نہایت پرزور انداز میں اسلام کے بنیادی عقائد کا ذکر کیا جا رہا ہے آپ کی رسالت کا اثبات کیا جاتا۔ اور وہ بھی خارجی دلائل سے نہیں بلکہ خود قرآنِ کریم سے، تاکہ بیک وقت ان دو بنیادی صداقتوں کو ثابت کرنے کا ذریعہ بن جاتا۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۵﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾

(اس قرآن کو) نہایت اہتمام سے اتارا ہے زبردست رحم والے نے۔ ۵) تاکہ آپ خبردار کریں ایک ایسی قوم کو جن کے باپ دادا کو خبردار نہیں کیا گیا، پس وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ۶)

قرآنِ کریم کی عظمت و اہمیت

گزشتہ آیتوں میں قرآن کو شاہد بنا کر اور جس کی قسم کھا کر یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں اور صراطِ مستقیم پر ہیں، پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی قرآنِ کریم اور اس کے نازل کرنے والے کی اہمیت و عظمت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ تَنْزِيْلَ کا لفظ یہاں منصوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں فعل محذوف ہے۔ اور پھر اس لفظ کا تعلق بابِ تفعیل سے ہے، جس کا معنی صرف اتارنا نہیں بلکہ نہایت اہتمام کے ساتھ درجہ بدرجہ اتارنا ہے۔ اور یہ ایسا اہتمام ہے جو کسی اور کتاب کے نزول میں ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس کو بوقتِ ضرورت موقع کی مناسبت سے اس طرح نازل فرمایا گیا کہ حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد آنحضرت ﷺ کے لیے تقویت کا باعث بھی بنتی رہی اور اس کے مفہوم و معنی کو متعین کرنے، مراد کو واضح کرنے، ابہامات کو کھولنے اور مجملات کو تفصیلات میں بدلنے کا کام بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا ہے۔ اور سوالات کا جواب بھی بروقت آپ پر نازل ہوتا رہا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا تاکہ ایمان لانے والوں کی ذہنی اور عملی تربیت ساتھ ساتھ ہوتی

Marfat.com

رہے اور جن لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دی جارہی ہے ان کے تحفظات کو بھی دور کیا جاتا رہے اور ان پر اتمام حجت بھی ہوتا رہے۔ اور مزید یہ کہ جس ذات نے اس قرآنِ عظیم کو اتارا ہے اس کی دو صفتوں کا حوالہ دے کر ایک عظیم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ان دو صفات میں سے پہلی صفت عزیز ہے۔ یعنی جس ذات نے اس قرآن کو اتارا ہے وہ غالب ہے، وہ بے پناہ قدرت کی مالک ہے، اس علم کی نارسائی کے ہر عیب سے پاک ہے، وہ اپنی مخلوقات کی کسی ضرورت سے بے خبر نہیں۔ اس نے نوعِ انسانی کی ضرورتوں کو جانتے ہوئے اس کتاب کو اتارا ہے۔ تو جو لوگ اس کی تکذیب کرنے کی جسارت کریں انہیں ذہن میں یہ بات رکھنی چاہیے کہ یہ کتاب کسی سائل کی درخواست نہیں کہ جس کے ساتھ جو سلوک بھی کیا جائے کوئی پوچھنے والا نہیں، بلکہ یہ ایک عزیز و مقتدر ذات کا فرمان واجب الاذعان ہے جسے بہر صورت غالب اور نافذ ہونا ہے۔ انکار کرنے والے ممکن ہیں یہاں بھی پکڑے جائیں، ورنہ قیامت کے دن تو ان کو کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج ان سرکشوں کو ڈھیل کیوں دی جارہی ہے اور ان پر عذاب کیوں نہیں نازل ہو رہا۔ اس کے لیے پروردگار کی دوسری صفت لائی گئی کہ وہ عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ رحیم بھی ہے۔ وہ جس طرح اس کتاب پر ایمان لانے والوں کے ساتھ رحمت کا سلوک کرتا ہے اور دنیا میں بھی ان کو سرفرازی دیتا ہے اور آخرت میں بھی بے پایاں رحمتوں سے نوازے گا۔ اسی طرح اس کی تکذیب کرنے والے بھی محض اس لیے آج تک بچے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بھی رحمت کا معاملہ کرتے ہوئے ڈھیل پہ ڈھیل دیتا چلا جارہا ہے تاکہ وہ اگر سنبھلنا چاہیں تو سنبھل جائیں ورنہ ان پر اتمام حجت ہو جائے۔ اور قیامت کے دن ان کے چھوٹنے کی کوئی صورت نہ رہے۔

نزولِ قرآن کا مقصد اور بنی اسماعیل کو تنبیہ

اگلی آیتِ کریمہ میں قرآن کے نازل ہونے کا اصل مقصد بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اس اہتمام کے ساتھ اس لیے اتارا ہے تاکہ آپ اس قوم کو اس کتاب کے ذریعے انذار کریں جن کی طرف آج تک کوئی خبردار کرنے والا اور کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ یعنی ان کے آبا و اجداد انذار نہیں کیے گئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سرزمین پر رہنے والوں کو اس تعلیم و ہدایت سے کبھی بہرہ ور نہیں کیا گیا جو آخرت میں سرخرو ہونے کے لیے ضروری ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے بعد براہِ راست ان کی طرف کوئی رسول نہیں آیا۔ جہاں تک ہدایت کا تعلق ہے عرب کے دوسرے علاقوں میں اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول آتے رہے اور ان کی تعلیم اور ہدایت کا اثر ان لوگوں تک بھی پہنچتا رہا۔ اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب تک کہیں ہدایت کے اثرات رہتے ہیں وہاں وہ نئے رسول اور نبی کو مبعوث نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر قرآنِ کریم کی گواہی کے مطابق کچھ صحیفے بھی نازل ہوئے۔ اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام پر بھی ممکن ہے کہ کچھ صحائف نازل ہوئے ہوں۔ لیکن اہلِ عرب نے ان صحیفوں کو باقی نہیں رکھا۔ البتہ ان دونوں پیغمبروں کی زبانی ہدایات کا کسی نہ کسی حد تک ان کے اندر چلن رہا۔ اور ان کی ہمسائیگی میں بنی اسرائیل میں جو رسول مبعوث ہوتے رہے ان کے اثرات بھی ان تک پہنچتے رہے۔ اسی طرح حضرت شعیب اور حضرت ہود علیہما السلام کی تعلیمات کا کچھ نہ کچھ حصہ ان تک پہنچا۔ اس لیے ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بالکل محروم تھے۔ البتہ یہ بات ضرور صحیح ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے بعد براہِ راست ان کی طرف کوئی رسول نہیں آیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں جس رسول کی بعثت کی دعا مانگی تھی اور جس امتِ مسلمہ کے اٹھا

Marfat.com

جانے کی ابتدا کی تھی اس کا ٹھیک وقت یقیناً وہی ہوسکتا تھا جب کہ دیگر انبیاء ورسل کی ہدایت اور تعلیمات کا اثر قریب الاختتام ہوتا۔ اور ملتِ ابراہیمی کے اثرات بھی آخری لمحوں کو چھونے لگتے۔ چنانچہ جیسے ہی یہ وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کی طرف انہیں میں سے اس آخری نبی اور رسول کو بھیجا جو قیامت تک کے لیے پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت کا سامان لے کر آیا۔ کیونکہ اب اگر اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تشریف نہ لاتے اور قرآنِ کریم نازل نہ ہوتا تو پھر اہلِ عرب کے غفلت سے نکلنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۷﴾

(البتہ ثابت ہو چکی ہے ان میں سے اکثر پر ہماری بات، سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۷)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے نتیجے میں اہلِ مکہ اور دیگر اہلِ عرب کی طرف براہ راست آپ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ جس پر قریش اور دیگر مخالفین کو شکرگزار ہونا چاہیے لیکن بعض عوارض کے باعث قریش کا جو کچھ حال ہو چکا ہے اس کے پیشِ نظر آپ کو یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ وہ سب لوگ آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی بات ثابت ہو چکی ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی زد میں آ چکے ہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ داعی الی اللہ کی ہر ممکن کوشش کے باوجود اس کی دعوت پر کان دھرنا بھی گوارا نہیں کرتے اور اتباعِ ہویٰ میں اس حد تک ڈوب جاتے ہیں کہ نہ اپنی عقل سے کام لیتے ہیں اور نہ پیغمبر کی ہدایت کو دیکھنا گوارا کرتے ہیں، رفتہ رفتہ ان سے قبولیتِ حق کی استعداد چھین لی جاتی ہے اور وہ ہدایت سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ آپ کو ایسے لوگوں کے لیے کبھی فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿۸﴾

(ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں پس ان کے سر اٹھے ہوئے ہیں۔ ۸)

مخالفین کے ایمان نہ لانے کا سبب

سابقہ آیت میں جن لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اس آیتِ کریمہ میں اس کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب ان کا استکبار اور ان کی ہٹ دھرمی ہے۔ یہ ہٹ دھرمی ان کے گلے کا طوق بن گئی ہے، جس طرح طوق اگر گردن سے ٹھوڑی تک لٹک رہا ہو تو وہ گردن کو اوپر اٹھنے نہیں دیتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان مشاہدے اور غور و فکر سے محروم ہو جاتا ہے۔ اب وہ اگر صحیح بات تک پہنچنا بھی چاہے تو اس کی استعداد جواب دے جاتی ہے اور مزید یہ کہ ان کے سر اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں۔ مقمح دراصل اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا سر پیچھے کو کھینچ کر اس طرح باندھ دیا جائے کہ وہ نہ دائیں بائیں دیکھ سکے اور نہ نیچے ہو سکے۔ یہ درحقیقت ان کے استکبار کی تصویر ہے۔ ان کا تکبر اور خود پسندی ان کے سروں کو نیچے نہیں ہونے دیتی۔ اس طرح سے وہ قبولیتِ حق کی استعداد سے محروم ہونے کی وجہ سے قبولیتِ ایمان کی دولت سے محروم ہو گئے ہیں۔

Marfat.com

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ⑨

(ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کردی اور ایک دیوار ان کے پیچھے، اس طرح ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے، پس ان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ ۹)

گزشتہ مضمون کی مزید وضاحت

یہ گزشتہ مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ جن لوگوں کی ہٹ دھرمی اور استکبار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی محرومی کا فیصلہ کردیا ہے اور اس کی صورت یہ ہوئی ہے کہ وہ زمین وآسمان کی نشانیاں دیکھنے سے محروم کردیے گئے ہیں۔ اب اگر کوئی روشن سے روشن حقیقت بھی ان کے سامنے آجائے تو وہ اپنی بے بصیرتی اور صلاحیتوں کے کھوجانے کے باعث اس قابل نہیں رہے کہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ایسے لوگ بعض دفعہ کسی بڑے حادثے سے متنبہ ہو کر کبھی حالات سے سبق سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ ہٹ دھرمی اور استکبار کی روش ترک نہیں کرتے انہیں حالات سے بھی سبق سیکھنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ان کی محرومی کو فیصلہ کن بنانے کے لیے ان کے آگے اور پیچھے دیواریں کھڑی کردیتے ہیں تاکہ نہ وہ اپنے ماضی سے سبق سیکھ سکیں اور نہ مستقبل کے اندیشے انہیں راہِ راست پر لاسکیں۔ ان کے وقتی مفادات اور ان کے تعصبات اس طرح ان کے گرد احاطہ کیے رہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی ہے۔ بڑے سے بڑے حادثے میں بھی جب تک ان کے اپنے مفادات پر چوٹ نہ پڑے وہ کبھی سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے۔ قومی روایات اور عزم وہمت کے تقاضے ان کے سامنے دم توڑتے رہیں، انہیں ذات کے گنبد سے باہر جھانکنے کی کبھی ہمت نہیں ہوتی۔ کتابی علم تو ان کے لیے پہلے ہی بیکار ہو چکا ہوتا ہے، اب اپنے تاریخی صفحات کو بھی اس طرح گم کردیتے ہیں کہ جو حوادث دیواروں پر لکھے جاچکے ہیں انہیں ان کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ تشنہ نے ایسی ہی صورتحال کے حوالے سے کہا تھا:

کتابوں کا لکھا تو عمر بھر پڑھتے رہے تشنہ
کبھی وہ بھی پڑھا ہوتا جو دیواروں پہ لکھا ہے

ہم عالمِ اسلام بالخصوص پاکستان کے رہنے والے ایسے ہی عذاب کی گرفت میں معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں مشرقی پاکستان کے حادثے نے بری طرح جھنجھوڑا بلکہ ادھ موا کردیا، لیکن کسی دردمند نے بالکل صحیح کہا:

حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

اب ہمیں اپنا مقدر دیواروں پہ لکھا ہوا نظر آتا ہے لیکن جن کے ہاتھوں میں زمامِ کار ہے ان کے سامنے ایسے دیواریں چنی جاچکی ہیں اور وہ اپنی ذات کے گنبد میں ایسے اسیر ہو چکے ہیں کہ نہ وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں نہ انہیں مستقبل کے اندیشے نظر آتے ہیں۔ والی اللہ المشتکیٰ وھو المستعان۔

Marfat.com

وَسَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰﴾

(اوران کے لیے یکساں ہے آپ انہیں خبردار کریں یا نہ کریں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ۱۰)

گزشتہ دو آیتوں میں جن ہٹ دھرم اور متکبرین کی تصویر کشی کی گئی ہے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ آپ ان لوگوں کو انذار کریں یا نہ کریں انہیں جونک لگنے والی نہیں، یہ کبھی آپ کی بات سن کر نہیں دیں گے۔ ہٹ دھرمی اور استکبار نے ان کی عقلوں اور اخلاق کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، اس لیے اب ایمان قبول کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ البتہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ تبلیغ و دعوت کا کام ترک کر دیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں لوگوں کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جن کے اندر حقیقت کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ انہیں تلاش کرنا اور ان تک حق کی دعوت پہنچانا یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ آپ تبلیغ و دعوت کے کام کو جاری رکھیں۔ جس طرح اچھی زمین اپنے اندر کے پھول پتے پیدا کر کے اور اپنے اندر بارش کو جذب کر کے اپنے وجود کا احساس دلا دیتی ہے، اسی طرح تبلیغ و دعوت کی بارانِ رحمت سے ایسے لوگوں کا وجود آپ سے آپ ظاہر ہو کے رہتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قبولیتِ حق سے محروم لوگ ایسے لوگوں تک جلدی دعوت کو پہنچنے نہیں دیتے۔ اس لیے داعی الی اللہ کو چاہیے کہ جیسے جیسے دعوت کے امکانات مشکل ہوتے جائیں ویسے ویسے وہ اپنے کام میں تیزی پیدا کرتا جائے۔

حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی
نوا را تیز تر می کن چوں اثرِ نغمہ کمیابی

اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكۡرَ وَخَشِىَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَيۡبِ‌ۚ فَبَشِّرۡهُ بِمَغۡفِرَةٍ وَّاَجۡرٍ كَرِيۡمٍ‏ ﴿۱۱﴾

(آپ تو اس شخص کو خبردار کر سکتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرے، سو ایسے لوگوں کو مغفرت اور باعزت صلہ کی بشارت دیجیے۔ ۱۱)

اِنذار کے مؤثر ہونے کی شرائط

جن لوگوں نے خواہشاتِ نفس کے اتباع اور خانہ ساز قسم کے نظریات اور تعصبات کو زندگی کا سرمایہ بنا رکھا ہے اور وہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے لیے تیار نہیں آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ آپ ایسے لوگوں کے دلوں میں حق نہیں اتار سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سماعِ قبول اور قبولیتِ حق سے محروم کر دیا ہے۔ ان کے ساتھ سر مارنا دیواروں سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔ آپ کی دعوت و تبلیغ اور آپ کا انذار صرف اس شخص کے لیے مؤثر اور مفید ہو سکتا ہے جو ذکر کی پیروی کرتا ہے۔ ذکر سے مراد نصیحت بھی ہے اور یاددہانی بھی اور ذکر قرآنِ کریم کے ذاتی اسماء میں سے ایک نام بھی ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جو شخص قرآنِ کریم کو سنتا ہے اور آپ کی نصیحت پر کان دھرتا ہے اور آپ کی یاددہانی پر دلوں کے دروازے وا کرتا ہے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیتوں کو اتباعِ حق کا ذریعہ بناتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ وہ خدائے رحمٰن سے ڈرتا ہے۔ اس کی خشیت سے اس کا دل دھڑکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا خالق و مالک ہے۔ اور یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے میرے لیے بے شمار نعمتوں کا ایک خوان بچھا رکھا ہے اور اس کی رحمت ہمیشہ میرے شاملِ حال رہتی ہے۔ وہ میری آنکھوں سے غائب ضرور ہے لیکن میں اس کی رحمتوں سے کبھی دور نہیں ہوتا۔ اس کی ناراضگی کا اندیشہ اور اس کے عتاب کا خدشہ یہ میری زندگی کا اصل سرمایہ ہے۔ یہ وہ

Marfat.com

شخص ہے جس کے لیے آپ کا انذار مؤثر اور مفید ہو سکتا ہے۔ ایسے شخص کو آپ مغفرت کی خوشخبری سنا دیجیے۔ اور یہ بشارت بھی دیجیے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اجرِ کریم سے نوازے گا۔ یوں تو اس کا اجر ہی انسانی اندازوں سے ماورا ہے لیکن جسے وہ خود کریم قرار دے اس کے بارے میں تو انسانی عقل و خرد کے پیمانے کچھ بھی اندازہ کرنے سے قاصر ہیں۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۲﴾

(بے شک ہم مردوں کو زندہ کریں گے، اور ہم لکھ رہے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے، اور ہم نے ہر چیز ایک واضح کتاب میں محفوظ کر لی ہے۔ ۱۲)

آخرت کی یاددہانی

حق و باطل کی یہ کشمکش یونہی بے نتیجہ جاری نہیں رہے گی بلکہ وہ دن بہت دور نہیں جب اس کشمکش کے مختلف کرداروں کو ان کے اعمال کے مطابق جزا و سزا سے گزرنا ہوگا۔ ایک دن ایسا آئے گا جب ہر چیز تباہ کر دی جائے گی۔ ہر زندہ چیز موت سے ہمکنار ہو جائے گی۔ پھر ایک وقت آئے گا جب زندگی کی کارفرمائی ہوگی۔ مُردوں کو از سرِ نو زندہ کیا جائے گا۔ اور یہ اس لیے ہوگا کہ خدائے رحمٰن کی رحمت کا یہ لازمی تقاضا ہے۔ کیونکہ اس کائنات کا خالق و مالک اگر رحیم و کریم ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی رضا کے حصول میں لوگ جان وتن سے گزر جائیں، مال و دولت قربان کر ڈالیں، بچوں کو اس راستے میں نثار کر دیں۔ اور ان میں سے کسی کو نہ صلہ ملے اور نہ کسی انعام سے نوازا جائے۔ اور اسی طرح جو لوگ شب و روز اللہ تعالیٰ کی معصیت کا ارتکاب کرتے رہیں، اس کی ذات کو بھی چیلنج کریں اور اس کی صفات کو بھی پامال کریں اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہ ہو اور ان کے اعمالِ کفر اور اعمالِ شرک پر کوئی سزا نہ دی جائے۔ یہ بات اس رحیم و کریم ذات کی صفات سے سراسر متصادم ہے کہ اس کے نزدیک نیکی اور بدی، اپنے اور پرائے اور اطاعت و معصیت برابر ہو کر رہ جائے۔ اس رحمانیت کا یقیناً یہ لازمی تقاضا ہے کہ آخرت برپا ہو اور اچھے اور برے اپنے انجام کو پہنچیں۔ اور پھر یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہاں کسی شخص کو معصیت اور گناہ کے اثبات کے بغیر سزا نہ دی جائے اور کسی کارنامے کے ثبوت کے بغیر انعام سے نہ نوازا جائے۔ چنانچہ یہ بات از بس ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ جب مردوں کو زندہ کرے تو جو کچھ لوگوں نے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اعمال آگے بھیجے ہیں انہیں محفوظ حالت میں سامنے لایا جائے اور جو اعمال انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں اور جن کے آثار تادیر زندہ رہے ہیں اور جنہوں نے حالات اور انسانی فکر پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور جس نے کہیں انسانی تربیت کا کام کیا ہے اور کہیں انسانی بگاڑ کو آگے بڑھایا ہے یہ سب کچھ محفوظ حالت میں نامۂ عمل کی صورت میں ان کرنے والوں کے ہاتھوں میں دیا جائے گا۔ اور کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے گا کہ مجھے جن اعمال کے بدلے میں سزا دی گئی ہے میرے سامنے ان کا ثبوت ظاہر نہیں کیا گیا۔ اور جن باتوں پر مجھے نوازا گیا ہے میرے نامۂ عمل میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ اور پھر اسی پر بس نہیں کہ ان تمام اعمال ناموں میں اعمال کو محفوظ کیا جائے گا بلکہ ان کی تائید میں یہ ساری تفصیلات ایک واضح دفتر میں بھی درج کی گئی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے بڑا دفتر اور اعمال نامہ ہے۔ اس کی ایک ایک چیز شمار کر لی گئی ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور اسی کے مطابق انسانوں کو جزا اور سزا سے گزارا جائے گا۔

Marfat.com

اس آیت کے آخر میں ''امام مبین'' کا لفظ آیا ہے۔ امام کے اصلی معنی رہنما، ہادی، لیڈر اور مرجع کے ہیں۔ پھر اس کا استعمال اس کتاب کے لیے ہونے لگا جو سب کے لیے رہنما اور مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس آیت میں یہ لفظ اس مرکزی کتاب، رجسٹر اور اعمال نامے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جس میں ہر شخص کے اعمال درج ہوں گے اور جس کے مطابق ہر شخص جزا یا سزا پائے گا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ
الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ
فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا
مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ
اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾
وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ
تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا
طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾
وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾
وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ
دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ
شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ
بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ

Marfat.com

يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَمَآ
اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا
مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾
يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ
اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

رکوع: ۲۔ (اورانہیں بستی والوں کی مثال سنایئے جبکہ اس بستی میں رسول آئے۔ ۱۳) جبکہ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا، پھر ہم نے تیسرے سے ان کو تقویت دی تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں۔ ۱۴) بستی والوں نے کہا کہ تم کچھ نہیں ہو، مگر ہم جیسے انسان، اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے، تم محض جھوٹ بولتے ہو۔ ۱۵) رسولوں نے کہا کہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمہاری طرف رسول بنا کے بھیجے گئے ہیں۔ ۱۶) اور ہماری ذمہ داری بس واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے۔ ۱۷) بستی والوں نے کہا ہم تو تمہیں منحوس سمجھتے ہیں، اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے، اور تمہیں ہمارے ہاتھوں بڑی دردناک سزا پہنچے گی۔ ۱۸) رسولوں نے جواب دیا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے، کیا یہ باتیں تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی ہے بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۱۹) اور شہر کے آخری کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیروی کرو۔ ۲۰) پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے اور وہ ٹھیک راستے پر ہیں۔ ۲۱) اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ہستی کی جس نے مجھ کو پیدا کیا ہے، اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۲۲) کیا میں اس کے علاوہ دوسروں کو معبود بناؤں، اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں۔ ۲۳) بے شک میں اس وقت ایک صریح گمراہی میں ہوں گا۔ ۲۴) بے شک میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں، پس تم میری بات سنو۔ ۲۵) اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا، اس نے کہا: کاش! میری قوم کو معلوم ہوتا۔ ۲۶) کہ میرے رب نے کس چیز کی وجہ سے مجھے بخش دیا اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا۔ ۲۷) اور اس کے

Marfat.com

بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا، اور نہ ہم اتارنے ہی والے تھے۔ ۲۸) بس ایک ڈانٹ تھی اور یکایک وہ سب بجھ کر رہ گئے۔ ۲۹) افسوس ہے بندوں کے حال پر جو رسول بھی ان کے پاس آیا اس کا وہ مذاق ہی اڑاتے رہے۔ ۳۰) کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کیا، بے شک وہ ان کے پاس کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ۳۱) بے شک وہ ہمارے ہی حضور میں حاضر کیے جائیں گے۔ ۳۲)

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۚ ﴿۱۳﴾

(اور انہیں بستی والوں کی مثال سنایئے، جبکہ اس بستی میں رسول آئے۔ ۱۳)

اس سے پہلے کے رکوع میں سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی رسالت کو حتمی انداز میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ قرآنِ کریم جیسی مُسکتِ دلیل اس کے لیے پیش کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی کی بعثت کے بعد سب سے اہم نکتہ جس پر اللہ تعالیٰ کے رسول اور مخالفین کے درمیان بحث ہوتی اور مخالفت کا طوفان اٹھتا ہے وہ رسالت ہی کا نکتہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رسول لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو رسول کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن مخالفین ہر ممکن طریقے سے اس کا رد کرتے ہیں۔ اور جب دلائل سے کام نہیں چلتا تو پھر وہ طاقت استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور پیغمبر کی شخصیت اور اس کے دعوے کی حقانیت کو سامنے رکھتے ہوئے جو اعتراضات ان کے ذہن میں آتے ہیں انہیں بار بار اچھالتے ہیں تا کہ عوام کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی رسالت پر یکسو نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی رسالت پر بھی مختلف وقتوں میں مختلف دلائل دیے گئے اور گزشتہ رکوع میں بھی مختلف حوالوں سے اس کا اثبات فرمایا گیا۔ پیشِ نظر رکوع میں تاریخی دلائل سے آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اثبات فرمایا گیا ہے اور قریشِ مکہ آپ کی نبوت اور رسالت پر جس قسم کے اعتراضات کیا کرتے تھے تاریخ کی روشنی میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ تم نے اگر اپنا رویہ نہ بدلا اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح نہ کی تو تمہارا انجام ان لوگوں سے مختلف نہیں ہوگا جن کا ذکر پیشِ نظر رکوع میں کیا گیا ہے۔

قریش کی عبرت کے لیے اہلِ قریہ کی مثال اور قریہ کا تعین

اس رکوع میں ایک قریہ والوں کا قصہ سنایا گیا ہے۔ قریہ جس طرح ایک بستی یا گاؤں پر بولا جاتا ہے اسی طرح اس کا اطلاق ایک شہر پر بھی ہوتا ہے۔ یہاں جس قریہ کا ذکر ہے ممکن ہے وہ کوئی بڑا شہر رہ چکا ہو۔ لیکن قرآنِ کریم نے اس کا نام نہیں لیا۔ اور حدیث میں بھی اس کی وضاحت نہیں فرمائی گئی۔ اس وجہ سے مفسرین میں اس قریہ کے تعین میں اختلاف ہوا ہے۔ مفسرین کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ اس سے مراد شام کا مشہور شہر انطاکیہ ہے۔ اور یہاں جن رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے ہوئے سفیر تھے جنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انطاکیہ والوں کے انذار کے لیے بھیجا تھا۔ لیکن مفسرین کی یہ رائے بوجوہ صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ اور علامہ ابنِ کثیر نے بھی ایسی ہی وجوہ کے باعث اس رائے پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا اور تنقید فرمائی ہے۔ ہمارے نزدیک اس رائے کے محلِ نظر ہونے کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

Marfat.com

۱۔ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے دو خاندان انطاکیہ پر حکمران رہے۔ ایک سلوقی خاندان، جس کے دورِ حکومت میں تیرہ بادشاہ اینتیوکس کے نام سے گزرے ہیں۔ یعنی جس طرح مصر کا ہر حکمران فرعون اور حبشہ کا ہر حکمران نجاشی کہلاتا تھا، اسی طرح سلوقی خاندان کا ہر حکمران اینتیوکس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس خاندان کی حکومت پینسٹھ قبل مسیح میں ختم ہوگئی۔ اس کے بعد رومیوں کی حکومت آئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے وقت رومی ہی اس علاقے کے حکمران تھے۔ اور انطاکیہ بھی ان کی حکومت میں شامل تھا۔ سلوقیوں کی حکومت میں تو ایسے کسی واقعہ کا پیش آنا اس لیے غلط ہے کہ ان رسولوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سفیر کہا گیا ہے۔ بنابریں ظاہر ہے کہ ان کا وجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کئی سال پہلے کسی طرح عقل کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ اور رومیوں کی تاریخ ایسے کسی واقعہ کو پیش نہیں کرتی جس میں انطاکیہ پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ہو۔

۲۔ انطاکیہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا نزول اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہوا ہوتا تو یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ انجیلوں اور بائبل ہسٹری میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ لیکن نہ تو انجیلوں میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ بائبل ہسٹری میں، بلکہ اس کے برعکس بائبل کی کتاب اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ صلیب کے چند سال بعد عیسائی مبلغین پہلی مرتبہ وہاں پہنچے تھے۔ اور بائبل کے بیان کے مطابق وہاں کثرت سے غیر اسرائیلیوں نے دینِ مسیحی کو قبول کیا اور مسیحی کلیسا کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

۳۔ یہ جو بات کہی گئی ہے کہ یہاں رسولوں سے مراد اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قاصد اور سفیر ہیں۔ یہ بات بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی، اس لیے کہ ان آیات میں رسولوں نے جس حیثیت سے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اور پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے دو رسولوں کی تکذیب کے بعد تیسرا رسول ان کے تقویت کے لیے بھیجا اور لوگوں کی تکذیب کے بعد ان رسولوں کا یہ کہنا کہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ یہ باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سفیر۔ اور مزید یہ کہ لوگوں کا اس بنیاد پر انہیں نبی ماننے سے انکار کرنا کہ تم ہمارے جیسے بشر ہو اور بشر رسول نہیں ہوسکتا۔ اس اعتراض میں اس لحاظ سے تو وزن ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رسول کہتے ہوں کیونکہ ہمیشہ منکرینِ رسالت نے بشریت اور رسالت میں تضاد محسوس کیا ہے۔ لیکن کسی عظیم شخصیت کے سفیروں پر تو کبھی ایسا اعتراض نہیں کیا گیا کیونکہ سفیر ہمیشہ انسان اور بشر ہی ہوتے ہیں کسی دوسری مخلوق میں سے ہونے کا کوئی سوال نہیں۔

۴۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی نبوت اور دعوت کو بنی اسرائیل ہی کے لیے مخصوص کیا تھا۔ اس لیے نہ تو انہوں نے کبھی خود کسی غیر اسرائیلی کو دعوت دی اور نہ اپنے شاگردوں کو اس کی اجازت دی۔ بلکہ ان کا ارشاد یہ تھا کہ میں صرف اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کی تلاش کے لیے آیا ہوں۔ اور یہ بھی ان کا ارشاد ہے کہ میرے پاس جو روٹی ہے وہ صرف بچوں ہی کے لیے ہے، کتوں کے آگے اس کو ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔ بچوں سے مراد ان کی اسرائیلی تھے اور کتوں سے مراد غیر اسرائیلی۔ ان حقائق کی بنیاد پر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو انطاکیہ میں بھیجا ہو۔ کیونکہ انطاکیہ میں رہنے والے اسرائیلی نہیں تھے۔

۵۔ اسی رکوع سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بستی میں یہ رسول تشریف لائے تھے اس بستی والوں کی تکذیب کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور وہ بالکل پامال کر کے رکھ دیے گئے۔ قرآنِ کریم میں عذاب کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی جس سنت کو ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم

Marfat.com

ہوتا ہے کہ ایسا عذاب تکذیب رسل کے نتیجے میں آتا ہے کسی اللہ تعالیٰ کے رسول کے بھیجے ہوئے مبلغین کی دعوت قبول نہ کرنے کے نتیجے میں نہیں آتا۔ کیونکہ مبلغین کی دعوت سے وہ اتمامِ حجت نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ کے رسول کی تکذیب سے ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ بستی انطاکیہ نہیں اور ان کی ہدایت کے لیے جانے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ سفیر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے، تو پھر آخر وہ بستی کون سی تھی؟ قرآن اور حدیث میں کسی مستند ذریعے سے ہمیں اس کا جواب نہیں ملتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس بستی کا نام مبہم رکھا ہے۔ اور سلف صالحین کا کہنا یہ ہے کہ جس بات کو قرآن وسنت میں مبہم رکھا گیا ہو اسے مبہم رکھنے میں ہی عافیت ہے۔ اور ویسے بھی قرآنِ کریم میں جس غرض کے لیے یہ قصہ بیان کیا گیا ہے اسے سمجھنے کے لیے بستی کا نام اور رسولوں کے نام معلوم ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس قصے کے بیان کرنے کی غرض قریش کے لوگوں کو یہ تنبیہ کرنا ہے کہ تم بالکل اسی روش پر چل رہے ہو جس روش پر وہ بستی والے چلے تھے۔ اور جس روش نے ان بستی والوں کو برے انجام سے دوچار کیا تم بھی اس سے بچ نہیں سکو گے۔

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

(جبکہ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا، پھر ہم نے تیسرے سے ان کو تقویت دی تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں۔ ۱۴)

تین رسولوں سے مراد؟

انبیائے کرام کی تاریخ سے کسی قوم کی ہدایت کے لیے ایک سے زیادہ نبیوں کی بعثت غیر معمولی واقعہ ہے۔ جس کی معروف مثال حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ہیں۔ لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں پہلے دو رسولوں کا کسی بستی میں جانا اور پھر تیسرے رسول کا ان کی تقویت اور تائید کے لیے بھیجا جانا اس سے بھی زیادہ توجہ طلب معاملہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون جیسے خطرناک اور طاقتور دشمن کی طبیعت کی بے اعتدالی اور ظالمانہ خُو کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے تائید و نصرت کے لیے اپنے بھائی کو مانگ کر لیا تھا، تاکہ کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آنے کی صورت میں باہمی مشاورت کر سکیں اور حالات کا سامنا کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ بلاشبہ ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اور روح القدس ان کی تائید کے لیے موجود رہتے ہیں۔ بایں ہمہ انسانی فطرت بھی اپنے کوئی تقاضے رکھتی ہے۔ ایسی ہی صورتحال اس بستی کی بھی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف محولہ بالا دو رسول بھیجے گئے تھے۔ جب ان بستی والوں نے ان کی دعوت قبول کرنے کی بجائے خطرناک اقدام کرنے کا فیصلہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حجت کے لیے تیسرے رسول کو بھی بھیج دیا، تاکہ تینوں ایک دوسرے کے لیے تقویت کا باعث ہوں اور بستی والے بھی ان کی ہیبت محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ لیکن جب اہلِ قریہ نے تینوں رسولوں کی تکذیب کر دی تو انہوں نے تنبیہ کرتے ہوئے ان لوگوں سے کہا کہ ہماری تکذیب کرنے میں جلدی نہ کرو، اس بات پر غور کر لو کہ ہم خود سے تمہارے پاس نہیں آئے، ہم خالقِ کائنات کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ ہماری تکذیب کے نتائج پر تمہاری نظر رہنی چاہیے۔ اور یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ تمہارا ظالمانہ سلوک اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دے سکتا ہے اور کوئی بڑی بات نہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو جاؤ۔ کیونکہ جب بھی قوموں کی طرف عذاب آیا ہے تو اس کا بنیادی سبب رسولوں کی تکذیب ہی رہا ہے۔

Marfat.com

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ۝ ١٥

(بستی والوں نے کہا کہ تم کچھ نہیں ہو، مگر ہم جیسے انسان، اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے، تم محض جھوٹ بولتے ہو۔ ۱۵)

اہلِ قریہ کا اعتراض

ان رسولوں کے دعویٰ رسالت کی تردید میں اہلِ قریہ نے وہی بات کہی جو اس سے پہلے ہر رسول کے مخالفین کہتے رہے ہیں، وہ یہ کہ رسالت ایک عظیم منصب ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہدایت حاصل کر کے بندوں تک پہنچائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نازک اور عظیم کام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ انسان نہ تو اپنے پروردگار کو دیکھ سکتا ہے، نہ اس سے باتیں کر سکتا ہے اور نہ اس کی بات کو سن سکتا ہے۔ تو پھر ایک انسان نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اس میں براہِ راست اللہ تعالیٰ سے متعلق ہونا پڑتا ہے۔ اسی تصور کے پیشِ نظر ہر دور کے انسانوں نے بشریت اور رسالت میں تضاد محسوس کیا ہے کہ جو رسول ہے وہ بشر نہیں ہو سکتا اور بشر رسول نہیں ہو سکتا۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۹۴ میں ارشاد ہے: وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ''لوگوں کو ایمان لانے سے صرف اس بات نے روکا جب ان کے پاس ہدایت آئی کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا ہے۔'' قرآنِ کریم کہتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کیونکہ انسان ہی انسان کی ہدایت کا باعث بن سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجا جاتا تو وہ نظر ہی نہ آتا۔ اور اگر وہ انسانی شکل میں آتا تو پھر یہی اعتراض پیدا ہوتا۔ اور دوسری یہ بات کہ فرشتہ انسانی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ اس کی ضروریات انسانوں جیسی ہیں اور نہ اس کی احتیاجات، نہ اس کی کمزوریاں انسانوں کی کمزوریاں ہیں کہ وہ انسانوں کو صبر اور استقامت کی مثال بن کر دکھا سکے۔ اور نہ وہ اپنے اندر خواہشات رکھتا ہے کہ خواہشات پر قابو پا کر زہد، استقلال اور صبر کی عملی تصویر پیش کر سکے۔ اور نہ وہ انسانی کیفیت کا حامل ہے کہ انسان کو خشوع خضوع اور خشیتِ الٰہی کی تعلیم دے سکے۔ تو پھر اسے نبوت اور رسالت دینے کا کیا فائدہ ہوگا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انسانوں نے ہمیشہ نبوت و رسالت کے لیے انسانوں کو نااہل قرار دیا اور ان کی نبوت اور رسالت کو ہمیشہ موردِ الزام ٹھہرایا۔ جبکہ قرآنِ کریم صراحت کے ساتھ یہ بات کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی رسول ہو سکتا ہے۔ سورۃ انبیاء میں ارشاد فرمایا گیا: وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ''ہم نے تم سے پہلے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے جن پر ہم وحی کرتے تھے، اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو، اور ہم نے ان کو ایسے جسم نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ جینے والے تھے۔''

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں نے ہمیشہ انسان کی پہچان میں ٹھوکر کھائی ہے۔ انسان جب عقیدے کی عظمت سے محروم ہوتا ہے اور کردار کی پاکیزگی سے تہی دامن ہو جاتا ہے تو وہ بگڑے ہوئے انسانوں کو جو دولت و ثروت اور حکومت و اقتدار کے ایوانوں میں دادِ عیش دیتے ہیں کو حقیقی انسان سمجھ بیٹھتا ہے۔ اس کی نگاہ انسان کے رنگ و روپ، اس کے لباس، اس کے مساکن، اس کی سواریوں، اس کی زمینوں، اس کی

Marfat.com

دولت اور اس کے مناصب پر رہتی ہے اور انہی چیزوں کے حوالے سے وہ چھوٹے بڑے انسانوں میں تمیز کرتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ سیرت و کردار کے افلاس کے ساتھ ساتھ انسانی صفات بھی کسمپرسی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہر دو ٹانگوں پر چلنے والا انسان کہلاتا ہے چاہے وہ اپنی صفات کے اعتبار سے حیوانات سے بھی گیا گزرا ہو۔ اور عہدہ و منصب پر فائز یا دولت و ثروت کا مالک انسانیت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو جاتا ہے چاہے اس کے اندر درندگی بھری ہوئی ہو۔ اس کوتاہ نظری، کورچشمی اور بے بصیرتی نے انسان کی حقیقی پہچان کے سامنے پردے حائل کر دیے ہیں۔ اور انسان اپنی حقیقی عظمت کی پہچان میں ناکام ہو گیا ہے۔ اس کی ذات کو بھی یقیناً اس سے نقصان پہنچا لیکن بڑا نقصان یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول جو انسانیت کا نمونہ بلکہ فخر ہوتے ہیں خطرناک حد تک ان کی معرفت انسانوں کے لیے مشکل ہو گئی۔ حالانکہ یہ انسان اور بشر ہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات اور کائنات کا گلِ سرسبد بنایا ہے۔ اور اس کے سر پر نبوت اور خلافت کا تاج رکھا۔ اور اسے وہ عظمت عطا کی جس کے بارے میں ذوق کہتا ہے:

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی اپنی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

حاصل کلام یہ کہ آپ لوگ چونکہ ہماری طرح انسان ہیں اور انسان نبی یا رسول نہیں ہو سکتا۔ تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں۔ اور انسانوں کے لیے ہدایت چونکہ رسولوں پر ہی اترتی ہے تو آپ رسول نہ ہونے کی وجہ سے اس دعوے میں قطعاً غلط ہیں کہ آپ پر اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز اتاری ہے۔ اولاً تو انسان ہونے کی وجہ سے آپ کا دعویٰ رسالت ہی سراسر جھوٹ پر مبنی ہے اور اس پر مزید جھوٹ یہ ہے کہ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی وحی اترتی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ یہ جھوٹ پر جھوٹ ہے۔ تو ایسے لوگوں پر ہم ایمان کیسے لے آئیں۔ بعض اہلِ علم نے وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ کو سیاقِ کلام کا حصہ بنانے کی بجائے ایک مستقل بات قرار دے کر اسے مخالفین کی جہالت اور عقل کا جھوٹا پندار قرار دیا ہے یعنی وہ لوگ اس پندار میں مبتلا تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ انسانی ہدایت کے لیے انسانی دانش کافی ہے۔ جوہرِ عقل کا فانوس اسی لیے عطا فرمایا گیا ہے تاکہ لوگ اپنی زندگی کے معاملات اسی کے ذریعے حل کریں۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی وحی بھیجنے کی ضرورت نہیں، بلکہ انسان اپنی معنوی ضرورتوں کے لیے خود کفیل بنایا گیا ہے جبکہ عقلِ سلیم رکھنے والا یہ بات جانتا ہے کہ انسانی عقل کا دائرۂ کار محسوسات اور معقولات تک ہے۔ لیکن جن چیزوں کا تعلق مابعد الطبعیات سے ہے اور جن احساسات کا تعلق عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت سے ہے اور وہ بنیادی تصورات جو تخلیقِ آدم سے لے کر آج تک مذہب نے انسان کو عطا کیے ہیں اور جس سے انسان کی مذہبی اور روحانی تربیت ہوتی ہے یہ تمام چیزیں انسانی عقل کے دائرۂ کار سے باہر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان باتوں کا نہ کوئی حل بتاتی ہے اور نہ ان سے متعلق کسی سوال کا جواب دیتی ہے۔ آج کا عقلیت پسند انسان بھی اسی غلطی کا شکار ہو کر وحی اور رسالت کے انکار میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اور یہی جہالت ان لوگوں میں بھی پائی جاتی تھی جو محولہ بالا رسولوں کی رسالت سے انکار کر رہے تھے۔ یہ بات یقیناً اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو بالکل صحیح ہے لیکن سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے آیت کے اس ٹکڑے کا یہ مفہوم لینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْکُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۷﴾

(رسولوں نے کہا کہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمہاری طرف رسول بنا کے بھیجے گئے ہیں۔ ۱۶) اور ہماری ذمہ داری بس واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے۔ ۱۷)

Marfat.com

اعتراض کا جواب اور تنبیہ

رَبُّنَا یَعْلَمُ کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اسے قسم قرار دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ رسولوں نے قسم کھا کر یہ بات فرمائی کہ دوسروں کو اعتبار دلانے کے لیے چونکہ آخری ذریعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائی جائے۔ تو ہم بھی قسم کھا کر یہ بات کہتے ہیں کہ ہم تمہاری ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ اتنی بڑی بات کے بعد تو تمہیں ہماری بات کا اعتبار کرنا چاہیے اور ہم پر ایمان لانا چاہیے۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ تم ہمارے بارے میں جو چاہو خیال کرو اور بے شک ہماری طرف جھوٹ کی نسبت کرو، ہم تمہیں روک تو نہیں سکتے۔ لیکن یہ بات یاد رکھو کہ اصل حاضری تو اللہ تعالیٰ کے حضور ہوگی، وہاں ہر آدمی سے اس کے ایک ایک قول اور عمل کا حساب لیا جائے گا۔ ہم اس احساس کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمہاری طرف رسول بن کر آئے ہیں۔ اور اس کی گواہی سے بڑھ کر کسی کی گواہی نہیں ہو سکتی اور اس کے علم سے ہٹ کر کسی اور چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ رہی یہ بات کہ تم اگر ہماری رسالت کو تسلیم نہیں کرو گے تو ہمارا شاید کوئی نقصان ہو جائے گا اور ہم شاید دنیوی برتری کے لیے کسی جتھابندی میں مبتلا ہیں اور تمہارے انکار سے ہماری گروہ بندی کو نقصان پہنچے گا۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارا کام کسی کے دل میں ایمان اتار دینا نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ نے ہم پر جو فرض عائد کیا ہے اس کو ادا کرتے ہوئے لوگوں تک اپنی دعوت پہنچانا ہے، سو ہم نے وہ ذمہ داری ادا کر دی ہے۔ قیامت کے دن ہم سے تمہارے ایمان کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ البتہ تمہیں اس بات کا جواب دینا ہوگا کہ تم نے ہماری رسالت کی تکذیب کیوں کی، اور تمہیں اس کی پاداش میں عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾

(بستی والوں نے کہا: ہم تو تمہیں منحوس سمجھتے ہیں، اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے، اور تمہیں ہمارے ہاتھوں بڑی دردناک سزا پہنچے گی۔ ۱۸)

تَطَیُّرَ کا مفہوم اور اس الزام کا سبب

تَطَیُّرَ اور اِطَّیُّرَ کا معنی ہوتا ہے فال بد لینا اور کسی کو منحوس سمجھنا۔ جب بھی کسی قوم کی طرف اللہ تعالیٰ کے کوئی نبی یا رسول تشریف لائے ہیں تو قوم نے حتی الامکان نبی کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ ہر ممکن طریقے سے انہیں ناکام کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ اور جب دیکھا کہ ہماری مخالفت سے دعوت کا یہ سلسلہ رکتا نظر نہیں آتا تو پھر انہوں نے اذیت رسانی کے عمل کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ جب اس سے بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو پھر اللہ تعالیٰ کے نبی کو قتل کرنے کے منصوبے باندھنے لگے۔ قوموں کا یہ ایک ایسا رویہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے ہر نبی کو سابقہ پیش آیا ہے۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں پروردگار لوگوں کو مخالفت سے روکنے اور دین کی طرف مائل کرنے کے لیے بعض دفعہ مختلف آزمائشوں سے دوچار کرتا ہے تاکہ وہ مصیبت میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہونے لگیں۔ اور انہیں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر ہم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو ہو سکتا ہے کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو جائے۔ لیکن جب قوموں کی قسمت بگڑ جاتی ہے تو وہ بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے ان آفات و مسائل کو آزمائش سمجھنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی نحوست سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ آنے والے رسول چونکہ بتوں، دیویوں، دیوتاؤں اور

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کی جانے والی مختلف قوتوں کی مذمت کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی پوجا پاٹ سے روکتے ہیں اس لیے ہمارے وہ معبود اور دیوتا ان سے ناراض ہو کر ہمیں آفات میں مبتلا کر رہے ہیں۔ تو اس لحاظ سے ہمارے معبودوں کی ناراضگی چونکہ ان کی وجہ سے ہوتی ہے اس لیے جب تک ہم انہیں ختم نہیں کریں گے یا یہاں سے نکلنے پر مجبور نہیں کر دیں گے اس وقت تک ہم ان مسائل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ یہ ہے وہ سبب جس کی وجہ سے ان کی مخالفت کم ہونے کی بجائے اور تیز ہونے لگتی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو دھمکیاں دینے لگتے ہیں کہ اگر تم لوگ اس بدعقیدگی کی اشاعت سے باز نہ آئے تو ہم اپنے دیوتاؤں کی حرمت کی حفاظت کے لیے تم کو سنگسار کر دیں گے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے تمام معذب قوموں کی تاریخ کے حوالے سے ایک ایک قوم کا نام لے کر اس گمراہی کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ ہم صرف ایک حوالے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ "اور ہم نے قومِ فرعون کو قحط اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں، تو جب ان کے حالات اچھے ہوتے کہتے کہ یہ تو، ہمارا حق ہی ہے اور اگر ان کو کوئی آفت پہنچتی تو اس کو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔"

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ⑲

(رسولوں نے جواب دیا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے، کیا یہ باتیں تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی ہے بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۱۹)

طَآئِرُ کا مفہوم

طَــآئِرُ فالِ بد کے معنی میں آتا ہے، لیکن یہاں اس سے مراد فالِ بد کا نتیجہ یعنی نحوست ہے۔ کبھی اسے نوشتۂ تقدیر کے معنی میں بھی بول دیتے ہیں۔

رسولوں نے جواب دیا کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اسے تم دوسروں کی نحوست بتانے کی بجائے اپنے اندر تلاش کیوں نہیں کرتے۔ کیونکہ ہر انسان اپنے اعمال کے نتیجے اور اپنی قسمت کے احوال سے گزرتا ہے۔ تمہاری بدبختی کے اسباب خود تمہارے اندر موجود ہیں۔ تم اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں سے محظوظ ہوتے ہو۔ لیکن اس کے احسانات کا شکر ادا کرنے کی بجائے اس کے احسانات کا اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہو۔ نعمتیں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں اور اسی کی تخلیق کے نتیجے میں تم دنیا میں آئے ہو لیکن تم ان کا انتساب بجائے اپنے خالق و مالک کی طرف کرنے کے ان قوتوں کی طرف کرتے ہو جن کا ان احسانات سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہاری نحوست درحقیقت تمہارے ان ہی عقائدِ بد اور اعمالِ سیئہ کا نتیجہ ہے۔ تم بجائے اس کے کہ اس حقیقت کو سمجھو الٹا ان لوگوں کو مطعون کرتے ہو جو تمہیں اس صورتحال سے نجات دینے کے لیے آئے ہیں۔ تم بجائے اپنے گریبانوں میں منہ ڈالنے کے اپنے محسنوں کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔ اور بجائے اپنی گمراہیوں کے سمجھنے کے دوسروں پر اپنی ذمہ داری ڈال رہے ہو۔ اکبر الٰہ آبادی نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کیسی خوبصورت بات کہی ہے:

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

Marfat.com

آیت کے آخر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو اپنی شامتِ اعمال کا ذمہ دار اس لیے گردانتے ہو کہ انہوں نے تمہیں آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اب تمہارے احوال پر تنقید کرتے ہوئے تمہارے اصل امراض کی نشان دہی کی۔ بجائے اس کے کہ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھو تم اسے توڑنے کے درپے ہو گئے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ تمہاری اس روش اور طرزِ عمل نے نہ صرف تمہاری فطرت کو بگاڑا اور اعمال کو تباہ کیا ہے بلکہ تمہاری فکری سلامتی کو بھی خطرناک حد تک متاثر کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن حدود کو ملحوظ رکھ کر انسانیت کی پرورش کی جاتی ہے تم انہیں حدود کو بار بار پامال کر رہے ہو اور تمہیں اس کا بالکل شعور نہیں۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾
اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

(اور شہر کے آخری کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیروی کرو۔ ۲۰
پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے اور وہ ٹھیک راستے پر ہیں۔ ۲۱)

ایک مخلص کی حمیتِ حق اور قوم کو دعوت

محولہ بالا رسولوں کی دعوت اور مخالفین کی مخالفت کوئی ایک دن کی بات نہیں یقیناً عرصہ دراز تک یہ سلسلہ چلا ہوگا۔ اور اس کشمکش میں مختلف نشیب و فراز آئے ہوں گے۔ تینوں رسولوں نے کبھی ایک ساتھ اور کبھی الگ الگ شہر کے مختلف مراکز کو اپنی تبلیغ و دعوت کا ہدف بنایا ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر بھر میں اس کشمکش کی بات پھیل گئی۔ کچھ اس کے ہمدرد پیدا ہوئے اور کچھ لوگوں نے مخالفین کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ بات یہاں تک پہنچی کہ مخالفین نے اللہ تعالیٰ کے ان رسولوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب یہ ہولناک خبر شہر کے مضافات میں پہنچی تو چونکہ شہر کے مختلف گوشوں میں دعوت کے ہمدرد بھی پیدا ہو چکے تھے انہیں میں سے ایک مخلص شخص جوان رسولوں کی دعوت پر ایمان لا چکا تھا لیکن ابھی تک شہر کے کسی دور دراز گوشے میں اس مخالفت کا ہدف بنے بغیر خاموشی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت، اور بندگی میں مصروف تھا۔ اس نے جب محسوس کیا کہ معاملہ خطرناک نقطے تک پہنچ گیا ہے تو وہ دعوت کے ساتھ اخلاص اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی حفاظت کے جوش میں نہایت تیزی سے بھاگتا ہوا وہاں پہنچا جہاں حق و باطل کا میدان گرم تھا۔ لوگ مخالفت میں دیوانہ ہو رہے تھے اور مخالفین نے پوری طرح لوگوں کے جذبات میں آگ لگا رکھی تھی۔ اس مخلص شخص نے پہنچتے ہی لوگوں کو اس خطرناک اقدام سے روکنے کے لیے ان سے خطاب کیا اور انہیں رسولوں کے اتباع کی دعوت دی۔ ایک تو مرسلین کا لفظ ہی دعوت کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا رسول دنیا میں اسی لیے آتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اسی کی اطاعت ہی میں لوگوں کے دین و دنیا کی بھلائی ہوتی ہے۔ لیکن یہ لوگ چونکہ مخالفت میں اندھے ہو رہے تھے اس لیے صرف دعوت پر اکتفا کرنے کی بجائے اس مخلص شخص نے دو دلائل بھی دیے۔ پہلی دلیل یہ دی کہ تم نے آج تک ان کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور تمہاری اذیت رسانی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ان عظیم بندوں کا حال یہ رہا کہ انہوں نے ہمدردی اور خیر خواہی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ خونِ جگر پی پی کر انہوں نے تمہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ اور تمہاری اندھی مخالفت اور بہیمانہ عداوت کے باوجود انہوں نے کبھی اخلاص کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہائی بے غرض لوگ ہیں۔ اگر معاملہ ان کی اپنی ذات یا ان کے مفاد

Marfat.com

کا ہوتا تو وہ کبھی نہ کبھی اپنی ذات اور اپنے مفاد کو نقصان پہنچنے کے اندیشے سے پسپائی اختیار کر لیتے۔ لیکن انہوں نے کسی موقع پر بھی کوئی کمزوری نہیں دکھائی۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور ان کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور اپنے فرائض کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں۔ اور دوسری دلیل یہ دی کہ وہ صرف بے غرض ہی نہیں ہدایت یافتہ بھی ہیں۔ ان کی سیرت بالکل بے داغ ہے۔ کوئی شخص ان کی زندگی کے کسی شعبے پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ انہوں نے زندگی کا ایک ایک لمحہ لوگوں کے سامنے گزارا ہے۔ لوگوں نے انہیں ہمیشہ الامین اور الصادق پایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص بے غرض بھی ہو اور نیک نیت بھی اور اس کی زندگی پاکیزگی کی تصویر ہو، آخر اس کی دعوت کو قبول کیوں نہ کیا جائے۔ اور اس کی مخالفت کر کے اپنی بدبختی کو دعوت کیوں دی جائے۔

وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾

(اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ہستی کی جس نے مجھ کو پیدا کیا ہے، اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۲۲)

قوم کی ملامت کا جواب

اسلوبِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس مخلص بندے کی تقریر کے جواب میں اس بپھری ہوئی قوم نے اس کی مخلصانہ دعوت کو قبول کرنے کی بجائے اسے ملامت شروع کر دی کہ تم ایسا لگتا ہے کہ ان رسولوں سے کوئی ساز باز کر چکے ہو۔ یا ان کے خفیہ ایجنٹ ہو۔ تم پروگرام کے تحت عین وقت پر ان کی حمایت کے لیے پہنچے ہو تاکہ تم لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو سکو۔ تم درحقیقت دینِ آبائی کے دشمن ہو اور اس کے لیے تم نے قوم کی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ چنانچہ قوم کی ملامت کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے اس مخلص بندے نے یہ کہا کہ تمہاری ملامت اپنی جگہ اور تمہارا دینِ آبائی پر تعصب بھی اپنی جگہ، لیکن میں تم سے صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ میں نے تمہارے مشرکانہ رویئے کے برعکس ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کا عہد کیا ہے۔ تو تم مجھے بتاؤ کہ آخر اس میں کیا قباحت ہے۔ آخر میں اس ذات کی بندگی کیوں نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا۔ یعنی میں اپنے خالق اور مالک کی بندگی کروں تو تم مجھے ملامت کرتے ہو۔ اور تم اپنے مصنوعی معبودوں کو پکارو اور ان کی بندگی بجا لاؤ جبکہ انہوں نے نہ تمہیں پیدا کیا اور نہ تمہاری ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ تو تم اپنے رویے میں بالکل صحیح ہو۔ تم خود دونوں باتوں میں تقابل کر کے دیکھو۔ کیا میرا رویہ اور میرا فیصلہ انصاف کے مطابق ہے یا تمہارا رویہ۔ اور دوسری بات اس مخلص بندے نے یہ کہی کہ ایک دن تمہیں بھی مرنا اور اسی خدا کی طرف جانا ہے، جس کی بندگی پر آج تمہیں اعتراض ہے۔ ذرا غور کرو کہ جب اس کے سامنے پیشی ہو گی۔ تو اس کی بندگی سے انکار کا کیا جواب دو گے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا وَّلَا یُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۴﴾

(کیا میں اس کے علاوہ دوسروں کو معبود بناؤں، اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں۔ ۲۳) بے شک میں اس وقت ایک صریح گمراہی میں ہوں گا۔ ۲۴)

Marfat.com

شرکاء پر تنقید

اگر تمہارے کہنے میں آ کر میں اس ذات کی بندگی نہ کروں اور اسے معبود نہ بناؤں جس نے مجھے پیدا کیا اور وجود بخشا۔ تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو اپنا معبود بنالوں جن کی بے بسی کا حال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے کوئی تکلیف یا نقصان پہنچانا چاہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میری سفارش نہیں کر سکتے۔ اور نہ ان کی سفارش میرے کسی کام آ سکتی ہے۔ اور اگر وہ مجھے سزا دینا چاہے تو وہ مجھے اس کی سزا سے چھڑا نہیں سکتے۔ اس کے باوجود اگر میں ایسا کروں یعنی غیر اللہ کو معبود بنالوں تو یہ ایک ایسی کھلی ہوئی گمراہی ہوگی جس کے لیے میرے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

(بے شک میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں، پس تم میری بات سنو۔ ۲۵)

اتمامِ حجت

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب اس مخلص انسان نے محسوس کیا کہ یہ سنگ دل لوگ بجائے میری ہمدردی اور خیر خواہی میں ڈوبی ہوئی تقریر سے اثر لینے کے مجھے سنگسار کر دینے پر تل گئے ہیں اور ان کی جاہلی عصبیت نے انہیں بالکل درندہ بنا دیا ہے۔ تو انہوں نے اتمامِ حجت کے طور پر سب کے سامنے اعلان کیا کہ میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا ہوں کیونکہ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ جو میرا خالق اور رب ہے بندگی بھی اسی کی زیب دیتی ہے، میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں اس کی ذات وصفات کو تسلیم کرتے ہوئے غیر مشروط طور پر ایمان کا اعلان کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی تمہیں توجہ دلاتا ہوں کہ جس طرح وہ میرا رب ہے تمہارا بھی رب ہے۔ اگر اس کی ربوبیت کا تقاضا مجھے ایمان لانے پر مجبور کرتا ہے تو تمہیں بھی اس تقاضے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تو تم میری اس بات کو غور سے سنو اور سمجھو۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد میری آواز خاموش کر دی جائے گی۔ لیکن جب تک میری قوتِ گویائی باقی ہے میں تمہیں تمہارے رب کی یاد دلاتا رہوں گا۔

دوسرا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مخلص انسان کا خطاب قوم سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں سے ہے۔ ان کی دعوت وتبلیغ کی تائید کے لیے جو کچھ بن پڑے وہ کر گزرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ کیونکہ یہ ان پر ایمان لا چکے تھے۔ چنانچہ اپنے اس فرض کو آخری حد تک انجام دینے کے لیے انہوں نے برہنہ دشمنوں کے سامنے اس کا اعلان کر کے ان کی صداقت کا اعتراف کیا۔ اور لوگوں کے سامنے یہ بات واضح کر دی کہ اگر ان کی صداقت میں کوئی شبہ ہوتا اور یہ لوگ اپنے دعوئ رسالت میں جھوٹے ہوتے تو میں کبھی جان پر کھیل کر اس بے باکانہ طریقے سے ایمان کا اظہار نہ کرتا۔ پھر رسولوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ میرے اس اعلان کو سن لیجیے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے میرے ایمان کی شہادت دیجیے۔

Marfat.com

قِيۡلَ ادۡخُلِ الۡجَـنَّةَ ‌ؕ قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِىۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَلِىۡ رَبِّىۡ وَجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ ﴿۲۷﴾

(اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا، اس نے کہا: کاش! میری قوم کو معلوم ہوتا۔ ۲۶)
کہ میرے رب نے کس چیز کی وجہ سے مجھے بخش دیا اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا۔ ۲۷)

راہِ حق کے شہید کو بشارت کا مفہوم

اسلوبِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخلص انسان جو شہر کے ایک دور دراز گوشے سے قوم کو سمجھانے کے لیے آیا تھا بجائے اس کی بات کو قبول کرنے کے ان ظالموں نے اسے قتل کر دیا۔ چنانچہ جیسے ہی اس کا خون زمین پر گرا اللہ تعالیٰ نے اس کی عظیم قربانی کو قبول فرمالیا۔ اور حکم دیا کہ ہمارے اس مخلص بندے کو جنت میں داخل کر دو۔ ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہیدِ راہِ حق کو فی الواقع جنت میں داخل کر دیا گیا۔ اور یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں، آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ احد کے شہداء کو بھی پرندوں کی شکل میں جنت میں رکھا گیا ہے اور انہیں آزادی بخشی گئی ہے کہ جنت میں وہ جہاں چاہیں جائیں اور جنت کے جو پھل کھانا چاہیں وہ کھائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آج بھی اللہ تعالیٰ کی جنت میں غذا دیے جا رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ جنت میں لوگ، اپنی قربانیوں اور کارناموں کے باعث اس وقت جائیں گے جب قیامت برپا ہوگی۔ حساب کتاب کے بعد جب ان کے جنت میں جانے کا فیصلہ ہو جائے گا تو تب انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ تو یہ شہیدِ راہِ حق قیامت کے برپا ہونے سے پہلے جنت میں کیسے چلا گیا۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ شہدائے اُحد شہادت کے ساتھ ہی جنت میں پہنچا دیے گئے تھے۔ اور قاضی عیاضؒ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شہداء کی مختلف قسمیں ہیں جن میں جو اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ مقرب ہیں انہیں شہادت کے فوراً بعد جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اور باقی شہداء کو مختلف مدارج میں رکھا جائے گا۔ البتہ جنت میں ان کا داخلہ آخرت میں ہوگا۔ نیز عالمِ برزخ میں انہیں ان کی قبروں میں جنت کی بعض نعمتیں پہنچائی جائیں گی اور وہ برزخ میں رہتے ہوئے بھی جنت کے مزے لوٹیں گے۔

بعض لوگوں نے اس آیت کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ کسی فرشتے کی معرفت اس شہید کو یہ پیغام پہنچایا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اہلِ جنت میں شمار فرمایا ہے تم جنت میں یوں تو قیامت کے بعد جاؤ گے لیکن تمہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ تم اہلِ جنت میں سے ہو۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض شہداء کو جنت میں ان کا ٹھکانہ دکھا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ٹھکانہ دیکھ کر تمام برزخی زندگی میں اسی سرور میں مخمور رہتے ہیں۔ فرشتوں کے ذریعے دخولِ جنت کی خوشخبری اور آثارِ جنت کا مشاہدہ چونکہ موت کے بعد ہی ہو سکتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظالم قوم نے فی الواقع اللہ تعالیٰ کے اس مخلص بندے کو قتل کر دیا تھا۔

Marfat.com

مردِ مومن کا کمالِ اخلاق

دخولِ جنت کی اس خوشخبری کے بعد اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس مردِ مومن کے کمالِ اخلاق کا ذکر فرمایا ہے کہ اس کی نہایت مخلصانہ دعوت کو قبول کرنے کی بجائے قوم نے جو اس پر ظلم توڑا کہ اس کی جان لے لی۔ انسانی نقطۂ نگاہ سے تو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس قوم کی شکایت کرتا اور ان کی بربادی کے لیے بددعا کرتا۔ لیکن اس کی بلندیٔ اخلاق دیکھیے کہ وہ کسی جذبۂ انتقام میں مبتلا ہونے کی بجائے موت کا شکار ہو کر بھی اسی ہمدردی اور غمگساری کے جذبے میں ڈوب کر وہ اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہے کہ کاش میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ میرے رب نے ایمان کی وجہ سے مجھے کیسے اعزازات سے نوازا ہے اور میری مغفرت فرما کر کس طرح میرے مستقبل کو ہمیشہ کے لیے درخشاں بنا دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ میرے انجام سے باخبر ہو کر ایمان کا راستہ اختیار کریں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ دعوتِ الی اللہ کے منصب پر فائز ہوتے ہیں ان کی سیرت و کردار کی تعمیر اور ان کے قلب و دماغ کا ڈھانچا کس طرح کے خیالات سے وجود میں آتا ہے اور وہ اپنی قوم کی طرف سے اذیتوں کے باوجود بھی ان کے بدخواہ نہیں ہوتے۔ قوم ان کی جان لینے کے درپے ہوتی ہے اور ان کی ساری توانائیاں انہیں جہنم سے بچانے کے لیے صرف ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس مردِ مومن کی تعریف کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: نَصَحَ قَوْمَهٗ حَيًّا وَّمَيِّتًا ''اس شخص نے جیتے جی بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور مر کر بھی۔''

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾

(اور اس کے بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا، اور نہ ہم اتارنے ہی والے تھے۔ ۲۸
بس ایک ڈانٹ تھی اور یکایک وہ سب بجھ کر رہ گئے۔ ۲۹)

مکذبینِ رسول کے لیے سنتِ الٰہی

شہر کے دور دراز گوشے سے آنے والے مردِ مومن کی شہادت کے بعد یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو شہید کر دیا گیا یا انہیں ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔ ممکن ہے کہ وہ شہید نہ ہوئے ہوں لیکن قوم کے بپھرے ہوئے جذبات اور ظالمانہ عزائم کو دیکھ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی دوسرے علاقے کی طرف ہجرت فرمائی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم کی طرف مبعوث ہونے والا پیغمبر ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور قوم اس کی تکذیب پر تل جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب انہیں مزید مہلت نہیں دیتا۔ چنانچہ اس قوم پر بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ اور اس کے بارے میں نہایت برہمی سے یہ بات فرمائی گئی ہے کہ ہم نے آسمان سے انہیں تباہ کرنے کے لیے کوئی لشکر نہیں اتارا اور نہ ایسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے ہم لشکر اتارا کرتے ہیں۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کے لشکر بے شمار ہیں۔ زمین پر بھی ہیں اور آسمان پر بھی۔ انہیں میں سے فرشتوں کا لشکر بھی ہے۔ اور انسانوں کی کسی آبادی کو تباہ کرنے کے لیے فرشتوں کے لشکر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک فرشتہ بھی کسی شہر کی تباہی کے لیے کافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات فرشتوں یا کسی اور لشکر کی محتاج نہیں۔ وہ چاہے تو کسی دوسرے کی معاونت

Marfat.com

کے بغیر ساری دنیا کو بھی تباہ کر سکتا ہے لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے شہر کی فصیل کے دروازے کو پکڑ کر ایک زوردار اور ہیبت ناک آواز نکالی، جس نے ساری قوم کے شعلۂ حیات کو بجھا کر رکھ دیا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی حرارتِ غریزی سلب کر لی گئی ہو۔ اور خمود چونکہ بجھا دینے کو کہتے ہیں اس سے ممکن ہے اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کے خلاف دشمنی اور عداوت سے ایسے پھنکار رہے تھے جیسے سانپ شعلے اگلتا ہے یا آگ کی بھٹی شعلہ بار ہوتی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ان کی عداوت کے شعلے تو سرد ہونا ہی تھے زندگی کا شعلہ بھی بجھ کر رہ گیا۔

یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ اِلَّا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾
اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِنْ
كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

(افسوس ہے بندوں کے حال پر جو رسول بھی ان کے پاس آیا اس کا وہ مذاق ہی اڑاتے رہے۔ ۳۰) کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کیا، بے شک وہ ان کے پاس کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ۳۱) بے شک وہ ہمارے ہی حضور میں حاضر کیے جائیں گے۔ ۳۲)

مکذبینِ رسول پر افسوس

انسانی نفسیات کو متوجہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ افسوس ہے ان بندوں پر جو راہِ حق پہچاننے کی بجائے ہمیشہ اپنی خواہشات کے اتباع میں نفسانیت کا کھیل کھیلتے رہے ہیں۔ ان کا بگاڑ جب حد سے گزرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت کے لیے کوئی نہ کوئی رسول بھیجتا ہے تاکہ یہ لوگ تباہی سے بچ جائیں۔ لیکن یہ لوگ چونکہ حقیقت کی نگاہ سے محروم ہو چکے ہوتے ہیں بجائے رسول کی دعوت کو قبول کرنے اور اس کی عظمت کو پہچاننے کے اس کی تکذیب پر تل جاتے ہیں۔ وہ نہایت خیر خواہی اور ہمدردی سے ان کی بھلائی چاہتا ہے اور یہ نادانوں کی طرح اس کا منہ چڑاتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ آج یہی روش قریشِ مکہ کی ہے وہ بھی اسی راستے پر چل رہے ہیں جس راستے پر اس سے پہلے تباہ ہونے والی قومیں چلتی رہی ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ یہ روایات سینہ بہ سینہ ان کی قوم میں پھیلی ہوئی ہیں کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کتنی قوموں کو تکذیبِ رسول کی پاداش میں تباہ کیا ہے اور وہ قومیں پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئیں۔ انہوں نے اپنے استہزا کا انجام دیکھ لیا۔ اور یہ بھی بجائے اس سے سبق سیکھنے کے وہی انجام دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان تباہ ہونے والی قوموں کو بھی اپنی دولت و ثروت پر بڑا ناز تھا۔ اور وہ پیغمبر کی باتوں کو ازکار رفتہ سمجھتے تھے۔ لیکن آج وہ کہاں ہیں۔ قریش اور ان جیسے دوسرے لوگ بھی اسی انجام سے دوچار ہو کر وہیں پہنچیں گے جہاں وہ پہنچ چکے ہیں۔ اور پھر ایک روز ان سب نے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے۔ وہاں ایک ایک عمل کا حساب دینا پڑے گا۔

Marfat.com

آخری آیت کی نحوی توجیہ

وَاِنْ کُلٌّ الخ۔ اِنْ نافیہ بھی ہوسکتا ہے اور مخففہ بھی۔ لیکن ل کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِنْ مخففہ ہے۔ کُلٌّ کل الخلائق کے معنی میں مبتدا ہے۔ اور جَمِیْعٌ مبتدا کی خبر ہے جو المجموعون کے معنی میں ہے۔ مُحْضَرُوْنَ دوسری خبر ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۖۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ
يَاْكُلُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا
فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿٣٤﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ
اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ
الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۖۚ
نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ
ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٣٨﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ
كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿٣٩﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ
وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿٤٠﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ
اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿٤١﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ
مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿٤٣﴾
اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿٤٤﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا
بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ

Marfat.com

اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا قِيْلَ
لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾
وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ
اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

رکوع: ۳۔ (اور ان لوگوں کے لیے ایک بہت بڑی نشانی مردہ زمین ہے، ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلے اگائے، پس اس میں سے وہ کھاتے ہیں۔ ۳۳) اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس میں چشمے جاری کر دیے۔ ۳۴) تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں، یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ ۳۵) پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے پیدا کیے ان چیزوں میں سے بھی جن کو زمین اگاتی ہے اور خود ان کی اپنی جنس سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ جانتے تک نہیں۔ ۳۶) اور ان کے لیے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں، پس وہ اچانک اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ ۳۷) اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے، یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔ ۳۸) اور چاند، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کر رہ جاتا ہے۔ ۳۹) نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور سب اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ ۴۰) اور ایک نشانی ان کے لیے یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ ۴۱) پھر ہم نے ان کے لیے پیدا کیں اسی کی مانند جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ ۴۲) اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ کوئی ان کا فریاد سننے والا ہو اور نہ وہ بچائے جا سکیں۔ ۴۳) پس ہماری رحمت ہے اور ایک وقتِ معین تک ان کو بہرہ مند کرنا ہے۔ ۴۴) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اس چیز سے جو تمہارے آگے اور پیچھے ہے، اور شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۴۵) ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے سامنے آتی ہے وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ ۴۶) اور جب ان سے

Marfat.com

کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا، تم تو بالکل ایک صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو۔ ۴۷) اور وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ قیامت کی دھمکی کب پوری ہوگی، اگر تم لوگ سچے ہو۔ ۴۸) یہ لوگ بس ایک ڈانٹ ہی کے منتظر ہیں جو انہیں آ پکڑے گی اس حال میں کہ وہ جھگڑ رہے ہوں گے۔ ۴۹) پس نہ تو وہ کوئی وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے اہلِ خانہ کی طرف پلٹ سکیں گے۔ ۵۰)

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۖۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾
لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

(اور ان لوگوں کے لیے ایک بہت بڑی نشانی مردہ زمین ہے، ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلے اگائے، پس اس میں سے وہ کھاتے ہیں۔ ۳۳) اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس میں چشمے جاری کر دیے۔ ۳۴) تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں، یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ ۳۵)

اس سورۃ کے آغاز میں آنحضرت ﷺ کی اصل حیثیت، قرآن کریم کی آپ کی رسالت پر گواہی اور آپ کے فرضِ منصبی کو بیان کرنے کے بعد قریشِ مکہ کے رویے پر تنقید فرمائی گئی۔ اور آپ کے فرضِ منصبی کی نزاکتوں کو واضح کرنے کے لیے تاریخی استشہاد کے طور پر گزشتہ کسی دور میں مبعوث ہونے والے رسولوں کی تبلیغی کاوشوں اور ان کی قوم کے ردعمل کو واضح کرتے ہوئے قریش کو آئینہ دکھاتے ہوئے اس قوم کا بھیانک انجام بیان کیا گیا ہے تاکہ قریش اور دیگر اہلِ عرب اچھی طرح اندازہ کر سکیں کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں وہ جو طرزِ عمل اختیار کر چکے ہیں اس کا نتیجہ تاریخ کے مختلف ادوار میں کیا نکلتا رہا ہے اور آج بھی اگر وہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی سنت میں چونکہ تبدیلی نہیں آتی اس لیے آج بھی اس انجام سے مختلف کسی اور انجام کی توقع رکھنا احمقوں کی جنت میں بسنے کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ اس یاددہانی اور وارننگ کے بعد اب اس دعوت کے بنیادی نکات کو دلائل کے ساتھ واضح فرمایا جا رہا ہے تاکہ جو شخص بھی راہِ راست پر آنا چاہے وہ علم کی پوری روشنی کے ساتھ آئے۔ اور جو گمراہی کی موت مرنا چاہے اسے یہ شکایت نہ ہو کہ حق ہم پر پوری طرح واضح نہیں کیا گیا تھا۔

توحید پر ربوبیت سے دلیل

مذہب کی تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف مبعوث ہوئے ہیں تو اس قوم نے اپنے انکار کو ہمیشہ نشانیوں کے مطالبے کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی اور اپنی ہٹ دھرمی اور استکبار کو یہ کہہ کر جواز بخشا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا رسول واقعی اپنی دعوت میں سچا ہے تو اسے ہماری منہ مانگی نشانیاں دکھانے سے انکار نہیں ہونا چاہیے۔ قریشِ مکہ بھی ایسے ہی ہتھکنڈوں سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو بے اثر کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ چنانچہ پروردگار نے ان سے نہایت سامنے کی بات فرمائی ہے کہ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کے رسول کی دعوت

Marfat.com

کی حقانیت کے لیے نشانیاں مطلوب ہیں تو نشانیاں تو ان کے گردوپیش اور ان کے سامنے پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی ہٹ دھرمی اور استکبار انہیں ان نشانیوں کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک ایسی نشانی کو بیان کیا جارہا ہے جس سے کوئی انسان بھی غافل نہیں رہتا۔ اس لیے کہ ایسا کون سا شخص ہوگا جس کا زمین سے سابقہ نہ رہتا ہو۔ اس لیے سب سے پہلے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تم ذرا زمین کو دیکھو کہ زمین اپنی تمام تر وسعتوں اور اپنے دامن میں کھولتا ہوا لاوا رکھنے کے باوجود تمہارے قدموں میں اس طرح بچھی ہوئی ہے کہ جس سے زیادہ سرافگندگی اور عاجزی کا اظہار ممکن نہیں۔ انسان اس پر دوڑتا بھاگتا ہے، بڑی بڑی گاڑیاں چلاتا ہے، گہرے نالے کھودتا ہے، بڑی بڑی عمارتیں اس کی سطح پر اٹھاتا ہے، بڑے بڑے ڈیم بناتا ہے، لیکن زمین نے آج تک انسان کی ان کارروائیوں کو بروئے کار لانے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس میں سختی اس قدر ہے کہ بڑے سے بڑا بوجھ اٹھالیتی ہے۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سینے پر ایستادہ ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص اس پر سونے کے لیے لیٹ جاتا ہے تو اس کی نرمی اسے اس طرح اپنی آغوش میں لے لیتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں ماں کی آغوش میں سو رہا ہوں۔ لیکن اس سب سے بڑھ کر جس نشانی کی طرف یہاں توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب کہیں نزولِ باراں میں تاخیر ہوجاتی ہے تو ایک مدت گزرنے کے بعد ہر طرف دھول اڑتی دکھائی دیتی ہے، جوہڑ سوکھ جاتے ہیں، کسی مینڈک کے ٹرانے کی آواز نہیں آتی، زمین گھاس کی پتی تک کو ترس جاتی ہے، انسانی بستیاں قحط کا شکار ہوجاتی ہیں اور چارہ نہ ملنے کی وجہ سے جانور مرنے لگتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمین پر اب زندگی گزارنا ممکن نہیں رہا کہ اچانک گھٹا اٹھتی ہے اور چھم چھم بارش ہونے لگتی ہے۔ چند دنوں میں وہ زمین جس پر ہر طرف موت کا پہرہ تھا ہر طرف مجسم زندگی میں تبدیل ہوجاتی ہے، سوکھے ہوئے درختوں میں کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، زمین کا بڑا حصہ مخملی لباس پہن لیتا ہے، کاشتکاروں کی محنت رنگ لانے لگتی ہے اور جن غلوں پر انسان کی معاش کا انحصار ہے ان کی فصلیں لہلہانے لگتی ہیں اور جابجا کھجور، انگور اور دوسرے پھلوں کے باغات اپنی بہار دینے لگتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے وجود کی نشانی اور کیا ہوگی۔ اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا خالق زمین پر بسنے والوں کی ضروریات سے غافل نہیں، اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح وہ اپنی تخلیق میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ ہر مخلوق اس کی محتاج ہے، اسی طرح کائنات کا نظام وانصرام چلانے اور مخلوقات کی ضروریات پوری کرنے میں بھی وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی ذات میں بھی وحدہ لاشریک ہے اور اپنی صفات میں بھی۔ اس نے اپنی بےشمار نعمتیں دے کر انسان میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی نہیں کیونکہ وہ نہ زمین میں قوت روئیدگی پیدا کرسکتا ہے اور نہ وہ کسی اور نعمت کو از خود وجود بخش سکتا ہے۔ انہیں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں یہ ساری نعمتیں محض اپنے فضل وکرم سے عطا کیں۔ اور بغیر کسی استحقاق کے ہمیں ان نعمتوں سے بہرہ مند فرمایا ہے۔ افسوس تو ان بندوں پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کھاتے، استعمال کرتے لیکن اس کی شکرگزاری کرنے کی بجائے اکڑتے اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ضمیر کا مرجع؟

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ بعض اہلِ علم نے ضمیر کو مذکر دیکھ کر اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کو ٹھہرایا ہے لیکن سیاق کلام کو دیکھتے ہوئے یہ تکلف معلوم ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کا مرجع ارض کو بنایا جائے۔ رہی یہ بات کہ ضمیر مذکر ہے اور ارض (زمین) مونث ہے۔ اس لیے ضمیر اور مرجع میں موافقت نہیں رہتی۔ لیکن اہلِ علم جانتے ہیں کہ عربی زبان میں بعض دفعہ ضمیر لفظ کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کے مفہوم کے اعتبار سے آتی ہے اور اسے اہلِ ادب علی سبیل التاویل سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہاں بھی ارض البلد الطیب کے معنی میں

Marfat.com

ہے۔قرآنِ کریم نے سورۃ الاعراف میں اسے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ارشاد باری ہے وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا (الاعراف ۵۸) ''اور جو زمین زرخیز ہوتی ہے اس کی نباتات تو اس کے رب کے حکم سے خوب اپجتی ہیں اور جو زمین ناقص ہوتی ہے اس سے ناقص ہی چیز اگتی ہے۔''

وَمَا عَمِلَتْهُ اَیْدِیْهِمْ اس کا ایک ترجمہ تو ہم نے اوپر متن میں کیا ہے لیکن ایک دوسرا ترجمہ بھی ہوسکتا ہے اور وہ بھی صحیح ہے۔وہ یہ ہے تاکہ یہ کھائیں اس زمین کے پھل اور وہ چیزیں جو ان کے اپنے ہاتھ بناتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں سے انسان مختلف نعمتیں اور غذائیں بناتا ہے۔غلے سے روٹی، سبزیوں سے سالن پھر آٹے اور بیسن سے مختلف قسم کی مٹھائیاں، مختلف پھلوں سے مربے، اچار، چٹنیاں اور ایسی ہی اور بے شمار چیزیں وغیرہ۔یہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل کا کرشمہ ہے۔اس لحاظ سے ان مصنوعی نعمتوں پر بھی اللہ تعالیٰ ہی کا شکر لازم ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

(پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے پیدا کیے ان چیزوں میں سے بھی جن کو زمین اگاتی ہے اور خود ان کی اپنی جنس سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ جانتے تک نہیں۔ ۳۶)

سُبْحٰنَ کا مفہوم

سُبْحٰنَ کلمۂ تنزیہ ہے۔اس سے اللہ تعالیٰ کو ہر عیب اور ہر کمزوری سے پاک اور ہر نارسائی سے بالا ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ان آیات میں اگرچہ مشرکین کی تردید اور شرک کی مذمت پیشِ نظر ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات کی تنزیہ پیشِ نظر نہیں۔لیکن شرک چونکہ بجائے خود انسانی عقائد میں بہت بڑی خرابی کا نام ہے۔اس لیے جب ایسی کسی خرابی کا انتساب پروردگار کی طرف ہوتا ہے تو اس کا مفہوم دراصل یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اندر کوئی نہ کوئی کمزوری پائی جاتی ہے۔مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فلاں فلاں صفات میں فلاں فلاں تو تیں شریک ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ان صفات کو بروئے کار لانے پر قادر نہیں۔اگر اس کی قدرت کامل ہوتی تو کسی دوسرے کی شرکت کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا۔وہ اپنی قدرت کی ناتمامی کے باعث دوسروں کو اپنے ساتھ شریک کرنے پر مجبور ہوا ہے۔اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات میں تو کسی کو شریک نہیں کیا لیکن بعض ہستیاں ایسی طاقتور ہیں کہ پروردگار ان کی مداخلت روکنے پر قادر نہیں۔اس لیے وہ اپنی کمزوری کے باعث ان کی مداخلت کو برداشت کر رہا ہے۔ایسے ہی بعض دیگر مشرکانہ تصورات ہیں جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف کمزوریوں کو منسوب کرنے کے مترادف ہیں۔چنانچہ ان تمام خرافات کے ازالے کے لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے تمام عیوب ونقائص اور کمزوریوں سے پاک اور منزّہ ہے۔

توحید پر صفتِ تخلیق سے استدلال

اللہ تعالیٰ کو ہر نقص اور عیب سے پاک ثابت کرنے کے بعد صرف اس کی ایک صفتِ تخلیق کا حوالہ دیا ہے جس پر غور کرنے کے بعد اگر کسی شخص کی عقل پر پتھر نہیں پڑ گئے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ہر طرح کے شرک سے تائب ہو جاتا ہے۔وہ جب دیکھتا ہے کہ یوں تو اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق بجائے خود ایسی حیران کر دینے والی ہے کہ جیسے جیسے تدبر کا قدم آگے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے آدمی کے حیرت واستعجاب میں

Marfat.com

اضافہ ہوتا جاتا ہے۔لیکن جب ہم خصوصی طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے جو چیزیں بھی پیدا کی ہیں ان میں انتہا درجے کا تنوع پایا جاتا ہے۔ انسانوں ہی کو دیکھ لیجیے ان کی شکلوں، رنگوں، قامتوں، زبانوں، صلاحیتوں، مزاجوں اور ذوقوں میں باہمی کس قدر اختلاف اور فرق پایا جاتا ہے۔ پھولوں کو دیکھ لیجیے۔ان کے رنگ اور ان کی خوشبو اس قدر اپنے اندر تنوع رکھتی ہے کہ آدمی اس سیلاب کے سامنے ڈوبتا چلا جاتا ہے۔اس نے آسمان پر روشنی کے جو بڑے بڑے کُرّے سجا رکھے ہیں اور بڑے بڑے فانوس جلا رکھے ہیں کوئی شخص ان کی روشنی کی کنہ کو کماحقہ پا نہیں سکتا۔اور پھر اسی پر بس نہیں اس نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے بھی پیدا کیے ہیں۔عورت مرد کا جوڑا تو انسان کے اپنے وجود کا باعث ہے اس لیے اسے تو ہر ایک جانتا ہے لیکن حیوانات کی نسلیں بھی نر اور مادہ کے ازدواج سے وجود میں آئی ہیں۔اسی طرح نباتات میں ماہرینِ زراعت تزویج کے اصول کی کارفرمائی کو دیکھتے ہیں تو انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔اب تو علم کا سفر یہاں تک بڑھ چکا ہے کہ بے جان مادوں میں بھی تزویج کے عمل کی کارفرمائی ثابت ہو چکی ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود مادے کی بنیادی ترکیب منفی اور مثبت برقی توانائی کے ارتباط سے ہوئی ہے۔ابھی نہ جانے اس عالم کا کتنا حصہ ہمارے علم کی رسائی سے باہر ہے۔جب کبھی وہ روشنی میں آیا تو اس بات کی مزید تصدیق ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تنوع بھی رکھا ہے اور تزویج کا عمل بھی جاری ہے۔یہ تنوع اور یہ ازدواج اللہ تعالیٰ کی حکمت وصناعی کی ایسی دلیل ہے اور اس کی وحدانیت اور الوہیت کا ایسا ثبوت ہے جس کے سامنے شرک کی ہر آلودگی دم توڑ جاتی ہے۔

ہر چیز کے جوڑا جوڑا ہونے سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جس طرح ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے اسی طرح دنیا کا بھی کوئی جوڑا ہونا چاہیے ورنہ دنیا بالکل بے مقصد و بے غائت ہو کر رہ جاتی ہے۔اور یہ بات ایک حکیم خالق کی شان سے بعید ہے کہ وہ کوئی عبث اور بے مقصد کام کرے۔چنانچہ اس دنیا کے اس خلا کو بھرنے کے لیے اس نے آخرت بنائی ہے۔

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ فَاِذَا ھُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

(اور ان کے لیے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں، پس وہ اچانک اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ ۳۷)

رات اور دن کی نشانی سے استدلال

لوگوں کو توجہ دلانے کے لیے ایک اور نشانی کا ذکر فرمایا کہ جس طرح دن اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے اسی طرح رات بھی اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے۔حالانکہ اگر کبھی انسان اس بات پر غور کرے کہ دن کیسے گزرتا ہے اور رات کیسے آتی ہے اور دن کے جانے اور رات کے آنے میں کیا حکمتیں کارفرما ہیں۔دن کو کس طرح نور کی چادر اڑھائی جاتی ہے تو لوگوں کے لیے روشن دن نمودار ہو جاتا ہے جس میں وہ زندگی کی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔پھر اللہ تعالیٰ اپنی یہ نورانی چادر اس سے کھینچ لیتے ہیں تو وہ تاریکی میں ڈوب جاتا ہے جس سے لوگوں کو آرام کا موقع ملتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ روز و شب کے انقلاب کا یہ سلسلہ جاری نہ کرتا تو انسان ہمیشہ تاریکی ہی میں رہتا۔روز و شب کا یہ ایاب و ذہاب اور مخلوق کے مفاد کے لیے ان کی یہ سازگاری اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ دنیا اضداد کی رزم گاہ نہیں ہے بلکہ یہ خالق کی بنائی ہوئی دنیا ہے جو اس کے تمام اضداد کو اس کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

Marfat.com

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾

(اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے، یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔ ۳۸)

سورج کی نشانی سے استدلال

دن کے وقت ظاہر ہونے والی سب سے بڑی نشانی سورج ہے۔ آفتاب پرستوں کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ ذرا اس آفتاب کو دیکھو اپنے حجم، اپنی طاقت، اپنی افادیت اور اپنی وسعت کے باوجود وہ کس قدر نیازمندی کے ساتھ اپنے مدار میں گردش کرتا رہتا ہے۔ کیا مجال کہ اپنے محور و مدار سے ذرا ہٹ سکے یا اس کی پابندیٔ اوقات میں منٹ یا سیکنڈ کا بھی فرق پیدا ہو سکے۔ اگر آفتاب اپنے ارادے میں آزاد ہوتا، وہ ایک مضبوط قانون اور نظم کا پابند نہ ہوتا تو کبھی نہ کبھی اپنے محور یا مدار سے نکلتا، کبھی اپنا فرض انجام دینے میں کوتاہی کرتا اور اس کے نتیجے میں کبھی نہ کبھی لیل ونہار کے ایاب وذہاب میں تبدیلی آتی۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہونا کیا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ ایک عزیز اور علیم ذات کی منصوبہ بندی کا پابند ہے۔ اور اپنی بے پناہ طاقت کے باوجود وہ اس کے سامنے ادنیٰ غلام کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾

(اور چاند، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کر رہ جاتا ہے۔ ۳۹) نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور سب اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ ۴۰)

چاند کی نشانی سے دلیل

جس طرح خدائے عزیز وعلیم نے سورج کا ایک مستقر ٹھہرایا اور وہ اس کی طرف چل رہا ہے اسی طرح اس نے چاند کی بھی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔ وہ اپنے سفر اور اپنی منزلوں کے بارے میں نہ خود کار ہے اور نہ خود مختار ہے، بلکہ وہ اس عظیم ہستی کے قانون ونظام میں ایسا بندھا ہوا ہے کہ صدیوں سے وہ اس نظام کے مطابق چل رہا ہے اور کبھی اس میں تقدیم وتاخیر کا سوال پیدا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے جو اس کے لیے منزلیں ٹھہرا رکھی ہیں وہ اسے بہرصورت طے کرنا پڑتی ہیں۔ ایک دن وہ ہلال بن کر طلوع ہوتا ہے پھر روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ چودھویں رات کو بدرِ کامل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد گھٹتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ منزلیں طے کرتے کرتے وہ بالآخر کھجور کی پرانی ٹہنی کی مانند ہو کے رہ جاتا ہے۔ اور یہ منزلوں کا تعین اور سفر کی یکسانی ایسی مستحکم ہے کہ انسان حساب لگا کر یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کس روز چاند کس منزل میں ہوگا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جس چاند کا حال یہ ہے کہ وہ منازلِ فلکی طے کرتا کرتا سوکھ کے کانٹا اور خمیدہ قامت ہو کے رہ جاتا ہے جس طرح کھجور کی سوکھی ٹہنی ہوتی ہے اور اپنی رفتار اور منزلوں کے تعین میں ایسا مجبورِ محض ہے کہ لاکھوں سالوں میں منٹ سیکنڈ کا تغیر نہیں ہو سکا۔ کیسے نادان ہیں وہ لوگ جو ایسی مجبور ومقہور ذات کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے اور اس کی پوجا کرتے ہیں۔

Marfat.com

اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ سورج اپنی تمام تر عظمت و وسعت کے باوجود اس کی مجال نہیں رکھتا کہ وہ اپنے مدار سے نکل کر چاند کے مدار میں جا گھسے اور اس کو پکڑ لے۔ اور نہ رات کی یہ مجال ہے کہ دن کی مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے آ جائے۔ اور وہ دن کی روشنی کو سمیٹ کر اپنی تاریکیوں کو غالب کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر کرہ اپنے مدار میں اسی طرح گردش کرنے پر مجبور ہے۔

ان آیات کا اصل مقصد علمِ ہیئت کے حقائق کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انسان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور عقل سے کام لے تو زمین سے لے کر آسمان تک جدھر بھی وہ نگاہ ڈالے گا اس کے سامنے خدا کی ہستی اور اس کی یکتائی کے بے حد وحساب دلائل آئیں گے اور کہیں کوئی ایک دلیل بھی دہریت اور شرک کے ثبوت میں نہ ملے گی۔ ہماری یہ زمین جس نظامِ شمسی میں شامل ہے اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کا مرکز، سورج زمین سے 3 لاکھ گنا بڑا ہے اور اس کے بعید ترین سیارے نیپچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم 2 ارب 79 کروڑ 30 لاکھ میل ہے بلکہ اگر پلوٹو کو بعید ترین سیارہ مانا جائے تو وہ سورج سے 4 ارب 60 کروڑ میل دور تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظامِ شمسی ایک بہت بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس کہکشاں (Galaxy) میں ہمارا یہ نظامِ شمسی شامل ہے اس میں تقریباً 3 ہزار ملین (3 ارب) آفتاب پائے جاتے ہیں اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی یہاں تک پہنچنے میں 4 سال صرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بھی پوری کائنات نہیں ہے، بلکہ اب تک کے مشاہدات کی بنا پر اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ تقریباً 20 لاکھ لولبی سحابیوں (Spiral Nebulse) میں سے ایک ہے اور ان میں سے قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی 10 لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ رہے بعید ترین اجرامِ فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں ان کی روشنی تو زمین تک پہنچنے میں 10 کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے جو اب تک انسانی مشاہدے میں آیا ہے۔ آگے نہیں کہا جا سکتا کہ مزید ذرائع مشاہدہ فراہم ہونے پر اور کتنی وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔

تمام معلومات جو اس وقت تک کائنات کے متعلق بہم پہنچی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورا عالم اسی مادے سے بنا ہوا ہے جس سے ہماری یہ چھوٹی سی ارضی دنیا بنی ہے اور اس کے اندر وہی ایک قانون کام کر رہا ہے جو ہماری زمین کی دنیا میں کارفرما ہے ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم اس زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دور دراز دنیاؤں کے مشاہدے کرتے اور ان کے فاصلے ناپتے اور ان کی حرکات کے حساب لگاتے۔ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ ساری کائنات ایک ہی خدا کی تخلیق اور ایک ہی فرمانروا کی سلطنت ہے؟ پھر جو نظم، جو حکمت، جو صناعی اور جو مناسبت ان لاکھوں کہکشاؤں اور ان کے اندر گھومنے والے اربوں تاروں اور سیاروں میں پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر کیا کوئی صاحبِ عقل انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ، آپ سے آپ ہو گیا ہے؟ اس نظم کے پیچھے کوئی ناظم، اس حکمت کے پیچھے کوئی حکیم، اس صنعت کے پیچھے کوئی صانع اور اس مناسبت کے پیچھے کوئی منصوبہ ساز نہیں ہے؟

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿٤١﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿٤٤﴾

Marfat.com

(اور ایک نشانی ان کے لیے یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ ۴۱) پھر ہم نے ان کے لیے پیدا کیں اسی کی مانند جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ ۴۲) اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ کوئی ان کا فریاد سننے والا ہو اور نہ وہ بچائے جا سکیں۔ ۴۳) پس ہماری رحمت ہے اور ایک وقتِ معین تک ان کو بہرہ مند کرنا ہے۔ ۴۴)

صفتِ تخلیق اور صفتِ ابقاء سے استدلال

اللہ تعالیٰ کی توحید اور انسانی زندگی پر اس کے احسانات اور کائنات کے نظم و نسق اور اس کے سنبھالنے میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل کے طور پر جو نشانیاں بیان کی جا رہی ہیں ان میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی نسل کو حضرت نوح علیہ السلام کی بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ بھری ہوئی کشتی سے مراد یہ ہے کہ قومِ نوح پر تکذیبِ رُسل کے نتیجے میں جب عذاب بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ایک بڑی کشتی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بحری جہاز بنانے کا حکم دیا۔ انسان اس سے پہلے کشتی کی صنعت سے بالکل بے خبر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی آبادی خشکی پر دریاؤں اور سمندروں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے پاس دریاؤں اور سمندروں کو پار کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور پھر جو عذاب آنے والا تھا وہ چونکہ غیر معمولی پانی کا سیلاب تھا جس سے خشکی میں رہ کر بچنا ناممکن تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام جب کشتی تیار کر چکے تو اچانک طوفان کے آثار پیدا ہوئے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس تنور میں آگ جلتی تھی وہیں سے سب سے پہلے پانی ابلنا شروع ہوا۔ پھر جا بجا چشمے ابل پڑے، آسمان نے اپنے بند کھول دیے، موسلا دھار بارش نے دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ایک کر دیا، حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اپنی کشتی میں ہر طرح کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا سوار کر لو تاکہ طوفان کے بعد کی زندگی میں ان سے کام لیا جا سکے۔ اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ مرد ہوں یا عورت کشتی کے مختلف حصوں میں انہیں بھی سوار کر لو۔ ظاہر ہے کہ زندگی کی مختلف ضرورتوں اور مختلف جانوروں سے لدی ہوئی یہ کشتی اپنے اندر کس قدر وسعت رکھتی تھی کہ صاحبِ ایمان لوگوں کی نسل ساری کی ساری اس میں سوار کر دی گئی۔ اور اسی کشتی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی اور بقاء کا سامان کیا۔ جبکہ باقی تمام نوعِ انسانی سیلاب کی نذر ہو کر لقمۂ اجل ہو گئی۔ اس لیے سب سے پہلے اس وقت کے انسان پر زندگی کی حفاظت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے جو احسان کیا اور کشتی پر سوار کر کے ان کی بقا کا جو انتظام فرمایا اس کا ذکر کیا گیا۔ اور دوسری آیت میں مزید احسان کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے پھر کشتیِ نوح جیسی اور کشتیاں بھی پیدا فرمائیں جن پر بعد کی نسلیں سوار ہوتی رہیں اور آج بھی انسان اسی کشتی کو ترقی دیتے ہوئے کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس احسان سے کبھی فارغ نہیں ہو سکتا جس کی ابتدا کشتیِ نوح سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے بعد کی کشتیاں بنانے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔ جس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان نے جتنی بھی ایجادات کی ہیں چاہے وہ سمندر پر سفر کے حوالے سے ہوں یا زمینی اور فضائی سفر کے حوالے سے، یا زندگی کی دوسری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے، ان میں سے ہر ایجاد بظاہر انسان کا کرشمہ ہے، لیکن در حقیقت اللہ تعالیٰ کی نوازش اور اس کی عطا ہے۔ ان ایجادات میں جس جوہر نے بنیادی کردار ادا کیا ہے وہ جوہرِ عقل ہے۔ اور یہ جوہر ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان پر سب سے بڑا احسان اور انعام ہے۔ اور مزید یہ کہ عقل بھی ایجادات کے سلسلے میں اس وقت کوئی نیا کارنامہ انجام دینے میں کامیاب ہوتی ہے جب اچانک اللہ تعالیٰ انسان کی اس ایجاد کو ایک نئے سفر کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ اور اچانک اس کے اندر ایک نیا دیپ جل اٹھتا ہے۔ نیوٹن نے بارہا سیب کے درخت سے سیب کو گرتے دیکھا، لیکن کبھی اسے کششِ ثقل کا الہام نہیں

Marfat.com

ہوا۔ لیکن ایک دن اچانک سیب کو گرتے دیکھ کر وہ اس راز کو پا گیا کہ آخر سیب نیچے ہی کیوں گرتا ہے، اوپر کیوں نہیں جاتا؟ یہ یقیناً زمین کی کشش کا نتیجہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو فطرت کی طاقتوں پر جو تصرف کے اختیارات حاصل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ اور ان طاقتوں پر تصرف کے جو طریقے اس نے دریافت کیے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے اس کے علم میں آئے ہیں۔ اسرارِ فطرت کا پتہ چلا لینا اور ان قوتوں سے کام لینے کے طریقے جان سکنا اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سوا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جب مرضی ہوتی ہے اور وہ جس چیز کو انسان کی بھلائی کے لیے وجود میں لانا چاہتا ہے انسان کی اس کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ لیکن یہ انسان کی غلطی ہے کہ وہ ان ایجادات کو اپنی ذاتی قوتِ تسخیر کا نتیجہ سمجھ لیتا ہے اور یہیں سے اس کی گمراہی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لیے اگلی آیتِ کریمہ میں توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہمارا احسان ہے کہ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں اس وقت کے صاحبِ ایمان لوگوں کی نسل کو سوار کیا اور پھر انہیں سے آئندہ زمین پر نوعِ انسانی کا سلسلہ چلا۔ پھر انسان درجہ بدرجہ ایجادات میں آگے بڑھتا رہا اور آج اس کی کشتیاں سمندر کے سینے پر دوڑتی پھرتی ہیں، لیکن اسے کبھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ انہیں کشتی سمیت غرق کر دے۔ اور یہ نہ کوئی فریاد کر سکیں اور نہ کوئی ان کی فریاد رسی کر سکے اور نہ کبھی یہ ہلاکت سے محفوظ رہ سکے۔ یہ تو سراسر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کو اپنی حکمت و مشیت کے مطابق مختلف صلاحیتوں سے نوازا، ان کے اظہار کا موقع دیا اور ایک وقتِ خاص تک ان نعمتوں سے اسے بہرہ مند ہونے کا موقع فراہم کیا۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّقُوۡا مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡكُمۡ وَمَا خَلۡفَكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۴۵﴾

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اس چیز سے جو تمہارے آگے اور پیچھے ہے، اور شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۴۵)

انسان کے بگاڑ کی مثال

انسان کے بگاڑ کی انتہا یہ ہے کہ وہ نہ دوسروں کے انجام سے عبرت حاصل کرتا ہے اور نہ آئندہ آنے والا انجام اس کے اندر تشویش پیدا کرتا ہے۔ حیوانوں کی طرح جب تک اسے چارہ کھانے کو ملتا رہتا ہے اسے کسی بات کی ہوش نہیں ہوتی۔ قریش چونکہ ایسی ہی صورتحال سے دوچار تھے اس لیے ان کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ انہیں گزشتہ اقوام کی تاریخ کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور موت کے بعد کی زندگی یعنی آخرت میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے تب بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہی دو حوالے ہیں جس سے انسان کا رویہ بدلنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن قریش معلوم ہوتا ہے تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں کیونکہ جن باتوں سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کیا جاتا ہے وہ ان باتوں کو سننے کے بھی روادار نہیں۔

آیت کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے اگرچہ اس سے آیت کی مراد میں فرق نہیں پڑتا لیکن حوالے ضرور بدل جاتے ہیں۔ اس مضمون کی طرف سورۃ سبا کی ایک آیت ہمیں متوجہ کرتی ہے۔ آیت یہ ہے: اَفَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ نَّشَاۡ نَخۡسِفۡ بِهِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ نُسۡقِطۡ عَلَيۡهِمۡ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ''کیا وہ اپنے آگے اور پیچھے کے آسمان اور زمین پر غور نہیں کرتے، اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان کے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں۔''

Marfat.com

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں آگے اور پیچھے سے مراد زمین و آسمان ہیں۔ یعنی اس بات سے ڈرو کہ زمین تمہارے سمیت دھنسا نہ دی جائے اور آسمان سے تم پر ٹکڑے نہ گرا دیے جائیں۔ لیکن یہ بدبخت متنبہ ہونے کی بجائے اعراض کرتے اور مزید نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿۴۶﴾

(ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے سامنے آتی ہے وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ ۴۶)

بگاڑ کی انتہا

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اللہ تعالیٰ کے دین سے روگردانی ان کی اس حد تک طبیعتِ ثانیہ بن چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیات میں سے کوئی آیت بھی ان کی نصیحت کے لیے پڑھی جائے یا اس کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی انہیں متنبہ کرنے کے لیے آجائے تو یہ بجائے اس کی طرف التفات کرنے کے اس سے اعراض کرتے ہیں۔ نہ آثارِ کائنات کی کوئی بات ان پر اثر انداز ہوتی ہے، نہ کوئی معجزہ اپنا اثر چھوڑتا ہے اور نہ تاریخی شواہد ہی انہیں متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ہوائے نفس کے اتباع نے انہیں بالکل پتھر میں تبدیل کر دیا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖۗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۴۷﴾

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا، تم تو بالکل ایک صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو۔ ۴۷)

اخلاقی کج روی اور بے حسی

گزشتہ آیات میں ان کے اعراض کے حوالے سے ان کی سنگدلی کو نمایاں کیا گیا کہ کوئی تذکیر ان پر اثر انداز نہیں ہوتی اور کوئی نصیحت ان پر کارگر نہیں ہوتی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ قبولیتِ حق کی استعداد سے تو محروم ہوئے ہی تھے، اخلاقی بے حسی کی بھی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ اہلِ عرب اپنی تمام تر گمراہیوں کے باوجود غریب پروری اور مہمان نوازی کو ایک بہت بڑی نیکی سمجھتے تھے۔ لیکن قرآنِ کریم کے مخالفین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے معروفات اور اپنی معاشرتی خوبیوں سے بھی تہی دامن ہو گئے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا کہ تمہیں اپنی دولت وثروت پر بڑا ناز ہے تو پھر اپنی دولت سے کچھ حصہ نکالو اور ان لوگوں پر صرف کرو جو نانِ شبینہ تک کے محتاج ہیں۔ تو حیرت کی بات ہے کہ وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی نے ہمیں دولت دی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے انہیں نادار رکھا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں بھی کھانے پینے کے وافر اسباب فراہم کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ کا انہیں محروم رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انہیں کھلانا پلانا نہیں چاہتا، بلکہ ان کی محرومی ہی اس کی مشیت کا تقاضا ہے۔ تو ہم اس کی مشیت کی خلاف ورزی کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ اگر وہ انہیں فاقوں میں دیکھ کر خوش ہوتا ہے تو ہم ان کو

Marfat.com

کیسے کھلا پلا سکتے ہیں۔ اور اگر ہم اس کی مشیت کے خلاف کریں گے تو یہ اسے ناراض کرنے کے مترادف ہوگا اور ہم اسے ناراض کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اندازہ کیجیے کہ انسانی عقل کیسی عیار ہے جب بگڑتی ہے تو بگاڑ کے کیسے کیسے دلائل ایجاد کرتی ہے۔ ایک عام آدمی بھی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو رزق خود ہاتھ بڑھا کر نہیں دیتا بلکہ اس کے مختلف اسباب ہیں جن کے ذریعے وہ رزق فراہم کرتا ہے۔ انہیں میں سے ایک ذریعہ اور سبب یہ بھی ہے کہ امراء کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غرباء کو ان کا حق دیں۔ لیکن جب دولت مند لوگ یہ حق ادا کرنے کی بجائے دولت پر قبضہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں تو غرباء کی غربت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات اتنی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ مقصود صرف ان کی شقاوت اور بدبختی اور قساوت اور سفاہت کو نمایاں کرنا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٨﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿٤٩﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٠﴾

(اور وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ قیامت کی دھمکی کب پوری ہوگی، اگر تم لوگ سچے ہو۔ ۴۸) یہ لوگ بس ایک ڈانٹ ہی کے منتظر ہیں جو انہیں آ پکڑے گی اس حال میں کہ وہ جھگڑ رہے ہوں گے۔ ۴۹) پس نہ تو وہ کوئی وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے اہلِ خانہ کی طرف پلٹ سکیں گے۔ ۵۰)

اَلْوَعْدُ سے مراد

ہم نے ترجمے میں اگرچہ اَلْوَعْدُ سے قیامت مراد لی ہے لیکن اس سے مراد عذاب بھی لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ مخالفین کو دونوں کے حوالے سے ڈراتے تھے کہ اگر تم ایمان نہ لائے اور تمہاری سرکشی بڑھتی چلی گئی تو ممکن ہے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک قیامت کا تعلق ہے وہ تو اپنے وقت پر آئے گی لیکن اس وقت تم ایمان سے تہی دامن ہونے کی وجہ سے جواب دہی میں کچھ کہہ نہیں پاؤ گے۔ اب اگر یہاں اَلْوَعْدُ سے عذاب ہی مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی حیرت انگیز آیات اور نہایت موثر دلائل سننے کے باوجود وہ ہمیشہ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں کہ جب تک ہم اپنی آنکھوں سے عذاب کو دیکھ نہیں لیتے اس وقت تک ہم اس کی خبر دینے والے کو سچا ماننے کے لیے تیار نہیں۔ حالانکہ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھتا ہے کہ اگر تمہیں عذاب دکھا بھی دیا جائے تو تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ کیونکہ عذاب کے آنے کے بعد نہ تو ایمان کی قبولیت کا اعتبار رہتا ہے اور نہ عذاب کا شکار ہونے والے اس قابل رہتے ہیں کہ وہ ایمان قبول کر سکیں۔

اگر اس سے مراد قیامت لی جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اور مخالفین کے درمیان جس طرح توحید کے حوالے سے دلائل کی جنگ جاری رہتی تھی اسی طرح آخرت بھی ایک نزاعی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہاں ان کی طرف سے قیامت کے مطالبے پر کسی دلیل کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا کیونکہ متعدد مواقع پر وقوعِ قیامت پر ایک سے ایک بڑھ کر دلائل دیے جا چکے تھے۔ لیکن وہ بار بار کج بحثی کا ثبوت دیتے تھے۔ اس لیے یہاں وقوعِ قیامت کا ایک منظر پیش کر دیا گیا ہے تاکہ ان کے دلوں میں اگر کچھ بھی قبولیت کی رمق باقی ہے تو اسے

Marfat.com

تحریک ہو سکے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے یا قیامت وہ ایک ایسا دھماکا یا ایک ایسی ڈانٹ ہوگی کہ انسان جس حال میں بھی ہوگا اسے دھر لیا جائے گا۔ لوگ اپنے معاملات میں جھگڑ رہے ہوں گے یا حق کے مقابلے میں ہنگامہ کر رہے ہوں گے کہ پکڑ لیے جائیں گے۔ اب انہیں اتنی مہلت بھی نہیں ملے گی کہ وہ کسی کو وصیت کر سکیں اور وہ اپنے اہلِ خانہ کی طرف پلٹنا چاہیں گے لیکن اس کا موقع بھی نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے کہ انہیں اس طرح اچانک پکڑ لیا جائے انہیں چاہیے کہ وہ زندگی سے فائدہ اٹھائیں اور آخرت کی تیاری کریں۔

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ

مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ
مَّرْقَدِنَا ٜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ كَانَتْ
اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَالْیَوْمَ
لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ اَصْحٰبَ
الْجَنَّةِ الْیَوْمَ فِیْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ عَلَى
الْاَرَآىِٕكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا یَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾
سَلٰمٌ ۫ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾
اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ
عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ
اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِیْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ
الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾ اَلْیَوْمَ
نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا

Marfat.com

كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ
فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا
مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٧﴾

رکوع: ۴۔ (اور صور پھونکا جائے گا تو وہ اچانک قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔ ۵۱) وہ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی، یہ کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھا کھڑا کیا۔۔ یہ تو وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔ ۵۲) بس وہ ایک ڈانٹ ہوگی پھر وہ اچانک سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔ ۵۳) پس آج کسی نفس پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا، اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے رہے ہو۔ ۵۴) بے شک آج جنت والے اپنی دلچسپیوں میں مشغول ہوں گے۔ ۵۵) وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔ ۵۶) ان کے لیے اس میں میوے ہوں گے اور ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ طلب کریں گے۔ ۵۷) ربِ رحیم کی طرف سے ان کے لیے سلام ہوگا۔ ۵۸) اور اے مجرمو! آج تم الگ ہو جاؤ۔ ۵۹) اور اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ ۶۰) اور یہ کہ میری ہی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔ ۶۱) اور اس نے تم میں سے ایک بڑی مخلوق کو گمراہ کر دیا، تو کیا تم عقل نہیں رکھتے! ۶۲) یہ ہے وہ جہنم جس سے تمہیں ڈرایا جاتا رہا ہے۔ ۶۳) جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اس کی پاداش میں آج اس میں داخل ہو جاؤ۔ ۶۴) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے، ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ ۶۵) اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے، پھر وہ راستے کی طرف سبقت کرتے تو کس طرح دیکھ پاتے۔ ۶۶) اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ پر ہی انہیں مسخ کر کے رکھ دیتے تو وہ نہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے لوٹ سکتے۔ ۶۷)

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿٥١﴾
(اور صور پھونکا جائے گا تو وہ اچانک قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔ ۵۱)

نفخۂ ثانیہ کے بعد کی کیفیت

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں آخری نفخہ کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ہر چیز تباہ و برباد ہو چکی ہوگی، ہر طرف زندگی کے آثار ختم ہو کر موت کا سناٹا ہوگا۔ پھر اچانک صور پھونکا جائے گا اور جہاں کہیں کوئی شخص دفن ہوا تھا یا موت کا شکار ہوا تھا اسے وہیں سے اٹھایا جائے گا اور وہ اٹھتے ہی میدانِ حشر میں اپنے رب کے سامنے حاضری کے لیے بے ساختہ چل پڑے گا۔

Marfat.com

قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾

(وہ کہیں گے: ہائے ہماری بدبختی! یہ کس نے ہمیں ہماری خوابگاہ سے اٹھا کھڑا کیا۔۔ یہ تو وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔ ۵۲)

اپنی خواب گاہوں سے اٹھنے والے سراسیمگی کے عالم میں چاروں طرف دیکھیں گے اور حیران ہوکر کہیں گے کہ ہمیں ہماری خواب گاہ سے کس نے اٹھا دیا ہے۔ وہ یہ گمان کررہے ہوں گے کہ ہم تو اپنی خواب گاہوں میں آرام کررہے تھے کہ شاید کسی خوفناک حادثے کی وجہ سے جاگ اٹھے ہیں۔ یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں کہ ان کی اس بات کا جواب کون دے گا، ممکن ہے وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاکر خود ہی اس نتیجے پر پہنچیں کہ یہ تو وہی قیامت کا آغاز ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار ذکر کرتے اور ہمیں متنبہ کرتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتوں کی طرف سے انہیں یہ کہا جائے کہ یہ وہی دن ہے اللہ تعالیٰ کے رسول جس کے بارے میں بار بار تمہیں آگاہی دیتے تھے اور تم اس کا ہمیشہ انکار کرتے تھے۔ آج دیکھ لو کہ رسولوں کی بات سچی نکلی اور تم اپنے تکبر اور سرکشی کی وجہ سے جس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے آج تم اسی سے دوچار کردیے گئے ہو۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

(بس وہ ایک ڈانٹ ہوگی پھر وہ اچانک سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کردیے جائیں گے۔ ۵۳)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس سے پہلے مخالفین کی یہ غلط فہمی دور کی گئی ہے کہ وہ موت کے بعد ہمیشہ کی نیند سو جائیں گے اور کبھی انہیں از سرنو اٹھنا نہیں ہوگا اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیے جائیں گے۔ اب ان کی ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا جائے یا وقوع قیامت سے وہ صرف اس لیے اسے بعید از عقل سمجھتے ہیں کہ ساری کائنات کا تباہ کرنا اور پھر از سرنو انہیں زندہ کرنا اور سب سے زندگی بھر کے اعمال کا حساب لینا یہ کوئی عقل میں آنے والی بات نہیں۔ اس کے لیے اسباب کی اتنی بڑی قوت چاہیے جسے عقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نہ قیامت کے لانے میں اللہ تعالیٰ کو کسی تیاری کی ضرورت ہے اور نہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کرکے میدانِ حشر میں لانے کے لیے اسباب کی فراہمی کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ڈانٹ کافی ہے جس سے سب لوگ زندہ ہوکر اللہ تعالیٰ کے حضور جانے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے جس طرح اللہ تعالیٰ نے کلمۂ کُن سے ہر چیز کو بنایا، اسی طرح وہ کلمۂ کُن سے ہی ہر چیز کو ختم کردے گا اور اسی ایک کلمے اور ایک ڈانٹ سے قیامت کو برپا کرسکتا ہے۔ جَمِیْعٌ کا لفظ کہہ کر یہ اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لیے کسی کو چھوڑا نہیں جائے گا بلکہ ہر چھوٹا بڑا، امیر اور مامور، عابد اور معبود سب اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر کردیے جائیں گے۔ اور مُحْضَرُوْنَ کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آج کے بڑے بڑے سرکش اور متکبر اس طرح اللہ تعالیٰ کے حضور لائے جائیں گے جیسے مجرم عدالت کے سامنے حاضر کیے جاتے ہیں۔

Marfat.com

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾

(پس آج کسی نفس پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا، اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے رہے ہو۔ ۵۴)

پروردگار کی طرف سے اظہارِ حقیقت

عدالت کے آغاز میں پروردگارِ عالم یہ پالیسی بیان جاری فرمائیں گے کہ آج ہماری عدالت میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ انبیاء واولیاء اور عباد وزہاد بھی اور فساق وفجار اور طواغیت وکفار بھی سب کے ساتھ یکساں انصاف ہوگا۔ آج عدلِ کامل کے ظہور کا دن ہے۔ ہر شخص اپنے اعمال کے ترازو میں تولا جائے گا۔ آج نسبتوں کی بجائے اعمال اور کردار کی عظمتیں اجاگر ہوں گی۔ ہر ایک کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو اس کے اعمال کا تقاضا ہوگا اور جزائے اعمال کا اثبات باقاعدہ اعتراف وشہود سے ہوگا۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ
مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾

(بے شک آج جنت والے اپنی دلچسپیوں میں مشغول ہوں گے۔ ۵۵) وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔ ۵۶) ان کے لیے اس میں میوے ہوں گے اور ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ طلب کریں گے۔ ۵۷) ربِ رحیم کی طرف سے ان کے لیے سلام ہوگا۔ ۵۸)

اہلِ جنت پر نوازشات

عدالت کی کارروائی شروع ہوگی تو سب سے پہلے ان مخلص وفاداروں کو یاد کیا جائے گا جنہوں نے زندگی کا ہر دکھ اسلام کی سربلندی کے لیے برداشت کیا۔ اور اپنی ہر خواہش اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی رضا پر قربان کردی۔ انہیں بلاحساب یا ہلکی حساب فہمی کے بعد جنت میں جانے کا حکم دیا جائے گا۔ انہیں دورانِ عدالت لمبے انتظار کی کوفت میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا جائے گا اور کفار کو بطورِ خاص ان کے ساتھ یہ سلوک دکھایا جائے گا اور جنت میں ان کی نعمتوں میں ڈوبی ہوئی زندگی اور خوش عیشی کی مسرتوں میں ان کی مشغولیت سے انہیں آگاہ کیا جائے گا تاکہ انہیں اندازہ ہوسکے کہ جن لوگوں کو انہوں نے دنیا میں ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور ہمیشہ ان کی غربت کا مذاق اڑایا، آج وہ اللہ تعالیٰ کے حضور کس قدر نوازے گئے ہیں۔

انسان کی فطرت ایسی ہے کہ وہ اپنی ہر خوشی کو نامکمل سمجھتا ہے جب تک اہلِ خانہ اس میں شریک نہیں ہوتے۔ اس لیے دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت اکیلے جنت کے مزے نہیں لوٹیں گے بلکہ وہ اور ان کی بیویاں جنت کی ہر دلچسپی اور مسرت میں ایک ساتھ ہوں گے۔ وہ جنت کے درختوں کے گھنے سائے میں ایک ساتھ محوِ خرام ہوں گے۔ اور جب جی چاہے گا تو بادشاہوں کی طرح مزین تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے مجلسی زندگی سے محظوظ ہوں گے۔

Marfat.com

وہ خوشی یقیناً نامکمل ہوتی ہے جس میں کام و دہن کی تواضع کا انتظام نہ ہو۔ اس لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ ان کے سامنے ایک سے ایک بڑھ کر پھل اور میوے پیش کیے جائیں گے۔ اور ان پھلوں میں تنوع اور لذت کا عالم یہ ہوگا کہ اہلِ جنت جس میوے اور پھل کی خواہش کریں گے اور جس لطف و لذت کا تصور کریں گے وہ ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو دنیا میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا، کہ وہ جو چاہے فوراً اسے مل جائے۔ اور جو چیز اسے ناگوار ہو وہ فوراً اس سے دور کر دی جائے۔ دنیوی زندگی میں اس کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن اہلِ جنت کو جنت میں یہ مقام و مرتبہ حاصل ہوگا اور وہ بھی ایک دو دن کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ان کے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اہلِ جنت کے دلوں کی آبادی اور ان کی روح کی خوشی اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے۔ یہی ان کا وہ سرمایہ ہے جس نے انہیں جنت کا مستحق بنایا اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے۔ انہیں خوب یاد ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں خوشخبری سنائی تھی اور قرآنِ پاک نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کی تھی کہ اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کے سلام کا اعزاز بخشا جائے گا۔ اس لیے اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ وہ جنت کی بیش بہا نعمتوں کے باوجود اس کی امید لگائے بیٹھے ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا انہیں سلام پہنچے گا اور کب ہم اس کے دیدار سے مشرف کیے جائیں گے۔ چنانچہ اہلِ جنت کی خوشیوں اور نعمتوں کو مکمل کرتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ اہلِ جنت کو ربِ رحیم کا سلام پہنچایا جائے گا۔ سورۃ الاحزاب میں اسی نعمت کے حوالے سے فرمایا گیا ہے: تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلَامٌ ''اور ان کا خیر مقدم جس دن وہ اس سے ملیں گے سلام سے ہوگا۔'' پیشِ نظر آیت بھی اسی مفہوم کی حامل ہے۔ احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے جنت کے تمام دروازوں سے داخل ہوں گے اور اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچائیں گے۔ اس خوشی اور سرمستی کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو محبت کی چاشنی سے آگاہ ہو اور جو اس بات کو سمجھ سکتا ہو کہ جس محبوب کی خواہشِ وصل میں عمر گزری ہو اس کی طرف سے سلام آنے کی لذت کیا ہے؟

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾

(اور اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔ ۵۹) اور اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ ۶۰) اور یہ کہ میری ہی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔ ۶۱) اور اس نے تم میں سے ایک بڑی مخلوق کو گمراہ کر دیا، تو کیا تم عقل نہیں رکھتے۔ ۶۲)

مجرموں کا حشر

اہلِ جنت کے معاملے کے بعد اب ان مجرموں کو عدالت میں طلب کیا جا رہا ہے جنہوں نے زندگی میں اللہ تعالیٰ سے سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ اس کو ماننے سے انکار کیا یا دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے رہے۔ انہیں سب سے پہلا یہ حکم دیا جائے گا کہ اے جرائم پیشہ لوگو! آج الگ ہو کر کھڑے ہو جاؤ، تم اس قابل نہیں ہو کہ تم عدالت میں بھی باایمان بندوں کے ساتھ کھڑے رہو۔ دنیا چونکہ

Marfat.com

دارالامتحان تھی اس لیے وہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے رہے۔ لیکن آج جزائے اعمال کا دن ہے اس لیے آج تم باایمان بندوں کے ساتھ کھڑے نہیں رہ سکتے بلکہ الگ ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور دوسرا مطلب اس کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم ایک گروہ اور جتھے کی صورت میں اکٹھے ہو کر کھڑے مت ہو۔ تمہارے جتھے اور پارٹیاں توڑ دی گئی ہیں، تمہارے آپس کے تمام رشتے کاٹ دیے گئے ہیں۔ اب تم میں سے ہر شخص کو اپنی ذاتی حیثیت میں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہوگی۔

ان مجرموں کو اسی تنبیہ سے اندازہ ہو جائے گا آج ہمارے ساتھ کیا گزرنے والی ہے۔ اس لیے وہ جاننا چاہیں گے کہ ان کا اصل جرم کیا ہے۔ ان کو زیادہ دیر اس انتظار میں نہیں رہنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ اے آدم کے بیٹو! کیا ہر نبی اور رسول کے واسطے سے ہمیشہ تم پر یہ بات واضح نہیں کی گئی تھی کہ شیطان تمہارا دشمن ہے کہ وہ تمہارے جدِ امجد کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ اسے اپنی سرکشی اور حماقت پر افسوس ہوتا وہ حضرتِ آدم کی دشمنی پر تل گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا چونکہ آدم کی وجہ سے ہوا ہے اس لیے میں اولادِ آدم سے اس کا انتقام لوں گا۔ اور میں ہر طرف سے اور ہر میدان میں اور ہر طریقے سے اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے فیصلے کے مطابق کبھی اس میں کوتاہی نہیں کی۔ اس لیے تمہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان مختلف طریقوں سے تمہیں بہکائے گا، دیکھنا اس کی پیروی نہ کرنا اور کبھی اس کی بندگی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ نہ اس کی عبادت کرنا، نہ اس کی اطاعت کرنا۔ اور زندگی کے ہر معاملے میں صرف میری اطاعت، میری پرستش اور میری بندگی کرنا، میرے سامنے سر جھکانا، میرے احکام کی تعمیل کرنا، میری نازل کردہ شریعت کے مطابق اپنا آئین اور دستور بنانا اور میرے رسول کی سنت کے مطابق اپنا طرزِ عمل طے کرنا۔ یہی وہ سیدھا راستہ ہے جس پر چل کر تم مجھ تک پہنچ سکتے ہو۔ لیکن تم ایسے بدنصیب ثابت ہوئے کہ میری تمام تر تنبیہات کے باوجود تم نے شیطانی وساوس کے در آنے اور اس کی سازشوں کے پہنچنے کے راستے بند نہ کیے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ شیطان تمہارے اندر سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیا تم اتنی عقل نہیں رکھتے ہو کہ اپنے دوست اور دشمن میں امتیاز کر سکو۔ اور تمہارے اندر اتنی حمیت نہیں کہ جس نے تمہارے جدِ امجد کو جنت سے نکلوایا تم اس کی دشمنی کو یاد رکھتے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیتے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

(یہ ہے وہ جہنم جس سے تمہیں ڈرایا جاتا رہا ہے۔ ۶۳) جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اس کی پاداش میں آج اس میں داخل ہو جاؤ۔ ۶۴)

میرے رسول میری طرف سے برابر تمہیں تمہارا عہد یاد دلاتے رہے۔ شیطان کی دشمنی کو تمہارے سامنے مبرہن کرتے رہے اور اس کی بندگی اور پیروی کے انجام سے تمہیں باخبر کرتے رہے۔ لیکن تم نے ان کی ایک بھی سن کر نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان ایک خلقِ کثیر کو تم میں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تو اب جہنم کی صورت میں اس کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ اس لیے اب اس کے سوا تمہارے سامنے اور کوئی راستہ نہیں کہ تم اپنے کرتوتوں کی پاداش میں اس جہنم میں داخل ہو جاؤ، اب یہی تمہارا ٹھکانا ہے۔ اب اس میں نہ تمہارا گریہ و بکا کام آئے گا اور نہ تمہاری دعائیں سنی جائیں گی۔

Marfat.com

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

(آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کردیں گے، ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ ۶۵)

اسلوب کی تبدیلی کا سبب

اوپر کی آیات میں اسلوبِ کلام خطاب کا تھا۔ اس آیت میں غائب کا ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کی آیات میں انہیں زجر و ملامت کی جارہی تھی۔ اس کے لیے موزوں اسلوب خطاب ہی کا تھا۔ اب اس آیت میں قریش اور دیگر مخالفین کے سامنے ان کا انجام واضح کیا جارہا ہے تاکہ یہ لوگ اس سے سبق سیکھیں۔ اور یہ بھی دکھایا جارہا ہے کہ ان کی زبانیں بھی تمہاری زبانوں کی طرح دنیا میں قینچی کی طرح چلتی تھیں۔ اور کسی کی بات انہیں سننا گوارا نہ تھی۔ اب ان کی بے بسی کو دیکھو کہ وہ سخن سازی سے کام لینا چاہیں گے اور اپنے گناہوں سے مکر کر جان چھڑانے کی فکر میں ہوں گے لیکن وہ ایسا نہیں کرپائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کردیں گے۔ اور ان کے ہاتھ پاؤں کو ہم قوتِ گویائی بخشیں گے۔ ان کی زبانیں چونکہ جھوٹ بولنے کی عادی ہیں اس لیے انہیں تو بند کردیا جائے گا۔ البتہ ہاتھ پاؤں وہی کچھ بتائیں گے جو ان سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ جب ان کے اعضاء و جوارح ان کے خلاف گواہی دے کر حجت قائم کردیں گے تو پھر ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہے گا۔

یہاں اگرچہ صرف ہاتھ اور پاؤں کے بولنے کا ذکر ہے لیکن قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں اور ان کی کھالوں کے بولنے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ حم السجدہ آیت ۲۰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے: حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. بعض جگہ زبانوں کے گواہی دینے کا بھی ذکر آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مونہوں پر اور زبانوں پر تو مہر کردی جائے گی وہ بول نہیں سکیں گے، البتہ زبانیں اپنے مالک کے تمام کرتوتوں کو ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کے سامنے بیان کریں گی یعنی زبان والا اپنی مرضی سے نہیں بول سکے گا، اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بولے گا، اور ٹھیک ٹھیک گواہی دے گا۔ اور سورۃ رحمٰن میں بتایا گیا ہے کہ ان گواہیوں کے پورا ہوجانے کے بعد مجرموں کو ان کی چوٹیوں اور ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾

(اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے، پھر وہ راستے کی طرف سبقت کرتے تو کس طرح دیکھ پاتے۔ ۶۶) اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ پر ہی انہیں مسخ کرکے رکھ دیتے تو وہ نہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے لوٹ سکتے۔ ۶۷)

Marfat.com

حیرت انگیز بات اور تنبیہ و تہدید

ان دو آیتوں میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں لیکن ان میں سے پہلے ایک بات یہ ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ مخالفین کی انتہا درجہ مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رحمت ان سے منہ نہیں موڑتی۔ اور اس وقت تک ان کو مہلت دی جارہی ہے جب تک ان سے قبولیت کی استعداد کا آخری امکان ختم نہیں ہو جاتا۔ اور پھر مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت کے سامنے ایسی کوئی روک بھی نہیں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی گرفت میں تاخیر ہو رہی ہو۔ چنانچہ اسی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ مخالفین کا حال تو یہ ہے کہ ہم نے جو ان کو صلاحیتیں دے رکھی ہیں ان سے وہ کوئی کام لینے کی بجائے بری طرح انہیں پامال کر رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم ان کی آنکھوں کو مٹا دیتے۔ یعنی ان سے بصارت سلب کر لیتے۔ اور پھر یہ راستے کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے۔ اور ان کو کہیں راہ نہ ملتی۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تا کہ وہ آخری حد تک بصارت سے فائدہ اٹھائیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنے حسب حال دیکھ کر اس کے دین کی طرف بڑھیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنی جن صلاحیتوں اور قوتوں کے بل بوتے پر اللہ تعالیٰ کے دین کی مخالفت کر رہے ہیں اور اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی کاوشوں کو ناکام کر دیں گے۔ کاش! کبھی انہیں یہ خیال ہوتا کہ ہم اگر چاہیں تو ہم انہیں ان کی جگہ پر ہی مسخ کر کے رکھ سکتے تھے۔ نہ ان کی آنکھیں کام دیتیں، نہ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ اٹھاتیں۔ وہ ایک پاگل اور مفلوج آدمی کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے۔ نہ وہ کہیں آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے پلٹ سکتے۔ یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے ان کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ اور اگر ہم ایسا کرنے کا ارادہ کر لیتے تو ان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ ہمارے ارادے میں حائل ہو جاتے۔ اب بھی ان کے پاس موقع ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس مہلت اور رحمت سے فائدہ اٹھائیں اور اس کی عطا کردہ صلاحیتوں کا حق پہچانیں اور اپنے رب کی شکرگزاری کرتے ہوئے اس کے رسول کا دامن تھام لیں۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا
يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿٦٩﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٠﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا
فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا

Marfat.com

يَأْكُلُونَ ﴿٧٢﴾ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾ وَاتَّخَذُوا
مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لَعَلَّهُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٧٤﴾ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ
وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُحْضَرُونَ ﴿٧٥﴾ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّا نَعْلَمُ مَا
يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٦﴾ أَوَلَمْ يَرَ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ
فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ ﴿٧٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ
مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ
مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٧٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ
الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ ﴿٨٠﴾ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ
الْعَلِيمُ ﴿٨١﴾ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾
فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٣﴾

رکوع: ۵۔ (اور جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں تو ہم پیچھے لوٹا دیتے ہیں اس کو اس کی خلقت میں، تو کیا وہ سمجھتے نہیں۔ ۶۸) اور ہم نے (اپنے نبی کو) شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور یہ اس کو زیب بھی نہیں دیتی، یہ تو ایک یاددہانی ہے اور نہایت واضح قرآن ہے۔ ۶۹) تاکہ ان لوگوں کو خبردار کردے جن کے اندر زندگی ہے اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے۔ ۷۰) کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے، پس وہ ان کے مالک ہیں۔ ۷۱) اور ہم نے انہیں ان کا مطیع کر دیا، پس ان میں سے بعض ان کی سواریاں ہیں اور بعض کا وہ گوشت کھاتے ہیں۔ ۷۲) اور ان میں ان کے لیے دوسرے فوائد اور مشروبات ہیں، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ ۷۳) اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں اس امید پر کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ ۷۴) وہ ان کی کوئی مدد نہیں کرسکیں گے بلکہ وہ ان کی حاضر کی ہوئی فوج بنیں گے۔ ۷۵) پس آپ کو

Marfat.com

غمگین نہ کرے ان کی کوئی بات، ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۶) کیا انسان دیکھتا نہیں کہ ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو پھر وہ ایک کھلا ہوا جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا۔ ۷۷) اور اس نے ہم پر ایک پھبتی چست کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، کہتا ہے کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہو جائیں گی۔ ۷۸) اے پیغمبر! کہہ دیجیے ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کو جاننے والا ہے۔ ۷۹) وہی ہے جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے آگ جلا لیتے ہو۔ ۸۰) کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان کی جیسی مخلوق پیدا کر دے، کیوں نہیں، اور وہی اصل پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ ۸۱) بلاشبہ اس کا معاملہ بس یہ ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۸۲) پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۸۳)

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾

(اور جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں تو ہم پیچھے لوٹا دیتے ہیں اس کو اس کی خلقت میں، تو کیا وہ سمجھتے نہیں۔ ۶۸)

گزشتہ دھمکی پر انسانی زندگی کے احوال سے دلیل

گزشتہ دو آیتوں میں مخالفین کو دھمکی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جن قوتوں کو وہ راہِ راست پر صرف کرنے کی بجائے خواہشاتِ نفس کی تکمیل اور اسلامی دعوت کو ناکام کرنے میں صرف کر رہے ہیں، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم ان کی بینائی سلب کر لیتے اور انہیں ہر طرح سے مسخ کر کے عضوِ معطل بنا کے رکھ دیتے، تا کہ لوگ انہیں دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ لیکن ان لوگوں کی حماقتوں کا کیا کہنا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں اور قوتوں کو اپنی مِلک سمجھتے اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی دسترس سے باہر سمجھتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ ہم جو چاہیں کریں ہمیں کوئی پوچھنے اور پکڑنے والا نہیں۔ چنانچہ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے خود انسان کی اپنی زندگی کے احوال و مشاہدات سے دلیل دی جا رہی ہے کہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ انسان کو گندے پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا جاتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں گزرنے والی احوال و کیفیات کو چھوڑ دو، وہ دنیا میں آنے کے بعد بھی ایک مضغۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ حواس سے بے بہرہ، عقل سے محروم، ہر طرح کے احساس سے عاری۔ اسے یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ ماں باپ جو میرے وجود کا باعث ہیں وہ کون ہیں، کسی کی پہچان نہیں ہوتی۔ پھر قدرت اسے بتدریج طاقت اور توانائی بخشتی ہے۔ حتیٰ کہ جوانی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد وہ قوت اور توانائی کا پیکر بن جاتا ہے۔ پھر جیسے جیسے ان قوتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عہدہ و منصب کی ہیبتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں تو وہ بالکل بھول جاتا ہے کہ دنیا میں میری آمد ایک بے بس بچے کی طرح ہوئی تھی اور آج جبکہ اپنے آپ کو قوتوں اور توانائیوں کا سرچشمہ دیکھ رہا ہوں یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کی دَین ہے۔ چنانچہ وہ اسی بے خودی اور مستی میں اپنے آپ کو بندہ سمجھنے کی بجائے فرعون اور نمرود سمجھنے لگتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ میری اس حالت پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ اور میری یہ فرمانروائی ہمیشہ باقی رہے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت ایک تدریج کے ساتھ اپنا کام کرتی ہے کہ

Marfat.com

توانائی کی جگہ ناتوانی اترنے لگتی ہے۔ بلند ہمتی اور اولوالعزمی کی بجائے گوشۂ عافیت میں بیٹھ رہنا بھلا معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب ہوش وحواس جواب دینے لگتے ہیں اور تاب وتواں پر مردنی طاری ہونے لگتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے ارشادفرمایا: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً (الروم: ۵۴)

''اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ناتوانی سے، پھر ناتوانی کے بعد اس نے توانائی بخشی پھر توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا۔''

کتنے لوگ ہیں جن پر جسمانی ضعف وناتوانی کے ساتھ ساتھ ہوش وحواس اور شعور وخرد میں بھی ضعف کا شکار ہوتے ہیں، وہ شخص جو کل تک دانشور کہلاتا تھا اور لوگ اس کے فکری سرمائے کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے وہ جب اس ارذل العمر کو پہنچتا ہے تو اس کی دانشوری جواب دے جاتی ہے اور وہ اپنی بعض حرکتوں میں بالکل بچوں کی سطح پر اتر جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں کرسکتا کہ یہ شخص بھی کبھی فکر ودانش کی مملکت کا تاجدار رہا ہو۔ قرآنِ کریم نے اس کی تصویر کھینچتے ہوئے فرمایا: وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (النحل: ۷۰) ''اور تم میں بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو ارذل العمر کو پہنچائے جاتے ہیں یہاں تک وہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتے۔''

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی صورتحال سے استدلال کیا گیا ہے کہ جس پروردگار کی قدرت کا عالم یہ ہے کہ وہ بے بس بچے کو وقت کے ساتھ ساتھ قوت اور طاقت کا سرچشمہ بنا دیتا ہے اور پھر اسی جوانِ رعنا کو بتدریج بڑھاپے میں مبتلا کر کے فکری افلاس اور جسمانی ناتوانی کی علامت بنا دیتا ہے۔ کیا اس کے لیے یہ بات مشکل ہے کہ تم اپنی جس قوت وہیبت پر ناز کر رہے ہو اور اپنے جن حواس کو اپنی ہیبت کا ذریعہ سمجھتے ہو وہ ان سب کو سلب کرلے کہ تم نہ کوئی چیز دیکھ سکو، نہ سن سکو اور نہ کہیں اپنی جگہ سے حرکت کرسکو۔ یہ وہ کیفیت ہے جو تم بڑھاپے تک پہنچنے والے لوگوں میں بالعموم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ یہ کس قدر سامنے کی بات ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ سمجھنے سوچنے سے محروم ہوگئے ہیں۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۟ۙ (۶۹) لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۷۰)

(اور ہم نے (اپنے نبی کو) شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور یہ اس کو زیب بھی نہیں دیتی، یہ تو ایک یاددہانی ہے اور نہایت واضح قرآن ہے۔ ۶۹) تاکہ ان لوگوں کو خبردار کردے جن کے اندر زندگی ہے اور کافروں پر حجت تمام ہوجائے۔ ۷۰)

ہم پہلی آیت کی تشریح میں کچھ کہنے کی بجائے وہ تصریحات نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں جو سورۃ الشعراء کی آیات ۲۲۴ تا ۲۲۷ کی تشریح کے ضمن میں لکھوا چکے ہیں۔

آنحضرت ﷺ پر شاعر ہونے کے الزام کی تردید

مخالفین جس طرح آنحضرت ﷺ کو کاہن قرار دیتے تھے اور جس کی تردید ہم گزشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں، اسی طرح وہ آپ ؐ کو شاعر بھی قرار دیتے تھے حالانکہ ان کا وہ بالائی طبقہ جو شعر فہمی میں ایک مقام رکھتا تھا اس نے کبھی آنحضرت ﷺ کو شاعر قرار نہیں دیا اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ کیا قرآنِ کریم شعر کی زبان میں نازل ہوا ہے تو وہ اسے شعر کہنے سے بھی گریز کرتے تھے۔ البتہ جس بات نے انہیں مجبور کیا کہ قرآنِ کریم کو شاعری کی کتاب اور آنحضرت ﷺ کو ایک شاعر قرار دیں وہ یہ بات تھی کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی نبوت کی

Marfat.com

دلیل کے طور پر قرآنِ کریم کو پیش کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں کیونکہ مجھ پر قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی کتاب نازل ہوئی ہے۔ اور پھر قرآنِ کریم کے اعجاز کو قرآن اور اپنی حقانیت کی دلیل ٹھہرایا اور چیلنج کیا کہ اگر تم قرآن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں سمجھتے تو پھر اس کی مثال لا کر دکھاؤ۔ تو اب ان کے لیے آنحضرت ﷺ کی نبوت سے انکار کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی تھی کہ وہ قرآنِ کریم کے اعجاز اور اس کی فصاحت و بلاغت کو شعر کا نتیجہ قرار دیں اور آنحضرت ﷺ کو شاعر ثابت کریں۔ اور لوگوں کو یہ کہہ کر مطمئن کریں کہ تم جس کتاب کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے اسے آسمانی کلام ماننے پر مجبور ہو رہے ہو اس کی یہ فصاحت و بلاغت کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جو ہمیں شاعروں کے کلام میں نظر آتی ہے۔ اس لیے محمد (ﷺ) پیغمبر نہیں بلکہ شاعر ہیں۔ البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ قرآنِ کریم میں جو فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے اس کا جواب کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد (ﷺ) سب سے بڑے شاعر ہیں، لیکن یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اس قرآن کی دلیل کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

آپ ؐ کو شاعر قرار دے کر وہ ایک اور پہلو سے بھی آپ ؐ کی نبوت کے بارے میں لوگوں میں بدگمانیاں پیدا کرتے تھے۔ وہ یہ کہ شاعروں کے بارے میں عام طور پر اہلِ عرب یہ تصور رکھتے تھے کہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ تو محمد (ﷺ) چونکہ ایک شاعر ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ بھی ایک جن لگا ہوا ہے جو ان پر خوبصورت کلام اِلقاء کرتا ہے۔ محمد (ﷺ) کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ کوئی فرشتہ ہے حالانکہ یہ ویسا ہی جن ہے جیسا ہر بڑے شاعر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں تین کسوٹیاں رکھ دی ہیں جس پر پرکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کسی شاعر کا کلام ہے یا کلامِ ربانی ہے۔ اور اس کا سنانے والا کوئی شاعر ہے یا اللہ تعالیٰ کا رسول۔

فیصلہ کن تین کسوٹیاں

پہلی کسوٹی یہ پیش کی گئی ہے کہ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح کوئی کلام بھی اس بات سے پہچانا جاتا ہے کہ اس نے اپنے زیرِ اثر لوگوں کو کس طرح کی سیرت و کردار سے آراستہ کیا ہے اور اس کے پڑھنے اور سننے والے اپنے اندر کیسے خصائل رکھتے ہیں۔ شعراء اور ان کا کلام آپ کے سامنے ہے اور ان کے پڑھنے والوں کی زندگیاں بھی آپ کے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح محمد (ﷺ) نے جن لوگوں کو اپنی تعلیم و تربیت سے جس رنگ میں رنگا ہے، وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ دونوں کا تقابل کر کے دیکھ لو۔ اگر تو دونوں کی زندگیوں کا رنگ ایک جیسا ہے، ان کے طور اطوار یکساں ہیں، ان کے اہداف ملتے جلتے ہیں، ان کے اعمال ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ واقعی دونوں شاعر ہیں اور دونوں کا کلام یکساں ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راست بازی اور خدا ترسی ہے، بات بات میں ذمہ داری کا احساس ہے، برتاؤ میں لوگوں کے حقوق کا پاس و لحاظ ہے، معاملات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے۔ اور دوسری طرف شعراء کے ساتھی گمراہ، اوباش، عیاش اور شر پسند قسم کے لوگ ہیں جن کی زندگیاں فسق و فجور سے عبارت ہیں، جن کا سب سے بڑا ہدف عشق بازی اور شراب نوشی ہے اور جن کی دلچسپیاں حُسن پرستی، شہوانیت اور جنسی مواصلت کے گرد گھومتی ہیں، جنہوں نے قوم کو اتفاق و اتحاد کی دولت دینے کی بجائے ہمیشہ بکر و تغلب کی لڑائیوں جیسے فسادات میں مبتلا کیا ہے، جو اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رو میں بہنے والے اور لطف و لذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ

Marfat.com

ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو کر بھی نہیں گیا کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند تر نصب العین بھی ہے۔ تو ان دونوں کرداروں کو دیکھ کر اور زندگی کے ان دو نمونوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں نمونے یکساں ہیں اور جس کلام کے زیرِ اثر یہ دو الگ الگ نمونے تیار ہوئے ہیں اس کلام کا منبع و مصدر ایک ہی ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

دوسری کسوٹی جس پر پرکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کا پیش کرنے والا اللہ تعالیٰ کا رسول ہے یا وہ ایک عظیم شاعر اور قرآنِ کریم شاعری کی کتاب ہے۔ یہ ہے کہ ان شاعروں کا حال یہ ہے کہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں یعنی ان کا توسنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ان کے فکر کی کوئی بنیاد نہیں۔ جس طرح ہر درخت اپنی جڑ سے پھوٹتا ہے، آہستہ آہستہ تنا بنتا ہے، پھر اس سے شاخیں پھوٹتی ہیں اور برگ و بار لاتا ہے لیکن وہ اپنی جڑ سے کبھی بے نیاز نہیں ہوتا اور نہ اس کے پھل اس کی حقیقت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ یہی حال انسان کا بھی ہے کہ اگر اس کے عقائد متعین ہیں، اس کی سوچ کا راستہ مقرر ہے، اس کی منزل طے شدہ ہے، اس کے اہداف واضح ہیں وہ ایک طرح کے طور اطوار اور خصائل و شمائل کو پیدا کرتا ہے۔ اس کے افراد میں کتنی بھی وسعت پیدا ہو جائے، اس کے معاملات کی پختگی، اس کی معاشرت کی شائستگی اور اس کے اخلاق کے پیمانوں میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ قرآنِ کریم دل و دماغ کو ایک متعین فکر فراہم کرتا ہے۔ وہ انسان کو صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے، ایمان و عمل اس کی پہچان بن جاتی ہے، خدا ترسی، ہمدردی و غمگساری سے انسانی معاملات میں شائستگی پیدا کرتا ہے۔ گہری نظر سے دیکھنے والا اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ معاشرہ اپنی ایک جڑ رکھتا ہے، یہ قبیلہ اپنا ایک نسب رکھتا ہے، اس کی دنیا متعین آداب سے عبارت ہے جبکہ شعراء کے یہاں کوئی متعین راستہ نہیں، کوئی فکری نظام نہیں، جذبات یا خواہشات و اغراض کی ہر نئی روان کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے، ان کے جہاز کا لنگر کسی چٹان سے بندھا ہوا نہیں، ان کے خیالات کی کشتیاں طبیعت سے اٹھنے والی لہروں کے ساتھ اپنا راستہ بدلتی رہتی ہیں، ایک لہر اٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں، دوسری لہر آئی تو اسی زبان سے انتہائی گندے سفلی جذبات کا ترشح شروع ہو گیا، جس کو چاہا آسمان پر چڑھا دیا، جسے چاہا قعرِ مذلت میں گرا دیا، خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حُسنِ اخلاق اور بد اخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو در پہلو ملے گا۔ آپ کسی شاعر کو پڑھتے ہوئے کبھی یہ محسوس کریں گے کہ میں ایک شیطان کو پڑھ رہا ہوں، اور کبھی یوں محسوس ہوگا کہ میں کسی روحانی رہنما کو پڑھ رہا ہوں۔ انہیں ایسی باتیں کہتے ہوئے کبھی کسی روک کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب\
تجھے ہم ولی سمجھتے ہیں جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایسے عظیم دو فرقوں کے حامل کلاموں کو اگر کوئی شخص ایک کہتا ہے یا دونوں کو ایک ہی نام دیتا ہے تو یہ ایک ایسی جسارت ہے جسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

یہ تیسری کسوٹی ہے جس پر قرآنِ کریم اور شعراء کے کلام کو پرکھا جاسکتا ہے کہ شاعر گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ کردار سے انہیں کوئی خاص نسبت نہیں ہوتی۔ ان کے دعووں کو دیکھو تو ہر میدان کے لاجواب آدمی معلوم ہوتے ہیں، لیکن عمل کی دنیا میں دیکھو تو بالکل صفر دکھائی دیتے ہیں۔ جن مکارمِ اخلاق کی تعریف میں وہ آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں ان پر عمل کرنے کی انہیں کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس پیغمبر کو دیکھو کہ وہ جو کلام پیش کر رہے ہیں اس کا سب سے بڑا عملی نمونہ وہ خود ہیں۔ آپ کا جاننے

Marfat.com

والا ہر شخص گواہی دیتا ہے کہ آپ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ آپ کے قول وفعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہ کرسکتا تھا۔ آپ نے جس بندگی رب، جن مکارم اخلاق اور جس ایثار وقربانی کی دعوت مخلوق کو دی اس پر سب سے زیادہ عمل خود کر کے دکھایا۔ تو ایسے قدسی صفات شخص کو ان شاعروں کی صف میں کھڑا کرنا جن کے اقوال واعمال میں ادنیٰ مطابقت بھی نہیں ہے، بہت بڑی زیادتی ہے۔

ایک ضروری بات

ان آیات کو پڑھتے ہوئے ایک بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآنِ کریم کی تنقید دورِ جاہلیت کے شعراء پر ہے شعر یا فنِ شعر پر نہیں۔ قرآنِ کریم اور آپ نے اس دور کے شعراء پر تنقید اس لیے کی ہے کہ ان کی شاعری جن مضامین سے لبریز تھی اسلام انہیں برائیوں، گمراہیوں اور بداخلاقیوں سے روکنے کے لیے آیا تھا۔ شعر دورِ جاہلیت میں اہلِ عرب میں ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ ایک مؤثر شاعر اپنی شاعری سے بعض دفعہ قوم میں آگ لگا دیتا تھا اور اس کے اشعار کے اثر سے لوگوں کے تنِ مردہ میں زندگی کا خون دوڑنے لگتا تھا۔ چنانچہ ایسا مؤثر ذریعۂ ابلاغ اگر برائی کی ترویج کے لیے وقف ہو کر رہ جائے تو اس سے بڑی نقصان دہ چیز اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اور اس دور کے شعراء نے اتنی مؤثر صلاحیت کو جن باتوں کے لیے وقف کر رکھا تھا ان کی حیثیت انسانیت کے لیے سمِ قاتل سے کم نہ تھی۔ ان کی شاعری کے بیشتر مضامین شہوانیت، عشق بازی، شراب نوشی یا قبائلی منافرت، جنگ وجدل یا نسلی فخر وغرور پر مشتمل تھے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں کہیں خال خال پائی جاتی تھیں۔ چونکہ وہ لوگ فضائلِ اخلاق سے بہت حد تک تہی دامن ہوچکے تھے اس لیے ان کی شاعری جھوٹ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، طعن وتشنیع، مشرکانہ خیالات اور قبائلی تفاخر میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ اور شاعری کی تاثیر کی وجہ سے یہ عیوب ان کی سیرت وکردار کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری اور ایسے شاعروں کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کبھی تحسین کی نگاہ سے نہ دیکھ سکتے تھے بلکہ اس کو یکسر بدل ڈالنا یا ختم کردینا ان کے مشن کا بنیادی جز تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایسی ہی شاعری کے بارے میں فرمایا لَاَنْ یَّمْتَلِئَ جَوْفُ اَحَدِکُمْ قَیْحًا خَیْرٌلَّہٗ مِنْ اَنْ یَّمْتَلِئَ شِعْرًا ”تم میں سے کسی شخص کا پیٹ پیپ سے بھر جائے، اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے۔“

ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ یہ بات کسی حد تک مسلمہ ہے کہ مبالغہ شعر کا ایک لازمی وصف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شعر میں اگر مبالغہ نہ ہو تو اس میں شعریت یا شعری حُسن پیدا نہیں ہوتا۔ اور ادھر حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی دنیا میں اظہارِ حقیقت اور راست گوئی کا نمونہ بن کر آتا ہے۔ وہ اگر تعریف کرتا ہے تو حقیقت سے آگے نہیں بڑھتا اور اگر کسی پر تنقید کرتا ہے تو صداقت سے نیچے نہیں گرتا۔ اس کی ذات، اس کی ہر بات اور اس کا ہر عمل انسانوں کے لیے میزان کی حیثیت رکھتا ہے جس کا کوئی پلڑا نہ اٹھتا ہے اور نہ جھکتا ہے۔ اسی لیے اس کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ اس تقابل کو دیکھ کر بڑی آسانی سے یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو شعر سے مناسبت کیوں نہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شعر گوئی کی صلاحیت کیوں نہ عطا فرمائی۔ سورۃ یٰسٓ میں پروردگار نے اس کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے فرمایا وَمَا عَلَّمْنٰہُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ ”ہم نے آپ کو شعر نہیں سکھایا اور نہ یہ آپ کے کرنے کا کام ہے۔“ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو شعر سے دلچسپی نہ تھی۔ دورانِ گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبانِ مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے یا اس میں الفاظ کا الٹ پھیر ہوجاتا۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دورانِ تقریر میں آپؐ نے شاعر کا مصرع یوں نقل کیا:

Marfat.com

کفی بالاسلام و الشیب للمرء ناهیا

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! اصل مصرع یوں ہے:

کفی الشیب و الاسلام للمرء ناهیا

اور بھی اس طرح کی کئی مثالیں روایات میں موجود ہیں۔ ایسے موقعوں پر حضرت ابوبکر صدیقؓ عام طور پر عرض کرتے، یارسول اللہ! شعر اس طرح نہیں بلکہ اس طرح ہے۔ تو آپؐ فرماتے کہ بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپؐ نے اچھے اشعار کو ہمیشہ پسند فرمایا، اور اچھے شعراء کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور آپؐ نے یہ اصولی بات فرمائی: حسن الشعر کحسن الکلام قبیحه کقبیح الکلام ''اچھا شعر اچھے کلام کی طرح ہے اور برا شعر برے کلام کی طرح ہے۔'' دوسری حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: ان من الشعر لحکمة ''بعض اشعار میں بڑی دانائی کی باتیں ہوتی ہیں۔''

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ''بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے جنہوں نے نیک اعمال کیے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا، اور انہوں نے بدلہ لیا اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، اور عنقریب جان لیں گے جنہوں نے ظلم وستم کیے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے۔''

شانِ نزول

شعراء پر تنقیدی آیات کے نزول کے بعد حضرت حسان ابن ثابتؓ، عبداللہ بن رواحہؓ، کعب بن مالکؓ اور کعب بن زہیرؓ روتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! شاعروں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل کی ہیں ہم بھی تو شاعر ہیں، ہم تو ہلاک ہو گئے، ہماری نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے پیشِ نظر آیتِ کریمہ نازل فرمائی۔ اس میں ان شعراء کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہیں۔

چار خصوصیات کے حامل شعراء کا استثناء

جن میں پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مومن ہوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کی کتابوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی شاعری کا ایک ہدف متعین ہو جائے گا۔ خیالات کی ہر لہر کے ساتھ شعر گوئی کی قوت حرکت میں نہیں آئے گی بلکہ ان کا ہر شعر کلمۂ حق کی حمایت اور ذکرِ الٰہی کی سربلندی میں کام آئے گا۔ وہ دل و دماغ اور اپنی زبان کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور امانت سمجھیں گے۔ انہیں اس بات کا یقین ہوگا کہ میری زبان سے جو شعر نکلے گا وہ قیامت کے دن میزان کا تول بنے گا اور مجھے اس کا جواب دینا ہوگا۔ اور پھر میرے شعر کی تاثیر سے اثرات مرتب ہوں گے مجھے اس کی ذمہ داری کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔

دوسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ ایمان کے ساتھ ساتھ عملِ صالح کی دولت سے بھی مالا مال ہوں گے۔ وہ ایمان لا کر چونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی غیر مشروط اطاعت کا عہد کر چکے ہیں، اس لیے ان کی پوری زندگی تقویٰ اور عملِ صالح سے عبارت ہوگی۔ وہ فسق و فجور کا

Marfat.com

ارتکاب کریں گے اور نہ ان کے اشعار فسق کی تبلیغ سے آلودہ ہوں گے۔ وہ ان تمام اخلاقی بندشوں کو اپنے اخلاق کی زنجیر بنا دیں گے جنہیں شریعت نے ان پر لازم کیا ہے۔ اور انہیں مکارمِ اخلاق کو وہ اپنے شعری قوت سے لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنے کی کوشش کریں گے۔

تیسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو یاد کریں گے۔ اپنے عام حالات اور اوقات میں بھی اور اپنے کلام میں بھی۔ ان کی زندگی ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی اور ایک ہی طرزِ عمل سے عبارت ہوگی۔ ان کی شاعری میں انہیں چیزوں کا اظہار ہوگا جو اسلامی تعلیمات نے ان کے حوالے کی ہیں اور ان کی زندگی میں وہی چیزیں چلتی پھرتی دکھائی دیں گی جن کا وہ اپنی شاعری میں اظہار کریں گے۔ ان کی زندگی میں ثنویت نہیں ہوگی کہ شخصی زندگی تو زہد وتقویٰ سے آراستہ ہو لیکن کلام سراسر رندو ہوسناکی سے لبریز ہو۔ جیسے ہمارے یہاں بعض ایسے محترم شاعر گزرے ہیں جنہوں نے شراب خانہ خراب کو کبھی منہ نہیں لگایا، لیکن ان کی شاعری میں شراب کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بڑا بادہ خوار کوئی نہیں ہوگا۔ اور ان کی زندگی کا یہ رنگ بھی نہیں ہوگا کہ وہ شعر میں بڑی حکمت و معرفت کی باتیں کریں اور ایسا لگے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کا ان سے بڑھ کر مبلغ کوئی نہیں، مگر ان کی ذاتی زندگی کو دیکھیے تو اس میں یادِ خدا کے آثار تک نظر نہ آئیں۔ اسلام جس طرح اپنے ماننے والوں کو متعین اہداف دیتا ہے، اسی طرح انہیں اسی منزل کا مسافر بھی بناتا ہے، ان کی تمام زندگی کا سفر اسلام ہی کی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ نہ کبھی منزل بدلتی ہے اور نہ کبھی سفر کی جہت تبدیل ہوتی ہے۔ یہ یکسانی اور یک رنگی ان شاعروں کی خصوصیت ہے جن کا یہاں ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

چوتھی خصوصیت ان شعراء کی یہ ہے کہ چونکہ ان کے جذبات و احساسات بھی اسلام کا رنگ اختیار کر چکے ہیں، ان کو اسی بات پر غصہ آتا ہے جو اسلام کی نگاہ میں بری ہے اور اسی بات پر خوشی ہوتی ہے جو اسلام کی نگاہ میں اچھی ہے۔ ان کا دادو دہش اسلام کے حوالے سے ہوتا ہے اور ان کا انتقام اور انتصار بھی اسلام ہی کے حوالے سے متشکل ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی کی تعریف کرتے ہیں تو اسلام کی خاطر اور کسی کی ہجو کہتے ہیں تو اسلام کی خاطر۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ جو تمام ذاتی، نسلی اور قومی عصبیتوں سے ہاتھ اٹھا چکے تھے، اب ان کا بالکل یہ حال ہو گیا تھا جس کی تصویر حالی نے کھینچی ہے:

بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی
شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم، نرما گئے وہ
جہاں کردیا گرم، گرما گئے وہ

مسلمان شعراء کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ وہ اپنی تمام تر طلاقتِ لسانی اور شعری مہارت کے باوجود اپنی اس صلاحیت کو کبھی شخصی اغراض کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ البتہ جب ان پر کوئی ظلم کرتا یا نسلی یا قومی عصبیتوں کی آگ بھڑکاتا یا آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا یا اسلامی تعلیمات کو ہجو و طعن کا نشانہ بناتا تھا، تو پھر اسلام کے حق میں اور باطل سے انتقام لینے کے لیے ان کی زبانیں حرکت میں آتی تھیں اور وہ اپنی زبانوں سے وہی کام لیتے تھے جو ایک مجاہد تیرو نشتر سے کام لیتا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ شعرائے کفر جب اسلام اور نبی کریم ﷺ کے خلاف الزامات کے طوفان اٹھاتے اور نفرت و عداوت کی آگ بھڑکاتے تھے تو اس کا جواب دینے کے لیے آنحضرت ﷺ شعراءِ اسلام کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے ایک موقع پر حضرت کعب بن مالکؓ سے فرمایا:

Marfat.com

اهجهم فوالذی نفسی بیده لهو اشد علیهم من النبل ''ان کی ہجو کہو کیونکہ اس اللہ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمہارا ہر شعران کے حق میں تیر سے زیادہ تیز ہے۔'' حضرت حسان ابن ثابتؓ کے لیے مسجدِ نبوی میں منبر رکھا جاتا تھا اور وہ کافر شعراء کا جواب دیتے تھے۔ اور آنحضرت ﷺ انہیں دعاؤں سے نوازتے تھے۔ ابوسفیان اسلام لانے سے پہلے آنحضرت ﷺ کی ہجو کہا کرتا تھا۔ ایک دن اس کی ہرزہ سرائی کے جواب میں حضرت حسانؓ نے جو اشعار کہے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَاَجَبْتُ عَنْهُ وَعِنْدَاللّٰهِ فِیْ ذَاکَ الْجَزَاءُ

وَاِنَّ اَبِیْ وَوَالِدَتِیْ وَعِرْضِیْ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْکُمْ وِقَاءُ

اَتَشْتِمُهٗ وَلَسْتَ لَهٗ بِکُفْءٍ فَشَرُّکُمَا لِخَیْرِکُمَا الْفِدَاءُ

لِسَانِیْ صَارِمٌ لَاعَیْبَ فِیْهِ وَبَحْرِیْ لَاتُکَدِّرُهُ الدِّلَاءُ

''اے ابوسفیان! تونے میرے محبوبؐ کی جناب میں نازیبا باتیں کیں اور میں اس ہجو کا تمہیں جواب دے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں مجھے اس کی جزائے خیر ملے گی۔''

''سنو! تمہاری بدزبانی سے حضورؐ کی عزت کو بچانے کے لیے میرا باپ، میری ماں اور میری عزت بطور سپر کام دیں گے یعنی میں اپنے باپ، اپنی ماں اور اپنی عزت تک کو حضورؐ کی عزت پر قربان کردوں گا۔''

''تو اس کی جناب میں نازیبا بات کہتا ہے جس کا تو ہم پایہ نہیں ہے۔ تم دونوں میں سے جو برا ہے وہ اس پر فدا ہو جو تم میں سے اچھا ہے۔''

''میری زبان تیز تلوار ہے اس میں کوئی نقص نہیں ہے اور میرا بحرِ فصاحت اتنا گہرا ہے کہ ڈول نکالنے سے وہ مکدر نہیں ہوتا۔''

آیت کے آخری حصہ میں ظالموں کے انجام کی خبر دی گئی ہے اور یہاں ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے سراسر زیادتی سے کام لیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ پر کبھی شاعر ہونے کا الزام لگاتے تھے اور کبھی کاہن ہونے کا۔ تاکہ لوگ آپ کی نبوت کے بارے میں یکسو نہ ہوسکیں۔ اور اسلام کو آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے۔ انہیں وارننگ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ عنقریب جان لیں گے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے اور وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

قرآن کے نزول کا مقصد

دوسری آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ کی بعثت اور قرآنِ کریم کے نزول کا مقصد بیان فرمایا گیا ہے کہ آپؐ دنیا میں شعر و شاعری کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ہدایت دینے کی غرض سے ان کے برے انجام سے انذار کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ لیکن اس انذار اور آگاہی کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول کی غیر معمولی شخصیت اور قرآنِ کریم کی غیر معمولی فصاحت و بلاغت اور آپ کی انتہا درجہ محنت و مشقت اور ہمدردی و خیر خواہی کی ضرورت ہے اور اس کے بغیر دعوت الی اللہ کا کام ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا اور انسانوں کے لیے انذار بے فائدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری ضرورت یہ ہے کہ جن لوگوں کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول مبعوث ہوتا ہے اور شب و روز ان کی اصلاح کے لیے کوشش کرتا ہے وہ لوگ ایسے نہ ہوں جن میں ہوائے نفس کے اتباع اور سفلی

Marfat.com

جذبات میں ڈوبے رہنے کے باعث انسانی قدریں دم توڑ چکی ہوں اور وہ لوگ اس بنیادی احساس سے محروم ہو چکے ہوں کہ انسان کا کوئی خالق و مالک بھی ہے اور اس نے انسانوں کو یقیناً ایک مقصدِ زیست دے کر پیدا کیا ہے۔ اس لیے جب تک اس بات کی خبر نہ ہو کہ وہ مقصدِ زیست کیا ہے اور انسانوں کا خالق و مالک کن باتوں سے خوش ہوتا اور کن باتوں سے ناراض ہو جاتا ہے اور انسانی زندگی کی بھلائی کے لیے وہ بنیادی عقائد و نظریات اور وہ مکارمِ اخلاق کیا ہیں جو انسانوں کی انسانیت اور ان کے باہمی حقوق و آداب کی ادائیگی کی ضمانت بن سکتے اس وقت تک پیغمبر کی غیر معمولی دعوت بھی حد درجہ تسخیر و تاثیر رکھنے کے باوجود کامیابی سے محروم رہتی ہے۔ اور جن لوگوں میں یہ مذکورہ بالا خصوصیات ہوتی ہیں وہی لوگ ہیں جنہیں یہاں حَیٌّ کے لفظ سے یاد فرمایا گیا ہے۔ حَیٌّ کا معنی ہے زندہ۔ اور انسان کی زندگی سانس کی آمد و رفت کا نام نہیں۔ اور نہ عمدہ خوراک اور زرق برق لباس کا نام ہے۔ بلکہ زندہ انسان وہ ہے جس کا ضمیر زندہ ہے جو اپنے مقصدِ حیات سے وابستہ ہے۔ جس میں قبولیتِ حق کا شعلہ بجھا نہیں۔ جو نصیحت کے جواب میں صورتِ حجر نہیں بلکہ زندہ ضمیر لے کر حاضر ہوتے ہیں اور جن کی فطرت زندہ ہے۔ یہی لوگ ہیں جن پر انذار اثر انداز ہوتا ہے جن کے بارے میں قرآنِ کریم نے کہا اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (یٰسٓ: ۱۱) ''تم انہیں کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان دیں اور بن دیکھے خدا سے ڈریں۔'' اسی کے بارے میں اقبال کہتا ہے:

اے دلِ زندہ کہیں تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے اور اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی ہے کہ آپ کی دعوت کے نتیجے میں صرف وہی لوگ حق کو قبول کریں گے جن کے دل زندہ ہیں یعنی ان کے اندر حقیقی روحانی اور معنوی زندگی باقی ہے۔ لیکن آپ کا انذار سب کے لیے ہے۔ جو دلِ زندہ سے محروم ہو چکے ہیں آپ انذار انہیں بھی کریں۔ لیکن ان سے حق کی قبولیت کی امید نہ رکھیں یا کم از کم ان کے عدمِ قبولیت سے آپ دل گرفتہ نہ ہوں کیونکہ انہوں نے اپنے کرتوتوں سے اپنے آپ کو اس دولت سے محروم کر لیا ہے۔ البتہ آپ کے انذار سے فائدہ یہ ہوگا کہ ان پر اتمامِ حجت ہو جائے گا اور وہ قیامت کے دن یہ بہانہ نہ کر سکیں گے کہ ہمیں کسی نے انذار نہیں کیا تھا۔ اگر ہمیں ڈرایا جاتا یا سمجھایا جاتا تو یقیناً ہم بھی آج صاحبِ ایمان لوگوں میں ہوتے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾

(کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے، پس وہ ان کے مالک ہیں۔ ۷۱) اور ہم نے انہیں ان کا مطیع کر دیا، پس ان میں سے بعض ان کی سواریاں ہیں اور بعض کا وہ گوشت کھاتے ہیں۔ ۷۲) اور ان میں ان کے لیے دوسرے فوائد اور مشروبات ہیں، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے! ۷۳)

Marfat.com

کفار کی سرکشی کے مقابلے میں رحمت کے اسلوب میں دلائلِ ربوبیت

گزشتہ آیت میں ہم یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری صرف اس لیے تھی کہ آپ لوگوں کو ہدایت قبول نہ کرنے کے نتیجے میں جس صورتحال سے اولاً تو دنیا میں اور ثانیاً آخرت میں سابقہ پیش آنے والا ہے اس سے آپ لوگوں کو انذار کریں۔ یعنی آپ ڈرائیں دھمکائیں اور خبردار کریں۔ لیکن پروردگار کی رحمت چونکہ ہمیشہ ہر چیز پر محیط رہتی ہے اس لیے وہ انتہائی ناراضگی کی حالت میں بھی برہمی کا اظہار کرنے کی بجائے اپنی نعمتوں کا ذکر فرما کر ان کی بند طبیعتوں کو کھولنے کی ایک صورت پیدا فرماتا ہے۔ گزشتہ آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ قرآنِ کریم سے کوئی فائدہ اٹھانے کی بجائے اسے شاعری قرار دے رہے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کو شاعر کہہ کر لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ جس فصیح و بلیغ کلام سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتے ہیں وہ وحیِ الٰہی نہیں بلکہ کمال درجے کی شاعری ہے اور آپ اس دور کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کے کلام سے متاثر ہونے کا نتیجہ یہ تو ہوسکتا ہے کہ انہیں ایک بڑا شاعر سمجھا جائے لیکن اس کا کوئی جواز نہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا رسول مان لیا جائے۔ اندازہ کیجیے کہ یہ موقع ایسا ہے کہ پروردگار کی طرف سے شدید برہمی کا اظہار ہونا چاہیے کیونکہ قرآنِ کریم کو شاعری قرار دینا اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کا انکار یہ ایک ایسی جسارت ہے جو نا قابلِ معافی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانا ہے کہ برہمی کے اظہار کی بجائے دلوں میں نئی جوت جگانے کے لیے فرمایا جارہا ہے کہ نادانو! اور کچھ نہیں تو تم اپنے مویشیوں پر ہی غور کرو جن سے تم گوناگوں فائدے اٹھاتے ہو۔ انہیں کسی اور کی کمالِ صنعت نے پیدا نہیں کیا بلکہ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں۔ اور اس کی انتہا درجہ کی کرم فرمائی ہے کہ اس نے ان جانوروں کو اپنے کمالِ تخلیق سے پیدا فرمایا اور پھر تمہارے حوالے کرکے تمہیں ان کا مالک بنادیا۔ اولاً تو جانوروں کی تخلیق بجائے خود اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اظہار ہے اور پھر مزید یہ کہ بیشتر جانور انسان سے زیادہ قوت و طاقت کے مالک ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح پیدا فرمایا ہے کہ گائے اور بھینس دودھ دیتی ہیں تو کبھی انکار نہیں کرتیں۔ اونٹنی دودھ بھی دیتی ہے اور باربرداری کی خدمت بھی انجام دیتی ہے اور عرب کے صحرا میں جہاں کئی دنوں تک پانی نہیں ملتا وہ بغیر کھائے پیے اس صحرا کو سامان اور اپنے مالک سمیت اٹھائے ہوئے لے جاتی ہے اور کبھی اپنے مالک سے سرتابی نہیں کرتی۔ بیل رہٹ بھی کھینچتے ہیں اور باربرداری کا کام بھی کرتے ہیں۔ بھیڑ بکریاں اللہ تعالیٰ نے اس طرح پیدا کی ہیں کہ وہ سر جھکائے ہروقت انسان کی ضرورتوں کے لیے قربان ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انسان کے کتنے فوائد ہیں جو ان جانوروں سے وہ حاصل کرتا ہے۔ کہیں دودھ کی لسی بن رہی ہے، کہیں دہی تیار ہورہا ہے، کہیں گھی نکالا جارہا ہے پھر اس سے مختلف قسم کے کھانے تیار ہورہے ہیں، مختلف مٹھائیاں بن رہی ہیں، کہیں انسان ان کے بالوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے، کہیں ان کی کھالوں سے خیمے بنائے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی ہڈیاں اور بول و براز بھی منفعت سے خالی نہیں۔ ان میں سے ہر نعمت انسان کے لیے نہ صرف لذیذ ہے بلکہ خوشگوار اور صحت بخش بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف توجہ دلا کر سوال کرتا ہے کہ کیا ان تمام نعمتوں کے مقابلے میں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دے رکھی ہیں ان پر کوئی حق عائد نہیں ہوتا۔ یقیناً انسانی فطرت، انسانی عقل اور انسانی اخلاق اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جس محسن نے ایسی گراں قدر نعمتوں سے گراں بار کر رکھا ہے یقیناً اس کا یہ حق ہے کہ اس کی شکرگزاری اور فرماں برداری کی جائے۔ اپنی نیازمندی اور شکرگزاری میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے اور اس کی رضا کے خلاف کبھی سوچنے کی زحمت بھی نہ کی جائے۔ اپنی ہمتوں اور طاقتوں کو اسی کے احکام کی بجاآوری میں صرف کیا جائے اور دل ہمیشہ اپنے محسن کی محبت سے سرشار رہیں۔

Marfat.com

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٧٤﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿٧٥﴾

(اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں اس امید پر کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ ۷۴) وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے بلکہ وہ ان کی حاضر کی ہوئی فوج بنیں گے۔ ۷۵)

مخالفین کے دلوں کی سنگینی

مخالفین کے دلوں کی سختی اور قبولیتِ حق سے اعراض کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا جس طرح ذکر فرمایا اور انسانوں پر کی جانے والی بے شمار نعمتوں کا حوالہ دے کر انہیں اپنے شکر کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ حق کی طرف لپکتے اور اپنی سرکشی اور تمرد کو ختم کر کے اللہ تعالیٰ کے عاجز بندے بن جاتے۔ بصورتِ دیگر وہ اپنے انجام سے ڈرتے اور ان پر سراسیمگی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے اثر قبول کرنے کی بجائے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کچھ معبود بنا لیے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر بالفرض قیامت آ ہی گئی اور جواب دہی کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا پڑا تو یہ ہمارے معبود ہمیں اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچا لیں گے۔ پروردگار ان کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے فرما رہا ہے کہ نادانو! وہ تمہاری کیا مدد کریں گے، وہ اس قابل کہاں کہ تمہاری مدد کو پہنچیں۔ البتہ جب تم سے تمہاری ان مشرکانہ زندگی کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا تو یہی تمہارے معبود تمہارے خلاف اس لشکر میں حاضر ہوں گے جو تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ مجرموں کی صف میں کھڑے ہوں گے تو جن قوتوں کو انہوں نے اپنا معبود بنا رکھا تھا انہیں بھی ان کے ساتھ کھڑا کیا جائے گا۔ کیونکہ دنیا میں یہ جھوٹے معبود اپنے نام نہاد پرستاروں کی پرستش ہی سے اپنے وجود اور بقا کے ضامن تھے۔ اگر یہ لوگ ان کا پراپیگنڈا نہ کرتے اور خلقِ خدا کو ان کا گرویدہ نہ بناتے تو کوئی انہیں پوجنے والا نہ ہوتا۔ اس لیے یہ ان کے لشکر کے طور پر ان کے ساتھ پکڑے جائیں گے۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٦﴾

(پس آپ کو غمگین نہ کرے ان کی کوئی بات، ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۶)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ کیونکہ حق و باطل کی کشمکش میں مخالفین کی طرف سے اٹھتا ہوا طوفانِ مخاصمت جس میں استہزا، اتہامات، اعتراضات اور خرافات کے بے شمار بگولے ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی طرف بڑھ رہے ہیں تو اس کا طبیعت پر اثر ہونا ایک فطری بات ہے۔ بالخصوص اس بات کا اندازہ کر کے کہ میں اللہ تعالیٰ کا آخری رسول ہوں اور مجھے ایک ایسا کامیاب انقلاب برپا کرنا ہے جس سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں حال یہ ہے کہ مخالفت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، کسی کا ایمان لانا جان

Marfat.com

پر کھیلنے کے مترادف ہوگیا ہے۔ایسی صورتحال میں وہ تبدیلی کیسے آئے گی جس کی آرزو میں میں شب وروز محنت کررہا ہوں۔اس پر تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ آپ کی مخالفت میں جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں آپ اس کا ہرگز اثر قبول نہ کریں۔کیونکہ اولاً تو الزامات لگانے والے بھی جانتے ہیں کہ ان کے الزامات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔وہ جب تنہائی میں آپس میں بیٹھتے ہیں تو آنحضرت کی صداقت کا اعتراف کرتے ہیں لیکن دشمنی انہیں تسلیم کرنے سے روکتی ہے۔اور دوسری یہ بات کہ ان کا مقابلہ صرف آپ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہے۔وہ آپ کے خلاف چاہے کیسی بھی صورتحال پیدا کردیں لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کو وہ کبھی چیلنج نہیں کرسکتے۔ان کی خفیہ اور علانیہ ہر طرح کی کاوشوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔جس طرح اس کا علم لامحدود ہے اسی طرح اس کی قدرت اور حکومت بھی ہر طرح کی حدود سے ماورا ہے۔وہ جس طرح ہر بات کو جانتا ہے اسی طرح ہر بات کا تدارک کرنے کی بھی قوت رکھتا ہے۔تو جب ان کی ہر تدبیر اور ہر سازش کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور آپ اسی کے کام میں شب وروز لگے ہوئے ہیں اور دشمن اسی کام کی وجہ سے آپ کے ساتھ دشمنی کررہا ہے تو پھر آپ کے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔اللہ تعالیٰ خود اس کا انتظام فرمائیں گے بس آپ اس پر بھروسا رکھیں وہ دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تنہا کافی ہے۔

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷۷﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ﴿۷۸﴾

(کیا انسان دیکھتا نہیں کہ ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو پھر وہ ایک کھلا ہوا جھگڑالو بن کر کھڑا ہوگیا۔ ۷۷) اور اس نے ہم پر ایک پھبتی چست کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، کہتا ہے کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہوجائیں گی۔ ۷۸)

مخالفین کو اوقات یاد دلائی گئی ہے

تسلی کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ قریش اور دوسرے لوگ آپ کی مخالفت میں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے آپ کو دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔کیونکہ جب کوئی انسان یا کوئی معاشرہ اخلاق کی حدود کو پامال کردیتا ہے اور ہدایت کی ہر بات سے منہ موڑ لیتا ہے تو ایسے معاشرے سے بڑی سے بڑی بات کا صدور بھی قابلِ تعجب نہیں ہوتا۔ان لوگوں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ یہ اللہ کریم پر بھی پھبتیاں کسنے کی جسارت سے باز نہیں آتے۔حالانکہ ان کی اپنی حیثیت یہ ہے کہ ان کا ہر چھوٹا بڑا آدمی گندے پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوا، پھر ماں کے پیٹ میں بھی اسے خون سے غذا دی جاتی رہی ہے، پھر وہ پیدا ہوا تو ایک مضغۂ گوشت کے سوا کچھ نہ تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ کے احسانات نے جیسے جیسے اس کو گراں بار کیا ویسے ویسے وہ اللہ تعالیٰ کا کھلم کھلا دشمن بنتا چلا گیا۔اور دشمن بھی ایسا جس کی زبان کو کوئی روک نہیں۔کسی عظمت کا خوف کسی بڑائی کا احساس اسے بڑی سے بڑی بات کہنے سے نہیں روکتا۔اور ان ہی میں سے بعض لوگوں کی جرأت کا عالم یہ ہے کہ وہ اللہ کریم کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت میں بھی شبہ ہے۔وہ قیامت کے وقوع کو اس لیے خلافِ عقل سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی تبدیلی اور اتنی بڑی تباہی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بہت بڑی چیز ہے۔ابنِ عباسؓ، قتادہؒ اور سعید بن جبیرؒ کی روایات سے ان لوگوں کے ہذیان اور جسارتوں کا اندازہ ہوتا ہے جن میں یہ واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ کفارِ مکہ کے سرداروں میں سے ایک شخص

Marfat.com

قبرستان سے کسی مردے کی ایک بوسیدہ ہڈی لیے ہوئے آ گیا اور اس نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اسے توڑ کر اور اس کے منتشر اجزاء ہوا میں اڑا کر آپ سے کہا: اے محمد! (ﷺ) تم کہتے ہو کہ مردے پھر زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ بتاؤ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا ادنیٰ تصور بھی موجود ہو تو وہ کسی ایسی بے ہودہ بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی بات کا جواب دیا گیا ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۗ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۙ ﴿۷۹﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجیے ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کو جاننے والا ہے۔ ۷۹)

مخالفین کے اعتراض کا جواب

آخرت میں از سرِ نو زندگی پر کفار کا اعتراض دو وجہ سے تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہزاروں سال میں فنا کے گھاٹ اتر جانے والی مخلوق جن کا ریشہ ریشہ اور ذرہ ذرہ ہوا میں اڑ چکا ہے اور جن کے جسم کا کوئی حصہ محفوظ نہیں، آخر انہیں دوبارہ زندہ کیسے کیا جائے گا؟ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ کوئی شخص کہاں مرا، کہاں اس کی قبر بنی اور اس کی لاش مٹی ہو کر کہاں کہاں پھیل گئی اور مٹی کے ذرات اڑ کر کہاں کہاں پہنچے؟ اس پوری تفصیل کو ایک فرد کے حوالے سے آخر کون جان سکتا ہے اور مزید کہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ کہی جاتی ہے کہ ہر شخص کا نامۂ عمل اس کے ہاتھوں میں دیا جائے گا گویا ان کی زندگی بھر کے اعمال کا ریکارڈ محفوظ ہوگا جو اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا۔ اندازہ کیجیے کیا ایسی بات کو عقل تسلیم کر سکتی ہے۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں باتوں کا اس آیتِ کریمہ میں جواب دیا۔ پہلی بات کے جواب میں فرمایا کہ تمہیں انسانوں کے از سرِ نو پیدا ہونے یعنی دوبارہ اٹھائے جانے پر اعتراض ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس ذاتِ بابرکات نے پہلی دفعہ انسانوں اور دیگر مخلوقات کو پیدا کیا تو یہ تخلیق کا عمل اگر ہم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے تو یقیناً کوئی بھی ہزاروں سال میں پیدا ہونے والی مخلوقات کے بارے میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی ذات اتنا بڑا کام بھی انجام دے سکتی ہے۔ لیکن اب جبکہ کائنات اپنی وسعتوں سمیت ہمارے سامنے ہے اور انسانی زندگی کے مظاہر بھی ہمارے سامنے ہیں تو ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں کوئی تأمل نہیں۔ لیکن یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے تخلیقی عمل پر تو کسی شبے کا اظہار نہیں کرتے لیکن اسی تخلیقی قوت سے دوبارہ کام لینے پر ہمیں عقلی استبعاد آ پکڑتا ہے۔ آخر یہ کیسی منطق ہے کہ جو کام پروردگارِ عالم ایک دفعہ کر چکے ہیں اور ہزاروں سال سے وہ کام جاری ہے آخر اسے دوبارہ کیوں نہیں کر سکتے۔

دوسری بات کا جواب یہ دیا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پناہ ہے اسی طرح اس کا علم بھی حدود سے ماوراء ہے۔ نہ اس کی تخلیقی قوت کے سامنے کوئی رکاوٹ حائل ہو سکتی ہے، اور نہ اس کے علم کے لیے کوئی چیز روک بن سکتی ہے۔ جس طرح وہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اسی طرح وہ ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ انسانی وجود کے ذرات کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ زمین کیا کمی کرتی رہی ہے اور کیا اضافہ کرتی رہی ہے۔ جن چیزوں کی حفاظت بلکہ تصور بھی انسانی علم کے لیے ناممکن ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علمی کمال کے سامنے بہت معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ سورۃ ق میں ارشاد فرمایا گیا ہے: قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ "زمین ان کے اندر سے جو کچھ کم کرتی ہے ہم اس کو جانتے ہیں اور ہمارے پاس سارا ریکارڈ رکھنے والی ایک کتاب

Marfat.com

ہے۔'' اسی طرح پروردگارِ عالم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان نے کیا کارنامے انجام دیے ہیں، کن اعمال کا ارتکاب کیا ہے، کہاں کہاں اس کی آمد و رفت رہی ہے، کس کس سے تعلق رہا ہے اور کہاں کہاں اس کے معاملات کی دنیا پھیلی ہوئی ہے؟ کیونکہ وہ ہر مخلوق کو جاننے والا ہے اور انسانوں کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے باہر نہیں۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

(وہی ہے جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے آگ جلا لیتے ہو۔ ۸۰)

ضد سے ضد کا ظہور

تمہیں اس بات میں استبعاد نظر آتا ہے کہ موت سے زندگی کیسے نکل سکتی ہے، ضد سے ضد کا ظہور کیسے ہو سکتا ہے، خزاں سے بہار کیسے پھوٹ سکتی ہے۔ اسی لیے تمہیں انسانوں کا دوبارہ جی اٹھنا بعید از عقل معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ ضد سے ضد کا ظہور تمہارے اپنے مشاہدات کا حصہ ہے۔ کیا آج کی دنیا میں پانی سے بجلی پیدا نہیں کی جاتی، کوئلے سے سفید دھاگا نہیں نکالا جاتا۔ چلیے اسے تو آپ مشینوں کا عمل سمجھ لیجیے لیکن قرآنِ کریم نے ایک ایسی مثال دی ہے جو نزولِ قرآن کے وقت انسانی تجربے کا حصہ تھی۔ پہاڑوں اور صحرا میں رہنے والے بدو اور صحراؤں کے مسافر دو ہرے بھرے درختوں کی ٹہنیوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر آگ نکالتے تھے یعنی ان سے چقماق کا کام لیتے تھے۔ جب ان ٹہنیوں کو آپس میں ٹکرایا جاتا تھا تو ان سے آگ کے شعلے جھڑنے لگتے تھے اور یہ کوئی افسانہ نہیں، یہ دو درخت ''مرخ'' اور ''عفار'' کے نام سے صحراؤں اور پہاڑوں میں پائے جاتے تھے۔ اور دورِ جاہلیت کے ادب میں اس کا عام تذکرہ موجود تھا۔ الکامل للمبرد میں مختلف اشعار میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور حماسی شاعر بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔ اگر ان دو درختوں کی سرسبز ٹہنیوں سے آگ کے شعلے جھڑ سکتے ہیں اور یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے انسانوں کو دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا۔

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ٭ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۱﴾

(کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان کی جیسی مخلوق پیدا کر دے، کیوں نہیں، اور وہی اصل پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ ۸۱)

مسلّمات سے دلیل

سابقہ آیت کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے سوالیہ انداز میں فرمایا اور اس سوال کی بنیاد مشرکین کے مزعومات اور مسلّمات پر رکھی۔ کیونکہ مشرکین اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا بلکہ تمام کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور اس کے سوا کسی میں یہ قدرت نہیں کہ وہ کائنات کی تخلیق کر سکے۔ چنانچہ ان کے اس اعتقاد کو سوال کی صورت دیتے ہوئے فرمایا کہ کیا وہ

Marfat.com

ذات جس کے بارے میں تمہیں اعتراف ہے کہ وہ زمین اور آسمانوں کا خالق ہے اور کائنات کی ہر چیز اسی کی تخلیق سے وجود میں آئی ہے تو کیا وہ زمین اور آسمانوں اور کائنات کو بنانے کے بعد صفتِ تخلیق سے محروم ہوگیا یا وہ مسلسل تخلیق کے عمل سے تھک گیا اور تنگ آ گیا ہے جبکہ کائنات پر غور و فکر کرنے والے اس بات کے داعی ہیں:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

اگر اس کی صفتِ تخلیق ویسے ہی تروتازہ، شگفتہ اور شاداب ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ زمین و آسمان کو تباہ کرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہ کر سکے جبکہ کسی چیز کو پہلی دفعہ وجود دینا دوسری دفعہ کے وجود دینے سے مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جب ایک چیز کامیابی سے تخلیق کے مراحل سے گزر جاتی ہے تو پھر اس کا اعادہ کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن قیامت کے منکرین کا عجیب حال ہے کہ وہ کائنات کی ایک ایک چیز کا خالق اللہ تعالیٰ کو جانتے ہیں لیکن قیامت کی صورت میں تمام کائنات کی تباہی اور پھر از سرِ نو زندگی بپا ہونے کو مستبعد از عقل سمجھتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا عالم یہ ہے کہ وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ خلاق ہے۔ نہ اس کی تخلیقی قوت میں پہلے کوئی کمی تھی اور نہ اب ہے، اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح مخلوقات کی تباہی کے بعد وہ خوب جانتا ہے کہ کوئی شخص کس سرزمین میں مرا، اس کے اجزاء کہاں بکھر گئے، اور اس کے ذرات ہوا کے دوش پر کہاں کہاں پہنچے۔ کیونکہ وہ خلاق ہونے کے ساتھ ساتھ علیم بھی ہے اور علیم میں بھی خلاق کی طرح مبالغے کے ساتھ ساتھ استمرار اور دوام بھی پایا جاتا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾

(بلاشبہ اس کا معاملہ بس یہ ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۸۲)

مخالفین کی ایک غلط فہمی کا ازالہ

قیامت کو مشرکین کے بعید از عقل سمجھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہیں اس بات کا ادراک نہیں ہو رہا تھا کہ اتنی وسیع کائنات کا اچانک ٹوٹ جانا اور پھر از سرِ نو وجود میں آ جانا اور پھر ہر شخص کو نئی زندگی کا مل جانا اور سب کا محشر میں پہنچ کر اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا، یہ کیسے ممکن ہے۔ اتنی بڑی تبدیلی اور اتنے وسائل کی فراہمی کیسے ممکن ہے۔ چنانچہ ان کی کوتاہ فکری کا رد کرتے ہوئے پروردگار ارشاد فرما رہا ہے کہ قیامت کا برپا کرنا ہو یا کوئی اس سے بھی بڑا کام، اللہ تعالیٰ کو اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کرنا پڑتی۔ مشرکین چونکہ اس کی قدرتوں اور اس کی صفات کو اپنے امکانات اور اپنی صلاحیتوں پر قیاس کرتے ہیں اس لیے ان کو دشواری پیش آ رہی ہے جبکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ اسے وقوع پذیر ہو جانے کا حکم دیتا ہے۔ اسے اس کے لیے نہ کہیں سرمایہ فراہم کرنا پڑتا ہے نہ میٹریل ڈھونڈنا پڑتا ہے نہ اس کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے۔ بس وہ ایک حکم دیتا ہے اور ہر چیز حکم کے مطابق وجود میں آ جاتی ہے یا اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی سب سے بڑی قدرت اور قوت کا نام اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کا حکم اور اس کی تعمیل کی حقیقت کیا ہے، اس کا تعلق سراسر اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے۔ ہمارے سامنے اس کے مظاہر ہیں کہ زمین اور آسمان اور ان میں بے شمار کُرّے اور بے شمار مخلوقات اور پھر ان کی زندگی، بقا کے امکانات اور ہر مخلوق کی زندگی کے لیے اسباب کی فراہمی یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وجود میں آ رہا ہے اور ہم

Marfat.com

اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔لیکن ان میں سے ہر چیز کے وجود اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے درمیان جو نقطۂ اتصال ہے اس سے ہم بے خبر ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وسیع علم کا حصہ ہے۔اور چونکہ قرآنِ کریم میں اس کا ذکر ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تشابہات میں داخل ہے۔

فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾

(پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۸۳)

مشرکین کی اصل کمزوری کی نشان دہی

سورۃ کی آخری آیت میں مشرکین کے مشرکانہ خیالات کا رد کرنے کے بعد ایک ایسی بات فرمائی گئی ہے جو درحقیقت مشرکین کی اصل کمزوری ہے۔ اگر وہ اس کمزوری سے نجات پالیں تو نہ وہ شرک میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور نہ کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جسارت کر سکتے ہیں۔ وہ کمزوری یہ ہے کہ شرک جو اللہ کریم کی ذات وصفات میں کسی بھی نقص اور عیب کو تسلیم کر لینے کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ جس ذات کے بارے میں آدمی یہ یقین رکھتا ہو کہ اس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اس کا علم ہر طرح کی نارسائی سے پاک ہے، اس کی کبریائی کے مقابلے میں کسی اور کبریائی کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ایسا شخص نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کر سکتا ہے نہ استمداد کے لیے ہاتھ پھیلا سکتا ہے نہ کسی کمزور لمحے میں کسی اور کو پکار سکتا ہے نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی حاکمیت کو تسلیم کر سکتا ہے۔ یہ ساری خرابیاں اس شخص میں پیدا ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کمزوریوں، نقائص اور عیوب کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی تسلیم کرتا ہے زبان سے اس کی برتری کا دعویٰ کرتا ہے لیکن عملی زندگی میں اس کی ذات وصفات میں مختلف قسم کی کمزوریوں کو محسوس کرتا ہے۔ اس لیے اصل بیماری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے نقص اور عیب سے پاک ہے۔ کسی کمزوری کا تصور بھی اس کے ساتھ ممکن نہیں۔ ہر چیز کا اختیار واقتدار اس کے ہاتھ میں ہے کسی اور کا اس میں کوئی ساجھا نہیں۔ اس ذاتِ کبریا کے سوا جس طرح کسی کو پوجا نہیں جا سکتا اسی طرح اس کے بنائے ہوئے آئین وقانون کی غیر مشروط اطاعت بھی نہیں کی جا سکتی۔ وہ چونکہ ہر طرح کے اختیار واقتدار کا مالک ہے اس لیے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ یہ یقین رکھا جائے:

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق — زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق — اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ — جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسا کرو تم — اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو، گر ڈرو تم — اسی کی طلب میں مرو، جب مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی — نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اس وقت تم یہ گونجتی ہوئی آواز سنو گے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ، لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ "بتاؤ آج کس کی حکومت ہے، پھر خود ہی جواب دیا جائے گا ایک اللہ کی جو قہار ہے۔" تب ان لوگوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے گی جو اپنی زندگیوں میں نجانے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور کس کس کو دخیل اور مؤثر مانتے تھے۔

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

دروسِ قرآن

سُوْرَةُ الصّٰٓفّٰتِ

(۳۷)

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوۡرَةُ الصّٰٓفّٰتِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نام:۔ اس سورۃ کا نام الصّٰٓفّٰت ہے۔ یہ اس سورۃ کی پہلی ہی آیت سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول:۔ زمانے کے تعین کے بارے میں یقین سے کوئی بات کہنا مشکل ہے البتہ اس کے مضامین اور طرزِ کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکی دور کے وسط میں نازل ہوئی ہے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب قریش اور اہلِ مکہ کی طرف سے مخالفت میں شدت پیدا ہو چکی تھی۔ اور مسلمان نہایت دل شکن حالات کا سامنا کر رہے تھے۔

مضامین:۔ دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی توحید، قیامت اور رسالت کے اصولی مباحث پر زور دیا گیا ہے۔ توحید کے ضمن میں الوہیتِ ملائکہ کے تصور پر بطورِ خاص تنقید کی گئی ہے۔ کیونکہ مشرکینِ عرب ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ باپ کو اپنی بیٹیوں سے بالعموم زیادہ محبت ہوتی ہے۔ اس اگر قیامت میں ہمارے کوئی مشکل وقت آ ہی گیا تو یہ بیٹیاں ہمیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا لیں گی۔ اس ان بیٹیوں کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے مختلف طریقے اپنا رکھے تھے اور اس طرح سے وہ ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک سمجھتے تھے۔ چنانچہ پہلی ہی آیات میں قسمیہ انداز میں بتایا گیا ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہمیشہ اس کے احکام کی تعمیل کے لیے حاضر اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔ اور وہ اپنے عمل سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ پروردگار کے نہایت فرمانبردار اور اطاعت گزار بندے ہیں۔ چہ جائیکہ انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیا جائے۔ وہ اپنی عبادت اور فرماں برداری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے قرب سے مشرف ہیں۔ کتنے ایسے فرشتے ہیں جو عرش کو گھیرے ہوئے ہیں اور جنات و شیاطین کی رسائی ان تک نہیں ہوتی۔ کاہنوں نے ان کی رسائی کا غلط تصور دے کر اپنا کاروبار چمکا رکھا ہے جبکہ حال یہ ہے کہ اگر جنات و شیاطین ملاِ اعلیٰ کی باتوں کی کوئی سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں یہ ملائکہ ان کو دھتکارتے ہیں اور شہابِ ثاقب ان کا تعاقب کرتے ہیں۔

قیامت کا مذاق اڑانے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم یہاں جیسے چاہو سرکشی کا اظہار کر و لیکن قیامت کے دن تمہارا اور تمہارے لیڈروں کا جس طرح سامنا ہونے والا ہے اس کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ کس طرح سے عوام اپنے لیڈروں پر لعنت کریں گے اور لیڈر اپنے پیروؤں کو ملامت کریں گے کہ وہ خود شامت زدہ تھے انہوں نے حق کے واضح ہونے کے بعد اس کا انکار کیا۔ اور اس سے آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ آپؐ ان کی باتوں کی پرواہ نہ کریں یہ بڑی ہولناک صورتحال سے دوچار ہونے والے ہیں۔

Marfat.com

مخالفین چونکہ یہ تہیہ کر چکے تھے کہ اس اٹھتی ہوئی قوت کو وہ فنا کر کے دم لیں گے۔ اس لیے انہیں نہایت پرزور طریقہ سے تنبیہ کی گئی ہے کہ تم جس فانوس کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہو اور جس قوت کو سرنگوں کرنا تم اپنا مقصد بنا چکے ہو، تمہیں معلوم ہونا کہ یہ بہت دنوں کی بات نہیں کہ اس دین کو عمومی غلبہ ملنے والا ہے اور تم اللہ تعالیٰ کے لشکر کو خود اپنے گھر کے صحن میں اترا ہوا پاؤ گے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا لشکر قرار دیا گیا ہے وہ اس وقت بری طرح ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ اور ان کی بیشتر تعداد دوسرے ملکوں میں ہجرت کر چکی تھی۔ بمشکل چالیس پچاس افراد مکہ معظمہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس تھے۔ ایسی صورتحال میں کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ غلبہ آخر آنحضرت ﷺ اور ان کے مٹھی بھر صحابہ کو ہوگا۔ لیکن پندرہ سولہ سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ فتح مکہ کے موقع پر لوگوں نے ان باتوں کو اپنی آنکھوں سے وقوع پذیر ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔

توحید اور آخرت کے عقیدے کی صحت پر نہایت اختصار کے ساتھ دلنشین دلائل دیے گئے ہیں۔ مشرکین کے عقائد پر تنقید کرتے ہوئے انہیں غیر معقول، بے سروپا اور لغو ثابت کیا ہے۔ اور ان کی گمراہیوں کے برے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے تاریخ سے مختلف شواہد پیش کیے گئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح وہ قومیں تباہ ہوئیں جنہوں نے انبیائے کرام کی تکذیب کی۔ اور وہ قومیں سرفراز اور سربلند ہوئیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کیا اور اللہ تعالیٰ کے دین کو اپنی زندگی کا طرزِ عمل بنایا۔ اسی سلسلے میں آباؤ اجداد کی اندھی تقلید پر بھی تنقید کرتے ہوئے اس کے غلط نتائج پر تنبیہ کی گئی ہے۔

انبیائے کرام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے سب سے زیادہ زور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالاتِ زندگی پر دیا گیا ہے۔ کیونکہ مشرکین بھی ان کی سیادت وامامت کے ماننے والے تھے۔ ملتِ ابراہیمی کی پیروی پر اصرار کرتے تھے اور نسبی اور نسلی طور پر اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جانشین سمجھتے تھے۔ انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی سے یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حد درجہ اطاعت گزار، فداکار اور اس کی رضا کے طلبگار تھے۔ وہ ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں زندگی گزارتے تھے۔ قریش کی طرح ان کی زندگی میں نہ شرک کا دخل تھا اور نہ سرکشی اور تمرد کا۔ اور مسلمانوں کو بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کا یہ واقعہ سنا کر کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ پا کر اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے، یہ سبق دینا تھا کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی اصل روح اس کے سوا کچھ نہیں کہ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اس کی اطاعت میں سب کچھ قربان کر دینے کو زندگی کا مقصد بنا لیا جائے۔

سورۃ کی آخری آیات میں آنحضرت ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آغازِ کار میں جن مصائب سے انہیں سابقہ پیش آ رہا ہے گھبرائیں نہیں، آخر کار غلبہ انہیں کو نصیب ہوگا۔ آپ کے مخالفین لازماً ناکام ہوں گے۔ اب جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں آپ ان سے درگزر کیجیے اور صبر کے ساتھ اپنا کام کرتے جائیے۔ وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابیوں سے نوازے گا اور آپ کے دشمن آپ کے ہاتھوں مفتوح ومغلوب ہو کر رہیں گے۔ چند ہی سال بعد واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ محض خالی تسلی نہ تھی۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۱۸۲	سُوْرَةُ الصّٰٓفّٰتِ مَكِّيَّةٌ (۳۷)	رُكُوْعَاتُهَا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۳﴾ اِنَّ اِلٰهَكُمْ
لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾
اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ۙ﴿۶﴾ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ
مَّارِدٍ ۚ﴿۷﴾ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ
جَانِبٍ ۖ﴿۸﴾ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ﴿۹﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ
فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ
خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۪﴿۱۲﴾
وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۪﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۪﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ
هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۙ﴿۱۶﴾
اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ﴿۱۷﴾ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۚ﴿۱۸﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ
وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾
هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ع﴿۲۱﴾

Marfat.com

رکوع: ۱۔ (قسم ہے قطار درقطار صفیں باندھنے والے فرشتوں کی۔ ۱) پھر ڈانٹنے، پھٹکارنے والے فرشتوں کی۔ ۲) پھر ذکر کرنے والے فرشتوں کی۔ ۳) پس تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ ۴) وہی رب ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا، اور وہی مالک ہے سارے مشرقوں کا۔ ۵) بے شک ہم ہی نے آسمانِ دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے۔ ۶) اور ہم ہی نے اس کی حفاظت کی ہے ہر سرکش شیطان سے۔ ۷) وہ ملأ اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے، ہر طرف سے دھتکارے جاتے ہیں۔ ۸) کھدیڑنے کے لیے اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے۔ ۹) مگر یہ کہ کوئی اچک لے کوئی بات تو ایک چمکتا ہوا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۱۰) پس ان سے پوچھئے کیا ان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا ان چیزوں کا جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں ان کو تو ہم نے لیس دار مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ۱۱) بلکہ آپ تعجب کر رہے ہیں اور یہ لوگ مذاق اڑا رہے ہیں۔ ۱۲) اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت قبول نہیں کرتے۔ ۱۳) اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ۱۴) اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ ۱۵) کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے۔ ۱۶) اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے۔ ۱۷) کہہ دیجیے ہاں، اور تم ذلیل وخوار ہو کر زندہ ہو گے۔ ۱۸) سو وہ اٹھانا تو بس ایک ہی جھڑکی ہوگی کہ یکا یک وہ دیکھنے لگیں گے۔ ۱۹) اور کہیں گے ہائے ہماری کمبختی یہ تو بدلے کا دن ہے۔ ۲۰) یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ۲۱)

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝۳ اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴

(قسم ہے قطار درقطار صفیں باندھنے والے فرشتوں کی۔ ۱) پھر ڈانٹنے، پھٹکارنے والے فرشتوں کی۔ ۲) پھر ذکر کرنے والے فرشتوں کی۔ ۳) پس تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ ۴)

قسم دلیل ہوتی ہے یہاں فرشتوں کے تین گروہوں کی قسم کھائی گئی ہے

ہم اس سے پہلے بھی متعدد مواقع پر ذکر کر چکے ہیں کہ جس لفظ پر واؤ قسم کے لیے آتا ہے اسے قسم کہتے ہیں اور اس کے بعد آنے والا جملہ جوابِ قسم یا مقسم علیہ کہلاتا ہے۔ جوابِ قسم کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے اور قسم دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ گویا دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے قسم کو بطور دلیل کے لایا جاتا ہے۔ البتہ ہمارے شیوہ مخاطبت اور طرزِ تحریر کے برعکس دلیل پہلے دی جاتی ہے اور دعویٰ بعد میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ دعویٰ کے ذکر کرنے سے پہلے دلیل کے ذریعے انسانی دل ودماغ کی زمین کو دعویٰ کی قبولیت کے لیے ہموار کر دیا جائے۔ جس طرح ایک کسان زمین کو تخم ریزی کے لیے پہلے ہموار کرتا ہے اور پھر اس میں تخم کاشت کرتا ہے۔ اسی طرح پروردگار بھی انسانی دماغوں کو پہلے دلائل کے ذریعے ہموار کرتا ہے اور پھر ان کے سامنے وہ باتیں لاتا ہے جنہیں قبول کرنا ان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہاں بھی سب سے پہلے تین قسمیں

Marfat.com

کھائی گئی ہیں اور حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ اور اس دور کے اہم ترین مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ تینوں قسمیں دراصل ملائکہ کے تین گروہوں کی ہیں جن میں پہلا گروہ وہ ہے جنہیں صافات کے نام سے یاد فرمایا گیا ہے جس کا معنی ہے صف باندھنے والے۔ اسے فرشتوں کی صفت کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے اور یہ وہ صفت ہے جس کا ذکر اسی سورۃ میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی زبانی کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ''اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معین مقام ہے، اور ہم تو صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔''

دوسری آیت میں ان فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے جو زجر کرنے والے، ڈانٹنے اور دھتکارنے والے ہیں۔ یہ وہ فرشتے ہیں کہ جب جنات وشیاطین ان مقامات کے قریب جانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے لیے ممنوع قرار دیے گئے ہیں اور یا فرشتوں کو سننے کے لیے ان کے راستوں میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ ان کو دھتکارتے ہیں اور شہابِ ثاقب ان کا تعاقب کرتے ہیں۔ یعنی ملاِ اعلیٰ اور عالمِ غیب کی خبروں کو محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خصوصی انتظام کر رکھا ہے جس کی وجہ سے جنات وشیاطین کو ان علاقوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں جہاں سے وہ فرشتوں کی کوئی سی ادھوری بات سن کر اور اپنی باتیں ساتھ شامل کر کے زمین پر کہانت کا بازار گرم کیے ہوئے تھے اور اس طرح سے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس کے بعد تیسری آیت میں ان فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے جنہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے قول میں مُسَبِّحُوْنَ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ یعنی ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ شب و روز اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح میں مصروف رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جن ملائکہ کی صفات یہ ہوں کہ وہ ہر وقت صف باندھے قطار در قطار اللہ تعالیٰ کے احکام کے انتظار میں کھڑے رہتے ہوں اور جنہیں سوائے بندگیِ رب کے کسی کام سے غرض نہ ہو ان کی زندگی میں اس کے سوا نہ کوئی خواہش پائی جاتی ہو اور نہ ان کی زندگی کا اس کے سوا کوئی نصب العین اور کوئی مقصد ہو۔ اور اگر آسمانوں کے ممنوعہ علاقوں میں جنات وشیاطین غیب کی خبریں چرانے اور فرشتوں سے کسی بات کو لے اڑنے کی کوشش کریں تو انہیں دھتکارتے اور ایسے علاقوں سے دور رکھتے ہوں اور ان میں سے کچھ فرشتوں کا کام یہ ہو کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح میں مصروف رہتے ہوں تو کیا انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات میں شریک تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا ان کے بارے میں یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سامنا کر سکیں گے۔ اور کیا ان سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ پروردگارِ عالم کی مرضی کے خلاف کسی کی مدد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ چنانچہ اس طرح سے فرشتوں کی صفات کی وضاحت اور ان کی حیثیت کو کھولنے کے بعد جوابِ قسم لایا گیا ہے کہ یہ تینوں باتیں اس بات پر دلیل ہیں کہ تمہارا اِلٰہ صرف ایک اِلٰہ ہے اور وہ خداوند ذوالجلال ہے جس کے قبضے میں کائنات کا نظام ہے جو سب کو زندگی اور موت دینے والا ہے۔ جن و انس کے علاوہ ہر مخلوق اس کے تکوینی نظام میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس کے احکام سے سرتابی کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ تو وہ ملائکہ جنہیں نور سے پیدا کیا گیا ہے اور جن کی سرشت میں بندگی اور اطاعت کے سوا کوئی اور جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔ تو جو لوگ ان کو اس کا شریک بناتے ہیں اور ان کی شفاعت کی امید پر ان کی پوجا کر رہے ہیں، وہ احمقوں کی دنیا میں بستے ہیں۔ فرشتوں کا خود اپنا طرزِ عمل ان کی گمراہی اور حماقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

Marfat.com

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝٥

(وہی رب ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا، اور وہی مالک ہے سارے مشرقوں کا۔ ۵)

مقسم علیہ یعنی دعویٰ کی وضاحت

یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔ یعنی وہ معبودِ حقیقی جو واحد اور احد ہے وہی تمام آسمانوں اور زمین اور اس کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب اور مالک ہے۔ اور وہی رب المشارق بھی ہے۔ مشارق مشرق کی جمع ہے۔ جمع جس طرح کثرتِ تعداد پر دلالت کرتی ہے اسی طرح اطراف کی وسعتوں پر بھی دلیل ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کائنات جس کا وہ مالک ہے اس کی وسعتوں کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ لیکن اس سے مشرکین کو یہ غلطی لگی ہے کہ اتنی وسیع کائنات میں رہنے والے ایک ایک فرد کی ضرورتوں اور اس کے احساسات سے کون آگاہ ہوسکتا ہے۔ یقیناً پروردگارِ عالم نے بادشاہوں کی طرح نیچے بے شمار کارکن رکھے ہوئے ہیں اور ان کو بعض اختیارات دے کر بعض کام ان کے سپرد کردیے ہیں۔ اور اس طرح سے کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ چنانچہ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کے کسی گوشے سے نہ تو بے خبر ہے اور نہ اس کے انتظامات سے عاجز ہے۔ اور نہ وہ کسی علاقے کے انتظامات کو برقرار رکھنے کے لیے کسی کا محتاج ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کی محتاج ہے۔ وہ ہر چیز کے نفع وضرر اور اس کی قسمت کا مالک ہے۔ کسی کی بڑائی اور عظمت اس کی بڑائی اور عظمت کے لیے چیلنج نہیں بن سکتیں بلکہ سب عظمتیں اور بڑائیاں اس کی دین اور اس کی عطا ہے۔ وہ تمام اختیارات کا مالک ہے۔ عقل کی بات یہ ہے کہ عبادت، اطاعت، پرستش اور بندگی کا حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو صرف اس ذات کے لیے جو سب سے بڑا، سب سے عظیم، سب بڑائیوں کا مالک، ہر طرح کی احتیاج سے پاک اور سب اس کے محتاج ہیں۔ عقل اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کرسکتی کہ کسی بے اختیار کی عبادت کی جائے، کسی بے اقتدار سے استمداد کی جائے، کسی محتاج کے سامنے اپنی حاجات پیش کی جائیں اور کسی پستی کے سامنے بلندیاں جھکیں، اور کسی محکوم کے سامنے حاکم سر نیچا کرے اور اس کے حضور درخواست کی جائے۔ چنانچہ اس بات کی طرف اس آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جو اس کائنات کا خالق ومالک رب اور فرمانروا اور تمام مشارق ومغارب کا حکمران ہے یقیناً الوہیت اسی کو زیب دیتی ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ جس طرح پروردگار رب المشارق ہے اسی طرح رب المغارب بھی ہے۔ لیکن یہ بات چونکہ واضح ہے اس لیے اس کو ذکر نہیں فرمایا گیا۔ ویسے بھی مغارب، مشارق کے تحت ہیں۔ اس لیے جب اصل کا ذکر آگیا تو فرع کا ذکر کرنا ضروری نہ رہا۔ ممکن ہے یہاں مشارق کا ذکر اس لیے کیا گیا ہو کہ دنیا میں مشرکوں نے سب سے زیادہ پرستش سورج کی کی ہے جو مشرق سے نکلتا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨ الْكَوَاكِبِ ۝٦ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝٧

(بے شک ہم ہی نے آسمانِ دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے۔ ۶) اور ہم ہی نے اس کی حفاظت کی ہے ہر سرکش شیطان سے۔ ۷)

Marfat.com

قدرتِ خداوندی کی وسعت اور حفاظت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح ہم نے اہلِ زمین کے لیے زمین میں دلچسپیوں کی ایک کائنات بسا رکھی ہے کہ نہ رنگوں کی بہار کی کوئی انتہا ہے اور نہ خوبصورت آوازوں اور دلنواز صداؤں اور اداؤں کا کوئی شمار ہے۔ انسان سرِشام کسی جنگل میں نکل جائے تو پرندوں کی موسیقی اسے دوسری دنیا میں پہنچا دے گی۔ اور کبھی چھائی ہوئی گھٹا میں پہاڑوں کے دامن کی سیر کرے تو چاندی کے ابلتے ہوئے فوارے اور سیماب اگلتے ہوئے چشمے اور چیڑوں کے گڑے ہوئے جھنڈے انسان کے لیے جنت نگاہ بن جاتے ہیں۔ تو جس پروردگار نے زمین پر یہ جنت کا منظر قائم کر رکھا ہے اسی نے آسمانِ دنیا یعنی عالمِ بالا کو ستاروں کی قندیلوں سے روشن کر رکھا ہے۔ انسان جب چھٹی ہوئی چاندنی میں آسمانِ دنیا کو دیکھتا ہے تو وہ اس کی خوبصورتی میں کھو جاتا ہے۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ جس پروردگار نے اس آسمان کو ستاروں سے خوبصورت بنایا ہے اسی نے اس کو ہر شیطانِ سرکش سے محفوظ بھی کر دیا ہے۔ یعنی یہ عالمِ بالا اور سقفِ نیلگوں محض ایک خلاء ہی نہیں کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے اور اس کے مختلف خطے ایسی مستحکم سرحدوں سے محصور کیے گئے ہیں کہ کسی شیطانِ سرکش کا ان حدوں سے گزر جانا ممکن نہیں۔ اس خلاء کے اندر بے حد حساب خطے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کیے گئے ہیں جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور عجیب بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی سرکش شیطان اوپر جانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ ستارے جو بظاہر مشعلوں کی صورت دکھائی دیتے ہیں ان ہی ستاروں کے ذریعے سے اس کی سرزنش کی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ مضمون مختلف اسالیب سے بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد فرمایا وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَجَعَلْنٰـهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنَ (الملک: ۵) ”اور ہم نے سماءِ دنیا کو تاروں سے سجایا ہے اور ان کو شیاطین کے سنگسار کرنے کے لیے بھی بنایا ہے۔“ دوسرے مقام میں ارشاد فرمایا وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِیْنٌ (الحجر: ۱۶۔۱۸) ”اور ہم نے آسمان میں برج بنائے اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے ستاروں سے مزین کیا ہے اور اس کو ہر شیطانِ رجیم سے محفوظ کیا ہے اور اگر کوئی چھپ کے سننے کی کوشش کرے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔

لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿۸﴾ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿۹﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾

(وہ ملاِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے، ہر طرف سے دھتکارے جاتے ہیں۔ ۸) کھدیڑنے کے لیے اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے۔ ۹) مگر یہ کہ کوئی اچک لے کوئی بات تو ایک چمکتا ہوا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۱۰)

جنات کی بے بسی اور اہلِ عرب کے مشرکانہ خیالات کی تردید

اہلِ عرب میں جس طرح فرشتوں کے بارے میں مشرکانہ خیالات پائے جاتے تھے اسی طرح وہ جنات کے بارے میں بھی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انہیں آسمان پر جانے، فرشتوں کی باتیں سننے اور عالمِ غیب کی بعض خبروں سے آگاہ ہونے کی سہولت حاصل ہے۔ اور انسانوں میں سے جو لوگ عملیات کے ذریعے ایسے جنات کو قابو کر لیتے ہیں وہ ان کے واسطے سے آسمان میں ہونے والے فیصلوں سے قبل از وقت آگاہ

Marfat.com

ہوجاتے ہیں۔ایسے شخص کو ان کی زبان میں کاہن کہا جاتا تھا اور وہ غیب دانی کی شہرت رکھنے کی وجہ سے مرجعِ خلائق بنے رہتے تھے اور لوگوں کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی جیبوں پر بھی ہاتھ صاف کرتے تھے اور ان کے خیالات اور اعتقاد میں بھی بگاڑ پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔چنانچہ نبی کریم ﷺ نے جب نبوت کا دعویٰ فرمایا اور یہ کہا کہ مجھ پر ایک فرشتہ اللہ تعالیٰ کا کلام لے کر نازل ہوتا ہے تو لوگوں نے آپ کو بھی ایک کاہن قرار دیا۔اور آپ کے بارے میں یہ بات کہنا شروع کردی کہ آپ کا تعلق بھی دوسرے کاہنوں کی طرح کسی شیطان سے ہے جو عالمِ بالا سے فرشتوں سے کچھ باتیں سن کر آپ کو بتاتا ہے اور آپ اسے وحیِ الٰہی کے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔چنانچہ ان تمام خرافات کی تردید کرتے ہوئے یہاں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ شیاطینِ جن میں سے کسی کی یہ طاقت نہیں کہ وہ آسمان پر جاسکیں اور ملاِ اعلیٰ کی باتیں سن سکیں۔ لَا یَسَّمَّعُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ سننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سن نہیں سکتے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے وحیِ الٰہی کی حفاظت کے لیے ایسے انتظامات کردیے ہیں کہ اب کسی شیطان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ آسمان پر جا کر غیب کی کسی بات کو جاننے پر قادر ہوسکے۔

آیت میں الملأالاعلیٰ کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے آسمان پر رہنے والے فرشتے۔بعض اہلِ علم کے نزدیک اس سے مراد آسمانوں کے تمام فرشتے نہیں بلکہ اشراف ملائکہ مراد ہیں۔ظاہر ہے کہ فرشتے نہ اپنے مناصب کے اعتبار سے یکساں ہیں نہ شرافت و مرتبہ کے اعتبار سے،اور نہ اپنے فرائض اور صلاحیتوں کے اعتبار سے سب ایک جیسے ہیں۔یقیناً ان میں وہ فرشتے بھی شامل ہیں جو زمین اور اہلِ زمین کے معاملات سے متعلق ہیں گے وہی شاید اس سے مراد ہیں۔اور جنات ہمیشہ انہیں تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ان کے لیے آسمانوں پر جانے کی کھلی اجازت تو پہلے بھی نہ تھی لیکن آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد ان پر مکمل پابندی لگادی گئی۔لیکن یہ چونکہ اپنی خلقی ساخت کے اعتبار سے فرشتوں کے بہت قریب ہیں اس لیے ان کے لیے آسمانوں پر چلے جانا ناممکن نہیں۔اور مزید یہ کہ جس طرح فرشتوں کی جبلت اور فطرت میں عصمت رکھی گئی ہے ان کی فطرت میں شرارت اور شیطنت کا غلبہ ہے۔اس لیے ان میں سے بعض جنات اپنی فطرت اور جبلت سے مجبور ہو کر پابندی کے باوجود آسمانوں پر جانے کی کوشش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمادیا ہے کہ جب بھی جنات عالمِ بالا پر جانے کی کوشش کرتے ہیں تو فرشتے انہیں بری طرح دھتکارتے،مارتے اور کھدیڑتے ہیں اور کسی کو اوپر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔اور اگر ان میں سے کوئی سرکش شیطان کوئی بات اچک کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو ایک دمکتا ہوا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔اور یہ شعلہ میزائل کی طرح اس پر گرتا ہے اور اس کا کام تمام کردیتا ہے۔معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبھی تو اس مقصد کے لیے ستاروں ہی کو استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی آگ کا کوئی گولہ فرشتوں کی طرف سے ان پر پھینکا جاتا ہے جو ان کی کارکردگی کو ناکام کرکے رکھ دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی خدائی میں کوئی دخل نہیں وہ انتہائی فرمانبردار بندوں کی طرح یا تو عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور یا ان امور کو سرانجام دینے میں لگے رہتے ہیں جو انہیں تفویض کیے جاتے ہیں۔اسی طرح جنات کو بھی انسانوں کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں۔اس لیے جو لوگ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھ کر ان کی پوجاپاٹ کرتے ہیں وہ محض اپنا نقصان کرتے ہیں۔اسی طرح جو لوگ جنات کو علمِ غیب کا وسیلہ سمجھ کر ان سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی احمقوں کی دنیا میں بستے ہیں۔اس کائنات کا ایک ہی اِلٰہ ہے اور اسی کے ہاتھ میں ایک ایک مخلوق کے معاملات کی باگ ڈور ہے۔

Marfat.com

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾

(پس ان سے پوچھئے کیا ان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا ان چیزوں کا جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں ان کو تو ہم نے لیس دار مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ۱۱)

احوالِ قیامت سے پہلے امکانِ قیامت کی دلیل

بعد کی آیات میں احوالِ قیامت کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ نزولِ قرآن اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کے وقت قریش اور دیگر اہلِ مکہ کی جو کیفیت ہوتی تھی قرآن پاک کا ہر طالب علم اس سے واقف ہے۔ جیسے ہی آنحضرت ﷺ انذار کرتے ہوئے عذاب آخرت کا ذکر کرتے تو مخالفین فوراً بات کو اچک لیتے اور آپ کی ترغیب و ترہیب کو بے اثر کرنے کے لیے یہ سوالات اٹھاتے کہ قیامت کے احوال کا تذکرہ تو بعد میں کیجیے گا پہلے تو یہ ثابت کیجیے کہ قیامت واقعی آئے گی۔ اور ہم جو اس میں عقلی استبعاد محسوس کرتے ہیں پہلے اس کی تو کوئی توجیہ کیجیے۔ چنانچہ اس ضرورت کے تحت پروردگار نے احوالِ قیامت کے ذکر سے پہلے اس کے امکان کو ذکر فرمایا۔ اور براہِ راست گفتگو کرنے کی بجائے اس کی بنیاد ایک ایسے سوال پر رکھی ہے جس کے تمام تر جواب کی عمارت ان کے مسلمات پر اٹھائی گئی ہے۔ سوال یہ کیا گیا ہے کہ تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق حتیٰ کہ زمین و آسمان اور پہاڑ تک ہم نے پیدا کیے ہیں۔ اور تمہیں ان کی تخلیق میں کوئی ذہنی استبعاد محسوس نہیں ہوتا۔ خدا لگتی کہو کہ کیا ان عظیم مخلوقات کا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا خود تمہارا پیدا کرنا۔ اگر اتنی بڑی بڑی مخلوقات کی تخلیق میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو کیا دوبارہ تمہاری تخلیق ہمارے لیے مشکل ہوگی۔ یہی مضمون سورۃ مومن میں دوسرے انداز سے بیان ہوا ہے۔ لیکن اس کی کاٹ بھی وہی ہے جو پیشِ نظر آیت میں ہے۔ ارشاد ہوا ہے لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ”آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔“ کیونکہ کائنات کی بڑی بڑی مخلوقات ایسی مختلف چیزوں سے پیدا کی گئی ہیں جن کا خام مواد ملنا آسان کام نہیں۔ ان کی تخلیق میں ایسی پیچیدگیاں ہیں جن کی گرہ کھولنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے اسے ہم نے چپکتی ہوئی مٹی یا لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔ اور مٹی کا مادہ جس طرح اس کی پیدائش کے وقت فراوانی سے موجود تھا آج بھی موجود ہے۔ اس وقت اگر انسان کو اس سے تخلیق کرتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو آخرت کے وقت آخر اس کی تخلیق میں کیوں دشواری پیش آئے گی۔ ہم جب چاہیں گے ان کو پھر بنا دیں گے۔ لیس دار گارے سے انسان کی پیدائش کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسانوں کے جدِ امجد کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی۔ اور پھر آگے نسلِ انسانی اسی کے نطفے سے وجود میں آئی۔ اور انسان کا یہ مادۂ حیات اسی غذا سے بنتا ہے جو زمین سے نکلتی ہے۔ اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزاء سے مرکب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخر کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلے، ترکاریاں اور پھل نکالے اور ان حیوانات کی پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔ تو اگر نوعِ انسانی کی تخلیق کی ابتداء مٹی سے ہی ہوئی اور اسی سے نکلنے والی اشیاء اس کے مادۂ حیات کی غذا بنی اور انسان کی تخلیق کا سلسلہ چلتا رہا، تو یہ سب کچھ تو اب بھی موجود ہے اور قیامت کے وقوع کے وقت بھی موجود ہوگا۔ تو پھر انسان کی از سرِ نو زندگی میں عقلی استبعاد کس طرح پیدا ہو گیا۔

Marfat.com

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جو سوال اٹھایا گیا ہے اس میں چونکہ ''مَنْ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اس سے بعض اہلِ علم یہ گمان کرتے ہیں کہ قدرت کی پیدا کردہ چیزوں سے مراد شاید یہاں ملائکہ اور جنات کی تخلیق ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے انسانوں کو مٹی سے پیدا کیا اور جنات کو نار سے اور فرشتوں کو نور سے تخلیق کیا ہے۔ تو کیا نار اور نور سے کسی مخلوق کا تخلیق کرنا زیادہ مشکل ہے یا مٹی سے انسان کا پیدا کرنا۔ یقیناً نار اور نور سے تخلیق کا عمل زیادہ مشکل ہے اور جب اس مشکل کام میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی تو انسانوں کو از سرِنو زندہ کرنے میں ہمیں کیوں دشواری ہوگی۔

بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾

(بلکہ آپ تعجب کر رہے ہیں اور یہ لوگ مذاق اڑا رہے ہیں۔ ۱۲)

متکلم اور مخاطب کی سوچ اور ذوق میں تضاد

یعنی قرآنِ کریم کے اتنے واضح اور آسان دلائل کے بعد ان کا انکار، اے پیغمبر! آپ کے لیے تعجب انگیز ہے اور اسی لیے آپ حیران ہو رہے ہیں کہ آخر ان کی عقلوں پر کیسے پتھر پڑ گئے ہیں کہ بالکل سامنے کی بات کو بھی مان کر نہیں دے رہے کہ جن مخلوقات کی تخلیق ہر اعتبار سے نہایت حیرت انگیز ہے ان میں ان کے لیے کوئی عقلی استبعاد نہیں۔ اور انسان کی از سرِنو تخلیق یا انہیں زندہ کر کے اٹھانا جبکہ یہ اس واردات سے خود گزر چکے ہیں آخر کیا عقلی استبعاد رکھتی ہے کہ انہیں اس کا ماننا مشکل ہو رہا ہے۔ اس لیے آپ کو ان کا اشکال باعثِ تعجب معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ اتنی واضح بات کو قبول کرنے کی بجائے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں کہ یہ شخص جو دعویٔ نبوت سے پہلے تک نہایت سمجھدار، سنجیدہ مزاج اور مدبر خیال کیا جاتا تھا آج اسے کیا ہو گیا ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں اور صدیوں پہلے مرنے والے انسانوں کے از سرِنو زندہ ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے جبکہ ان کے جسموں کا ذرہ ذرہ ہوا میں اڑ چکا اور ان کا کوئی نام و نشان تک موجود نہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ان کے سوءِ فہم، عقلی افلاس اور ذہنی کج روی پر تعجب کا اظہار کرتا ہے۔ اور وہ پیغمبر کی باتوں کو عقل و خرد سے عاری گمان کر کے تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ دونوں سوچوں میں کس قدر دوری ہے۔ ایک مشرق ہے اور دوسرا مغرب۔ اس فکری تضاد اور رویوں میں اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ:

وَاِذَا ذُکِّرُوْا لَا یَذْکُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰیَۃً یَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾
وَقَالُوْٓا اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۵﴾

(اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت قبول نہیں کرتے۔ ۱۳) اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ۱۴) اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ ۱۵)

Marfat.com

بدذوقی کے نتائج

جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت قبول کرنے اور بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کا ذہنی سانچہ اس حد تک تبدیل ہو چکا ہے کہ وہ کسی صحیح بات کو قبول نہیں کرتا اور کوئی اچھی بات اس میں اترنے نہیں پاتی۔ کیونکہ افکار، ذہنی تربیت، صحیح ماحول اور امیال وعواطف، ذہنی ساخت کو تشکیل کرتے اور صالح کردار کی تعمیر کرتے ہیں۔ لیکن جب ان کی بجائے فکری کج روی، غلط تربیت، غلط ماحول اور مشرکانہ عقائد فیصلہ کن جگہ بنا لیتے ہیں تو پھر اس کے نتیجے میں ایسا فکری اور عملی قالب وجود میں آتا ہے جو اس آیتِ کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ آج بھی ہم اپنے گردوپیش میں دونوں طرح کے ذہنی رویوں کو کارفرما دیکھتے ہیں اور دونوں سے پیدا ہونے والے فکری اور عملی اختلافات کو بھی جابجا دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور ہزار کوشش کے باوجود بھی ان میں کہیں سازگاری ہوتی نظر نہیں آتی۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اس خرابی کے اسباب کو دور کرنے کی بجائے خرابی کی شاخوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم مسلسل خرابی کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ جب تک یہ لوگ اپنے اعتقادات میں درستی پیدا نہیں کرتے مشرکانہ تصورات سے توبہ نہیں کرتے۔ اور آخرت کی جوابدہی کا احساس ان کے رگ وپے میں نہیں اترتا، اس وقت تک ان کے رویوں میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ وہ اگر بڑے سے بڑا معجزہ بھی دیکھتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے کسی عظیم نشانی کو دیکھنے کا موقع پاتے ہیں تو اس سے کوئی سبق سیکھنے کی بجائے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے جس سے ہماری عقلوں کو شکار کیا جا رہا ہے۔

ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾

(کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے۔ ۱۶)
اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے۔ ۱۷)

مزید وضاحت

یہ ان کی ذہنی پسماندگی کی دلیل ہے کہ قرآنِ کریم اور صاحب قرآن ﷺ ہر ممکن طریقے سے انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اپنے ذہنی افلاس اور فکری گھٹن سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ بار بار ایک ہی بات دہرا رہے ہیں کہ جب ہمیں موت چاٹ جائے گی پھر ایک وقت آئے گا ہم بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہو جائیں گے اور ہڈیاں بھی گل سڑ کر خاک بن جائیں گی۔ ہوسکتا ہے انہیں ہوا اڑا کر کہیں کی کہیں لے جائے تو کیا ہم اس وقت بھی اٹھائے جائیں گے۔ اور مزید حیرت کی بات یہ کہ ہمارے آباؤ اجداد بھی اسی تجربے سے گزارے جائیں گے۔ اس سے آپ ان کی ذہنی کم مائیگی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے حوالے سے مزید تعجب کا اظہار کر رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے سامنے سب انسان یکساں ہیں۔ جو سلوک آج کے انسان سے ہوگا وہی ماضی اور مستقبل کے انسان سے بھی ہوگا۔ لیکن دورِ جاہلیت کا انسان یہ سمجھتا ہے کہ جو لوگ اس سے پہلے گزر گئے ہیں وہ شاید ہم سے مختلف حیثیتوں کے مالک تھے۔ اور یا وہ ماضی کا حصہ بن کر شاید کسی زیادہ قدر وقیمت کے حامل ہو گئے ہیں۔ اس لیے ان کا اور ہمارا معاملہ کیسے ایک ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

(کہہ دیجیے ہاں، اور تم ذلیل وخوار ہو کر زندہ ہو گے۔ ۱۸)

مخالفین کا یہ سوال کہ کیا جب ہم مر گئے اور بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہو گئے اور خاک ہو کر خاک میں مل گئے یا ذرات کی شکل میں ہوا میں اڑ گئے تو کیا ہم پھر بھی اٹھائے جائیں گے اور ہم سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد گزر چکے ہیں، کیا انہیں بھی اٹھایا جائے گا؟ عقلی دلیل تو اس سے پہلے گزر چکی ہے کہ تمہارے دوبارہ اٹھائے جانے اور از سر نو زندہ کیے جانے میں کوئی عقلی استبعاد نہیں۔ البتہ اب شاہانہ لب ولہجے میں ان کے سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ ہاں تم بھی اور تمہارے آباؤ اجداد بھی زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور اس میں شک وشبہ کا کوئی امکان نہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ تم صرف اٹھائے نہیں جاؤ گے بلکہ ذلیل وخوار کر کے اٹھائے جاؤ گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں از سر نو زندگی کا عطا ہونا یقیناً ایک بہت بڑی بات ہے لیکن یہ سب کچھ تمہارے اعزاز کے لیے نہیں ہوگا بلکہ تمہیں اس لیے اٹھایا جائے گا تا کہ تم اپنے اعمال کی جواب دہی کر سکو، اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا پوری طرح ظہور ہو سکے۔ جن لوگوں نے زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاری انہیں نہایت عزت واحترام سے اٹھایا جائے گا، فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور نہایت عزت کے ٹھکانوں میں پہنچایا جائے گا۔ لیکن تم نے چونکہ زندگی بھر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور سرکشی اور تمرد کے ساتھ زندگی گزاری اس لیے آج تمہاری اکڑی ہوئی گردنیں جھکا دی جائیں گی۔ اور تمہارے ساتھ وہ سلوک کیا جائے گا جو مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾

(سو وہ اٹھانا تو بس ایک ہی جھڑکی ہوگی کہ یکا یک وہ دیکھنے لگیں گے۔ ۱۹) اور کہیں گے ہائے ہماری کمبختی یہ تو بدلے کا دن ہے۔ ۲۰) یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ۲۱)

قیامت کے منکرین کی بدحواسی سے دلیل

قیامت کے منکرین اس کے وقوع کو بہت بڑی بات سمجھ کر نا قابلِ یقین خیال کرتے اور کبھی اسے خلافِ عقل ٹھہراتے تھے۔ ان کے تصورات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہمیں قیامت برپا کرنے میں کسی تیاری کی ضرورت نہیں ہوگی۔ نہ جن وانس کو از سر نو اٹھانے میں ہمیں کوئی غیر معمولی قوت صرف کرنا پڑے گی اور نہ اس کے لیے سامان فراہم کرنا ہوگا۔ بلکہ وہ تو ایک جھڑکی اور ڈانٹ ہوگی جس کے نتیجے میں انسان زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور میدانِ حشر کی طرف چل پڑیں گے۔

آیت میں زَجْرَةٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ زجر کا اسمِ مرہ ہے۔ اور اس کے عربی زبان میں کئی معنی آتے ہیں۔ ان میں سے ایک معنی ہے مویشیوں کو چلنے پر آمادہ کرنے کے لیے ایسی آوازیں نکالنا جنہیں سن کر وہ اٹھ کھڑے ہوں۔ یہاں اس سے مراد وہ دوسرا صور ہے جو حضرت اسرافیل علیہ السلام مردوں کو زندہ کرنے کے لیے پھونکیں گے۔ اس کے الفاظ کو دیکھتے ہوئے ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا

Marfat.com

ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے ہوں گے یکا یک ایک ڈانٹ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی انہیں سنائی دے گی کہ اٹھ جاؤ، اور وہ بس آن کی آن میں سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن اہلِ تفسیر کا خیال یہ ہے کہ صورتحال یقیناً اس سے مختلف نہیں ہوگی لیکن یہ کام صورِ اسرافیل سے لیا جائے گا تا کہ حشر و نشر کے منظر میں ہیبت کا اضافہ کر دیا جائے۔ اور دوسرا حیران کن اثر اس صورِ اسرافیل کا یہ ہوگا کہ یہ لوگ اٹھتے ہی چاروں طرف تکنے لگیں گے۔ گویا کہ ان کے حواس بھی بحال کر دیے جائیں گے۔ چنانچہ ان کا پہلا احساس یہ ہوگا کہ ہائے ہماری کمبختی یہ تو وہی یوم الجزاء ہے جس کا ہم تمسخر اڑاتے رہے ہیں ممکن ہے فرشتوں کی طرف سے اس کا جواب دیا جائے۔ یا خود ان کا اپنا احساس بول اٹھے یا میدانِ حشر کا سارا ماحول اس وقت زبانِ حال سے گواہی دے رہا ہو کہ ہاں یہ وہی فیصلے کا دن ہے جس کو تم دنیا میں جھٹلایا کرتے تھے۔ تصور ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت منکرینِ قیامت پر کیسی قیامت گزرے گی۔

اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ
ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ
اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ
لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ
عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾
قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ
بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ اِنَّا لَذَآىِٕقُوْنَ ﴿۳۱﴾
فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾ فَاِنَّهُمْ يَوْمَىِٕذٍ فِى الْعَذَابِ
مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا
قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اَىِٕنَّا لَتَارِكُوْٓا
اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴿۳۶﴾ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۷﴾
اِنَّكُمْ لَذَآىِٕقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ

Marfat.com

تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ
مَعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُمْ مُكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ
سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِنْ مَعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ
لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ﴿٤٧﴾ وَ
عِنْدَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ ﴿٤٨﴾ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَكْنُونٌ ﴿٤٩﴾
فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٥٠﴾ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ
إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ﴿٥١﴾ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ﴿٥٢﴾ أَإِذَا مِتْنَا
وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَدِينُونَ ﴿٥٣﴾ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُطَّلِعُونَ ﴿٥٤﴾
فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿٥٥﴾ قَالَ تَاللَّهِ إِنْ كِدْتَ لَتُرْدِينِ ﴿٥٦﴾
وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿٥٧﴾ أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ ﴿٥٨﴾
إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿٥٩﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ
الْعَظِيمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ﴿٦١﴾ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ نُزُلًا
أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ﴿٦٢﴾ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِلظَّالِمِينَ ﴿٦٣﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ
تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ﴿٦٥﴾
فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ
عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ ﴿٦٨﴾

Marfat.com

إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ ﴿٦٩﴾ فَهُمْ عَلَىٰ آثَارِهِمْ يُهْرَعُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ
ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُنْذِرِينَ ﴿٧٢﴾
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ ﴿٧٣﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٧٤﴾

رکوع: ۲۔ (جمع کرو سب ظالموں کو اور ان کے ساتھیوں کو، اور جن کی وہ بندگی کیا کرتے تھے۔ ۲۲) اللہ کو چھوڑ کر، پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔ ۲۳) اور ذرا انہیں روکو، بے شک ان سے کچھ پوچھا جائے گا۔ ۲۴) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔ ۲۵) بلکہ وہ آج اپنے آپ کو حوالے کیے دے رہے ہیں۔ ۲۶) اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے سوالات شروع کردیں گے۔ ۲۷) اور پیروی کرنے والے اپنے پیشواؤں سے) کہیں گے کہ تم ہمارے پاس دائیں طرف سے آتے تھے۔ ۲۸) وہ جواب دیں گے، نہیں بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے۔ ۲۹) ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا بلکہ تم ہی تھے حد سے نکل جانے والے۔ ۳۰) آخر کار ہم پر ہمارے رب کی بات ثابت ہوگئی، بے شک ہم عذاب کا مزہ چکھنے والے ہیں۔ ۳۱) پس ہم نے تم کو گمراہ کیا، ہم خود گمراہ تھے۔ ۳۲) پس وہ سب اس دن عذاب میں شریک ہوں گے۔ ۳۳) ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ ۳۴) یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے۔ ۳۵) اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ ۳۶) بلکہ وہ حق لے کر آیا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی ہے۔ ۳۷) بے شک تم دردناک عذاب چکھنے والے ہو۔ ۳۸) اور تم اسی کا بدلہ دیے جاؤ گے جو تم کرتے رہے ہو۔ ۳۹) مگر اللہ کے خالص بندے ہی اس سے محفوظ رہیں گے۔ ۴۰) یہ لوگ ہیں جن کے لیے روزی ہے جانی پہچانی۔ ۴۱) میوے، اور وہ عزت سے رکھے جائیں گے۔ ۴۲) نعمت کے باغوں میں۔ ۴۳) تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ۴۴) پھرائے جائیں گے ان پر شرابِ معین کے جام۔ ۴۵) چمکتی ہوئی شراب، پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت۔ ۴۶) نہ اس میں کوئی ضرر ہوگا اور نہ اس کو پی کر بہکیں گے۔ ۴۷) اور ان کے پاس باحیاء موٹی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی۔ ۴۸) گویا کہ وہ محفوظ انڈے ہیں۔ ۴۹) پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر حالات پوچھیں گے۔ ۵۰) ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ہمنشیں تھا۔ ۵۱) جو کہا کرتا تھا کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو۔ ۵۲) کیا جب ہم مرجائیں گے مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو ہمیں جزاء وسزا دی جائے گی۔ ۵۳) پھر کہنے لگا کیا تم جھانک کر دیکھو گے۔

Marfat.com

۵۴) پھر وہ جھانکے گا اور اس کو جہنم کے بالکل بیچ میں دیکھے گا۔ ۵۵) کہے گا اللہ کی قسم تم تو مجھے تباہ ہی کر دینے والے تھے۔ ۵۶) اگر میرے رب کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو آج میں بھی پکڑے ہوؤں میں سے ہوتا۔ ۵۷) اور کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں۔ ۵۸) مگر جو ہم پہلی بار مر چکے، اب ہمیں کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ ۵۹) یقیناً یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ ۶۰) ایسی ہی کامیابی کے لیے کوشش کرنے والوں کو کوشش کرنی چاہیے۔ ۶۱) کیا مہمانی کے طور پر وہ بہتر ہے یا زقوم کا درخت۔ ۶۲) ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے۔ ۶۳) بے شک وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ ۶۴) اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔ ۶۵) پس وہ اسی سے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے۔ ۶۶) پھر ان کے لیے اس کے اوپر گرم پانی کی ملونی ہے۔ ۶۷) پھر ان کا لوٹنا دوزخ کی طرف ہوگا۔ ۶۸) انہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا۔ ۶۹) پھر یہ بھی ان کے نقشِ قدم پر بھاگتے رہے۔ ۷۰) حالانکہ اس سے پہلے بھی اگلوں میں بہت سے لوگ گمراہ ہوئے۔ ۷۱) ان میں ہم نے اپنے انذار کرنے والے بھیجے۔ ۷۲) پس دیکھ لو ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جن کو انذار کیا گیا تھا۔ ۷۳) اس بدانجامی سے) صرف وہی لوگ بچے جنہیں اللہ نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ ۷۴)

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾

(جمع کرو سب ظالموں کو اور ان کے ساتھیوں کو، اور جن کی وہ بندگی کیا کرتے تھے۔ ۲۲)
اللہ کو چھوڑ کر، پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔ ۲۳)

مجرمین کی میدانِ حشر میں حاضری کا ایک منظر

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا سے مراد ایک تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، کیونکہ قرآنِ کریم میں شرک کو ظلم قرار دیا گیا ہے۔ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت، سرکشی اور نافرمانی کا رویہ اختیار کیا۔ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں انہیں بھی ظالم کہا گیا ہے۔

اَزْوَاجَ سے مراد وہ بیویاں بھی ہوسکتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دین سے بغاوت اور سرکشی میں اپنے شوہروں سے تعاون کرتی رہی ہیں۔ اور وہ لوگ بھی ہوسکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے بغاوت اور سرکشی میں ان کے ہم مشرب اور معاون رہے ہیں۔ کیونکہ ازواج زوج کی جمع ہے۔ یہ بیوی اور ہم مشرب دونوں پر بولا جاتا ہے۔ البتہ حضرت عمر فاروق کے ارشاد سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں ازواج سے ہم مشرب اور ہم خیال لوگ مراد ہیں۔ یعنی سود خور دوسرے سود خوروں کے ساتھ، زناکار دوسرے زانیوں کے ساتھ اور میخوار دوسرے میخواروں کے ساتھ جمع کیے جائیں گے۔

Marfat.com

وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ سے مراد وہ معبود بھی ہو سکتے ہیں مشرکین جن کی بندگی کیا کرتے تھے، جیسے بت اور شجر و حجر وغیرہ۔ اور وہ انسان اور شیاطین بھی اس سے مراد لیے جا سکتے ہیں۔ جن کی کوشش یہ رہی ہے کہ ان کی بندگی کی جائے، اس کے سامنے سر جھکایا جائے اور انہیں بخشش اور مغفرت کا ذریعہ سمجھا جائے اور جو اپنے دامن گرفتگان کو جنت کا یقین دلاتے رہے۔ اور اسی طرح وہ لوگ بھی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مقابلے میں اپنے وضعی قوانین کی غیر مشروط اطاعت کروائی۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ تمام مشرک اور سرکش لوگوں اور ان کے ہم مشربوں کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے۔ اور اسی طرح ان معبودوں کو بھی جن کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بندگی کی جاتی رہی اور ایسے رہنماؤں کو بھی جو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے توڑ پر اور اس کی حاکمیت کے مقابل میں اپنے وضعی قوانین اور اپنی حاکمیت کا صور پھونکتے رہے۔ اور پھر فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ ان سب کو جہنم کا راستہ دکھا دو تا کہ یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی میں قیادت کے منصب پر فائز لوگ اکیلے ہی اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار نہیں ہوں گے بلکہ جو لوگ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور ان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے وہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اسی طرح جن کی بندگی کی جاتی رہی اور وہ اس بندگی میں خود فریق رہے اور وہ اصنام اور شجر و حجر، لوگ جن کی پوجا کرتے رہے یہ بھی جہنم میں اپنے پوجنے والوں کے ساتھ ہوں گے تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ ہم جن کو خدا سمجھتے رہے ہیں ان کی حقیقت یہ تھی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ البتہ وہ انبیاء و اولیاء اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جن کی تعلیمات کے برعکس ان سے عقیدت رکھنے والوں نے ان کے بارے میں بندگی کے تصورات رکھے ان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، بلکہ ان کی بیزاری کے اظہار کے بعد ممکن ہے مشرکین کے عذاب میں اضافہ ہو جائے۔

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾

(اور ذرا انہیں روکو، بے شک ان سے کچھ پوچھا جائے گا۔ ۲۴) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔ ۲۵) بلکہ وہ آج اپنے آپ کو حوالے کیے دے رہے ہیں۔ ۲۶)

منکرین کی تذلیل

فرشتے جب ان مجرموں کو جہنم کی طرف لے کر جا رہے ہوں گے تو انہیں حکم ملے گا کہ انہیں کچھ دیر کے لیے روکو، ان سے کچھ پوچھنا ہے۔ یہ لے جائے جانے والے سب وہ لوگ ہیں جن میں ایک سے ایک بڑا باغی اور سرکش رہ چکا ہے۔ اور ان کے تکبر کا عالم یہ تھا کہ یہ اپنے پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی کسی بات کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور پھر یہ عام لوگ نہیں ان میں بیشتر لوگ دنیا میں بڑے سے بڑے مناصب پر فائز رہے ہیں۔ کوئی دنیوی جاہ و جلال کا دعویدار تھا اور کوئی علم و فضل میں کمالات کا، کسی کو اپنی مشیخیت پر ناز تھا اور کسی کو اپنے حسب و نسب کی برتری پر۔ لیکن آج یہ سب سر جھکائے خاموشی سے اس طرح حکم میں بندھے چلے جا رہے ہوں گے کہ سب کی ہیکڑی نکل چکی ہو گی اور ہر ایک سراپا اطاعت بنا ہوا ہو گا۔ چنانچہ انہیں روک کر ان سے یہ پوچھا جائے گا کہ دنیا میں تم ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے، تم نے ہر برائی کو فروغ دینے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لیا۔ تم میں اگر ایک قائد تھا تو دوسرے لوگ اس کی قیادت کا ایندھن بنے ہوئے تھے۔ اس کے لیے نعرے لگاتے، جھنڈے اٹھاتے اور اس کی سربلندی کے لیے پسینہ بہاتے اور مال صرف کرتے تھے۔ اور

Marfat.com

قائد اپنے پیروکاروں کی خاطر کیسے کیسے دکھ برداشت کرتے تھے۔ لیکن اپنی قیادت پر حرف نہیں آنے دیتے تھے۔ لیکن آج تم سب تنہا تنہا ایک دوسرے سے بیگانہ اپنی فکر میں مگن چلے جارہے ہو، آخر تم میں یہ تبدیلی کیوں آئی؟ اور پھر دوسرے لوگ جوان شامت زدوں کا نظارہ کر رہے ہوں گے انہیں متوجہ کر کے فرمایا گیا ہے کہ ذرا انہیں دیکھو کہ یہ تو پوری طرح اپنے آپ کو سپرد کیے دے رہے ہیں۔ اپنی سرکشی کو بھول کر مکمل طور پر سپر انداز ہو چکے ہیں۔ انہیں اپنے دائیں بائیں کا کوئی ہوش نہیں۔ کل تک وہ جن کے لیے جان کھپاتے تھے آج انہیں پوچھنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ ہر شخص کو اپنے انجام کی فکر ہے۔ دراصل یہ نقشہ کھینچ کر قریش کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ تم آج اپنے جن تعلقات اور علاقات پر نازاں ہو اور جن وابستگیوں سے تم نے اپنے گروہ بنا رکھے ہیں قیامت کے دن ان میں سے ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ وہاں ہر ایک کو اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اس لیے آج سوچ لو کہ کل تمہارے ساتھ کیا گزرنے والی ہے تاکہ آج اس کی کوئی تجویز کرسکو۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿٢٨﴾ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿٣٠﴾

(اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے سوالات شروع کر دیں گے۔ ۲۷) (اور پیروی کرنے والے اپنے پیشواؤں سے) کہیں گے کہ تم ہمارے پاس دائیں طرف سے آتے تھے۔ ۲۸) وہ جواب دیں گے، نہیں بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے۔ ۲۹) ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا بلکہ تم ہی تھے حد سے نکل جانے والے۔ ۳۰)

میدانِ حشر کا ایک اور منظر لیڈروں اور پیروں کی تو تکار

کفار کے اس ہجوم میں وہ لوگ بھی موجود ہوں گے جنہوں نے اپنی حیثیتِ عرفی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسروں کو گمراہ کیا ہوگا اور وہ لوگ بھی ہوں گے جو ان کے پیچھے چل کر گمراہ ہوئے ہوں گے۔ اب جو ان کی نظر ایک دوسرے پر پڑے گی تو اس مصیبت میں یہ سمجھ کر کہ شاید ہمیں یہ بہانہ کوئی فائدہ دے سکے ایک دوسرے سے الجھ پڑیں گے۔ عوام اپنے قائدین سے کہیں گے کہ تم ہی لوگ ہو جو اصل میں آج ہماری اس مصیبت کے ذمہ دار ہو۔ تم نے اگر بہکانے میں زور صرف نہ کیا ہوتا اور ہماری صحیح رہنمائی کی ہوتی تو آج ہم اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لیے یمین کا لفظ استعمال کیا ہے کہ تم ہمارے پاس یمین کی طرف سے آتے تھے۔ یمین مختلف معنی رکھنے کی وجہ سے آیت میں مختلف مفاہیم کا باعث بنا ہے۔ یمین کا ایک معنی ہوتا ہے قوت وطاقت۔ اس لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم کمزور لوگ تھے اور تم قوت وطاقت کی علامت تھے، اختیارات کا مرکز تھے، قیادت وسیادت کا تمہیں مقام حاصل تھا، تم اپنی تمام قوتوں سمیت ہم پر اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس طرح سے تم نے ہمیں جدھر موڑا ہم ادھر مڑ گئے۔ دوسرا معنی یمین کا ہوتا ہے قسم۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم قسم کھا کھا کر ہمیں یہ باور کراتے تھے کہ ہمارا مذہب درست ہے اور رسول ﷺ کی تعلیم سراسر باطل ہے۔ یمین کا تیسرا معنی ہے خیر اور بھلائی۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم ہمارے خیر خواہ بن کر ہمارے پاس آتے تھے اور ہمیں یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہیں جس راہ پر چلانا چاہتے ہیں وہی حق اور بھلائی کی راہ ہے۔ اس طرح سے ہم تمہارے فریب میں آگئے۔ لیکن بعض اہلِ علم نے آیت کے الفاظ کو ایک اسلوب قرار دیتے ہوئے یہ مفہوم لیا ہے کہ دراصل پیچھے چلنے والوں نے جب اپنے قائدین پر اپنی گمراہی کا الزام لگایا تو انہوں نے یہ کہا کہ تم

Marfat.com

ہمارے پاس آتے رہے ہو، کبھی دائیں سے، کبھی بائیں سے، کبھی آگے سے کبھی پیچھے سے۔ لیکن ابھی وہ صرف یہ کہہ پائے تھے کہ تم آتے رہے ہو ہمارے پاس کبھی دائیں سے، تو قائدین نے فوراً ان کی بات کاٹ لی تاکہ وہ ان کے الزام کو غلط ثابت کر سکیں۔ اور فوراً اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ تم جو کچھ ہم پر الزام لگا رہے ہو کہ ہم تمہاری گمراہی کے ذمہ دار ہیں اس میں ذرہ بھر صداقت نہیں۔ تم درحقیقت خود ہی ایمان لانے والے نہ تھے ورنہ ہمارے پاس کوئی ایسی طاقت نہ تھی کہ جس سے ہم زبردستی تم سے اپنی بات منوا سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم خود ہی حد سے بڑھ جانے والی قوم ہو۔ اپنی گمراہی کے ذمہ دار تم خود ہو۔ تمہیں ایمان کی ذمہ داریاں قبول نہ تھیں، تمہارے نفس کی آزادیاں چونکہ رسول کی مخالفت میں محفوظ رہتی تھیں اس لیے تمہیں ہماری بات سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، بلکہ تم نے ہماری ہر بات کو اپنے دل کی آواز سمجھا اور اسے قبول کر لیا۔ اب بجائے اس کے کہ اس حقیقت کو قبول کر لیا جائے تم نے ہمیں الزام دینا شروع کر دیا ہے۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾

(آخر کار ہم پر ہمارے رب کی بات ثابت ہو گئی، بے شک ہم عذاب کا مزہ چکھنے والے ہیں۔ ۳۱

پس ہم نے تم کو گمراہ کیا، ہم خود گمراہ تھے۔ ۳۲)

ابلیس نے جب اللہ تعالیٰ کے سامنے ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہا کہ میں اولادِ آدم کو ہر ممکن طریق سے گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر کو آپ شکر گزار نہیں پائیں گے تو اس کے جواب میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ تمہارا داؤ میرے نیک بندوں پر نہیں چلے گا۔ البتہ جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی میں تمہیں اور انہیں بھی جہنم کی نذر کر دوں گا۔ بلکہ جہنم کو تم سے بھروں گا۔ قائدین یہ کہیں گے کہ ہم اپنے اعمال اور کفر کے باعث اس قابل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہم پر لازم ہو گیا۔ اب ہمیں جہنم کے عذاب کا مزہ چکھنا ہے۔ ہم چاہے اس کا ذمہ دار کسی کو بھی ٹھہرائیں لیکن ہم اپنی ذمہ داری سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس لیے جہنم کے عذاب کا استحقاق ہم پر ثابت ہو چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ ہم نے تمہیں گمراہ کیا تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے ہم خود گمراہ تھے، ہماری دکان سے ملنے والی جنس گمراہی کے سوا اور کوئی نہ تھی۔ ہمارے دامن میں صرف گمراہی کے کانٹے تھے، تم جب ہمارے پاس آئے تو ہم وہی چیز پیش کر سکتے تھے جو ہمارے پاس تھی۔ اب اس پر شکایت بے معنی ہے۔ درخت اپنا وہی پھل پیش کرتا ہے جو اسے لگتا ہے، ہم نے بھی وہی پھل آپ کے سامنے رکھا اور آپ چونکہ اس کے طلبگار تھے آپ نے شوق سے اسے قبول کیا، تو آج اس کا انجام سامنے ہے، شکایت بیکار ہے۔

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

(پس وہ سب اس دن عذاب میں شریک ہوں گے۔ ۳۳)

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

قائدین اور ان کی پیروی کرنے والوں کی تو تکار اور بحث کے بعد پروردگار فیصلہ کن انداز میں فرما رہا ہے کہ ان دونوں کو ان کی بحث سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پیروی کرنے والوں کا یہ عذر مسموع نہیں ہوگا کہ ان کے قائدین نے انہیں گمراہ کیا تھا بلکہ ان کے گمراہ ہونے کی سزا انہیں اسی طرح ملے گی جیسے ان کے گمراہ کرنے والوں کو ملے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو اتنی عقل دے رکھی ہے کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے اور

Marfat.com

اس پر مزید اس کا کرم یہ ہے کہ اس نے سمجھانے بجھانے کے لیے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں۔ اور رسولوں کے چلے جانے کے بعد ہمیشہ ان کی راہ پر چلنے والے اہلِ علم نے لوگوں کو راہِ راست پر چلنے کی تلقین کی۔ اس بنا پر ان کی گمراہی کی ذمہ داری ان پر ڈالی جائے گی کوئی دوسرا حوالہ انہیں فائدہ نہیں دے گا۔ اور نہ ان کے قائدین اور پیشواؤں کی کسی معذرت کو قبول کیا جائے گا بلکہ ان کی گمراہی کا وبال بھی انہیں پر پڑے گا۔ البتہ اگر کہیں ایسا ہو کہ طاقت اور احتیاج کے دباؤ سے کسی کو باطل پر چلنے پر مجبور کر دیا جائے اور اس کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ رہے ورنہ اس کی زندگی خطرے میں ہو۔ تو ممکن ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے کوئی رعایت ہو جائے۔ بجز اس کے کہ اور کوئی صورت ایسی نہیں جس میں اپنی گمراہی کا سبب دوسروں کو بتا کر جان چھڑانے کی کوشش کی جائے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ عذر قبول کر لیا جائے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٤﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴿٣٦﴾

(ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ ۳۴) یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے۔ ۳۵) اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ ۳۶)

گزشتہ آیت کی مزید وضاحت

گزشتہ آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے دین سے برگشتگی اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب پر قوموں کو سزا کسی ایک دور یا کسی ایک قوم کا معاملہ نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا اٹل اصول ہے کہ جب بھی کسی قوم نے ان جرائم کا ارتکاب کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ضرور گرفت فرمائی ہے۔ اسی حوالے سے فرمایا گیا ہے کہ ہم ہمیشہ مجرمین کے ساتھ ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ چاہے کوئی آگے چلنے والا ہو یا پیچھے چلنے والا۔ ہر شخص کی گمراہی اس کی اپنی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ ہر دور کے انسانوں کا یہی حال رہا ہے کہ جب بھی انہیں کہا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ تو جن لوگوں نے اپنی خدائی کا صور پھونک رکھا تھا اور جن طاغوتی قوتوں نے اپنے آستانے بچھا رکھے تھے اور وہ لوگوں کو اپنے طریقے کی پیروی پر مجبور کرتے تھے۔ اور اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے اپنے لیے سجدہ گاہیں تجویز کر رکھی تھیں اور مختلف قوتوں کی بندگی کو اپنا طرزِ عمل بنا رکھا تھا یہ سب بھڑک اٹھتے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ رسول جو ہمیں توحید کی دعوت دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت کی طرف بلاتا ہے یہ صحیح ہے کہ اس پر اترنے والی کتاب فصاحت و بلاغت کا مرقع ہے اور وہ عجیب و غریب خبریں دیتا ہے تو اس کی حیثیت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک بہت بڑا شاعر ہے اس لیے فصاحت و بلاغت اس کے منہ سے جھڑتی ہے۔ اور وہ دماغ کے فتور کا شکار ہے اس لیے الٹی سیدھی غیب کی خبریں دیتا ہے۔ تو کیا ایسے شخص کے کہنے پر ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہم اور ہمارے آباؤ اجداد بندگی کرتے رہے ہیں۔ یہ وہ گمراہی ہے جس کا شکار ماضی کی قومیں بھی رہی ہیں اور اب قریش بھی اسی کا شکار ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون چونکہ سب کے لیے ایک ہے اس لیے جس طرح گزشتہ معذب قومیں اپنے اس استکبار کی وجہ سے عجیب و غریب گمراہیوں کا شکار ہوئیں اسی طرح قریش بھی ہو چکے ہیں۔ تو جو سزا انہیں مل چکی ہے یقیناً وہی سزا قریش کو بھی ملے گی اگر انہوں نے اپنی اصلاح نہ کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں کسی کے لیے استثنیٰ نہیں۔

Marfat.com

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۷﴾

(بلکہ وہ حق لے کر آیا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی ہے۔ ۳۷)

قریش کے طعن کا جواب

یہ قریش کو جواب دیا گیا ہے کہ جسے تم شاعر اور مجنون قرار دے رہے ہو، وہ شاعر اور مجنون نہیں اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔ اس کے رسول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہر پیغمبر اور رسول نے اس کے آنے کی خبر دی اور اس کی علامات بتائیں۔ بعض رسولوں نے اس کے نام تک کی خبر دی۔ اس کی جائے پیدائش اور اس کے دارالہجرت تک کی اطلاع دی۔ انجیل میں اور زردشت کی بعض پیشگوئیوں میں فتح مکہ کی خبر دی گئی ہے اور آپ کے لشکر کے سپاہیوں کو نہ صرف قدوسی قرار دیا گیا ہے بلکہ ان کی تعداد تک بتائی گئی ہے۔ بعض کتابوں میں آپ کا حلیہ تک منقول ہے۔ آپ ان تمام خبروں اور پیشگوئیوں کا مصداق بن کر تشریف لائے ہیں۔ آپ نے اپنے سراپا سے ان خبروں کی تصدیق کی ہے جو آپ کی شکل وصورت کے بارے میں دی گئی ہیں اور آپ کی تعلیمات نے ان پیشگوئیوں کا مصداق بن کر دکھایا ہے جن میں آپ کی تعلیمات کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ تو ایسا رسول جو گزشتہ انبیائے کرام اور رسولانِ عظام کی پیشگوئیوں کا مصداق بن کر آیا ہو اسے شاعر اور مجنون قرار دینا صرف دیانت ہی نہیں، عقل وخرد کے ہر تقاضے کی بھی خلاف ورزی ہے۔

اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾
اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

(بے شک تم دردناک عذاب چکھنے والے ہو۔ ۳۸) اور تم اسی کا بدلہ دیے جاؤ گے جو تم کرتے رہے ہو۔ ۳۹)
مگر اللہ کے خالص بندے ہی اس سے محفوظ رہیں گے۔ ۴۰)

مجرمینِ قریش کا انجام

تم نے اب تک ہمارے رسول کی دعوت کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کے دین کو نا کام کرنے کی کوشش کی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم ایک دردناک عذاب کا استحقاق پیدا کر چکے ہو۔ وہ عذاب دنیا میں بھی اتر سکتا ہے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کی داعی نہ ہوئی تو آخرت کے عذاب سے تو کوئی بچانے والا نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ دنیا میں کیے ہوئے اعمال کی سزا دیتا ہے۔ تم نے بھی اگر اپنی دنیوی زندگی کو درست نہ کیا تو آخرت میں تمہیں اپنے کرتوتوں کی جزاء دی جائے گی۔ اس عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں میں شامل کر لیا جائے۔ اور اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ ایمان وعمل کو زادِ سفر بنایا جائے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لایا جائے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر جو شریعت نازل کی ہے اس کی پیروی و اتباع میں زندگی گزاری جائے۔ مخلصین کے لفظ سے اس بات پر زور معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت اور بخشش اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استحقاق کا سرِرشتہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی بارگاہ سے وہی نوازا جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو، کسی اور کے بس میں نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر اس کی نعمتوں میں سے کوئی حصہ دے سکے۔

Marfat.com

أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾
فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾

(یہ لوگ ہیں جن کے لیے روزی ہے جانی پہچانی۔ ۴۱) میوے، اور وہ عزت سے رکھے جائیں گے۔ ۴۲)
نعمت کے باغوں میں۔ ۴۳) تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ۴۴)

اہلِ جنت کا تذکرہ

اہلِ جہنم کے حالات بیان کرنے کے بعد اہلِ جنت کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ پہلی دس آیتوں میں عام اہلِ جنت کا اکرام اور ان کو ملنے والی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد کی آیات میں ایک خاص جنتی کا عبرت آموز واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

عام اہلِ جنت کے بارے میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ انہیں رزق وہ عطا کیا جائے گا جن کی تفصیل مختلف صورتوں میں بیان کی گئی ہے اور ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اور بعض اہلِ علم نے رزقِ معلوم سے یہ مراد لیا ہے کہ اس کے اوقات متعین اور معلوم ہیں۔ یعنی وہ رزق صبح و شام پابندی کے ساتھ عطا کیا جائے گا۔ ان اوقات میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اور مزید یہ بات کہ دنیا میں ہر چیز کا ملنا ظن و گمان پر مبنی ہے۔ کیونکہ دنیا میں انسان کے حالات یکساں نہیں رہتے۔ اس بات کا امکان ہر وقت رہتا ہے کہ حالات میں کوئی بڑی تبدیلی آ جائے۔ لیکن جنت میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ وہاں ہر چیز کا ملنا یقینی اور دائمی ہے۔ یہ کھٹکا دلوں میں کبھی داخل نہیں ہوگا کہ جو عیش آج میسر ہے ہوسکتا ہے کل نہ ہو۔

دوسری آیت میں رزق کی خود تفصیل بیان کی گئی ہے کہ وہ رزق غذا کی صورت میں نہیں بلکہ فواکہ اور میووں کی شکل میں ہوگا۔ کیونکہ غذا کی ضرورت بھوک کو مٹانے کے لیے ہوتی ہے، صرف لذت حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ اور جنت میں چونکہ ہر چیز ابدی ہوگی کسی چیز کو زوال نہیں ہوگا اس لیے وہاں بھوک نہیں لگے گی۔ کیونکہ بھوک لگنے کا مطلب یہ ہے کہ اجزائے جسم کے تحلیل ہونے کے بعد اب ضرورت ہے کہ کچھ کھا پی کر اس تحلیل کی کمی کو دور کیا جائے۔ وہاں کی زندگی بھی دائمی ہے اس لیے زندگی کی بقا کے لیے بھی وہاں غذا کی ضرورت نہیں ہوگی۔ البتہ انسان میں لطف ولذت کا احساس موجود ہوگا تو فواکہ پیش کر کے ان کے لطف ولذت کے احساس کو تسکین دی جائے گی۔

مزید فرمایا کہ اہلِ جنت کو نعمت والے باغوں میں نہایت عزت واحترام سے رکھا جائے گا کیونکہ اگر کسی مہمان کے لیے رنگارنگ نعمتیں چن دی جائیں لیکن اسے احترام نہ دیا جائے تو نعمتیں انسان کے لیے کانٹوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ عزت واحترام سے معمولی ضیافت بھی مزہ دے جاتی ہے اور برے طریقے سے پیش کی جانے والی بیش بہا نعمتیں بھی حلق سے نیچے نہیں اترتیں۔ عزت کی جگہ اللہ کی جنت سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ان نعمت کے باغوں کا اہل جنت کے ٹھکانے کے طور پر خصوصی طور پر ذکر فرمایا گیا۔

مجلس طرازی دوست نوازی اور چار یاری انسان کی ایسی ضرورت ہے کہ جس کے بغیر کوئی خوشی اور کوئی راحت مکمل نہیں ہوتی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ جنت میں مجلسیں بھی جمیں گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان مجلسوں کے شرکاء صرف لذتوں کے حصول کے لیے جمع نہیں ہوں گے بلکہ ان کے دل بھی ایک دوسرے کے قریب ہوں گے۔ اس لیے جب وہ مجلسوں میں بیٹھیں گے اگرچہ ان کی نشست تختوں پر ہوگی لیکن وہ آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ کسی کی پشت کسی کی طرف نہیں ہوگی اور کوئی پہلو بدل کر نہیں بیٹھے گا۔ ہر شخص دوسرے کی باتوں سے بھی محظوظ ہوگا اور ایک دوسرے کو دیکھ کر بھی راحت محسوس کریں گے۔

Marfat.com

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝٤٥ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝٤٦ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ۝٤٧

(پھرائے جائیں گے ان پر شراب معین کے جام۔ ۴۵) چمکتی ہوئی شراب، پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت۔ ۴۶) نہ اس میں کوئی ضرر ہوگا اور نہ اس کو پی کر بہکیں گے۔ ۴۷)

اہلِ جنت کی مجلسی زندگی

مجلسی زندگی کا لازمی حصہ اہلِ عرب میں تمام اہلِ مجلس کی شراب نوشی تھی۔ قیمتی سے قیمتی شراب مجلسوں میں مہیا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور پھر نہایت اہتمام سے شراب کے جام گردش میں لائے جاتے تھے۔ اسلام نے عربوں کی زندگی میں جو تبدیلیاں پیدا کیں اور جسے انسانی زندگی کے لیے نمونہ بنایا وہ، وہ زندگی تھی جس میں عیش و عشرت، اسراف و تبذیر، بے خودی پیدا کرنے والے ماکولات و مشروبات اور مقصدِ زندگی سے بے پرواہ کرنے والی مصروفیات سے روک دیا گیا تھا۔ اور لہو و لعب اور عیش و نشاط کے تمام مشاغل ان لوگوں کو جنت میں بطور انعام دینے کا وعدہ کیا گیا جو دنیا میں ان سے دستکش رہ کر مجاہدانہ زندگی گزاریں گے۔ چنانچہ اہلِ جنت کی مجلسی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ جب اپنی بیش قیمت مسانید پر براجمان ہو کر مجلس طرازی میں مصروف ہوں گے تو ان کی مجلس میں شراب کے جام مسلسل گردش میں رہیں گے۔ جام کے لیے ''کاس'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں ظرف اور مظروف یعنی پیالہ اور شراب دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور شراب کے لیے ''معین'' کا لفظ آیا ہے جس کا اطلاق ایسی مہنگی شراب پر بھی ہوتا ہے جو خالص اور بے آمیز ہو۔ اور ان چشموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جہاں سے شراب ابلتی ہے۔ دنیا میں تو ایسے چشموں کا وجود نہیں، لیکن قیامت کے دن اہلِ جنت کے لیے ایسے چشمے اور نہریں رواں کی جائیں گی جس میں پھلوں سے کشید کی ہوئی شراب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ شراب ابلے گی اور بہے گی اور اس کے لطف و لذت کا آج تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اس کا رنگ سفید اور نہایت چمکدار ہوگا۔ اور وہ شراب لذیذ ہی نہیں بلکہ سراپا لذت ہوگی۔ کیونکہ قرآنِ کریم نے اس کے لیے لَذَّةٍ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اگر اس لفظ کو مصدر قرار دیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ شراب لذت دینے والی نہیں بلکہ مجسم لذت ہوگی۔ اس کی مثبت تعریف کرنے کے بعد ان باتوں کی تردید کی گئی ہے جو دنیا کی شراب کے لازمی خواص ہیں۔ وہ شراب جو دنیا میں عام چلتی ہے اس کو ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے بدبو اور سڑاند سے دماغ جل اٹھتا ہے۔ اس کا پہلا ہی گھونٹ آدمی کے ذائقے کو تلخ کر دیتا ہے اور پھر حلق سے اترتے ہی پیٹ میں ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے، پھر وہ دماغ کو چڑھتی ہے اور دورانِ سر لاحق ہوتا ہے۔ پھر دماغ پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ تو ان سے پوچھیے جو ایسی مجلسوں میں جانے کے عادی ہیں۔ اور اگر شراب پینے میں مکمل احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو نہ آدمی کی زبان قابو میں رہتی ہے اور نہ اس کا جسم انسانیت کی حدود میں رہتا ہے۔ اور جو اپنے آپ کو واقعی میخوار سمجھتے ہیں ان کا تو اصرار یہ ہے کہ وہ شراب نوشی ہی کیا جو اپنا رنگ نہ دکھائے۔ کسی میخوار شاعر کا شعر ہے:

یہ خاک پینا ہے کہ تھوڑی سی پی اور سو رہے
جو پی کے تھانے نہ پہنچے وہ بادہ خوار نہیں

Marfat.com

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جنت میں جس شراب کا دور چلے گا وہ ان تمام خرابیوں سے پاک ہوگی۔ اس سے بدبو کی بجائے خوشبو مہکے گی۔ اس کا مزہ دماغ کو رونق بخشے گا۔ اس میں ''غول'' نہیں ہوگا۔ غول کے معنی دردِ سر، پیٹ کا درد، بدبو اور گندگی، عقل کا بہک جانا مختلف معنی کیے گئے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے سارے ہی معنی مراد ہیں۔ اس کو پی کر نہ اعضاء شکنی ہوگی، نہ عقل تعطل کا شکار ہوگی، وہ جسم اور دماغ دونوں کو نقصان دینے کی بجائے راحت اور سرور کا باعث بنے گی۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾

(اور ان کے پاس باحیاء موٹی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی۔ ۴۸) گویا کہ وہ محفوظ انڈے ہیں۔ ۴۹)

اہلِ جنت کی پرائیویٹ زندگی

انسان کے لطف ولذت کے لمحات ہوں یا نہایت سنجیدہ غور وفکر کی ساعتیں، وہ اچھی بیوی کے بغیر نامکمل رہتی ہیں۔ یہ ضرورت ایسی فطری اور لازمی ہے کہ جنت میں جبکہ ہر جنتی ہر ضرورت اور احتیاج سے بے نیاز ہو چکا ہوگا ایک اچھی بیوی وہاں بھی اس کی چاہت ہوگی۔ عرب اپنی ساری گمراہیوں کے باوجود اپنے حرم میں شرم وحیاء کے قائل تھے۔ ان کے شعراء بھی ایسی کنواریوں اور نازنینوں کی تعریفیں کرتے تھے جو دوسرے لوگوں کی چشمِ تصور سے بھی دور رہتی ہوں۔ اور یہ ذوق ہر اس شخص اور اس قوم کا ہے جن کے یہاں غیرت وحمیت کو انسانی اقدار میں اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسی تصور کے پیشِ نظر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اہلِ جنت کی رفاقت میں ایسی عورتیں ہوں گی جو شرم وحیاء کے اعتبار سے نگاہیں جھکانے والی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے جن شوہروں کے ساتھ ان کا ازدواجی رشتہ قائم کر دیا وہ ان کے علاوہ کسی بھی مرد کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گی۔ علامہ ابنِ جوزی نے نقل کیا ہے کہ یہ عورتیں اپنے شوہروں سے کہیں گی میرے پروردگار کی عزت کی قسم جنت میں مجھے تم سے بہتر کوئی نظر نہیں آتا۔ جس اللہ نے مجھے تمہاری بیوی اور تمہیں میرا شوہر بنایا ہے تمام تعریفیں اسی کی ہیں۔ اور ان کے حُسن کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ بڑی بڑی آنکھوں والی ہوں گی جسے چشمِ غزال کہا جاتا ہے۔

دوسری آیت میں ان کے لیے جو تشبیہ استعمال کی گئی ہے اس میں بھی بہ یک وقت ان کی شرم وحیاء کی تصویر بھی کھینچ دی گئی ہے اور ان کی خوبصورتی کی بھی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ عورتیں ایسی ہیں گویا کہ وہ محفوظ انڈے ہیں۔ پرندہ عام طور پر انڈا اپنے پروں کے نیچے چھپا کے رکھتا ہے تاکہ اس پر بیرونی گرد وغبار نہ پہنچے۔ اس لیے وہ نہایت صاف ستھرا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے ان انڈوں سے انڈوں کی وہ جھلی مراد لی ہے جو چھلکے کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورتیں جھلی کی طرح نرم ونازک اور گداز ہوں گی۔

ہم جب دورِ جاہلیت کے ادب کو دیکھتے ہیں تو بکثرت نظر آتا ہے کہ ان کے شعراء نازنینوں کو تشبیہ شتر مرغ کے انڈوں سے دیتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تشبیہ میں عفت، صیانت اور رنگ تینوں چیزوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور ''مکنون'' نے اس میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ شتر مرغ کے شکاری جانتے ہیں کہ تمام جانوروں میں شتر مرغ اپنے انڈوں کی سب سے زیادہ حفاظت کرتا ہے۔ وہ حتی الامکان انہیں ریت میں چھپا کر رکھتا ہے۔ اس سے شرم وحیاء کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔ اس کے انڈے سنہرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اس لیے شعراء خوبصورت عورتوں کے رنگ کو صفراء سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ خوبصورت عورت کے لیے یہ رنگ سب سے پسندیدہ رنگ ہے۔ اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ جنتی عورتیں سنہرے رنگ کی نہایت نرم ونازک اور شرم وحیاء کی پیکر ہوں گی۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں ہوں گی جن میں قیامت کی بجلیاں مچلتی ہیں صرف اپنے شوہروں کے لیے دراز ہوں گی، ورنہ وہ جھکی رہیں گی۔

Marfat.com

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾
يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾
قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ
لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّىْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾
اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾

(پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر حالات پوچھیں گے۔ ۵۰) ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ہمنشیں تھا۔ ۵۱) جو کہا کرتا تھا کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو۔ ۵۲) کیا جب ہم مرجائیں گے مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو ہمیں جزاء وسزادی جائے گی۔ ۵۳) پھر کہنے لگا کیا تم جھانک کر دیکھو گے۔ ۵۴) پھر وہ جھانکے گا اور اس کو جہنم کے بالکل بیچ میں دیکھے گا۔ ۵۵) کہے گا اللہ کی قسم تم تو مجھے تباہ ہی کردینے والے تھے۔ ۵۶) اگر میرے رب کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو آج میں بھی پکڑے ہوؤں میں سے ہوتا۔ ۵۷) اور کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں۔ ۵۸) مگر جو ہم پہلی بار مرچکے، اب ہمیں کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ ۵۹)

اہلِ جنت کے مابین ایک مکالمہ

اس مجلس طرازی میں بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچے گی کہ انہیں دنیا میں گزارے ہوئے وہ دن یاد آئیں گے جب حق و باطل کی کشمکش میں مختلف لوگوں سے انہیں سابقہ پیش آتا تھا۔ ان میں کہیں اذیتوں سے گزرنا پڑتا تھا اور کبھی بعض دوستوں کی طنز وتعریض سے واسطہ پڑتا تھا۔ چنانچہ اسی حوالے سے باتیں کرتے ہوئے ان میں سے ایک صاحب بولے کہ میرا ایک دوست تھا جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ جب کبھی اس سے آخرت کے حوالے سے بات ہوتی تو وہ نہایت تعجب اور تعریض کے انداز میں مجھ سے کہتا کہ کیا تم بھی آخرت کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو۔ ارے بھائی! جب ہم مر کے مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا اس وقت ہمیں زندہ کیا جائے گا۔ اور پھر میدانِ حشر میں جواب دہی پر مجبور کیا جائے گا اور اس طرح ہمیں جزاء وسزا سے گزارا جائے گا۔ کیا ان میں سے کوئی بات بھی ایسی ہے جسے عقل تسلیم کرتی ہو۔ کہا میرا وہ دوست ہمیشہ مجھ پر ہنستا اور مذاق اڑاتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلامی عقائد پر قائم رکھا۔ آج ہم یہاں پہنچ گئے۔ لیکن میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا انجام کیا ہوا؟ پھر اپنے ساتھیوں سے کہے گا کہ کیا تم بھی اس کا انجام دیکھنا چاہو گے۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ اہلِ جنت کی خواہشوں کو پورا کرنے کا وعدہ کیا ہے چنانچہ اس کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اسے اجازت دی جائے گی کہ وہ جہنم میں جھانک کر دیکھے۔ چنانچہ اپنی مسند سے ایک طرف سر جھکاتے ہوئے وہ دیکھے گا کہ عین جہنم کے بیچ میں اس کا دوست کھڑا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو کیسی کیسی صلاحیتوں سے نوازے گا کہ وہ اپنے تخت پر بیٹھے بیٹھے جس شخص کو چاہیں گے دیکھ لیں گے، چاہے ان کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ حائل ہو۔ چنانچہ جیسے ہی اس پر نظر پڑے گی تو

Marfat.com

وہ اپنے دوست کو خطاب کرتے ہوئے اس پر برہمی کا اظہار کرے گا اور کہے گا کہ ظالم اگر میں تیری باتوں کے پیچھے چلتا تو تو مجھے لے ڈوبتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ میں تمہارے فریب سے محفوظ رہا۔ ورنہ جس عذاب میں تم آج گرفتار ہو اسی عذاب میں میں بھی پکڑا گیا ہوتا۔ اس مجلس کے تمام ساتھی اس منظر کو دیکھ کر اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں پر جھوم اٹھیں گے اور ان کی زبانوں سے بے ساختہ ایسی باتیں نکلیں گی جس سے ان کی غیر معمولی خوشی کا اظہار ہوگا۔ وہ خوشی سے اچھلتے ہوئے کہیں گے کہ ہمیں جو موت آنا تھی وہ آ چکی اب ہم کبھی نہیں مریں گے، موت کا کھٹکا تو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ڈر رہتا تھا، جنت میں آنے کے بعد وہ ڈر بھی جاتا رہا۔ اب نہ کسی موت کا اندیشہ ہے، نہ کسی عذاب کا ڈر۔ یہ جنت ہماری خوشیوں کی منزل ہے۔ ہم نے یہ منزل جیت کر سب سے بڑی بازی جیت لی ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿٦١﴾

(یقیناً یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ ٦٠) ایسی ہی کامیابی کے لیے کوشش کرنے والوں کو کوشش کرنی چاہیے۔ ٦١)

جنت کا حصول سب سے بڑی کامیابی ہے

ہم جس منزل پر پہنچ گئے ہیں یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اس سے بڑی کسی اور کامیابی کا تصور انسان کے لیے ممکن نہیں۔ دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ''پس جو نارِ جہنم سے ہٹا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا پس وہ ٹھہرا کامیاب۔'' دنیا میں رات دن کھوئے رہنا کوئی بڑی کامیابی نہیں، اصل کامیابی جنت کا حصول ہے، کسی کو اگر بڑی سے بڑی خوشی اور کامیابی کے لیے کوشش کرنا ہو تو اسے چاہیے کہ جنت کی طلب میں ہر ممکن کوشش کرے۔ کیونکہ نہ اس سے بہتر کوئی منزل ہے اور نہ اس سے زیادہ پاکیزہ کوئی کوشش ہے۔

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾

(کیا مہمانی کے طور پر وہ بہتر ہے یا زقوم کا درخت۔ ٦٢)

اہلِ جنت کو جنت میں جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن ضیافتوں اور نعمتوں سے نوازا جائے گا اس کا ذکر کرنے کے بعد مخالفین سے پوچھا جا رہا ہے کہ آخرت تو بہر حال آنی ہے تمہیں از سرِ نو زندہ ہو کر اٹھنا ہے اور زندگی بھر کے اعمال کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کرنی ہے۔ اس جواب دہی کے نتیجہ میں دو میں سے ایک نتیجے کا سامنا لازمی ہے۔ کامیابی کی صورت میں جنت کی نعمتیں میسر آئیں گی اور ناکامی کی صورت میں جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور جہنم میں جس مہمانی سے اہلِ جہنم کو واسطہ پڑے گا وہ زقوم کی مہمانی ہوگی۔ ''نُـزُل'' اصل میں اولین مہمانی کو کہتے ہیں۔ مہمان جیسے ہی اپنی سواری سے اترتا ہے اور مہمان خانے میں اسے بٹھایا جاتا ہے تو کھانا پیش کرنے سے پہلے اس کی جو ہلکی پھلکی تواضع کی جاتی ہے اسے ''نُزُل'' کہتے ہیں۔ اہلِ جہنم کو سب سے پہلی جس ضیافت سے سابقہ پڑے گا وہ یہ ہوگی کہ اسے زقوم کھانے کو ملے گا۔

Marfat.com

زقوم کی وضاحت

زقوم دراصل ایک درخت کا نام ہے جو جزیرۂ عرب کے علاقہ تہامہ میں پایا جاتا ہے۔ علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ یہ تمام بنجر صحراؤں میں ہوتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے یہ وہی درخت ہے جسے اردو میں تھوہر کہتے ہیں۔ اسی سے ملتا جلتا ہندوستان میں ایک درخت ہے جو ناگ پھن کے نام سے معروف ہے۔ بعض لوگوں نے اسے زقوم قرار دیا ہے۔ اس درخت کا مزہ نہایت کڑوا اور بو نہایت ناگوار ہوتی ہے۔ اور توڑنے پر اس سے دودھ کا رس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔ ناگ پھن اس بھی زیادہ مکروہ درخت ہے اور وہ اپنی شکل و صورت میں بھی زیادہ خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تھوہر یا ناگ پھن نام کے اعتبار سے ہوسکتا ہے زقوم کے قریب ہو۔ لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے زقوم بالکل اس سے الگ چیز ہے۔ یہ دونوں درخت اپنی بدنمائی اور کراہت کے باوجود زمین ہی میں پیدا ہوتے ہیں لیکن زقوم جہنم کی جڑ سے نکلتا ہے۔ اور دوسرے درختوں کی طرح اس کی تربیت پانی، ہوا اور دھوپ میں نہیں ہوتی بلکہ آگ میں ہوتی ہے۔ اور یہ آگ کے بعض دیگر جانوروں کی طرح آگ ہی میں پھلتا پھولتا ہے۔

سوال کا حاصل یہ ہے کہ ایک طرف تو جنت کی وہ ضیافتیں ہیں جو اہلِ جنت کو دی جائیں گی اور وہ نعمتیں ہیں جن کی نظیر کہیں نہیں۔ اور دوسری طرف جہنم میں ہونے والی تواضع ہے جس کی ابتداء ہی زقوم سے ہوگی۔ جو آدمی اختلالِ دماغ کا شکار نہیں وہ بقائمی ہوش وحواس کبھی دوسری قسم کی ضیافت کو قبول نہیں کرسکتا۔

اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِیْنَ ﴿٦٣﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْٓ اَصْلِ الْجَحِیْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ ﴿٦٥﴾

(ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے۔ ٦٣) بے شک وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ ٦٤) اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔ ٦٥)

زقوم کافروں کے لیے فتنہ

جہنم میں اہلِ جہنم کے ساتھ جو سلوک ہوگا اس کا تذکرہ تو اس لیے کیا گیا تاکہ لوگ اس سے خوفزدہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف آئیں۔ لیکن ہم نے ظالموں کے لیے اسے فتنہ بنا دیا۔ بجائے اس سے ڈر کر ہدایت قبول کرنے کے انہوں نے اس کا خوب خوب مذاق اڑایا۔ روایات میں ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تمہارا دوست یعنی محمد (ﷺ) کہتا ہے کہ آگ میں ایک درخت ہے، حالانکہ آگ اور درخت میں تو باہمی تضاد پایا جاتا ہے۔ درخت لکڑی سے بنتا ہے اور آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ اور جہاں بھی آگ ہوگی وہاں کسی کونپل کے پھوٹنے کا بھی امکان نہیں ہوگا۔ اور اس نے مذاق اڑاتے ہوئے یہ تک کہا کہ زقوم بربر زبان میں کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں۔ یہ تو بہت اچھا ہے کہ جہنم میں مکھن اور کھجور کھانے کو ملے گی۔ قرآنِ کریم نے اگلی آیت میں ان دونوں باتوں کا جواب دیا کہ زقوم تو جہنم کی تہ میں اگنے والا ایک درخت ہے۔ اس لیے نہ تو اس سے مراد کھجور اور مکھن ہے اور نہ یہ اعتراض معقول ہے کہ آگ میں درخت کیسے

Marfat.com

ہوسکتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی مخلوق کے لیے ماحول کو سازگار بنانا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حصہ ہے۔ وہ اگر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ درخت زمین میں اگیں اور پانی سے ان کی سیرابی ہو تو وہ درخت یقیناً زمین میں اگیں گے۔ لیکن اگر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ زقوم نام کا ایک درخت جہنم کی تہ سے نکلے تو اس کی قدرت کو کون چیلنج کرسکتا ہے۔ اس نے یقیناً اس درخت کی فطرت اور جبلت اس طرح کی بنائی ہے کہ وہ آگ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی اسے سیراب کرتی اور پروان چڑھاتی ہے۔ اور یہی اس کے لیے مناسب ماحول ہے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

ایک بلیغ تشبیہ

پھر اس درخت کو مزید ہولناک اور وحشت ناک دکھانے کے لیے یہ فرمایا گیا کہ اس سے نکلنے والے شگوفے اور خوشے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ نہ کسی نے شیطان کو دیکھا اور نہ اس کے سر کو۔ تو پھر زقوم کو اس سے تشبیہ دینے کا کیا فائدہ۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہر زبان میں ایسی چیزوں سے تشبیہ دینے کا رواج رہا ہے جن کا تعلق سراسر خیال سے ہو حقیقت سے نہیں۔ لیکن تشبیہ اس لیے دی جاتی ہے کہ عوام کے ذہنوں میں بعض دفعہ تخیلی چیزوں کا تصور حقیقت سے گہرا ہوتا ہے۔ اور وہ حقیقی چیزوں سے زیادہ ذہنوں پر اثر ڈالتی ہیں۔ مثلاً ایک عورت کی انتہائی خوبصورتی کا تصور دلانے کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ تو پری کی طرح ہے اور انتہائی بدصورتی کو بیان کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ وہ تو چڑیل ہے۔ آپ بھی کسی پراگندہ حال اور پراگندہ بال شخص کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ کہتے ہیں کہ تم نے کیا بھوت جیسی شکل بنا رکھی ہے۔ حالانکہ نہ کسی نے چڑیل کو دیکھا، نہ پری کو اور نہ بھوت کو۔ لیکن ذہنوں پر اس کے اثرات ہمیشہ محسوس کیے گئے ہیں۔ یہاں بھی یہی حال ہے۔ زقوم کے پتوں اور کانٹوں کو شیطان کے سروں سے تشبیہ دے کر اس کی بدنمائی اور ہولناکی میں آخر حد تک اضافہ کر دیا ہے۔

فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾

(پس وہ اسی سے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے۔ ۶۶)

تکلیف دہ غذا

یعنی آگ کی تپش اور عذاب کی شدت سے جبکہ وہ بھوک اور پیاس سے کلبلائیں گے تو اسی درخت کے پھل اور شاید اس کے پتوں کو انہیں کھانے پر مجبور کیا جائے گا۔ چونکہ اور کچھ کھانے کو نہیں ہوگا اس لیے وہ اسی سے اپنا پیٹ بھریں گے۔

ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾

(پھر ان کے لیے اس کے اوپر گرم پانی کی ملونی ہے۔ ۶۷)

Marfat.com

جلا ڈالنے والا مشروب

پھر اس زقوم کو نگلنے اور پیٹ میں اتارنے کے لیے اوپر سے جو پانی پینے کو ملے گا وہ کھولتا ہوا پانی ہوگا۔لیکن ان کے لیے مجبوری یہ ہوگی کہ حلق میں پھنسے ہوئے زقوم کے نوالے نیچے اترنے کا نام نہیں لیں گے۔مجبوراً اسی گرم پانی سے جو آنتڑیوں کو جلا دے گا کام لینے پر مجبور ہوں گے۔

ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِ۟لَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾

(پھر ان کا لوٹنا دوزخ کی طرف ہوگا۔ ۶۸)

اصل ٹھکانہ جہنم

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب اہلِ دوزخ بھوک اور پیاس سے بیتابی کا اظہار کریں گے تو انہیں اس مقام کی طرف ہانک دیا جائے گا جہاں زقوم کے درخت اور کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہوں گے۔زقوم سے جیسے کیسے وہ اپنا پیٹ بھریں گے اور پانی کے ابلتے ہوئے چشموں سے پیاس بجھائیں گے۔پھر وہاں سے انہیں واپس جہنم کی اسی جگہ پر بھیج دیا جائے گا جہاں سے انہیں کھانے پینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔
دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اہلِ جہنم کو اولین ضیافت کے طور پر تو زقوم اور کھولتا ہوا پانی ملے گا، پھر وہاں سے ان کے اصل ٹھکانے یعنی جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾

(انہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا۔ ۶۹) پھر یہ بھی ان کے نقشِ قدم پر بھاگتے رہے۔ ۷۰)

اللہ تعالیٰ نے انسان کے امتحان کے لیے عقل اور بصیرت عطا کی ہے۔البتہ مزید فضل وکرم کے طور پر وحیِ الٰہی کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں۔لیکن انسان کی کمزوری ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ عقل وخرد اور بصیرت سے بہت کم کام لیتا ہے۔اس لیے جب بھی اس کے سامنے حق آیا ہے تو بجائے اس کے کہ عقل وبصیرت کی کسوٹی پر حق وباطل کو پرکھے اور حق کو حق جان کر اس کا اتباع کرے۔اس نے اس کی بجائے ہمیشہ آباؤاجداد کے طریقے کی پیروی کی۔اور جب بھی رسول نے انہیں حق کی طرف دعوت دی اور ان کے غلط رویوں پر تنقید کی انہوں نے رسول کو خبطی شاعر قرار دے کر اپنے آباؤاجداد کی تقلید کو اپنا مذہب بنایا۔اور اسی نے ان کو گمراہی کی دلدل میں دھکیل دیا۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۷۴﴾

(حالانکہ اس سے پہلے بھی اگلوں میں بہت سے لوگ گمراہ ہوئے۔ ۷۱) ان میں ہم نے اپنے انذار کرنے والے بھیجے۔ ۷۲) پس دیکھ لو ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جن کو انذار کیا گیا تھا۔ ۷۳) (اس بدانجامی سے) صرف وہی لوگ بچے جنہیں اللہ نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ ۷۴)

Marfat.com

گمراہی کا اصل سبب آباء پرستی ہے

آباؤ اجداد کی تقلید سے تباہ ہونے والے صرف قریش ہی نہیں بلکہ تاریخ میں بار بار اس حادثہ کا ظہور ہو چکا ہے۔ ان سے پہلے گزرنے والی اکثر قومیں اسی گمراہی میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہوئیں۔ اب یہاں سے تاریخ کی طرف کلام کا رخ مڑ رہا ہے۔ اسی لیے اس کے بعد تاریخ سے ان قوموں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے انذار کے لیے اپنے رسول بھیجے جو ان کی غلط روش یا انجام سے ان کو آگاہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے باپ دادا کی تقلید میں ان انذار کرنے والوں کی پرواہ نہ کی اور ان کی بات کو ٹھکرا دیا۔ بالآخر ان کا انجام جو ہوا وہ تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ اس برے انجام سے صرف وہی لوگ محفوظ رہے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیا تھا۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ
الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ
فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾
وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ
اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي
النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى
اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ
ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا
تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا

Marfat.com

فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿٩٧﴾ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴿٩٨﴾
وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٩٩﴾ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ
الصَّالِحِينَ ﴿١٠٠﴾ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ
يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ
يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴿١٠٢﴾
فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ﴿١٠٣﴾ وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ
صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٠٥﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ
الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿١٠٦﴾ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿١٠٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي
الْآخِرِينَ ﴿١٠٨﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿١٠٩﴾ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٠﴾
إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١١﴾ وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ
الصَّالِحِينَ ﴿١١٢﴾ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ ۚ وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ
وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ ﴿١١٣﴾ ع

رکوع: ۳۔ (ہمیں نوح (علیہ السلام) نے پکارا تو کیا ہی خوب ہیں ہم جواب دینے والے۔ ۷۵) اور ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو بہت بڑی کلفت سے نجات دی۔ ۷۶) اور ہم نے اس کی نسل کو باقی رہنے والا بنایا۔ ۷۷) ہم نے اس کے طریقے پر پچھلوں کو چھوڑا۔ ۷۸) اور سلامتی ہے نوح پر دنیا والوں میں۔ ۷۹) ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیا کرتے ہیں۔ ۸۰) بے شک وہ ہمارے صاحب ایمان بندوں میں سے تھا۔ ۸۱) پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔ ۸۲) اور بے شک اسی کی جماعت میں سے ابراہیم بھی تھا۔ ۸۳) جب وہ اپنے

Marfat.com

رب کے حضور قلب سلیم لے کے آیا۔ ۸۴) جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تم لوگ کس چیز کو پوجتے ہو۔ ۸۵) کیا اللہ کے سوا دوسرے جھوٹ گھڑے ہوئے معبودوں کے طالب ہو۔ ۸۶) تو رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے۔ ۸۷) پھر اس نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی۔ ۸۸) اور کہا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ ۸۹) پس وہ لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ۹۰) پس وہ نظر بچا کر چپکے سے ان کے معبودوں کی طرف گیا بولا تم کھاتے کیوں نہیں ہو۔ ۹۱) کیا بات ہے تم کچھ بولتے بھی نہیں ہو۔ ۹۲) پھر گھسا ان پر مارتا ہوا داہنے ہاتھ سے۔ ۹۳) پھر وہ لوگ آگے حضرت ابراہیم کے پاس بھاگے ہوئے۔ ۹۴) حضرت ابراہیم نے کہا کہ تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو۔ ۹۵) حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو۔ ۹۶) انہوں نے کہا اس کے لیے ایک مکان بناؤ، پس اس کو آگ میں جھونک دو۔ ۹۷) انہوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی تو ہم نے انہیں کو نیچا دکھا دیا۔ ۹۸) حضرت ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۹۹) اے میرے رب! مجھے ایک بیٹا عطا فرما جو صالحوں میں سے ہو۔ ۱۰۰) تو ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔ ۱۰۱) پس جب وہ اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں تو تو بتا تیری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے کہا، ابا جان! آپ کو جو حکم دیا جارہا ہے اس کی تعمیل کیجیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ ۱۰۲) پس جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔ ۱۰۳) اور ہم نے اس کو آواز دی کہ اے ابراہیم۔ ۱۰۴) پس تم نے خواب سچ کر دکھایا، بے شک ہم بہترین نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ ۱۰۵) بے شک یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ ۱۰۶) ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ ۱۰۷) اور اس کا ذکرِ خیر ہم نے بعد والوں میں چھوڑ دیا۔ ۱۰۸) سلامتی ہے ابراہیم پر۔ ۱۰۹) اسی طرح ہم خوبکاروں کو جزاء دیتے ہیں۔ ۱۱۰) یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔ ۱۱۱) اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی کی صالحین میں سے۔ ۱۱۲) اور ہم نے اسے اور اسحاق کو برکت دی اور ان کی ذرّیت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر کھلا ہوا ظلم کرنے والا ہے۔ ۱۱۳)

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾

(ہمیں نوح (علیہ السلام) نے پکارا تو کیا ہی خوب ہیں ہم جواب دینے والے۔ ۷۵) اور ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو بہت بڑی کلفت سے نجات دی۔ ۷۶)

Marfat.com

حضرت نوحؑ کی مایوسی کے بعد دعا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت

ہم اس سے پہلے سورۃ الشعراء آیات ۱۷۔۱۸ میں پڑھ چکے ہیں اور آگے سورۃ نوح میں مزید تفصیل سے پڑھیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو صدیوں تک اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور خونِ جگر پی پی کران کی ہدایت کی کوشش کی۔ اس راہ کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو آپ نے برداشت نہ کیا ہو۔ اور تبلیغ ودعوت اور افہام وتفہیم کا کوئی اسلوب نہیں جس سے آپ نے ان کی ہدایت کے لیے کام نہ لیا ہو۔ لیکن جب قوم نے دعوت قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا حتیٰ کہ آپ کلیۃً ان کی ہدایت سے مایوس ہوگئے، تب آپ نے اللہ تعالیٰ کو پکارا اور قوم کے خلاف استغاثہ دائر کیا۔ اور نہایت عاجزی سے اپنی حالت بیان کرتے ہوئے کہا فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ”حضرت نوح نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو گیا ہوں، اب تو میری مدد کر۔“ اور ان سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ○ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ”اور نوح نے اپنے رب کو پکارا، اے میرے رب! تو زمین پر کافروں میں سے کسی کو چلتا پھرتا نہ چھوڑ، اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو وہ صرف نابکاروں اور ناشکروں کو جنم دیں گے۔“

یاد رہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے اس وقت عذاب طلب کیا اور مایوسی کا اظہار کیا جب آپ اپنی طاقت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ چکے تھے۔ اور تبلیغ ودعوت کے تمام ممکن ذرائع سے کام لے چکے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا۔ اور ان پر طوفان بھیج کر سب کو غرق کر دیا اور صرف حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے اہل کو نجات دی۔ اہل چونکہ ذرّیت اور مخلص مومنین دونوں پر بولا جاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد میں سے صرف ان لوگوں کو نجات بخشی جو صاحب ایمان تھے۔ اور آپ کی اولاد کے علاوہ جو دوسرے لوگ ایمان لائے تھے انہیں بھی کشتی پر سوار ہونے کا موقع دیا اور اس طرح سے ان کی نجات کا سامان کیا۔ آپ کو اور آپ پر ایمان لانے والوں کو اگرچہ اس طوفان سے نجات بخشی جو اس وقت کی معلوم دنیا کی تباہی کا باعث بنا اور یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام تھا۔ لیکن پروردگار نے اس کا ذکر کرنے کی بجائے اس صورتحال کا ذکر فرمایا جس میں تبلیغ ودعوت کے نتیجے میں آپ مبتلا تھے۔ وہ کربِ عظیم تھا جس کا مقابلہ آپ صدیوں سے کر رہے تھے یعنی وہ ظالم قوم جس کی طرف آپ مبعوث ہوئے تھے انہوں نے آپ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے مخالفت اور اذیت رسانی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ دکھ اور تکلیف کی کوئی ایسی شکل نہ تھی جو آپ پر اور آپ پر ایمان لانے والوں پر آزمائی نہیں گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تباہی کا سامان کر کے اس کربِ عظیم سے آپ کو اور آپ کے اہل کو نجات بخشی۔

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس میں ایک طرح سے نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی ہے کہ آپ کے ساتھ جو کچھ آپ کی قوم کر رہی ہے یہی کچھ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔ پھر دیکھ لیجیے پروردگار نے حضرت نوح علیہ السلام کو کامیاب وکامران کیا اور وہ قوم طوفان کا شکار ہوگئی۔ اور اس طرح سے انہیں مٹایا گیا کہ کسی نے ان کی لاشوں تک کو نہیں دیکھا۔ اگر قریش اور دیگر مخالفین نے اپنی روش نہ بدلی اور قومِ نوح کی طرح آپ کی مخالفت میں ہر ممکن طریقہ اختیار کر ڈالا تو وہ دن دور نہیں جب یہ لوگ بھی اسی صورتحال سے دوچار ہوں گے۔

Marfat.com

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾

(اور ہم نے اس کی نسل کو باقی رہنے والا بنایا۔ ۷۷)

قرآنِ کریم نے سورۃ بنی اسرائیل میں بنی اسرائیل اور بعد کی دنیا کی آبادی کو ان لوگوں کی اولاد قرار دیا ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تھے۔ اور کشتی میں صرف آپ کی اولاد نہیں بلکہ وہ لوگ بھی سوار تھے جو آپ پر ایمان لائے تھے۔ اس صورت میں پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ذُرِّیت سے مراد جسمانی اور ایمانی دونوں طرح کی ذُرِّیت مراد ہے۔ اور اگر اس سے مراد صرف نسبی ذُرِّیت ہی ہو تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ کی اولاد سے باہر کوئی اور شخص ایمان نہیں لایا جبکہ قرآنِ کریم نے جابجا ایسے اشارے کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی آپ پر ایمان لائے۔ دونوں صورتوں میں یہ بات تو طے ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کی اولاد ہو یا دوسرے لوگ وہ بہرحال صاحب ایمان لوگ تھے۔ وہ بہرحال باقی رہے اور جن لوگوں نے آپ پر ایمان لانے سے انکار کیا وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اس سے یہ بات خودبخود سامنے آتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں وقتی طور پر حالات کیسی بھی صورتحال اختیار کر لیں لیکن انجام اور مآل کے اعتبار سے بقاء صرف اہلِ حق کا مقدر ہے۔ بعض دفعہ حق دیکھنے کو مغلوب ہو جاتا ہے لیکن وہ حقیقت میں مغلوب نہیں ہوتا۔ ایک وقت آتا ہے جب حق کی روشنی سورج کی طرح غالب آ جاتی ہے۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾

(ہم نے اس کے طریقے پر پچھلوں کو چھوڑا۔ ۷۸)

حضرت نوح ؑ کے ذکرِ خیر اور آپ کے پیغام کو بعد والوں میں باقی رکھا

گزشتہ آیت کی وضاحت میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس آیت نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کے نتیجے میں بہت کم لوگ ایمان لائے۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی دعوت قبولیت سے محروم رہی۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بعد کے آنے والی دنیا میں چرچا آپ کے نام اور آپ کے دین کا رہا۔ مخالفین مٹ گئے اور ان کی مخالفت کی بنیادیں بھی ہل گئیں۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کا نام اور آپ کی دعوت آج تک زندہ ہے۔ بعد میں کتنے عظیم رسول اور پیغمبر آئے جن کے لیے آپ کی اولوالعزمی، راہِ حق میں آپ کی استقامت، اللہ تعالیٰ سے آپ کا بے پناہ لگاؤ اور تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں آپ کا غیر معمولی شغف ان کے لیے مشعلِ راہ بنتا رہا اور لوگوں میں آپ کی نیک نامی تاریخ کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

Marfat.com

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۸۲﴾

(اور سلامتی ہے نوح پر دنیا والوں میں۔ ۷۹) ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیا کرتے ہیں۔ ۸۰) بے شک وہ ہمارے صاحبِ ایمان بندوں میں سے تھا۔ ۸۱) پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔ ۸۲)

حضرتِ نوحؑ کے لیے دنیا ہی میں اظہارِ تحسین

اس سے بڑے اعزاز کی بات اور کیا ہوگی کہ دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام کے لیے تحسین و آفرین اور دنیا و آخرت دونوں میں برکت و سلامتی کی بشارت دی گئی ہے۔ اور بشارت بھی ایسی کتاب میں جو قیامت تک پڑھی جائے گی اور جس کی حامل امت قیامت تک اس دین کی امین بنائی گئی ہے جس دین کے لیے حضرت نوح علیہ السلام نے دکھ اٹھائے تھے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ایسی ہر دلعزیزی عطا فرمائی ہے کہ کسی مذہب کو ماننے والا ان کے بارے میں برا تصور نہیں رکھتا۔ تمام مذاہب کے پیروکار انہیں اپنا بزرگ جانتے اور ان کی تعظیم بجالاتے ہیں۔

تمام محسنین کی یہی جزاء ہے

اس کے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ اعزاز و اکرام ان کی خصوصیت نہیں بلکہ ان صفات کا لازمی نتیجہ ہے جو انہوں نے اس کٹھن وادی میں انجام دیے۔ چنانچہ جو شخص بھی راہِ حق میں ایسی ہی استقامت، ایسی ہی جانفروشی اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ پر بے پناہ اعتماد و توکل کا ثبوت دے گا اور وہ اس راستے میں مقامِ احسان پر فائز ہوگا یعنی اس کی حیثیت امام و قائد کی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ وہی معاملہ کرتا ہے جو اس نے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کیا۔ سلام اس کا عنوان بنا دیا جائے گا اور اس کی بیش بہا قربانیوں اور نیکیوں کا اسے بیش از بیش صلہ دیا جائے گا۔

اگلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ایک مستقل تاریخی سند جاری کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ مومن یہاں اپنے کامل معنی میں ہے۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام ہمارے ایسے بندے تھے کہ جنہیں ہماری ذات، ہماری صفات، ہمارے پیغام اور ہمارے وعدوں میں کبھی شک و شبہ اور اضمحلال کا شائبہ بھی نہیں ہوا۔ حالات کیسے بھی نامساعد رہے ان کی نظر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم، اس پر استقامت اور اس پر اجر و ثواب پر رہی ہے۔ ان کا دل ہمیشہ اس یقین سے لبریز رہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے کبھی ناکام نہیں ہونے دے گا، وہ اپنے بندوں کو کبھی ضائع نہیں کیا کرتا۔

Marfat.com

ایک حقیقت کا انکشاف

اگلی آیت میں ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے۔ دینِ حق سے برگشتہ اور دنیا ہی کو مطلوب و مقصود بنا کر زندگی کھپا دینے والے لوگ ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہی اس دھرتی کا نمک ہیں۔ اور یہ دنیا ہمارے دم سے قائم ہے اور ہمارا وجود اس دنیا کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ لیکن اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ ہمارے یہاں قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے لیے انتخاب کر لیتا ہے وہ لوگوں کی مخالفتوں کے زخم سہتے ہیں۔ اور راہِ حق میں ہر چھوٹی بڑی مصیبت کو برداشت کرتے ہیں لیکن کبھی اپنے اللہ سے شکوہ نہیں کرتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دین اور اللہ تعالیٰ کی رضا کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ حق و باطل کی کشمکش میں جب آخری مرحلہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نہ صرف بچا لیتا ہے بلکہ ہر طرح کے انعامات کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اور ان کے مقابلے میں دوسرے لوگ جو نہ جانے اپنے آپ کو کیا سے کیا سمجھتے تھے انہیں مٹا دیا جاتا ہے۔ جس طرح سونا خالص کرنے کے لیے کھوٹ جلایا جاتا ہے اسی طرح صاحبِ ایمان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان کی ایمانی صلاحیت کے باعث چھانٹ لیتا ہے اور باقی تمام لوگوں کو خس و خاشاک کی طرح جہنم میں جھونک دیتا ہے۔ یہ اس دنیا کی اصل حقیقت ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿٨٣﴾

(اور بے شک اسی کی جماعت میں سے ابراہیم بھی تھا۔ ۸۳)

حضرت نوحؑ کے قافلۂ حق کے ایک سالار حضرت ابراہیمؑ ہیں

اس سے پہلے آیت ۷۸ میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے طریقے کو بعد کے آنے والوں میں بھی باقی رکھا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ اس کی دلیل ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک جلیل القدر شخصیت گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دور کا امام بنایا۔ اور آج دنیا میں تمام قابلِ ذکر مذاہب ان کو اپنا بزرگ مانتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں کہا گیا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حضرت نوح علیہ السلام کی جماعت میں سے تھے۔ یعنی اہلِ حق کا وہ قافلہ جس کے سرخیل حضرت نوح علیہ السلام تھے ایک وقت آیا کہ اس کی قیادت و سیادت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سنبھالی۔ انہوں نے بھی اس راستے میں ایمان و احسان کی وہی قندیلیں روشن کیں جو حضرت نوح علیہ السلام نے کی تھیں۔ اس راستے میں حضرت نوح علیہ السلام ہی کی طرح استقامت اور جانفروشی کی ہمیشہ رہنے والی مثالیں چھوڑیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اسی صدق و اخلاص کا مظاہرہ کیا جو حضرت نوح علیہ السلام کی روایت تھا۔ اندازہ کیجیے کہ جس قافلے کو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا قافلہ سالار ملے اس قافلے کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کبھی مٹ بھی سکتا ہے۔ تاریخ کے سفر میں نشیب و فراز کے مراحل تو آ سکتے ہیں لیکن کبھی اس قافلے کا سفر رکنے میں نہیں آتا۔ کبھی اس قافلے کی قیادت حضرت نوح علیہ السلام نے کی تھی پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو نئی تاب و تواں بخشی، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قیادت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سپرد فرمائی۔ درحقیقت تمام انبیاء و رسل کی ملت ایک ہی رہی ہے، راستہ ایک رہا ہے، دعوت میں کبھی تبدیلی نہیں آئی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کبھی اس کی علمبرداری کسی نے کی ہے اور کبھی کسی نے، لیکن یہ قافلہ رکنے کبھی نہیں پایا۔

Marfat.com

اِذْجَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾

(جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم لے کے آیا۔ ۸۴)

حضرت ابراہیمؑ کا اصل سرمایہ قلبِ سلیم ہے

اس راہ کے قافلہ سالاروں کی سب سے بڑی متاع یہ قلبِ سلیم ہے۔ اور یہی وہ علامت ہے جسے حنیفیت کہا گیا ہے۔ کیونکہ قلبِ سلیم سے مراد وہ دل ہے جو تمام اعتقادی اور اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو، جو شرک و نفاق کے امراض سے بالکل محفوظ ہو، جس میں نافرمانی اور سرکشی کا کوئی جذبہ نہ پایا جاتا ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ جس کے تعلق میں کوئی الجھاؤ نہ ہو، اس کی منزل بھی اللہ تعالیٰ کی ذات ہو اور اس کا راستہ بھی صراطِ مستقیم ہو۔ اللہ تعالیٰ سے جس کی محبت میں کوئی دوسری محبت حائل نہ ہو سکے، بڑی سے بڑی قربانی اس کے لیے اس راستے کا ایک ایسا مرحلہ ہو جس سے گزرے بغیر دل کو تسکین نہ ملتی ہو۔

مزید یہ کہ ایسا گوہرِ گراں مایہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں لے کے آیا۔ کیونکہ اسے خوب معلوم ہے کہ دل کی بیداری اور آبادی بھی اسی محبوب و مطلوب سے ہے اور کسی اور کی پرچھائیں بھی اس دل میں اس محبوب کو گوارا نہیں۔ وہ اپنے دل کو ہر طرف سے صاف اور پاکیزہ کر کے اور ہر تمنا دل سے نکال کر اپنے رب کو دعوت دیتا ہے۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی کیفیت کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ مقام و مرتبہ اس عمر میں عطا فرما دیا تھا جس عمر میں جوانی دیوانگی کی منزلیں طے کرتی ہے۔ چنانچہ اس نعمت سے سرشار ہونے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اپنے والد سے اور ان کے واسطے سے اپنی قوم سے خطاب کیا۔

اِذْقَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾

(جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تم لوگ کس چیز کو پوجتے ہو۔ ۸۵) کیا اللہ کے سوا دوسرے جھوٹ گھڑے ہوئے معبودوں کے طالب ہو۔ ۸۶)

حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فکر و عمل اور دعوت و تبلیغ میں چونکہ حضرت نوح علیہ السلام کا جانشین اور ساتھی قرار دیا ہے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو نورِ توحید عطا کیا گیا تھا آپ اسے دوسرے لوگوں کے سامنے پیش نہ فرماتے۔ اور آپ کو جس قلبِ سلیم سے آراستہ فرما کر دنیا میں مبعوث کیا گیا تھا وہ دل آپ کو خاموش رہنے دیتا۔ اس لیے آپ نے اپنے والد اور اپنی قوم سے براہِ

Marfat.com

راست پوچھا کہ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا معبود کون ہے اور ہم کس کی بندگی بجالاتے ہیں۔ کیونکہ اسی سوال کے جواب میں پوری زندگی کی سلامتی کی ضمانت ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں جو ہر طرح کی پرستش اور اطاعت سے بیگانہ ہو۔ کوئی شخص اگر مذہب سے لاتعلق ہونے کی بنا پر کسی بڑی ہستی کی پرستش یا اطاعت نہیں کرتا تو وہ اپنے نفس کی بندگی بجالاتا ہے۔ ہوائے نفس اور خواہشِ نفس اپنی ہدایت اور نگرانی میں وہ سب کچھ کرواتی ہیں جو ان کی پرستش کا تقاضا ہے۔ اس لیے انسان کی فطرت اور اس کی جبلت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس سوال کا سامنا کرے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے یہی سوال کیا۔ اور اس سوال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے بندے نہیں ہو تو پھر کیا تم نے اس کے مقابلے میں جھوٹ موٹ خدا بنا رکھے ہیں اور ان کی بندگی بجالاتے ہو۔ حالانکہ اس سے بڑی بے حقیقت اور غلط بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ آدمی پرستش اور اطاعت سے تو انکار نہ کرے البتہ اس پرستش اور اطاعت کے لیے اپنے جی سے گھڑ کر کوئی معبود بنالے اور اسی کی بندگی پر اصرار کرنے لگے۔

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾

(تو رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے۔ ۸۷)

مخالفین کے اعتقادات سے استدلال

یعنی اگر تمہارے اپنے گھڑے ہوئے اور بنائے ہوئے خدا معبود ہو سکتے ہیں تو رب العالمین کے بارے میں تم کیا گمان رکھتے ہو۔ جس کے بارے میں تمہیں اعتراف ہے کہ وہ ساری کائنات کا خالق و مالک ہے، وہی ساری کائنات کا رب اور پالنے والا ہے، اسی کی ربوبیت کا فیضان کائنات کی ہر مخلوق کو پہنچ رہا ہے، وہی بے پایاں علم اور قدرت کا مالک ہے، کائنات میں بسنے والی کوئی مخلوق اس کے علم سے باہر نہیں اور کوئی مخلوق اس کی قدرت کو چیلنج نہیں کر سکتی۔ بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس کے سامنے ذرۂ ناچیز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ جس طرح مخلوقات کی ضروریات فراہم کر رہا ہے اسی طرح ان کی حفاظت بھی کر رہا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس ہمہ صفت موصوف ذات کو چھوڑ کر کسی اور کو رب یا معبود بنالیا جائے جبکہ اس کے سوا ہر مخلوق فانی، عاجز، محتاج اور کائنات کی بیشتر مخلوقات سے بے خبر ہے۔ کائنات کی وسعتیں اس کی علمی بساط سے باہر ہیں۔ اس کا دامن مخلوقات کی ضروریات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ کسی کی زندگی کا کفیل ہے اور نہ کسی کو موت دینے پر قادر ہے۔ تو پھر اللہ رب العالمین کے مقابلے میں کسی اور کو معبود بنالینا ایک ایسی جسارت ہے جسے نہ عقل قبول کرتی ہے نہ اخلاق اجازت دیتا ہے۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾

(پھر اس نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی۔ ۸۸) اور کہا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ ۸۹)

پس وہ لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ۹۰)

Marfat.com

آیت کا پس منظر اور اس کا مفہوم

اسی آیات کا پس منظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کو ایک عرصہ گزر گیا تھا لیکن نہ گھر میں اس کے لیے جگہ بن سکی تھی نہ گھر سے باہر اسے کوئی ہموائی مل سکی۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے لوگوں میں ان کی گمراہی کھل کر سامنے آجائے۔ چنانچہ آپ ایسی کسی بات کے حوالے سے ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ دن آپہنچا جس میں قوم کے چھوٹے بڑے شوق اور رغبت سے ایک میلے میں شریک ہوتے تھے اور رات بھر مختلف دلچسپیوں میں کھوئے رہتے تھے اور میلے کا انعقاد معلوم ہوتا ہے شہر سے باہر ہوتا تھا۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کے لوگ اس میلے میں شرکت کے لیے جانے لگے تو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ممکن ہے وہ یہ امید رکھتے ہوں کہ قوم کے اجتماعی عمل اور رویے کو دیکھ کر شاید حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے خیالات میں تبدیلی لاسکیں۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی اور سوچ میں تھے ان کے دعوت دینے پر انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر ستاروں کو دیکھا اور کہا میری طبیعت کچھ مضمحل ہو رہی ہے، میں رات بھر کی کسی مصروفیت میں شریک ہونے کے قابل نہیں۔ ان کا ستاروں کی طرف دیکھنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی بلکہ ایک ایسا طریقہ تھا کہ گھڑی کی ایجاد سے پہلے وقت کا اندازہ کرنے کے لیے عام طور پر لوگ ایسا ہی کیا کرتے تھے اور انہیں ستاروں کی حرکت سے وقت معلوم کر لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ اکثر لوگ اس طریقے سے آگاہ تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ستاروں کی کسی تاثیر کے قائل تھے۔

عربی ادب کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب کوئی شخص یہ جملہ بولتا تھا تو اس سے غور کرنا مراد لیا جاتا تھا۔ ویسے بھی اکثر یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ جب کسی شخص سے فوری فیصلے کی کوئی بات کہی جاتی ہے تو وہ عموماً اوپر سر اٹھا کر فضا میں تکتا ہے یا ستاروں کو دیکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ غور وفکر کر رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی جب میلے پر جانے کی دعوت دی گئی تو آپ چونکہ تبلیغ و دعوت کی ذمہ داریوں کے حوالے سے اکثر سوچ میں ڈوبے رہتے تھے تو آپ نے ستاروں کی طرف دیکھا یعنی غور کیا کہ کیا اس موقع کو مشرکین کے سامنے ان کے معبودوں کی بے بسی کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا تاکہ وہ اپنے سامنے ایک محسوس مثال کو دیکھ کر اپنے مشرکانہ رویے پر نظر ثانی کر سکیں۔ اس لیے آپ نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان کے ساتھ جانے کی بجائے اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں۔ اب سوال یہ تھا کہ ان سے آخر جان کیسے چھڑائی جائے۔ تو آپ نے اس کے لیے فرمایا کہ میں سقیم ہوں۔ سقیم کا ایک معنی تو ہوتا ہے، بیمار۔ اس معنی کے لحاظ سے بھی یہ بات غلط معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس بات پر کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں کہ اس وقت آپ فی الواقع بالکل صحت مند تھے۔ اور دوسرا معنی ہوتا ہے مضمحل ہونا۔ یعنی نڈھال اور ضعیف وناتواں ہونا، جسم کا ٹوٹنا۔ اس معنی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ دن بھر کی تبلیغی کاوشوں اور مخالفین کی مخالفت سے نہایت تھکے ہوئے آزردہ اور مضمحل سے تھے۔ اس لیے اسی حوالے سے آپ نے جانے سے انکار کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ نے اپنی ساری تھکاوٹ اور ماندگی کو بھلا کر لوگوں کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور لوگوں نے آپ کی بجھی ہوئی طبیعت اور ناتوانی کو محسوس کرتے ہوئے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

Marfat.com

فَرَاغَ اِلٰۤى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾

(پس وہ نظر بچا کر چپکے سے ان کے معبودوں کی طرف گیا بولا تم کھاتے کیوں نہیں ہو۔ ۹۱) کیا بات ہے تم کچھ بولتے بھی نہیں ہو۔ ۹۲) پھر گھسا ان پر مارتا ہوا داہنے ہاتھ سے۔ ۹۳)

بت خانے میں حضرت ابراہیمؑ کی ظرافت اور حمیت

رات کا ایک حصہ گزر جانے پر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محسوس کیا کہ اب پہریدار سو چکے ہیں اور بیشتر لوگ میلے کی دلچسپیوں میں کھو چکے ہیں تو آپ نظر بچا کر اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں چھوٹے بڑے بت رکھے ہوئے تھے آپ نے دیکھا کہ بتوں کے سامنے مختلف قسم کے چڑھاوے رکھے گئے ہیں جن میں ہر طرح کی مٹھائیاں بھی تھیں۔ آپ نے بتوں سے مخاطب ہو کر کچھ طنزیہ فقرے چست کیے کہ تم کیسے معبود ہو، تمہارے عبادت گزاروں نے تمہارے سامنے لذیذ کھانے اور حلوے رکھے ہیں تم انہیں کھاتے کیوں نہیں۔ اور پھر مزید آگے بڑھے اور کہا کہ تم تو بولتے تک نہیں ہو۔ پھر آپ نے ان پر چند ہاتھ رسید کیے اور بہت سے بتوں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا اور پھر خاموشی سے وہاں سے نکل گئے۔

فَاَقْبَلُوْۤا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾

(پھر وہ لوگ آئے حضرت ابراہیم کے پاس بھاگے ہوئے۔ ۹۴)

بت کدے کے ذمہ داروں کا تجسس

میلے کی مصروفیت سے فارغ ہو کر معبد کے ذمہ دار جب واپس لوٹے اور انہوں نے بت کدے میں بتوں کی تباہی دیکھی تو سر جوڑ کر بیٹھے، تلاش شروع ہوئی کہ آخر یہ کس کی کارستانی ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہاں شہر میں ایک نوجوان رہتا ہے وہ اکثر بت پرستی کی مذمت کرتے دیکھا گیا ہے یقیناً یہ اسی کی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ لوگ بھاگے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تو آپ نے سب سے پہلے ان لوگوں کا مذاق اڑایا اور بڑے بت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ان سب میں بڑا ہے یقیناً اس نے یہ حرکت کی ہوگی اور ان کی حماقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو اپنے ان معبودوں ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جن پر یہ مصیبت گزری ہے۔ اگر یہ اپنے سر پر آئی ہوئی مصیبت کو نہ خود دفع کر سکتے ہیں اور نہ اس کو بیان ہی کر سکتے ہیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

(حضرت ابراہیم نے کہا کہ تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو۔ ۹۵) حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو۔ ۹۶)

Marfat.com

حضرت ابراہیمؑ کی تعریض

بتوں کے پجاریوں کو ملامت کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ شامت زدو! تم جن کو اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور جنہیں اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو انہیں کی پرستش کرتے ہو۔ اتنی موٹی سے بات تمہیں سمجھ نہیں آتی کہ انسان اپنے خالق کو تو اس لیے پوجتا ہے کہ اس نے اسے تخلیق کیا، لیکن تم ان کی پوجا کر رہے ہوں جنہیں تم نے بنایا یا تراشا ہے۔ اس سے بڑھ کر خلاف عقل بات اور کیا ہوگی کہ مخلوق خالق کو پوجتی ہے اور تم اپنی مخلوق کو پوجتے ہو۔ یعنی جنہیں تم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اسی طرح جنات و ملائکہ میں سے جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ نہ تمہارے خالق ہیں اور نہ مخلوق، بلکہ ان کا خالق بھی پروردگار ہی ہے اور وہ تمہاری طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، تو آخر مخلوق کا مخلوق کو پوجنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾

(انہوں نے کہا اس کے لیے ایک مکان بناؤ، پس اس کو آگ میں جھونک دو۔ ۹۷) انہوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی تو ہم نے انہیں کو نیچا دکھادیا۔ ۹۸)

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کی سازش اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل کا جب ان سے جواب نہ بن پڑا اور وہ آپ کی گفتگو کے سامنے بے بس ہو کے رہ گئے تو تب انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس کے لیے ایک عمارت بنائی جائے اور اسے آگ سے بھر دیا جائے۔ یعنی ایک بڑا آتش کدہ تعمیر کیا جائے اور پھر کسی طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک کر ختم کر دیا جائے۔ البتہ آیت میں کید کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی خفیہ چال کے ذریعے اس تدبیر کو بروئے کار لانا چاہا۔ ممکن ہے انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کی طرف سے کسی مزاحمت کا اندیشہ ہو۔ کیونکہ بدویانہ دور زندگی میں خاندانی عصبیت بڑی اہمیت رکھنے والی چیز ہوتی ہے۔ اس خفیہ تدبیر کو انہوں نے کیا عملی شکل دی اس کا متعین جواب دینا تو مشکل ہے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ بت خانے کے پروہتوں نے حکومت کی مدد سے کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہی جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا خاتمہ بھی ہو جائے اور لوگوں کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی کسی تدبیر میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ آپ کو آگ میں نہ ڈال سکے کیونکہ سورۃ الانبیاء آیت ۶۹ میں قرآنِ پاک کے الفاظ یہ ہیں قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ ''ہم نے کہا اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم کے لیے۔'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینک دیا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں بسلامت نکال دیا۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حقانیت کو لوگوں کے سامنے اتنا نمایاں کر دیا کہ اب خاموشی سے آپ کو نقصان پہنچانا ممکن نہ رہا۔ اب مخالفین اور حکومتِ وقت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔

Marfat.com

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۹۹﴾

(حضرت ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۹۹)

حضرت ابراہیمؑ کی محض اللہ تعالیٰ کے سہارے ہجرت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے رویے کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ ان لوگوں سے ایمان قبول کرنے کی امید کارِ عبث ہے۔ اور حکومت اپنے انتہائی اقدام میں ناکام ہو کر یقیناً کسی نئی تدبیر کی فکر میں ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں اس شہر سے ہجرت کر جاؤں۔ لیکن جاؤں کہاں، اس کی کچھ خبر نہیں۔ جب اپنوں نے برداشت نہ کیا تو باہر اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت اور دعوت دینے والے کو کون برداشت کرے گا۔ دنیا میں میرا کوئی ایسا ٹھکانہ نہیں جس کی طرف رخ کروں۔ جہاں بھی جاؤں گا لوگ شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اس لیے میں کسی ٹھکانے کے تصور سے یہاں سے ہجرت نہیں کر رہا بلکہ میری ہجرت اپنے رب کی طرف ہے۔ اسی سے وفاداری کی پاداش میں یہاں سے نکالا جا رہا ہوں اور اسی کی وفاداری کا حق ادا کرتے ہوئے ہر جگہ جانے کی کوشش کروں گا۔ رہی یہ بات کہ میں راستوں سے بے خبر، منزلوں سے ناآشنا اور لوگوں کے لیے بیگانہ ہوں تو اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ جس اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اتنا بڑا اقدام کر رہا ہوں یقیناً وہ مجھے راستہ دکھائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اس کے اعتماد پر اس کے راستے پر چلنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کیا کرتا۔ اس کا وعدہ ہے جسے قرآنِ کریم میں بھی دہرایا گیا ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ”اور جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کے لیے اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔“ اللہ تعالیٰ میرے لیے بھی راستے کھولے گا۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾

(اے میرے رب! مجھے ایک بیٹا عطا فرما جو صالحوں میں سے ہو۔ ۱۰۰) تو ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔ ۱۰۱)

بیٹے کی دعا اور قبولیت

قرآنِ کریم کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے ہجرت کی ہے تو آپ کے ساتھ صرف آپ کی ایک بیوی اور ایک بھتیجے تھے جو حضرت لوط علیہ السلام کے نام سے معروف ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت عطا فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک آپ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ تکالیف اور غربت میں یقیناً بیوی انسان کا ایک بڑا سہارا ہوتی ہے لیکن بیٹا ایک ایسی ضرورت ہے جو اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے، جس سے دل کی دنیا بھی آباد ہوتی ہے اور امیدیں بھی جوان ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور آپ کو ایک ایسے بیٹے کی بشارت دی گئی جو نہایت حلیم اور بردبار ہوگا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ کی دعا کے نتیجے میں جلدی ہی آپ کو بیٹا عطا کر دیا گیا۔ بلکہ دعا اور بشارت میں سالہا سال کا فصل حائل ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ”شکر ہے اس اللہ کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا

Marfat.com

فرمائے۔" بائبل کا بیان ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۸۶ برس کی تھی اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ۱۰۰ برس تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں کی عمر میں ۱۴ سال کا فاصلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس بیٹے کی دعا مانگی گئی تھی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں اور وہی آپ کی اکلوتی اولاد تھے۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

(پس جب وہ اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں تو تو بتا تیری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے کہا، ابا جان! آپ کو جو حکم دیا جارہا ہے اس کی تعمیل کیجیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ ۱۰۲)

آیت کی تشریح کے ضمن میں ایک ترتیب سے چند باتوں کی وضاحت

آیتِ کریمہ میں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ بیٹا ذبح کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت دیا تھا جب بیٹا "سعی" کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ سعی کا معنی ہوتا ہے دوڑنا پھرنا، دوڑ دھوپ کرنا اور مختلف کاموں میں باپ کا ہاتھ بٹانا۔ یوں تو بیٹا ماں باپ کو ہمیشہ ہی پیارا ہوتا ہے۔ لیکن اکلوتا بیٹا تو پیارا ہی نہیں دلوں کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک ہی بیٹے تھے۔ سال ڈیڑھ سال بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی ہے۔ لیکن سعی کی عمر کو پہنچنے تک آپ کی اور کوئی اولاد نہ تھی۔ اور مزید یہ کہ آپ پیدا بھی اس وقت ہوئے ہیں جب آپ کی عمر ۸۶ سال تھی۔ اکلوتا اور پھر بڑھاپے کی اولاد تو باپ کی کمزوری بن جاتی ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ اب آپ کا بچپنا ختم ہو چکا، لڑکپن بھی ختم ہونے کے قریب ہے، جوانی کے دن بہت دور نہیں، اس عمر میں کون ماں باپ ہیں جن کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز صرف بیٹا ہو کر ہی نہ رہ جائے۔ بڑھاپے میں جوانی کے قریب پہنچنے والے بیٹے کی قربانی، کون اندازہ کرسکتا ہے کہ کتنا بڑا امتحان ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے خلیل تھے ان کے لیے ایسے امتحانات ناگزیر تھے تاکہ وہ محبت اور خلت میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرتے ہوئے دنیا کے لیے ایک مثال بن جائیں۔

چوتھی بات اس آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو ذبح کرنے کا خواب ایک دفعہ نہیں دیکھا بلکہ ایک سے زیادہ مرتبہ آپ کو یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ کیونکہ اگر آپ نے یہ خواب ایک ہی دفعہ دیکھا ہوتا اس کے لیے اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ کی بجائے اِنِّيْ رَاَيْتُ فِي الْمَنَامِ زیادہ موزوں تھا۔ یہی بات صراحت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صاحبزادے سے فرمائی کہ بیٹے میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب بتاؤ تمہاری رائے کیا ہے؟ تاکہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے غور کرسکو کیونکہ یہ معاملہ بیداری کا نہیں، خواب کا ہے اور خواب کے الفاظ بعض دفعہ تعبیر میں صریح نہیں ہوتے۔ اور ویسے بھی خواب میں دیکھی ہوئی چیز اور فرشتے کا لایا ہوا حکم دونوں برابر کیسے ہوسکتے ہیں لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام کم عمر ہونے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تربیت سے یہ بات

Marfat.com

جان چکے تھے کہ انبیاء کا خواب محض خواب نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہوتا ہے۔ اس لیے آپ نے فوراً جواب دیا کہ ابا جان جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ اسے کر گزریئے۔ کیونکہ حکمِ خداوندی کے بعد غور وفکر اور لیت ولعل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اقبال نے اسی کو فیضانِ نظر قرار دیتے ہوئے اظہارِ تحسین کیا ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مزید یہ عرض کی کہ آپ میری طرف سے مطمئن رہیے، آپ مجھے ان شاء اللہ صابرین میں سے پائیں گے۔ اتنا بڑا دعویٰ امتثالِ امر کی اتنی بڑی مثال قربانی کا غیر معمولی جذبہ لیکن اس کے لیے ادعا کی زبان اختیار نہیں کی گئی بلکہ انتہائی انکساری سے عرض کی کہ آپ ان شاء اللہ تعالیٰ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔ یعنی مجھ سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں صبر واستقامت کے پیکر گزر چکے ہیں۔ مجھے کسی بڑی بات کا دعویٰ نہیں، میری تو صرف یہ آرزو ہے کہ اس راستے پر جن لوگوں نے صبر واستقامت کے چراغ جلائے ہیں میں بھی ان عظیم لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝١٠٣

(پس جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔ ۱۰۳)

تسلیم واطاعت کا اصل مرحلہ

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جواب کے بعد تسلیم واطاعت کا وہ مرحلہ آیا جس کا تصور بھی پتّوں کو پانی کر دینے کے لیے کافی ہے۔ دونوں باپ بیٹا منیٰ میں اس جگہ پہنچے جہاں آج کل ایامِ حج میں رمی جمرات کی جاتی ہے۔ باپ نے چھری نکال کر پتھر پر رگڑی اور بیٹے نے اطاعتِ امر کے لیے سر جھکا دیا۔ فرشتے یقیناً سناٹے میں ہوں گے اور فضاء سہمی ہوئی ہوگی یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ باپ جو سرتاپا محبت و شفقت تھا اور بیٹا جو اطاعت وعقیدت کی تصویر تھا، آج یہ زندگی کا انوکھا باب کھولنے کے لیے کیوں تیار ہو گئے۔ فرشتوں نے بھی آج تک بے مثال عقیدت واطاعت کی مثالیں قائم کی ہیں لیکن یہ ایک انوکھا تجربہ تھا جس سے انسانیت امتثالِ امر کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہی تھی۔ جب باپ بیٹا دونوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سپرد کر دیا یعنی باپ نے فیصلہ کر لیا کہ میں زندگی بھر کے ارمانوں کو آج اللہ تعالیٰ کے حضور قربان کر دوں گا۔ اور بیٹے نے عہد کر لیا کہ میں امرِ الٰہی کے سامنے سر ہلانے کی جراٴت بھی نہیں کروں گا۔ تب باپ نے بیٹے کو اٹھایا اور منہ کے بل زمین پر پچھاڑ دیا، تاکہ جب پوری قوت سے گلے پر چھری چلانے کا وقت آئے تو بیٹے کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو باپ کی قربانی کے جذبے میں کمزوری پیدا نہ کر سکیں۔ لیکن بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی جس طرح مسلسل قربانی وایثار کی مجسم تصویر تھی، اس میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ بیٹے کی آنکھ میں آنسو ان کے پائے ثبات میں لرزش پیدا کر سکتے۔ آپ نے بیٹے کو منہ کے بل اس لیے پچھاڑا تھا تاکہ وہ بیٹے کو سجدے کی حالت میں قربان کریں۔ کیونکہ اسلام میں سجدے کی ہیئت اللہ تعالیٰ کے قرب کی سب سے بڑی علامت ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ”سجدہ کر اور اپنے رب سے قریب تر ہو جا۔“

Marfat.com

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٠٥﴾

(اور ہم نے اس کو آواز دی کہ اے ابراہیم۔ ۱۰۴) پس تم نے خواب سچ کر دکھایا، بے شک ہم بہترین نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ ۱۰۵)

نحوی تشریح اور امتحان میں حضرت ابراہیمؑ کی فیروزمندی

اس سے پہلے کی آیت لَمَّا سے شروع ہوتی ہے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ جملہ اس کا جواب ہے۔ لیکن بعض دیگر اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ یہ جملہ اس کا جواب نہیں بلکہ لَمَّا کا جواب محذوف ہے اور اسے ذکر کرنے کی بجائے قاری اور سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی کیفیت اور جن کی وسعت الفاظ کے جامہ میں سما نہیں سکتی۔ باپ بیٹے کا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سپرد کر دینا اور پھر بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دینا اور چھری لے کر پوری قوت سے آمادۂ عمل ہو جانا اور بیٹے کا سر تک ہلانے سے بھی گریز کرنا، یہ اطاعتِ امر اور قربانی و ایثار کی ایسی مثال ہے جس کی کیفیت اور اثرات کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے پروردگار نے اس کے جواب کو ذہنِ سامع پر چھوڑ دیا کہ وہ تصور کرے کہ یہ صورتحال دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں کیسا جوش آیا ہوگا اور پروردگار کو اپنے ان دونوں بندوں پر کیسا پیار آیا ہوگا۔ اسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بیان کی بہتر سے بہتر تعبیر بھی اس کیفیت کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ البتہ اس رحمت کا ظہور اس طرح ہوا کہ پروردگار نے ابراہیم کو پکارا کہ اے ابراہیم! ہم نے تجھے خواب میں ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، صرف ذبح کرتے ہوئے دکھایا تھا، وہ خواب تم نے پورا کر دکھایا۔ اگرچہ تم اس کا مفہوم یہی سمجھے کہ بیٹے کو ذبح کرنا ہے۔ اور تمہارے جوش و جذبہ نے قدم قدم پر اس کی تصدیق بھی کی۔ لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ باپ کے ہاتھوں سے بیٹا ذبح ہو، ہم تو دونوں میں امتثالِ امر کا جذبہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اب جبکہ تو نے اس جذبے کو سچا کر دکھایا ہے تو اب اپنا ہاتھ روک لو۔ ہم اپنے محسنین کو ایسی ہی جزاء دیا کرتے ہیں۔ احسان ہر اس نیکی کو کہتے ہیں جو اس طرح سے کی جائے جس طرح اسے کرنے کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صدق و اخلاص میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔ جو نیکی اور قربانی بھی اس جذبے کے ساتھ کی جائے گی ہم اسے تکلیف یا رنج و غم کا باعث نہیں بناتے، بلکہ اس کے ذریعے سے فضیلتوں کو ابھارنے اور مرتبہ و مقام میں ترقی دینے کا کام لیتے ہیں۔ اور آخرت میں ان ہی نیکیوں کو ابدی بادشاہی کی فیروزمندیوں کا ذریعہ بنائیں گے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿١٠٦﴾

(بے شک یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ ۱۰۶)

حضرت ابراہیمؑ کی عظیم قربانی کا صلہ دائمی قربانی

یعنی باپ کو خواب میں یہ دکھانا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں اور باپ اور بیٹے کا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کی تعمیل از بس ضروری ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی آزمائش تھی جس میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام پورا اترے اور اللہ تعالیٰ نے قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا فرما کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کامیابی کا اعلان فرمایا۔ اندازہ کیجیے جس آزمائش اور امتحان کو

Marfat.com

اللہ تعالیٰ مبین قرار دے اور اس میں کامیابی کا خود اعلان فرمائے تو اس کا اس کے سوا کیا مطلب ہے کہ ان باپ اور بیٹے نے ایک ایسی کامیابی حاصل کی ہے کہ اس آسمان کے نیچے نہ کسی کو اتنا بڑا امتحان پیش آیا اور نہ اس سے زیادہ شاندار کامیابی کسی نے حاصل کی۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾

(ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔ ۱۰۷)

ذبحِ عظیم قرار دینے کی وجہ

اسے بڑی قربانی دو وجہ سے قرار دیا گیا ہے ایک تو اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی درحقیقت دو قربانیوں کا مجموعہ تھی۔ ایک قربانی یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی از اول تا آخر قربانی و ایثار کی داستان تھی۔ اور دوسری قربانی یہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام صبر و جانثاری کا ایک ایسا پیکر ثابت ہوئے کہ قیامت تک کے لیے وہ قربانی کا استعارہ بن گئے۔ تو وہ قربانی جوان عظیم بندوں نے پیش کی اور اسے اللہ تعالیٰ نے ایک بینظیر قربانی کی نیت پورا کرنے کا ذریعہ بنایا۔ تو وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اسے ذبحِ عظیم قرار دیا جائے۔

اور دوسری وجہ اس کو ذبحِ عظیم قرار دینے کی یہ ہے کہ بائیبل اور اسلامی روایات دونوں میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بیٹے کی قربانی کے لیے چھری گلے پر رکھ دی اور اسے پوری قوت سے چلایا تو تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی کہ ابراہیم اپنا ہاتھ روک لو۔ اور ایک مینڈھا آپ کے سامنے پیش کیا گیا کہ اسماعیل کے بدلے میں اس کو ذبح کر دو۔ اور اسے ذبحِ عظیم اس لحاظ سے قرار دیا گیا کہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سنت جاری فرما دی کہ اسے مناسکِ حج میں شامل فرما دیا۔ اور جو لوگ حج پر نہ جا سکیں اور وہ قربانی دینے کی وسعت رکھتے ہوں تو انہیں اپنے گھروں میں قربانی دینے کا پابند کر دیا۔ اور یہ ایسی قربانی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر بلا انقطاع آج تک چلی آ رہی ہے اور قیامت تک ان شاء اللہ تعالیٰ جاری رہے گی۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ صلے

(اور اس کا ذکرِ خیر ہم نے بعد والوں میں چھوڑ دیا۔ ۱۰۸)

آپؑ کی جاں نثاری کی قبولیت

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس جاں نثاری اور فداکاری کو ایسی قبولیت عطا فرمائی کہ اس سنت کو بعد والوں میں بھی باقی رکھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکرِ خیر اور آپ کی تعریف و توصیف بھی بعد کی آنے والی نسلوں میں زندہ رکھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج کوئی آسمانی مذہب ایسا نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بزرگوں میں شمار نہ کرتا ہو۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۱۰۹﴾ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

(سلامتی ہے ابراہیم پر۔ ۱۰۹) اسی طرح ہم خوبکاروں کو جزاء دیتے ہیں۔ ۱۱۰)

Marfat.com

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صدق واخلاص کے باعث دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے سلامتی لازم کردی ہے۔آج بھی جو شخص ان کا ذکر کرتا ہے ان کی سلامتی کے لیے دعا بھی کرتا ہے۔اور یہ سلامتی اور برکت کسی حسب ونسب کی وجہ سے نہیں بلکہ ان لوگوں کو ملتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ صدق واخلاص،وفاداری وجاںنثاری اور اخلاصِ عمل میں ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک ہوں۔اور حضرت ابراہیم علیہ السلام یقیناً ایسے تھے۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١١﴾

(یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔ ۱۱۱)

مومن یہاں اپنے مکمل معنی میں ہے۔علم الیقین ہو،عین الیقین ہو یا حق الیقین ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور آپ کے احکام کے بارے میں ہر طرح کے یقین کی قوت سے مالامال تھے۔اور یہ یقین کی قوت ہی کے کرشمے ہیں کہ بڑی سے بڑی قربانی کے وقت بھی ان کے پائے استقامت میں کبھی تزلزل نہ آیا۔ان کی پوری زندگی خود فراموشی اور اللہ تعالیٰ کی ہمہ وقتی یاد سے وابستہ ہے۔وہ جاںنثاری اور فداکاری کی تصویر ہیں۔ان کے ایمان کا کم سے کم درجہ وہ ہے جسے اقبال نے خراج تحسین پیش کیا ہے:

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٢﴾ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ۭ
وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿١١٣﴾

(اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی،ایک نبی کی صالحین میں سے۔ ۱۱۲) اور ہم نے اسے اور اسحاق کو برکت دی اور ان کی ذرّیت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر کھلا ہوا ظلم کرنے والا ہے۔ ۱۱۳)

حضرت اسحاقؑ قربانی کا انعام ہیں

تورات کی روایت کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت پیدا ہوئے جبکہ ان کے والد ماجد کی عمر ۸۶ سال تھی۔اور تورات ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کی عمر ۱۳ سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں انہیں ذبح کرتے ہوئے دکھایا۔ اور دونوں باپ بیٹا اس خواب کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کے لیے تیار ہوگئے۔باپ اپنے بیٹے کے گلے پر امتثالِ امر میں یقیناً چھری چلا دیتا اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ان کا ہاتھ نہ روک دیتا۔یہ بہت بڑا امتحان تھا جس میں باپ بیٹا دونوں اللہ تعالیٰ کے یہاں سرخرو ٹھہرے۔اس پر پروردگار نے خوش ہو کر اور انعام کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوسرا بیٹا عطا فرمایا جن کا اسمِ گرامی اسحاق تھا۔اور اس وقت ان کے والد ماجد کی عمر تورات کی روایت کے مطابق ۱۰۰ سال ہوچکی تھی۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صرف بیٹے کی بشارت ہی نہیں دی گئی بلکہ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ وہ نبی ہوں گے اور صالحین میں سے ہوں گے۔اس سے پیچھے ہم پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جبکہ

Marfat.com

آپ کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی بیٹے کے لیے دعا مانگی تھی تو یہ درخواست کی تھی کہ الٰہی! وہ بیٹا صالحین میں سے ہونا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے نزدیک اس بیٹے کی کوئی اہمیت نہیں جس میں صالحیت نہ پائی جاتی ہو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں اولاد میں اضافہ پیشِ نظر نہیں ہوتا بلکہ وہ ایسی ذُرِّیت اور اولاد چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور اصلاحِ خلق کے لیے ان کا دست و بازو بن سکے۔ چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو صالحین میں سے پیدا کیا گیا۔ اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنی قربانی دے کر ثابت کر دیا کہ وہ اپنے والد ماجد کی آرزوؤں کا عین مصداق ہیں۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی تو انہوں نے فرمایا کہ کاش اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔ کیونکہ آپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پا کر اولاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہو چکے تھے۔ ان حقائق کی بنا پر حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت دیتے ہوئے بطورِ خاص پروردگار نے فرمایا کہ وہ صالح اور نبی ہوگا۔ اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس ترتیب کے ساتھ قرآنِ کریم نے قربانی کے واقعہ کو بیان کیا ہے اور پھر آخر میں جا کر حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یکے بعد دیگرے پیدا ہونے والے بیٹوں میں پہلے حضرت اسماعیل تھے اور اس کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام۔ حضرت اسحاق قربانی کے واقعہ کے بعد پیدا ہوئے۔ وہ قربان ہونے والے فرزند نہیں بلکہ قربانی کا انعام ہیں جو اس دنیا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملا۔ اس سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ یہود نے حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی جو روایات گھڑی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے پر چند سامنے کی باتیں

بعض باتیں بالکل پیش پا افتادہ ہیں۔ ان کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہود حضرت اسحاق علیہ السلام کو کس طرح ذبیح قرار دیتے ہیں۔ مثلاً بائیبل سے یہ بات ثابت ہے کہ قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی اور یہ بات بھی بائیبل ہی سے معلوم ہوتی ہے کہ اکلوتے بیٹے حضرت اسماعل علیہ السلام تھے، حضرت اسحاق نہیں۔ کیونکہ آج بھی بائیبل میں یہ بات صراحت سے موجود ہے کہ:

''اور ابراہام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا اور ساری نے ابراہام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے، سو تو میری لونڈی کے پاس جا، شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابراہام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابراہام کو ملکِ کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے۔ اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی۔'' (پیدائش ۱۶۔۱۔۳)

''اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابراہام ۱۰۰ برس کا تھا۔

بائیبل کے مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۴ برس تک تنہا حضرت اسماعیل ہی حضرت ابراہیم کے بیٹے تھے۔ کیونکہ جب ابراہیم پیدا ہوئے ہیں تو بائیبل کی شہادت کے مطابق آپ کی عمر ۸۶ برس تھی۔ اور جب حضرت اسحاق پیدا ہوئے تو آپ ۱۰۰ سال کے ہو چکے تھے۔ اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی۔ تو خود فیصلہ کر لیا جائے کہ اکلوتا کون تھا اور قربانی کس کی مانگی گئی اور ذبیح کون ہے۔

Marfat.com

معتبر روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا اس کے سینگ خانہ کعبہ میں آویزاں کردیے گئے تھے۔ اور وہ حضرت عبداللہ ابنِ زبیر کے زمانے تک محفوظ رہے۔ ظالم حجاج بن یوسف کے سنگ باری کرنے پر خانہ کعبہ مسمار ہوا تو وہ سینگ بھی ضائع ہوگئے۔ ابنِ عباس گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے یہ سینگ خانہ کعبہ میں دیکھے تھے۔ بالکل سامنے کی بات ہے کہ مینڈھے کے سینگوں کا خانہ کعبہ میں پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ ملکِ شام میں نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا۔ اور حضرت اسماعیل کے ساتھ پیش آیا تھا۔ کیونکہ اللہ کے جس گھر کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے تعمیر کیا اسی میں ان کی یادگار بھی محفوظ رکھی گئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آنحضرت ﷺ کی بعثت تک جس طریقے سے حج کیا جاتا رہا اور مناسکِ حج ادا ہوتے رہے ان میں ہمیشہ قربانی شامل رہی۔ اور قربانی کے جانور منیٰ میں اسی جگہ ذبح کیے جاتے رہے جہاں قربانی کا یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اور پھر آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد آپ نے بھی اس طریقے کو اسی طرح قائم رکھا، بلکہ جب صحابہ نے آپ سے پوچھا مَاهٰذِهِ الْاَضَاحِيُّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ''اے اللہ کے رسول، یہ قربانیاں کیا ہیں؟'' آپ نے فرمایا هٰذِهٖ سُنَّةُ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ ''یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آج تک ساڑھے چار ہزار سال تک متواتر عمل اس بات کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیل ہوئے ہیں، بنی اسحاق نہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو۔ اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یادگار کہتے ہوں۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے اسے برکت دی اور اسحاق کو برکت دی۔ بعض لوگوں نے ''اسے'' سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لیا ہے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ یہاں دو شخصیتوں میں تقابل ہے اور وہ دونوں برابر کی ہیں۔ اگر ایک سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لیا جائے اور دوسری حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں تو نہ یہ دونوں برابر ہیں کیونکہ یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔ اور نہ ان میں تقابل صحیح ہے کیونکہ تقابل دو بھائیوں میں ہوتا ہے باپ اور بیٹے میں نہیں، جبکہ حضرت اسحاق حضرت ابراہیم کے بیٹے ہیں اس لیے ''اسے'' سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں بھائیوں میں تقابل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے ان دونوں بھائیوں کو برکت عطا فرمائی۔ حضرت اسحاق کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے اور ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی وسعت اور ایسی عزت عطا فرمائی کہ صدیوں تک انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی علمبرداری کی۔ بڑی بڑی حکومتیں ان کی نگرانی میں بنتی اور ترقی کرتی رہیں اور صدیوں تک دینی امامت و قیادت کا علم ان کے ہاتھوں میں رہا۔ اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد بنی اسماعیل کہلائی۔ اور تمام اہلِ عرب ان کی اولاد ہی کو اپنا مقتداء اور پیشوا مانتے رہے۔ قبیلۂ قریش جو براہِ راست حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کہلاتا تھا نزولِ قرآن کے وقت تمام جزیرۂ عرب پر ان کی سیاسی قیادت غالب تھی اور ہر جگہ ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ سارا سال ان کے قافلۂ تجارت پر کوئی ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتا تھا جبکہ باقی قبائل اشہر حرم کے سوا سفر نہیں کرسکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے گھر کی انہیں تولیت حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ کے گھر کا حج ان کی نگرانی میں انجام پذیر ہوتا تھا۔ یہ دو خاندان مشرق وسطیٰ میں خاص قدر و منزلت کے حامل تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص برکت عطا فرمائی تھی۔ لیکن یہ تمام تر قدر و منزلت اور خیر و برکت اس انتساب کا نتیجہ تھا جو انہیں حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام سے تھی۔ اور ان کی تمام تر دنیوی اور اخروی کامیابیاں اس دین سے متعلق رہنے اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرنے میں مضمر تھیں جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔

Marfat.com

ان کا یہ استحقاق ذاتی نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کے نتیجے میں ان کو عطا ہوا تھا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ان کا یہ یاد دلایا گیا ہے کہ اب اگر تم صرف اس بات کو اپنے لیے سرمایۂ عزت وافتخار بنا لو کہ تم ان بزرگوں کی اولاد ہو تو یہ فخر تمہارے کام نہیں آئے گا۔ اب تو یہ دیکھا جائے گا کہ تم میں محسن کون ہے اور ظالم کون ہے۔ ان میں کون اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل اور اس کی اطاعت وبندگی کو اپنا وظیفۂ حیات سمجھتا ہے اور وہ کون ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا رکھے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کو ضروری سمجھنے کی بجائے دوسروں کو اس میں دخیل مانتا ہے۔ یہ وہ بنیادی تصور ہے جس پر ان کی آئندہ زندگی کی خیر وفلاح کا دار و مدار ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾
وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا
هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰى
مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ
عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ
اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ
رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾
سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ
مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ
نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ

Marfat.com

دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ ع

رکوع: ۴۔ (ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا۔ ۱۱۴) اور ان کو اور ان کی قوم کو کربِ عظیم سے نجات دی۔
۱۱۵) ہم نے ان کو نصرت بخشی، تو وہی غالب آنے والے بنے۔ ۱۱۶) ہم نے ان کو نہایت واضح کتاب عطا کی۔
۱۱۷) اور ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی۔ ۱۱۸) اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکرِ خیر باقی رکھا۔ ۱۱۹) سلام ہے موسیٰ
اور ہارون پر۔ ۱۲۰) ہم بہترین نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیتے ہیں۔ ۱۲۱) بے شک وہ دونوں ہمارے مومن
بندوں میں سے تھے۔ ۱۲۲) اور بے شک الیاس بھی یقیناً پیغمبروں میں سے تھے۔ ۱۲۳) جب انہوں نے اپنی قوم
سے کہا کیا تم لوگ ڈرتے نہیں ہو۔ ۱۲۴) کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑتے ہو۔ ۱۲۵) اس اللہ کو
جو تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے اگلے آباؤ اجداد کا بھی۔ ۱۲۶) تو انہوں نے اس کو جھٹلا دیا تو بے شک وہ گرفتار کیے
جانے والوں میں سے ہوں گے۔ ۱۲۷) بجز ان بندگانِ خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا۔ ۱۲۸) اور ہم نے اس کا
ذکر بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔ ۱۲۹) سلام ہے ال یاسین پر۔ ۱۳۰) ہم بہترین نیکی کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ
دیتے ہیں۔ ۱۳۱) بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ ۱۳۲) بے شک لوط بھی یقیناً پیغمبروں میں سے
تھے۔ ۱۳۳) اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے اسے اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی۔ ۱۳۴) بجز ایک بڑھیا
کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔ ۱۳۵) پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔ ۱۳۶) بے شک تم ان کی
بستیوں پر گزرتے ہو صبح کو بھی۔ ۱۳۷) اور رات کو بھی، تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔ ۱۳۸)

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾
وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

(ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا۔ ۱۱۴) اور ان کو اور ان کی قوم کو کربِ عظیم سے نجات دی۔ ۱۱۵) ہم نے ان کو
نصرت بخشی، تو وہی غالب آنے والے بنے۔ ۱۱۶)

حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں سے دو رسولوں کی سرگزشت کے بعض اہم گوشوں کا تذکرہ

حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں یوں تو بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور انہیں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی عظمت سے نوازا۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ نمایاں قد و قامت کی حامل دو شخصیتیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنا دیا اور جنہوں نے بنی اسرائیل کی تاریخ میں سب سے زیادہ اپنا وزن محسوس کرایا، وہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام تھے۔ یہ دونوں ایک ایسی قوم میں

Marfat.com

پیدا ہوئے جو غلامی کی طویل رات کی وجہ سے آزادی کی سحر طلوع ہونے کی امید کھو چکے تھے۔اور حکمرانوں کے بدترین ظلم اور قابلِ نفرت رویے کی وجہ سے ان کے اندر آزادی کی تڑپ، خاندانی خصوصیات اور اجتماعی علامات اپنا توازن کھو چکی تھیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بھائیوں کو شخصیت کا ایسا حسن، اللہ تعالیٰ کے دین پر ایسی استقامت اور اپنی خصوصی تائید ونصرت سے اس طرح نوازا تھا کہ چند ہی سالوں میں فرعون اور آلِ فرعون جیسے جبار دشمن کو شکست دے کر بنی اسرائیل کو اس عظیم ابتلاء سے نجات دینے میں کامیاب ہو گئے جس میں وہ صدیوں سے مبتلاء تھے۔ان کی غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور غلاموں سے بدتر جوان کے ساتھ سلوک ہو رہا تھا اسے ختم کر ڈالا۔اور بنی اسرائیل اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ان دو بزرگوں کی نگرانی اور تربیت سے ایک ایسی عظیم امت بن کر اٹھے جس نے صدیوں تک اپنی عظمت کے جھنڈے لہرائے۔تیسری آیت میں فرمایا کہ ہم نے ان کی مدد کی۔اس مدد سے مراد وہ تمام آزمائشیں بھی ہو سکتی ہیں جن سے فرعون اور آلِ فرعون کو ہراساں کیا گیا۔اور انہیں باور کرایا گیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے دین کا راستہ روکنے سے باز نہ آئے تو کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو سکتا ہے۔اس سے وہ نصرت بھی مراد لی جا سکتی ہے جس سے بنی اسرائیل مصر سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔اور پھر جب بحرِ قلزم نے ان کا راستہ روکا اور فرعون کی فوجیں سر پر پہنچ گئیں تو محض اللہ تعالیٰ کی نصرت سے قلزم کا پانی سمٹ گیا اور بنی اسرائیل کو دریا پار کرنے کے لیے راستہ مل گیا۔اسی طرح اس سے مراد وہ نصرتیں بھی ہو سکتی ہیں جو صحرائے سینا میں مصر سے نکلنے کے بعد من حیث القوم بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً میسر آتی رہیں۔حتیٰ کہ وہ اردن اور فلسطین پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾

(ہم نے ان کو نہایت واضح کتاب عطا کی۔ ۱۱۷) اور ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی۔ ۱۱۸)

الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ کا مفہوم

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی، اسی طرح ایک واضح اور روشن کتاب بھی عطا فرمائی۔اس کتاب سے یقیناً کتابِ تورات مراد ہے۔بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو بطورِ خاص کتاب دیے جانے کا ذکر اس لیے فرمایا گیا ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کسی امت کو بھی شریعت کسی واضح کتاب کی شکل میں عطا نہیں فرمائی، بلکہ لوگوں کو صرف زبانی تعلیم دی جاتی تھی۔تورات کو یہ خاص امتیاز حاصل ہے کہ اس میں شریعت ایک مرتب اور روشن کتاب کی شکل میں دی گئی۔تاریخ مذہب کے حوالے سے یہ بات کسی حد تک کھٹکتی ہے۔کیونکہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے اور قرآنِ کریم نے بھی بعض جگہ اس طرف اشارے کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول بھیجے ہیں ان میں سے ہر ایک کو کوئی کتاب یا صحیفہ عطا کیا گیا ہے۔خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے نازل کیے گئے۔حضرت ادریس علیہ السلام پر ایک مستقل کتاب نازل کی گئی۔بحرِ مردار کے بعض غاروں میں کسی کتاب کے بعض نسخے ملے ہیں۔گمان یہ ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو حضرت ادریس علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً بعض رسولوں پر کتابیں نازل ہوئی ہیں تو ان میں صرف نصیحت کی باتیں ہی تو نہیں ہوں گی، شریعت کے احکام ونواہی بھی ہوں گے۔البتہ یہ فرق ہو سکتا ہے کہ بعض بنیادی اور اہم احکام تحریری شکل میں دیے جاتے ہوں۔اور دیگر احکام اور آداب کی تعلیم زبانی دی جاتی ہو۔تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔

Marfat.com

صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی ہدایت کا مفہوم

یہ بات معلوم ہے کہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، حضرت ہارون پر نہیں۔ لیکن انہیں چونکہ آپ کے ساتھ شریکِ رسالت بنایا گیا تھا اس لیے کتاب دیے جانے کے شرف میں انہیں بھی شامل کیا گیا ہے۔ مزید فرمایا کہ ہم نے انہیں صراطِ مستقیم کی ہدایت بھی بخشی تھی۔ اس سے دو باتوں کی طرف شاید اشارہ ہو۔ پہلی یہ بات کہ یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر عموماً اور حضرت ہارون علیہ السلام پر خصوصاً بعض اتہامات لگائے ہیں اور بعض غلط باتیں ان کی طرف منسوب کی ہیں۔ اس سے ان باتوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ انسان کا صراطِ مستقیم پر فائز رہنا اور زندگی کے سفر میں کبھی اس جادۂ مستقیم سے قدم کا ہٹنے نہ پانا، یہ صرف انبیاء کی خصوصیت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو معصوم پیدا فرمایا۔ ان کی عصمت اور ان کے اسوۂ حسنہ ہونے کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم نے انہیں صراطِ مستقیم کی ہدایت کی تھی۔ اب اگر تم یہ دیکھنا چاہو کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی، عبادات، معاشرت، معیشت، معاملات، باہمی تعلقات غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں صراطِ مستقیم کیا ہے تو اس کے لیے تمہیں وقت کے ہر رسول کی زندگی کو دیکھنا ہوگا اور انہیں میں سے ایک نمایاں مثال حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام بھی ہیں۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

(اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکرِ خیر باقی رکھا۔ ۱۱۹) سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر۔ ۱۲۰) ہم بہترین نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیتے ہیں۔ ۱۲۱) بے شک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔ ۱۲۲)

یہ ترجیع کی آیات ہیں ان کا مفہوم گزر چکا ہے

یہ ترجیع کی آیات ہیں جو ایک ہی طرح کے مضمون کے بعد آتی ہیں۔ اس سے بتانا مقصود یہ ہوتا ہے کہ تم جن مقدس نفوس کا تذکرہ پڑھ رہے ہو ان کی بعض اقدار ایسی مشترک ہیں جو ان کی حقانیت کی علامت بھی ہیں اور تاریخ میں ان کے کردار کی گواہ بھی۔ یہ بتانے کے لیے کہ اس زمین کے وہ اشجارِ طیبہ ہیں اور اس چمن کے وہ ثمراتِ لذیذہ ہیں جن سے تمہارے کام و دہن بار بار لذت اندوز ہوں گے۔ کیونکہ یہ ان نفوسِ قدسیہ کے جہد و عمل کے لازمی خصائص ہیں جن کا ظہور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ان میں سے پہلی بات یہ فرمائی کہ تم مخالفین کی مخالفت کو دیکھ کر یہ گمان مت کرو کہ یہ قیمتی شخصیات تاریخ پر شاید اپنا اثر چھوڑ کر نہیں گئیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب تم اسی راستے پر آگے بڑھو گے تو تم محسوس کرو گے کہ ان کے بعد آنے والا قافلہ انہیں کے آثار کو لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ اور بعد کے آنے والی ہر مقدس روح اور ہر قابلِ ذکر شخص کی زبان پر ان کے لیے سلامتی کی دعائیں ہیں اور ان کی سلامتی کے چرچے ہیں۔ اور داد و دہش کا ہمارا یہ طریقہ کسی ایک شخص یا خاندان کے لیے نہیں بلکہ ہر اس شخص اور ہر اس قافلے کے لیے ہے جو اپنی ہمت سے بڑھ کر اخلاص بہم پہنچاتا اور حُسنِ عمل کے چراغ روشن کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے ساتھ بھی ہم نے یہی معاملہ کیا ہے اس لیے کہ ہمارے وہ ایسے صاحبِ ایمان بندے تھے کہ جن کے ایمان کے نور نے نہ جانے کہاں کہاں روشنی بکھیری ہے اور کن کن راستوں کو روشن کیا ہے۔

Marfat.com

وَاِنَّ اِلۡیَاسَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۲۳﴾

(اور بے شک الیاس بھی یقیناً پیغمبروں میں سے تھے۔ ۱۲۳)

حضرت الیاسؑ کی ذاتی اور منصبی زندگی کی بعض تفصیلات

گزشتہ آیات میں جن جلیل القدر پیغمبروں کا ذکر آیا ہے اور جس ترتیب سے ان کا ذکر ہوا ہے تاریخ میں ان کا ظہور بھی اسی ترتیب سے ہوا ہے۔ حضرت الیاس علیہ السلام سے جن انبیائے کرام کا ذکر شروع ہو رہا ہے ان کی ترتیب تاریخی نہیں بلکہ صفاتی ہے۔ اور ان کا ذکر بھی نہایت اجمال سے کیا گیا ہے۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ ان کی دعوت بھی وہی دعوت تھی جس کا ذکر آپ سابق انبیاء کے تذکرے میں پڑھ چکے ہیں۔ اور انہوں نے تمام تر ناموافق حالات کے باوجود اسی اخلاص اور جانفشانی سے لوگوں کی ہدایت کے لیے کام کیا ہے جو تمام انبیاء کرام کا طریقہ ہے۔ سب سے پہلے حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کا ذکر تورات میں ایلیا کے نام سے ہوا ہے۔ یہ ان انبیائے کرام میں سے ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے۔ موجودہ زمانے کے محققین ان کا زمانہ ۸۷۵ اور ۸۵۰ ق م کے درمیان متعین کرتے ہیں۔ وہ جلعاد کے رہنے والے تھے جو آج کل موجودہ ریاست اردن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے بیٹے کی نااہلی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی سلطنت دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ایک سلطنتِ یہودا اور دوسرا سلطنتِ اسرائیل۔ اسرائیل کی ریاست شروع ہی سے ایسے سخت بگاڑ کی راہ پر چل پڑی تھی جس کی بدولت اس میں شرک و بت پرستی، ظلم و ستم اور فسق و فجور کا زور بڑھتا گیا۔ لیکن یہ بگاڑ اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب اسرائیل کے بادشاہ اخی اب نے موجودہ لبنان کے بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر لی۔ وہ چونکہ مشرکہ تھی اس لیے اس کے اثرات نے شرک کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں۔ خدائے واحد کی پرستش کی بجائے بعل کی پرستش کو عام رواج دے دیا گیا۔ یہی زمانہ ہے جب حضرت الیاس علیہ السلام یکا یک منظر عام پر آئے۔ انہوں نے جلعاد سے آ کر اخی اب کو نوٹس دیا کہ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے ملک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا حتیٰ کہ اوس تک بھی نہ پڑے گی۔ چنانچہ تین ساڑھے تین سال تک بارش کا ایک چھینٹا تک بھی نہ گرا۔ بادشاہ کو کچھ دنوں کے لیے ہوش آیا تو اس نے حضرت الیاس علیہ السلام کے کہنے پر مجمع عام میں بعل کے بہت سے پجاریوں کو بھی قتل کرایا۔ پھر آپ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فوراً بارش نازل فرمائی اور دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ایک ہو گیا۔ لیکن بادشاہ پھر اپنی توبہ سے پھر گیا اور اپنی مشرک بیوی کے کہنے پر حضرت الیاس علیہ السلام کو قتل کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت الیاس کو ملک چھوڑنا پڑا اور وہ چند سال تک کوہ سینا کے دامن میں پناہ گزین رہے۔ بائبل نے وہ فریاد اپنے الفاظ میں نقل کی ہے جو اس زمانے میں حضرت الیاس علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے کی۔

"بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا اور تیرے مذبحوں کو ڈھا دیا اور تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی کیلا بچا ہوں سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔"

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست سلطنتِ یہود میں بھی ایسی ہی خرابیاں پھیلیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام نے یہاں بھی ان کو سمجھانے کی کوشش کی اور بادشاہ کو ایک خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

Marfat.com

"خداوند تیرے باپ داؤد کا خدا یوں فرماتا ہے اس لیے کہ تو نہ اپنے باپ یہوسفط کی راہوں پر اور نہ یہوداہ کے بادشاہ آسا کی راہوں پر چلا بلکہ اسرائیل کے بادشاہ کی راہ پر چلا ہے۔ اور یہوداہ اور یروشلم کے باشندوں کو زنا کار بنایا جیسے اخی اب کے خاندان نے کیا۔ اور اپنے باپ کے گھرانے سے اپنے بھائیوں کو جو تجھ سے اچھے تھے قتل بھی کیا۔ سو دیکھ خداوند تیرے لوگوں کو اور تیری بیویوں کو اور تیرے سارے مال کو بڑی آفتوں سے مارے گا۔ اور تو انتڑیوں کے مرض سے سخت بیمار ہو جائے گا یہاں تک تیری انتڑیاں اس مرض کے سبب سے روز بروز نکلتی چلی جائیں گی۔ (۲۔تواریخ ۱۲:۲۱۔۱۵)

حضرت الیاس علیہ السلام نے اپنے خط میں جو کچھ لکھا اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے وہی کچھ ہوا۔ پہلے یہ ریاست بیرونی حملہ آوروں کے حملوں سے تباہ ہوئی، دشمن اس کی بیوی تک کو پکڑ کر لے گیا اور پھر بادشاہ خود انتڑیوں کے مرض سے ہلاک ہوا۔

اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام اسرائیل تشریف لے گئے۔ بادشاہ اور اس کے حواریوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر تباہی ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ حضرت الیاس کی بددعا سے بادشاہ اور اس کا گھرانہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی دنیا سے اٹھا لیا۔

اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

(جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم لوگ ڈرتے نہیں ہو۔ ۱۲۴)

جب انہوں نے بنی اسرائیل کو دیکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بعل پرستی میں مبتلا ہو گئے اور شریعت کے اتباع کی بجائے ہوائے نفس کے اتباع کو اپنا طرزِ عمل بنا لیا ہے تو آپ نے ان سے کہا کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے نہیں ہو، جب وہ تم سے تمہارے طرزِ عمل کے متعلق سوال کرے گا تو تم کیا جواب دو گے۔

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

(کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑتے ہو۔ ۱۲۵) اس اللہ کو جو تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے اگلے آباؤ اجداد کا بھی۔ ۱۲۶)

حضرت الیاس علیہ السلام کی دعوت

آپ نے کہا کہ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑتے ہو جو تمہارا بہترین خالق ہے۔ بہترین خالق سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کا کوئی اور حامل بھی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جس کی مخلوق ہو اس کے سوا کوئی اور خالق نہیں۔ ویسی صفتِ تخلیق سے متصف ہونا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ اور پھر صرف وہ تمہارا خالق ہی نہیں بلکہ تمہارا بھی اور تمہارے اگلے آباؤ اجداد کا بھی رب ہے۔ وہ صرف تمہیں پیدا کر کے ہی نہیں چھوڑ دیتا بلکہ تخلیق کے بعد ایک مخلوق کی جتنی ضرورتیں ہو سکتی ہیں ان تمام کو مہیا کرنے والا وہی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ جیسے کچھ ان میں تبدیلی آتی ہے ان کا جاننے والا بھی وہی ہے۔ اور پھر ضروریات میں چونکہ وجدان، حواس، شعور اور عقل اپنے اپنے وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے ان کا عطا کرنے والا بھی وہی ہے۔ اور اس کائنات میں جتنے

Marfat.com

انسان کونقصان پہنچانے والے امکانات موجود ہیں ان سے تحفظ دینے والا بھی وہی ہے۔ بچپن بالخصوص انسان کا بے بسی کی تصویر ہے۔ اسے خوبصورت بنانا اور ماں کے اندر مامتا پیدا کرنا، باپ میں شفقت کا فانوس روشن کرنا یہ سب اس کی ربوبیت کے اجزاء ہیں۔ یہ کیسا بے ہودہ پن ہے کہ تم ایسے رب کو چھوڑ کر بعل کو پکارتے اور اس کی پرستش کرتے ہو۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

(تو انہوں نے اس کو جھٹلا دیا تو بے شک وہ گرفتار کیے جانے والوں میں سے ہوں گے۔ ۱۲۷)
بجز ان بندگانِ خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا۔ ۱۲۸)

حضرت الیاس علیہ السلام نے جنہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی انہوں نے آپ کی کوششوں کی قدر کرنے کی بجائے آپ کی تکذیب کردی، آپ کی نبوت پر ایمان لانے کی بجائے آپ کو جھٹلایا اور بعل پرستی سے توبہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے اور دور ہٹ گئے۔ تو ایسے لوگ یقیناً قیامت کے دن ان لوگوں میں ہوں گے جنہیں گرفتار کر کے نہایت ذلت کے ساتھ جہنم کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قوم کے سر پر عذاب تلا کھڑا ہے، تباہی اور بربادی ان کے دروازے پر پہنچ چکی ہے، ان کے بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی کہ حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لے آتے اور ان کی باتوں پر کان دھرتے۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال کی پاداش میں پکڑے جائیں گے۔ اس میں صرف وہ لوگ بچیں گے جو حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی بندگی کے لیے چھانٹ لیا۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

(اور ہم نے اس کا ذکر بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔ ۱۲۹) سلام ہے اِل یاسین پر۔ ۱۳۰) ہم بہترین نیکی کرنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ ۱۳۱) بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ ۱۳۲)

ان آیات کی تشریح ہو چکی ہے

یہ وہی ترجیع کی آیات ہیں جو گزشتہ انبیائے کرام کی سرگزشتوں کے سلسلے میں گزری ہیں اور ان میں بار بار وہی باتیں فرمائی گئی ہیں جو اس مبارک قافلے کے ہر فرد کے لازمی خصائص اور یقینی انعامات ہیں۔ البتہ دوسری آیت میں اِل یاسین کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ حضرت الیاس علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دوسرا نام ابراہام تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ نام تو آپ کا ایک ہی ہے البتہ اہلِ عرب میں عبرانی اسماء کے مختلف تلفظ رائج تھے۔ مثلاً حضرت میکائیل علیہ السلام کو میکال اور میکائین بھی کہا جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت الیاس علیہ السلام کے نام کا تلفظ بھی مختلف رہا۔ ایک قول یہ ہے کہ اِل یاسین الیاس کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد ان کے تمام آل واتباع ہیں۔ قرآنِ کریم میں طور سینین طور کی جمع ہے۔ اس کا استعمال بھی اسی اصول کے تحت ہوا ہے۔ ناچیز کا گمان یہ ہے کہ بعض دفعہ قافیہ کی رعایت سے بھی اصل نام پر بعض حروف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی اصل نام تو الیاس ہے لیکن قافیہ کی رعایت سے ی۔ ن کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مفہوم ان آیات کا پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔

Marfat.com

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٣٣﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٣٤﴾
اِلَّا عَجُوْزًا فِى الْغٰبِرِيْنَ ﴿١٣٥﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿١٣٦﴾ وَاِنَّكُمْ
لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٣٨﴾

(بے شک لوط بھی یقیناً پیغمبروں میں سے تھے۔ ۱۳۳) اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے اسے اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی۔ ۱۳۴) بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔ ۱۳۵) پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔ ۱۳۶) بے شک تم ان کی بستیوں پر گزرتے ہو صبح کو بھی۔ ۱۳۷) اور رات کو بھی، تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔ ۱۳۸)

حضرت لوطؑ کی دعوت، قوم کا جواب اور ان کا انجام اور قریش کو تنبیہ

حضرت لوط علیہ السلام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور آپ پر ایمان لائے تھے اور ہجرت کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے میں آپ کے ساتھ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت کی ذمہ داریوں سے گراں بار کیا اور ایک نہایت پاجی قوم جو بحرِ مردار کے قریب رہتی تھی اس کی اصلاح کی ذمہ داری پر فائز کیا۔ مختلف مواقع پر تفصیل سے ان کی سرگزشت گزر چکی ہے۔ یہاں تو بعض دیگر انبیائے کرام کے ساتھ ان کا تذکرہ قریش کو یہ سمجھانے کے لیے کیا جا رہا ہے کہ جب بھی کسی قوم کی طرف اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول سمجھانے کے لیے آتا ہے تو اس کے آنے سے اتمامِ حجت ہو جاتا ہے۔ اب اس قوم کی قسمت ترازو میں ہوتی ہے اگر وہ قبول کر لیتی ہے تو دنیا اور آخرت کی کامیابیاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔ اور اگر تکذیب کرتی ہے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دی جاتی ہے۔ متعدد رسولوں اور ان کی قوموں کے تذکرے سے یہی بات ان کے ذہن نشین کرنا پیشِ نظر ہے تاکہ وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کو کوئی معمولی واقعہ نہ سمجھیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں حضرت لوط علیہ السلام کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے سچے رسولوں میں سے تھے۔ انہیں قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا۔ جب اس قوم کی بڑی تعداد نے ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ آ گیا۔ آپ کو اور آپ کے صاحبِ ایمان اہل کو نجات دے دی گئی اور باقی سب کو تباہ کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ آپ کی رفیقۂ حیات جس نے زندگی کے شب و روز آپ کے ساتھ گزارے تھے وہ بھی محض اس لیے تباہ ہونے والوں کے ساتھ تباہ کر دی گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی رفیقۂ حیات ہونے کے باوجود آپ پر ایمان نہیں لائی تھی۔

اور اللہ تعالیٰ کے یہاں نجات کا دارومدار ایمان و عملِ صالح پر ہے، مجرد رشتہ داری کسی کے کام آنے والی چیز نہیں۔

آخر میں ترجیح کی آیات لانے کی بجائے جو گزشتہ سرگزشتوں میں ہم پڑھ چکے ہیں قریش کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ تم شب و روز ان کی بستیوں میں سے گزرتے ہو، تمہارے تجارتی قافلوں کے لیے وہی راستہ ہے۔ تم ان کھنڈرات کو دیکھتے ہو، لیکن ان کی تباہی کے اسباب پر کبھی غور نہیں کرتے۔ آخر یہاں کی خوبصورت آبادیاں کھنڈرات میں تبدیل کیوں ہو گئیں، ان میں بسنے والے مکین بھولی بسری یادیں کیوں بن گئے۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ ان کے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی رسالت کی تکذیب کی۔ ان کے ہر چند سمجھانے کے باوجود انہوں نے سننے اور ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر اللہ تعالیٰ کی سنت حرکت میں آئی تو انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ تمہارے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت کیوں بدل جائے گی۔ اس کی سنت کبھی نہیں بدلتی۔ جو معاملہ پہلوں کے ساتھ ہوا، وہی ہر دور والوں کے ساتھ ہوگا۔

Marfat.com

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى
الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ
الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ
فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾
وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ
اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ
الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ
شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ
لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ
تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا
بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا
وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾
اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَآ اَنْتُمْ
عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ
مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾
وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

Marfat.com

لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾
وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾
وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ وَّاَبْصِرْهُمْ
فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ
فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبْصِرْ
فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾
وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

رکوع: ۵۔ (اور بے شک یونس بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ ۱۳۹) یاد کرو جبکہ وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا۔ ۱۴۰) پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا پس وہ دھکیلا گیا۔ ۱۴۱) پھر اس کو مچھلی نے نگل لیا اور وہ سزاوارِ ملامت تھا۔ ۱۴۲) پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا۔ ۱۴۳) تو وہ اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک۔ ۱۴۴) پھر ڈال دیا ہم نے اسے چٹیل میدان میں اور وہ نڈھال تھا۔ ۱۴۵) اور ہم نے اس پر ایک بیلدار درخت اگا دیا۔ ۱۴۶) ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا۔ ۱۴۷) پس وہ لوگ ایمان لائے اور ہم نے انہیں ایک وقت تک فائدہ اٹھانے دیا۔ ۱۴۸) پس ان لوگوں سے پوچھیے کیا آپ کے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے ہیں۔ ۱۴۹) کیا ہم نے فرشتوں کو عورتیں پیدا کیا اور وہ دیکھ رہے تھے۔ ۱۵۰) خوب سن لو یہ لوگ محض من گھڑت طور پر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ ۱۵۱) کہ اللہ اولاد رکھتا ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۱۵۲) کیا اللہ نے بیٹوں پر بیٹیوں کو چنا ہے۔ ۱۵۳) کیا ہے تمہیں، تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔ ۱۵۴) کیا تم ہوش سے کام نہیں لیتے۔ ۱۵۵) کیا تمہارے پاس (ان باتوں کے لیے) کوئی واضح دلیل موجود ہے۔ ۱۵۶) تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ ۱۵۷) اور انہوں نے اللہ اور جنوں کے درمیان ایک رشتہ جوڑ رکھا ہے اور جنوں کو خوب معلوم ہے کہ وہ گرفتار کیے جائیں گے۔ ۱۵۸) اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ ۱۵۹) مگر اللہ کے وہ بندے جو چن لیے گئے ہیں۔ ۱۶۰) پس بے شک تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو۔

Marfat.com

۱۶۱) اللہ سے برگشتہ نہیں کر سکتے۔ ۱۶۲) مگر انہیں کو جو جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ ۱۶۳) اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معین مقام ہے۔ ۱۶۴) اور ہم اللہ کے حضور صف بستہ رہنے والے خدمتگار ہیں۔ ۱۶۵) اور ہم اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔ ۱۶۶) اور بے شک یہ لوگ کہتے تھے۔ ۱۶۷) کہ کاش ہمارے پاس پہلوں کی تعلیم ہوتی۔ ۱۶۸) تو ہم اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے۔ ۱۶۹) تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا تو وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۱۷۰) اپنے بھیجے ہوئے بندوں کے لیے ہمارا یہ کلمہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے۔ ۱۷۱) بے شک ان کی مدد کی جائے گی۔ ۱۷۲) اور بے شک ہمارا ہی لشکر غالب رہنے والا بنے گا۔ ۱۷۳) پس اے پیغمبر آپ کچھ مدت تک ان سے اعراض کریں۔ ۱۷۴) اور دیکھتے رہیں وہ خود بھی عنقریب دیکھ لیں گے۔ ۱۷۵) کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ ۱۷۶) پس جب وہ ان کے صحن میں اترے گا تو بڑی ہی بری ہوگی ان لوگوں کی صبح جن کو اس سے متنبہ کیا جا چکا ہے۔ ۱۷۷) تو کچھ مدت کے لیے ان سے اعراض کرو۔ ۱۷۸) اور دیکھو، وہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے۔ ۱۷۹) پاک ہے تیرا رب، عزت کا مالک، ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ ۱۸۰) اور پیغمبروں پر سلامتی ہے۔ ۱۸۱) اور ہر طرح کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے۔ ۱۸۲)

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾

(اور بے شک یونس بھی پیغمبروں میں سے تھا۔ ۱۳۹) یاد کرو جبکہ وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا۔ ۱۴۰) پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا پس وہ دھکیلا گیا۔ ۱۴۱) پھر اس کو مچھلی نے نگل لیا اور وہ سزاوار ملامت تھا۔ ۱۴۲)

حضرت یونس علیہ السلام کی سرگزشت کے اہم واقعات

اس سے پہلے قرآنِ مجید میں سورۃ یونس اور سورۃ انبیاء میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ تیسرا موقع ہے جب قرآنِ کریم میں آپ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول تھے اور اہلِ نینوا کی طرف انہیں مبعوث کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ آپ نے کتنے عرصے تک اہلِ نینوا کو سمجھایا، اپنی رسالت کی طرف بلایا، اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دی اور اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف انہیں مائل کیا۔ لیکن قوم نے جب مسلسل آپ کی دعوت کی ناقدری کی اور آپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو آپ نے یہ سوچ کر کہ ایسے ناقدروں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنا جو اس کی قدر نہ پہچانتے ہوں۔ نادانوں کے سامنے موتی پھینکنے کے مترادف ہے۔ اس لیے آپ ناراض ہو کر اور غیرتِ حق کے جوش میں قوم کی حدود سے نکل کھڑے ہوئے۔ ساحلِ سمندر معلوم ہوتا ہے بستی سے دور نہ تھا۔ آپ وہاں پہنچے، ایک سواریوں سے بھرا ہوا جہاز روانگی کے لیے آمادہ تھا، آپ اس میں سوار ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے شاید آخری سواری کی ضرورت تھی اور وہ آپ کو لے کر چل پڑا۔ قرآنِ کریم نے ناراض ہو کر قوم سے نکل جانے کو اَبَقَ سے تعبیر کیا ہے۔ عربی زبان

Marfat.com

میں یہ لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ غلام اپنے آقا کے یہاں سے بھاگ جائے۔ حضرت یونس علیہ السلام کسی انسان کے غلام نہیں بلکہ آپ اللہ تعالیٰ کے غلام تھے اور اللہ تعالیٰ ہی نے اہلِ نینوا کی ہدایت کے لیے آپ کو مبعوث کیا تھا۔ رسول ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے منتظر رہتے ہیں اور کسی کام میں نفس کی پیروی نہیں کرتے ہیں۔ پروردگار نے چونکہ اپنے انبیاء ورُسل کو معصوم پیدا کیا ہے اس لیے وہ نفس کی پیروی میں کبھی ٹھوکر نہیں کھاتے۔ البتہ اتباعِ حق کے جوش میں کبھی کبھی وہ بھی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ یہ چیز غیرِ نبی میں ہو تو نہ صرف بری نہیں بلکہ پسندیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کی علامت ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی چونکہ حق کی کسوٹی بن کر آتے ہیں اور وہ امت کے لیے ہر معاملے میں اسوۂ حسنہ اور معیارِ حق ہوتے ہیں۔ اس لیے کوئی سی بھی بے اعتدالی ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ باقی نہیں رہنے دیتا، فوراً اس پر گرفت فرماتا یا اصلاح کر دیتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام ایک رسول کی حیثیت سے نینوا میں اپنے فرائض ادا کرنے کے پابند تھے چاہے قوم آپ کی دعوت کو قبول کرے یا نہ کرے، آپ وہاں سے ہجرت اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے اپنی قوم کی ناقدری کو غیرتِ حق کے خلاف سمجھا۔ اس لیے برہم ہو کر اپنی قوم اور تبلیغ کے میدان کو چھوڑ دیا۔ اور انہیں تین دن تک اللہ تعالیٰ کے عذاب کی تنبیہ فرما کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ پروردگار نے اس پر گرفت فرمائی۔ جب وہ جہاز میں سوار ہو کر روانہ ہوئے تو راستے میں جہاز طوفان میں گھر گیا۔ جہاز والوں نے اپنی روایت کے مطابق یہ سمجھا کہ اس میں یقیناً کوئی بھاگا ہوا غلام سوار ہے یا کوئی مجرم ہے۔ جب تک اسے الگ کر کے دریا میں نہیں ڈالا جائے گا جہاز اس طوفان سے باہر نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ مجرم کو متعین کرنے کے لیے قرعہ کا فیصلہ کیا گیا۔ اگرچہ اسلام کسی کو قرعہ اندازی کے ذریعے مجرم ثابت کرنے کو جائز نہیں رکھتا، لیکن جہاز والوں نے اپنی روایت کے مطابق اس پر عمل کیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے ہی قرعہ اندازی کروائی گئی۔ کیونکہ جہاز میں سب سے زیادہ ثقہ اور باوقار وہی نظر آ رہے تھے، لیکن قدرت کی نیرنگی دیکھیے کہ قرعہ انہیں کے نام کا نکلا۔ وہ اس قرعہ کے مطابق سمندر میں لڑھکا دیے گئے۔ جیسے ہی حضرت یونس علیہ السلام پانی میں گرے ایک مچھلی نے انہیں نگل لیا۔ وہ مچھلی یقیناً ویل اور شارک کی قسم کی مچھلیوں میں سے ہوگی جو آدمی کو سموچا نگل جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جب مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگلا تو وہ مُلِیم یعنی ملامت کے سزاوار تھے۔ یعنی جو افتاد ان کو پیش آئی وہ اس کے سزاوار تھے۔ کیونکہ جو فعل ان سے سرزد ہوا وہ ایک پیغمبر کی حیثیت سے ایسا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں مستحقِ تنبیہ ٹھہرایا۔ انہوں نے یہ اقدام اگرچہ غیرتِ حق کی بنا پر کیا تھا اور نیک جذبہ اس کا محرک تھا لیکن پیغمبر کے ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کا اذن ضروری ہے۔ ان کا بلند و بالا مرتبہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا قریبی تعلق اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کوئی کام بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کریں۔ اس وجہ سے ان پر سخت گرفت ہوئی۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

(پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا۔ ۱۴۳) تو وہ اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک۔ ۱۴۴)

Marfat.com

تسبیح (آیت کریمہ) رحمتِ خداوندی کی ضمانت ہے

قرآنِ کریم میں دیگر مواقع پر حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہی حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو آپ سمجھ گئے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے عتاب نے پکڑ لیا ہے۔ میں اپنے محلِ تبلیغ ودعوت اور اپنے مورچے سے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی اجازت کے بغیر نکل آیا ہوں، اس کی وجہ سے یہ عتاب مجھ پر ہوا ہے۔ اب اس عتاب سے بچ نکلنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ جس نے عتاب فرمایا ہے اسی کی رحمت کو پکارا جائے۔ اپنے قصور کا اعتراف کیا جائے اور اپنے آپ کو اس کے دروازے پر ڈال دیا جائے کیونکہ:

جس نے دیا ہے درد، وہی چارہ گر بھی ہے
کہنی ہے چارہ گر سے ہی خود چارہ گر کی بات

چنانچہ بے ساختہ آپ کی زبان سے ہی نہیں بلکہ رگ وپے سے **لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ** کی صدا گونجنے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا میں یہ شان رکھی ہے کہ جو اسے دل کی آمادگی کے ساتھ پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مشکل آسان فرما دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کرم فرمایا اور مچھلی نے آپ کو دریا کی کسی ریتی پر اگل دیا۔ اور اگر آپ اللہ تعالیٰ سے یہ مناجات نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ قیامت تک کے لیے اسی مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر حضرت یونس علیہ السلام تسبیح نہ کرتے تو وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس مچھلی کے پیٹ ہی کو حضرت یونس علیہ السلام کی قبر بنا دیا جاتا۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝١٤٥ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۝١٤٦

(پھر ڈال دیا ہم نے اسے چٹیل میدان میں اور وہ نڈھال تھا۔ ۱۴۵) اور ہم نے اس پر ایک بیلدار درخت اگا دیا۔ ۱۴۶)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ظہور

آخر مچھلی نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے دریا کی کسی ریتی پر حضرت یونس علیہ السلام کو اگل دیا۔ آپ چونکہ مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے بالکل مضمحل اور نڈھال ہو گئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے جسم پر بال تک نہ رہے تھے۔ ایسی کمزور حالت میں نہ زمین کی سختی آپ کے لیے قابلِ برداشت تھی اور نہ موسم کی شدت۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایک بیلدار درخت آپ کے اوپر اگا دیا تاکہ اس کے پتے آپ کے لیے سایہ فراہم کریں اور اس کا رس آپ کے لیے غذا کا کام دے۔ **يَقْطِيْنٍ** اس درخت کو کہتے ہیں جس کا تنہ نہ ہو۔ روایات میں ہے یہ کدو کی بیل تھی۔ اور شجرہ کا لفظ بتا رہا ہے کہ یا تو اس کدو کی بیل کو اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر تنہ دار بنا دیا تھا اور یا کوئی اور درخت تھا جس پر وہ بیل چڑھا دی گئی تھی تاکہ اس سے گھنا سایہ میسر آسکے۔ ورنہ بیل سے سایہ ملنا مشکل تھا۔

Marfat.com

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿١٤٧﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿١٤٨﴾

(ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا۔ ۱۴۷) پس وہ لوگ ایمان لائے اور
ہم نے انہیں ایک وقت تک فائدہ اٹھانے دیا۔ ۱۴۸)

قوم کی طرف مراجعت اور قوم کی خوش نصیبی

کچھ عرصہ بعد حضرت یونس علیہ السلام کی حالت سنبھلی، آپ چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے غائب ہوجانے کے بعد جب آپ کی قوم نے عذاب کے آثار دیکھے تو وہ بچوں، بوڑھوں اور جانوروں سمیت گھروں سے باہر نکل آئے اور اللہ تعالیٰ سے انتہائی گریہ زاری کے ساتھ اپنی غفلت کی معافی مانگی، اپنے کفر اور شرک سے توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔ ان کے سر پر تلا ہوا عذاب ٹل گیا۔ یہ واحد قوم ہے کہ آیا ہوا عذاب اس سے واپس لے لیا۔ ان کے سر سے عذاب ٹلنے کی شاید وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر یہ سمجھ کر قوم سے نکل گئے کہ ان میں قبولیتِ ایمان کی صلاحیت نہیں۔ لیکن بعد میں قوم کی توبہ نے یہ ثابت کیا کہ ان میں ایمان کی صلاحیت موجود ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے انہیں چھوڑ کر جانے میں جلدی فرمائی۔

قوم نے توبہ کے ساتھ ساتھ حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش بھی شدت سے جاری رکھی۔ حتیٰ کہ انہیں سمندر کے کنارے تلاش کرلیا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو واپس اسی بستی یعنی نینوا میں جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ جیسے ہی آپ وہاں پہنچے لوگ دیوانہ وار آپ کی طرف لپکے اور ایمان لے آئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس وقت تک انہیں ایمان کی سعادت سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا اور جب تک انہوں نے اپنے ایمان کو شرک اور نافرمانی سے آلودہ نہیں کیا۔

فرمایا گیا ہے کہ ہم نے یونس کو ایک لاکھ یا زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بستی میں رہنے والوں کی صحیح تعداد کا علم نہ تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان کی بستی کو دیکھتا تو یہی اندازہ کرتا کہ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہی ہوگی کم نہ ہوگی۔ یہ عام گفتگو کا اسلوب ہے جسے یہاں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ویسے بھی دیکھا جائے تو کسی منظم ادارے یا منظم گروہ کی تعداد جو ہمیشہ شمار کی جاتی ہو اس کا تو ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن قوموں کی تعداد یا شہر کی آبادی کے بارے میں کوئی متعین بات کہنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ بڑی آبادی والے شہروں یا قوموں میں زندگی اور موت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ لوگ مرتے ہیں تو تعداد کم ہوجاتی ہے۔ نابالغ، بالغ ہوجاتے ہیں تو تعداد بڑھ جاتی ہے۔ بچے جوان ہوجاتے ہیں جو دو چار سال کا عمل ہوتا ہے تو تعداد کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ بناء بریں ایک لاکھ کہنے کی بجائے اَوْ يَزِيْدُوْنَ فرمایا گیا تاکہ ان تمام امکانات کا احاطہ کرلیا جائے اور غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿١٤٩﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿١٥٠﴾

(پس ان لوگوں سے پوچھئے کیا آپ کے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے ہیں۔ ۱۴۹)
کیا ہم نے فرشتوں کو عورتیں پیدا کیا اور وہ دیکھ رہے تھے۔ ۱۵۰)

Marfat.com

خاتمۂ سورۃ کی آیات اور سابقہ مضمون کا اعادہ اور اختتام

یہاں سے خاتمۂ سورہ کی آیات شروع ہورہی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس مضمون سے اس سورۃ کا آغاز ہوا اسی پر اس کا اختتام بھی ہورہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک اس سورۃ میں جو کچھ کہا گیا ہے اب اس سورۃ کی آخری آیات میں اس کو Some off کیا جارہا ہے۔ انسان نے اسالیب کلام میں بہت ترقی کی ہے تب جا کر وہ وہاں پہنچا ہے جو قرآنِ کریم کا عام اسلوب ہے۔ لیکن بعض اسالیب ایسے ہیں جن پر ابھی تک انسان گرفت نہیں پاسکا۔ نہ اس کو پوری طرح سمجھ پایا ہے اور نہ اس کے استعمال پر قادر ہوا ہے۔

اس سورۃ کا آغاز ملائکہ کی الوہیت اور جنات کی غیب دانی کے ابطال سے ہوا ہے۔ اب آخر میں ان فرشتوں اور جنات کے بارے میں جو غلط عقائد لوگوں نے اختیار کر رکھے ہیں ان کا ابطال فرمایا جارہا ہے۔ وہاں بھی ان کے مشرکانہ خیالات کی تردید ایک سوال کی صورت میں شروع ہوئی تھی اور یہاں بھی سوال ہی سے اس کا آغاز کیا جارہا ہے۔

ملائکہ سے متعلق بعض قبائل کا عقیدہ

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قریش، جہینہ، بنی سلمہ، خزاعہ اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ ان قبائل کے لوگ اس خیال سے ان کی پوجا کرتے اور قربانیاں دیتے تھے کہ اگر کبھی ہمیں پروردگار کی ناراضگی سے واسطہ پڑا تو پروردگار کی بیٹیاں ہمیں اس کے غضب سے بچالیں گی۔ ان کے اس عقیدے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ ان سے پوچھئے کہ تم نے جو پروردگار کے متعلق یہ عقیدہ اختیار کر رکھا ہے کہ فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں، کیا تم نے اس عقیدے کے اندر جو قباحتیں مضمر ہیں کبھی ان پر غور کیا ہے۔ ان میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تم نے فرشتوں کو مونث گمان کر رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تمہیں اس کی خبر کیسے ہوئی کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے مونث پیدا فرمایا ہے۔ کیا فرشتوں کی تخلیق کے وقت تم موجود تھے، تم دیکھ رہے تھے کہ کس کس مخلوق کو پیدا کیا جارہا ہے اور ان میں مذکر کون ہے اور مونث کون ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو اس کا ثبوت لاؤ۔ یہی مضمون سورۃ الزخرف میں بھی ان الفاظ میں بیان ہوا ہے وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ”کیا انہوں نے فرشتوں کو جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں عورتیں بنادیا ہے، کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے، ان کا یہ بیان لکھ رکھا جائے گا اور ان سے اس کی پرسش ہوگی۔“

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

(خوب سن لو یہ لوگ محض من گھڑت طور پر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ ۱۵۱) کہ اللہ اولاد رکھتا ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۱۵۲)

غلط بات کا ثبوت مزید غلط بات سے

وہ اوپر کی بات کا ثبوت تو کیا لائیں گے ان کی جہالت اور جسارت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد فرض کر رکھی ہے۔ نہ جانے کس کس کو اللہ تعالیٰ کی اولاد سمجھتے ہیں اور انہیں میں سے فرشتے بھی ہیں جن کو صرف اولاد ہی نہیں بلکہ اس کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ان کے پاس نہ کوئی عقلی ثبوت ہے اور نہ کوئی نقلی۔ بس اپنے جی سے کچھ باتیں گھڑ لی گئی ہیں اور انہیں عقیدے کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اور مزید جرأت کا عالم یہ ہے کہ ایسی ہی گھڑی ہوئی بعض باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب بھی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بالکل جھوٹے لوگ ہیں۔

Marfat.com

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

(کیا اللہ نے بیٹوں پر بیٹیوں کو چنا ہے۔ ۱۵۳) کیا ہے تمہیں، تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔ ۱۵۴)
کیا تم ہوش سے کام نہیں لیتے۔ ۱۵۵)

اظہارِ تعجب

اللہ تعالیٰ کی اولاد ہونے اور پھر فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہونے پر تو یقیناً ان کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ کوئی نقلی۔ کیونکہ عقل اس بات کو کبھی باور نہیں کر سکتی کہ ایک واجب الوجود ذات جو ازل سے ہے اور جسے کبھی زوال نہیں، وہ ہر طرح کی احتیاج سے پاک ہے وہ جسم سے بھی مبرا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس کے سہارے سے باقی ہے۔ وہ خود کسی سہارے کی محتاج نہیں کہ ایسی ذات کی اولاد بھی ہو سکتی ہے؟ اور جہاں تک نقلی دلیل کا تعلق ہے اس کے لیے کوئی ایسا قول یا ایسی روایت ہونی چاہیے جس کا کہنے والا جھوٹ کے ہر شائبے سے پاک ہو۔ ظاہر ہے ایسی بھی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں۔ بلکہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ عرف میں بھی کسی معزز ذات کے لیے ایسی کسی بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا جاتا جسے معاشرے کا معروف اچھے اور عزت والے لوگوں کے لیے پسند نہ کرتا ہو۔ اس معاشرے کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو بڑا غیرت مند اور عزت کی علامت سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ بیٹے کو اگر گوارہ کرتے بھی ہیں تو نہایت ناگواری کے ساتھ۔ تو سوال یہ ہے کہ وہ خالق کائنات جو عزت و حرمت میں سب سے بالا اور انتسابات میں سب سے اعلیٰ ہے اس کے بارے میں یہ کیسے فیصلہ کر لیا گیا کہ اس نے فرشتوں کو بیٹیاں بنایا اور پھر ان کو اپنے لیے پسند کر لیا۔ حالانکہ اگر اسے اپنے لیے کسی کو پیدا کرنا ہی تھا تو وہ بیٹیوں کے بجائے بیٹوں کو پیدا کر لیتا۔ یہ تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ جو مخلوق تمہارے نزدیک دوسروں سے کم تر ہے اسے وہ اپنے لیے اختیار کر لے۔ عقائد کے معاملے میں تمہاری ترجیحات کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم فیصلہ کرتے ہوئے ہوش سے کام نہیں لیتے۔ ورنہ تم اللہ تعالیٰ کے لیے کبھی وہ بات پسند نہ کرتے جو تم اپنے لیے پسند کرنے پر تیار نہیں ہو۔

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

(کیا تمہارے پاس (ان باتوں کے لیے) کوئی واضح دلیل موجود ہے۔ ۱۵۶) تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ ۱۵۷)

اپنے موقف پر کوئی واضح دلیل کتاب سے پیش کرو

یعنی بظاہر تمہارے پاس نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہے اور نہ کوئی نقلی اور نہ کوئی عرفی۔ اس کے باوجود بھی تمہیں دعویٰ ہے اپنی بات کے صحیح ہونے کا، تو محض خالی دعویٰ تو کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کے لیے تم اپنے پاس کوئی مضبوط دلیل رکھتے ہو تو اسے پیش کرو۔ لیکن وہ مضبوط دلیل کسی آسمانی کتاب کی شہادت کی صورت میں ہونی چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کوئی من گھڑت بات تو قبول نہیں کی جا سکتی۔ اور مزید یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جن مخلوقات کو پیدا کیا ہے اور جیسا پیدا کیا ہے اور ان کی جو بھی حیثیت ہے اسے اس کے سوا تو کوئی نہیں جانتا۔ اور اس کا

Marfat.com

ذریعہ انسانوں کے پاس اس کی نازل کردہ کتابیں ہیں جو اس نے اپنے رسولوں پر نازل کی ہیں اور اسی کو وحیِ الٰہی کہتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی دلیل موجود ہے یعنی کسی آسمانی کتاب میں فرشتوں کے بارے میں کوئی بات کہی گئی ہے جسے تم نے عقیدہ بنا رکھا ہے تو اسے پیش کرو۔ اور اگر ایسا نہیں تو محض من گھڑت باتوں کو تو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

(اور انہوں نے اللہ اور جنوں کے درمیان ایک رشتہ جوڑ رکھا ہے اور جنوں کو خوب معلوم ہے کہ وہ گرفتار کیے جائیں گے۔ ۱۵۸) اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ ۱۵۹) مگر اللہ کے وہ بندے جو چن لیے گئے ہیں۔ ۱۶۰)

جنوں کا بھی اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑ رکھا ہے

مشرکین کی داستانِ شرک بہت دراز ہے۔ انہوں نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد مانی اور فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا، بلکہ اس سے بڑا ستم یہ کیا ہے کہ جنوں اور خدا کے درمیان بھی انہوں نے رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ بعض مفسرین نے اس رشتے کو نسبی رشتہ قرار دیا ہے۔ وہ ابنِ کثیر، قرطبی اور تفسیرِ کبیر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور ضحاکؒ سے منقول ہے کہ بعض اہلِ عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ معاذ اللہ ابلیس اللہ تعالیٰ کا بھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ خالقِ خیر ہے اور وہ خالقِ شر۔ یہاں اس باطل عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ لیکن بعض اہلِ علم نے جن میں علامہ زمخشری بھی شامل ہیں یہ کہا ہے کہ ''الجنہ'' سے مراد پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں ملائکہ ہیں۔ کیونکہ الجنہ کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ''جن'' لغوی طور پر پوشیدہ مخلوق کو کہتے ہیں اور ملائکہ بھی اصلاً ایک پوشیدہ مخلوق ہی ہیں۔ لیکن راجح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں الجنہ سے مراد جن ہی ہیں۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں ملائکہ اور جنات کا ذکر دو بالکل مختلف الجنس اور مختلف الصفات مخلوقات کی حیثیت سے ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جنات اپنی خلقت کے اعتبار سے انسان کے بالمقابل ملائکہ سے قریب تر ہیں۔ کیونکہ جنات کی خلقت نار سے ہوئی ہے اور فرشتوں کی نور سے اور انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان دونوں کو ایک قرار دے دیا جائے۔ اور جہاں تک اللہ تعالیٰ اور جنوں کے درمیان مشرکین کا رشتہ اور ناطہ قائم کرنے کا تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کو تو مشرکین نے خدا کی ذات میں شریک بنایا تھا لیکن جنات کو خدا کے حقوق اور اس کی صفات میں شریک کر رکھا ہے۔ عبادت خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے لیکن یہ بدقسمت لوگ جنوں کو نافع وضار اور علمِ غیب کے حصول کا ذریعہ مانتے ہیں اور اس وہم کی بنیاد پر ان کی عبادت کرتے اور ان کے لیے قربانیاں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں۔

مشرکین کی حماقت اور نادانی کو نمایاں کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ تو جنات کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کر کے ان کی بندگی کرتے ہیں اور انہیں معبود کا درجہ دے رکھا ہے حالانکہ جنات کو خوب معلوم ہے کہ وہ بھی انسانوں کی طرح ایک دن پکڑے جائیں گے، اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لیے حاضر کیے جائیں گے اور جو ان میں مجرم ہوں گے وہ اپنے جرم کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہوں گے۔ حیرانی کی بات ہے کہ جس مخلوق کو حشر کے روز اس صورتحال سے سابقہ پڑنے والا ہے مشرکین کی بیوقوفی کا کیا کہیے وہ انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتے اور اپنے معبودوں میں شامل کرتے ہیں۔

Marfat.com

قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے اور جابجا اس کی مثالیں پھیلی ہوئی ہیں کہ جب سلسلۂ بیان کے اندر کوئی ایسی گھناؤنی بات آجاتی ہے جس کی فوری تردید کی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سلسلۂ بیان روک کر فوری طور پر اس کی تردید فرماتے ہیں پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہاں بھی بات یہ ہو رہی تھی کہ مشرکین نے جنات کا رشتہ خدا سے جوڑ دیا ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کر دیا ہے۔ تو سلسلۂ کلام کو روک کر فوراً فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے پاک ہے، جو کچھ مشرکین اس کے لیے بیان کرتے ہیں۔ اور وہ ان تمام نسبتوں سے مبرا ہے جو مشرکین نے اس کی طرف منسوب کر رکھی ہیں۔ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے اور نہ کوئی اس کی صفات میں، وہ بالکل وحدہ لاشریک ہے۔ چنانچہ شرک کی اس آلودگی کی تردید کرنے کے بعد پھر سلسلۂ کلام کو جوڑتے ہوئے فرمایا کہ تمام جنات میدانِ حشر میں مجرموں کی طرح گرفتار کر کے حاضر کیے جائیں گے۔ اور ان کے اعمال کے مطابق ان سے سلوک ہوگا۔ البتہ اس سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ اپنی بندگی اور اطاعت کی توفیق عطا فرمائیں گے اور وہ شیطان کے فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾

(پس بے شک تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ ۱۶۱) اللہ سے برگشتہ نہیں کر سکتے۔ ۱۶۲) مگر انہیں کو جو جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ ۱۶۳)

جنات کی پرستش کرنے والوں کو تنبیہ

اس آیتِ کریمہ میں جنات کی پرستش کرنے والوں اور ان کو معبود ماننے والوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم جنات کی مدد سے انسانوں کو گمراہ کرنے کا جو کاروبار کرتے ہو اور تم اس میں بہت کچھ کامیابی کی امید رکھتے ہو، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم جنات کی مدد سے اور ان کو ساتھ لے کر کیسے بھی فتنے اٹھاؤ اور گمراہی کے لیے کیسے کیسے پاپڑ بیلو، تم اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں پر تمہارا کوئی داؤ کارگر نہیں ہو سکتا۔ البتہ تمہیں صرف ان لوگوں کو برگشتہ کرنے میں کامیابی ہو سکتی ہے جو اپنی بداعمالیوں کے باعث خود ہی جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ یہ بات بالکل ویسی ہے جیسے ابلیس نے پروردگار سے عرض کی تھی کہ میں اولادِ آدم کو گمراہ کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑوں گا۔ آپ ان میں سے بہت کم لوگوں کو شکرگزار پائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ تیرا زور صرف انہیں لوگوں پر چلے گا جو تیری پیروی کرنے والے بنیں گے۔ میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگے گا اور حُسنِ نیت سے صراطِ مستقیم پر چلنے کی کوشش کرے گا تو راستے کی مشکلات اس کے لیے گمراہی کا سبب نہیں بنیں گی۔ بلکہ وہ انہیں مشکلات سے کندن بن کے نکلے گا اور شیطان کے سارے حربے ناکام ہو جائیں گے۔ بالکل یہی بات جنات اور ان کے پیروکاروں سے فرمائی گئی ہے۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

(اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معین مقام ہے۔ ۱۶۴) اور ہم اللہ کے حضور صف بستہ رہنے والے خدمتگار ہیں۔ ۱۶۵) اور ہم اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔ ۱۶۶)

Marfat.com

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی زبان سے فرشتوں کے مقام کی وضاحت

اوپر کی آیات میں فرشتوں کی حیثیت کو واضح کیا گیا اور ان سے متعلق مشرکین کے عقائد کی تردید کی گئی۔ لیکن اب ان کے مقام و مرتبہ کی مزید وضاحت کے لیے فرشتوں کے سردار حضرت جبرائیل علیہ السلام کا اپنا اعتراف ذکر فرمایا گیا ہے تا کہ مشرکین پر ان کی غلطی کو مزید واضح کر دیا جائے۔ ان آیات سے اللہ تعالیٰ کے ارشادات کی تائید مقصود نہیں، اس لیے کہ وہ کسی تائید کا محتاج نہیں۔ پیشِ نظر صرف یہ ہے کہ مشرکین جو فرشتوں کے شریکِ خدا ہونے کے وہم میں مبتلا تھے ان کے وہم پر ضرب لگانے کے لیے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کی شہادت کو شامل کیا جائے۔ کیونکہ ان کی شہادت کے بعد اس عقیدے کے بطلان میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنے اور دیگر فرشتوں کے مقام و مرتبہ کے بارے میں واضح فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کا دائرۂ کار معین اور اس کی رسائی محدود ہے۔ ایک معلوم مقام ہے جس سے ہم آگے پیچھے نہیں ہو سکتے۔ ان کی حدودِ کار واضح ہیں، ان کے فرائض کی نوعیت غیر مشتبہ ہے، بعض مقامات پر ان کی پرواز کی آخری حد مقرر کر دی گئی ہے وہ اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ آنحضرت ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ سے آگے جاتے ہوئے جب حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ساتھ جانے کے لیے کہا، تو انہوں نے صاف عرض کیا کہ میری رسائی کی آخری حد یہی ہے۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

تو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کسی کام کا ارادہ تک نہیں کر سکتے۔ کسی کام کو بطورِ خود کرنا ان کی جبلت کے خلاف ہے۔ مزید فرمایا کہ ہم تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں صف بستہ رہنے والے ہیں اور اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں ان سے مراد نماز ہے۔ یعنی ہم صفیں باندھے اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی نماز میں مشغول رہتے ہیں اور تسبیح سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں سے ارفع و منزہ قرار دیتے ہیں جو اس کی شان کے منافی ہیں۔ یعنی ایک طرف سے یہ بات واضح فرمائی کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے اور ہمہ وقتی چاکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے سوا کسی اور کام میں مصروف ہونا ہمارے بس کی بات نہیں۔ دوسری طرف یہ کہا کہ ہم چونکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں تو اس کے شریک بننے کا تصور ہمارے قریب بھی کبھی پھٹکنے میں نہیں آتا۔ نہ جانے انسانوں نے ہمیں معبودوں میں کیسے شامل کر لیا اور ہم سے ایسی باتیں کیونکہ منسوب کر دی گئیں۔

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

(اور بے شک یہ لوگ کہتے تھے۔ ۱۶۷) کہ کاش ہمارے پاس پہلوں کی تعلیم ہوتی۔ ۱۶۸) تو ہم اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے۔ ۱۶۹) تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا تو وہ عنقریب جان لیں گے۔ ۱۷۰)

Marfat.com

قریش کی بڑ، اور اس پر تنبیہ

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ فاطر کی آیت ۴۲ میں بھی گزر چکا ہے۔ مفہوم اس کا یہ ہے کہ قریش کے سامنے جب ان قوموں کا ذکر آتا جن کی طرف اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول مبعوث کیے گئے اور انہوں نے ان کی تکذیب کر دی، جس کے نتیجہ میں ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ تو قریش یہ سن کر بڑے اعتماد اور فخر کے ساتھ یہ بات کہتے کہ اگر سابقہ امتوں کی طرح ہمارے پاس کوئی تعلیم ہوتی یا ہماری طرف اللہ تعالیٰ کا کوئی رسول مبعوث ہوتا تو ہم تکذیب کی بجائے اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ اور سابقہ امتوں کا سا رویہ ہرگز اختیار نہ کرتے۔ اس کی تعلیم و تربیت کو قبول کرتے اور اللہ تعالیٰ کے خالص بندے بن کر دکھاتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب جبکہ اللہ تعالیٰ کا آخری رسول آ گیا۔ ان کی ہدایت کے لیے کتاب نازل کر دی گئی اور ان پر ایک ایک بات کھول کر عیاں کر دی گئی۔ اور آنحضرت ﷺ کی دلآویز شخصیت اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کی فصاحت و بلاغت اور تائید میں آپ سے ظاہر ہونے والے معجزات، اور اس انتہائی بگڑے ہوئے معاشرے میں آنحضرت ﷺ کی بے عیب شخصیت اور قابلِ فخر سیرت و کردار نے پوری طرح آپ کی حقانیت ثابت کر دی، تو ان کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ نہ آنحضرت ﷺ کو رسول مانتے ہیں اور نہ آپ پر نازل ہونے والی کتاب کو اللہ تعالیٰ کی کتاب مانتے ہیں۔ تو ان کی اس روش پر تأسف کا اظہار کرتے ہوئے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ نادان عنقریب جان لیں گے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ۚۖ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ۖ

وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾

(اپنے بھیجے ہوئے بندوں کے لیے ہمارا یہ کلمہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے۔ ۱۷۱) بے شک ان کی مدد کی جائے گی۔ ۱۷۲) اور بے شک ہمارا ہی لشکر غالب رہنے والا بنے گا۔ ۱۷۳)

سنت اللہ کا ذکر

گزشتہ آیت میں قریش کو جس انجام سے خبردار کیا گیا تھا اس آیتِ کریمہ میں اس انجام کی خبر دی گئی ہے۔ وہ انجام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کی سنت یہ ہے کہ جب بھی کسی قوم کا بگاڑ حد سے بڑھ جاتا ہے تو وہ ان کی ہدایت کے لیے اپنے انبیاء و رُسل کو بھیجتا ہے۔ لیکن قوم ان پر ایمان لانے کی بجائے جب انکار پر تل جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعے ان پر اتمامِ حجت کر دیتا ہے۔ اور اس شدید کشمکش میں جب قوم یہ سمجھتی ہے کہ ہدایت کی یہ پھوٹتی ہوئی کونپل ہماری مخالفت کے بگولوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، اپنی موت آپ مر جائے گی یا ہم اسے توڑ دیں گے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی سنت حرکت میں آتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اس پر ایمان لانے والوں کی مدد فرماتا ہے۔ اس مدد کے نتیجے میں کبھی تو ہدایت کا یہ قافلہ غالب آ جاتا ہے اور صورتحال یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اگر قوم ہدایت سے عناد اور دشمنی کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو مٹا دیتا ہے۔ رسول اور اس پر ایمان لانے والے کسی دوسرے علاقے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق انسانوں کی ہدایت کا سروسامان کرتے ہیں۔ اس سے قریش کو یہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ تم اپنی افرادی قوت، اپنے قبائل کی طاقت اور اپنی دولت و ثروت پر

Marfat.com

بھروسا کرتے ہوئے یہ مت سمجھو کہ تم آنحضرت ﷺ کی دعوت کو ناکام کر دو گے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق اپنے رسول کی مدد کرے گا اور رسول اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ جو اس کا لشکر رہتا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو غالب فرمائے گا۔ کیونکہ حق و باطل کی کشمکش میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی معیت میں جس طرح مومنین کے لشکر کو رکھتا ہے، اسی طرح فرشتوں کا لشکر بھی اس کے ہمرکاب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے لشکر کو کون شکست دے سکتا ہے۔ سورۃ المومن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے یا فیصلے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ”اور ہم لازماً اپنے رسولوں کی اور اہلِ ایمان کی مدد کریں گے، دنیا کی زندگی میں بھی اور اس دن بھی جس دن گواہ، گواہی دینے کو اٹھیں گے۔“

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾

(پس اے پیغمبر آپ کچھ مدت تک ان سے اعراض کریں۔ ۱۷۴) اور دیکھتے رہیں وہ خود بھی عنقریب دیکھ لیں گے۔ ۱۷۵)

آنحضرت ﷺ کو تسلی

اس پر نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور صبر اور انتظار کی ہدایت کی گئی ہے۔ یعنی اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلے اور سنت کی وضاحت فرماتے ہوئے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ حق و باطل کی اس خونخوار کشمکش میں غلبہ حق کا ہو کر رہے گا۔ اور اگر قریش ایمان نہ لائے تو اتمام حجت ہو جانے کے بعد یہ مٹا دیے جائیں گے۔ لیکن ابھی اس فیصلے پر عمل کا وقت نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اتمامِ حجت کب ہوتا ہے اور کافروں کی مہلت کب ختم ہوتی ہے۔ اس وقت تک آنحضرت ﷺ کو انتظار اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ البتہ اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ غلبہ آنحضرت ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کا ہو گا۔ آپ خاموشی سے دیکھتے رہیں کہ مخالفین کیا کر رہے ہیں اور ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور یہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے کہ ان کی کاوشیں کیا رنگ لاتی ہیں۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

(کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ ۱۷۶) پس جب وہ ان کے صحن میں اترے گا تو بڑی ہی بری ہو گی ان لوگوں کی صبح جن کو اس سے متنبہ کیا جا چکا ہے۔ ۱۷۷) تو کچھ مدت کے لیے ان سے اعراض کرو۔ ۱۷۸) اور دیکھو، وہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے۔ ۱۷۹)

گزشتہ امتوں کے حوالے سے قریش کو انجامِ بد سے بچنے کی ہدایت

نبی کریم ﷺ تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں مخالفین کی مخالفت کو روکنے اور ان کے دلوں میں ایمان اتارنے کے لیے کبھی کبھی انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھی ڈراتے تھے۔ کیونکہ یہ تاریخ کا سب سے بڑا سچ ہے کہ جب قوموں نے رسولوں کی تبلیغی کاوشوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ان کی تکذیب کر دی تو پھر اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں آ پکڑا۔ آپ گزشتہ امتوں کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں اس انجامِ بد سے بچنے کی

Marfat.com

تلقین فرماتے تھے۔لیکن وہ بدنصیب بجائے ہدایت کو قبول کرنے کے شور مچاتے کہ آپ ہم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب لے آئیے۔ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اس سے بے پناہ اذیت پہنچتی کیونکہ آپ خوب جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے آجانے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔لیکن مخالفین اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔اب قریش کو شاید آخری دفعہ تنبیہ کی جارہی ہے کہ نادانو! جس عذاب کے لیے جلدی مچارہے ہو،تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ وہ عذاب کیا چیز ہے۔یادرکھو اس کے آجانے کے بعد تم آٹھ آٹھ آنسو روؤ گے لیکن تمہاری فریاد سنی نہیں جائے گی۔اور چونکہ قبائل میں عام طور پر شب خون صبح کے وقت مارا جاتا ہے تو تباہی کا پیغام لاتا ہے۔اس لیے یہاں بھی صباح کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ جن لوگوں کو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا جاچکا ہے تکذیب کی صورت میں انہیں بہت برے دن سے سابقہ پیش آنے والا ہے۔

یادرہے کہ قریش اور دیگر اہلِ مکہ اور ان سے ملحقہ قبائل آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے بعد بھی اس لیے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچے رہے کہ مکہ معظمہ اور مختلف قبائل میں تمام تر معاشرتی اور سیاسی بائیکاٹ کے باوجود قبولِ ایمان کا سلسلہ رکا نہیں بلکہ دھیرے دھیرے جاری رہا۔البتہ جہاں تک غلبۂ حق کا تعلق ہے وہ قرآنِ کریم کی پیشگوئی کے مطابق حرف بہ حرف پورا ہوا۔مسلمانوں کی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں کی مدد فرمائی۔اور پھر چند ہی سالوں کے بعد قافلۂ حق پوری ہیبت اور جبروت کے ساتھ حرم کے صحن میں جا اترا،اور دو سال کا عرصہ مکمل نہیں ہونے پایا کہ پورے جزیرۂ عرب میں اسلام کا پھریرا لہرانے لگا۔اور وہ صبح اہلِ مکہ کے لیے کس قدر دہشت ناک تھی جب وہ ہاتھ باندھے حضورؐ کے سامنے کھڑے تھے اور آپ ان سے پوچھ رہے تھے کہ بتاؤ آج میں تم سے کیا سلوک کروں۔

حیرانی کی بات ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور فتح مکہ سے کئی سال پہلے اس کا نزول ہوا ہے اور اس وقت کے حالات اسلام اور مسلمانوں کے لیے نہایت حوصلہ شکن تھے۔کوئی دور دور تک یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ غلبۂ حق کا کوئی امکان ہوسکتا ہے۔لیکن قرآنِ کریم نے کس اعتماد کے ساتھ یہ خبر دی ہے کہ تم عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہو،تمہیں تباہ تو نہیں کیا جائے گا لیکن تمہاری مغلوبیت میں زیادہ دیر نہیں۔جس اسلام کو تم ایک اجنبی چیز سمجھ رہے ہو وہ چند سالوں کے بعد اس دھرتی کا مقدر بننے والا ہے۔اور پھر ایسا ہی ہوکے رہا ہے۔اس لیے دوبارہ آنحضرت ﷺ سے کہا گیا ہے کہ آپ کچھ دنوں کے لیے ان مخالفین سے اعراض فرمائیے اور دیکھتے رہئے کہ یہ کشمکش کیا رنگ لاتی ہے۔وہ بھی عنقریب دیکھ لیں گے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

سُبۡحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۸۱﴾
وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۸۲﴾

(پاک ہے تیرا رب،عزت کا مالک،ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ ۱۸۰) اور پیغمبروں پر سلامتی ہے۔ ۱۸۱) اور ہر طرح کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے۔ ۱۸۲)

Marfat.com

خلاصۂ سورۃ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار نے ان تین آیتوں میں سورۃ کے جملہ مضامین کو سمیٹ دیا ہے۔ سورۃ میں سب سے زیادہ جس مضمون پر زور دیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، الوہیت اور ان تمام باتوں اور چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کرنا ہے جو مشرکین اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی مضمون کو سمیٹتے ہوئے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہارا رب وہ ہے جو تمام عزت واقتدار کا حقیقی مالک ہے۔ اور وہ ان تمام باتوں سے ارفع اور پاک ہے جو مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس طرح سے یہ آیت توحید کا کلمۂ جامعہ ہے۔

اس سورۃ میں چند انبیاء اور رُسل کے واقعات بیان کیے گئے ہیں جن سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا تقاضا یہ ہے کہ زمین پر بسنے والوں کو اس کے احکام اور اس کی مرضیات سے آگاہ کیا جائے۔ اس عظیم کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مبعوث فرمائے اور ان کے لیے یہ بات مقدر کردی گئی کہ حالات کچھ بھی ہوں، تاریخ ہمیشہ انہیں سلام کرتی رہے گی۔ اور سلامتی ان کی مساعیِ جمیلہ کا دنیا میں ہمیشہ عنوان بنی رہے گی۔ ہمارے رسول پاک ﷺ نے چونکہ سب سے زیادہ وسعت اور جامعیت کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ ان کے لیے سلامتی مخصوص کی۔ اور مخالفین کی ساری کوششوں کے باوجود ان کے نام اور احترام کو وہ عظمت ملی جو تاریخ میں کسی اور کو نہ مل سکی۔

جس طرح اللہ تعالیٰ ہر چھوٹی بڑی مخلوق کو رزق بہم پہنچاتا اور اس کی ضروریات پوری فرماتا ہے اسی طرح اس نے انسانوں کی معنوی اور روحانی ضرورتوں کو بھی بتمام وکمال پورا فرمایا، جس سے اس کی انسانیت کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اس کی کاوشوں سے زمین پر اللہ تعالیٰ کا وہ نظام قائم ہوا جس نے عدلِ اجتماعی کو زمین کا مقدر بنا دیا۔ اور آخرت میں بھی اس کے عدلِ کامل کا ظہور ہوگا، ہر مستحقِ جزاء، جزاء پائے گا اور مستحقِ سزا، سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ اس لیے جو شخص بھی ان باتوں پر غور کرے گا اس کی زبان پر بے ساختہ یہ کلمہ جاری ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔
یہی وجہ ہے کہ علامہ قرطبی نے اپنی سند سے حضرت ابوسعید خدری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے کئی بار سنا کہ آپ نماز ختم ہونے کے بعد یہ آیات تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ متعدد تفاسیر میں حضرت علیؓ کا یہ قول منقول ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ قیامت کے دن اسے بھرپور پیمانے سے اجر ملے، اسے چاہیے کہ وہ اپنی ہر مجلس کے آخر میں یہ تین آیتیں پڑھا کرے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ ...

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد ...

هُدًى لِّلنَّاس

جدید اسلوب میں تفسیری نکات ...

تفسیر روح القرآن

(جلد [illegible])

(سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ) ...... تا ......

مؤلف

مولانا ڈاکٹر ...

Marfat.com